دُنیائے اِسلام کے نوّے ۹۰ صُوفیائے کرام، اَولیائے عظّام اور عارفانِ
عالی مقام کے مکمّل حالات وکوائف، اُنھیں کے ملفُوظات وتصنیفات
اور مُستند کُتب تواریخ کی روشنی میں،

مُرتّبہ

ادارۂ تصنیف وتالیف

ناشرین:

شیخ غلام علی اینڈ سنز پرنٹرز، پبلشرز، کشمیری بازار لاہور

برانچیں:

لاہور — کراچی — پشاور — حیدر آباد

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون۔

انوارِ اصفیا

دنیائے اسلام کے نوشے صوفیائے کرام، اولیائے عظام اور عارفانِ عالی مقام
کے مکمل حالات و کوائف، انھیں کے ملفوظات و تصنیفات اور مستند کتبِ تواریخ
کی روشنی میں

مرتبہ

ادارۂ تصنیف و تالیف

شیخ غلام علی اینڈ سنز پرنٹرز پبلشرز کشمیری بازار لاہور

سلسلہ مطبوعات نمبر ۲۸۳

شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر نے علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر شیخ غلام علی
اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا۔

فہرس-۱

(بہ لحاظ حروف تہجی)

فہرس-۲

(بہ لحاظ زمانہ)

جس سن یا مقام کے بارے میں علم نہیں، یا اس کی صحت میں شبہ ہے وہ درج ہی نہیں کیا گیا تاکہ غلط فہمی نہ ہو۔

نمبر شمار	نام	ولادت (سن ہجری)	وفات (سن ہجری)	مقام ولادت	مقام وفات	صفحہ
۱۸	حضرت خواجہ ابو یوسف چشتیؒ	۳۷۵	۴۵۹	چشت	چشت	۹۵
۱۹	حضرت ابوالحسن علی ہجویری داتا گنج بخشؒ	۴۰۰	۴۶۵	غزنی	لاہور	۹۷
۲۰	حضرت خواجہ مودود چشتیؒ	۴۳۰	۵۲۷	-	چشت	۱۱۲
۲۱	حضرت غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانیؒ	۴۷۰ یا ۴۷۱	۵۶۱	گیلان (ایران)	بغداد	۱۱۵
۲۲	حضرت شیخ ابو نجیب سہروردیؒ	۴۹۰	۵۶۳	سہرورد (زنجان)	بغداد	۱۳۲
۲۳	حضرت شیخ احمد بن ابوالحسن رفاعیؒ	-	۵۷۰	-	ام عبیدہ (عراق کے درمیان ایک قلعہ ہے)	۱۳۴
۲۴	حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ	-	۵۷۵	غجدوان (بخارا)	غجدوان	۱۳۷
۲۵	حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ	-	۶۰۷ یا ۶۱۷	ہارون (خراسان)	مکہ معظمہ	۱۴۱
۲۶	حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ	۵۰۴	۶۱۸	-	-	۱۴۴
۲۷	حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ	۵۳۶	۶۳۳	سیستان	اجمیر	۱۴۷
۲۸	حضرت شہاب الدین سہروردیؒ	۵۴۹	-	سہرورد	-	۱۷۱
۲۹	حضرت خواجہ شمس الدین محمد تبریزی سبزواریؒ۔	۵۶۰	۶۴۵	سبزوار (عراق)	ملتان	۱۷۶
۳۰	حضرت محی الدین عربیؒ	۵۶۰	۶۳۸	مرسیا (اندلس)	دمشق	۱۸۳
۳۱	حضرت بہاؤالدین زکریا سہروردی ملتانیؒ	۵۶۵	۶۶۶	علاقہ ملتان	ملتان	۱۸۷
۳۲	حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر مسعود اجودھنیؒ	۵۸۲	۶۶۶	-	پاک پٹن	۱۹۶
۳۳	حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ	۵۸۳	۶۳۳	اوش (ترکستان)	دہلی	۲۰۹
۳۴	حضرت خواجہ عزیزاں علی رامیتنیؒ	۵۹۱	۷۲۱	رامیتن (بخارا)	خوارزم	۲۱۸
۳۵	حضرت شیخ اوحدالدین کرمانیؒ	-	۶۳۵	-	بغداد	۲۲۱

دوسرا حصہ ـــــ متفرقات

معروضہ

حقوق وفرائض کی ادائیگی، نواہی مکروہات کا ترک اور کبائر سے اجتناب وہ صراطِ مستقیم ہے، جس پر چل کر کوئی بھی انسان روحانی ترقی کی منزلیں طے کر کے معرفت کے بلند درجے تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ارتقائے عظیم ذہن وقلب کو ان تجلیاتِ الٰہی سے منور کر سکتا ہے، جن کی روشنی میں راہِ سلوک کی تمام منزلیں نظر آنے لگتی ہیں۔ انوارِ الٰہی کا تدریجی نزول قدم بہ قدم رہنمائی کرتا ہے، قوتِ نظریہ اور قوتِ عملیہ جیسے جیسے بڑھتی جاتی ہے، منزلیں اسی رفتار سے طے ہونے لگتی ہیں اور جب باطن اس حد تک منور ہو جاتا ہے کہ ماسوائے اللہ کے کسی دوسری چیز کی گنجائش نہ رہے تو بندہ اس مخصوص ولایت میں داخل ہو جاتا ہے، جو عام انسانوں کے فکر ونظر اور ان کی دسترس سے باہر ہوتی ہے ——— ایسے ہی بندے اللہ تعالےٰ کے نزدیک صلحاء میں شمار ہوتے ہیں:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۔ (النساء ع ۹)

اور ایسے ہی بندوں کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ میرے دوست ہیں اور انھیں کوئی اندیشہ اور ڈر نہ ہوگا:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (یونس ع ۷)

اولیا، قطب، غوث، واصل بالحق، عارف، درویش وغیرہ اصطلاحات کا اطلاق ایسے ہی صالحین پر ہوتا ہے یہی عابد وزاہد، متبعین شریعت وطریقت، حاملینِ علمِ باطن اور محرمانِ اسرارِ حقیقت عام اصطلاح میں صوفیہ[1] کہلاتے ہیں۔

ان پاک ہستیوں نے ذکرِ اسمِ ذات، مجاہدات اور تخریبِ بدن کے ذریعہ سے تلوثاتِ بشری اور محسوساتِ جسمانی کو فنا کر کے اللہ جل شانہٗ کے ساتھ معیت حاصل کی اور سلوک کے ان راستوں کو جن طریقوں سے طے کیا، وہی اپنے مریدوں اور دوسرے طالبانِ حق کے لیے تجویز کیے، چنانچہ مختلف اولیائے کرام، صوفیائے عظام اور مشائخ عالی مقام نے اپنے اپنے زاویہ فکر کے مطابق رشد وہدایت کے چراغ روشن کیے، جس سے جدا جدا مسلک ظہور میں آ گئے۔ تاہم بنیادی معتقد

---

[1] علامہ شبلی نعمانی نے "الغزالی" میں "رسالہ امام قشیری"، "کتاب الہند" از ابوریحان بیرونی اور "کشف الظنون" سے جو اقتباسات پیش کیے ہیں ان سے مفہوم یہ نکلتا ہے کہ لفظ تصوف اصل میں "س" سے تھا اور یونانی زبان میں "سوف" کے معنی حکمت ہیں۔ یہی لفظ تصوف کا مادہ ہے۔ عربی میں داخل ہونے پر یہ لفظ عربی اصطلاح کی حیثیت حاصل کر گیا اور "سوفی" بہ معنی حکیم رائج ہوا۔ پھر "سوفی" سے "صوفی" ہو گیا۔

سب کا ایک ہی ہے، جس سے ان بزرگوں کے مقامات اور درجات میں فرق نہیں پڑتا۔

یہی وجہ ہے کہ اس تذکرے میں ہم نے ان تمام ہستیوں کو شامل کیا ہے جن کے حالات کتاب کے حدود میں سما سکے خواہ وہ کسی مسلک اور مشرب سے تعلق رکھتے ہیں، البتہ مسلک کی تخصیص کے لیے کتاب کے دوسرے حصے میں مشہور سلسلوں کے بزرگان کرام کی علیحدہ فہرستیں دے دی گئی ہیں تاکہ یہ کمی بھی باقی نہ رہے۔

اس کتاب کے سلسلے میں چند باتیں ذہن نشین رکھ لینی چاہئیں اور وہ یہ ہیں:

۱ - صوفیائے کرام کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے اور بیشتر کے حالات مختلف تذکروں میں بکھرے پڑے ہیں، مگر اس تذکرے کا مقصد چونکہ ہر بزرگ کے حالات کو پوری تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنا ہے تاکہ سیرت کا کوئی پہلو باقی نہ رہے، اس لیے ان سب حضرات کو ایک ہی کتاب میں اس طرح سے یکجا کر دینا ممکن نہ تھا۔ صرف ان ہی حضرات کے حالات اس میں آسکے ہیں، جو پیش خدمت ہیں۔

۲ - ادارے کے مصنفوں اور ایڈیٹروں نے اردو، عربی اور فارسی کی متعدد کتابیں کھنگالنے اور بہت تحقیق و تدقیق اور عرق ریزی کے بعد یہ تذکرہ مرتب کیا ہے، تاہم بہ تقاضۂ بشریت کسی سقم کا رہ جانا بعید از قیاس نہیں۔

۳ - مرتبین نے جن کتابوں سے مدد لی ہے ان کے ناموں کی فہرست بھی کتاب میں دے دی گئی ہے۔ ان میں سے جو اقتباسات لیے گئے ہیں ان کا اسی جگہ حوالہ دے دیا گیا ہے۔ بعض بیانات جنھیں طویل سمجھا گیا ان کو مختصر کر دیا گیا ہے اور بعض کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ تاکہ قارئین کو کسی قسم کی الجھن یا اشتباہ نہ ہو۔

۴ - ادارے نے اس فرم کی شائع شدہ چند دوسری کتابوں یعنی انوار اولیا، خواجہ غریب نواز، عرس اور میلے، اور احسن الکلام سے بھی بعض بہترین چیزیں اخذ کر کے تذکرے میں شامل کر دی ہیں۔

۵ - قارئین کی سہولت اور فوری حوالہ کا اہتمام فہرست میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ دو فہرستیں بنا دی گئی ہیں، ایک حروف تہجی کے اعتبار سے اور دوسری زمانے کے لحاظ سے۔

امید ہے صوفیہ کرام کی سیرت پر یہ جامع اور مبسوط تذکرہ شائقین کو اس موضوع پر رنگا رنگ کتابوں کی تلاش اور ورق گردانی سے بے نیاز کر دے گا۔

چیف ایڈیٹر

ادارہ تصنیف و تالیف

جن کتابوں سے مدد لی گئی

۱ - لطائف اشرفی مطبوعہ نصرت المطابع دہلی
۲ - خزینۃ الاصفیاء مرتبہ غلام سرور لاہوری
۳ - انوار اولیا از رئیس احمد جعفری
۴ - عرس اور میلے از ارمان سرحدی
۵ - احسن الکلام از ارمان سرحدی
۶ - رود کوثر از شیخ محمد اکرام ایم اے
۷ - منتخب التواریخ از بدایونی
۸ - تذکرہ علمائے ہند از مولوی رحمان علی
۹ - سکینۃ الاولیا از دارا شکوہ
۱۰ - انفاس العارفین از شاہ ولی اللہ
۱۱ - اخبار الاخیار از شیخ عبد الحق محدث دہلوی
۱۲ - تذکرہ از خلیفہ محمد سعید و محمد صغیر
۱۳ - بزم صوفیہ از سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم-اے
۱۴ - سیرت اشرف از سید ضمیر الدین احمد
۱۵ - تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی
۱۶ - اخبار الصالحین از نواب معشوق جنگ بہادر
۱۷ - تذکرہ اولیائے ہند از مرزا محمد اختر
۱۸ - حدیقۃ الاخیار ترجمہ گلشن ابرار از خواجہ امام بخش
۱۹ - تذکرہ شیخ رحمکار از سید سیاح الدین کاکاخیل
۲۰ - فوائد الفواد
۲۱ - سیر محمدی
۲۲ - خواجہ غریب نواز

۲۳ - اسرار الاولیا
۲۴ - سیر الاقطاب
۲۵ - مسلکِ تصوف
۲۶ - سیر العارفین
۲۷ - مرأۃ الاسرار
۲۸ - سیر المتاخرین
۲۹ - مناقب فخری
۳۰ - کنز الانساب
۳۱ - لطائف قدسی
۳۲ - تاریخ مشائخ چشت
۳۳ - مناقب الاصفیا
۳۴ - مونس القلوب
۳۵ - نافع السالکین
۳۶ - نفحات الانس
۳۷ - عجائب القصص
۳۸ - سفینۃ الاولیا
۳۹ معجم البلدان
۴۰ - مناقب العارفین
۴۱ روضۃ الاصفیا
۴۲ - سیر الاولیا

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ
اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ
وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ ذٰلِكَ الْفَضْلُ
مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝

(النساء ع ۹)

اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان
حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے،
یعنی انبیا اور صدیقین اور شہدا اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے
رفیق ہیں۔ یہ فضل ہے اللہ کی جانب سے اور اللہ کافی جاننے والا ہے۔

- ہر چیز کے لیے کان اور مخرج ہوتا ہے اور تقویٰ کی کان عارفین کے قلوب ہیں۔
- ہر چیز کے لیے صفائی اور پاک ہوتی ہے اور قلوب کا تصفیہ ذکرِ الٰہی سے ہوتا ہے۔
- علمِ باطن اللہ جل شانہٗ کے اسرار میں سے ایک سر ہے اور اللہ کی حکمتوں میں سے ایک حکمت ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کے سینے میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے۔
- جب بندہ اخلاص کامل سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ میں مصروف ہوجاتا ہے تو اس کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ عرشِ معلےٰ تک جا پہنچتا ہے بشرطیکہ وہ کبائر سے اجتناب کرتا ہو (ترکِ فرائض اور اختیارِ نواہی کا مرتکب نہ ہو)

(احادیثِ رسولؐ)

خواجہ خواجگان حضرت خواجہ حسن بصریؒ

ولادت ــــــــــ مدینہ منورہ ۲۱ھ

وفات ــــــــــ بصرہ ۱۱۰ھ

پروردۂ ولایت و نبوت، بحرِ ورع و علم، امام المتقین حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ متقدمین صوفیہ میں سے ہیں۔ بڑے مستجاب الدعوات، صاحب کرامات و عالی مقامات اور ظاہری و باطنی علم میں یگانۂ روزگار تھے۔ آپ نے ایک سو بیس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو دیکھا ہے۔ جن میں ستر اصحاب بدر تھے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا آپ کو بہت اچھا جانتی تھیں۔ آپ کے کلام میں بے حد تاثیر و قبولیت تھی چنانچہ ہزارہا افراد نے آپ کی مجلس سے ہدایت پائی۔

آپ کا اسم گرامی حسن، کنیت مبارک ابو محمد، ابو سعید اور ابی البصر رہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانۂ خلافت ۲۱ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام موسیٰ راعی تھا، جو بصرہ اور واسط کے درمیان میسان نام ایک جگہ کے رہنے والے تھے اور زید بن ثابت انصاریؓ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ انھوں نے ۱۲ھ میں حضرت صدیق اکبرؓ کے ہاتھ پہ اسلام قبول کیا[1]۔ آپ کی والدہ ماجدہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی لونڈی تھیں۔ جب آپ پیدا ہوئے تو حضرت فاروق اعظمؓ کے حضور میں لائے گئے۔ بڑے خوشرو اور خوبصورت تھے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے انھیں دیکھ کر فرمایا سَمُّوْهُ حَسَنًا فَاِنَّهٗ حَسَنُ الْوَجْهِ (اس کا نام حسن رکھو کیونکہ اس کا چہرہ حسین ہے) چنانچہ حسن نام رکھا گیا۔

ابتدا میں آپ جواہرات بیچا کرتے تھے۔ چنانچہ حسن لولوئی[2] کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ اس پیشہ سے آپ نے بہت روپیہ کمایا پھر جب عشق الٰہی کا غلبہ ہوا تو آپ نے سارا مال و اسباب راہِ خدا میں لٹا دیا اور لوگوں سے بالکل کنارہ کش ہو کر گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر عبادت و ریاضت اور مجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ دن رات یاد الٰہی میں مصروف رہتے۔ ہر وقت باوضو ہوتے۔ بالآخر درجۂ کمال کو پہنچے اور لوگوں کو رشد و ہدایت کی تلقین فرمانے لگے۔ سنت نبوی اور متابعت مصطفویؐ کے سخت پابند تھے۔ خوف الٰہی سے ہر وقت روتے رہتے تھے، آپ کی آنکھیں کبھی خشک نہیں دیکھی گئیں، اور کثرت گریہ کے باعث آنکھوں میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ نظر کمزور ہو گئی تھی۔ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ بدن پر گوشت نظر

---

[1] روضۃ الاحباب

[2] لولو عربی میں جواہرات کو کہتے ہیں۔

نہ آتا تھا۔ مزاج میں فروتنی اور انکسار بہت تھا۔

تذکرۃ الاولیا کے بیان کے بموجب حضرت علی علیہ السلام بصرہ تشریف لائے تو تمام واعظین اور ذاکرین کو منع کر دیا مگر آپ کا منبر باقی رہنے دیا۔ پھر ایک موقعہ پر حضرت علیؓ آپ کی مجلس میں پوشیدہ طور پر آئے اور پوچھا تم عالم ہو یا متعلم۔ آپ نے فرمایا "میں کچھ نہیں ہوں، جو کچھ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھ تک پہنچا ہے وہ لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہوں۔" حضرت علیؓ نے یہ سن کر فرمایا "یہ جوان شائستہ کلام ہے۔" حضرت حسن بصریؒ نے اپنی فراست سے جان لیا کہ یہ حضرت علیؓ ہیں۔ چنانچہ منبر پر سے اُتر آئے اور ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ عرض کیا "اے امیر المومنین! خدا کے لیے مجھے طہارت سکھائیے۔" حضرت علیؓ نے صوری اور معنوی دونوں طہارتوں کی تعلیم دی، پھر حضرت علیؓ کی صحبت میں سے خواجہ حسن بصریؒ نے بہت فیض حاصل کیا۔ آپ حضرت علیؓ کے خلیفہ اور سیدنا امام حسنؓ اور خواجہ کمیل بن زیاد[1] کے صحبت یافتہ ہیں۔

آپ کے متعلق بہت سی حکایتیں مشہور ہیں جن سے آپ کے علو مرتبہ کا پتہ چلتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ بصرہ میں قحط پڑا اور قریباً دو لاکھ آدمی نماز استسقاء پڑھنے کے لیے باہر میدان میں نکلے۔ خواجہ حسن بصریؒ کو منبر پر کھڑا کیا کہ دعا فرمائیں۔ آپ نے کہا کہ پانی کی ضرورت ہے تو مجھے بصرہ سے نکال دو۔ یہ کہنا تھا کہ پانی برسنے لگا۔

حضرت رابعہ عدویہ بصری رحمتہ اللہ علیہا جنھوں نے زہد میں محبت کی آمیزش کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے گلشنِ تصوف میں حبِ الٰہی کی نغمہ سرائی نثر اور نظم میں کی، اپنے وقت کی بہت بڑی ولیہ تھیں۔ خواجہ حسن بصریؒ آپ کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ خواجہ حسن بصریؒ کا معمول تھا کہ ہفتہ میں ایک بار مجمع عام میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت رابعہ بصری بھی اس موقع پر تشریف لایا کرتی تھیں۔ اگر خواجہ حسن بصری حضرت رابعہ بصری کو مجلس میں نہ دیکھتے تو خاموش رہتے۔ ایک دفعہ لوگوں نے پوچھا کہ آپ کی محفل میں ایسے ایسے جید علماء و صلحاء آتے ہیں پھر اگر ایک ضعیفہ نہیں آئی تو کیا ہوا۔ آپ نے جواب دیا "جو شربت ہاتھیوں کے حوصلہ کے مطابق تیار کیا گیا ہو وہ چیونٹیوں کے سینہ میں کیونکر آ سکتا ہے۔"

ایک مرتبہ حضرت مالک بن دینارؒ نے پوچھا لوگوں کی خرابی کس بات میں ہے۔ فرمایا دل کے مرنے میں۔ پوچھا دل کا مرنا کیا ہوتا ہے فرمایا دنیا کی محبت!

آپ فرمایا کرتے تھے کہ معرفتیں اٹھ گئیں اور برائیاں رہ گئیں اور مسلمانوں میں جو باقی رہ گیا ہے وہ مغموم و متفکر ہے۔

---

[1] خواجہ کمیل بن زیادؒ کاملین روزگار میں سے تھے۔ سیدنا حضرت علیؓ کے خلیفہ تھے۔ صاحب کمالات اور صاحب خوارق و کرامات تھے۔ آپ کے سلسلے میں بڑے بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد آپ خانہ نشین ہو گئے اور صرف ان مریدوں کو تعلیم دیتے تھے جو اعتقاد صادق سے حاضر ہوتے اور علم کی طلب کرتے۔ آپ نے عبدالملک بن مروان کے دورِ حکومت میں ۸۲ھ میں حجاج بن یوسف ثقفی کے ہاتھوں شہادت پائی۔

فرمایا عاجزی کرنے والے کی شان یہ ہے کہ گھر سے باہر جائے تو جس کسی پر بھی اس کی نظر پڑے اُسے اپنے آپ سے بہتر جانے۔
سعید بن جبیرؒ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا، تین کام کبھی نہ کرنا - ۱- بادشاہوں کی بساط پر قدم نہ رکھنا اگرچہ وہ شفقت کریں۔ ۲- کسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ بیٹھنا خواہ وہ رابعہ وقت ہو اور تو اسے کتاب اللہ کی تعلیم دیتا ہو۔ ۳ -مزامیر نہ سننا اگرچہ تو مردانِ مرد کا درجہ رکھتا ہو، اس لیے کہ آفت سے خالی نہیں بالآخر اپنے زخم لگا دیتے ہیں؟
فرماتے ہیں جب بندہ گناہ کرکے توبہ کرتا ہے تو اس سے قرب الٰہی بڑھتا ہے اور اسی طرح بار بار توبہ کرنے سے قربت بڑھتی جاتی ہے۔
فرماتے ہیں ہزاروں آدمیوں کی دوستی بھی ایک شخص کی عداوت کے بدلے میں نہ خریدو- لالچ عالم کو بدنام کر دیتا ہے اور آدمی کا اعلانیہ اپنے نفس کو بُرا کہنا دراصل اس کی تعریف کرنا ہے - فرمایا تم میں سب سے زیادہ قابلِ عزت وہ ہے جو ہمیشہ تمھارا دوست رہے -
ایک مرتبہ آپ نے اپنے احباب سے فرمایا، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے مانند ہو- وہ لوگ یہ سن کر بہت خوش ہوئے- آپ نے فرمایا صرف شکل میں ان کی مانند ہو کسی دوسری بات میں نہیں- اگر تم انھیں دیکھتے تو دیوانہ خیال کرنے لگتے -اور اگر وہ تمھارے حال کو جان لیتے تو تم میں سے ایک کو بھی مسلمان نہ کہتے- فرمایا بُروں کی ہم نشینی آدمی کو نیکوں سے بدگمان کر دیتی ہے -
فرمایا جس نے خدائے تعالےٰ کے سامنے عاجزی اور فروتنی کے ساتھ صوف پہنا، اللہ تعالیٰ اس کی آنکھوں اور اس کے دل میں نور بڑھا دیتا ہے اور جو فخر کے لیے ایسا کرے وہ جہنم میں ڈالا جاتا ہے -
ایک مرتبہ کسی نے کسی مسئلے کے بارے میں کہا کہ فقہا یوں کہتے ہیں- آپ نے اس سے پوچھا تم نے کوئی فقیہہ دیکھا بھی ہے فقیہہ وہ ہے جو دنیا سے پرہیز کرے، اپنے گناہوں کو دیکھے اور اپنے رب کی عبادت کا پورا پابند ہو اور جس نے دولت کی عزت کی خدا نے اُسے ذلت دی- فرمایا دنیا تمھاری سواری ہے اگر تم اس پر سوار ہو گئے تو یہ تمھیں لیے چلے گی اور اگر تم پر سوار ہو گئی تو تمھیں ہلاک کرکے چھوڑے گی-
فرمایا معرفت یہ ہے کہ آدمی اپنے میں ذرہ بھر خصومت نہ پائے- حیات جاودانی اس چند روزہ عمل سے نہیں ہے- نیت نیک سے ہے- فکر آئینہ ہے کہ تیری نیکیاں اور برائیاں تجھے دکھا دے- جو بات سر حکمت سے نہیں وہ آفت ہے- اور جو خاموشی ہر فکر سے نہیں وہ تمام تر شہوت و غفلت ہے- اور جو نظر سر عبرت سے نہیں وہ بالکل بے ہودہ اور ذلت ہے- اہل عقل کو خاموشی اختیار کرنی چاہیئے تاکہ ان کے دل گویا ہو سکیں- اور اس کا اثر زبان پر سرایت کرے- ظاہر و باطن کا ایک دوسرے کے برعکس ہونا نفاق ہے- کوئی مومن ایسا نہیں ہوا اور نہ ہوگا جو اس خوف سے کانپتا نہ ہو کہ مبادا منافق ہو- مومن وہ ہے جو ہر حال میں یکساں ہو، اس کا ظاہر اور باطن ایک سا ہو- ایسا نہیں کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے کہے-

فرمایا اگر تم کسی سے دشمنی کرنا چاہو تو اگر وہ خدا کا فرمانبردار بندہ ہے تو اس سے دستبردار ہو جاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ اُسے تمہارے حوالے نہ کرے گا۔ اور اگر وہ خدا کا نافرمان بندہ ہے تو تمہارا مطلب خود بخود نکل آئے گا کہ اپنے قلب کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے، پس ہر مسلمان تجھ سے محفوظ رہے گا۔

فرمایا عقلمند وہ ہے کہ دنیا کو خراب کر کے آخرت کو بنائے۔ جو بات کسی کو کہنی ہو لازم ہے کہ پہلے خود اس پر عمل کرے۔ میرے نزدیک دین کے بھائی، بیوی بچوں سے زیادہ عزیز ہیں اس لیے کہ وہ دین کے یار ہیں اور بیوی بچے دنیا کے یار اور دین کے دشمن ہیں۔

فرماتے ہیں آدمی جو کچھ کہ اپنی ذات اور اپنے ماں باپ کے کھانے کپڑے میں خرچ کرتا ہے اس کا حساب دینا ہوگا مگر مہمان اور دوست کے کھانے کا حساب نہ ہوگا۔

ایک مرتبہ پوچھا گیا خشوع کیا ہے، فرمایا خشوع یہ ہے کہ خدا کا خوف ہر وقت دل میں موجود رہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے غافل نہ ہو۔

ایک دن آپ گھر میں رو رہے تھے۔ لوگوں نے عرض کیا آپ ایسی پرہیزگار زندگی بسر کر رہے ہیں پھر کیوں روتے ہیں؟ فرمایا ممکن ہے بے قصد اور بے علم مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جائے اور میں نے ایسی جگہ قدم رکھا ہو جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہ ہو۔

حضرت حسن بصریؒ خوف اور خشیت الٰہی کے پیکر تھے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ صرف نفس کی ایذا رسانی پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تصفیہ قلب اور تزکیہ کردار کے بھی عامل تھے۔ وہ دل کی صفائی اور کردار کی درستگی صرف مجاہدہ اور ریاضت سے نہیں کرتے تھے بلکہ فکر و تامل کے ساتھ کرتے تھے۔ ان کا فکر و تامل ان کے زہد و تقشف پر مستزاد تھا اور ان کی حیات کی یہی اصل اور اساس تھی۔ غرض آپ زاہدوں میں سب سے بڑے زاہد اور عابدوں میں سب سے بڑے عابد تھے۔

ایک مرتبہ آپ سے پوچھا گیا کہ آپ اپنی مجلس وعظ میں لوگوں کی کثرت دیکھ کر خوش ہوتے ہوں گے۔ فرمایا مجھے کثرت سے خوشی نہیں ہوتی ہاں اگر کوئی درویش صاحب دل موجود ہو تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔

آپ سے پوچھا گیا کہ مسلمانی کیا ہے؟ فرمایا "مسلمانی کتاب میں ہے اور مسلمان قبر میں"۔ پھر پوچھا گیا دین کی اصل کیا ہے۔ فرمایا "پرہیزگاری"۔ پوچھا گیا کون سی چیز پرہیزگاری کو تباہ کرتی ہے، فرمایا "طمع"۔ پوچھا گیا جنت عدن کیا ہے۔ فرمایا "سونے سے تعمیر شدہ ایک محل ہے جس میں پیغمبروں، شہیدوں، صدیقوں اور عادل بادشاہوں کو داخل کیا جائے گا"۔ پھر پوچھا گیا بیمار طبیب دوسروں کا علاج کیسے کرے، فرمایا "پہلے اپنا پھر مریض کا علاج کرے"۔ فرمایا "لوگو! جو کچھ میں کہوں اسے سن لیا کرو، میرا علم تمہیں فائدہ دے گا اور میرا عمل تمہیں کوئی نقصان نہ دے گا"۔

ایک مرتبہ لوگوں نے کہا ہمارے دل سوئے ہوئے ہیں آپ کا کلام ہمارے دل پر اثر نہیں کرتا۔ آپ نے فرمایا
میں کیا کروں، تمہارے دل مُردہ ہیں۔ سوئے ہوئے کو ہلانے سے جگایا جا سکتا ہے، اگر مُردہ کو کیسے جگایا جائے۔"
کسی نے کہا بعض لوگ آپ کی باتوں کو صرف اس لیے یاد رکھتے ہیں کہ ان میں نقص نکالیں اور اعتراض کریں۔
آپ نے فرمایا "مجھے لوگوں سے محفوظ رہنے کی خواہش نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ کی ہمسائیگی اور بہشت کی آرزو ہے۔ ان لوگوں کی
زبان سے تو ان کا پیدا کرنے والا بھی محفوظ نہیں۔"
ایک مرتبہ آپ وعظ فرما رہے تھے کہ حجاج بن یوسف اپنے لشکر سمیت تلواریں سونتے ہوئے آپ کی مجلس میں
آگیا۔ حاضرین مجلس میں سے ایک نے کہا آج حسن کے امتحان کا دن ہے۔ حجاج مجلس میں آکر ایک جگہ خاموش بیٹھ گیا۔
حضرت حسنؒ نے اس کی طرف ذرا التفات نہ کیا۔ تب وہ شخص بولا حسن واقعی حسن ہے۔ مجلس ختم ہونے پر حجاج نے
آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور لوگوں سے کہا "اگر کسی مردِ حق کو دیکھنا چاہتے ہو تو اس (حسن) کی طرف دیکھو۔"
ایک روز آپ قبرستان میں سے گزر رہے تھے، کچھ لوگ ساتھ تھے۔ آپ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا "اس قبرستان
میں ایسے لوگ بھی دفن ہیں جنہوں نے آٹھ بہشتوں کی بھی کوئی پرواز کی مگر پھر بھی اس قدر حسرت دل میں لے گئے کہ اگر اس کا
ایک ذرہ اہل فلک کو پیش کیا جائے تو وہ خوف کے مارے غرق ہو جائیں۔"
عمر بن عبدالعزیز نے ایک مرتبہ آپ کو کہلا بھیجا کہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔ آپ نے جواب دیا "اگر اللہ تعالےٰ
آپ کے ہمراہ ہے تو پھر آپ کو کسی کی پروا نہیں، اور اگر اللہ ہمراہ نہیں تو پھر کسی سے کیا امید رکھ سکتے ہیں۔ ایک اور موقع
پر آپ نے خلیفہ کو کہا وہ دن سر پر سمجھیں جب کسی کا بس ماندہ مر جائے۔ خلیفہ نے جواب دیا وہ دن کبھی آیا ہی سمجھیں
جب دنیا ہی نہ ہوگی۔
روایت ہے کہ ایک غریب اور مفلس شخص کا گھوڑا ایشی ہو گیا۔ اس نے حضرت خواجہ حسن بصریؒ سے عرض کیا۔
آپ نے قیمت دریافت کر کے چار سو دینار میں اسے خرید لیا۔ رات کو اس شخص نے خواب میں دیکھا کہ اس کا گھوڑا دوسرے
گھوڑوں کے ساتھ بہشت کی چراگاہ میں چر رہا ہے۔ اس نے پوچھا یہ کس کے گھوڑے ہیں۔ بتایا گیا یہ تیرے تھے مگر اب
ان کا مالک حسن بصریؒ ہے۔ خواب سے بیدار ہونے پر وہ شخص حسن بصریؒ کے پاس آیا اور کہا کہ میں کل والا سودا منسوخ
کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا "تیرے خواب سے میرے خدا نے مجھے پہلے ہی آگاہ کر دیا ہے" وہ واپس چلا گیا۔
اگلی رات خواجہ حسن بصریؒ نے خواب میں دیکھا عالی شان محل اور دلفریب منظر ہے۔ پوچھا اس محل کا مالک کون ہے؟
جواب ملا، جو شخص بیع منسوخ کرے یہ اس کا محل ہے۔ بیدار ہونے پر آپ نے اس آدمی کو بلایا اور بیع منسوخ کر دی۔
کسی نے آپ کا حال پوچھا آپ نے جواب میں فرمایا "ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو دریا میں ہوں، کشتی الٹ جائے
اور ہر شخص ایک ایک تختہ پر رہ جائے۔" اس شخص نے کہا ان بیچاروں کا بہت بُرا حال ہوگا۔ آپ نے فرمایا "میرا بھی یہی حال ہے۔"

کسی نے آپ سے کہا کہ فلاں شخص نزع کی حالت میں ہے۔ آپ نے فرمایا" ایسا نہ کہو وہ توستر سال سے نزع کی حالت میں ہے۔ اب آزاد ہو جائے گا"۔ فرمایا "جن کا بوجھ ہلکا تھا وہ نجات پاگئے اور جن کا بوجھ بھاری تھا وہ ہلاک ہوئے۔ خدا اس قوم کو بخشے جس کے نزدیک دنیا امانت کے طور پر تھی اور اس امانت کو واپس کرکے وہ چلے گئے"۔

ایک دفعہ عید کے دن آپ ایسے لوگوں کے پاس سے گزرے جو ہنس رہے تھے اور کھیل کود میں مصروف تھے۔ آپ نے فرمایا "مجھے ان لوگوں پر تعجب ہے جو ہنستے ہیں حالانکہ انھیں اپنے حال کی خبر نہیں"۔

آپ نے ایک شخص کو قبرستان میں روٹی کھاتے دیکھا فرمایا "یہ منافق ہے۔ پوچھا گیا کیسے؟ فرمایا" جسے مُردوں کے سامنے خواہش پیدا ہو وہ قیامت اور موت کا معتقد نہیں اور یہی منافق کی علامت ہے"۔

خواجہ حسن بصریؒ کی سیرت کی تصویر کشی ابونعیم احمد بن عبداللہ الاصفہانی (متوفی ۴۳۰ھ) نے بہترین الفاظ میں کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں:

" خواجہ حسن بصریؒ کیا تھے؟ وہ خوف الٰہی کے حلیف تھے۔ وہ حزن و الم کو دوست رکھتے تھے، وہ راتوں کو جاگتے اور عبادت کرتے تھے، وہ دن کو ریاضت اور مجاہدہ میں صرف کرتے تھے، وہ فقیہہ بھی تھے، اور زاہد بھی۔ وہ عابد بھی تھے اور دنیا سے بیزار بھی۔ وہ دنیا کو فضول سمجھتے تھے۔ وہ دنیا کی زینت کو ہیچ اور ناکارہ سمجھتے تھے۔ وہ نفس کی خواہشات سے بغاوت کے خوگر تھے۔ وہ نفس کی تمناؤں سے نخوت کے ساتھ پیش آتے تھے"!

اُن کا زہد عبادت تھا حزن دائم سے ان کی آنکھیں ہر وقت پُرنم رہتیں ان کا دل ہر وقت اشکبار رہتا۔ ان کا خیال تھا کہ عمل صالح کی تربیت، نشوونما اور تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ہنسے کم اور روئے زیادہ۔ دنیا کی اُلجھنوں سے اپنا دامن بچائے اور انجام و عواقب کے خوف سے لرزہ براندام رہے۔ سرور و نشاط کے دام میں اسیر نہ ہو۔ حزن و الم کو سرمایۂ افتخار بنائے اور جان لے کہ ہنسی میں وہ لذت نہیں جو گریہ میں ہے۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ تقویٰ کے ارتقا اور تکمیل میں سب سے زیادہ جو چیز معاون و مددگار ہوتی ہے، بلکہ بنیادی اور اساسی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے، وہ ہے صرف خوفِ خدا یا خشیتِ الٰہی!!

شعرانی کا بیان ہے:

" حضرت حسن بصریؒ پر خوفِ خدا اور خشیتِ الٰہی کی اتنی دہشت طاری رہتی تھی کہ گویا جہنم کی آگ صرف انہی کے لیے تخلیق کی گئی ہے"۔

زہد کے بارے میں ایک مرتبہ حضرت حسن بصری نے فرمایا:

" دنیا دارِ عمل ہے، جو اس میں اس طرح رہا کہ اس سے بغض اور نفرت رکھتا رہا، وہ خود بھی کامیاب ہوا اور اس نے

دنیا کو بھی سعادت عطا کی، جو دنیا میں اس طرح رہا کہ اس کی محبت میں مست اور بے خود ہو گیا، اس نے اپنے تئیں بھی نقصان پہنچایا اور دنیا کے کام بھی نہ آیا۔"

ایک اور موقع پر حزن والم کے بارے میں فرمایا:

"جو شخص یہ جانتا ہے کہ موت آکر رہے گی، جو یہ جانتا ہے کہ قیامت واقع ہو کر رہے گی، جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اسے بہرحال ایک نہ ایک دن خدا کے حضور میں پیش ہونا ہے وہ شخص کس طرح خوش رہ سکتا ہے؟ اس کے حزن والم کی کیفیت تو برابر بڑھتی ہی چلی جائے گی۔"

ایک اور موقع پر اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی تو فرمایا:

"دنیا میں آدمی جتنی طویل غمگین زندگی بسر کرے گا، اسی مناسبت سے اس کے عمل صالح کی آبیاری ہوگی۔"

آپ کے بعض اقوال وارشادات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے فرماتے ہیں:

تفکر خیر اور عمل کی طرف دعوت دیتا ہے۔

جو خدا سے ڈرتا ہے، سب لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔

جو ہر شئے کو دیکھنے میں اپنی آنکھ کو آزاد کیے رہتا ہے اس کا غم بڑھ جاتا ہے اور جو ہر وہ بات کہہ دیتا ہے جو اس کے جی میں آئے، وہ اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے۔

صبر دنیا کی سب نیکیوں کا نچوڑ ہے۔

خدا سے ڈرنے والے کو چاہیے کہ اس کے تصرفات میں کلام نہ کرے۔

دنیا کا عذاب یہ ہے کہ تیرا دل مردہ ہو جائے۔

جو آج بے خوف ہے کل اُسے ڈرایا جائے گا اور جو آج ڈرتا ہے وہ کل بے خوف ہوگا۔

جو خدا سے شرم کرتا ہے لوگ بھی اس سے شرم رکھتے ہیں، اور جو خدا کے سامنے گناہ کرنے میں دلیری کرتا ہے لوگ بھی اس پر دلیر ہو جاتے ہیں۔

جو بات حکمت سے خالی ہے وہ آفت ہے، جو خاموشی حکمت سے خالی ہے وہ غفلت ہے، جو نظر عبرت سے خالی ہے وہ ذلت ہے۔

خالی پیٹ شیطان کا قید خانہ ہے اور بھرا ہوا پیٹ اس کا اکھاڑہ۔

اگرچہ توبہ سے غیبت کا کفارہ ادا ہو جاتا ہے مگر اس سے معافی مانگ جس کی تو نے غیبت کی

جنت کے مقابلہ میں بڑی سے بڑی نعمت حقیر ہے اور دوزخ کے مقابلہ میں بڑی سے بڑی مصیبت آسان اور قابل برداشت ہے۔

نفس سے بڑھ کر دنیا میں مُنہ زور اور بدلگام جانور اور کوئی نہیں۔
اگر یہ جاننا چاہتے ہو کہ تمھارے مرنے کے بعد دنیا کی کیا حالت ہو گی تو دیکھ لو کہ دوسروں کے مرنے کے بعد دنیا کی کیا حالت ہے۔
دولت وہی شخص طلب کرتا ہے جسے خدا ذلیل کرے۔
اُس شخص کا دل کبھی درست نہیں ہو سکتا جس کی پیروی احمق لوگ کریں۔
جو دوسروں کی باتیں تم سے بیان کرتا ہے، وہ تمھاری باتیں دوسروں سے ضرور کہے گا۔
فکر تیرے لیے آئینہ ہے جو تجھ پر نیکی اور بدی ظاہر کرتا ہے۔
جس نے خدا کو پہچانا اس نے اسے دوست رکھا اور جس نے دنیا کو پہچانا اس نے خدا کو دشمن سمجھا۔
مومن کی شان یہ ہے کہ اس کی صبح ہوتی ہے تو وہ ملول اور غمگین ہوتا ہے اور اس کی شام ہوتی ہے تو وہ ملول اور غمگین ہوتا ہے۔
اے انسان! اگر تیرے نفس نے نجات پائی تو تُو نے بھی نجات پائی اور اگر تیرا نفس ہلاک ہو گیا تو تُو بھی ہلاک ہو گیا اور تیرے سوا جس نے نجات حاصل کی، وہ تجھے کوئی نفع نہ دے سکے گا۔
لالچ آدمی کو بدنما بنا دیتا ہے۔
ہشام بن عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں غرہ رجب ۱۱۰ھ میں نواسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ مزار پُر انوار بصرہ میں ہے۔

حضرت رابعہ عدویہ بصریؒ

ولادت ـــــــــــــ بصرہ ۹۷ھ

وفات ـــــــــــــ بصرہ ۱۸۵ھ

حضرت خواجہ حسن بصریؒ زہد کی بنیاد و اساس حزن والم کو قرار دے چکے تھے اور ان کی حیات روحیہ کا تمام تر دارومدار اسی اصول پر تھا۔ تصوف میں خوف والم کا مسلک انھیں سے منسوب ہے، مگر ان کے بعد زہد میں محبت کی آمیزش کے اصول کو لے کر ایک نیا مکتب خیال ابھرا۔ تصوف میں اس عامل جدید کے اضافے کو دوسری صدی ہجری کی مشہور و معروف ہستی حضرت رابعہ عدویہ بصری رحمۃ اللہ علیہا سے منسوب کیا جاتا ہے جو اپنے وقت کی بہت بڑی عارفہ اور ولیہ تھیں۔

حضرت رابعہ بصریؒ وہ پہلی ہستی ہیں جنھوں نے تصوف کے گلشن میں حبِّ الٰہی کی نغمہ سرائی نثر اور نظم میں کی۔ کتب تصوف میں حضرت رابعہؒ کے بہت سے اقوال و ارشادات اور ان کا منظوم کلام اس موضوع پر ملتا ہے۔

حضرت رابعہؒ ۹۷ھ میں شہر بصرہ میں ایک نہایت غریب گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ابھی کمسن تھیں کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ایک دفعہ بصرہ میں قحط پڑا اور لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ ایسے موقع پر پیٹ بھرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا جاتا۔ حضرت رابعہؒ کی بہنوں نے انھیں عتیق نام ایک دولت مند شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا[1]، جو انھیں گھر لے گیا اور لونڈی کے طور پر گھر کا کام کاج کرانے لگا۔

ہوش سنبھالنے پر آپ کی طبیعت عبادت و ریاضت کی طرف مائل ہوئی۔ گھر کا کام کر چکتیں تو عبادت میں لگ جاتیں اور اکثر ساری ساری رات عبادت میں گزار دیتیں۔

ایک دفعہ بہت رات گئے آقا کی آنکھ کھلی تو اس نے حضرت رابعہؒ کو سجدے میں دیکھا۔ آپ گڑگڑا کر دعا مانگ رہی تھیں۔ آقا نے کان لگا کر سنا، حضرت رابعہ فرما رہی تھیں "اے میرے اللہ! میں بہت مجبور اور بے بس ہوں، گھر کا کام کاج کرنے کی پابندی تیری عبادت کے راستے میں حائل ہے، تو میری معذرت قبول فرما اور میرے گناہ معاف

---

[1] بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ بہنوں نے آپ کو فروخت نہیں کیا تھا بلکہ وہ قحط کے باعث شہر چھوڑ کر کہیں اور جا رہی تھیں۔ حضرت رابعہ بھی ساتھ تھیں کسی نے حضرت رابعہ کو پکڑ لیا اور کنیز بنا کر کسی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

کر دے :
آقا نے ایک کم عمر لڑکی کی پرہیزگاری کا یہ عالم دیکھا تو دل میں خدا کا خوف پیدا ہو گیا۔ اگلے ہی دن اس نے حضرت رابعہؒ کو آزاد کر دیا۔

اب آپ دن رات عبادت میں مصروف رہنے لگیں۔ پہلے کچھ عرصہ ویران جنگلوں میں رہ کر گزارا پھر بصرہ شہر میں آکر رہنے لگیں۔ عبادت کا یہ عالم تھا کہ فرض اور سنت نمازوں کے علاوہ ایک ہزار نفل دن رات میں پڑھا کرتی تھیں، اس کے سوا اور کوئی شغل نہ تھا۔ جو کوئی ان کے پاس جاتا اسے وعظ و نصیحت کرتیں۔ آپ نے قرآن حفظ کر رکھا تھا اور حدیث پر بھی پورا عبور حاصل کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے کے بعض اولیائے کرام اور بزرگانِ دین حضرت رابعہؒ کی مجلس میں آکر ان سے کئی باتیں سیکھا کرتے تھے۔ حضرت رابعہؒ نے کئی حج کیے اور متعدد مرتبہ خانہ کعبہ کی زیارت کی۔

آپ کھانے پینے کے لیے کسی سے کبھی کچھ نہ مانگتیں، کئی کئی دن فاقوں سے رہتیں، لیکن زبان پر کبھی شکایت یا سوال کا لفظ نہ آیا بلکہ اس کے برعکس کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کھانے کو کچھ آیا، آپ کو خود کھانے کی حاجت تھی مگر جو چیز آئی وہ اٹھا کر کسی سوالی کو دے دی اور خود بھوکی رہیں۔ تکلیف اور خوشی دونوں باتوں کا انھیں کبھی احساس تک نہ ہوتا تھا۔

آپ فرمایا کرتی تھیں اللہ کی عبادت کسی لالچ سے نہیں کرنی چاہیے، جیسے لوگ کہتے ہیں کہ اچھے کام کریں تو جنت ملے گی۔ آپ فرمایا کرتی تھیں خدا کی عبادت صرف خدا کی خوشنودی کے لیے کرنی چاہیے، جنت کے لالچ سے عبادت کرنا تجارت ہے عبادت ہرگز نہیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ایک روز آپ ایک ہاتھ میں آگ اور دوسرے میں پانی سے بھرا ہوا لوٹا لے کر بڑے جوش میں چلی جا رہی تھیں۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیا؟ فرمایا پانی سے دوزخ کی آگ بجھانے چلی ہوں اور آگ لے جا رہی ہوں کہ جنت کو جلا کر پھونک دوں تاکہ وہ لوگ جو جنت کی لالچ سے خدا کی عبادت کرتے ہیں انھیں جنت ہاتھ نہ آئے۔

ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے آپ کے سامنے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت دی ہے۔ ہمیشہ مرد کو ہی نبی یا رسول بنا کر بھیجا گیا۔ کسی عورت کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔ آپ بولیں یہ ٹھیک ہے لیکن یہ بھی سن لو کہ مردوں نے ہی خدا ہونے کا دعوٰی کیا ہے۔ کسی عورت نے آج تک یہ نہیں کہا۔ (آپ کا اشارہ مصر کے قدیم فرعون کی طرف تھا، جو عینیت کے حق میں خدا کا درجہ رکھتے تھے)

ایک دفعہ کسی نے کہا کہ گھر سے باہر نکل کے ذرا دیکھیں ہر طرف بہار ہی بہار دکھائی دے رہی ہے۔ آپ نے فرمایا میرا کام کاریگر کو دیکھنا ہے نہ کہ اس کی کاریگری کو۔

ایک دفعہ آپ نے ایک شخص کو دیکھا جو سر پر پٹی باندھے چلا جا رہا تھا۔ آپ نے اس سے پٹی باندھنے کی وجہ پوچھی اور پوچھا تمہاری عمر کیا ہے۔ اس نے کہا میری عمر تیس سال کے قریب ہے۔ اور پٹی میں نے اس لیے باندھ رکھی ہے کہ سر میں درد ہو رہا ہے۔ آپ بولیں اتنی مدت تم بیمار رہے یا تندرست۔ اس نے کہا تندرست۔ آپ نے فرمایا اتنی مدت تک تندرستی کے شکریے کی پٹی تو ایک دن بھی نہ باندھ سکے اور ایک دن بیمار ہوئے ہو تو فوراً شکایت کی پٹی باندھ لی ہے۔ وہ شخص یہ بات سن کر بہت شرمندہ ہوا۔

ایک اور مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت رابعہؒ کے ہاں اکٹھے دس مہمان آگئے۔ اس وقت گھر میں صرف ایک روٹی رکھی تھی۔ آپ نے خادمہ سے کہا وہ روٹی فقیر کو دے دو۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص نے دروازہ پر دستک دی۔ خادمہ باہر گئی اور واپس آکر بتایا ایک شخص کھانا لایا ہے۔ آپ نے پوچھا "کتنی روٹیاں ہیں؟ خادمہ نے کہا دو، آپ نے کہا "اسے واپس کر دو، یہ ہمارا کھانا نہیں"۔

تھوڑی دیر بعد خادمہ پھر آئی اور کہا "کوئی دوسرا شخص کھانا لے کر آیا ہے"۔ آپ نے پوچھا "کتنی روٹیاں ہیں؟" خادمہ نے کہا "پانچ"۔ آپ نے کہا "اسے بھی واپس کر دو۔ یہ ہمارا کھانا نہیں"۔

تیسری مرتبہ خادمہ پھر آئی اور کہا کہ "ایک اور شخص کھانا لایا ہے"۔ آپ نے پوچھا "کتنی روٹیاں ہیں" خادمہ نے کہا "گیارہ"۔ آپ نے فرمایا "لے آؤ۔ یہ ہمارا کھانا ہے"۔ خادمہ کھانا اندر لے آئی۔ حضرت رابعہؒ نے دس روٹیاں دس مہمانوں کو کھلائیں اور گیارھویں روٹی کا نصف خادمہ کو دیا اور نصف خود کھائی۔

خادمہ نے دریافت کیا کہ "آپ نے کس طرح جانا کہ وہ کھانے ہمارے نہ تھے اور یہ کھانا ہمارا ہے"۔ حضرت رابعہؒ نے فرمایا "خدا کہتا ہے دنیا میں ایک کے بدلے دس اور آخرت میں ستر دوں گا۔ میں نے بھی ایک روٹی فقیر کو دے کر اس سے سودا کیا تھا۔ چونکہ اس کا وعدہ جھوٹا نہیں ہو سکتا لہٰذا جب پہلا شخص دو روٹیاں لایا تو میں نے جان لیا یہ غلط ہے۔ دوسرا شخص پانچ لایا تو وہ بھی غلط تھا۔ تیسری مرتبہ صلہ صحیح ملا۔ دس روٹیاں تو میری ایک روٹی کے عوض میں تھیں اور جو روٹی ہم نے فقیر کو دی تھی، وہ بھی خدا نے واپس کر دی تھی"۔

ایک مرتبہ آپ نماز ادا کر رہی تھیں کہ کمزوری کے باعث نماز پڑھتے پڑھتے سو گئیں۔ اس اثنا میں ایک چور آیا اور آپ کی چادر اٹھا کر چل دیا۔ جب وہ دروازے سے باہر نکلنے لگا تو اسے دروازہ نظر نہ آیا۔ اس نے چادر رکھ دی تو دروازہ دکھائی دینے لگا۔ دوبارہ چادر اٹھا کر چلا تو دروازہ پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے دوبارہ چادر رکھ دی تو دروازہ پھر نظر آنے لگا۔ تیسری مرتبہ چادر اٹھانے لگا تو آواز آئی، اپنے آپ کو مصیبت میں نہ ڈالو۔ اس گھر کی مالکہ نے اپنے آپ کو ہماری نگہبانی اور دوستی میں دے رکھا ہے۔ یہاں تو کسی کی مجال نہیں کہ کچھ کر سکے۔ ایک دوست سویا ہوا ہے تو کیا ہوا دوسرا دوست تو بیدار ہے۔

کہا جاتا ہے ایک دن خواجہ حسن بصریؒ آپ کے ہاں گئے اور پوچھا مجھے وہ باتیں بتاؤ جو تم نے علم و تعلیم سے حاصل کیں اور نہ کسی سے سنیں بلکہ مخلوق سے بلاواسطہ تجھے پہنچی ہوں۔ آپ نے فرمایا میں نے چند رسیاں بٹی تھیں کہ انھیں بیچ کر اپنی ضروریات خرید لوں۔ چنانچہ وہ دو درم میں فروخت کیں۔ ایک درم ایک ہاتھ میں لیا اور دوسرا دوسرے ہاتھ میں۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ مبادا ایک ہی ہاتھ میں دونوں درم لینے سے گمراہ ہو جاؤں۔ بس یہی آج کی حاصل شدہ بات ہے۔

ایک دفعہ لوگوں نے آپ سے کہا اے رابعہؒ! خواجہ حسن بصری کہتے ہیں کہ قیامت کے دن اگر ایک دم کے لیے بھی میں دیدارِ الٰہی سے محروم ہوا تو اتنا روؤں گا کہ اہلِ بہشت کو میرے حال پر رحم آ جائے گا۔

حضرت رابعہؒ نے فرمایا یہ درست ہے لیکن اگر دنیا میں بھی خدائے تعالیٰ کے ذکر سے غافل رہنے پر اس قدر گریہ و زاری ہوتی کہ اہلِ دنیا کو ان کے حال پر ترس آ جاتا تو یہاں بھی ایسا ہی ہوتا۔

لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ نکاح کیوں نہیں کرتیں۔ فرمایا مجھے تین باتوں کا اندیشہ ہے اگر ان سے فارغ کر دو تو مجھے نکاح کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ اوّل یہ کہ مرتے وقت ایمان سلامت لے جاؤں گی یا نہیں؟ لوگوں نے کہا معلوم نہیں۔

آپ نے فرمایا دوسرا یہ کہ میرا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا یا بائیں میں لوگوں نے کہا ہمیں اس کا بھی علم نہیں۔ آپ نے فرمایا تیسرا یہ کہ قیامت کے دن ایک گروہ کو بہشت میں دائیں طرف سے لے جائیں گے اور دوسرے گروہ کو بائیں طرف سے دوزخ میں، تو میں کس جانب ہوں گی؟ لوگوں نے عرض کیا ہمیں علم نہیں۔ فرمایا تو پھر جسے اس قدر غم ہوں وہ عورت شوہر کی خواہش کیسے کر سکتی ہے۔

لوگوں نے آپ سے پوچھا آپ کہاں سے آئی ہیں۔ فرمایا اُس جہاں سے۔ پوچھا کہاں جائیں گی، فرمایا اُسی جہاں میں۔ پھر پوچھا گیا جہان میں آپ کیا کرتی ہیں، بولیں افسوس۔ پوچھا گیا کیوں کر۔ فرمایا اس جہان کی روٹی کھا کر اُس جہان کا کام کرتی ہوں۔ لوگوں نے کہا آپ کی زبان میں عجب مٹھاس ہے آپ مسافر خانہ کی محافظت کے لائق ہیں۔ فرمایا یہی کچھ تو کر رہی ہوں، جو کچھ میرے اندر ہے اُسے باہر کرتی ہوں اور جو باہر ہے اُسے اندر نہیں آنے دیتی۔ چاہے کوئی آئے یا جائے مجھے کچھ غرض نہیں۔ میں دل کو محفوظ رکھتی ہوں نہ کہ مٹی (جسم) کو۔

آپ ہمیشہ روتی رہتی تھیں۔ لوگوں نے پوچھا آپ کیوں اتنا روتی ہیں۔ فرمایا میں نے اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ محبت کی، ڈرتی ہوں کہ مرتے وقت کہیں یہ آواز نہ آ جائے کہ "تو ہمارے لائق نہیں"۔

آپ نے فرمایا صرف زبان سے توبہ کرنا جھوٹوں کا شیوہ ہے۔ اگر خود بخود توبہ کریں تو پھر دوسری توبہ کی حاجت نہیں رہتی۔ فرمایا اگر صابر ہوتا تو کریم ہوتا۔ اور معرفت کے معنی ہیں خدا کی طرف دھیان رکھنا۔ عارف وہ ہے جو اللہ تعالےٰ سے دل طلب کرے۔ جب اللہ تعالےٰ اسے دل دے دے تو وہ اسی کے قبضہ میں رہے تاکہ وہ محفوظ رہے۔ اللہ تعالےٰ

ہی کے پردے میں لوگوں سے حجاب میں رہے۔

آپ نے ایک شخص کو دیکھا جو رو رو کر کہہ رہا تھا ہائے غم ہائے افسوس! آپ نے سن کر فرمایا ایسا نہ کہو، بلکہ کہو ہائے بےغمی ہائے بے افسوسی۔ اس لیے کہ اگر تم اندوہگین اور متاسف ہوتے تو ایسا کہنے کی جرأت ہی نہ کرتے۔

کسی شخص کو آپ نے روپے دیے کہ جا کر کمبل خرید لاؤ۔ اس نے پوچھا سفید کمبل چاہیے کہ سیاہ۔ آپ نے کہا پیسے واپس دے دو۔ اور رقم واپس لے کر دریا میں پھینک دی۔ فرمایا کمبل ابھی خریدا ہی نہیں اور سیاہ و سفید کا جھگڑا پیش ہو گیا۔

بہار کا خوشگوار موسم تھا مگر آپ گھر کے اندر ہی رہا کرتی تھیں باہر نہ آتی تھیں۔ ایک مرتبہ خادمہ نے عرض کیا کہ آپ باہر آ کر صانع حقیقی کی قدرت تو ملاحظہ فرمائیں۔ آپ نے جواب دیا تو ایک مرتبہ اندر آ اور آ کر خود صانع حقیقی کو دیکھ میرا کام صانع کو دیکھنا ہے نہ کہ صنعت کو۔

ایک مرتبہ سات دن رات آپ نے فاقہ کیا، نیند بھی نہ کی۔ ساتویں دن بھوک نے بے حد غلبہ کیا اور آپ بےبس ہو گئیں۔ نفس نے فریاد کی کہ اے رابعہ تو کب تک مجھے تکلیف دے گی۔ اچانک کسی شخص نے آ کر کھانا پیش کیا آپ نے کھانا لے لیا اور چراغ جلانے لگیں۔ اتنے میں بلی آئی اور اس نے کھانا الٹ دیا۔ آپ نے پانی کا کوزہ اٹھایا کہ پانی ہی پی کر روزہ کھول لیں کہ چراغ بجھ گیا۔ آپ نے اندھیرے ہی میں پانی پی کر روزہ افطار کرنا چاہا، مگر اتفاق سے کوزہ بھی گر کر ٹوٹ گیا اور پانی بہ گیا۔ آپ بہت افسردہ ہو گئیں اور مناجات کی کہ الٰہی یہ کیا بھید ہے؟ غیب سے آواز آئی اے رابعہؒ! اگر تو چاہتی ہے کہ دنیا کی نعمتیں تیرے لیے وقف کر دوں تو پھر میں تیرے دل سے اپنا غم واپس لے لوں گا۔ کیونکہ میرا غم اور دنیا کی نعمت ایک ہی دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ اے رابعہؒ! تیری بھی ایک مراد ہے اور میری بھی ایک مراد ہے۔ دونوں مرادیں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔

حضرت رابعہؒ فرماتی ہیں، جب میں نے یہ آواز سنی تو دنیا سے اپنے دل کو بالکل قطع کر لیا اور امیدیں چھوڑ دیں۔ نماز کو میں نے آخری نماز سمجھا، اور دنیا سے یوں علیحدگی اختیار کر لی کہ جب دن ہوتا ہے تو اس خوف سے کہ مبادا لوگ مجھے اپنے ساتھ مشغول نہ کر لیں، دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے ہی ذکر میں مشغول رکھے تاکہ تیرے خیال سے مجھے کوئی روک نہ سکے۔

ایک دفعہ آپ بیمار تھیں۔ حضرت حسن بصریؒ بیمارپرسی کے لیے آئے۔ دیکھا تو دروازہ پر ایک رئیس روپوں کی تھیلی پکڑے کھڑا ہے اور آنسو جاری ہیں۔ خواجہ حسن بصریؒ نے اس سے پوچھا کیا ماجرا ہے؟ اس نے کہا میں اس یکتائے زمانہ (رابعہؒ) کے لیے ایک چیز لایا ہوں، لیکن اس خیال سے رو رہا ہوں کہ شاید وہ لینے سے انکار کر دیں۔ اگر آپ میری سفارش کر دیں تو شاید قبول فرما لیں۔

حضرت حسن بصریؒ اندر داخل ہوئے اور حضرت رابعہؒ کو اس رئیس کا پیغام دیا۔ حضرت رابعہؒ نے سن کر فرمایا جو کوئی اللہ تعالیٰ کو برا کہتا ہے خدا اس کی روزی بند نہیں کرتا اور جس کی زندگی اسی کی محبت کے دم سے ہو اُسے تو وہ بغیر رزق کے ہی زندہ رکھ سکتا ہے۔ جب سے میں نے اُسے دیکھ لیا ہے تمام مخلوق سے منہ پھیر لیا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ جس شخص کو میں جانتی ہی نہیں اس کا مال میں کیسے لے لوں، کیا خبر وہ حلال ہے یا حرام۔

ایک مرتبہ سفیانؒ حضرت رابعہؒ کی بیمار پرسی کو گئے، لیکن حضرت رابعہ کی ہیبت کے باعث کوئی بات نہ کر سکے۔ حضرت رابعہؒ نے خود ہی پوچھا، فرمائیے سفیان نے کہا میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس تکلیف کو آپ سے ہٹا لے۔ حضرت رابعہؒ نے فرمایا تمھیں معلوم نہیں یہ بیماری اسی کے حکم سے ہے۔ سفیان نے کہا آپ ٹھیک فرماتی ہیں حضرت رابعہؒ نے فرمایا پھر میں دوست کی مرضی کے خلاف کیسے درخواست کر سکتی ہوں!

سفیان نے پھر پوچھا کہ آپ کو سب سے زیادہ کس چیز کی خواہش ہے۔ فرمایا: سفیان! تم سمجھدار ہو کر ایسی باتیں کیوں کرتے ہو۔ بارہ سال گزرے کہ مجھے تازہ خرمے کھانے کی خواہش ہے اور تم جانتے ہی ہو کہ خرمے یہاں کتنے سستے ہیں اور بے قدری سے بکتے ہیں، لیکن میں نے ابھی تک نہیں کھائے۔ کیوں کہ میں تو غلام ہوں اور غلام کو خواہش سے کیا مطلب؟ اگر میں کسی چیز کی آرزو کروں اور میرے خدا کو وہ پسند نہ ہو تو یہ کفر ہے۔ سفیان نے عرض کیا میں آپ کے کاموں میں دخل نہیں دے سکتا۔ آپ میرے متعلق کچھ فرمائیں۔ حضرت رابعہؒ نے فرمایا اگر تم دنیا کو دوست نہ رکھتے تو نیک مرد ہوتے۔ سفیان نے پوچھا کیونکر؟ فرمایا آپ کی باتوں کے مطابق۔

یہ سن کر سفیان کو رونا آگیا اور عرض کیا اے اللہ مجھ سے خوش ہو جا۔ حضرت رابعہؒ نے فرمایا تجھے شرم نہیں آتی کہ جس کی تو رضا چاہتا ہے تو خود ہی اس سے راضی نہیں۔

آپ بہت کم گفتگو کیا کرتی تھیں، بیشتر وقت نماز پڑھنے میں گزرتا۔ اگر کوئی بات کرنی بھی ہوتی تو قرآن کی آیات میں اپنا مطلب ادا کرتیں۔ لوگوں نے ایسا کرنے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ انسان جو کچھ بولتا ہے فرشتے اسے لکھتے جاتے ہیں۔ میں قرآن کی آیتوں کے سوا کچھ نہیں بولتی۔ اس لیے کہ میرے منہ سے کوئی بری بات نہ نکلے، جسے وہ لکھ لیں۔ میں آیتیں پڑھتی ہوں اور فرشتے وہی لکھ لیتے ہیں۔

حضرت رابعہؒ کا دل خوف الٰہی سے معمور رہتا تھا اور عذاب جہنم کے خوف سے اکثر اشکبار رہتی تھیں۔ ساتھ ہی انھوں نے ایک نئے مسلک یعنی حُبِ الٰہی کی بنیاد بھی رکھی۔ یعنی خوف جہنم اور طمع جنت سے بے نیاز ہو کر خدا کو صرف اس لیے یاد کیا جائے کہ وہ خدا ہے، اس کی ذات سے بے انتہا اور والہانہ محبت کی جائے۔ یہ محبت کسی دوسرے جذبے کی تابع نہ ہو۔ صرف اللہ ہی کے لیے ہو، اللہ ہی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہو، اس کا مقصد صرف اللہ ہی کی خوشنودی حاصل کرنا ہو اور صرف اسی ذات باری کے جلوے کا دیدار مقصود ہو۔ ذات باری جب عقیدت اور محبت کا سرچشمہ

بن جائے تو پھر کوئی دوسری شے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔

الطبقات الکبریٰ میں لکھا ہے کہ "حضرت رابعہؒ ہر وقت مغموم اور ملول رہا کرتی تھیں۔ ان کی آنکھیں اشکبار رہتی تھیں۔ جب وہ عذاب دوزخ کا ذکر سنتی تھیں تو دیر تک اس کی دہشت سے بے ہوش رہتی تھیں۔ ہوش میں آنے پر لگاتار توبہ کرنے لگتیں۔ ان کی سجدہ گاہ ہمیشہ آنسوؤں سے تر رہتی تھی۔"

حضرت رابعہؒ کے حُب اور حزن میں ربط دیتے ہوئے عبدالرزاق پاشا لکھتے ہیں: حضرت رابعہؒ میں حزن و الم کے جو گہرے نقوش پائے جاتے ہیں: اگر نگاہ تعمق سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا یہ بھی تمام تر حُب کا نتیجہ ہیں جو حضرت رابعہؒ کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے تھی۔ تصوف اسلامی کے ہیکل میں جس ہستی نے سب سے پہلے حُب الٰہی کو ایک مستقل اور محکم مسلک کی صورت میں پیش کیا وہ صرف حضرت رابعہؒ عدویہ ہیں۔ انھوں نے ایسے آثار و نقوش چھوڑے ہیں جو ان کے حزن و الم کی، محبت الٰہی کی صورت میں صحیح تعبیر اور تفسیر کا کام دیتے ہیں۔ سیدہ رابعہ عدویہؒ کا شمار اسلام کے عاشقین اور محزونین میں ہے۔ انھوں نے متصوفانہ ادب کا آغاز کیا اور نظم و نثر کے ایسے موتی بکھیرے جن کی آب و تاب اب تک قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی۔"

حضرت رابعہؒ کے دل پر حُب الٰہی کی جو تجلیاں جلوہ فگن ہوئیں، انھیں حضرت رابعہؒ نے شعروں میں بیان کیا ہے۔ ایک جگہ اپنے نفس کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتی ہیں (ترجمہ):

"اے نفس! تو اللہ سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے، حالانکہ تو اس کی نافرمانی بھی کرتا رہتا ہے۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی عجیب بات ہو سکتی ہے؟

اگر تیری محبت سچی ہے تو اپنے اللہ کی فرمانبرداری کر، کیوں کہ محبت کرنے والا جس سے محبت کرتا ہے اس کی فرمانبرداری اور اطاعت بھی ضرور کرتا ہے۔"

اپنے رب سے مخاطب ہو کر فرماتی ہیں:

"اے میرے اللہ! اگر میں تیری عبادت دوزخ سے ڈر کر کرتی ہوں تو مجھے جہنم میں ڈال دے، اور اگر جنت کے لالچ میں ایسا کرتی ہوں تو تو مجھے جنت سے محروم رکھ۔ اور اگر میں تجھ سے، تیری ذات سے اور صرف تیرے لیے محبت کرتی ہوں تو اے میرے پروردگار! مجھے اپنے جمال ازلی سے محروم نہ رکھیو۔"

اپنے رب سے خطاب کرتی ہیں:

"میں تجھ سے محبت کرتی ہوں، دو طرح کی محبت، ایک محبت ہے آرزو اور تمنا کی، اور دوسری ہے صرف تیری ذات کی۔ میری وہ محبت جو آرزو اور تمنا سے معمور ہے، وہ تو کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن وہ محبت جو صرف تیری ذات سے ہے تو اسی کا واسطہ، تو حجاب کو دور کر دے تا کہ آنکھیں تیرا جلوہ

دیکھ سکیں۔"

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

" رابعہ عدویہؒ نے اپنے اشعار میں غرض اور آرزو کی جس محبت کا ذکر کیا ہے، اس سے مراد ہے اللہ کا احسان اور انعام جو وہ اپنے بندوں پر روا رکھتا ہے ، اور جس حُب ذات یعنی خالص حُب الٰہی کا ذکر کیا ہے، اس سے مراد ہے دیدار الٰہی اور جمال خداوندی کی محبت ، جس کا نظارہ ان کے دل کی آنکھوں نے کیا اور یہی محبت سب سے بہتر اور برتر ہے۔ جمال ربوبیت کی لذت بجائے خود سب سے بڑی چیز ہے۔ اس کے بارے میں حدیث قدسی میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے' میں اپنے نیک اور صالح بندوں کو وہ چیز دیتا ہوں جسے نہ (عام) آنکھیں دیکھ سکتی ہیں، نہ (عام) کان سن سکتے ہیں اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال گزر سکتا ہے۔"[1]

حضرت رابعہؒ نے ۱۸۵ھ میں ۸۸ برس کی عمر میں وفات پائی۔ وفات سے تھوڑی دیر قبل بصرہ کے کچھ لوگ بیمار پرسی کے لیے آئے۔ وہ لوگ دروازہ کے پاس راستہ روک کر کھڑے تھے۔ حضرت رابعہؒ نے ان سے مخاطب ہوکر فرمایا " فرشتوں کے لیے راستہ چھوڑ دو۔" وہ لوگ دروازہ سے باہر ہو گئے اور دروازہ بند کردیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھولا گیا تو حضرت رابعہؒ داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکی تھیں۔

---

[1] احیا علوم الدین۔

حضرت خواجہ حبیب عجمیؒ

وفات ــــــــــــــــ بصرہ ۱۵۶ھ

مشائخ کبار میں حضرت خواجہ حبیب عجمیؒ ریاضات و کرامات کے لحاظ سے بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ سن ولادت کا صحیح علم نہیں۔ سفینۃ الاولیا کے بیان کے مطابق آپ کی وفات ۱۵۶ھ میں ہوئی مگر "تذکرہ" میں محمد سعید لکھتے ہیں کہ آپ کی وفات ۹ رمضان ۱۲۰ھ کو بنی امیہ کے دسویں خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں ہوئی۔ مزار پر انوار بصرہ میں ہے۔

اصل نام حبیب اور ابو محمد کنیت تھی۔ فارس کے رہنے والے تھے۔ شروع میں بہت دولت مند تھے۔ ساہوکار تھے۔ وہاں پر سود لیا کرتے تھے۔ ہر روز قرضداروں کے پاس تقاضا کرنے جاتے اور جس سے جو لینا ہوتا جب تک مل نہ جاتا اسے نہ چھوڑتے۔ اپنی آمد و رفت کا خرچ بھی قرضداروں ہی سے وصول کرتے۔ بالآخر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے دل میں آگ لگا دی اور زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔

واقعہ یوں ہوا کہ ایک روز آپ کسی مقروض کے ہاں تقاضا کرنے گئے۔ مقروض گھر پر نہ تھا صرف اس کی بیوی موجود تھی۔ اس نے کہا میرا خاوند گھر پر نہیں نہ ہی گھر میں کوئی روپیہ ہے جو ادا کر سکوں، ہاں ایک بکری ذبح کی تھی اس کی گردن موجود ہے، آپ چاہیں تو وہی لے جائیں۔ آپ نے کہا وہی دے دو۔ چنانچہ گردن لے کر گھر آئے اور بیوی سے کہا یہ سود میں ملی ہے اسے پکا لو۔ بیوی بولی آٹا اور لکڑی ختم ہے۔ کہنے لگے اچھا میں ابھی جا کر یہ دونوں چیزیں بھی سود میں لاتا ہوں۔ یہ کہہ کر دو قرض داروں کے پاس گئے اور ان سے آٹا اور لکڑی سود میں لے آئے۔ بیوی نے گردن پکائی۔ جب کھانا تیار ہو گیا اور کھانے کے لیے بیٹھے تو باہر سے کسی سوالی نے آواز دی کہ بھوکا ہوں کچھ کھانے کو دیا جائے۔ آپ نے اندر ہی سے جھڑک دیا۔ سائل چلا گیا۔

جب آپ کی بیوی نے سالن میں چمچہ ڈال کر نکالنا چاہا تو دیکھا کہ وہ خون ہی خون ہے۔ بیوی نے حیران ہو کر شوہر کی طرف دیکھا اور کہا کہ اپنی شوخی اور کنجوسی کا نتیجہ دیکھ لو۔ خواجہ حبیب عجمی نے ہنڈیا میں خون دیکھا تو حیران ہو کر رہ گئے۔ دل میں آگ لگ گئی۔ اسی وقت اپنی سابقہ زندگی سے توبہ کی۔ اگلے دن جمعہ تھا، آپ باہر نکلے تاکہ باری باری سے سب قرض داروں کے پاس جا کر انھیں سود معاف کر دیں۔ راستہ میں بچے کھیل رہے تھے، انھوں نے خواجہ صاحب کو دیکھ کر چلانا شروع کیا "ہٹ جاؤ حبیب سود خوار آ رہا ہے۔ ہم پر اس کی گرد پڑ گئی تو ہم بھی ایسے ہی ہو جائیں گے۔"

یہ سُن کر آپ کے دل پر زبردست چوٹ لگی اور اپنا ارادہ ترک کر کے سیدھے خواجہ حسن بصریؒ کی خدمت با برکت میں حاضر ہوئے۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے انھیں نصیحتیں کیں اور توبہ کرائی۔ پھر آپ باہر تشریف لے گئے اور اعلان کر دیا کہ جس کسی کے ذمے میرا کچھ نکلتا ہو وہ آئے اور مجھ سے اپنی دستاویز لے جائے۔ چنانچہ قرضدار آئے اور آپ سے اپنی اپنی دستاویز لے گئے۔ سب مال و اسباب جو آپ کے پاس جمع تھا راہ خدا میں لٹا دیا۔ اب یہ عالم تھا کہ دن میں خواجہ حسن بصریؒ کی مجلس میں تشریف لے جاتے ان سے علم سیکھتے اور معرفت الٰہی کے رموز سے آگہی حاصل کرتے۔ رات کو علیحدگی میں بیٹھ کر عبادت الٰہی کرتے۔

اخبار الصالحین میں اس انقلابی واقعہ کی تفصیل مندرجہ بالا واقعہ سے قدرے مختلف بیان کی گئی ہے۔ لکھا ہے امام ذہبی فرماتے ہیں: حبیب بن محمد بن العجمی سوداگر تھے اور دراہم کا بیوپار کیا کرتے تھے۔ ایک دن چند لڑکوں کے پاس سے جو کھیل رہے تھے آپ کا گزر ہوا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ دیکھو یہ سود خوار آگیا۔ یہ سُن کر آپ نے سر جھکا لیا اور کہا کہ اے رب بچوں تک پر تو نے میرا حال ظاہر کر دیا۔ جب گھر پہنچے تو ایک صوف کا کرتہ پہن لیا اور تمام مال و اسباب سامنے رکھ کر دعا کی کہ اے پروردگار میں اس مال کے عوض تجھ سے اپنا نفس خریدنا چاہتا ہوں مجھے آزاد فرما دے۔ جب دوسرا دن ہوا تو اپنا تمام مال راہِ خدا میں خیرات کر دیا اور عبادت الٰہی میں مصروف ہوئے اور صائم الدہر اور قائم اللیل رہنے لگے اور ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہتے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ پھر ان لڑکوں کے پاس سے گزر ہوا تو لڑکوں نے آپس میں کہا خاموش رہو حبیب العابد جاتے ہیں۔ یہ سُن کر آپ رونے لگے اور کہا اے اللہ یہ سب تیری طرف سے ہے۔ مرآۃ الاسرار میں بحوالہ تذکرۃ الاولیا مذکور ہے کہ ابتدائے زمانہ میں آپ بہت ہی مرفع الحال تھے اور سود بھی لیا کرتے تھے۔ جب حسن بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو تمام منہیات سے توبہ کی۔ جو کچھ اندوختہ تھا سب راہِ خدا میں صرف کر دیا اور دریائے فرات کے کنارے ایک مکان بنا کر عبادت میں مشغول ہوئے۔ دن کو خواجہ حسن سے علم حاصل کرتے اور رات کو عبادت کرتے۔

جب اس طرح عبادت کرتے ایک مدت گزر گئی تو ایک دن بیوی نے شکایت کی کہ خرچ نہیں ہے ضروریات کیسے پوری کی جائیں۔ آپ نے فرمایا میں کام پر جاتا ہوں مزدوری سے جو ملے گا لے آؤں گا۔ چنانچہ آپ دن بھر گھر سے باہر رہ کر عبادت کرتے، شام کو واپس گھر جاتے۔ جب بیوی انھیں خالی ہاتھ دیکھتی تو کہتی یہ کیا معاملہ ہے۔ آپ فرماتے میں کام کر رہا ہوں جس کا کام کر رہا ہوں وہ بڑا سخی ہے کہتا ہے وقت آنے پر خود ہی اجرت دے دیا کروں گا فکر نہ کرو۔ لہذا مجھے اس سے مانگتے شرم آتی ہے۔ وہ کہتا ہے ہر دسویں روز میں مزدوری دیا کروں گا۔ چنانچہ بیوی نے دس دن تک صبر کیا۔

دسویں روز بھی شام کو جب خالی ہاتھ واپس آنے لگے تو راستے میں سوچ رہے تھے اب بیوی کو کیا جواب دوں گا۔ بہرحال گھر پہنچے تو دیکھا کہ عمدہ عمدہ کھانے تیار رکھے ہیں۔ بیوی آپ کو دیکھتے ہی بول اٹھیں یہ کس نیک بخت کا کام کر رہے ہو جس نے دس دن کی اجرت اس قسم کی بھیجی اور تین ہزار درہم نقد بھی بھیجے ہیں، یہ بھی کہلا بھیجا ہے کہ کام زیادہ محنت سے کرو گے تو

اُجر۔۔ زیادہ دوں گا۔

یہ ماجرا دیکھ کر آپ کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ خیال کیا کہ خدائے پاک نے ایک گنہگار بندے کی دس روز کی عبادت کا یہ صلہ دیا، اگر زیادہ حضورِ قلب سے عبادت کروں تو نہ جانے کیا کچھ دے ۔ یہ سوچ کر علائق دنیا سے بالکل الگ ہوگئے اور ایسی ایسی عبادتیں اور ریاضتیں شروع کر دیں کہ اسرارِ الٰہی بے نقاب ہونے لگے۔ عنایاتِ الٰہی کا نزول شروع ہوگیا اور مستجاب الدعوات کا درجہ مل گیا۔

ایک دن خواجہ حسن بصریؒ آپ کے مکان پر تشریف لائے۔ خواجہ حبیب چونکہ عجمی تھے اس لیے عربی صحیح طور پر نہ بول سکتے تھے اور نماز میں الحمد کو الھمد تلفظ کرتے تھے۔ خواجہ حسن بصریؒ نے فرمایا تمھارے پیچھے نماز پڑھنی درست نہیں اور الگ ہوکر نماز ادا کی۔ مرأۃ الاسرار میں لکھا ہے کہ رات کو خواجہ حسن بصریؒ نے خواب دیکھا اور پوچھا اے اللہ تیری رضا کیا ہے۔ جواب ملا اے حسن، میری رضا حبیب کے پیچھے نماز پڑھنے میں تھی، مگر تم نے نہیں پڑھی۔

جب حبیب عجمی کے سامنے قرآن پڑھا جاتا تو آپ بہت روتے۔ کسی نے کہا تم سمجھتے تو ہو نہیں، روتے کیوں ہو۔ فرمایا میری زبان گو عجمی ہے مگر دل عربی ہے۔

ایک روز خواجہ حسن بصریؒ حجاج کے آدمیوں سے چھپ کر آپ کے ہاں آگئے۔ وہ لوگ وہاں بھی پہنچ گئے اور مکان میں داخل ہوکر آپ کو تلاش کیا مگر آپ نہ ملے۔ جب وہ مایوس ہوکر واپس چلے گئے، تو حضرت حسن بصریؒ نے آپ سے پوچھا تم نے کیا کیا کہ ان لوگوں کی نظر مجھ پر نہ پڑی۔ آپ نے فرمایا میں نے دس بار آیۃ الکرسی، دس بار آمن الرسول اور دس بار قل ھو اللہ احد پڑھ کر اللہ سے دعا کی تھی کہ میں نے حسن کو تیرے سپرد کیا اس کی حفاظت فرما۔

ایک روز حضرت امام حنبلؒ اور امام شافعیؒ بیٹھے تھے۔ حبیب عجمیؒ وہاں سے گزرے۔ امام حنبلؒ نے کہا ہم آج ان سے ایک سوال کریں گے چنانچہ جب آپ قریب آئے تو انھوں نے پوچھا آپ ایسے شخص کے متعلق کیا کہتے ہیں جس کی پانچ نمازوں میں سے ایک نماز قضا ہوگئی ہو اور اسے یاد نہ ہو کہ وہ کون سی نماز تھی، اسے کیا کرنا چاہیے۔

آپ نے فرمایا ایسے شخص کا دل خدا سے غافل ہے، اسے ادب کرنا چاہیے اور پانچوں وقت کی نمازیں قضا سمجھ کر ادا کرنی چاہئیں۔ امام حنبلؒ یہ جواب سُن کر حیران رہ گئے۔

آپ کی کرامات کا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک عورت آئی کہنے لگی میرا بیٹا عرصہ سے گم ہے میں اسے تلاش کرتے کرتے نڈھال ہوگئی ہوں، دعا کیجیے کہ اللہ تعالٰے مجھے اپنے بیٹے سے ملا دے۔ آپ نے پوچھا تیرے پاس کچھ ہے؟ اس نے دو درم پیش کیے کہ میرے پاس یہی کچھ ہے۔ آپ نے دونوں درم محتاجوں کو دے دیے اور فرمایا گھر واپس جا تیرا لڑکا تجھے مل جائے گا۔

وہ واپس گئی تو دیکھا لڑکا موجود تھا۔ پوچھا کیسے یہاں پہنچے۔ کہنے لگا میں کرمان میں تھا، استاد نے مجھے کچھ چیزیں خریدنے

کے لیے بازار بھیجا۔ میں سودا خرید کر واپس آ رہا تھا کہ ہوا کے جھونکے نے مجھے اونچا اڑا لیا۔ میں نے آواز سنی کوئی کہہ رہا تھا اے ہوا اسے گھر پہنچا دے۔

یہ حضرت حبیبؒ کی دعا اور دو درم کے صدقہ کا نتیجہ تھا۔

ایک مرتبہ سخت قحط پڑا۔ آپ نے بہت سا سامانِ خورد و نوش قرض خرید کر لوگوں میں تقسیم کیا اور کپڑے کی ایک تھیلی سی کر سرہانے رکھ لی، کوئی بھی قرض مانگنے آتا آپ تھیلی میں ہاتھ ڈالتے اور دام نکال کر اسے دے دیتے۔ یہ غیبی مدد تھی۔

آپ کا گھر بصرہ شہر کے عین چوراہے پر تھا۔ آپ کے پاس صرف ایک ہی پوستین تھی جو پہنا کرتے تھے۔ ایک روز پوستین اتار کر چوراہے میں ایک جگہ رکھ دی اور کچھ فاصلے پر وضو کرنے کے لیے چلے گئے۔ حضرت حسن بصریؒ کا گزر وہاں سے ہوا تو پوستین دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ حبیبؒ کی ہے، چنانچہ کھڑے ہو کر نگرانی کرنے لگے۔ جب حضرت حبیبؒ واپس آئے تو حسن بصریؒ نے ان سے پوچھا یہ پوستین یہاں کس کے بھروسہ پر چھوڑ گئے تھے۔ آپ نے جواب دیا جس نے آپ کو اس کی نگرانی کے لیے مقرر کیا، اسی کے بھروسا پر چھوڑ گیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ خواجہ حسن بصریؒ آپ کے ہاں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ دروازے پر ایک سوالی آ گیا۔ حضرت حبیبؒ نے خواجہ حسنؒ کے سامنے سے سارا کھانا اٹھا کر سوالی کو دے دیا۔ حضرت حسنؒ نے فرمایا آپ بھی عجب آدمی ہیں مہمان کے آداب کا خیال نہیں کرتے۔ دینا ہی تھا تو کھانے سے کچھ اٹھا کر دے دیتے اور کچھ رہنے دیتے۔ آپ خاموش رہے اور کچھ جواب نہ دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک شخص قسم قسم کے کھانے اور پانچ سو درم لے کر آ گیا۔ آپ نے درم اسی وقت محتاجوں میں تقسیم کر دیے اور کھانا حضرت حسنؒ کے سامنے رکھ دیا اور دونوں نے مل کر کھایا۔ پھر خواجہ حسن سے مخاطب ہو کر فرمایا علم کے ساتھ یقین بھی ضروری ہے، آپ کو یقین بھی ہوتا تو بہتر تھا۔

ایک مرتبہ آپ تنہائی میں کہہ رہے تھے "اے اللہ جو تجھ سے خوش نہیں اُسے خوشی نصیب نہ ہو اور جسے تجھ سے انس نہیں اُسے کسی سے بھی انس نہ ہو" لوگوں نے عرض کیا آپ دنیاوی معاملات سے الگ تھلگ ہو کر گوشہ میں بیٹھ گئے ہیں، بتائیں رضا کس چیز میں ہے۔ فرمایا جس دل میں نفاق کا غبار نہ ہو رضا اسی دل میں ہے۔

ایک مرتبہ ایک قاتل کو پھانسی دی گئی۔ رات کو لوگوں نے اس شخص کو خواب میں دیکھا کہ پر تکلف لباس پہنے بہشت کے باغوں میں ٹہل رہا ہے۔ سوال کیا گیا تو تو قاتل تھا پھر یہاں کیسے پہنچا۔ اس نے جواب دیا جب مجھے پھانسی دی جا رہی تھی حضرت حبیب عجمی کا ادھر سے گزر ہوا انھوں نے میری طرف توجہ کی اور دعا مانگی۔ یہ اسی کا اثر اور نتیجہ ہے۔

ایک درویش نے آپ سے پوچھا کہ آپ تو عجمی ہیں اس بڑے درجہ کو کیونکر پہنچ گئے۔ غیب سے آواز آئی، ہاں عجمی ہے مگر حبیب ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے ہاتھ سے سوئی گر پڑی، گھر میں اندھیرا تھا مگر خدا کی قدرت سے روشن ہو گیا۔ آپ نے فوراً آنکھیں بند کر لیں اور فرمایا نہیں نہیں میں چراغ کے بغیر سوئی کو نہیں ڈھونڈنا چاہتا۔

خواجہ خواجگان حضرت داؤد طائیؒ جن کا مزار پُر انوار بغداد میں ہے۔ حضرت خواجہ حبیب عجمیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ انھوں نے ۱۶۲ھ[1] میں تیسرے عباسی خلیفہ مہدی بن منصور کے عہد میں وفات پائی۔ خواجہ داؤد طائی بھی بہت بڑے اولیاء اللہ تھے۔ ورع و پرہیزگاری میں درجۂ کامل اور انواع علوم میں بہرۂ وافی رکھتے تھے۔ امام اعظمؒ کی صحبت میں رہے۔ بیس سال تک ان کی شاگردی میں رہ کر علم فقہ میں کمال حاصل کیا اور ایسے درجہ کو پہنچے کہ امام صاحب کے اصحاب کرام میں کسی کو آپ پر تقدم حاصل نہ ہوا۔ آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ مجھے زیر دیوار دفن کرنا تاکہ کوئی میرے منہ کے سامنے سے نہ گزرے۔ چنانچہ آپ زیر دیوار مدفون ہوئے۔ اور آج تک آپ کی قبر مبارک اسی حالت میں ہے۔

آپ اکابرین طائفہ و عظمائے اولیا و کبرائے فقہا میں سے تھے۔ جب کبھی دوسرے بزرگان کرام کو کسی مسئلہ میں باہم اختلاف ہوتا تو وہ آپ ہی کو منصف مقرر کرتے تھے۔ آپ کا قول ہے کہ مرید کی علامت یہ ہے کہ دنیا سے اسے کوئی لگاؤ نہ ہو اور اس کے جتنے دوست آشنا دنیا کی طرف مائل ہوں ان سب کو ترک کر دے۔ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی بیمار پرسی کے لیے بھی نہ جائے۔

---

[1] سن وفات میں اختلاف ہے۔ بعض ۱۶۵ھ بیان کرتے ہیں مگر ۱۶۲ھ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

حضرت خواجہ عبدالواحد بن زیدؒ

وفات ——————— بصرہ ۱۷۶ھ

شیخ المشائخ حضرت خواجہ عبدالواحد بن زید ان اولیائے کرام میں سے ہیں جنھوں نے خواجہ حسن بصریؒ سے علوم باطنی میں کمال حاصل کیا اور انھیں سے خرقۂ خلافت پایا۔ ریاضت و مجاہدہ اور ذوقِ عشق میں یکتائے زمانہ تھے۔ حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ کے شاگرد تھے۔

آپ صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ ابتدا میں بڑے صاحب ثروت تھے مگر اس زمانے میں بھی بزرگانِ دین اور مردانِ خدا کی زیارت کا بہت شوق رکھتے تھے۔ اکثر دور دراز کا سفر کر کے ان کی ملاقات کیا کرتے تھے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ آپ نے ترک و تجرید اختیار کر لیا۔ اس ضمن میں ایک واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ آپ نے خدمت کے لیے ایک غلام خریدا۔ ایک رات آپ کو اس کی ضرورت پڑی، تلاش کیا تو لڑکا گھر میں موجود نہ پایا۔ دروازے اندر سے بند تھے۔ آپ حیران تھے کہ لڑکا باہر کیسے چلا گیا۔ جب صبح ہوئی تو لڑکا خود بخود آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ایک دینار پیش کیا جس پر بادشاہی مہر کی بجائے سورۂ اخلاص نقش تھی۔ آپ نے پوچھا یہ سکہ کہاں سے ملا۔ غلام نے جواب دیا اگر آپ رات کو مجھے تلاش نہ کیا کریں تو میں ہر صبح آپ کی خدمت میں اس طرح کا سکہ پیش کیا کروں گا۔ آپ نے منظور کر لیا اور اسی طرح کئی دن گزر گئے۔

ایک روز کچھ پڑوسی آپ کے پاس آئے اور کہا آپ کا یہ غلام مشتبہ اور مشکوک ہے۔ آپ نے فرمایا اچھا میں اس بات کی تحقیق کروں گا۔ چنانچہ آپ اس کی نگرانی کرنے لگے۔ جب رات ہوئی تو وہ غلام اٹھا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ دروازہ خود بخود کھل گیا، پھر اشارہ کیا تو وہ بند ہو گیا۔ دوسرے دن پھر ایسا ہی ہوا۔ آخر ایک دن ایسے موقع پر آپ غلام کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے غلام ایک صاف زمین پر پہنچا، وہاں پہنچ کر اس نے اپنے کپڑے اتار دیے اور بوریا پہن لیا، پھر صبح تک نماز پڑھتا رہا۔ جب صبح ہوئی تو اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ اے میرے بڑے مالک میرے چھوٹے مالک کی اجرت مجھے عطا کر۔ معاً ایک سکہ آسمان سے گرا اور اس نے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا، پھر حضرت زیدؒ کی نظر سے غائب ہو گیا۔

آپ یہ معاملہ دیکھ کر سخت متحیر ہوئے اور غلام کے متعلق اپنی بدگمانی پر متاسف۔ چنانچہ آپ نے اسی جگہ دو رکعت نماز ادا کی اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی۔ ابھی آپ اسی جگہ پر تھے کہ معاً ایک سوار فرشِ اشہب پر بیٹھا نظر آیا۔ سوار نے پوچھا

تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ آپ نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ سوار نے پوچھا تمھیں معلوم ہے اس مقام اور تمھارے گھر کے درمیان کتنا فاصلہ ہے۔ فرمایا مجھے علم نہیں۔ سوار نے کہا اس زمین اور تمھارے شہر کے درمیان تیز سوار کے لیے دو برس کا راستہ ہے۔ تم یہاں سے کہیں نہ جاؤ، رات کو تمھارا غلام آئے گا۔

جب کچھ رات گزر گئی تو غلام آگیا، اس کے پاس طرح طرح کے کھانے تھے۔ اس نے آپ کو کھلایا اور عرض کیا میرے سردار آئندہ آپ ایسا نہ کریں اس کے بعد اس نے نماز ادا کی اور صبح تک نماز پڑھتا رہا۔ صبح ہوئی تو آپ کا ہاتھ پکڑا، کچھ باتیں کیں جو آپ نہ سمجھ سکے۔ پھر آپ کے ساتھ چند قدم گیا۔ دفعتہً آپ نے دیکھا کہ گھر کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ غلام نے کہا میرے سردار کیا آپ نے مجھے آزاد کرنے کی نیت نہیں کی۔ اب مجھے آزاد کر دیں۔ آپ نے اسی وقت اسے آزاد کر دیا۔ غلام نے ایک پتھر اٹھا کر آپ کو دیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ آپ نے دیکھا تو وہ پتھر نہ تھا بلکہ سونے کی ڈلی تھی۔ چنانچہ اس واقعہ سے آپ اس قدر متاثر ہوئے کہ سارے دھندے چھوڑ کر تارک دنیا ہو گئے۔ خواجہ حسن بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی صحبت کیمیا اثر سے مستفیض ہونے لگے۔ تمام مال و اسباب خدا کی راہ میں لٹا دیا، اور تجرید و تفرید کے درجہ کمال کو پہنچے۔

کہا جاتا ہے کہ آپ چالیس سال تک ریاضت و مجاہدہ کرتے رہے اور اس سارے عرصہ میں فجر کی نماز عشا کے وضو سے ادا فرمائی۔ جب سے اپنا مال و دولت راہ خدا میں لٹایا تھا کبھی اس مال کی طرف دوبارہ رغبت نہ ہوئی۔ آپ کا ارشاد تھا کہ درویش وہ ہے جو خالی جیب، خالی ہاتھ اور خالی پیٹ رہے۔ ایسا نہ ہو تو وہ درویش نہیں بلکہ کم ہمت شخص ہے۔ اہل دنیا کے ساتھ آپ نے بالکل قطع تعلق کر رکھا تھا، کسی کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے نہ تھے، مگر آنے والے کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے۔ عجز و انکسار کا یہ حال تھا کہ اپنے آپ کو ہر کسی سے کمتر جانتے تھے۔ سلام میں ہمیشہ سبقت کرتے۔ اکثر وقت رونے میں بسر ہوتا اور ذکر الٰہی میں لگے رہتے۔ آپ دعا میں فرمایا کرتے تھے۔ الٰہی مجھے ایسے اعضاء دے جو تیری عبادت کے لیے بہت قوی ہوں اور ایسے جوارح چاہتا ہوں جو تیری اطاعت کی طرف مدد کریں اور مجھے ایسی ہمت دے جو تیری محبت سے متعلق ہو۔

آپ کے متعلق ایک حکایت بیان کی جاتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ کسی جہاد کے لیے روانہ ہوئے۔ کچھ مرید ساتھ تھے۔ ان میں سے ایک نے قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی:

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

ایک پندرہ سالہ لڑکا بھی پاس کھڑا تھا اس نے یہ آیت سن کر کہا عبدالواحد کیا خدا کا یہ ارشاد صحیح ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں صحیح ہے۔ لڑکے نے کہا اچھا گواہ رہنا۔ میں اپنی ذات اور اپنا سب مال و اسباب جنت کے لیے فروخت کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ سے بیعت کی اور سارا مال راہ خدا میں دے دیا صرف ایک گھوڑا اور سلاح رکھ لیا اور جہاد کے لیے

روانہ ہوا۔ وہ دن کو روزہ رکھتا اور رات کو نمازیں پڑھتا۔ راستہ میں ایک جگہ اس نے خواب دیکھا اور چونک اٹھا۔ معلوم ہوا چونکہ اس کی نیت خالص تھی اس لیے اس کا سودا قبول ہوگیا اور اسے جنت کی بشارت مل گئی۔ لڑکے نے اپنا خواب بیان کرنے کے بعد جونہی اسے ختم کیا، دشمن کی فوج سامنے نظر آئی۔ لڑکا ان سے جنگ کرنے لگا۔ نو دشمنوں کو مار کر خود شہید ہوگیا۔

حضرت عبدالواحد فرماتے ہیں جب میں اس کی لاش پر پہنچا تو وہ تڑپ رہا تھا، مگر خوشی سے قہقہے لگا رہا تھا یہاں تک کہ اسی حالت میں اس کی روح تن سے نکل گئی۔

ایک روز آپ کہیں جا رہے تھے راستہ میں ایک بیمار بوڑھا نظر آیا جو دھوپ میں پڑا تھا اور ضعف و بیماری کے باعث ہل جل نہ سکتا تھا۔ آپ کو اس پر رحم آیا، دعا کی، ابر کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا اور بوڑھے کو اپنے سایے میں ڈھانپ لیا۔ بوڑھے نے آپ کی یہ کرامت دیکھی تو نہایت عاجزی سے عرض کیا آپ مستجاب الدعوات ہیں، میرے لیے دعا کریں کہ اللہ مجھے شفا عنایت فرمائے۔ آپ نے دعا کی، بوڑھا اسی وقت تندرست ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

آخری عمر میں آپ بہت بیمار ہو گئے۔ اٹھنے بیٹھنے کی طاقت نہ رہی۔ ایک دن نماز کا وقت آیا تو کوئی خادم موجود نہ تھا کہ وضو کراتا، آپ نے اپنے حق میں آپ دعا کی، فوراً صحت یاب ہو گئے، وضو کیا اور نماز ادا کی۔ فارغ ہو کر جب بستر پر دراز ہوئے تو بیماری نے پہلے کی طرح پھر غلبہ پا لیا۔ پھر اسی بیماری سے ۱۷۷ھ میں وفات پائی۔ مزار پُر انوار بصرہ میں ہے۔

آپ کے بعض ارشادات یہ ہیں[1]:

مومن کی مثال اس بچہ کی سی ہے جو رحم میں ہو اور وہ باہر نکلنا نہیں چاہتا، جب نکل آئے تو پھر واپس رحم میں نہیں جا سکتا۔ دنیا سے نکلتے وقت مومن کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔

فرماتے ہیں بندہ کی سب سے عمدہ حالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ موافقت کرے اور راضی برضا رہے۔ پس اگر اللہ تعالیٰ اسے اطاعت کے لیے دنیا میں باقی رکھنا چاہے تو وہ اسی پر راضی رہے گا اور اگر دنیا سے اٹھا لے تب بھی خوش رہے گا۔

فرماتے ہیں جس بندہ کو دنیا میں سے کچھ عطا ہو پھر وہ کسی اور چیز کی خواہش کرے تو اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ کی خلوت کا لطف اس سے سلب کر لیتا ہے اور قرب کو دوری اور انس کو وحشت سے بدل دیتا ہے۔

---

[1] یہ ارشادات امام شعرانی نے اپنی کتاب طبقات الکبریٰ میں جمع کیے ہیں۔

حضرت خواجہ حذیفہ مرعشیؒ

وفات ـــــــــــــــــــ ۲۰۲ھ

امام الفقراء، پیشوائے اولیا حضرت خواجہ حذیفۃ المرعشی رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ کے بہت بڑے واقف اسرار اور صاحب کمال تھے۔ زہد اور ورع و تجرید میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ خرقہ ارادت و خلافت خواجہ ابراہیم بن ادھمؒ سے حاصل کیا تھا۔ اس عہد کے تمام بڑے بڑے بزرگ اور صاحب کمال آپ کی مجلس میں کسب فیض کے لیے آیا کرتے تھے۔

نواح شام میں مرعش نام ایک مقام کے رہنے والے تھے۔ آپ نے حضرت خواجہ فضیل بن عیاضؒ اور خواجہ بایزید بسطامیؒ کو بھی دیکھا تھا۔ آپ کے مریدوں کا طریقہ محض تجرد ظاہر و باطن تھا اور سفر و حضر میں ذکر جلی کیا کرتے تھے ـــ بے طلب جو کچھ مل جاتا اسی پر اکتفا کر لیا کرتے تھے۔

سات سال کی عمر میں آپ نے قرآن کریم حفظ کر لیا تھا۔ اور بہت عمدہ قرأت کرتے تھے۔ ایک دن رات میں قرآن ختم کر لیتے تھے۔ آپ نے حضرت خواجہ ابراہیم بن ادھمؒ کی خدمت کیمیا اثر میں حاضر ہو کر قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔ پیر و مرشد نے آپ کو گلے لگا کر فرمایا حذیفہ! اطمینان رکھو، تم عنقریب اپنے مقصد اور اونچے درجہ کو پہنچو گے۔ پھر پیر و مرشد نے آپ کو بیعت کیا۔

حضرت حذیفہ قریباً چھ ماہ تک پیر و مرشد کی خدمت میں رہے اور گوشہ نشین ہو کر عبادت الٰہی کیا کرتے تھے۔ پیر و مرشد آپ کی ریاضت شاقہ دیکھ کر فرماتے تھے، سلوک کے راستہ کے لیے جس بات کی ضرورت ہے وہ تم میں موجود ہے۔ چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں آپ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کی توجہ اور التفات سے کاملیت کے درجہ کو پہنچ گئے۔

اس کے بعد کئی سال تک سفر و حضر میں پیر و مرشد کا ساتھ دیا۔ کہا جاتا ہے جب حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کے آخری دن آئے، تو آپ نے حضرت حذیفہؒ کو بلا کر خرقہ خلافت عطا فرمایا اور اپنی جانشینی کا شرف بخشا، پھر ہدایت فرمائی کہ خلق خدا کی رہنمائی میں لگ جاؤ۔

پیر و مرشد نے فرمایا اے حذیفہ! دنیا کی طرف ہرگز توجہ نہ دینا اور ہمیشہ اپنے پیران طریقت کے راستے پر چلنا۔ فرمایا یاد رکھنا دنیا درویشوں کی رہزن ہے۔

لہ سن وفات میں اختلاف ہے۔ اخبار الصالحین میں ۱۴ شوال ۲۰۲ھ مذکور ہے۔ بعض نے ۲۰۷ھ بتایا ہے۔ "تذکرہ" میں خلیفہ محمد سعید نے ۱۴ شوال ۲۵۲ھ تحریر کیا ہے

کہا جاتا ہے جب حضرت حذیفہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر حاضر ہوئے تو حضورؐ نے انھیں اپنے دیدار سے مشرف فرمایا۔ حضرت حذیفہ نے رو کر عرض کیا، یا رسول اللہؐ! مجھے ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے کہ اللہ کے قہر کا نشانہ نہ بن جاؤں ارشاد ہوا "حذیفہ! ہمت نہ ہار۔ تو میرے ہمراہ جنت میں جائے گا۔ اور جو شخص تجھے اپنا رہبر بنائے گا وہ بھی جنت میں جائیگا۔

حضرت حذیفہ کو تنہائی پسند تھی۔ فقرا کی دوستی بھی عزیز تھی۔ ان کی صحبت میں رہ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ اہل دنیا اور ان کی محبت سے اجتناب کرتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "صحبت اپنا اثر ضرور کرتی ہے خواہ ایک ساعت کی صحبت کیوں نہ ہو۔

آپ ہمیشہ باوضو رہا کرتے تھے اور ہمیشہ روزہ رکھتے۔ ٹاٹ کا لباس پہنتے اور ہر وقت آنکھیں اشکبار رہتیں۔ ایک دفعہ کسی نے پوچھا آپ ہمیشہ روتے رہتے ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّۃِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ (ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک دوزخ میں) مجھے نہیں معلوم کہ میں کس گروہ میں ہوں۔

اس نے کہا اگر آپ کو یہ نہیں معلوم کہ آپ کس گروہ یا فرقہ سے ہیں تو پھر آپ لوگوں سے بیعت کیوں لیتے ہیں؟ دوسروں کی راہ بھی مارتے ہیں۔ یہ سنتے ہی چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ جب ہوش میں آئے تو غیبی آواز سنی کوئی کہہ رہا تھا "اے حذیفہ! میں تجھے دوست رکھتا ہوں اور میں نے تجھے برگزیدہ کیا ہے، تو میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنت میں جائے گا" یہ آواز دوسرے لوگوں نے بھی سُنی۔ کہا جاتا ہے کہ اس آواز کو سُن کر تین سو کے قریب آدمی راجع الی الحق ہوئے[1]

آپ کا ارشاد ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ آدمی کے ظاہر اور باطن کے افعال یکساں ہوں۔ فرمایا اگر تجھے اس کا خوف نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ تیرے بہترین اعمال پر تجھے عذاب دے گا تو تو ہلاک ہونے والا ہے۔ یعنی جن اعمال کو تو بہترین سمجھتا ہے درحقیقت وہ ایسے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ معاف نہ کرے تو تجھے ان پر سخت عذاب دیا جائے۔

آپ فرماتے ہیں کہ اچھے اعمال میں سے مجھے کوئی چیز گھر میں بیٹھنے سے افضل معلوم نہیں ہوئی اور اگر میرے پاس کوئی تدبیر ایسی ہوتی کہ فرائض کے لیے باہر نکلنے کی ضرورت نہ ہوتی تو میں ضرور اس پر عمل کرتا۔

آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ اخبار الصالحین میں لکھا ہے "مرأۃ الاسرار و سفینۃ الاولیا میں آپ کے وفات کی تاریخ درج ہے مگر سن نہیں ہے۔ اور طبقات الکبریٰ میں سن درج ہے تاریخ نہیں ہے۔ ان دونوں کو ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی وفات چودھویں شوال ۲۰۲ھ میں ہوئی۔ مؤلف ہذا کی نظر میں ایک کتاب میں ۲۵ شوال ۲۰۲ھ بھی گزری ہے، مگر اول الذکر زیادہ معتبر ہے۔

---

[1] "تذکرہ" از خلیفہ محمد سعید۔

حضرت ذُوالنّون مصریؒ

وفات ———————— مصر ۲۴۵ھ[1]

آپ کی ذات بابرکات پیشوائے اہلِ ہدایت تھی۔ درویش کامل اور ریاضات وکرامات کے عامل تھے۔ اہلِ مصر آپ کو زندیق کے لقب سے پکارتے تھے اگر بعض لوگ آپ کی کرامات پر متحیر بھی ہوا کرتے تھے۔ چونکہ آپ نے اپنے آپ کو خلقت سے دُور رکھنے میں سعیِ بلیغ سے کام لیا۔ اس لیے جب تک زندہ رہے لوگ آپ کے منکر رہے اور جب تک وفات نہ پا گئے کوئی شخص آپ کے حالات سے واقف نہ ہو سکا۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں نے تیس سال تک لوگوں کو دعوتِ حق دی۔ مگر اس عرصہ میں بس ایک شخص جیسا کہ چاہیے ملا، وہ ایک شہزادہ تھا، جو شان وشوکت کے ساتھ میری مسجد کے نزدیک سے گزرا۔ میں اس وقت یہ کہہ رہا تھا کہ اس کمزور آدمی سے بڑھ کر اور کوئی شخص احمق نہیں ہے جو ایک طاقتور کے ساتھ لڑتا ہے۔ یہ بات سُن کر شہزادہ مسجد کے اندر آگیا اور پوچھنے لگا۔

"اس کا مطلب کیا ہے؟"

میں نے کہا "انسان محض ایک کمزور ہستی ہے جو خدائے بزرگ و برتر کے ساتھ برسرِجنگ ہے۔"

ان الفاظ کے سنتے ہی شہزادے کا رنگ فق ہو گیا اور مسجد سے نکل کر چلا گیا۔ دوسرے دن وہ پھر آیا اور مجھ سے خدا کا راستہ پوچھا۔ میں نے کہا "ایک راستہ لمبا ہے اور ایک چھوٹا۔ اگر چھوٹے راستے سے جانا چاہتے ہو تو دنیا ترک کر دو، گناہ چھوڑ دو اور خواہشاتِ نفسانی کو ترک کر دو۔ اگر لمبے راستے سے خدا تک پہنچنا چاہتے ہو تو سوائے ذاتِ باری تعالیٰ کے اور سب کچھ ترک کر دو۔"

شہزادے نے کہا "لمبا اور طویل راستہ اختیار کرتا ہوں۔"

دوسرے دن وہ پشمینہ پہن کر آیا اور ریاضت میں مشغول ہو گیا اور آخرکار ابدال کے مرتبے کو پہنچا۔

ایک دفعہ ایک آدمی نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میں مقروض ہوں اور میرے پاس کچھ نہیں کہ میں قرض ادا کر سکوں۔ آپ نے ایک پتھر اُٹھا کر اس کو دے دیا۔ جس کو وہ آدمی بازار میں لے گیا۔ قدرتِ الٰہی سے وہ پتھر زمرد بن گیا تھا، جس کو چار سو درم کے عوض اُس نے فروخت کر کے اپنا قرض ادا کیا۔

روایت ہے کہ ایک نوجوان کو جو صوفیائے کرام کا منکر تھا۔ آپ نے ایک انگشتری دی اور فرمایا اسے ایک دینار کے عوض گرو رکھ کر کچھ کھانے پینے کو لے آ۔ نانبائی نے کہا "صرف ایک درم کے عوض اس کو رکھ سکتا ہوں۔" نوجوان انگوٹھی واپس آپ کی

---

[1] سفینۃ الاولیا میں سن وفات ۲۴۵ھ بتایا گیا ہے۔ نفحات الانس میں ۲۴۶ھ ہے اور بعض تاریخوں میں ۲۴۲ھ لکھا ہے۔

خدمت میں لے آیا۔ آپ نے اس سے کہا " اب تم یہ انگوٹھی کسی صراف کے پاس لے جاکر اس کی قیمت دریافت کرو۔ صراف نے اس کی قیمت ایک ہزار دینار بتائی۔ وہ نوجوان تعجب کرتا ہوا آپ کے پاس پہنچا۔

آپ نے فرمایا یہ حسنِ فیاضی عظام کے متعلق تیرا علم صرف نانبائی جتنا ہے۔"

جب آپ کا مرتبہ درگاہ الٰہی میں بڑھ گیا تو کوئی شخص آپ کی طرف توجہ بھی نہ کرتا تھا۔ مصری لوگ آپ کو زندیق کہنے لگے۔ اور سب نے متفق ہو کر خلیفہ وقت متوکل عباسی کو حالات سے مطلع کیا۔ خلیفہ نے آپ کو پابزنجیر دربارِ خلافت میں بلوایا۔ راہ میں ایک عورت نے آپ کو دیکھا اور کہا:

" خبردار! اس مردِ خلیفہ سے ہرگز نہ ڈرنا، وہ بھی تمھاری طرح ایک بندہ ہے، جب تک خدا کی طرف سے حکم نہ ہو کوئی بندہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

جب خلیفہ کے سامنے پہنچے تو اس نے آپ کو زندان میں بھیج دیا۔ چالیس دن تک آپ قید رہے۔ اس اثنا میں حضرت بشر حافیؒ کی ہمشیرہ آپ کو ہر روز ایک روٹی کھانے کے لیے پہنچا دیتیں۔ جب آپ کو زندان سے نکالا گیا تو وہ چالیس روٹیاں بدستور پڑی تھیں۔ ہمشیرہ حضرت بشر حافیؒ نے کہا:

" آپ جانتے تھے کہ یہ روٹی حلال کمائی کی ہے، پھر بھی آپ نے نہیں کھائی؟"

آپ نے فرمایا " ان روٹیوں میں داروغہ جیل کا ہاتھ لگ جایا کرتا تھا۔ اس لیے ان کی طینت پاک نہ رہتی تھی۔"

قید خانے سے باہر آنے کے بعد کمزوری کی وجہ سے آپ گر پڑے۔ اور پیشانی پر زخم آیا اور خون بہنے لگا۔ پھر آپ کو خلیفہ کے سامنے لایا گیا۔ خلیفہ کے سوالات کا جواب آپ نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ دیا۔ تمام حاضرین رونے لگے۔ آخر خلیفہ نے معذرت کی اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ واپس مصر بھیج دیا۔

جب آپ نماز ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوتے تو کہتے " اے الٰہی میں کن قدموں سے تیری درگاہ میں حاضر ہوں اور کن آنکھوں سے تیرے کعبہ کو دیکھوں، اور کس زبان سے تیرا راز کہوں اور کس نعمت سے تیرا نام لوں، جب کہ محض بے مائیگی کا سرمایہ لے کر تیری درگاہ میں حاضر ہوا ہوں۔"

آپ کے اقوال بے شمار ہیں

فرماتے ہیں: وہ ذاتِ اقدس پاک و برتر ہے، جس نے حجابِ آخرت میں اپنے عارفوں کو چھپا لیا اور اصحابِ آخرت کو حجابِ دنیا سے پردہ پوش کیا۔

فرماتے ہیں: " بدترین حجاب نفس پرستی کا ہے۔"

فرماتے ہیں: " جو معدہ کھانے سے بھرا ہوا ہے اس میں حکمت نہیں آ سکتی۔"

فرماتے ہیں: " صحت تھوڑا کھانے میں ہے اور روح کی صحت تھوڑے گناہ کرنے میں۔"

فرماتے ہیں: "اگر کوئی شخص بلا میں مبتلا ہو اور صبر کرے تو تعجب کی بات نہیں، بلکہ تعجب کی بات یہ ہے کہ بلا میں مبتلا ہو اور راضی ہو۔"

فرماتے ہیں: "جب تک آدمی اللہ تعالیٰ سے ڈریں گے کام کے رہیں گے اور جب خوف خدا ان کے دل سے جاتا رہے گا گمراہ ہو جائیں گے۔"

فرماتے ہیں: "راہ راست پر وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔ جب خوف دل سے نکل جائے گا، گمراہ ہوگا۔"

فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت یہ ہے کہ بندہ اخلاق، افعال، بجا آوری امر و نہی اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہر طرح حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تابع ہو۔"

فرماتے ہیں۔ "کہ صحبت نہ رکھ مگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ موافقت میں۔ خلق کے ساتھ نصیحت لینے میں۔ نفس کے ساتھ مخالفت میں۔ دشمن کے ساتھ عداوت میں۔"

فرماتے ہیں "کہ میں نے اس طبیب سے زیادہ جاہل کسی طبیب کو نہیں دیکھا، جو مستوں کا علاج اُن کی مستی کے وقت کرتا ہے۔"

فرماتے ہیں: "صوفی وہ ہے کہ جب وہ باتیں کرے تو اس کی گفتگو اس کے حال کے مطابق ہو اور کوئی ایسی بات نہ کہے جو خود اس میں نہ ہو اور خاموشی کی حالت میں اس کا معاملہ اس کے حال سے تعبیر ہو۔ تمام علائق دنیوی کے قطع کرنے میں اس کا حال ناطق ہو۔"

فرماتے ہیں: "عارف الٰہی کا ہر گھڑی خوف زیادہ بڑھتا رہتا ہے۔ کیونکہ ہر گھڑی وہ زیادہ نزدیک ہوتا جاتا ہے، اور عارف وہ ہے جو مخلوق میں رہ کر مخلوق سے جدا رہتا ہے۔"

فرماتے ہیں: "عارف کو خائف ہونا چاہیے نہ کہ واصف۔ واصف کو عارف نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ عارف وہی ہوتا ہے جو خوف کھاتا ہے اور عارف کے لیے ایک حالت لازم نہیں ہوتی۔ ہر گھڑی عالم غیب سے اُس پر نئی حالت طاری ہوتی رہتی ہے، تاکہ وہ صاحب حالات رہ سکے۔

فرماتے ہیں: "معرفت تین قسم کی ہے

اوّل۔ معرفت توحید کی جو کہ عام مومنین کو حاصل ہے۔

دوسری۔ معرفت صحبت و بیان کی، جو کہ حکماء اور علماء کے لیے مخصوص ہے۔

تیسری۔ معرفت صفات وحدانیت کی، جو کہ صرف اولیاء اللہ کو حاصل ہے، جو دیدۂ باطن سے اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اسرار اُن کو نظر آتے ہیں۔"

فرماتے ہیں: "ہرگز ہرگز معرفت کا مدعی نہ بننا، ورنہ جھوٹے قرار دیے جاؤ گے۔"

لوگوں نے پوچھا عارف کے کیا صفات ہوتے ہیں۔
فرمایا: "عارف بغیر علم، چشم، مشاہدہ، کشف اور حجاب وغیرہ کے دیکھتا ہے، کیونکہ وہ قریب رہتا ہے بلکہ ذات حق تعالیٰ میں واصل ہوجاتا ہے۔ اس کی گردش اللہ تعالیٰ کی گردش۔ اس کی باتیں اللہ تعالیٰ کی باتیں۔ اس کی نظر خدا کی نظر ہوتی ہے۔ حضور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب میں کسی بندے کو اپنا دوست بناتا ہوں تو اُس کے کان، آنکھیں، زبان، ہاتھ، پاؤں ہوجاتا ہوں، تاکہ وہ مجھ سے سُنے، دیکھے، بولے اور چلے پھرے۔ فرمایا کہ زاہد لوگ آخرت کے بادشاہ ہیں، مگر عارف لوگ زاہدوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کی نشانی یہ ہے کہ ہر وہ چیز ترک کردی جائے جو حق تعالیٰ سے ذرہ بھر بھی روکتی ہو۔ یہاں تک کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات رہ جائے اور اسی کا ذکر و شغل جاری و ساری ہو۔"
فرماتے ہیں: "کہ توکل کے معنی بہت سے خداؤں کی اطاعت سے نکل کر ایک خدا کی اطاعت میں آجانے کے ہیں اور تمام وسائل کو ترک کر کے حق تعالیٰ کی عبادت میں شاغل ہوجانے کا نام توکل ہے، اور اپنے آپ کو اس کا بندہ حقیقی معنوں میں سمجھنا اوّل توکل ہے۔"
فرماتے ہیں: "کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت رکھنے والوں کا ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ اگر ان کو آگ میں بھی ڈال دیا جائے تو ان لوگوں کی ہمت میں ذرہ بھر کمی نہ ہو، کیوں کہ وہ حق تعالیٰ کے مونس ہیں۔"
لوگوں نے دریافت کیا "کہ دنیا کیا ہے"
فرمایا: "جو چیز حق تعالےٰ سے غافل کردے، وہ دنیا ہے۔"
پھر پوچھا "کمینہ انسان کون ہے۔"
فرمایا: "جو خدا تک پہنچنے کا راستہ نہ جانتا ہو اور نہ کسی سے راستہ پوچھے۔"
یوسف بن حسین نے دریافت کیا: "میں کن لوگوں کی صحبت میں بیٹھا کروں۔"
فرمایا: "نفس کی دشمنی میں خدا کا دوست بن جا۔ کسی کو اپنے سے حقیر نہ سمجھ، خواہ وہ کتنا ہی کمتر درجے کا کیوں نہ ہو۔ کیا معلوم اس کی عاقبت کیسی ہے۔"
ایک اور شخص نے عرض کیا "مجھے کچھ وصیت فرمائیں۔"
فرمایا: "اپنے باطن کو حق تعالےٰ کی طرف متوجہ کر اور ظاہر کو لوگوں کے ساتھ مشغول رکھ۔ حق تعالیٰ کا محبوب بن تاکہ وہ تجھ کو سب سے بے نیاز کردے۔"
کسی اور شخص نے آپ سے وصیت چاہی،
فرمایا: "گذشتہ اور آئندہ کے خیالات میں اپنے آپ کو مت اُلجھاؤ اور ہر حال پر راضی رہو۔"

نقل ہے کہ مرض الموت میں آپ سے سوال کیا گیا " آپ کی خواہش کیا ہے "؟

فرمایا: " قبل اس کے مروں، خواہ ایک ہی لمحہ کے لیے کیوں نہ ہو، مگر اس کو جان لوں۔ اس کے بعد یہ شعر پڑھا ؎

الخوف امرضنی والشوق احرقنی   والحب اضنانی واللہ احیانی

جس کا مطلب یہ ہے کہ خوف نے مجھ کو بیمار بنادیا اور شوق نے جلادیا۔ محبت نے دُبلا کردیا اور خدا نے زندہ کردیا۔

شعر پڑھ کر آپ بے ہوش ہوگئے اور ایک دن بے ہوش رہے۔

جب ہوش میں آئے تو یوسف بن حسین نے وصیت چاہی

فرمایا: " اس وقت کسی دوسری طرف مجھ کو مشغول نہ کرو۔ میں اللہ تعالےٰ کے احسانات دیکھ کر متعجب ہو رہا ہوں۔ اس کے بعد انتقال فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

آپ کی وفات کے بعد لوگوں نے آپ کی پیشانی پر بخطِ سبز لکھا ہوا دیکھا " یہ اللہ تعالیٰ کے حبیب ہیں اور اس کی محبت میں فوت ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں اور عشقِ الٰہی کی تلوار سے فوت ہوئے ہیں "۔

جب آپ کا جنازہ اُٹھا تو سورج نہایت تیزی کے ساتھ چمک رہا تھا اُسی وقت پرندوں کا ہجوم آگیا، جس نے پروں سے پر ملا کر آپ کے جنازے پر سایہ کیا۔ راہ میں جب کہ آپ کا جنازہ لے جا رہے تھے مؤذن کی اذان سنائی دی اور کلمۂ شہادت پر آپ نے انگلی اٹھائی۔ لوگوں نے یہ حالت دیکھ کر شبہ کیا کہ شاید آپ زندہ ہیں، چنانچہ جنازہ رکھ دیا گیا، لیکن آپ کی انگلی اُسی طرح تھی۔ پوری کوشش کی گئی کہ انگلی کو نیچے کیا جائے مگر نہ ہوئی۔ چنانچہ آپ کو دفن کردیا گیا۔ مصر کے لوگوں نے جب یہ حالت دیکھی تو اپنی ان ناروا حرکات پر جو آپ کے ساتھ انھوں نے کی تھیں نہایت پشیمان ہوئے اور توبہ کی۔

حضرت خواجہ ہبیرۃ البصریؒ

وفات ———— ۷ شوال ۲۸۷ھ

مقتدائے دین و تاج العارفین حضرت خواجہ خواجگان خواجہ ہبیرۃ البصریؒ اکمل اولیائے وقت میں سے تھے حضرت خواجہ حذیفۃ المرعشیؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اپنے زمانہ کے اولیا و علما کے مقتدا تھے۔ مشائخ کبار میں بہت اونچا درجہ رکھتے تھے۔ آپ سترہ برس کی عمر میں ہی متبحر عالم بن چکے تھے۔ کلام پاک حفظ کر لیا تھا۔ پھر عبادت و ریاضت اور مجاہدہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ بڑی بڑی ریاضتیں کیں۔ پیر و مرشد کی ہدایت کے مطابق کثرت سے مجاہدے کیے اور چند دن کے اندر اندر دلی مقصود حاصل ہو گیا۔

پیر و مرشد کی خدمت میں ایک سال گزارنے کے بعد ان سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ خلافت عطا کرتے وقت پیر و مرشد نے فرمایا، اے ہبیرہ! تم ہمیشہ پیرانِ عظام کی پیروی و مطابعت کرنا۔ تاکہ مقصد جلد حاصل ہو۔ حضرت ہبیرہ فرماتے ہیں جب میں نے خرقۂ درویشی پہنا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور علما و مشائخ کی ارواح میرے نزدیک موجود تھیں ہر ایک نے میرے حق میں دعا فرمائی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا درجہ عطا کیا تھا کہ جو کوئی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، وہ ضرور آپ سے بیعت ہوتا اور آپ کی توجہ اور نظر کرم سے فیض یاب ہو کر فائز المرام ہوتا۔ آپ ہمیشہ حجرہ کے اندر رہتے تھے۔ خلوت اور گوشہ نشینی میں خاص کشش محسوس کرتے تھے۔ قناعت اور استغنیٰ کے بہت عادی تھے۔

ایک روز ایک شخص ایک ہزار درم لے کر حاضر ہوا اور خدمت میں پیش کیے۔ آپ دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئے لوگوں نے چہرے پر پانی چھڑکا۔ ہوش میں آ گئے، مگر چہرے کا رنگ متغیر ہو چکا تھا اور جسم لرز رہا تھا۔ لوگوں نے عرض کیا، باعث کیا ہے۔ فرمایا، افسوس! جو بے چارہ طالبِ محبوب اور جویائے مطلوب ہو وہ نامرغوب اور مانع چیزوں کو دیکھ کر اپنی ناکامی اور نامحرومی کے خیال سے کیوں نہ دہشت زدہ ہو، اور اس کے ہوش و حواس کیسے برقرار رہ سکتے ہیں۔

آپ ہمیشہ روزہ سے رہتے تھے۔ رزق حلال کما کر کھاتے تھے۔ کبھی کسی سے کچھ نہ لیتے تھے۔ شروع میں ذریعہ معاش کتابت تھا۔ رات کو اکثر جاگتے اور عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ ہمیشہ باوضو رہتے۔ بہت سی کرامات منسوب کی جاتی ہیں۔

مریدوں کی تربیت میں دستِ قوی اور قبولیت تمام رکھتے تھے اور صاحب خانزادہ تھے۔ آپ کے مریدوں

"بمیریاں" کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ آپ کا اور آپ کے مریدوں کا طریقہ یہ تھا کہ رات دن باوضو رہتے اور حضورِ دل سے نماز ادا کرتے۔ اپنی مجلس میں اللہ کے سوا کسی کا ذکر نہ کرتے تھے۔ صفائی باطن میں بہت کوشاں رہتے تھے۔ تین تین چار چار دن کا روزہ رکھتے اور سبزی یا جنگلی میوے سے روزہ افطار کرتے۔ ہمیشہ مراقبہ یا محاسبہ نفس میں مشغول رہتے۔ لوگوں کے ساتھ میل جول سے اجتناب کرتے اور ظاہر و باطن کو باہم جمع کر کے فنا و توحید کامل حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

کشف و کرامات کی آپ کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔

شوال ۲۸۶ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ مزار پُر انوار بھی وہیں ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ

ولادت ———————— ۱۲۸ھ

وفات ———————— بسطام ۲۶۱ھ

حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ تجلیاتِ الٰہیہ کے محرم اور اسرارِ حق کے مظہر تھے۔ ہمیشہ قُربِ الٰہی کے مقام پر رہا کرتے تھے۔ محبت الٰہی کی آگ میں سوختہ اور بدن کو مشاہدہ میں مشغول رکھتے تھے۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق آپ کی روایات نہایت اعلیٰ تھیں۔ آپ سے پہلے جتنے بھی اولیا گزرے ہیں کسی کو بھی طریقت میں اس قدر ملکہ نہیں تھا، جتنا آپ کو تھا۔ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ کی ذات بابرکات ہم میں ایسی ہے جیسے جبرائیل علیہ السّلام فرشتوں میں، نیز تمام سالکانِ راہ توحید کی انتہا آپ کی ابتدا ہے۔

بعض لوگوں نے پُوچھا" انسان کے لیے راہِ طریقت میں کیا چیز بہتر ہے"۔

فرمایا : " مادرزاد دوست "۔

پُوچھا : " اگر یہ حاصل نہ ہو "۔

فرمایا : " چشم بینا !"

پُوچھا : " اگر یہ بھی حاصل نہ ہو "۔

فرمایا : " پھر سُننے والے کان "۔

عرض کیا : " اگر یہ بھی نہ ہوں "۔

فرمایا : " پھر مرگِ مفاجات "۔

روایت ہے کہ ایک دن آپ امام جعفر صادقؒ کی خدمت میں بیٹھے تھے۔ حضرت امامؒ نے فرمایا :

" بایزید کتاب طاق سے اُٹھا کر دے دو "۔

آپ نے فرمایا " کون سے طاق سے ؟"

حضرت امامؒ نے فرمایا : " عرصہ سے تم یہاں رہتے ہو اور ابھی تک تم کو طاق کا پتہ نہیں "۔

آپ نے عرض کیا : " مجھے اس سے کیا کام کہ آپ کی موجودگی میں سر اٹھاؤں "۔

حضرت امامؒ نے فرمایا : " اگر ایسا معاملہ ہے تو بسطام واپس جاؤ، تمھارا کام ختم ہو گیا ہے "۔

روایت ہے کہ ایک دفعہ لوگوں نے آپ سے عرض کی کہ فلاں جگہ ایک بزرگ تشریف فرما ہیں۔ آپ زیارت کو تشریف لے گئے۔ اتفاقاً اُس نے قبلہ شریف کی طرف منہ کرکے تھوکا۔ یہ حال دیکھ کر آپ فوراً واپس تشریف لے آئے اور فرمایا " اگر یہ شخص ذرہ بھر بھی طریقت جانتا ہوتا تو شریعت کے خلاف عمل نہ کرتا۔

فرماتے ہیں: " جس کام کو میں سب کاموں سے مؤخر جانتا تھا ' وہ مقدم کام تھا۔ یعنی والدہ کی رضامندی "۔

فرمایا: " جس چیز کو میں مجاہدات وریاضات شاقہ میں تلاش کرتا پھرتا تھا ' وہ میں نے گھر میں آسانی سے حاصل کر لی۔ یعنی ایک رات والدہ نے پانی طلب کیا، میں کوزہ میں پانی لینے گیا، مگر نہ ملا۔ پھر صراحی کو دیکھا مگر وہاں بھی نہ تھا۔ چنانچہ نہر پر جاکر پانی لایا، مگر میری واپسی تک والدہ سوگئی تھیں۔ میں اسی طرح کوزہ لیے کھڑا رہا۔ سخت سردی کے باعث کوزہ میں پانی جم گیا۔ جب والدہ بیدار ہوئیں تو انھوں نے مجھ کو یوں کھڑے دیکھ کر سبب دریافت کیا۔ میں نے عرض کی کہ شاید آپ بیدار ہوں اور پانی طلب کریں لیکن میں حاضر نہ ہوں۔ اس ڈر کی وجہ سے کھڑا رہا۔ یہ سن کر والدہ نے پانی پیا اور میرے حق میں دعا کی۔

آپ فرماتے ہیں ' میں بارہ سال جنگلوں میں اپنے نفس کے حق میں لوہار بنا رہا اور نفس کی ریاضت کی بھٹی میں ڈال کر مجاہدہ کی آگ سے گرم کرکے ملامت کے ہتھوڑے سے کوٹتا رہا۔ آخر کار میں نے اُسے آئینہ بنا لیا۔ پانچ سال آئینہ بنانے میں صرف ہو گئے طرح طرح کی عبادات وریاضات سے اس آئینے کو صیقل کیا، پھر ایک سال اس کو اغیار کی نظر سے دیکھا۔ پھر بھی اس کو غرور اطاعت کے بھروسے؛ ذرا عمل کی خود پسندی میں مبتلا دیکھا۔ پانچ سال اور کوشش کی پھر جب دیکھا تو مُردہ تھا۔ چنانچہ چار تکبیریں جنازہ کی پڑھ کر فارغ ہوا۔

نقل ہے کہ ایک دفعہ آپ کو عبادت میں کچھ لطف نہ آیا آپ نے خادم سے فرمایا:
" دیکھ گھر میں کیا چیز ہے "؟
اس نے دیکھا تو ایک انگور کا خوشہ نظر آیا۔ فرمایا " یہ کسی کو دے دے کیوں کہ ہمارا گھر بنیے کی دوکان نہیں "
اس کے بعد آپ کو عبادت میں لطف آنے لگا۔

نقل ہے کہ آپ کا ایک آتش پرست ہمسایہ تھا، جس کا ایک شیرخوار بچہ تھا۔ تمام رات وہ تاریکی کی وجہ سے روتا رہتا تھا۔ آپ روز چراغ اُٹھا کر اُس کے گھر کی طرف لے جاتے۔ بچہ خاموش ہو جاتا۔ جب وہ آتش پرست اپنے سفر سے واپس آیا تو بچے کی ماں نے شیخ کی نسبت سارا حال عرض کیا۔
اس نے کہا " افسوس ہے جب شیخ کی طرف سے روشنی پہنچ گئی تو پھر ہم اپنے آپ کو غفلت کی تاریکی میں کیوں رکھیں "
اس کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا۔
نقل ہے کہ ایک دفعہ لوگوں نے ایک آتش پرست سے کہا " مسلمان ہو جا "
اس نے جواب دیا " اگر مسلمانی یہی ہے جو بایزید کی ہے تو مجھ میں مسلمان ہونے کی طاقت نہیں۔ اگر مسلمانی وہ ہے

جو تم لوگوں کی سے تو افسوس ہے میں اس کا یقین نہیں کر سکتا۔

شیخ احمد حضرت خضرویہؒ کہتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ سب لوگ مجھ سے کچھ طلب کرتے ہیں، لیکن بایزید مجھ سے مجھ ہی کو طلب کرتا ہے۔

روایت ہے، کہ ایک دفعہ آپ نے ایک امام کے پیچھے نماز ادا کی، نماز کے بعد امام نے پوچھا:

آپ نہ تو کوئی کام کرتے ہیں، نہ کسی سے کچھ لیتے ہیں، پھر کھاتے کہاں سے ہیں؟

فرمایا: "پہلے مجھے نماز کی قضا ادا کر لینے دو۔ ایسے شخص کی اقتدا میں نماز جائز نہیں، جو روزی دینے والے کو نہیں جانتا۔"

فرماتے ہیں: جب پہلی مرتبہ میں حج کو گیا، تو خانہ کعبہ دیکھا۔ دوسری بار گیا تو صاحب خانہ کو دیکھا۔ تیسری بار جب گیا تو خانہ کعبہ نظر آیا! اور نہ صاحب خانہ۔ مطلب یہ کہ ذات حق میں اس درجہ گم ہو گئے تھے کہ سوائے حق کے اور کچھ دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔

ایک دفعہ کسی شخص نے آپ کے دولت خانہ پر جا کر آپ کو آواز دی۔ آپ نے پوچھا:

"کس کو بلاتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا "بایزید کو"

فرمایا: "تیس سال ہونے کو آئے، میں خود بایزید کی تلاش میں ہوں مگر اس کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔"

یہ بات کسی نے ذوالنون مصریؒ سے بیان کی۔ انھوں نے فرمایا:

"اللہ تبارک و تعالیٰ میرے بھائی بایزید کو بخشے۔ ایک جماعت ایسی ہے جو حق تعالیٰ کی ذات میں گم ہو گئی ہے اور وہ بھی انھی میں سے ایک ہیں۔"

لوگ بیان کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص آپ کی خدمت میں آ کر دعا کا سائل ہوتا تو آپ فرماتے:

"الٰہی تو ان کا خالق ہے اور یہ تیری مخلوق۔ میں کون ہوں جو تیرے اور تیری خلقت کے درمیان واسطہ بنوں" پھر اپنے آپ سے کہتے وہ واقف اسرار ہے، مجھ کو اس فضول بات سے کیا کام۔

ایک دفعہ آپ نے ایک شخص یہ سر کہتے سنا "خداوندا میری طرف دیکھ۔"

آپ نے نہایت جوش سے کہا کہ تو بڑا اچھا منہ رکھتا ہے کہ وہ تیری طرف دیکھے۔

اس نے کہا "اے شیخ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ وہ میری طرف دیکھے تاکہ میرا منہ عمدہ ہو جائے۔"

یہ بات آپ کو بہت پسند آئی اور کہا "تو سچ کہتا ہے۔"

فرماتے ہیں کہ میں نے تمام ہاتھوں سے اللہ کو ڈھونڈا، مگر جب تک مصیبت کے ہاتھ سے نہ ڈھونڈا نہ ملا۔ تمام قدموں سے اس کی راہ میں گیا، مگر جب تک دل کے قدموں سے نہ گیا منزل پہ نہ پہنچ سکا۔

فرماتے ہیں "مدت تک کعبہ کا طواف کرتا رہا، لیکن جب خدا تک پہنچ گیا تو خانہ کعبہ میرا طواف کرنے لگا۔"

فرماتے ہیں کہ مردوہ نہیں ہے کسی چیز کے پیچھے چلے بلکہ مرد وہ ہے جو جہاں کہیں بھی ہو چیزیں اس کے گرد دوڑیں اور جس چیز سے خطاب کرے اُسی سے جواب سنے۔

فرماتے ہیں کہ سچا عابد اور سچا عامل وہ شخص ہے جو کوشش کی تلوار سے اپنی تمام مرادوں کو قتل کر دے اور تمام خواہشوں اور تمناؤں کو اللہ تعالیٰ کی محبت میں تباہ کر دے اور خداوند کریم کی رضا پر راضی رہے۔ اور محض اس بات کی خواہش کرے، جس کا حق تعالیٰ شاہد ہو۔

فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا ایک ذرّہ بہشت کے ہزار ہا قصور و محلات سے بدرجہا بہتر ہے۔

لوگوں نے عرض کیا "کیا اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنی رضامندی سے بہشت میں نہیں لے جاتا؟"

فرمایا: "جب وہ کسی کو اپنی رضا دیتا ہے تو بہشت کو لے کر وہ کیا کرے گا"۔ (اس کی رضا کے مقابلے میں بہشت بے معنی ہے)

فرماتے ہیں: "کوئی گناہ تم کو اس قدر نقصان نہیں پہنچا سکتا جس قدر کہ ایک مسلم بھائی کو بے عزت کرنا"۔

فرماتے ہیں: "دنیا اہلِ دنیا کے لیے غرور، آخرت اہلِ آخرت کے لیے سرور اور اللہ تعالیٰ کی دوستی اہلِ معرفت کے لیے سراسر نور ہے"۔

فرماتے ہیں: "جب عارف چُپ ہو جاتا ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا سے بات کرے۔ جب آنکھوں کو بند کرتا ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے، دیدارِ حق کا جلوہ دیکھے اور سر زانو ہونے کے وقت اس کی خواہش ہوتی ہے کہ صور پھونکنے تک سر نہ اٹھائے"۔

فرماتے ہیں: "ایک بندے کے واسطے بجز اس کے کہ ہیچ ہو (یعنی زہد۔ علم، عمل وغیرہ کا کوئی غرور نہ ہو) اور کوئی بات بہتر نہیں ہے۔ بے ہمہ ہو کر با ہمہ بن جائے گا"۔

فرماتے ہیں: "جس کسی کو اللہ تعالیٰ اپنا دوست بناتا ہے، اُس کو اپنی تین خصلتیں عطا کر دیتا ہے۔ دریا جیسی سخاوت۔ زمین جیسی عاجزی۔ اور آفتاب کی طرح شفقتِ عوام"۔

فرماتے ہیں: "دوزخ اس شخص کے لیے عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانتا اور خدا شناس لوگ دوزخ کے لیے عذاب ہیں"۔

فرماتے ہیں: "عارف وصالِ الٰہی کے سوا اور کسی بات سے خوش نہیں ہوتا"۔

فرماتے ہیں: "یا تو تم اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرو جیسے کہ تم ہو، اور یا ایسے بن جاؤ جیسا اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہو"۔

ایک دفعہ لوگوں نے سوال کیا: "فرض کیا ہے اور سنت کیا ہے؟"

فرمایا: "اللہ تعالیٰ کی محبت فرض اور دنیا کا ترک کرنا سنت ہے"۔

نقل ہے کہ ایک دفعہ ایک مرید نے رختِ سفر باندھا اور روانگی کے وقت آپ سے وصیت طلب کی۔

فرمایا: "تین خصلتوں کا خیال رکھنا

اوّل : کسی بداخلاق سے واسطہ پڑے تو اس کی بدخلقی کو اپنی خوش خلقی میں تبدیل کر لینا۔

دوم : یہ کہ اگر کوئی احسان کرے تو اوّل خدا کا شکر ادا کرنا اور پھر محسن کا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی نے اس کے دل کو مہربان کیا ہے۔

سوم : یہ کہ اگر کوئی مصیبت پیش آجائے تو فوراً اپنی عاجزی کا اقرار کرنا "

آپ سے سوال کیا گیا کہ "بندہ اپنے کمال کو کس وقت پہنچتا ہے؟

فرمایا: "وہ اپنے عیبوں کو پہچان لے اور مخلوقات سے کسی قسم کی طمع نہ رکھے۔"

سوال کیا گیا "حق تک پہنچنے کی سبیل کیا ہے؟

فرمایا : "گونگے، بہرے اور اندھے بن جاؤ۔"

کسی نے عرض کیا "کچھ وصیت فرمایئے۔"

فرمایا : "آسمان کی طرف دیکھو۔ جب اُس نے اوپر نظر اٹھائی تو پوچھا "کیا تو جانتا ہے آسمان کو کس نے پیدا کیا؟"

عرض کیا: "جانتا ہوں"

فرمایا : "جس نے آسمان کو پیدا کیا ہے، وہ ہر جگہ تیرے حال سے واقف ہے۔ بس اس سے ڈر۔"

سوال کیا گیا کہ متکبر کون ہوتا ہے؟

فرمایا: "جس کو تمام کائنات میں اپنا نفس زیادہ اچھا نظر آئے۔"

پھر پوچھا " آپ پانی پہ چلتے ہیں؟"

فرمایا: "لکڑی کا ٹکڑا بھی پانی پر تیرتا ہے۔"

پھر پوچھا " آپ ہوا میں اُڑتے ہیں؟"

فرمایا: "پرندے بھی ہوا میں اُڑتے ہیں۔"

پھر پوچھا: "آپ ایک رات میں کعبہ کو ترجا پہنچتے ہیں؟

فرمایا: "جادوگر بھی ایک رات میں ہند سے دماوند پہنچ جاتا ہے۔"

سوال کیا گیا "پھر مردوں کا آخر کون سا کام ہے؟

فرمایا : "اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی سے دل نہ لگائیں۔"

حضرت خواجہ ممشاد علو دینوریؒ

ولادت ـــــــ دینور (کرمان شاہ کا مغربی کوہستان)

وفات ـــــــــــــ ۲۹۹ ھ

غوثِ زماں، قطبِ دوراں، مقتدائے طریقت و عارفِ حقیقت حضرت خواجہ ممشاد علو دینوریؒ سلسلہ عالیہ چشتیہ کے بڑے جلیل القدر بزرگ، غوث اور قطب تھے۔ اپنے زمانہ کے بڑے مشائخ میں سے تھے۔

آپ کا وطن دینور تھا، جو کرمان شاہ کے مغربی کوہستان میں واقع ہے، مگر آپ کی پرورش بغداد میں ہوئی۔ اصل نام علو اور لقب کریم الدین تھا۔ ممشاد علو دینوری کے نام سے مشہور ہوئے۔ حضرت خواجہ جنید بغدادی، خواجہ محمد رویم اور خواجہ ابوالحسن بغدادیؒ کے اقران میں سے تھے۔ خواجہ سری سقطیؒ[1] اور کئی دوسرے بزرگوں سے بھی فیض حاصل کیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ابتدا میں آپ بہت دولت مند تھے۔ جب حُبِّ الٰہی کا جذبہ اُٹھا تو سب مال و اسباب راہِ خدا میں دے دیا، یہاں تک کہ اپنا روزہ افطار کرنے کے لیے بھی کچھ نہ رکھا۔

آپ مکہ معظمہ میں اکر عبادتِ الٰہی اور ذکر و فکر میں مشغول رہنے لگے۔ ارادت سے قبل بیس سال تک اسی طرح عبادت اور مجاہدے کرتے رہے۔ بعد ازاں حضرت ہبیرۃ البصری کی خدمت کیمیا اثر میں حاضر ہوئے۔ حضرت شیخ نے آپ کو شرف بیعت سے مشرف فرمایا اور خلوت میں بٹھا کر آپ کو تعلیم دی۔

مدت تک ریاضت و مجاہدہ کرتے رہے، پھر ایک دن پیر و مرشد نے بلا کر کہا تمھارا کام پورا ہو چکا، وضو کر کے میرے پاس آؤ۔ آپ وضو کر کے حاضر ہوئے۔ شیخ نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا اے اللہ! علو کو درویشی کے اعلیٰ درجے تک پہنچا۔

---

[1] خواجہ سری بن مغلس سقطیؒ بڑے پایہ کے بزرگ اور اہل بغداد کے استاد تھے۔ ابوالحسن آپ کی کنیت تھی۔ حضرت جنید بغدادیؒ کی استادی کا بھی شرف حاصل تھا۔ امام قشیریؒ کے بیان کے مطابق آپ حضرت جنیدؒ کے ماموں اور پیر تھے۔ حضرت معروف کرخیؒ کی صحبت میں بھی رہے۔ آپ بہاتا مال بہت کم قیمت پر بیچا کرتے تھے اس لیے آپ کو سقطی کہا جاتا ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، ایک مرتبہ میں خواجہ سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کی عیادت کو گیا (آپ بیمار تھے)، اور پنکھا جھلنے لگا۔ آپ نے روک دیا، فرمایا: ہوا سے آگ اور بھڑکتی ہے۔ پھر فرمایا جنید! حق تعالیٰ کو چھوڑ کر اسباب خلق میں مشغول نہ ہو جانا۔ آپ نے ۲۵۱ھ اور بعض روایات کے مطابق ۲۵۳ھ کو بزمانہ خلافت ابو العباس احمد بن متوکل باللہ وفات پائی۔ مزار مبارک بغداد میں ہے۔

یہ سنتے ہی آپ بے ہوش ہو گئے۔ پھر جلد ہی ہوش آگیا، مگر پھر بے ہوش جاتے رہے۔ جب کئی بار ایسا ہوا تو پیرومرشد نے اپنا لعاب دہن ان کے منہ میں دیا اور آپ کو پوری طرح ہوش آگیا۔

پیرومرشد نے خرقۂ خلافت عطا فرمایا، اپنے سجادہ پر بٹھایا۔ چنانچہ آپ رشد و ہدایت میں لگ گئے۔ جب کوئی شخص مرید ہونے کو آتا تو آپ پہلے مراقبہ فرماتے، اجازت ملتی تو اسے مرید کرتے ورنہ رخصت کر دیتے۔

آپ اپنے پیران طریقت کے عرسوں کی مجلسیں منعقد کیا کرتے تھے اور اس میں جو لوگ شریک ہوتے انھیں وعظ و نصیحت فرماتے۔ کھانا کھلاتے مگر خود فقر و فاقہ ہی سے گزارتے۔ آپ بہت کم سوتے تھے۔ لباس بہت بوسیدہ اور پیوند لگا ہوتا تھا۔ ہمیشہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہتے یا عبادت میں مصروف رہتے۔ خدا کے خوف سے ہمیشہ روتے رہتے۔ بعض اوقات کثرت گریہ کے باعث بے ہوش ہو جاتے۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا چالیس سال سے بہشت میرے سامنے پیش کی جا رہی ہے مگر میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

کسی نے پوچھا آپ کے دل کی کیا کیفیت ہے؟ فرمایا: تیس برس ہو گئے میرا دل مجھ سے کھو گیا ہے اور اب تک اس کا پتہ نہیں۔ چونکہ تمام صدیقوں کا یہی حال ہے کہ ان کا دل کھو گیا ہے اور پھر انھیں نہیں ملا۔ اس لیے مجھے بھی کھویا ہوا دل کیسے مل سکتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں معرفت تمام تر صدق اور اللہ کے ساتھ محقق ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں جو کوئی اللہ جل شانہٗ کے دوستوں میں سے کسی ایک کے ساتھ انکار سے پیش آئے گا، اس کی ادنیٰ سزا یہ ہے کہ جب تک توبہ نہ کرے گا اللہ تعالیٰ اسے کوئی ایسی نعمت نہ دے گا جو اس نے اپنے دوستوں کو دے رکھی ہے۔

فرماتے ہیں انبیاء علیہم السلام کی روحیں کشف و مشاہدے کی حالت میں ہیں اور اولیاء اللہ کی روحیں قرب و اطلاع کی حالت میں۔

فرمایا ہمت سب کاموں کی پیشرو ہے، جس کی ہمت درست ہے اور جو اس میں سچا ہے، اس کے باقی سب اعمال درست ہو گئے۔

کسی نے پوچھا درویش بھوکا ہو تو کیا کرے۔ فرمایا نمازیں پڑھے۔ اسی نے پوچھا اگر نماز نہ پڑھ سکے؟ فرمایا سو رہے۔ پوچھا گیا اگر سو بھی نہ سکے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ فقیر کو تین حالتوں سے باہر نہ جانے دے گا: یا قوت بخشے گا یا غذا پہنچائے گا یا اسے اپنے پاس بلالے گا۔

فرمایا مرید کا ادب یہ ہے کہ مشائخ اور برادران طریقت کی عزت کرے۔ اسباب کے پیچ و خم سے باہر نکل آئے۔ اور بالکل مجرد ہو جائے۔ شرع کے آداب کو اس طرح نظر میں رکھے کہ اس میں سے ایک بھی فوت نہ ہو۔

آپ نے محرم ۲۹۹ھ میں وفات پائی۔ امام شعرانیؒ نے سن وفات ۲۹۷ھ بتایا ہے مگر اوّل الذکر زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ یہ تحقیق نہیں ہوسکی کہ مزار پرانوار کس جگہ پر ہے۔

حضرت خواجہ ابو اسحٰق شامی چشتیؒ آپ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ان کا لقب شریف الدین تھا۔ شام کے رہنے والے تھے۔ ۱۴۔ ربیع الاوّل ۳۲۹ھ میں وفات پائی اور شام میں عکہ کے مقام پر ان کا مزار ہے۔ علوم ظاہر و باطن کے سرچشمہ تھے۔ خوارق و کشف و کرامات میں بہت مشہور رہے۔ اکثر صحو میں رہتے تھے تاکہ عوام کو حال کی خبر نہ ہو۔ پیر و مرشد نے ان سے فرمایا تھا۔ اے ابو اسحٰق! میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ وہ تجھے کامل درویش کرے اور تیرے فرزندوں اور مریدوں کو بھی یہ نعمت عطا فرمائے۔

بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ ممشاد دینوری اور ممشاد علو دینوری دو الگ الگ ہستیاں تھیں اور بعض تذکرہ نگاروں نے انھیں ایک ہی شخصیت بتایا ہے۔ تذکرۃ الاصفیا اور بعض شجرات مشائخ چشت کی رُو سے شیخ علو دینوری اور شیخ ممشاد دینوری دونوں ایک ہی شخص ہیں[1]۔ اخبار الصالحین میں نواب معشوق یار جنگ بہادر نے ان دو الگ الگ عنوانات کے تحت ہر دو کے حالات بیان کیے ہیں۔ موصوف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"۔ ۔ ۔ ۔ لیکن نفحات الانس سے معلوم ہوتا ہے کہ الگ الگ ہیں اور شیخ ممشاد دینوری کا تعلق خاندان سہروردیہ سے ہے اور خواجہ علو دینوریؒ کا چشتیہ سے۔ اسی خیال سے صاحب مرأۃ الاسرار نے آپ کا نام صرف علو دینوری لکھا ہے اور حضرت ممشاد دینوری کا حال الگ لکھا ہے اور صاحب سفینۃ الاولیا نے بھی اس شک کو ظاہر کیا ہے۔"[2]

---

[1] اخبار الصالحین ص۲۵

[2] اخبار الصالحین ص۲۵

حضرت ابراہیم ادھمؒ

ولادت ———— ۱۷۹ھ

وفات ———— (ملک شام) ۲۸۱ھ[1]

دین و دنیا کے بادشاہ۔ وادیٔ یقین کے شہباز، عالمِ انتہا کے ماہرِ اسرار۔ دولتِ دُنیوی کے سرمایہ دار، عظیم الشان ملک کے بادشاہ یعنی حضرت ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ متقی اور صدیق تھے۔ آپ کو بہت سے بزرگانِ عظام سے شرفِ نیاز حاصل تھا۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ گروہ فقراء کے تمام علوم کی کنجی ابراہیم ادھمؒ ہیں۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ امام اعظمؒ کی مجلس میں حاضر ہوئے، لیکن امام صاحب کے دوستوں نے آپ کو بچشمِ حقارت دیکھا۔ یہ صورت دیکھ کر امام صاحب نے آپ کو "سیدنا" کے لفظ سے مخاطب فرمایا۔ چنانچہ امام صاحب کے دوستوں نے شرمندہ ہو کر پوچھا کہ یہ سعادت اُن کو کہاں سے حاصل ہوئی۔ امام صاحب نے فرمایا "یہ ہر وقت خدا کی اطاعت میں مصروف و مشغول رہتے ہیں، لیکن ہم دوسرے کاروبار بھی کرتے ہیں۔"

ابتدا میں آپ بلخ کے بادشاہ تھے۔ بڑے کرّوفر اور شان و شوکت سے حکومت کرتے تھے۔ ایک رات اپنے محل میں محوِ خواب تھے۔ آدھی رات کے وقت آنکھ ایک اچانک واقعہ سے کھل گئی۔ معلوم ہوا کہ ایک آدمی چھت کے اوپر ٹہل رہا ہے۔ پوچھا "تو کون ہے اور یہاں اس وقت کیا کر رہا ہے؟"

اُس نے کہا "آپ کا دوست ہوں، اور یہاں اپنا اونٹ تلاش کر رہا ہوں۔"

آپ نے فرمایا "بھلا یہ ممکن ہے کہ شاہی محلات کی چھتوں پر اونٹ آجائیں۔"

اُس آدمی نے جواب دیا "بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جامۂ اطلس پہن کر عیش و عشرت میں خدا مل جائے؟"

یہ جواب سُن کر آپ کے دل میں ایک خوف سا پیدا ہوگیا۔ دوسرے دن دربارِ عام میں جب آپ بصد شان و شوکت تخت پر تشریف فرما تھے، یکایک ایک بارعب آدمی اندر داخل ہوا۔ امراء و وزراء اور غلام وغیرہ میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ اس طرح گستاخانہ طور پر اندر آنے کی وجہ پوچھے۔ چنانچہ وہ بے تحاشا آپ کے تخت تک پہنچ گیا۔ آپ نے نہایت تعجب سے پوچھا:

---

[1] سیر الاقطاب میں وفات کی تاریخ جمعہ ۱۸ جمادی الاول ۲۸۱ھ بتائی گئی ہے۔ سفینۃ الاولیا میں ۲۶۱ یا ۲۶۳ھ لکھی ہے۔ بعض دوسری تاریخ کتب میں ۲۶۵ اور ۲۶۶ھ بھی مذکور ہے۔

"تو کون ہے اور یہاں کس طرح آیا؟"
اس نے کہا "میں اس سرائے میں ذرا ٹھہرنا چاہتا ہوں۔"
آپ نے فرمایا "یہ سرائے نہیں شاہی محل اور دربار ہے۔"
اُس آدمی نے کہا "آپ سے پہلے اس محل میں کون رہتا تھا؟"
فرمایا "میرا باپ"
پھر پوچھا "تمہارے باپ سے پہلے کون تھا؟"
فرمایا "میرا دادا"
اسی طرح کئی پشتوں تک پہنچ کر اُس نے پوچھا "آپ کے بعد یہاں کون رہے گا؟"
فرمایا۔ "میری اولاد"
پھر اس آدمی نے کہا "ذرا خیال کرو جس مقام میں اتنے آدمی آئیں اور جائیں کسی کا مستقل قیام نہ ہو، تو پھر وہ مقام سرائے نہیں تو اور کیا ہے۔"
یہ کہہ کر وہ باہر آ گیا۔ آپ تنہا اس کے پیچھے دوڑے اور پوچھا:
"تم کون ہو؟"
اُس نے جواب دیا "میں خضر ہوں۔"
یہ سُنتے ہی آپ کا درد اور بڑھ گیا۔ چنانچہ واپس آ کر لیٹ گئے، مگر سکون ندارد۔ ناچار باہر ہوا خوری کے لیے گھوڑے پر سوار ہو کر گئے۔ اس وقت آپ نے آواز سُنی کہ ابراہیمؒ اُس وقت سے پہلے جاگو جب کہ تمہیں موت کے ذریعے جگایا جائے۔ چنانچہ آپ نے تختِ حکومت پر لات مار دی اور فقیرانہ لباس بدل کر شہر سے باہر نکل گئے۔ اپنے گناہوں پر روتے جاتے تھے اور جنگلوں اور وادیوں میں سے پا پیادہ گذرتے جاتے تھے۔
بادشاہی کو چھوڑ اور فقر کا جامہ اختیار کر کے صحرا نوردی کرتے ہوئے آپ نواحِ نیشاپور میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک غار نظر آیا جو نہایت مشہور اور بھیانک تھا۔ یہاں تقریباً نو سال تک ریاضت کرتے رہے۔ ہر جمعہ کے جمعہ غار سے باہر نکلتے۔ لکڑیوں کو جنگل سے اکٹھا کرتے اور نیشاپور میں جا کر فروخت کرتے۔ جو کچھ حاصل ہوتا اس میں سے نصف راہِ خدا میں دے دیتے اور نصف کی روٹی خرید کر کے جمعہ کی نماز پڑھتے اور پھر غار میں آ جاتے۔
ایک دفعہ سخت سردی کے دوران میں آپ کے وضو کا پانی بھی جم گیا، لیکن آپ نے اسی پانی کو توڑ کر وضو کیا۔ صبح کے وقت آپ کو ذرا سردی نے ستانا شروع کیا۔ آپ کے دل میں آگ تاپنے کا خیال پیدا ہوا۔ آپ اس وقت نماز میں مشغول تھے۔ آپ کو ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے پوستین پہنا دی ہے۔ نماز پڑھ کر وظائف میں مشغول ہو گئے۔ جب فارغ ہوئے تو دیکھا کہ ایک اژدہا تھا

جس نے آپ کو گرم کر رکھا تھا۔

نقل ہے کہ چالیس سال تک حضرت ادھمؒ پیہم گریہ وزاری اور صحرا نوردی کرتے رہے، یہاں تک کہ مکہ مکرمہ کے نزدیک پہنچے۔ آپ کی تشریف آوری کی خبر بزرگانِ حرم کو کسی نہ کسی طرح ہو گئی، چنانچہ وہ سب لوگ آپ کے استقبال کو آئے۔ جب آپ کو اس بات کا علم ہوا تو اپنے آپ کو قافلے سے ذرا آگے بڑھا لیا اور علیحدہ ہو گئے۔ تاکہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ چنانچہ بزرگانِ حرم کے خدمت گاروں نے جو آگے آگے تھے، آپ سے پوچھا:

"ابراہیم ادھم کہاں ہیں؟ کیونکہ بزرگانِ حرم ان کے استقبال کو تشریف لائے ہیں!"

آپ نے فرمایا "بزرگ لوگ اس زندیق سے کیا چاہتے ہیں؟"

یہ سن کر ان لوگوں نے آپ کو پیٹا اور کہا "کہ تو ایسے بزرگ کو زندیق کہتا ہے۔ زندیق تو خود ہے۔"

آپ نے فرمایا "میں بھی یہی کہتا ہوں۔"

جب وہ لوگ چلے گئے تو آپ نے اپنے نفس کو مخاطب کیا اور کہا "تو نے اپنے کیے کی سزا دیکھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے تجھ کو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دیا اور تو مشائخینِ حرم کے استقبال کا لطف نہ اٹھا سکا۔ پھر آپ حرم میں مقیم ہو گئے۔ ہمیشہ اپنی محنت سے کما کر اپنا اور اپنے یاروں کا پیٹ پالتے رہے۔ کبھی کھیتوں کی رکھوالی کرتے اور کبھی جنگل سے جا کر لکڑیاں کاٹ لاتے اور فروخت کرتے۔

نقل ہے کہ آپ نے ایک درویش کو دیکھا جو مفلسی کی شکایت کر رہا تھا۔ آپ نے فرمایا:

"معلوم ہوتا ہے کہ تو نے درویشی مفت میں حاصل کی ہے۔"

درویش نے پوچھا "کیا درویشی کو خریدا بھی جا سکتا ہے؟"

فرمایا "ہاں! میں نے درویشی حکومتِ بلخ کے عوض خریدی ہے اور سمجھتا ہوں کہ ارزاں خریدی ہے۔"

نقل ہے کہ ایک شخص آپ کے پاس ہزار درہم لایا اور کہا کہ قبول فرما لیجیے۔"

آپ نے فرمایا "میں محتاجوں سے کچھ نہیں لیا کرتا۔"

اس نے کہا "میں محتاج نہیں۔ دولت مند ہوں۔"

آپ نے فرمایا "کیا تو اپنی دولت میں زیادتی کا خواہش مند نہیں؟"

اس نے کہا "ضرور ہوں۔"

فرمایا "روپیہ اٹھا لے کیونکہ محتاجوں کا سردار تو ہی ہے۔"

فرمایا جس شخص کا دل تین حالتوں میں خدا کی طرف حاضر نہ ہو، تو یہ اس امر کی نشانی ہے کہ اس پر دروازہ بند کیا جا چکا ہے۔ اوّل تلاوتِ قرآن کریم کے وقت دوئم نماز کے وقت اور سوئم ذکرِ الٰہی کے وقت۔

پھر فرمایا: عارف کی نشانی یہ ہے: وہ تفکر کرے، اور ہر شے سے عبرت کا سبق سیکھے اور خداوندکریم کی صفت و ثنا کرتا ہے
فرمایا کہ دو حجابوں کے اُٹھ جانے سے سالک کے دل پر انوار الٰہی کی بارش ہوتی ہے۔ اوّل یہ کہ دونوں جہان کی حکومت پر بھی راضی نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اگر چھین لیا جائے تو غمگین نہ ہو۔ کیونکہ کسی چیز پر خوش ہونا حریص ہونے کی اور غمگین ہونا غصّے کی نشانی ہے۔

نقل ہے کہ آپ نے بہت سے پا پیادہ حج کیے اور پچاس سال تک حرم شریف کے مجاور رہے، لیکن چاہِ زمزم سے پانی نکال کر نہ پیا کیوں کہ پانی نکالنے کا ڈول شاہی خرچ سے تیار ہوا کرتا تھا۔

آپ ہر روز مزدوری کرتے اور ساری کمائی مریدوں پر خرچ کر دیتے۔ ایک دن ذرا دیر سے اپنے مریدوں کے پاس پہنچے لیکن وہ آپ کا انتظار کیے بغیر کھانا کھائے سو گئے۔ جب آپ نے واپس آکر مریدوں کو سوتا پایا تو خیال کیا بچارے بھوکے سو گئے ہیں۔ چنانچہ آپ نے کھانا پکانا شروع کیا، لیکن آگ آپ کو بہت تنگ کر رہی تھی۔ کیونکہ خاطر خواہ طور پر نہ جلتی تھی۔ اسی دوران میں ایک مرید کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے دریافت کیا" کیا کر رہے ہیں آپ؟

فرمایا" کھانا تیار کر رہا ہوں تاکہ بیدار ہوتے ہی کھا سکو"۔

یہ سن کر وہ بہت شرمندہ ہوا اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ ہم آپ کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں اور آپ کی ہم پر کیسی شفقت ہے۔

ایک دفعہ خلیفہ معتصم باللہ نے آپ سے پوچھا" آپ کیا کام کرتے ہیں؟

فرمایا: دنیا طالبانِ دنیا کے سپرد کر چکا ہوں، اور عاقبت طالبانِ عاقبت کے سپرد کر دی ہے۔ دنیا میں میں نے صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر اپنے لیے اختیار کر لیا ہے اور عاقبت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار پسند کیا ہے۔

روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ نے متوکل زاہد سے دریافت کیا" کہ تم کہاں سے کھاتے ہو اور تمھارے گناہوں کی کیا صورت ہے۔

زاہد نے جواب دیا" مجھے کچھ علم نہیں، روزی رساں سے جا کر پوچھو"۔

فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ ایک غلام خریدا اور اس سے اس کا نام پوچھا۔ غلام نے کہا" میرا نام وہی ہے جس نام سے آپ مجھ کو پکاریں گے"۔

پھر میں نے پوچھا" کیا کھایا کرتے ہو؟

اس نے جواب دیا" جو کچھ آپ کھلائیں گے"۔

پھر پوچھا" کیا پہنتے ہو؟

جواب ملا" جو آپ پہنائیں گے"۔

پھر پوچھا" تمھاری کیا خواہش ہے ؟"
جواب ملا" غلام کو خواہش سے کیا مطلب ؟"
فرماتے ہیں کہ اس کی یہ باتیں سن کر اپنے آپ سے میں نے کہا کہ تمام عمر خدا کی ایسی عبادت نصیب نہ ہوئی، اب مجھ کو عبادت کا ڈھنگ اس غلام سے سیکھنا چاہیے ۔
لوگوں نے پوچھا" کہ آپ اپنی زندگی کیسے بسر کرتے ہیں ؟"
فرمایا" میرے پاس چار سواریاں ہیں، جب مجھ پر کوئی سختی آتی ہے تو شکر کی سواری پر بیٹھ جاتا ہے ۔ جب کوئی طاعت ظہور میں آتی ہے تو اخلاص کی سواری اختیار کر لیتا ہوں ۔ اگر گناہ سرزد ہوتا ہے تو توبہ کی سواری کام میں لاتا ہوں ۔ جب کوئی بلا نازل ہوتی ہے تو صبر کی سواری کام آتی ہے ۔"
نقل ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے آپ سے وصیت چاہی ۔
فرمایا" بندھے ہوئے کو آزاد کر دے اور آزاد کو بند کر دے ۔"
اس نے عرض کیا" میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا ۔"
فرمایا" کہ بندھی ہوئی تھیلیاں کھول دے اور کھلی ہوئی زبان بند کر دے ۔"
روایت ہے کہ آپ نے ایک شخص سے حالتِ طواف میں کہا کہ تجھ کو صالحین کا درجہ نصیب نہیں ہو سکتا جب تک تو چار دشوار گذار منزلیں طے نہ کرے ۔ اوّل یہ کہ راحت کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لے اور محنت کا دروازہ کھول دے ۔ دوّم یہ کہ عزت کا دروازہ بند کر ذلت کا دروازہ کھول ۔ سوّم یہ کہ خواب کا دروازہ بند کر دے، بیداری کا دروازہ کھول لے اور چہارم یہ کہ تونگری کا دروازہ بند کر ڈال، درویشی کا دروازہ کھول لے ۔
نقل ہے ایک دفعہ ایک شخص نے عرض کیا" اے شیخ میں اپنے آپ پر بہت ظلم کر چکا ہوں، مجھ کو کچھ نصیحت فرمائیے ۔"
فرمایا" اگر تم منظور کرو تو چھ باتیں بتاتا ہوں : اوّل یہ کہ جب حق تعالیٰ کی نافرمانی کرو تو خدا کی دی ہوئی روزی نہ کھاؤ ۔"
اس نے کہا" پھر کہاں سے کھاؤں ؟"
فرمایا" زیبا نہیں کہ جس کی روزی کھاؤ اس کی نافرمانی کرو ۔ دوّم یہ کہ جب گناہ کرنے کا ارادہ کرو تو خدا کی بادشاہت سے باہر نکل کر گناہ کرو ۔"
عرض کیا" ساری کائنات اُسی کی ہے، کوئی کہاں جائے ؟"
فرمایا" یہ نامناسب ہے کہ اُس کے ملک میں رہ کر گناہ کیا جائے ۔ تیسرے یہ کہ گناہ ایسی جگہ کیا جائے جہاں وہ دیکھ نہ سکے ۔"
کہا" یہ ناممکن ہے وہ دلوں کے بھید تک سے واقف ہے ۔"
فرمایا" جب رزق اس کا کھاؤ اور اس کے ملک میں رہو تو پھر اس کے سامنے گناہ کرنا کہاں تک انصاف پر مبنی ہے ؟"

چوتھے یہ کہ جب موت کا فرشتہ آئے تو اس سے کہو خدا توبہ کر لینے کی مہلت دے دے "

عرض کیا "یہ بھی نا ممکن ہے وہ میرا کہا نہ مانے گا "

فرمایا "جب یہ حالت ہے تو اس کے سامنے آنے سے پہلے توبہ کرنی چاہیے۔ پنجم یہ کہ جب قبر میں منکر نکیر آئیں تو ان کو باہر نکال دینا "

کہا "میں یہ بھی نہیں کر سکتا "

فرمایا "پھر ان کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے تیار رہو۔ چھٹے یہ کہ قیامت کے دن حساب کتاب کے بعد گنہگاروں کو دوزخ کی طرف بھیجا جائے گا، تم دوزخ میں جانے سے انکار کر دینا "

کہا "یہ بھی نا ممکن ہے "

فرمایا "تو پھر گناہ مت کرو "

نقل ہے کہ لوگوں نے آپ سے پوچھا "کیا سبب ہے اللہ تعالیٰ ہماری دعاؤں کو قبول نہیں کرتا ؟"

آپ نے فرمایا "تم خدا تعالیٰ کو جانتے ہو لیکن اس کی اطاعت نہیں کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے ہو، مگر ان کی پیروی نہیں کرتے۔ قرآن کریم پڑھتے ہو مگر اس پر عمل نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمت کھاتے ہو مگر شکر نہیں کرتے۔ جانتے ہو کہ دوزخ گنہگاروں کے لیے ہے مگر اس سے ذرا نہیں ڈرتے۔ شیطان کو دشمن سمجھتے ہو مگر اس سے نہیں بھاگتے۔ موت کو برحق سمجھتے ہو مگر کوئی سامان نہیں کرتے۔ خویش و اقارب کو اپنے ہاتھوں زمین میں دفن کرتے ہو لیکن عبرت نہیں پکڑتے۔ بھلا جو شخص اس طرح کا ہو اس کی دعا کیونکر قبول ہو سکتی ہے ؟"

ایک دفعہ آپ ایک کشتی میں سوار تھے کہ ایک زبردست لہر کشتی کی طرف آئی۔ آپ نے فوراً قرآن کریم اٹھا کر سامنے کیا اور کہا "خداوندا کیا تو ایسی حالت میں ہم کو غرق کرے گا، جبکہ تیری کتاب مبارک ہمارے درمیان ہے"۔ چنانچہ اسی وقت وہ لہر اور دریا کا جوش مدھم پڑ گیا۔

ایک دفعہ آپ درویشوں کے ایک گروہ کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ایک قلعہ کے نزدیک پہنچ کر دیکھا کہ بہت سی لکڑیاں جمع ہیں اور اسی جگہ رات بسر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ رات کو خوب آگ جلائی۔ اس وقت ایک درویش نے کہا

"کاش حلال گوشت ہمارے پاس ہوتا تو بھون کر کھاتے "

آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ قادر ہے "۔ یہ کہہ کر نماز میں مصروف ہو گئے۔ اسی اثنا میں ایک شیر کی آواز آئی جس کے آگے آگے ایک گورخر بھاگ رہا تھا۔ درویشوں نے اس گورخر کو پکڑ کر ذبح کر لیا۔ شیر پاس بیٹھا چپ چاپ دیکھتا رہا۔

حضرت خواجہ ابو علی رودباریؒ

وفات ——————— مصر ۳۲۱ھ

پیشوائے بزرگان نامدار، گنجینۂ ہدایت وولایت خواجہ ابو علی رودباری ان اولیائے کبار اور صوفیائے عظام میں سے ہیں جنھوں نے شیخ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اولیائے کرام کی صحبت سے فیض پایا، اور ولایت کے بڑے درجہ کو پہنچے۔ آپ کاملانِ طریقت اور اہلِ فتوت میں سے تھے۔ علوم وریاضت میں مسلّمہ تھے۔ کرامات وخوارق میں مشہورِ زمانہ تھے۔

آپ کا نام نامی احمد بن محمد بن القاسم بن منصور ورروزی تھا۔ علاقہ رودبار کے رہنے والے تھے مگر مصر میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ وہیں ۳۲۱ھ[1] میں انتقال فرمایا۔ آپ ورروز کے رئیسوں کے خاندان سے تھے اور نسب کسرائے ایران سے ملتا ہے۔

آپ کے ترک وتجرد کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جنید بغدادیؒ مسجد میں تقریر فرما رہے تھے کہ خواجہ ابو علیؒ بھی اس طرف سے گزرے۔ حضرت جنیدؒ نے گفتگو کے دوران میں کسی شخص سے مخاطب ہوکر فرمایا "اے شخص میری بات سن"۔ خواجہ ابو علیؒ سمجھے جنیدؒ مجھے کہہ رہے ہیں، چنانچہ ٹھہر گئے اور آپ کا وعظ سننے لگے۔ ان کے کلام نے دل پر ایسا اثر کیا کہ گھر پہنچ کر سارا مال ومتاع راہِ خدا میں دے دیا اور اہلِ صوفیہ کے طریقے پر چلنے لگے۔

اخبار الصالحین میں لکھا ہے "آپ حافظِ حدیث وعالم وفقیہہ وادیب تھے۔ اپنے وقت کے امام اور اپنی قوم کے سردار اور حضرت ابو عبد اللہ رودباریؒ کے ماموں تھے۔

شیخ ابو علیؒ کاتب[2] کہتے ہیں۔ میں نے کسی شخص میں ابو علی رودباری سے زیادہ علم شریعت وحقیقت کو جمع نہیں دیکھا۔ جب کبھی ان کے سامنے شیخ ابو علی رودباری کا نام لیا جاتا تو "سیدنا" کہتے۔ آپ کے شاگردوں نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا ہاں وہ شریعت سے حقیقت کی طرف گئے ہیں اور ہم حقیقت سے شریعت کی طرف آئے ہیں۔

شیخ عبد الغفور اس قول کی شرح یوں بیان کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص حقیقت سے شریعت کی طرف آتا ہے تو مجذوب

---

[1] اخبار الصالحین میں سن وفات یہی ہے۔ یہ ابو العباس محمد بن مقتدر الملقب بہ راضی باللہ کا عہد خلافت تھا۔ تذکرۃ الاولیاء میں سن وفات ۳۲۲ھ درج ہے۔

[2] شیخ ابو علی کاتب مصر کے مشائخ عظام میں سے تھے۔ آپ ابو بکر مصری اور ابو علی رودباری کی صحبت میں رہے ہیں۔ سلسلۂ نقشبندیہ کے شیخ ہیں۔ صاحب کرامت بزرگ تھے۔ ابو علی رودباری سے آپ کا سلسلہ حضرت جنید بغدادی تک پہنچتا ہے۔ آپ نے ۳۴۱ھ میں مصر میں وفات پائی۔

سالک کہا جاتا ہے اور حقیقت کی طرف رجوع کرنے کا محتاج ہوتا ہے۔ بخلاف اس شخص کے جو شریعت سے حقیقت کی طرف جاتا ہے اسے سالک مجذوب کہتے ہیں۔ وہ عین وصل کے لطف میں ہے اور اس کا حال اوّل الذکر سے نیکو تر ہوتا ہے۔ اس زمانے میں بغداد شریف میں جس قدر بزرگوار تھے، مثلاً حضرت جنید، شیخ ابوالحسن نوری، شیخ ابو حمزہ و ابن جلاد وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین، سب کی خدمت میں آپ حاضر ہوئے اور صحبت اٹھائی، پھر شام گئے، وہاں ابو عبداللہ جلادی کی صحبت میں رہے، پھر مصر گئے اور وہیں اقامت فرمائی اور انتقال فرمایا۔"

آپ کے کلمات طیبات عشق و محبت اور تصوف سے لبریز ہیں۔ فرماتے ہیں میں مدت تک طہارت کے وسوسہ میں مبتلا رہا۔ ایک دفعہ گیارہ مرتبہ وضو کیا مگر میری تسلی نہ ہوتی۔ ہر مرتبہ یہی خیال ہوا کہ وضو ٹھیک نہیں ہوا یہاں تک کہ سورج نکل آیا میں بہت افسردہ تھا کہ آواز آئی عافیت علم میں ہے۔ تصوف یہ ہے کہ صوفی صوف کا لباس پہنے اور نفس کو جفا اور بلا میں مبتلا کرے دنیا سے بالکل بے تعلق ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر چلے۔

فرماتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام پر معجزات اور براہین کا صادر کرنا فرض کیا ہے، اسی طرح اس نے اولیا پر مقامات و احوال کا پوشیدہ رکھنا فرض کیا ہے۔

فرمایا ہر شے کے لیے ایک واعظ ہے۔ دل کے لیے واعظ حیا ہے اور مرید وہ ہے جو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی شے کی خواہش نہ کرے۔ جوانمرد وہ ہے جو دونوں جہانوں میں اللہ تعالیٰ ہی کو چاہے۔

فرمایا خوف و رجا ایک پرندے کے دو بازوؤں کی مانند ہیں، اگر بازو ساکن ہوں گے تو پرندہ بھی ساکن رہے گا اور اگر ایک بازو میں نقص پیدا ہو جائے تو دوسرا بھی بے کار ہوگا۔

آپ کے دو شعر یہ ہیں ؎

من لم یکن بک فانیاً عن حظہٖ	وعن الھویٰ والانس بالاحباب
او تیمتہ صبابۃٌ جمعت لہٗ	ما کان فرقہ من الاسباب

(ترجمہ) جو کوئی بطریق سلوک اپنی آرزوؤں اور خواہشات نفسانی اور دوستوں کے میل ملاپ اور انسیت سے فانی نہیں ہوا، یا بطریق جذبہ اس میں عشق کی حدت اور جلن پیدا نہیں ہوتی جس سے وہ ایک ہی کا ہو رہے اور متفرق و پریشان اسباب ایک مقام پر آجائیں، وہ حقیقت کی منزل کو نہیں پہنچا۔

فرماتے ہیں جب دل دنیا وغیرہ کی محبت سے خالی ہو جاتا ہے تو اس میں حکمت پیدا ہو جاتی ہے۔ فرمایا نفس سے خدمت اور روح سے مکاشفہ ظاہر ہوتا ہے۔ آفت تین چیزوں سے ہے، بیماریِ طبیعت، ملازمت عادت، فسادِ صحبت طبیعت کی بیماری حرام اور مشتبہ چیزوں کا کھانا ہے۔ ملازمت عادت حرام اور باطل چیزوں کی طرف نظر کرنا اور غیبت کا سننا ہے۔ فسادِ صحبت خواہشات نفسانی کی اطاعت کرنا ہے۔

فرمایا نا موافق اور مخالف طبیعت کے لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا تنگ ترین قید خانہ ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کے کسی بندے سے اعراض کرنے کی علامت یہ ہے کہ وہ اس بندے کو ایسی شے میں مشغول کر دے جس سے اسے کوئی نفع حاصل نہ ہو۔ فرمایا جب تک تم ہمہ تن اپنی خودی سے باہر نہ آؤ گے، محبت کی حدود میں داخل نہ ہو سکو گے۔

فرمایا جو مرید پانچ روز کی بھوک بھی برداشت نہ کر سکے اُسے گداگری کے لیے بازار میں بھیج دینا چاہیے۔ فرمایا تصوف کے معنی یہ ہیں کہ محبوب کے دروازے پر سر رکھ دیا جائے اور اگر دن میں سو بار بھی وہاں سے نکالا جائے تو ہٹنے کا نام نہ لے، نیز یہ کہ تصوف آزادوں کی عطا ہے۔

فرمایا خوف کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرا جائے اور محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے آپ کو کلیۃً محبوب کے سپرد کر دے۔ توحید کے معنی ہیں کہ دل کی استقامت اور انکار سے علیٰحدگی۔ فرمایا سب سے زیادہ مفید وہ یقین ہے جو اللہ تعالیٰ کو تمھاری نظروں میں عظیم القدر کر دے اور اس کے سوا جو کچھ ہے اُسے حقیر بنا دے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کو اہل محبت پسند ہیں اور وہ انھیں دوست رکھتا ہے۔

وفات کے وقت آپ کا سر مبارک اپنی ہمشیرہ کی گود میں تھا۔ آپ نے آنکھیں کھول دیں اور فرمایا آسمانوں کے دروازے کھول دیے گئے ہیں۔ بہشتوں کو سجایا گیا ہے اور مجھے جلوہ دکھایا جا رہا ہے۔ فرشتے کہہ رہے ہیں ہم تمھیں ایسی جگہ لے جائیں گے جو تم نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔ حوریں مجھ پر نثار ہو رہی ہیں اور میرے دید کی مشتاق ہیں، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ مجھے تیری قسم میں غیر کی طرف دھیان نہ کروں گا۔ میں نے اتنی دراز عمر اسی امید میں گزاری ہے۔ ہم رشوت کے خواہشمند نہیں۔"

نزع کے عالم میں یہ شعر پڑھ رہے تھے:

وحقك لانظرت الى سواكا   بعين مودة حتى اراكا

(ترجمہ: تیرے حق کی قسم جب تک میں تجھے دیکھتا رہوں گا تیرے سوا میں کسی پر محبت کی نظر نہ ڈالوں گا۔ یعنی تجھے دیکھتے دیکھتے مر جاؤں گا۔)

حضرت جُنید بغدادیؒ

وفات ———————— بغداد ۲۹۷ھ[1]

آپ قطب وقت، منبع اسرار، مرقع انوار، سلطانِ طریقت، بادشاہِ حقیقت تھے۔ انواعِ علوم و فنون میں کامل دستگاہ رکھتے اور معاملات و ریاضات میں مفتی کامل تھے۔ کلمات لطیف اور اشارات عالی میں سب پر سبقت رکھتے تھے۔ سب کا آپ کی امامت پر اتفاق ہے۔ سید الطائفہ آپ کا لقب اور مقتداے اہلِ تصوف ہیں۔ شریعت۔ طریقت اور حقیقت میں انتہا پر پہنچے ہوئے تھے۔ عشق و زہد میں بے نظیر تھے اور مجتہد کا درجہ رکھتے تھے۔ اپنے وقت کے تمام مشائخ کے مرجع تھے۔ آپ کی تصانیف بے شمار ہیں۔ علم اشارات سب سے پہلے آپ ہی نے پھیلایا۔ بار بار دشمنوں اور حاسد لوگوں نے آپ پر کفر اور زندقہ کا فتویٰ لگایا۔ سری سقطیؒ کے خواہر زادہ اور مرید تھے۔ آپ کا درجہ اپنے مرشد سے بھی بڑھ کر تھا جس کا اعتراف خود سری سقطیؒ نے بارہا فرمایا۔ ہمہ تن درد و عشق تھے۔

فرماتے ہیں " جب تک ایک ہاتھ سے قرآن اور دوسرے سے سنّتِ رسولؐ نہ پکڑلو اس راستہ پر نہ چلو تاکہ نہ شبہات کے گڑھوں میں گرو اور نہ بدعت کی تاریکی میں مبتلا ہو سکو۔"

فرماتے ہیں " قیل و قال اور جنگ و پیکار سے یہ درجہ مجھ کو نہیں ملا، بلکہ بھوک، پیاس، نیند اور ترک دنیا سے ملا ہے۔"

ایک دفعہ آپ کی آنکھ میں شکایت پیدا ہوئی۔ ایک آتش پرست طبیب نے کہا:

" اگر آنکھ کی صحت درکار ہے تو آنکھ پر پانی نہ ڈالو۔"

آپ نے کہا " وضو کیسے کروں؟"

طبیب نے پھر وہی کہا اور چلا گیا۔ جب نماز کا وقت آیا تو آپ نے وضو کیا۔ نماز سے فارغ ہوئے تو آنکھ اچھی ہو گئی تھی۔ اسی وقت آواز آئی " جنیدؒ تم نے میری رضا کے لیے آنکھ کا نقصان گوارا کیا، اگر اس کے اجر میں تمام اہل دوزخ کی بخشش چاہتے ہو تو ہم تیار ہیں۔" جب دوسری دفعہ طبیب آیا تو آنکھ کو درست پایا۔ دیکھ کر قصہ پوچھا۔ آپ نے سب کچھ بیان کر دیا۔ وہ طبیب اسی وقت مسلمان ہو گیا اور کہا:

" یہاں انسان کا کیا کام۔ یہ خالق کا علاج ہے۔"

ایک شخص ایک دفعہ پانچسو دینار لے کر آیا۔ پوچھا:

---

[1] بعض تذکرہ نگاروں نے سن و فات ۳۰۲ھ لکھا ہے۔

" اس کے سوا تیرے پاس کچھ اور بھی ہے ؟"
کہا " بہت ہے "
فرمایا " کچھ اور بھی چاہتا ہے ؟"
کہا " ہاں، کیوں نہیں ؟"
فرمایا " پھر یہ اٹھا لے اس کا مستحق تو ہی ہے کیونکہ میں باوجود کچھ بھی نہ رکھنے کے کچھ نہیں چاہتا "
فرماتے ہیں " اخلاص میں نے ایک حجام سے سیکھا۔ مکہ میں ایک حجام کسی شخص کے بال درست کر رہا تھا، میں نے کہا :
" خدا کی راہ پر میرے بال بھی درست کر دو "
حجام نے اس آدمی سے جس کی وہ حجامت بنا رہا تھا کہا :
" تم ذرا علیحدہ ہو جاؤ، جب خدا کا نام آگیا تو پھر سب سے پہلے اسی کا کام کرنا چاہیے "
پھر مجھے بٹھا کر پہلے میرے سر کو بوسہ دیا، پھر حجامت بنا کر ایک کاغذ دیا جس میں چاندی کے ٹکڑے تھے اور کہا :
" اسے اپنی حاجتوں پر صرف کرو "
میں نے اس دن سے عہد کر لیا کہ اول فتوح جو مجھ کو ہو گی تو اس کے ساتھ سلوک کروں گا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد بصرہ سے اشرفیوں کی ایک تھیلی میرے پاس آئی۔ میں اس کو حجام کے پاس لے گیا، اس نے پوچھا :
" یہ کیا ہے ؟"
میں نے اپنی نیت اور عہد کرنے کا ذکر کیا، اس نے کہا :
" مرد خدا تم کو شرم نہیں آتی، خدا کے نام پر کام کرنے کے عوض مجھ کو دیتے ہو "
ایک رات آپ کے گھر ایک چور آیا، مگر ایک کرتے کے سوا کچھ نہ ملا۔ دوسرے دن آپ نے اپنا کرتہ بازار میں بکتے دیکھا، خریدار کہہ رہا تھا :
" اگر کوئی گواہی دے کہ یہ کرتہ تیرا ہی ہے تو میں خرید لوں گا "
آپ نے کہا " میں گواہی دیتا ہوں یہ کرتہ اسی کا ہے " تب اس شخص نے خرید لیا۔
ایک مرید پر آپ ہمیشہ زیادہ شفقت فرمایا کرتے تھے۔ دوسرے مریدوں نے شکایت کی تو فرمایا :
" تمہاری نسبت اس کی فہم و فراست زیادہ ہے "
امتحان کے طور پر آپ نے سب مریدوں کو ایک ایک جانور اور چھری دے کر فرمایا :
" ایسی جگہ جا کر ذبح کرو جہاں کوئی نہ دیکھے "
سب مرید ذبح کر کے لے آئے مگر وہ مرید جانور کو زندہ واپس لے آیا۔ پوچھا :

"تم نے کیوں ذبح نہ کیا؟"

عرض کیا "جہاں جاتا ہوں، خدا حاضر و ناظر ہے۔"

یہ سن کر آپ نے دوسرے مریدوں کی طرف دیکھا اور فرمایا:

"اس کی فراست دیکھ لی!" یہ سن کر سب نے توبہ کی۔

نقل ہے کہ ایک دفعہ ایک سید نے حج کا ارادہ کیا، جب بغداد پہنچا تو آپ کی زیارت کے لیے آیا۔ آپ نے پوچھا:

"تم کون ہو؟ کس کی اولاد ہو؟ اور کہاں کے رہنے والے ہو؟"

اُس نے جواب دیا "سید ہوں، گیلان کا رہنے والا ہوں۔"

آپ نے فرمایا: "تمھارے دادا یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ دو تلواریں چلایا کرتے تھے۔ ایک کافروں پر اور دوسری اپنے نفس پر۔ تم اُن کی اولاد ہو، کون سی تلوار چلاتے ہو۔"

یہ سن کر وہ بے تاب ہو کر گر پڑا۔ اور رو کر کہنے لگا:

"میرا حج یہیں ہو گیا، مجھ کو خدا کی راہ بتائیے۔"

آپ نے فرمایا "تمھارا سینہ خدا تعالٰے کا حرم خاص ہے، اس میں اُس کے سوا کسی اور کو جگہ نہ دو۔"

فرماتے ہیں: "عالم لوگوں کا علم دو حرفوں میں ہے۔ تصحیح ملّت اور تجرید خدمت۔"

فرماتے ہیں: "جس کی زندگی نفس سے ہے، اس کی موت جان نکلنے سے ہے، مگر جس کی زندگی خدا تعالٰی سے ہے، وہ طبعی زندگی سے اصلی زندگی کی طرف انتقال کرتا ہے۔"

فرماتے ہیں "جو آنکھ حق تعالٰے کی قدرت اور حکمت کو نہ دیکھے اس کا اندھا ہونا بہتر ہے اور جو زبان ذکر حق میں مصروف نہ ہو، اس کا گونگا ہونا اچھا ہے اور جو کان حق بات نہ سُنے اُس کا بہرہ ہونا اچھا ہے اور جو بدن اس کی خدمت نہ کرے، اُس کا مر جانا بہتر ہے۔"

فرماتے ہیں "جس شخص نے اپنے عمل پر اعتبار کیا، اُس کا پاؤں ڈگمگا جاتا ہے۔ جس نے اپنے مال پر بھروسہ کیا وہ نقصان میں پڑ گیا۔ جس نے خدا پر بھروسہ کیا وہ عزّت اور بزرگی والا بن گیا۔"

لوگوں نے سوال کیا "مراقبہ اور حیا میں کیا فرق ہے؟"

فرمایا "مراقبہ غائب کا انتظار ہے اور حیا حاضر سے ندامت کا نام ہے۔"

فرماتے ہیں "عبودیت کی دو خصلتیں ہیں:

۱۔ ظاہر و باطن میں ہر طرح خدا کی رضا پر راضی رہنا۔

۲۔ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی پوری محبت کے ساتھ اقتدا کرنا۔"

فرماتے ہیں: "فتوت یہ ہے کہ درویشوں کا امتحان نہ لیا جائے اور امیروں سے جھگڑا نہ کیا جائے۔"
جوانمردی یہ ہے کہ اپنا بوجھ دوسرے پر نہ رکھو اور جو کچھ پاس ہو اس کو خرچ کر دو۔"
تواضع یہ ہے کہ جہان والوں پر تکبر نہ کرو، اور حق تعالیٰ پر مطمئن رہ کر سب سے مستغنی ہو جاؤ۔"
فرماتے ہیں: "خُلق چار چیزوں کا نام ہے:

۱۔ سخاوت
۲۔ اُلفت
۳۔ نصیحت
۴۔ شفقت۔"

فرماتے ہیں: "نیک عادت فاسق کی صحبت بدخو عالم کی صحبت سے اچھی ہے۔"
فرماتے ہیں: "روزہ نصف طریقت ہے۔"

حضرت خواجہ ابو احمد ابدال چشتیؒ

ولادت ــــــــــ چشت ۲۶۰ھ

وفات ــــــــــ چشت ۳۵۵ھ

سلطان الاصفیا خواجہ ابو احمد ابدالؒ صاحب خوارق و کرامات بزرگ تھے۔ خواجہ خواجگان حضرت ابو اسحٰق شامیؒ[1] کے مرید و خلیفہ اور حضرت خواجہ ابو محمد چشتیؒ کے والد بزرگوار اور پیر و مرشد تھے۔

آپ کے والد بزرگوار سلطان فرسنام چشتؒ[2] کے شرفا اور امرا میں سے تھے۔ خواجہ ابو احمدؒ۔ رمضان المبارک ۲۶۰ھ میں چشت میں پیدا ہوئے۔ آپ کا لقب قدوۃ الدین تھا۔ صحیح النسب سید حسینی ہیں۔ آپ قطب اور ابدال بھی تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کی پھوپھی بڑی عفیفہ اور نیک تھیں حضرت خواجہ ابو اسحٰق چشتیؒ کبھی کبھی ان کے ہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک روز حضرت خواجہ نے ان سے فرمایا تمھارے بھائی کے ہاں ایک جلیل القدر فرزند پیدا ہوگا۔ تم اس کی ولادت تک اپنی بھاوج کی حفاظت کرنا کہ کوئی حرام و مشتبہ چیز نہ کھالے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی بھاوجہ کی جو حاملہ تھیں بڑی اچھی طرح نگہداشت کی۔ اکل حلال کے خیال سے اپنے ہاتھ سے چرخہ کات کر سوت بیچ کر روزی کماتیں، اور والدہ ماجدہ کی ضروریات پوری کرتیں۔

جب آپ پیدا ہوئے تو آپ نے انھیں اپنے مکان پر رکھ کر پرورش کیا۔ سات برس کے تھے کہ حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ کی توجہ سے علوم باطنی کا دروازہ آپ پر کھل گیا۔ چھوٹی سی عمر میں ہی اسرار و رموز کی ایسی باتیں بیان فرماتے کہ علمائے وقت حیران رہ جاتے۔

---

[1] حضرت خواجہ ابو اسحاق شامیؒ عالم علوم ظاہر و باطن اور صاحب خوارق و کشف و کرامات بزرگ تھے۔ آپ کا لقب شریف الدین تھا۔ حضرت ممشاد علو دینوریؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ۳۲۹ھ میں وفات پائی۔ مزار پر انوار ملک شام کے شہر عکہ میں ہے۔ آپ زیادہ تر سفر میں رہتے تاکہ عوام آپ کے کمال سے آگاہ نہ ہو سکیں۔ پیر و مرشد کی خدمت میں سات سال تک رہ کر بڑے بڑے مجاہدے اور ریاضتیں کیں۔ اہل چشت نے آپ سے ہدایت پائی اس لیے خواجہ چشت کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ چشت میں آپ کے علاوہ اور چار بزرگ صاحب ولایت ہوئے ہیں۔ حضرت ابو احمد، حضرت ابو محمد، حضرت ناصر الدین ابو یوسف اور حضرت خواجہ مودود رحمہم اللہ اجمعین۔ اسی لیے یہ پانچ بزرگ اور خواجگان چشت اور جو لوگ ان کے مرید و خلیفہ ہوئے چشتی کہلاتے ہیں۔ [2] چشت کا قصبہ شہر ہرات سے تیس کوس کے فاصلہ پر ہے۔

تیرہ برس کی عمر میں حضرت خواجہ علیہ الرحمتہ کے شرف ارادت میں داخل ہوئے۔ پھر گوشہ نشین ہو کر عبادت و ریاضت میں لگ گئے۔ بہت سے مجاہدے کیے۔ بیس برس کی عمر میں پیرو مرشد کی خدمت کرنے لگے۔ آٹھ برس ان کی خدمت میں رہ کر سخت ریاضتیں کیں۔ جب ہر طرح سے کامل ہو گئے تو پیرو مرشد نے خرقۂ درویشی عطا کر کے اپنا جانشین مقرر کیا۔ ان کے حق میں دعا کی اور خود ملک شام کو واپس چلے گئے۔

اب آپ نے رشد و ہدایت شروع کر دی۔ خلق خدا کو راہِ راست پر گامزن کرنے میں منہمک ہو گئے۔ غرض اللہ تعالےٰ نے آپ کو وہ شان دی کہ جب کیف و جذب کی حالت طاری ہوتی تو آپ کی پیشانی مبارک سے ایسا نور نکلتا کہ اس کی روشنی آسمان تک جاتی۔ دیکھنے والوں کو پتہ چل جاتا تھا کہ اب آپ پر کیف طاری ہے۔ اس حالت میں جس خوش نصیب پر نظر پڑ جاتی وہ صاحب کرامات ہو جاتا۔

آپ کی گفتگو بڑی فصیح و بلیغ ہوتی تھی۔ زبان میں بڑی تاثیر تھی۔ علمائے عصر آپ کے کلام کو سُن کر دنگ رہ جاتے تھے قرآن کریم آپ نے حفظ کر رکھا تھا۔ دن رات میں تین دفعہ قرآن ختم کرتے۔ ہمیشہ باوضو رہتے۔ لباس بوسیدہ ہوتا تھا۔ عبادت و ریاضت کا یہ عالم تھا کہ کامل تیس سال تک نہیں سوئے اور پہلو زمین سے نہیں لگایا۔ دنیا سے سخت نفرت تھی۔

نمازِ تہجد کے بعد اکثر دعا کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالےٰ تو اپنے فضل و کرم سے امت محمدؐ کو بخش دے۔

جب آپ چھوٹے تھے تو آپ کے والد بزرگوار کا ایک خم خانہ تھا۔ ایک دن آپ موقع پا کر وہاں چلے گئے۔ اندر سے دروازہ بند کر لیا اور سب پیمانے توڑ دیے۔ والد کو علم ہوا تو کوٹھے پر گئے اوپر سے نظر دوڑائی تو سخت غصّے میں آ کر ایک بڑا پتھر آپ کی طرف لڑھکا دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پتھر آپ کے سر کے قریب پہنچ کر ہوا میں معلق ہو گیا۔ اسے دیکھ کر آپ کے والد حیرت میں پڑ گئے اور توبہ کی۔

ایک مرتبہ آپ کچھ ساتھیوں کے ہمراہ دریائے دجلہ پر گئے۔ دریا پار کرنے کے لیے کشتی موجود نہ تھی۔ آپ مریدوں کے حلقہ میں بیٹھ گئے اور ذکر و فکر میں مصروف ہو گئے، اسی حالت میں سب کے سب دریا پار کر گئے اور کسی کا پاؤں تک پانی سے تر نہ ہوا۔ اس موقع پر کچھ غیر مسلم دیکھ رہے تھے، وہ سب آپ کی یہ کرامت دیکھ کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ وہ بھی آپ کی کرامت سے دریا پار کر گئے۔ پھر آپ کی صحبت کیمیا اثر میں رہ کر دین و دنیا کی کامرانی حاصل کی۔

آپ کے صاحبزادے کا نام نامی ابو محمد تھا، جو آپ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ لقب تاج الدین تھا۔ ابو محمد چشتی کے نام سے مشہور ہیں۔ بڑے صاحب کرامات اور صاحب علم بزرگ تھے۔ وہ بھی مادر زاد ولی تھے۔ چار برس کی عمر میں تعلیم کے لیے مکتب میں بٹھائے گئے۔ تھوڑی مدت میں قرآن مجید پڑھ لیا، پھر دوسرے دینی علوم حاصل کیے اور درجہ کمال کو پہنچے۔ تیرہ برس کی عمر میں حضرت خواجہ ابو احمدؒ نے آپ کو مرید کیا۔ خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور اپنا جانشین بنایا۔ آپ نے انھیں وصیت فرمائی کہ اے ابو محمد! فقر و فاقہ اختیار کرنا اور ہمیشہ فقراء کی صحبت میں رہنا، دنیا اور اہلِ دنیا سے اجتناب کرنا، تاکہ تمھیں درجہ کمال

حاصل ہو۔ چنانچہ آپ نے والد بزرگوار اور پیر و مرشد کی ہدایات پر عمل کیا۔ اور بلند درجہ پایا۔ بارہ برس تک حجرہ کے اندر رہ کر عبادت وریاضت کرتے رہے۔ آپ کی عمر مبارک چوبیس برس کی تھی، جب والد بزرگوار نے وفات پائی خواجہ ابو احمدؒ کی تاریخ وفات یکم جمادی الثانی ۳۵۵ھ بیان کی جاتی ہے اور آپ کا مزار پُرانوار قصبہ چشت میں ہے۔

والد کی وفات کے بعد خواجہ ابو محمد نے رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اکثر بادشاہ اور دوسرے بڑے بڑے لوگ آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ آپ اس وقت کے جملہ مشائخ اور صوفیائے کرام کے مقتدا اور پیشوا مانے جاتے تھے۔ زہد و ورع میں بے مثل تھے۔

کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود نے جب سومنات پر حملہ کیا تو آپ بھی اس کی طرف سے جہاد میں شریک ہوئے تھے اور خود لڑے تھے، چنانچہ سلطان آپ کا بہت معتقد تھا۔ سومنات کی فتح کے بعد سلطان نے خدمت میں حاضر ہو کر قدم بوسی کا شرف حاصل کیا تھا۔

خواجہ ابو محمدؒ نے غرہ رجب المرجب ۴۱۱ھ میں وفات پائی۔ مزار پرانوار چشت میں والد بزرگوار کے ساتھ ہی ہے۔

حسین بن منصور حلاّج

ولادت ——— بیضا (فارس) ۲۴۴ھ

وفات ——— ۳۰۹ھ

حسین بن منصور الحلاج شہر بیضا میں پیدا ہوئے۔ بیضا فارس کا ایک شہر ہے۔ آپ کی ولادت ۲۴۴ھ میں ہوئی۔ عمر کا ابتدائی زمانہ عراق کے شہر واسط میں گزرا۔ یہ واقعہ ۲۶۰ھ کا ہے یعنی اس وقت منصور کی عمر سولہ سال کے قریب تھی۔ پھر اہواز کے ایک مقام تستر میں سہل بن عبداللہ التستری کے ہمرکاب رہے، پھر بصرہ میں عمرو مکی کے فیض صحبت سے استفادہ کیا۔ ۲۶۴ھ میں بغداد آئے اور جنید بغدادی کے حلقۂ تلمذ میں شریک ہو گئے۔ منصور کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ ان کی عمر کا بڑا حصہ اسی شغل میں بسر ہوا۔ وہ مختلف اور متعدد ملکوں کی سیر و سیاحت کرتے رہے۔ اپنی زندگی میں تین مرتبہ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور ہر مرتبہ حج کے فریضہ سے سبکدوش ہوئے۔

گرفتاری اور فرار طبیعت بے باک اور غیور پائی تھی، جو بات دل میں آتی تھی اُسے زبان پر لانے میں تامل نہیں کرتے تھے۔ اپنے عقیدہ اور مسلک میں ذرا بھی لچک نہیں رکھتے تھے۔ بہت سخت تھے، نہ رواداری کے قائل تھے نہ مصلحت کے۔ جس بات کو سچ سمجھ لیتے تھے اس کو فاش اور برملا اعلان کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

۲۹۶ھ میں ابن داؤد الاصفہانی الظاہری کے فتوے کی بنیاد پر پہلی مرتبہ گرفتار ہوئے لیکن ٹھیک ایک سال کے بعد ۲۹۷ھ میں زندان سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور اہواز کے ایک مقام سوس میں پوشیدہ طور پر رہنے لگے۔ ۳۰۱ھ میں دوسری مرتبہ ان کی گرفتاری عمل میں آئی اور آٹھ سال تک مسلسل اسیر زنداں رہے، لیکن کسی ایک قید خانہ میں نہیں بلکہ بغداد کے مختلف جیل خانوں میں منتقل کیے جاتے رہے۔ شاید یہ اس لیے کہ کہیں پھر فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔

سزائے قتل ۳۰۹ھ میں ان کے مقدمہ کا آخری فیصلہ ہوا اور طے پایا کہ ۱۸ ذی قعدہ کو ان کی زندگی ختم کر دی جائے اس طرح کہ انھیں کوڑے مارے جائیں۔ ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیے جائیں۔ ان کا سر تن سے جدا کر دیا جائے۔ ان کے اعضا آگ میں جھلسائے جائیں اور اس کے بعد انھیں دجلہ کے پانی میں بہا دیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل کو کوئی نہ روک سکا۔

حلاج کی جان اس جرم میں لی گئی کہ وہ "انا الحق" یعنی "میں خدا ہوں" کا نعرہ لگاتے رہتے تھے۔ اس قول سے ان کا مطلب یہ تھا کہ وہ اتحاد ذات الٰہی کے قائل تھے۔ یعنی اپنی ذات کو ذاتِ الٰہی میں گم کر کے، ذات الٰہی کا ایک جزو

بن گئے تھے۔

حلاج کے اور بھی عقائد تھے، جو اس فیصلہ کا سبب بنے، مثلاً کوئی ایسا فریضہ نہیں ہے کہ انسان اس کی ادائیگی پہ مکلف ہو، صورت حال یہ ہے کہ حج ظاہر وہ ہے کہ انسان اپنے شہر سے ارض مقدس حجاز تک کا سفر کرتا ہے اور وہاں جا کر مناسک حج ادا کرتا ہے، لیکن اس کے علاوہ ایک دوسرا حج بھی ہے اور وہ ہے روحانی حج۔ اگر انسان اپنے نفس کی تربیت اور تکمیل کر چکا ہے تو وہ محسوس کر سکتا ہے کہ خود خانہ کعبہ اس کے پاس آگیا اور خود خانہ کعبہ نے اس کا طواف کیا، بجائے اس کے کہ وہ خانہ کعبہ تک جاتا اور وہاں طواف کرتا، جو حج ظاہر کی ایک معروف صورت ہے۔

کیا منصور کافر تھے؟ منصور کی ہلاکت کے بعد ان کے عقیدہ، مسلک اور مذہب کے بارے میں مختلف قسم کی رائیں مختلف لوگوں نے ظاہر کیں۔

ایک فریق تو یہ کہتا ہے کہ وہ کافر اور زندیق تھے، کتاب و سنت کی رو سے سوائے اس کے کہ انھیں کافر کہا جائے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ایک دوسرا گروہ ہے جو کہتا ہے کہ وہ بہت بڑے ولی اور برگزیدہ شخص تھے اور مقربین بارگاہ الٰہی میں داخل تھے۔ خدا کے ہاں ان کی بڑی منزلت تھی اور وہ اس سے بہت قریب تھے۔ ان کی طرف جو اقوال منسوب ہیں، ان کے ظاہری مفہوم و معنی سے لوگ مغالطہ میں پڑ گئے۔ ورنہ اگر وہ ان کے اصل مطلب اور مفہوم کو سمجھتے تو ہرگز ان کے بارے میں ایسی غلط رائے نہ قائم کرتے اور نہ ان کی تکفیر اور تفسیق کی جرأت کرتے۔

پہلے گروہ کے ہم نواؤں میں ابن ندیم بھی شامل ہیں، جن کا خیال ہے کہ منصور حلاج نے شعبدہ بازی سے کام لے کر تصوف کو اپنا شعار، اور پھر اپنی سپر بنا لیا تھا، ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ہر علم سے واقف ہیں، حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ ہر علم میں صفر محض تھے[1]

لیکن جو لوگ دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور حلاج کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ وہ بہت بڑے ولی اللہ تھے، ان کی سی برگزیدہ اور مقدس ہستی شاذ و نادر عالم وجود میں آتی ہے، وہ اپنی ذات اور ذات الٰہی کے اتحاد کے قائل تھے، یہی ان کا مضبوط اور مستحکم عقیدہ تھا۔ اس سلسلے میں ہم زیادہ نام نہیں چاہتے صرف دو ناموں پر اکتفا کریں گے۔

ایک تو حضرت جلال الدین رومی مشہور و عظیم فارسی شاعر جو منصور حلاج کی تعریف و توصیف علانیہ کرتے ہیں اور ذرا نہیں جھجکتے۔ اور دوسرے حضرت فریدالدین عطار، جو منصور حلاج سے اتنی عقیدت اور محبت رکھتے تھے کہ انھیں "شہید حق" کا خطاب دیا ہے۔

تصانیف و رسائل منصور حلاج نے تصوف اور طریق تصوف اور اپنے مخصوص عقائد و نظریات کی شرح و توضیح میں متعدد کتابیں لکھیں اور رسائل قلمبند کیے، ابن ندیم نے اپنی "الفہرست" میں ۴۷ تک کی تعداد گنائی ہے، جن میں سے چند کا ہم اس جگہ ذکر کرتے ہیں:

---

[1] الفہرست

(۱) کتاب الاحرف المحدثہ والازلیۃ والاسماء الکلیہ۔
(۲) کتاب الاصول والفروع۔
(۳) کتاب سر العالم والمبعوث۔
(۴) کتاب العدل والتوحید۔
(۵) کتاب علم البقاء والفناء۔
(۶) کتاب مدح النبی والمثل الاعلیٰ۔
(۷) کتاب ہو ہو۔

مذکورہ کتابیں منصور حلاج کی اہم ترین تصانیف میں شمار ہوتی ہیں۔

حلاج کا مذہب منصور کے مذہب اور عقیدہ کی اگر چھان بین کی جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے اپنی نظم و نثر میں جن خیالات و عقائد کا اظہار کیا ہے، وہ تین چیزوں پر مشتمل ہیں:

۱۔ ذاتِ الٰہی کا حصول ذاتِ بشری میں۔
۲۔ حقیقتِ محمدیہ کا قدم۔
۳۔ توحیدِ ادیان۔

حلاج کے نظریہ حلول کے بارے میں عنوان کے ایک معاصر اصطخری نے حسبِ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:

"حسین بن منصور، جو حلاج کے لقب سے مشہور ہیں، بیضا کے رہنے والے تھے۔ پیشہ کے اعتبار سے جلاہے تھے، ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جو شخص طاعت میں اپنے نفس کو پختہ کرلے، اپنے دل کو اعمال و اشغال صالحہ کا خوگر بنالے، ترکِ لذّات کا عادی ہو جائے، شہوات و خواہشات پر اقتدار حاصل کرلے، وہ مقام مقربین تک پہنچ جاتا ہے، پھر جب اس کا تزکیہ اور تنقیہ اور زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ بشریت کے حدود سے گزر جاتا ہے پھر جب اس میں بشریت کا شائبہ نہیں رہتا تو وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی روح میں تحلیل ہو جاتا ہے، جیسے حضرت عیسیٰ بن مریم، پھر وہ مطیع سے مطاع بن جاتا ہے۔ یعنی وہ کسی کی اطاعت کرتا نہیں، خود اس کی اطاعت لوگ کرنے لگتے ہیں۔ پھر وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے وہی ہوتی ہے، پھر اس کا کوئی فعل اس کا نہیں رہتا، بلکہ خود خدا کا فعل بن جاتا ہے۔"

حلاج کے اشعار اصطخری کی رائے کے پیشِ نظر حلاج انسان میں اللہ کے حلول کے قائل تھے، لیکن اس عقیدۂ حلول میں وہ تنہا نہیں تھے۔ حضرات شیعہ کے عقائد میں بھی یہ اہم عقیدہ ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حلاج نے یہ عقیدہ یہیں سے لیا اور اسی بنیاد پر اپنے عقیدہ حلول لاہوت اور ناسوت کی بنیاد رکھی۔ اس عقیدہ کی رو سے اللہ

انسان میں محبوب محب میں رب عبد میں حلول کر جاتا ہے۔
چنانچہ ذیل کے اشعار میں وہ کہتے ہیں :
" ہم دو روحیں ہیں،
جنھوں نے ایک بدن کی صورت اختیار کر لی ہے۔
جب وہ مجھے دیکھتا ہے،
میں اُسے دیکھتا ہوں،
جب میں اُسے دیکھتا ہوں،
وہ مجھے دیکھتا ہے "
ایک دوسرے مقام پر محبوب یعنی خدا کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :
" تو میری رگ و پے میں اور قلب میں جاری و ساری ہے،
جس طرح
آنسو میری آنکھوں سے جاری ہیں،
ضمیر، قلب میں اس طرح حل ہو گیا ہے،
جس طرح
روح بدن میں جذب ہو جاتی ہے "
حلاج روح محبوب اور روح نفس یعنی انسان اور اللہ کی روح کے امتزاج کے قائل تھے۔ ثبوت کے لیے اشعار ذیل ملاحظہ ہوں :
اے اللہ!
تیری روح، میری روح میں اس طرح سما گئی ہے،
جس طرح
شراب، آبِ زلال میں،
جب کوئی چیز،
تجھے مس ہوتی ہے، تو مجھے بھی مس ہوتی ہے۔
کیوں کہ،
تو اور میں، ہر حال میں ایک ہیں "

ان اشعار میں وہ امتزاج روح کو تشبیہ دیتے ہیں کہ جس طرح شراب اور پانی کو جدا نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح مجھے اور تجھے الگ نہیں کیا جا سکتا، جس طرح شراب اور پانی مل کر ایک ہو جاتے ہیں اسی طرح تو اور میں مل کر ایک ہوگئے ہیں۔

تضاد رائے لیکن منصور حلاج کی بعض ایسی تحریریں بھی ہیں، جو باہم مختلف ہیں مثلاً ابھی ہم اوپر کے اشعار میں بتا چکے ہیں کہ وہ امتزاج بشریت اور الوہیت کے قائل تھے، لیکن خود ہی اپنی ایک تحریر میں اس نظریہ سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں:

"جس شخص کا یہ خیال ہے کہ الہیت، بشریت میں ممزوج ہو سکتی ہے یا بشریت الہیت میں حلول کر سکتی ہے وہ کافر ہے، کیونکہ خدا سے بزرگ و برتر اپنی ذات اور صفات کے اعتبار سے فرد ہے، ان لوگوں کے مقابلہ میں جو اس کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور جن کے صفات عارضی ہیں۔ وہ کسی طرح بھی مخلوق سے مشابہت نہیں رکھ سکتا، نہ مخلوق خدا سے کسی درجہ میں مشابہت رکھ سکتی ہے۔ اس لیے یہ محال عقلی ہے۔"

اس تحریر کے پیش نظر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حلاج کے نزدیک لاہوت اور ناسوت، رب اور عبد، محبوب اور محب دو الگ الگ چیزیں ہیں، جو اپنی ذات اور حقیقت کے اعتبار سے بالکل جدا، متغائر اور متمائز ہیں۔

مسئلہ حلول کی نوعیت اگرچہ اس مسئلہ میں حلاج کی رائے میں بظاہر تضاد پایا جاتا ہے لیکن حلاج کے عقیدہ کا آخری اور مضبوط پہلو وہی ہے جس میں وہ عقیدۂ حلول کا حامل نظر آتا ہے۔

اس کا عقیدہ ہے کہ ذاتِ الٰہی، ذاتِ انسانی میں اس طرح حلول کر سکتی ہے کہ دونوں مل کر ایک ہو جائیں، جس طرح روح انسانی بدن انسانی میں داخل ہوتی ہے، اور پھر دونوں ایک بن جاتے ہیں۔ اس صورت میں انسان سے جو فعل سرزد ہوتا ہے، وہ درحقیقت ارادۂ انسانی نہیں ہوتا مشیت الٰہی ہوتا ہے۔ گویا انسان عین خدا بن جاتا ہے۔ اور خدا عین انسان بن جاتا ہے۔

دوسری عبارت میں اس خیال کا مطلب خود حلاج کے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ:

"انسان اپنی حقیقت کے اعتبار سے خدا ہے۔ بالخصوص اس صورت میں کہ اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا، اسی لیے اس نے ملائکہ کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں، جیسا کہ خود قرآن کریم سے ثابت ہے۔

یعنی ہم نے ملائکہ سے کہا، آدم کو سجدہ کرو۔ ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کر لیا۔ ابلیس نے انکار کیا اور استکبار کیا اور وہ کافروں میں شامل ہو گیا۔[1]

---

[1] سورہ بقرہ آیت ۳۴

حقیقت محمدیہ | حلاج نے اپنی کتاب "الطواسین" میں حقیقت محمدیہ کے قدم پر بڑی فلسفیانہ گفتگو کی ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو مختلف صورتیں ہیں:

ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ نور ازلی ہیں، جو قدیم ہے، حادث نہیں یعنی جو ہمیشہ سے ہے اور جسے کبھی فنا کا جھونکا نہیں بجھا سکتا۔ یہ نورِ محمدی دنیا اور کائنات کے عالم وجود میں آنے سے کہیں پہلے سے موجود تھا، اسی نور سے علم وعرفان کے سوتے پھوٹے

دوسری صورت آپ کی نبی مرسل کی ہے۔

اور یہ پہلی سے بالکل الگ ہے۔

حلاج نورِ محمدیؐ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

" آپ غیب کے نور کی روشنی تھے، ظاہر ہوئے اور لوٹ گئے۔"[1]

انوارِ محمدی اور نورِ نبوت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

" انوارِ نبوت آپ کے نور ازلی سے چمکے اور فروغ گیر ہوئے، آپ کے نور سے بڑھ کر کوئی نور بھی انور اور اظہر نہیں۔ نہ آپ کے قدم سے بڑھ کر کوئی اقدام ہے"[2]

ایک دوسرے مقام پر بتایا ہے کہ تمام علوم آنحضرتؐ کے بحرِ علم کا قطرۂ ناچیز تھے۔ تمام حکمتیں آپ کے سمندر کے سامنے ایک چھوٹی سی نہر تھیں، چنانچہ اس مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے منصور کہتے ہیں:

" آپ کے اوپر بادل تھے، جن سے بجلیاں کوندتی تھیں۔ آپ کے نیچے بجلیاں تھیں، جو چمکتی اور دمکتی تھیں۔ آپ کا سحاب نور برساتا تھا اور پھل لاتا تھا۔ تمام علوم آپ کے بحرِ بے پایاں کا ایک قطرہ ناچیز تھے۔ تمام حکمتیں آپ کی حکمت کے سمندر کے سامنے ایک چھوٹی سی نہر تھیں۔ تمام زمانے آپ کے زمانے کے سامنے ایک ساعت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔"[3]

آنحضرتؐ کے قربِ الٰہی کے پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے حلاج کہتے ہیں:

" حق آپ کا وجود ہے اور آپ کے وجود ہی سے حقیقت نمودار ہوئی ہے، آپ وصلت میں اول اور نبوت میں آخر تھے، آپ حقیقت کے باطن اور معرفت کے ظاہر تھے۔"

حلاج کے ان آثار و اقوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ قدیم کا کیا درجہ تھا۔ حلاج کا یہ نظریہ، حلاج ہی تک محدود نہ رہا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے صوفیوں نے بھی دوسرے الفاظ اور دوسرے رنگ میں اسے اختیار کیا۔ مثلاً محی الدین ابن عربی اور عمر بن الفارض۔ اور ان کے علاوہ دوسرے صوفیا کے ہاں بھی یہ رنگ نظر آتا ہے۔

---

[1] کتاب الطواسین [2] [3] نفس المرجع [4] کتاب الطواسین۔

توحید ادیان!

توحید ادیان!
یہ بھی منصور حلاج کا ایک نظریہ تھا!!

حلاج کا خیال تھا کہ تمام ادیان اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ ان کا فروعات میں اختلاف ہے، لیکن اصل کا جہاں تک تعلق ہے وہ ایک ہی ہے، تمام ادیان کا مرکز اور منبع خدا ہے۔ تمام ادیان خدا کے لیے ہیں ہر دین سے کوئی نہ کوئی گروہ وابستہ ہے، اپنی مرضی سے نہیں، بلکہ کسی بالادست قوت کی مرضی سے۔ جو شخص کسی مذہب کا بطلان کرتا ہے، وہ گویا حکم لگاتا ہے کہ فلاں مذہب اس نے خود اختیار کیا۔ اور یہ بات حلاج کی رائے میں مسلک قدریہ کے ذیل میں آتی ہے اور اس کے نزدیک اس اُمت کے مجوس جو لوگ کہلا سکتے ہیں، وہ قدریہ ہیں۔ حلاج کا یہ خیال بھی تھا کہ یہودیت اور مسیحیت اور اسلام اور دوسرے مذاہب، ان کے نام اور القاب جدا جدا ہیں۔ علامات و آثار میں بھی اختلاف اور تغائر ہے، لیکن جو مقصود اصلی ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں، وہ ایک ہی ہے۔

اللہ کی مشیت

دوسرے الفاظ میں حلاج کا مطلب یہ تھا کہ وہ صرف اللہ ہے جو اپنے بندوں پر اپنی مشیت نافذ کرتا ہے۔ اور وہ صرف خدا ہی ہے جو اپنے بندوں کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے کہ فلاں آدمی یہودی ہو، فلاں نصرانی مذہب اختیار کرے اور فلاں مسلمان کے گھر میں پیدا ہو، لہٰذا نہ کسی پر معترض ہونا چاہیے، نہ کسی سے دین کے بارے میں منافرت کرنی چاہیے کہ دین سب خدا کے ہیں، اور جو شخص دین کو اختیار کرتا ہے، اس میں بھی خدا کی مرضی اور مشیت شامل ہوتی ہے اور یہ جو اختلاف مختلف ادیان میں نظر آتا ہے، یہ اصلی اور جوہری اختلاف نہیں ہے، یہ صرف اسم اور مظہر کا اختلاف ہے اور نہ صحیح بات یہ ہے کہ تمام ادیان نام کے اعتبار سے متعدد ہیں۔ حقیقت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ مسمّٰی ایک ہے، اسم جدا جدا ہیں۔ یہ متنازع مظاہر ایک ہی حقیقت کے ہیں۔

جس طرح حقیقت محمدیہ کے سلسلہ میں حلاج کا نظریہ بعد کو دوسرے لوگوں نے قبول کیا، اسی طرح وحدت ادیان کے معاملہ میں بھی منصور حلاج کے نظریہ کی تائید و تقلید بعد کے دوسرے اکابر مثلاً محی الدین ابن عربی، عمر بن الفارض، جلال الدین رومی، عبدالکریم الجیلی اور دوسرے بہت سے سربرآوردہ اور سرآمدۂ روزگار صوفیا اور علما نے کی۔ شعرا نے اپنے اشعار میں اور مصنفین نے اپنی تصنیفات میں اس نظریہ کو سراہا اور اسے تسلیم کر کے اس کی توثیق اور تائید کی۔

اس نظریہ نے اسلام کی حیات روحیہ کی تاریخ پر گہرا اور دیرپا اثر ڈالا۔

حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر مہنویؒ

ولادت ———— غزنی ۳۵۷ھ

وفات ———— ۴۴۰ھ

دنیائے علم و عرفان کے پیشوا اور میدان تصوف کے شہسوار حضرت شیخ ابو سعید ابوالخیر پانچویں صدی ہجری کے اصحاب طریقت میں بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ کے کلمات طیبات نثر اور رباعیات کی شکل میں علم تصوف ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے، کم و بیش ایک سو تیرہ رباعیات اب بھی آپ کی یادگار باقی ہیں۔

آپ کے والد بزرگوار کا نام ابوالخیر تھا جو غزنی میں دوائیں بیچا کرتے تھے۔ پھر سلطان محمود غزنوی کے مصاحبوں میں شامل ہو گئے۔ جب حضرت شیخ ابو سعید نے ہوش سنبھالا تو غزنی کے علما کے درس میں جانے لگے اور حدیث و فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ بچپن ہی سے تصوف کے شیدا تھے۔ اور اس موضوع پر اکثر کتابیں دیکھتے رہتے تھے۔ مطالعہ کے ساتھ ساتھ تصوف سے دلچسپی بڑھتی گئی۔ بالآخر والد سے عرض کیا کہ مجھے رہنے کے لیے الگ مکان دے دیں تاکہ میں اطمینان سے مطالعہ میں لگا رہوں۔ والد بزرگوار نے اس کا انتظام کر دیا۔ چنانچہ مکان میں آپ نے جگہ جگہ کلمات تصوف اور قطعات قرآنی آویزاں کر رکھے تھے اور اُسے خوب سجایا تھا۔

ایک دن والد بزرگوار وہاں آئے اور گھر کی کیفیت دیکھی تو پوچھا تم نے یہ کلمات اور آیات یہاں آویزاں کر رکھی ہیں! آپ نے جواب دیا "ابا جان آپ نے اپنے گھر میں بادشاہ اور دوسرے بڑے لوگوں کی تصویریں ٹانک رکھی ہیں کیونکہ آپ کو ان لوگوں سے محبت ہے، مجھے ان چیزوں سے محبت ہے اس لیے میں نے اپنے ہاں یہ لگائی ہیں۔ شاید کسی دن میرا محبوب مجھ پر مہربان ہو جائے۔"

بیٹے کی اس نصیحت آموز بات نے باپ کے دل پر بڑا اثر کیا۔ چنانچہ جب وہ اپنے ہاں واپس گئے تو ساری تصویریں اتار دیں۔

ان دنوں مرو میں عبداللہ حصری اور قفال کے درس کی شہرت تھی۔ ابوالخیر نے ابو سعیدؒ کو مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے وہاں بھیج دیا۔ آپ وہاں چلے گئے۔ درس ختم ہونے پر روزانہ گھر آکر عبادت الٰہی میں مصروف ہو جاتے۔ غزنی میں

لہ یہ حالات اخبار الصالحین سے ملخصاً لیے گئے ہیں۔

رہ کر علوم ظاہری کی رہی سہی کمی بھی پوری کر لی اور اب علوم باطنی کی ضرورت محسوس کی۔ اس شوق میں مرو کو خیرباد کہا اور سرخش چلے گئے۔ جہاں ابوعلی فقیہہ کے درس میں شامل ہو کر فقہ اور تفسیر پر عبور حاصل کیا۔ تاہم کسی اہل باطن کی تلاش میں تھے۔

یہ خواہش یوں پوری ہوئی کہ آپ کو شیخ ابوالفضل سرخسی کی صحبت نصیب ہو گئی۔ آپ کا اپنا بیان ہے کہ میں کہیں جا رہا تھا ایک جگہ شارستان سرخش کے کنارے راکھ کے تودے پر لقمان مجنوں کو بیٹھا دیکھا۔ میں ان کی طرف ٹیلے کے اوپر چڑھ گیا۔ وہ اپنی پوستین سی رہے تھے۔ میں انھیں دیکھتا رہا۔ میرا سایہ ان کی پوستین پر پڑ رہا تھا۔ جب سی چکے تو فرمایا سعید ہم نے تم کو بھی پوستین کے ساتھ ٹانک لیا۔" یہ فرمایا اور اٹھ کر میرا ہاتھ پکڑا، پھر مجھے پیر ابوالفضل کی خانقاہ میں لے گئے۔ وہاں پہنچ کر شیخ کو آواز دی۔ وہ باہر تشریف لائے تو لقمان نے ان سے کہا "ابوالفضل! اسے اپنے پاس رکھو۔ یہ تمھارا ہے۔" یہ کہا اور میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ابوالفضل مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اندر لے گئے اور صفہ میں تشریف فرما ہو کر کتاب کا ایک جزو اٹھا کر دیکھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا اس کے اندر کیا ہوگا؟ ابوالفضل نے کشف سے میرے دل کی بات جان لی فرمایا "ابوسعید! اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر جو بھیجے ہیں تو اس لیے کہ لوگوں سے کہیں کہ سب کا معبود وہی ایک اللہ ہے۔ چنانچہ یہ لوگ آئے، جن لوگوں نے اس کلمہ کو کہا وہ اسی میں مستغرق ہو گئے۔"

آپ فرماتے ہیں شیخ کے یہ الفاظ میرے دل پر ایسے لگے کہ میں رات بھر نہ سو سکا۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے میں شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اجازت لے کر تفسیر پڑھنے کے لیے خواجہ بوعلی فقیہہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اس آیت کا درس دے رہے تھے: قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ ۔

جونہی میں نے یہ سنا میری حالت متغیر ہو گئی۔ خواجہ بوعلی نے میری حالت دیکھ کر فرمایا تم کل کہاں رہے۔ میں نے عرض کیا پیر ابوالفضل کے ہاں۔ فرمایا انھیں کے پاس چلے جاؤ۔ تمھارے لیے اُس حالت سے اِس حالت میں آنا حرام ہے۔

میں نے یہ سُن کر پیر ابوالفضل کی خانقاہ کا رُخ کیا اور پہنچ کر سلام عرض کیا۔ میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ پیر نے دیکھتے ہی فرمایا "ابوسعید ؎ مستک شدہ ہمی ندانی پس و پیش

ہاں گم نکنی تو ایں سررشتۂ خویش"

میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ انھوں نے فرمایا بیٹھ جاؤ اور اس کلمہ کی مزاولت رکھو کیونکہ اس سے تمھارے بہت سے کام انجام پائیں گے۔ چنانچہ جب تک شیخ زندہ رہے میں اپنی تمام مشکلات آپ سے حل کرتا رہا۔ شیخ کے وصال کے بعد شیخ ابوالعباس قصاب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک سال ان کے پاس گزارا۔

شیخ ابوالعباس صوفیوں کے جماعت خانہ میں ایک خاص جگہ پر برابر اکتالیس سال تک بیٹھے رہے تھے۔ رات کے وقت اگر کوئی شخص زیادہ نمازیں پڑھتا تو آپ اُس سے فرماتے میاں تم سو جاؤ اور آرام کرو۔ یہ بوڑھا جو کچھ کرتا ہے

تمھارے ہی لیے کرتا ہے۔ اسے خود ان باتوں کی ضرورت نہیں اور نہ اسے اُن سے کوئی فائدہ ہے۔

شیخ ابوالعباس سب کے ساتھ ایسا ہی کرتے تھے مگر ابوسعید کے ساتھ ان کا رویہ ایسا نہ تھا۔ ایک سال کی مدت میں انھوں نے ابوسعید سے کبھی نہ کہا کہ تم سو رہو اور نمازیں نہ پڑھو بلکہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ رکھا تھا۔ علاوہ ازیں اپنی کوٹھڑی کے برابر ایک کوٹھڑی انھیں دے رکھی تھی کہ اس میں رہ کر عبادت کیا کریں۔

ایک رات ابوالعباس صفہ سے باہر تشریف لائے، فصد کھلوائی۔ ابوسعید کو اس کا علم تھا۔ وہ بھی اٹھ کر باہر ان کی خدمت میں آ گئے، حضرت کے ہاتھ دھلائے، ان کے کپڑے اتارے اور اپنے کپڑے لا کر ان کے سامنے رکھ دیے۔ جب شیخ نے کپڑے پہن لیے تو اتارے ہوئے کپڑے ابوسعید نے خود دھوئے اور خشک ہونے کے لیے رسّی پر ڈال دیے۔ خشک ہونے پر تہ کر کے شیخ کے سامنے لے گئے۔ شیخ نے فرمایا یہ تم پہن لو۔

ابوسعید حکم بجا لائے اور شیخ کے کپڑے خود پہن لیے، پھر اپنی کوٹھڑی میں چلے گئے۔ جب صبح ہوئی تو لوگ شیخ کو ابوسعید کے اور ابوسعید کو شیخ کے کپڑے پہنے دیکھ کر متعجب ہوئے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ شیخ نے فرمایا "اسے دوش نثار ہا رفت ہم نصیب ایں جوان مہتکی آمد مبارکش باد!"

ابوسعید فرماتے ہیں: ایک مرتبہ شیخ کے پاس دو آدمی آئے کہنے لگے ہم میں ایک معاملہ پر بحث ہو رہی ہے ایک کہتا ہے اندوہ دائمی سب کچھ ہے، دوسرا کہتا ہے کہ نہیں، شادی دائمی سب کچھ ہے۔ آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ شیخ بولے "الحمد للہ کہ منزل گاہ پسر قصاب نہ اندوہ است و نہ شادی۔" (الحمد للہ کہ قصاب کے بیٹے کی منزل گاہ نہ اندوہ ہے نہ شادی) یعنی شیخ پر کوئی حال غالب نہ تھا بلکہ وہ خود تمام حالات پر غالب تھے اور وصول ذات کے مرتبہ پر فائز تھے جہاں امر متقابلہ سب مفقود ہیں۔ اس کے بعد شیخ نے فرمایا کہ "پسر قصاب بندہ خدا ایست در امر و نہی رہ مصطفےٰ دارد و متابعت سنت می کند۔"

جب دونوں آدمی چلے گئے تو میں نے پوچھا یا حضرت یہ کون لوگ تھے؟ فرمایا ایک ابوالحسن خرقانیؒ تھے اور دوسرے عبداللہ راستانیؒ۔

ابوسعید فرماتے ہیں جب مجھے شیخ کی خدمت میں ایک سال گزر گیا تو فرمایا اب تم اپنے وطن مہنہ جاؤ کچھ دنوں بعد یہی علم تمھارے دروازے پر نصب کریں گے۔ میں حکم پا کر وطن چلا آیا۔

صاحب نفحات الانس فرماتے ہیں: ماوراء النہر میں محمد ابو نصر حبیبی نام ایک بزرگ تھے۔ ان سے اور ابوسعید سے کبھی کی ملاقات نہ تھی۔ اسی اثنا میں خواجہ ابوبکر خطیب جو مرو کے اماموں میں سے تھے کسی کام کے لیے نیشاپور جا رہے تھے۔ شیخ محمد نے ان سے کہا کہ شیخ ابوسعید سے مل کر پوچھنا کہ میں نے ان سے جو سوال کیا تھا اس کا جواب دے دیں۔ خواجہ ابوبکر نے کہا آپ نے ان سے کیا سوال کیا تھا۔ انھوں نے کہا ان سے یہ پوچھنا کیا آثار محو ہو جاتا ہے کہتے ہیں انھوں نے کہا یہ مجھے یاد نہیں رہے گا۔ فرمایا اچھا لکھ لو۔

جب خواجہ ابوبکر نیشاپور پہنچے تو سرائے میں ٹھہرے۔ اتنے میں دو صوفی آئے اور سوچنے لگے کہ اس سرائے میں خواجہ ابوبکر خطیب کون ہے؟ میں نے کہا میں ہوں۔ وہ کہنے لگے شیخ ابوسعید نے سلام کیا ہے اور فرمایا ہے کہ کیا ہم محتاج ہیں کہ تم نے ہمارا گھر چھوڑ کر سرائے میں قیام کیا ہے۔ ہمارے میاں آجائیں۔ میں نے ان سے کہا حمام کر لوں تو آتا ہوں ابھی تک میں نے اس سلام و پیام کا کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔

جب میں غسل کر کے حمام سے باہر آیا تو ان دونوں درویشوں کو عود و گلاب ہاتھ میں لیے دیکھا۔ کہنے لگے ہمارے شیخ نے بھیجا ہے۔ جب میں ابوسعید کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے مجھے دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا:

اهلا لسعدی الرسول رحبالہ ؛ وجہ الرسول لحب وجہ المرسل

(سعدی کے پیامبر میرے سر اور آنکھوں پر۔ ایسے پیامبر کی صورت مجھے بھیجنے والے کی محبت کی وجہ سے پیاری معلوم ہوتی ہے)۔

میں نے ابوسعید کو سلام کیا۔ آپ نے جواب دیا اور فرمایا اگر تم اس پیر کی پیامبری کو باعث ذلت سمجھتے ہو تو یاد رکھو اس کا کلام ہمارے نزدیک بہت عزیز ہے۔ جب سے تم نے مرو سے باہر قدم نکالا ہے میں منزل بمنزل شمار کر رہا ہوں بتاؤ انھوں نے کیا کہا ہے؟

ابوبکر کہتے ہیں ہیبت کے مارے میری یہ حالت تھی کہ شیخ محمد کا سوال ہی بھول گیا۔ میں نے جیب سے کاغذ نکال کر شیخ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ انھوں نے فرمایا میں جواب دوں گا اور تم کو یہ جواب ابھی لے جانا ہوگا۔ اس لیے پہلے تم نیشاپور میں اپنا کام ختم کر لو۔ روانہ ہوتے وقت میرے پاس آنا۔

غرض میں نے اپنا کام ختم کر دیا۔ جب نیشاپور سے رخصت ہونے لگا تو شیخ سے جواب مانگا۔ آپ نے فرمایا اس پیر سے کہنا کہ تبقی وکا تذر مینی جب میں ہی نہیں رہا تو اثر کہاں باقی رہے گا۔ میں نے کمال عجز سے عرض کیا کہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ فرمایا کہ یہ کسی کے بیان میں نہیں آسکتا۔ اچھا یہ دو شعر یاد رکھو ؎

چشمم ہمہ اشک گشت و چشمم بگریست ؛ در عشق تو بے چشم ہمی باید زیست
از من اثرے نماند و این عشق ز چیست ؛ چون من ہمہ معشوق شدم عاشق کیست

میں نے عرض کیا یہ اشعار مجھے لکھ کر دے دیے جائیں۔ آپ نے حکم دیا اور حسن مودب نے اشعار کاغذ پر لکھ کر میرے حوالے کر دیے۔

جب میں مرو پہنچا شیخ محمد حیلی تشریف لائے۔ میں نے سارے واقعات ان سے بیان کر دیے اور دونوں اشعار بھی ان کو پڑھ کر سنا دیے۔ وہ سنتے ہی نعرہ مار کر زمین پر گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔ لوگ انھیں اٹھا کر لے گئے۔ ساتویں دن میں نے ان کی رحلت کی خبر سنی۔

ایک روز شیخ ابوسعید کے سامنے قوال یہ شعر گا رہے تھے ؎

اندر غزل خویش نہاں خواہم گشت — تا بر لب تو بوسہ دہم چونش بخوانی

آپ نے پوچھا یہ کس کی غزل ہے۔ عرض کیا گیا، عمارہ کی۔ شیخ نے اسی وقت ساتھیوں سے کہا اٹھو عمارہ کی ملاقات کو چلیں۔ چنانچہ ان کے ساتھ روانہ ہو گئے، زبان مبارک پر یہ رباعی جاری تھی ؎

در راہ یگانگی نہ کفر است و نہ دیں — یک گام ز خود بروں نہ و راہ ببیں

اے جانِ جہاں تو راہ اسلام گزیں — با مار سیہ نشیں و با خود منشیں

آپ سے پوچھا گیا تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ ستین سنۃ کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا اپنی نیستی میں ایک لمحہ کے لیے فکر کرنا اس عبادت یکسالہ سے بہت بہتر ہے جو اپنی ہستی کے خیال سے کی جاتی ہے۔ پھر آپ نے یہ رباعی پڑھی: ؎

تا روئے ترا بدیدام اے شمع طراز — نے کار کنم نہ از رہ دارم نہ نماز

چوں با تو بوم مجاز من جملہ نماز — چوں بے تو بوم نماز من جملہ نماز

استاد ابوصالح جو حضرت شیخ کے مقری تھے بیمار ہو گئے۔ آپ نے ابوبکر مودب کو جو آپ کے لڑکوں کو تربیت دیتے تھے بلایا اور کہا قلم دوات اور کاغذ لاؤ تاکہ ابوصالح کے لیے کچھ لکھ دوں۔ پھر یہ رباعی تحریر کرائی ؎

حوراں بہ نظارہ نگارم صف زد — رضواں بہ تعجب کف خود بر کف زد

آں خال سیاہ برآں رخاں مطرف زد — ابدال ز بیم چنگ بر مصحف زد

خواجہ ابوبکر نے یہ رباعی لکھ کر ابوصالح کو بھیج دی جسے باندھتے ہی تندرست ہو گئے اور اسی روز باہر تشریف لے آئے۔

ایک دن حضرت شیخ باہر بیٹھے تھے۔ اس وقت درخت کی پتیاں زرد تھیں۔ آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا:

تو از مہر زرد و من از مہر زرد — تو از مہر ماہ و من از مہر ماہ

کسی نے آپ سے بیان کیا کہ فلاں شخص پانی پر چلتا ہے۔ آپ نے فرمایا یہ کوئی مشکل بات نہیں جل مرغی اور ابابیل بھی پانی پر چلتے ہیں۔ پھر بیان کیا گیا فلاں شخص ہوا میں اڑتا ہے۔ فرمایا یہ بھی آسان ہے کوا اور مکھی بھی ہوا میں اڑتے ہیں۔ پھر کہا گیا فلاں شخص ایک لحظہ میں ایک شہر سے دوسرے شہر پہنچ جاتا ہے۔ فرمایا شیطان بھی ایک ساعت میں مشرق سے مغرب تک چلا جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا ان باتوں کی کوئی وقعت نہیں۔ مرد وہ ہے جو لوگوں میں اٹھے بیٹھے، ان سے لین دین کرے، شادی کرے، پھر ایک لحظہ کے لیے بھی خدا کی یاد سے غافل نہ رہے۔

کسی نے آپ سے تصوف کے معنی پوچھے، فرمایا " آنچہ در سرداری بنہی و آنچہ در کف داری بدہی و از آنچہ

برتو آید نہ جہی۔ پھر فرمایا اللہ بس باقی ہوس اور نفس سے انقطاع لازم ہے۔

آپ کا ارشاد ہے کہ بندہ اور خدا کے درمیان نہ تو آسمان و زمین حجاب ہیں اور نہ عرش و کرسی بلکہ اس کا تکبر اور غرور خود حجاب ہے یہ پردے درمیان سے اٹھ جائیں تو آدمی خود بخود خدا تک پہنچ جاتا ہے۔

آپ ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں سفر کے دوران ایک گاؤں میں گیا اور پوچھا یہاں کوئی بزرگ ہیں؟ معلوم ہوا ایک بزرگ تھے اور ان کے دیکھنے والوں میں صرف ایک بوڑھا شخص باقی رہ گیا ہے۔ میں نے اسے بلایا، جب وہ آیا تو میں نے پوچھا تم نے اس بزرگ کو دیکھا ہے۔ کہنے لگا ہاں! میں ان کے زمانہ میں کم سن تھا۔ میں نے پوچھا تم نے ان کی باتیں سنی تھیں؟ کہنے لگا۔ مجھ میں ان کی باتیں سمجھنے کی قدرت نہ تھی صرف ایک بات یاد ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیا؟ کہنے لگا ایک دفعہ ایک برتن پوش درویش سفر کرتا ہوا ان کے قریب گیا اور سلام کیا پھر کہا میں یہاں آیا ہوں تاکہ آپ کی صحبت میں آسائش ملے۔ ساری دنیا کا چکر لگا آیا ہوں مگر نہ اپنے آپ کو کہیں آسائش ملی نہ کسی کو آسائش میں دیکھا۔

بزرگ نے یہ سن کر جواب دیا " چہ از خویش دست نہ داشتی تا تو خود بیاسودی و خلق ہم از تو بیاسودندے "

شیخ ابوسعید فرماتے ہیں " اگفتیم این سخن تمام است کہ اگر ہمہ گفتہ برتر ازیں سخن نباشد " فرماتے ہیں " اصل این حدیث آں باشد کہ مرد را او برباد با تنگر ازند۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اللھم لا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین و لا اقل من ذالک۔ (اے میرے اللہ! مجھے ایک چشم زدن کے لیے بھی اپنے سے باز نہ رکھ)۔

شیخ ابوسعید فرماتے ہیں ایک دفعہ میں نے ایک بوڑھے صراف کو دیکھا۔ اس نے کہا اے شیخ سارے عالم میں ایک شخص بھی ایسا نہ چھوڑا جو مجھے پانی دیتا یا مجھے سلام کرتا۔ سب جانتے ہیں کہ ایک ساعت ہی کے لیے اپنے آپ سے آزاد ہو جائیں۔ اور میری خواہش ہے کہ ایک ساعت ہی کہیں کھڑا ہو جانے کی جگہ مل جائے۔ آخری عمر میں اس شخص کے بدن میں آگ لگ گئی اور جل کر مر گیا۔ چونکہ ابتدا ابتلا سے ہوئی تھی لہذا انتہا بھی ابتلا ہی سے ہوئی۔

ابوسعید فرماتے ہیں خدا کا ارشاد ہے وَلَذِكْرُ اللهِ أَكْبَرُ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر بزرگ تر ہے، اس طرح نہیں کہ تو اسے یاد کرتا ہے بلکہ اس طرح کہ وہ تجھے یاد کرتا ہے۔ اللہ کا ذکر تو بزرگ تر ہے مگر تمہارا ذکر کس حد تک بزرگ ہے یہ تم خود بھی جانتے ہو۔

فرماتے ہیں ایک شخص ایک بوڑھے کے پاس گیا اور کہا " اے پیر مرا سخنے بگوئے " پیر مرد تھوڑی دیر تک سر جھکائے رہا پھر سر اٹھا کر پوچھا " کیوں کیا میرے جواب کا انتظار ہے؟ " اس نے کہا ہاں! اس نے جواب دیا خدائے بزرگ و برتر کے علاوہ جتنی بھی چیزیں ہیں وہ اس قابل نہیں کہ ان کے متعلق کوئی بات تجھ سے کہوں اور جو بات حق جل شانہ سے متعلق ہے وہ ایسی ہے کہ بیان نہیں ہو سکتی۔

ایک شخص ایک مدت تک شیخ کی خدمت میں رہا۔ جب وہ بغداد جانے لگا تو شیخ نے پوچھا وہاں جاؤ گے تو کیا

کہو گے کہ کس کے پاس رہے۔ وہاں کیا دیکھا، کیا فائدہ اٹھایا۔ وہ کہنے لگا جو آپ کا ارشاد ہو۔ فرمایا جو شخص عربی جانتا ہو، اس کے سامنے یہ رباعی پڑھنا ؎

تالو خراسان خرجت شیئاً — لیس لہ فی جمال ثانی
فقلت لا تنکروا محاسنہ — فمطلع الشمس من خراسان

اور جو عربی نہ جانتا ہو اس کے سامنے یہ رباعی پڑھنا ؎

آنی کہ بہ خلد یادگار از تو برند — سبزی بہشت نوبہار از تو برند
در چین و خطا نقش و نگار از تو برند — خوباں ہمہ خال روزگار از تو برند

ایک روز حضرت شیخ ابوسعید اور شیخ ابوالقاسم گرگانی باہم بیٹھے تھے اور کچھ درویش جمع تھے۔ ایک درویش کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ان دونوں بزرگوں کا کیا مرتبہ ہے۔ شیخ ابوسعید نے اس شخص سے مخاطب ہو کر فرمایا جو شخص ایک ہی وقت میں ایک تخت پر دو بادشاہوں کو دیکھنا چاہتا ہے آکر دیکھے۔ درویش نے ان بزرگوں کی جانب غور سے دیکھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی نگاہ سے حجاب اٹھا دیے تاکہ شیخ کے کلام کی سچائی اس پر ظاہر ہو جائے۔ یہ دیکھ کر اس کے دل میں خیال آیا کہ کیا اللہ تعالیٰ کے ملک میں ان دو بادشاہوں سے بڑھ کر بھی کوئی ہے۔ شیخ ابوسعید نے کشف سے ان کے دل کی یہ بات بھی جان لی، اسی وقت فرمایا: "مختصر ملکے بود کہ ہر روزے دراں ملک چوں ابوسعید و ابوالقاسم ہفتاد ہزار فرو تر شود و ہفتاد ہزار برسد۔"

شیخ ابوسعیدؒ نے پیر ابوالفضل کے بعد شیخ ابوعبدالرحمان السلمیٰ نیشاپوری کی صحبت بھی اختیار کی تھی اور ان کے ہاتھ سے خرقہ بھی پہنا تھا۔ آپ خود فرماتے ہیں جب میں شیخ عبدالرحمان کے پاس گیا تو پہلی ملاقات پر آپ نے مجھ سے کہا آؤ تمھارے لیے اپنے قلم سے ایک بات لکھ دوں۔ میں نے عرض کیا لکھ دیجیے۔ فرمایا "سمعت جدی ابا عمرو ابن نجید السلمی . . . . الخ" (یعنی حضرت جنید بغدادی سے روایت ہے کہ تصوف بھی خلق ہے اور خلق کی تعریف حضرت امام ابوسہل صعلوکیؒ نے یہ فرمائی ہے کہ وہ اعتراض سے کنارہ کشی کرنے کا نام ہے ؎

بود علامت عرفاں نزاعتراض اعراض — نہ عارف ست و محقق کسی ایں علامت نیست

حضرت شیخ جس زمانے میں نیشاپور میں تھے، استاد ابوالقاسم قشیریؒ نے استدعا کی تھی کہ ہفتہ میں ایک بار ان کی خانقاہ میں تشریف لا کر مجلس فرمایا کریں۔ ایک منبر وہاں اسی غرض سے رکھ دیا گیا تھا اور اس پر کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔ ایک دفعہ ایک مجلس کے موقع پر لوگ آکر بیٹھتے جاتے تھے، شیخ ابوعبداللہ باکو بھی استاد ابوالقاسم کی مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے تھے۔ انھوں نے یہ صورت حال دیکھ کر پوچھا یہ کیا ہے؟ استاد نے جواب دیا مجلس منعقد ہو رہی ہے، شیخ ابوسعید کچھ فرمائیں گے۔ آپ بھی بیٹھیے اور سنیے۔

ابوعبداللہ نے جواب دیا مجھے ان پر اعتقاد ہی نہیں، مگر شیخ ابوالقاسم نے انھیں زبردستی بٹھادیا اور فرمایا ہوشیار رہنا خدا کے اس بندے کو خطرات قلوب پر آگاہی بخشی گئی ہے دل میں کوئی خیال نہ لانا۔

جب ابوسعید منبر پر تشریف لائے قرآن پاک پڑھا گیا۔ شیخ نے دعا فرمائی۔ جب شیخ کی گفتگو کا وقت آیا۔ ابوعبداللہ کے دل میں کچھ خیال آیا۔ شیخ نے مطلع ہونے پر جواب دے دیا اور کلام شروع کر دیا۔ جب آپ کی تقریر میں گرمی آئی، تو ابوعبداللہ نے دل میں کہا، اتنے مواقف پر حالت تجرید میں رہا ہوں، کئی مشائخ کو میں نے دیکھا ہے اور شروع ہی سے ان کی خدمت کرتا چلا آیا ہوں مگر اس مرد پر سب باتیں ظاہر ہو جاتی ہیں یہ کیا وجہ ہے۔ مجھ پر کوئی بات ظاہر نہیں ہوتی شیخ ابوسعید نے اس مرتبہ بھی ان کے دل کی بات کا جواب دیا یعنی ان کی طرف رُخ کر کے فرمایا اے خواجہ ے

تو چنانی کہ ترا بخت چناں است و چناں

من چنینم کہ مرا بخت چنیں است چنیں

اس کے بعد حضرت شیخ نے درود پڑھا، چہرے پر ہاتھ پھیرا، منبر سے اُتر آئے اور شیخ ابوالقاسم اور شیخ عبداللہ کے پاس بیٹھ گئے۔ استاد امام سے فرمایا کہ ان صاحب سے کہیے کہ میری طرف سے دل میلا نہ کریں۔ شیخ ابوعبداللہ نے جواب دیا میں اس وقت خوش ہوں گا جب آپ ہر پنجشنبہ کو میرے سلام کے لیے آنا موقوف کر دیں گے۔ شیخ نے فرمایا آپ پر بہت سے بزرگوں اور مشائخ کی نظریں پڑی ہیں، انھیں نگاہوں کے لیے آیا کرتا ہوں، نہ کہ آپ کے لیے۔

آپ کا یہ کلام سُن کر ساری مجلس کے لوگ رونے لگے۔ شیخ عبداللہ بھی بہت روئے اور اُس دن سے شیخ ابوسعیدؒ کی طرف سے دل صاف کر لیا اور وہ اب کبھی کبھی شیخ ابوسعید سے ملنے کے لیے آنے لگے۔

چونکہ حضرت ابوسعید سماع کے حق میں تھے اور ابوعبداللہ اس کے خلاف اس لیے اس بارے میں دونوں میں کسی قدر مخالفت باقی تھی جو کبھی کبھی ظاہر بھی ہو جایا کرتی تھی۔ چنانچہ ایک رات انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ہاتف کہہ رہا ہے "قوموا وارقصوا اللہ" جب بیدار ہوئے تو لاحول پڑھی کہ یہ شیطانی خواب تھا۔ دوسری مرتبہ پھر یہی خواب دیکھا، بیدار ہونے پر پھر لاحول پڑھی کہ یہ شیطانی خواب ہے۔ پھر ذکر فرمانے کے بعد قرآن پاک کی چند سورتیں پڑھیں۔

تیسری مرتبہ سوئے تو پھر یہی خواب دیکھا۔ اب خیال آیا کہ یہ شیطانی خواب نہیں، بلکہ مخالفت کی وجہ سے ہے جو سماع سے متعلق ہے۔ چنانچہ جب صبح ہوئی تو آپ حضرت شیخ ابوسعیدؒ کی خانقاہ میں تشریف لے گئے دیکھا تو حضرت شیخ خانقاہ کے اندر سے فرما رہے تھے "قوموا وارقصوا اللہ" جب شیخ نے ابوعبداللہ کو دیکھا تو خوش ہوئے اور دونوں کے دل سے یہ مخالفت جاتی رہی۔

ایک مرتبہ شیخ ابوسعید نے فرمایا میرے جنازے کے آگے آگے یہ رباعی پڑھنا

خوب تر اندر جہاں ازیں چہ بود کار
دوست بر دوست رفت یار بر یار!
آں ہمہ اندوہ بود ایں ہمہ شادی
واں ہمہ گفتار بود ویں ہمہ کردار!

حضرت شیخ ابوسعیدؒ کا سنِ ولادت ، ۳۵۷ ہجری بیان کیا جاتا ہے۔ غزنی میں پیدا ہوئے اور ۴ ماہ شعبان سنہ ۴۴۰ھ کو بروز جمعہ عشا کی نماز کے وقت اس دارِ فانی سے کوچ فرمایا۔ آپ کے جو اشعار اس وقت تک دستیاب ہوئے ہیں ان میں سے بعض اشعار (رباعیات) نمونہ کے طور پر درج کیے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں: ؎

یارب ، دلِ من زمعرفت بینا کُن — چشمم بجمالِ مصطفٰے بینا کُن!
روزے کہ چو لالہ سر بر آرم از خاک — در روضۂ مصطفٰے مرا ماوا کُن!

یارب چو شود روزِ قیامت ظاہر — وز ہر طرفے شود ملامت ظاہر
در روضۂ مصطفٰے برانگیز مرا — کز حضرت او شود سلامت ظاہر

رفتم بر طبیب و گفتم از درد نہاں — گفتا از غیر دوست بربند زباں
گفتم کہ غذا گفت ہمیں خونِ جگر — گفتم پرہیز گفت از ہر دو جہاں

گفتم کہ مرا تو بدیں زیبائی! — گفتا خود را کہ من خودم یکتائی
ہم عشقم و ہم عاشق و ہم معشوقم! — ہم آئینہ ہم جمال ہم بینائی!

اے در دلِ من اصلِ تمنا ہمہ تو — وے در سرِ من مایۂ سودا ہمہ تو
ہر چند بہ روزگار در می نگرم — امروز ہمہ توئی و فردا ہمہ تو

مجنون تو کوہ را ز صحرا نشناخت — دیوانۂ عشقِ تو سر از پا نشناخت
ہر کس بتو رہ یافت ز خود گم گردید — آنکس کہ ترا شناخت خود را نشناخت

اے آنکہ کشانیدہ ہر بندہ توئی — بیروں ز عبارت چہ و چندہ توئی
ایں دولتِ من بس کہ منم بندۂ تو — ویں عزّتِ من بس کہ خداوندہ توئی

آپ کا ایک شعر ہے ؎

بزیرِ قبہ تقدیس مست مستانند — کہ ہر چہ ہست ہمہ صورتِ خدا دانند

حضرت ابوعثمان سعید بن اسلام المغربی

وفات ——— نیشاپور ۳۷۳ھ

زبدۃ الاولیا، پیشوائے اصفیا حضرت ابوعثمان سعید بن اسلام المغربی سلسلۂ نقشبندیہ کے امام اور اولیائے کبار میں بڑا اونچا درجہ رکھتے تھے۔ شیخ ابوالحسن صائغ دینوریؒ کے مرید تھے۔ شیخ ابوعلی کاتب کے شاگرد تھے اور ان سے بھی خلافت حاصل کی تھی۔ ذکر و فکر اور انواع علوم میں کمال حاصل تھا۔

شروع میں بہت دولت مند تھے۔ سیر و تفریح کے شوقین تھے۔ بہت سے شکاری کتے پال رکھے تھے۔ زندگی میں انقلاب جس واقعہ کی بدولت پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ایک رات نوکروں نے پیالہ میں آپ کے لیے دودھ لاکر رکھا۔ چونکہ دودھ زیادہ گرم تھا آپ نے سرہانے رکھ دیا کہ ٹھنڈا ہو جائے۔ اس اثنا میں نیند آگئی اور سو گئے۔ جاگنے پر دودھ پینے لگے۔ ایک شکاری کتا دیکھ رہا تھا، وہ بھونکنے لگا۔ آپ دودھ پینے سے رک گئے۔ دوبارہ پینے کا قصد کیا تو وہ پھر بھونکنے لگا۔ غرض تین چار مرتبہ ایسا ہوا۔ بالآخر جب آپ پینے لگے تو کتا دوڑ کر آیا اور آپ پر جھپٹا۔ کتے نے دودھ میں منہ ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر آپ نے پیالہ رکھ دیا۔ کتے نے پیالے میں سے جس قدر دودھ پیا تھا اس کے اثر سے وہ ہلاک ہو گیا۔ بعد میں آپ نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ایک سانپ نے آکر پیالے میں سے کسی قدر دودھ پیا تھا اور اس وجہ سے دودھ میں زہر کا اثر شامل ہو گیا تھا جو کتے کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔

اس واقعہ نے آپ کو بہت متاثر کیا کہ کتے نے وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے مجھ پر سے اپنی جان قربان کر دی۔ چنانچہ اسی وقت حالت متغیر ہو گئی، دنیا کے دھندوں سے جی اچاٹ ہو گیا اور توبہ کر کے بزرگوں کی صحبت اختیار کی۔ تیس سال تک ویران جنگلوں اور بیابانوں میں رہ کر عبادت و ریاضت کرتے رہے، پھر مکہ معظمہ کا قصد کیا اور وہاں کے بہت سے مشائخ عظام سے ملاقاتیں کیں اور ان سے فیض حاصل کیا خود فرماتے ہیں کہ ابتدائے مجاہدہ میں بعض اوقات میری یہ حالت ہوتی کہ کھانا کھانے اور طہارت کے بعد وضو کرنے کے مقابلہ میں آسمان سے پھینکا جانا زیادہ پسند ہوتا۔"

آپ نے حبیب مغربی، ابوعمر زجاج اور ابویعقوب نہرجوری رحمۃ اللہ علیہم سے بھی فیض حاصل کیا۔ مکہ معظمہ میں رہ کر مجاوری بھی کی۔ ادب کی وجہ سے حدود حرم میں پاخانہ پیشاب تک کرنے سے اجتناب کیا۔ مکہ معظمہ سے نیشاپور واپس آئے تو پھر ساری عمر وہیں گزاری وہیں ۳۷۳ھ میں انتقال فرمایا اور ابوعثمان حیری اور ابوعثمان نعیمی کے پہلو میں دفن ہوئے۔

آپ کے اقوال و ارشادات سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہیں۔ فرماتے ہیں گنہگار مدعی سے بہتر ہے اس لیے کہ

وہ طریق توبہ کا خواستگار رہتا ہے جو خود ایک عبادت ہے اور مدعی ہمیشہ اپنے دعوے کے خیال میں رہتا ہے اور اپنے آپ کو ضائع اور برباد کرتا رہتا ہے۔

ایک روز آپ نے اپنے ایک خادم سے پوچھا اگر تم سے کوئی سوال کرے کہ تمہارا معبود کس حالت میں ہے تو کیا جواب دو گے۔ وہ کہنے لگا میں کہوں گا جس حالت پر ازل میں تھا۔ آپ نے فرمایا اگر وہ پوچھے کہ ازل میں کس حالت پر تھا تو کیا جواب دو گے۔ اس نے کہا میں کہوں گا، جیسا اب ہے۔ آپ نے سن کر فرمایا جواب خوب ہے۔

آپ فرماتے ہیں جو درویش خواہش نفسانی کے لیے امیروں سے رجوع کرتا ہے اس کے لیے فلاح نہیں اور اس کا کوئی عذر قابل قبول نہیں۔ فرمایا جس نے لوگوں کے حال کے ساتھ اپنے آپ کو مصروف کر لیا اس نے اپنی عمر ضائع کر دی۔ فرمایا ذاکر کے لیے لازم ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کو اپنے علم میں شامل کر لے اور اس کلمہ کی طاقت سے ہر اچھے اور بُرے خیال کو دل سے دور کر دے۔ جسے معرفتِ حق اور ذکرِ حق سے محبت ہوتی ہے اُس کی محبت کو موت بھی نہیں مٹا سکتی بلکہ یہ محبت اور راحت پہلے سے بڑھ جاتی ہے کیوں کہ محبت ہی محبت باقی ہوتی ہے۔ تفرقہ کے سب اسباب درمیان سے اٹھ جاتے ہیں۔

فرماتے ہیں اس درگاہ میں صرف دو باتیں رہبری کرتی ہیں، نبوت اور حدیث نبوت۔ نبوت تو ختم ہوگئی، حدیث نبوت باقی ہے اور اس کا راستہ مجاہدہ اور ذکر ہے۔ فرمایا جب تک آداب نفوس اور ریاست کا اثر باقی ہو مقاماتِ خاص تک نہیں پہنچا جا سکتا۔

فرمایا سفر کرنے والے کے لیے پہلے حرص، شہوت اور مراد نفس کو قطعی طور پر ترک کر دینا ضروری ہے۔ کیونکہ سفر غربت ہونے کی وجہ سے سراسر ذلت ہے، لیکن مومن کے لیے مخلوق کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل کرنا لازم نہیں۔

آپ فرماتے ہیں دوستی یہ ہے کہ جو چیز اپنے لیے پسند کی جائے وہی اپنے مہمان بھائی کے لیے پسند کی جائے، لیکن اس کی چیز کی ہرگز طمع نہ کرو۔ اس کا عذر قبول کرو اور اس کی سختی برداشت کرو۔ خود اس کا انصاف کرو، مگر اس سے انصاف نہ چاہو۔ خود اس کی اطاعت کرو مگر اس سے اطاعت نہ چاہو۔ اپنی نیکی بھلا دو مگر اُس کی نیکی نہ بھلاؤ۔

فرمایا تصوف علائق کو منقطع کرنا ہے۔ اتصال حقائق اور مخلوق کو چھوڑ دینا ہے۔ راحت میں موت کو درست کرنا شوق کی علامت ہے۔

آپ فرماتے ہیں کسی چیز کو جاننے کے لیے اس کی ضد کا جاننا ضروری ہے (جیسے نور اور ظلمت متضاد ہیں)، لہٰذا جب تک ریا کو نہ سمجھ لیا جائے، مخلص کا خلوص کامل نہیں ہو سکتا۔

آپ فرماتے ہیں کہ اعتکاف کی حقیقت فرمان سبحانہ تعالیٰ کے تحت جوارح کی نگہبانی اور محافظت ہے، اور صورۃً اعتکاف مسجد میں اقامت کرنا ہے۔

آپ فرماتے ہیں عارف کو غیب کے عجائبات دیکھنے کے لیے علم کی روشنی اور معرفت کی نورانی شعاعیں عطا کر دی جاتی ہیں۔

جب آپ مرض الموت میں گرفتار ہوئے تو طبیبوں کو بلایا گیا۔ آپ نے انھیں دیکھ کر فرمایا میرے طبیبوں کی مثال برادران یوسف جیسی ہے۔

وفات کے وقت آپ نے سماع سننے کی خواہش ظاہر کی اور اسی حالت میں وفات پائی۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت ابو عمرو ابراہیم زجاجیؒ جو اصحاب تصوف میں بہت اونچا درجہ رکھتے تھے اور اپنے عہد کے مشائخ کبار میں سے تھے حضرت ابو عثمان مغربی کے مرید تھے۔ ان کی وفات ۳۴۸ھ میں ہوئی۔

حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ

وفات ـــــــــــ ۴۵۰ھ

عارف ربانی، شہبازِ طریقت وحقیقت حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ سلسلہ نقشبندیہ کے اکابرین میں سے ہیں۔ اپنے عہد کے ممتاز اہلِ علم، صاحبِ زہد وورع اور سرِحلقہ اربابِ ذوق تھے۔ غوثِ وقت خواجہ ابوالحسن خرقانی[۱] قدس سرہٗ العزیز کے ہمعصر تھے اور شیخ عثمان مغربی رحمۃ اللہ علیہ سے پیوند تھا۔

صاحب مرأۃ الاسرار لکھتے ہیں کہ آپ کی روحانی تربیت حضرت خواجہ ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی تھی مگر سفینۃ الاصفیا میں ہر دو بزرگوں کا سن وفات ایک ہی درج ہے؛ جس سے دونوں ہم عصر معلوم ہوتے ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ یہ تربیت خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ کے حین حیات میں ہوئی ہوگی۔

حضرت شیخ علی ہجویری داتا گنج بخشؒ اپنی کتاب کشف المحجوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ مجھے ایک مشکل درپیش ہوئی جس کا میرے پاس کوئی حل نہ تھا۔ میں شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ کی خدمت میں گیا۔ آپ اس وقت مسجد میں تنہا کھڑے تھے اور مسجد کے ستون کو مخاطب کرکے میری مشکل کا حل بتا رہے تھے۔ میں نے سامنے آکر عرض کیا حضور یہ تو میری ہی مشکل کا حل ہے۔ خواجہ ابوالقاسم نے جواب دیا اللہ تعالےٰ نے ستون کو قوت گویائی دے دی تھی اور اس نے مجھ سے اس مشکل کا

---

[۱] خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ اپنے وقت کے غوث اور قطب الاقطاب تھے۔ خرقان کے رہنے والے تھے۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں گزرے ہیں۔ سن ولادت ۳۵۰ھ بیان کیا جاتا ہے۔ آپ کی نسبت چار واسطوں سے حضرت سلطان العارفین خواجہ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتی ہے۔ اگرچہ ان پڑھ تھے مگر علوم ظاہری وباطنی کے دروازے آپ پر کھول دیے گئے تھے۔ شیخ بوعلی سینا آپ کی شہرت سن کر خرقان آئے تھے؛ اور آپ کے گھر تشریف لے گئے تھے۔ سلطان محمود غزنوی بھی آپ سے ملاقات کرنے آیا تھا اور آپ نے اسے بہت سی نصیحتیں فرمائی تھیں۔ سلطان نے بہت سا روپیہ آپ کی خدمت میں پیش کیا، مگر آپ نے لینے سے انکار کر دیا۔ سلطان کو عبرت دلانے کے لیے آپ نے اُسے سوکھی روٹی کا ٹکڑا دیا کہ اسے کھاؤ۔ سلطان نے کھایا مگر خشک اور سخت ہونے کے باعث حلق میں اٹک گیا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا جس طرح یہ ٹکڑا تمھارے حلق میں پھنس گیا ہے، اسی طرح اشرفیاں میرے لیے ہیں۔ یہ میرے حلق سے نیچے نہیں اتر سکتیں۔

آپ نے پچھتر برس کی عمر میں ۴۲۵ھ میں خرقان میں وفات پائیؒ۔

حل پوچھا تھا۔ چنانچہ میں اسے جواب دے رہا تھا۔

آپ کا ارشاد ہے کہ آدمی کو چاہیے اپنے میں سے تمام نسبتیں گم کر کے بندگی کرے۔ طریقت میں نسبت سے مقصود نہیں ہے کہ بندہ کو یانت کا گمان ہو، نفی و اثبات، گم ہونا اور پالینا دونوں گمان ہیں۔

شیخ ابو علی فارمدیؒ [1] نے بھی ابتدائے حال میں خواجہ ابوالقاسم گرگانیؒ سے استفادہ کیا تھا۔ شیخ ابو علی ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ "میں امام ابوالقاسم قشیریؒ [2] کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا حال ان سے بیان کیا۔ آپ نے تحصیلِ علم کی ہدایت فرمائی۔ میں تین سال ہر روز ایک طرح کی روشنی اپنے میں دیکھتا جو زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ ایک روز شیخ نے فرمایا اب تعلیم ترک کر کے کلیۃً مشغولی بحق اختیار کرو۔ یہ حکم سن کر میں مدرسے سے خانقاہ میں آگیا اور آپ کی خدمت کرنے لگا۔

ایک روز آپ نہانے کا قصد کر رہے تھے۔ میں نے یہ دیکھ کر چند ڈول پانی کھینچ کر گرمابہ میں ڈالے کہ آپ کی تشریف آوری تک پانی گرم ہو جائے۔ جب آپ آئے اور نہا چکے تو پوچھا کہ گرمابہ میں کس نے پانی ڈالا تھا؟ میں نے عرض کیا اس خادم نے۔ آپ نے دعا دی اور فرمایا جو کچھ ابوالقاسم کو اس ستر برس میں حاصل ہوا تھا اے ابو علی! تو نے ایک ڈول کے عوض میں حاصل کیا۔ اس کے بعد عرصہ تک حضرتؒ کی خدمت میں مشغول مجاہدہ رہا۔

ایک روز میری یہ حالت ہوئی کہ میں اپنے آپ سے کھو سا گیا۔ جب افاقہ ہوا تو آپ سے اس کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا اب دوسری جگہ جا کر تحصیل نعمت مزید کرو۔ میں نے شیخ ابوالقاسم گرگانی طوسیؒ کا نام بہت سنا تھا۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا حال عرض کیا۔ آپ نے فرمایا ہاں ابتدائے حال ہے۔ مبارک باد۔ میں نے آپ کی خدمت میں قیام کیا اور ایک عرصہ دراز تک ریاضات و مجاہدات میں مشغول رہا۔" [3]

سفینۃ الاولیا میں آپ کا سن وفات ۴۵۰ھ بتایا گیا ہے۔

---

[1] شیخ ابو علی فارمدی قدس سرہٗ خراسان کے شیخ الشیوخ تھے۔ امام ابوالقاسم قشیریؒ کے شاگرد تھے۔ تصوف میں دو جانب منسوب ہیں، ایک شیخ ابوالقاسم گرگانی طوسی کی طرف دوسری شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کی طرف۔ آپ فارمد کے رہنے والے تھے جو طوس کے نواح میں واقع ہے۔ ۵۱۱ھ میں وفات پائی۔

[2] شیخ ابوالقاسم قشیری بڑے مرتبہ کے شیخ تھے۔ آپ رسالہ قشیریہ کے مشہور مصنف ہیں۔ اکابر اولیاء نے اس رسالہ کی شرحیں لکھیں۔ کتب تصوف میں اس کتاب کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی تفسیر لطائف الارشادات وغیرہ کا بھی نفحات الانس میں ذکر آیا ہے۔ لطائف الارشادات شیخ ابو علی دقاق کی تصنیف ہے آپ نے اس کی شرح لکھی۔ آپ شیخ موصوف کے مرید اور داماد تھے۔ آخر ربیع الاول ۴۶۵ھ میں وفات پائی۔ [3] اخبار الاصفیا

حضرت خواجہ ابو یوسف چشتیؒ

ولادت ــــــــــــــــ چشت ۳۷۵ھ

وفات ــــــــــــــــ چشت ۴۵۹ھ

سرورِ اہلِ مجاہدہ، وعالمِ علوم مشاہدہ حضرت خواجہ ابو یوسف چشتی رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ ابو محمد چشتیؒ کے حقیقی خواہر زادہ، پسر خواندہ اور مرید تھے۔ کرامات اور کمالات باطنی سے مالامال تھے۔ ریاضت و مجاہدہ میں بے مثل اور زہد و تقویٰ میں یگانہ تھے۔ ۳۷۵ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام نامی ابو یوسف اور لقب ناصر الدین تھا۔ والد بزرگوار کا نام محمد سمعان تھا۔ والدہ ماجدہ کا اسمِ گرامی عصمت خاتون تھا جو خواجہ ابو محمد چشتیؒ کی حقیقی ہمشیرہ اور بڑی عابدہ اور زاہدہ تھیں۔ دن رات خواجہ علیہ الرحمۃ کی خدمت گزاری میں حاضر رہتیں اور چرخہ کات کر رزقِ حلال کماتی تھیں۔

خواجہ ابو محمد پینسٹھ سال کی عمر تک متاہل نہیں ہوئے تھے۔ آپ کی ہمشیرہ آپ کی خدمت کیا کرتی تھیں۔ انھوں نے بھائی کی خدمت کا خیال کرتے ہوئے چالیس برس کی عمر تک شادی نہ کی تھی۔ ایک رات خواجہ محمد نے اپنے والد کو خواب میں فرماتے دیکھا کہ شام میں فلاں مقام پر محمد سمعان نام ایک شخص ہے، اپنی بہن کا نکاح اس سے کر دو۔ چنانچہ خواجہ ابو یوسف نے اس پر عمل کیا۔ ان سے خواجہ ابو یوسفؒ پیدا ہوئے۔ خواجہ محمد نے خود بھی پینسٹھ سال کی عمر میں نکاح کر لیا، مگر چونکہ اپنے قابلِ خدمت کوئی لڑکا نہ تھا اس لیے ابو یوسفؒ ہی کو اپنی اولاد کے برابر سمجھ کر پاس رکھ لیا تھا۔ ان کی تربیت کی اور اپنے بعد جانشین مقرر فرمایا۔

خواجہ ابو یوسف علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ ہو کر تھوڑے ہی عرصہ میں علم و فضل اور معرفت و حقیقت کے بلند درجہ کو پہنچ گئے۔

تحصیل علم سے فارغ ہونے پر حضرت خواجہ کے دست مبارک پر بیعت ہوئے۔ خواجہ نے فرمایا "اے فرزند! سات بار میرا نام لے کر آسمان کی طرف دیکھ"۔ آپ نے ایسا ہی کیا تو تحت الثریٰ تک نظر آ گیا۔ حضرت خواجہ کی نظرِ فیض اثر سے آپ پر علوم ربانی منکشف ہوئے۔ چنانچہ حضرت خواجہ نے خرقۂ خلافت عطا کر کے جانشین مقرر کیا۔ پیر و مرشد کے وصال کے بعد آپ نے رشد و ہدایت کا فرض سنبھالا اور بہت سے لوگوں کو مقصودِ حقیقی تک پہنچایا۔

اخبار الصالحین میں لکھا ہے "خواجہ ابو یوسفؒ کو انقطاع کلی پچاس سال کی عمر کے بعد حاصل ہوا۔ جب طبیعت اس طرف مائل ہوئی تو اپنے خواجہ حاجی مکی کے مزار کے پاس جو ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں نیز شیخ اسحاق کے مزار

کے پاس چلہ کشی اور ریاضت کرنی شروع کی اور مکان بنا کر بارہ سال وہیں بسر کر دیے۔ آپ کے سکر و فنا کی حالت یہ تھی کہ کبھی کبھی جب کہ خادم وضو کا پانی ہاتھوں پر ڈالتا ہوتا تھا۔ آپ اپنے آپ سے غائب ہو جایا کرتے تھے۔ اور دو ایک ساعت کے بعد ہوش میں آتے، اور وضو پھر ادا کرتے تھے۔ خواجہ عبداللہ انصاری آپ کے ہم عصر تھے۔ اور اسی زمانہ میں چشت میں آپ سے ملے ہیں۔ بادشاہوں میں آپ کا زمانہ ابوجعفر عبیداللہ الملقب بہ قائم بامراللہ خلیفہ عباس کا زمانہ تھا۔ سلاطین سلجوقیہ میں سے اس زمانہ میں سلطان طغرل بیگ بن میکائیل بن سلجوق حکمران تھا۔

نقل ہے آپ کو قرآن پاک حفظ نہ ہوتا تھا، جس سے بہت متردد تھے۔ ایک مرتبہ خواجہ ابو محمدؒ کو عالم مراقبہ میں فرماتے سنا "سو بار سورہ فاتحہ پڑھو تاکہ اس تردد سے نجات ملے۔ آپ نے ایسا ہی کیا اور قرآن پاک کو حفظ کر لیا۔"

آپ ہمیشہ فقر و فاقہ کی حالت میں رہتے تھے۔ لباس پھٹا پرانا ہوتا تھا۔ ہمیشہ فقرا کے ساتھ رہتے اور انھیں کے ساتھ کھانا کھاتے۔ اگر کوئی اہل دنیا آپ کی مجلس میں آجاتا تو چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا اس لیے کہ اہل دنیا سے سخت نفرت تھی۔ آپ روتے تھے اور فرماتے تھے "اے اللہ میں فقیر اور مسکین ہوں۔" آپ کے پاس جو کچھ نذر وغیرہ آتی سب فقرا کو دے دیتے۔ دن رات میں کئی بار قرآن ختم کیا کرتے تھے۔ پچاس برس کی عمر میں ایک تہ خانہ میں جو خود تیار کیا تھا، گوشہ نشین ہو گئے اور بارہ سال تک ریاضت کرتے رہے۔ یہ عبادت گاہ اب بھی موجود ہے اور زیارت گاہِ خلق ہے۔

آپ نے ۳ رجب ۴۵۹ھ کو وفات پائی۔ مزار مبارک چشت میں ہے۔

قطب الاقطاب حضرت خواجہ مودود چشتیؒ آپ ہی کے صاحبزادے تھے۔ آپ ہی کے مرید اور خلیفہ بھی ہیں۔ انھوں نے ۵۲۷ھ میں وفات پائی۔ مزار مبارک چشت میں ہے۔

حضرت ابوالحسن علی ہجویری داتا گنج بخشؒ

ولادت ــــــــــــ غزنی ۴۰۰ھ

وفات ــــــــــــ لاہور ۴۶۵ھ

سرحلقہ جملہ اقطاب و محرم جمیع ابواب ابوالحسن علی داتا گنج بخشؒ اپنے عہد کے امام یکتا اور اپنے طریق میں یگانہ تھے۔ علم اصول میں امام اور اہل تصوف میں بہت بڑا درجہ رکھتے تھے۔ قطب زماں خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بھی ان کی قبر پر چلہ کیا تھا۔ مشہور عالم کتاب "کشف المحجوب" داتا گنج بخشؒ ہی کی معرکہ آرا تصنیف ہے۔

حسب ونسب اور ابتدائی زندگی

۴۰۰ھ میں غزنی کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اصل نام ابوالحسن علی ہے۔ سلسلہ نسب یہ ہے: علی بن سید عثمان بن سید علی بن عبدالرحمان بن شاہ شجاع بن ابوالحسن علی بن اصغر بن سید زید شہید بن حضرت امام حسن علیہ السلام۔

ہجویر اور جلاب غزنی کے دو علاقے ہیں۔ شروع میں ان جگہوں پر قیام رہا اس لیے انھیں ہجویری اور جلابی کہتے ہیں۔ ابتدائی زندگی اور تعلیم کے متعلق پوری تفصیلات کا علم نہیں مگر ان کی تصانیف کے مطالعہ سے ان کی غیر معمولی علمی اور دینی استعداد کا پتہ چلتا ہے۔ علم شریعت کی تکمیل کے بعد طریقت کے منازل طے کرنے کے لیے آذربائیجان، خوزستان، عراق، بغداد، شام، دمشق، طوس، طبرستان، ترکستان اور دوسرے اسلامی ممالک کا سفر کیا[1]۔ اور وہاں کے جید علماء اور اولیاے کرام سے کسب فیض کیا۔ جن بزرگوں کی صحبت میں رہے ان میں ابوالقاسم قشیریؒ[2]، ابوسعید ابوالخیر، ابوالعباس اشقانی[3] اور ابوالقاسم گرگانی[4] خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

---

[1] اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں آپ نے ان تمام شہروں کے نام لکھے ہیں جہاں جہاں گئے۔

[2] شیخ ابوالقاسم قشیری تصوف کے مشہور رسالہ قشیری کے مصنف ہیں۔ ان کی اکابر اولیا نے شرحیں لکھیں۔ ربیع الاول ۴۶۵ھ میں وفات پائی۔ داتا گنج بخش ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ابوالقاسم وقت کے نادر تھے اور ان کی بات بڑی عزت کی۔ الخ سنتے تھے۔"

[3] ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "وہ بعض علوم میں میرے استاد تھے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا کوئی انسان نہیں دیکھا جو آپ کی طرح شرع کا پابند ہو۔"

[4] وفات ۴۵۰ھ خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ کے ہم عصر اور سلسلہ نقشبندیہ کے اکابرین سے تھے۔

اس سیر و سیاحت کے بعد لاہور آ کر سکونت پذیر ہوئے۔ یہ سلطان محمود غزنوی کا زمانہ تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ سے روایت ہے کہ داتا گنج بخشؒ لاہور اپنے مرشد کے حکم سے آئے۔ ان کے آنے سے قبل ان کے پیر کے مرید شیخ حسین زنجانیؒ لاہور میں مقیم تھے مگر جس شب کو وہ لاہور پہنچے اسی شب میں شیخ حسین زنجانیؒ نے انتقال فرمایا۔

کام | حضرت داتا گنج بخشؒ لاہور میں رہ کر اکثر تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف رہتے تھے مگر ایک لمحہ کے لیے بھی اشاعت اسلام سے غافل نہ ہوتے۔ آپ کی کوششوں سے سیکڑوں غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ ان اسلام لانے والوں میں لاہور کا ایک راجہ بھی تھا جو آپ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا۔

مقام | تصوف اور علوم دینیہ میں آپ کا درجہ بہت بلند مانا جاتا ہے۔ بعض مشائخ نے اپنے تذکروں میں آپ کو علوم ظاہر و باطن کا جامع قرار دیا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت بابا فرید الدین شکر گنجؒ جیسے اولیائے عظام نے آپ کے مزار پر چلہ کشی کر کے فیوض و برکات حاصل کیے۔ داتا صاحب کی درگاہ میں ان دونوں اکابر مشائخ کے اعتکاف کے حجرے موجود ہیں۔

"گنج بخش" لقب کی وجہ | کہا جاتا ہے کہ جب خواجہ معین الدین اجمیریؒ اعتکاف[1] ختم کر کے داتا صاحب کے مزار سے رخصت ہونے لگے تو یہ شعر پڑھا ؎

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا — ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

چنانچہ اس واقعہ کے بعد آپ کو "گنج بخش" کے لقب سے پکارا جانے لگا۔

مشاغل | آپ نے تصوف پر "کشف المحجوب" نام سے ایک کتاب تصنیف فرمائی۔ اس کے علاوہ حسب ذیل کتابیں بھی آپ کی تصنیف بتائی جاتی ہیں: (۱) منہاج الدین (اس میں اہل صفہ کے مناقب لکھے تھے) بقیہ اور کتابوں کے مضامین ان کے

---

[1] یہ عبادت کا ایک طریقہ ہے، جس میں انسان کچھ عرصہ کے لیے دنیا سے قطع تعلق کر کے صرف عبادت الٰہی میں مصروف ہو جاتا ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ غسل کر کے پاک کپڑے پہن کر عبادت کی نیت کی جاتی ہے۔ اور اس مخصوص عرصہ کے لیے آدمی گھر سے نکل کر مسجد کے کسی گوشہ میں بیٹھ جاتا ہے اور وہیں عبادت اور شب بیداری کرتا ہے۔ کھانا پینا اور سونا سب وہیں ہوتا ہے، صرف حوائج ضروریہ کے لیے ادھر اُدھر جا سکتا ہے۔ اس دوران میں گفتگو بھی نہیں کرتا۔ علما اعتکاف کو سنت قرار دیتے ہیں اور اسے بہت ثواب سمجھا جاتا ہے۔ اہل فقہ نے رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف کی بہت فضیلت بیان کی ہے۔ کیوں کہ شب قدر اسی مدت میں آتی ہے۔ چنانچہ راتوں کو جاگنا اور عبادت کرنا بہت ثواب سمجھا جاتا ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ آنحضرتؐ بھی آخری عشرہ رمضان میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ اعتکاف کے لیے دس دن ضروری نہیں اس سے کم مدت کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور رمضان کے علاوہ اور مہینوں میں بھی کیا جا سکتا ہے۔

نام سے ظاہر ہیں (۲) کتاب الفناء والبقاء (۳) اسرار الخرق والمونات (۴) کتاب البیان لاہل العیان (۵) بحر القلوب۔ (۶) الرعایۃ لحقوق اللہ۔

لیکن ان کتابوں میں سے اب کسی کا بھی پتہ نہیں ہے۔ ہم تک ان کی صرف کشف المحجوبؒ پہنچی ہے۔ جس میں تصوّف کے اسرار و رموز پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تصوّف کے تمام پہلوؤں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں اسلامی تصوف پر یہ پہلی کتاب ہے، جس میں داتا گنج بخشؒ نے محققانہ طرزِ تحریر سے اپنے مجاہدات و مکاشفات اور تمام ذاتی تجربات بیان کیے ہیں۔ مباحثِ سلوک پر بہترین تنقید کی گئی ہے اور کئی ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر زمانہ میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے مثل سمجھی گئی ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کا ارشاد ہے کہ جس کا کوئی مرشد نہ ہو اس کو کشف المحجوب کے مطالعہ کی برکت سے مل جائے گا۔ حضرت شرف الدین یحیٰی منیریؒ اپنے مکتوبات میں جا بجا اس کا ذکر فرماتے ہیں۔ حضرت جہانگیر اشرف سمنانیؒ کی تصنیف لطائف اشرفی میں اس کا حوالہ بکثرت موجود ہے۔ ملّا جامی رقمطراز ہیں:

"کشف المحجوب از کتب معتبرہ مشہورہ فن است ولطائف وحقائق دراں کتاب جمع کردہ است۔"

دارا شکوہ لکھتے ہیں:

"حضرت علی ہجویری را تصنیف بسیار است اما کشف المحجوب مشہور و معروف است و ہیچ کس را براں سخن غلبت شدی است کامل، در کتب تصوّف بخوبی آں در زبانِ فارسی کتاب تصنیف نہ شدہ۔"

کشف المحجوب کی تصنیف کا سبب ابوسعید ہجویری کا ایک استفسار ہے، جو تصوّف کے رموز و اشارات کو شیخ ہجویری سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ اسی کے جواب میں شیخ نے تصوّف کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ جس سے کشف المحجوب تصوّف کی قابلِ قدر کتاب بن گئی ہے۔ اس کے ذریعہ گویا پہلی مرتبہ اسلامی تصوّف کو ہندوستان میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کے مباحث ناظرین کے سامنے زیادہ تفصیل سے پیش کیے جاتے ہیں۔

کتاب کا پہلا باب علم کی بحث سے شروع ہوتا ہے۔ اس باب میں پانچ فصلیں ہیں۔ شروع میں کلام مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں علم کی اہمیت دکھا کر یہ بتایا ہے کہ علم ہی کے ذریعہ ایک سالک، مراتب اور درجات کے حصول کے قابل ہوتا ہے اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنے علم پر عمل بھی کرتا ہو۔ پھر علم کی دو قسمیں بتائی ہیں (۱) علم خداوند تعالیٰ (۲) علم خلق۔ اور ان کی تصریح اس طرح کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم کے نزدیک اس کے بندوں کا علم بالکل ہیچ ہے۔ وہ تمام موجودات اور معدومات کو جانتا ہے۔ بندوں کا علم ایسا ہونا چاہیے کہ ظاہر و باطن میں نفع بخش ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں (۱) اصولی یعنی ظاہر میں کلمۂ شہادت پڑھنا اور باطن میں معرفت کی تحقیق کرنا (۲) فروعی یعنی ظاہر میں معاملہ نہ کرنا اور باطن میں اس کے لیے صحیح نیت رکھنا۔

ہجویری کے نزدیک ظاہر بغیر باطن کے منافقت ہے اور باطن بغیر ظاہر کے زندقہ۔ علم باطن حقیقت اور علم ظاہر شریعت ہے

علم حقیقت کے تین ارکان ہیں :

۱ - خداوند تعالیٰ کی ذات کا علم: یعنی وہ ہمیشہ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ نہ کسی مکان میں ہے نہ جہت - اس کا کوئی مثل نہیں -

۲ - خداوند تعالیٰ کی صفات کا علم یعنی وہ عالم ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے دیکھتا ہے اور سنتا ہے -

۳ - خداوند تعالیٰ کے افعال کا علم، وہ تمام خلائق کا پیدا کرنے والا ہے -

علم شریعت کے بھی تین ارکان ہیں : کتاب سنت اور اجماع امت -

پہلا علم گویا خدا کا علم ہے اور دوسرا خدا کی طرف سے بندہ کو عطا کیا ہوا علم۔ ہجویری نے صوفیائے کرام کے اقوال اور اپنے دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس شخص کو خدا کا علم یعنی علم حقیقت نہیں اس کا دل جہالت کے سبب سے مردہ ہے۔ اور جس شخص کو اس کا عنایت کیا ہوا یعنی علم شریعت نہیں اس کا دل نادانی کے مرض میں گرفتار ہے۔ شیخ نے دونوں علموں کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے اور حضرت ابوبکر وراق ترمذیؒ کے اس قول کی تائید کی ہے کہ جس شخص نے صرف علم توحید پر اکتفا کیا وہ زندیق ہو گیا۔

دوسرا باب فقر سے شروع ہوتا ہے، اس میں تین فصلیں ہیں : پہلی فصل میں کلام مجید اور احادیث کی روشنی میں دکھایا ہے کہ فقر کا مرتبہ خدا کے نزدیک بہت بڑا اور افضل ہے اور فقیر کی تعریف یہ ہے کہ اس کے پاس کچھ نہ ہو۔ اس کی کسی چیز میں خلل نہ آئے - نہ دنیاوی ساز و سامان ہونے سے مالدار ہو جائے اور نہ اس کے نہ ہونے سے محتاج ہو جائے یعنی اس کا ہونا اور نہ ہونا اس کے نزدیک برابر ہو، بلکہ نہ ہونے سے اور بھی زیادہ خوش ہو۔ کیوں کہ فقیر جتنا تنگدست ہوگا اسی قدر اس پر حال زیادہ کشادہ ہوگا اور اسرار زیادہ منکشف ہوں گے، وہ جس قدر دنیا کے مال و متاع سے بے نیاز ہوتا ہے اتنا ہی اس کی زندگی الطاف خفی اور اسرار روشن سے وابستہ ہوتی جاتی ہے اور رضائے الٰہی کی خاطر وہ دنیا کی تمام چیزوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ ایک فقیر کا کمال فقر یہ ہے کہ اگر دونوں جہان اس کے فقر کے ترازو کے پلڑے میں رکھے جائیں تو وہ ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہوں، اور اس کی ایک سانس دونوں عالم میں نہ سمائے ۔

دوسری فصل میں صوفیانہ نقطۂ نظر سے فقر و غنا پر بحث کی ہے ۔ بعض صوفیائے کرام کا خیال ہے کہ غنا فقر سے افضل ہے - ان کی دلیل ہے کہ غنا خداوند تعالیٰ کی صفت ہے، فقر کی نسبت اس کی جانب جائز نہیں اور دوستی میں ایسی صفت جو خدا اور بندہ کے درمیان مشترک ہو ضرور پائی جائے گی اور یہ اس صفت یعنی فقر سے بہتر ہے، جس کو خداوند تعالیٰ کی جانب منسوب کرنا روا نہیں ۔

شیخ ہجویریؒ نے اس منطقیانہ دلیل کو منطقیانہ دلائل ہی سے رد کیا ہے۔ مثلاً خدا کی صفات میں مماثلت کی کوشش میں برابر ہونے کی دلیل ہے، مگر خداوند تعالیٰ کی صفت قدیم ہے اور خلق کی صفت حادث ہے، اس لیے دونوں میں

مماثلت ممکن نہیں۔ غنی خدا کے منجملہ اور ناموں کے ایک نام ہے۔ یہ اسی کے لیے زیبا ہے۔ بندہ اس نام کا مستحق نہیں ہو سکتا بندہ کے غنا کا کوئی سبب ہوتا ہے مگر خدا کا غنا سب سے بے نیاز ہے۔ خلق کے غنا میں حدوث و تغیرات ہوتے ہیں، خالق کا غنا اس سے دور ہے۔ اس کی قدرت کا کوئی مانع نہیں۔ وجود بشری کو حاجت لازم ہے، کیوں کہ حدوث کی علامت احتیاج ہے اور جب احتیاج پیدا ہوتی ہے تو پھر غنا کیوں کر باقی رہ سکتا ہے؟ اس تشریح و تفصیل کے بعد ہجویری نے غنا کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفت قرار دیا ہے جو ایک بندہ کے لیے کسی طرح سزاوار نہیں۔

شیخ ہجویریؒ کے نزدیک بندہ کا غنی ہونا محال بھی نہیں الغنی من اغناہ اللہ یعنی غنی وہ ہے جس کو خدا غنی کر دے۔ اس لیے غنی باللہ فاعل ہے اور اغناہ اللہ مفعول ہے۔ فاعل بالذات تمام ہوتا ہے اور مفعول فاعل کی وجہ سے قائم ہوتا ہے اگر بندہ غنا سے سرفراز کیا جاتا ہے تو یہ اس کے لیے نعمت ضرور ہے، مگر اس نعمت میں غفلت اسی طرح آفت ہے جس طرح فقر میں حرص۔ اس لیے بندہ اگر غنی ہے تو اس کو فاعل نہ ہونا چاہیے اور اگر فقر رکھتا ہو تو اس کو حریص نہ ہونا چاہیے۔ ہجویریؒ کے نزدیک غنا میں دل کے غیر سے مشغول رہنے کا احتمال باقی رہتا ہے۔ اور فقر میں دل اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے جدا رہتا ہے۔ اس لیے فقر، غنا سے بہتر ہے اور جب ایک طالب خدا کے سوا دنیا کی تمام چیزوں سے مستغنی ہو جاتا ہے تو فقر و غنا کے دونوں نام اس کے لیے بے معنی ہو جاتے ہیں۔

تیسری فصل میں فقر و فقیر سے متعلق مشائخ عظام کے جو اقوال ہیں ان کی تشریح و تفصیل کی ہے۔ مثلاً حضرت رویم بن محمد فرماتے ہیں کہ فقیر کی تعریف یہ ہے کہ اپنے بھیدوں کو محفوظ رکھے اور اس کا نفس آفت سے مصئون ہو۔ اور وہ فرائض کا پابند ہو۔ ہجویریؒ نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ جو کچھ فقیر کے دل پر گزرے اس کو ظاہر نہ کرے اور جس کا ظہور ہو جائے اس کو چھپائے نہیں اور نہ اسرار کے غالب ہونے سے ایسا مغلوب ہو جائے کہ شریعت کے احکام ادا نہ کر سکے۔ یا مثلاً حضرت ابوالحسن نوری فرماتے ہیں کہ فقیر کی صفت یہ ہے کہ نہ ہونے کی صورت میں سکوت کرے اور ہونے کے وقت خرچ کرے اور خرچ کے لیے بے چین ہو۔ شیخ ہجویریؒ نے دو طرح سے اس کی تفسیر کی ہے، ایک یہ کہ نہ ہونے کے وقت سکوت گویا خداوند تعالیٰ کے رضا کی دلیل ہے اور اگر اس کے پاس کچھ ہو گیا تو گویا اس کو خداوند تعالیٰ کی جانب سے خلعت عطا ہوا مگر خلعت فرقت کی نشانی ہے، کیوں کہ محب خلعت قبول نہیں کرتا، اس لیے جو کچھ فقیر کو ملتا ہے اس کو وہ دوسروں کو دے کر جلد اپنے سے جدا کر دیتا ہے۔ دوسری تفسیر یہ کی ہے کہ فقیر کو سکون اسی وقت حاصل ہوتا ہے، جب وہ کسی چیز کا منتظر نہیں رہتا اور جب کوئی چیز حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اس کو اپنے سے غیر پاتا ہے اور غیر کے ساتھ اس کو آرام نہیں ملتا اس لیے اس کو ترک کر دیتا ہے۔

تیسرے باب میں صوفی کی اصلیت سے محققانہ بحث کی ہے۔ اس میں بھی تین فصلیں ہیں:

لفظ صوفی کی اصلیت ہمیشہ سے مختلف فیہ رہی ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ صوفی صوف کا کپڑا پہنتا ہے، اس لیے اس

نام سے منسوب ہوا دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ صفِ اوّل میں رہتا ہے۔ اس لیے اس نام سے پکارا جاتا ہے۔ تیسرے کا خیال یہ ہے کہ صوفی اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ اصحاب صفہ کے ساتھ دوستی رکھتا ہے اور چوتھے کی رائے یہ ہے کہ یہ لفظ اسم صفائے مشتق ہے۔ اسی طرح اور توجیہات ہیں مگر ہجویریؒ نے ان میں سے ہر ایک کو غلط قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ صوفی کو صوفی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنے اخلاق و معاملات کو مہذب بنا لیتا ہے اور طبیعت کی آفتوں سے پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں صوفی وہ ہے جس کا دل کدورت سے پاک اور صاف ہو، کیوں کہ تصوّف باب تفعل سے ہے جس کا خاصہ تکلف ہے۔ یعنی صوفی اپنے نفس پر تکلیف اٹھاتا ہے اور یہی تصوّف کے اصل معنی ہیں۔

اہل تصوّف کی تین قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔ صوفی جو اپنی ذات کو فنا کر کے خدا کی ذات پر بقا حاصل کرتا ہے اور اپنی طبیعت سے آزاد ہو کر حقیقت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

۲۔ متصوّف: جو صوفی کے درجہ کو مجاہدہ سے تلاش کرتا ہے اور اس تلاش میں اپنی ذات کی اصلاح کرتا ہے۔

۳۔ مستصوف: جو محض مال و منال اور جاہ و حشمت کے لیے اپنے کو مثلِ صوفی کے بنا لیتا ہے۔

پس صوفی صاحبِ وصول (یعنی وصل حاصل کرنے والا) متصوّف صاحبِ اصول (یعنی صوفی کے اصول پر چلنے والا) اور مستصوف صاحبِ فضول ہوتا ہے۔ دوسری فصل میں ہجویریؒ نے مشائخ کبار کے اقوال نقل کیے ہیں جن سے ان کے مذکورہ بالا خیالات کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت حسن نوری فرماتے ہیں کہ تصوّف تمام حظوظِ نفسانی کے ترک کرنے کا نام ہے اور صوفی وہ لوگ ہیں، جن کا دل بشریت کی کدورت سے آزاد ہو گیا ہو اور نفسانی آفتوں سے صاف ہو کر اخلاص سے مل گیا ہو، یہاں تک کہ غیر خدا سے بری ہو کر وہ صفِ اول اور درجہ اولیٰ میں پہنچ جاتے ہیں۔

حضرت حصری کا قول ہے کہ تصوّف دل اور بھید کی صفائی اور کدورت کی مخالفت کا نام ہے۔ ہجویریؒ نے اس کی تصریح یہ کی ہے کہ فقیر اپنے دل کو خدا کی مخالفت کے میل سے پاک رکھتا ہے۔ کیوں کہ دوستی میں موافقت ہوتی ہے اور موافقت مخالفت کی ضد ہے۔ جب مراد ایک ہوتی ہے تو مخالفت نہیں ہوتی۔ اس لیے دوست کو دوست کے حکم کی تعمیل کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے۔

حضرت شبلی کا قول ہے کہ صوفی وہ ہے کہ دونوں جہان میں خدائے عزّوجل کے یہاں کوئی چیز نہ دیکھے۔ ہجویریؒ نے اس کی تشریح کر کے بتایا ہے کہ بندہ جب غیر کو نہ دیکھے گا تو اپنی ذات کو نہ دیکھے گا۔ اس طرح اپنی ذات کی نفی اور اثبات سے فارغ ہو جائے گا۔

اس بحث میں ہجویریؒ نے حضرت جنیدؒ کے اس قول کی تائید کی ہے کہ تصوّف کی بنیاد آٹھ خصلتوں پر ہے، جس سے آٹھ پیغمبروں کی پیروی ہوتی ہے۔ یعنی تصوّف میں سخاوت ابراہیمؑ کی ہو۔ رضا حضرت اسماعیلؑ کی ہو۔ صبر حضرت ایوبؑ کا ہو

اشارات حضرت زکریاؑ کے ہوں۔ غربت حضرت یحیٰیؑ کی ہو۔ سیاست حضرت عیسٰیؑ کی ہو۔ لباس حضرت موسیٰؑ کا ہو اور فقر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہو۔

تیسری فصل میں ہجویریؒ کے مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ تصوّف محض علوم و رسوم کا نام نہیں بلکہ یہ ایک خاص اخلاق کا نام ہے۔ علوم ہوتا تو تعلیم سے حاصل ہوتا۔ رسوم ہوتا تو مجاہدہ سے حاصل ہوتا، مگر یہ نہ تعلیم سے حاصل ہوتا ہے اور نہ صرف مجاہدہ سے۔ اس اخلاق کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ خدا کے احکام کو ریا سے پاک ہو کر پورا کرنا۔
۲۔ بڑوں کی عزّت کرنا، چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آنا اور کسی سے انصاف و عوض نہ چاہنا۔
۳۔ نفسانی خواہشوں کا اتباع نہ کرنا۔

چوتھے باب میں صوفیوں کے لباس پر تین فصلوں پر بحث کی ہے۔ صوفی سنّتِ رسولؐ کی پیروی میں کمبل یا گدڑی لباس کے طور پر استعمال کرتا ہے، جو اس کے فقر و ریاضت کی دلیل ہے۔ مگر گدڑی پہننے کے لیے ہجویریؒ نے بہت سی شرطیں مقرر کی ہیں۔ گدڑی پہننے والوں کو تارک الدنیا، اللہ کا عاشق ہونا چاہیے۔ اس کے باوجود وہ خود گدڑی اُسی وقت پہن سکتا ہے جب اس کو مشائخ پہنائیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مؤخر الذکر اوّل الذکر سے ایک سال خدا کی خدمت لیں اور ایک سال اُس کے دل کی رعایت حاصل کریں۔ خلق کی خدمت یہ ہے کہ وہ سب کو بلا تمیز اپنے سے بہتر جانتا ہو اور ان کی خدمت اپنے لیے واجب سمجھتا ہو۔ مگر اپنی خدمت کی تفضیلت کا گمان مطلق نہ کرتا ہو۔ خدا کی خدمت یہ ہے کہ دنیا اور عقبےٰ کے مزے کو ترک کر دیتا ہو اور جو کام کرتا ہو صرف خدا کی خاطر کرتا ہو۔ دل کی رعایت یہ ہے کہ اس میں ہمّت ہو اس سے تمام غم دور ہوں اور وہ صرف اللہ کی طرف متوجہ ہو، جب یہ تینوں شرطیں پوری ہو جائیں تو شیخ اپنے مرید کو گدڑی پہنا سکتا ہے۔ گدڑی پہننا گویا کفن کا پہننا ہے۔ جس کے بعد زندگی کی تمام لذتوں اور آسائشوں سے کنارہ کش ہو کر صرف خدا کا ہو کر رہنا پڑتا ہے۔

چھٹا باب ملامت پر ہے۔ ہجویریؒ نے خلق کی ملامت کو خدا کے دوستوں کی غذا کہا ہے اور اس کی تین قسمیں بتائی ہیں:

ایک یہ کہ ایک شخص اپنے معاملات و عبادات میں درست ہو، پھر بھی خلق اس کو ملامت کرتی ہو، لیکن وہ اس کی پروا مطلق نہ کرتا ہو۔ مثلاً شیخ ابوطاہر حرمیؒ ایک بار بازار میں جا رہے تھے، ایک شخص نے ان سے کہا: "اے پیر زندیق کہاں جا رہے ہو"۔ ان کے ایک مرید نے اس سے جھگڑا کرنا چاہا، مگر انھوں نے روک دیا اور جب گھر آئے تو مرید کو بہت سے خطوط دکھائے، جن میں ان کو کسی میں شیخ زکی، کسی میں شیخ زاہد، کسی میں شیخ الاسلام اور کسی میں شیخ الحرمین کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا اور فرمایا ہر شخص اپنے اعتقاد کے مطابق جو چاہتا ہے مجھ کو کہتا ہے، مگر یہ سب اسم نہیں ہیں، القاب ہیں۔ کوئی مجھ کو زندیق کہے تو اس کے لیے جھگڑا کیوں کیا جائے۔

دوسری یہ کہ وہ دنیا کی جاہ و حشمت سے منہ موڑ کر خدا کی جانب مشغول ہو اور خلق کی ملامت کو روا رکھتا ہو کہ دنیا کی طرف

مائل نہ ہونے پائے۔ مثلاً ابو یزید رمضان کے مہینے میں سفر حجاز سے اپنے شہر میں واپس آئے تو لوگوں نے بہت اعزاز و اکرام سے ان کا استقبال کیا۔ اس خیر مقدم میں وہ خدا کی یاد سے غافل ہو گئے۔ انھوں نے اسی وقت اپنی آستین سے ٹکیہ نکال کر کھانا شروع کر دیا۔ لوگوں نے ان کو ٹکیہ کھاتے دیکھا تو ان کو ملامت کرنے لگے اور ان سے برگشتہ ہو گئے۔ ابو یزید نے قصداً ایسا کیا تاکہ وہ دنیا اور دنیا والوں کی طرف متوجہ نہ ہونے پائیں۔

تیسری یہ کہ وہ ضلالت و گمراہی میں مبتلا ہو اور اس سے خلق کی ملامت کے ڈر سے باز نہ آنا محض نفاق اور ریاکاری سمجھتا ہو، یہاں تک کہ شریعت کو بھی ترک کر دیتا ہو۔ جو ہجویری کے نزدیک صحیح نہیں۔

شیخ ہجویریؒ نے اس قول کی تائید کی ہے کہ ملامت عاشقوں کے لیے ایک تروتازہ باغ، دوستوں کے لیے ایک مائدہ ناز تفریح، مشتاقوں کے لیے راحت اور مریدوں کے لیے سرور ہے۔ آخر میں خود اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کیا ہے کہ میں ایک مرتبہ شیخ ابو یزید کے مزار پر تین مہینے حاضر رہا۔ ہر روز غسل اور وضو کر کے بیٹھتا تھا، مگر وہ کشف حاصل نہ ہوا جو ایک بار وہیں حاصل ہو چکا تھا۔ آخر میں وہاں سے اٹھ کر خراسان کی طرف چلا گیا۔ ایک گاؤں میں پہنچا تو ایک خانقاہ میں صوفیا کی ایک جماعت نظر آئی۔ میں اس جماعت کی نگاہ میں بہت ہی حقیر معلوم ہوا۔ ان میں سے کچھ کہنے لگے یہ ہم میں سے نہیں ہے، اور واقعی میں ان میں سے نہ تھا۔ انھوں نے مجھے ٹھہرنے کے لیے ایک کوٹھا دیا اور وہ خود اونچے کوٹھے پر ٹھہرے۔ کھانے کے وقت مجھ کو سوکھی روٹی دی اور خود اچھا کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد تمسخر سے خربوزے کے چھلکے میرے سر پر پھینکتے تھے اور طنز کی باتیں کرتے تھے، مگر وہ جتنا زیادہ طنز کرتے تھے، اتنا ہی میرا دل ان سے خوش ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ذلت اٹھاتے اٹھاتے وہ کشف حاصل ہو گیا جو اس سے پہلے نہ ہوا تھا۔ اس وقت مجھ کو معلوم ہوا کہ مشائخ جاہلوں کو اپنے یہاں کیوں جگہ دیتے ہیں۔

اس کے بعد پورے سات ابواب میں صوفیانہ نقطۂ نظر سے صحابۂ عظام، اہل بیت، اہل صفہ، تبع تابعین، ائمہ اور صوفیائے متاخرین کا ذکر ہے۔ چودھواں باب نہایت اہم ہے اس میں صوفیوں کے مختلف فرقوں کے عقائد پر ناقدانہ اور محققانہ مباحث ہیں۔ تفصیل غالباً نامناسب نہ ہوگی۔

پہلا فرقہ محاسبیہ ہے جو عبداللہ بن حارث کی جانب منسوب ہے۔ حارث کا عقیدہ تھا کہ "رضا" مقامات میں سے نہیں بلکہ احوال میں سے ہے۔ ہجویریؒ نے "رضا" اور مقامات کی تشریح کر کے حارث کی مدافعت کی ہے اور رضا کی دو قسمیں بتائی ہیں:

۱۔ خداوند تعالیٰ کی رضا بندہ سے۔

۲۔ بندوں کی رضا خداوند تعالیٰ سے۔

بندوں سے خداوند تعالیٰ کی رضا یہ ہے کہ وہ ان کو ثواب، نعمت اور بزرگی عطا کرتا ہے اور خداوند تعالیٰ سے بندوں کی رضا یہ ہے کہ وہ اس کے احکام کی تعمیل کریں۔ خداوند تعالیٰ اپنے احکام میں یا تو کسی چیز سے منع کرتا ہے یا عطا کرنے کا عہد کرتا ہے مگر اس کے احکام کے ماننے والے اس کے خوف و ہیبت میں ایسے ہی لذت محسوس کرتے ہیں جیسے اس کے لطف و کرم

سے حظ اٹھاتے ہیں۔ اس کا جلال اور جمال ان کی نظروں میں یکساں ہے اور یہ محض اس لیے کہ وہ اپنے اختیارات کو سلب کر لیتے ہیں۔ جس کے بعد ان کا دل غیر کے اندیشہ سے نجات پاکر تمام غم والم سے آزاد ہو جاتا ہے۔

اصحاب رضا چار قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک خداوند تعالیٰ کی عطا پر (خواہ وہ کیسی ہو) راضی رہتے ہیں۔ یہ معرفت ہے۔ دوسرے اس کی نعمتوں (دنیاوی) پر راضی ہوتے ہیں۔ وہ دنیا والے ہیں۔ تیسرے مصیبت پر راضی رہتے ہیں۔ یہ رنج ہے۔ چوتھے احوال و مقامات کی قید سے نکل کر صرف خداوند تعالیٰ کی خوشی پر رہتے ہیں۔ یہ محبّت ہے۔

دوسرا گروہ قصاریہ کا ہے۔ اس کے پیشوا ابو صالح بن حمدون بن عمارۃ القصار ہیں، جو خلق کی ملامت کو تزکیۂ نفس کے لیے ضروری سمجھتے۔ ملامت پر بحث پیچھے گزر چکی ہے۔ اس لیے ہجویریؒ نے اس موقع پر اس مسلک پر تفصیل کے ساتھ روشنی نہیں ڈالی ہے۔

اس کے بعد گروہ طیفوریہ اور گروہ جنیدیہ کا ذکر ہے۔ اوّل الذکر کے پیشوا امام ابوالقاسم الجنید بن محمد ہیں۔ پہلے گروہ کا عقیدہ سکر اور دوسرے کا صحو پر مبنی ہے۔ اس سلسلہ میں ہجویریؒ نے بتایا ہے کہ سکر اور صحو کیا ہیں۔ سکر حق تعالیٰ کی محبّت کا غلبہ ہے۔ ایک سالک جب محبوب کے جمال کو دیکھتا ہے تو اس کی عقل عشق سے مغلوب ہو جاتی ہے اور نہایت بےخودی میں اس کے ادراک اور ہوش باقی نہیں رہتے۔ اس پر محویت اور فنا کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ صحو محویت کے بعد حصول مراد کا نام ہے، جس میں جمال محبوب کے مشاہدہ سے حیرت اور وحشت باقی نہیں رہتی۔ صحو میں غفلت سے حجاب پیدا ہوتا ہے لیکن جب یہی غفلت محبّت بن جاتی ہے تو وہ کشف ہے۔ صحو غفلت کے قریب ہو تو سکر ہے اور سکر محبّت کے قریب ہو تو صحو ہے۔ جب دونوں کی اصل صحیح ہوں تو سکر صحو اور صحو سکر ہے۔ اس جزوی اختلاف کے باوجود دونوں ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں۔ لیکن جب دونوں کی اصل صحیح نہ ہوں تو دونوں بے فائدہ ہیں۔ ہجویریؒ خود جنیدی مسلک کے پابند تھے اور صحو کو سکر پر فوقیت دیتے تھے۔

ایک گروہ نوریہ کا ہے، جس کے پیشوا ابن الحسن نوریؒ ہیں۔ وہ درویشوں کی عزلت گزینی کو ایک نامحمود فعل سمجھتے اور صحبت کو ضروری قرار دیتے ہیں اور اصحاب صحبت کے لیے ایثار و کلفت برداشت کرنے کو بھی ضروری سمجھتے ہیں اور نہ اس کے بغیر صحبت حرام ہے اور اگر صحبت کے رسمی ایثار رنج و کلفت کے ساتھ محبّت بھی شامل ہو تو یہ اور زیادہ اولیٰ ہے۔ ہجویریؒ نے فرقہ نوریہ کے اس مسلک کو پسند کیا ہے۔

ایک گروہ سہلیہ کا ہے۔ اس کے پیشوا امام حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ ہیں۔ ان کی تعلیم اجتہاد، مجاہدۂ نفس اور ریاضت ہے۔ اجتہاد، مجاہدہ اور ریاضت کی غرض نفس کی مخالفت ہے۔ اس لیے ہجویریؒ نے نفس کی تصریح واضح طور سے کی ہے۔ فرماتے ہیں، نفس کی مخالفت تمام عبادتوں کا سرچشمہ ہے۔ نفس کو نہ پہچاننا اپنے کو نہ پہچاننا ہے۔ جو شخص اپنے کو نہیں پہچانتا وہ خدا کو نہیں پہچان سکتا۔ نفس کا فنا ہو جانا حق کے بقا کی علامت ہے اور نفس کی پیروی حق عزوجل کی مخالفت ہے۔ نفس پر جبر

کرنا یعنی نفسانی خواہشوں کو روکنا جہادِ اکبر ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ نے اس میں بڑا غلو فرمایا ہے۔ وہ نفس کے مجاہدہ کو مشاہدہ قرار دیتے ہیں۔ سہل تستریؒ کے اس مسلک سے بعض گروہوں کو اختلاف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مشاہدہ محض عنایت ایزدی پر منحصر ہے۔ مجاہدہ وصلِ حق کی علت نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ ایک شخص حجرہ کے اندر عبادت میں مشغول ہو پھر بھی حق سے دور ہو اور ایک شخص خرابات میں رہتا ہو، گنہگار ہو اور اسے قربِ خداوندی حاصل ہو۔ ہجویریؒ نے اس اختلاف کو محض الفاظ اور تعبیر کا اختلاف قرار دیا ہے کہ ایک شخص مجاہدہ کرتا ہے تو اس کو مشاہدہ حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا مشاہدہ کرتا ہے کہ مجاہدہ حاصل ہو۔ مشاہدہ کے بغیر مجاہدہ نہیں اور مجاہدہ کے بغیر مشاہدہ نہیں۔ اس رائے کے باوجود ہجویریؒ مجاہدہ کو مشاہدہ کی علت قرار نہیں دیتے، بلکہ اس کو وصلِ حق کا طریق اور ذریعہ سمجھتے ہیں۔

نفس کے بعد نفس کی خواہشوں کا ذکر ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بندہ دو چیزوں کا تابع رہتا ہے۔ ایک عقل کا، دوسرے نفس کی خواہشوں کا۔ جو عقل کا تابع ہوتا ہے، وہ ایمان کی طرف جاتا ہے اور جو خواہشات نفس کی پیروی کرتا ہے وہ کفر، گمراہی اور ضلالت کی طرف مائل ہے۔ حضرت جنیدؒ سے پوچھا گیا کہ وصلِ حق کیا چیز ہے فرمایا: "خواہشات نفس کا ترک کرنا۔" ہجویریؒ نے بھی اس کی تائید کی ہے اور کہا ہے کہ سب سے بڑی عبادت خواہشات نفس کا ترک کرنا ہے۔ گو اس کا ترک کرنا ناخن سے کھودنے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

ہجویریؒ نے خواہشات نفس کی دو قسمیں بتائی ہیں: ۱- لذت اور شہوت۔ ۲- جاہ طلبی۔
اول الذکر کے فتنے سے خلق محفوظ رہتی ہے، لیکن مؤخر الذکر سے خلق کے درمیان فتنہ پیدا ہوتا ہے۔ خصوصاً جب یہ ... بھی خانقاہوں میں ہو۔

ساتواں گروہ فرقہ حکیمیہ کا ہے۔ یہ گروہ حضرت ابوعبداللہ بن علی الحکیم الترمذی کی جانب منسوب ہے۔ اس فرقہ کا مسلک ہے کہ ولی اللہ خدا کا برگزیدہ بندہ ہوتا ہے، جو نفس کی حرص و آز سے پاک ہو کر اسرارِ الٰہی سے واقف ہوتا ہے اور اس سے کرامت ظاہر ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہجویریؒ نے ولی کی ولایت اور کرامت پر مفصل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کچھ بندوں کو اپنا دوست بناتا ہے۔ ان کی صفات یہ ہیں کہ دنیاوی مال و دولت سے بے نیاز ہو کر صرف ذاتِ خداوندی سے محبت کرتے ہیں۔ ان کے چہرے نورانی ہوتے ہیں۔ جب دوسرے لوگ ڈرتے ہیں تو وہ نہیں ڈرتے۔ اور جب دوسرے غم زدہ ہوتے ہیں تو یہ نہیں ہوتے اور جب ایسے لوگ دنیا میں باقی نہ رہیں گے تو قیامت آجائے گی۔ معتزلہ کا اعتراض ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام بندے اس کے دوست ہیں۔ کوئی بندہ خاص اور برگزیدہ نہیں ہوتا۔ اللہ کا خاص بندہ صرف نبی ہوتا ہے۔ ہجویریؒ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر زمانہ میں اپنے بندوں میں سے کسی ایک کو خاص بناتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے رسول کی رسالت کی دلیل روشن اور واضح ہوتی رہے۔
فرقہ حشوی خاص بندوں کا ہونا جائز سمجھتا ہے۔ مگر اس کا خیال ہے کہ ایسے بندے تھے ضرور، مگر اب نہیں ہیں لیکن

ہجویریؒ کہتے ہیں کہ ایسے بندے ہر زمانہ میں ہوتے ہیں اور ان کی قسمیں یہ بتائی ہیں :

اخیار - ابدال - ابرار - اوتار - نقباء - قطب یا غوث -

ایک گروہ کا اعتراض ہے کہ ولی اپنی ولایت کے باعث عاقبت سے بے خوف اور دنیا پر مغرور ہو سکتا ہے لیکن ہجویریؒ نے بہت سے اقوال سے ثابت کیا ہے کہ ولی وہ ہے جو اپنے حال میں فانی اور مشاہدہ حق میں باقی ہو، اسے اپنے وجود کی خبر نہ ہو اور نہ اس کو اللہ کے سوا غیر کے ساتھ قرار ہو - وہ مشہور ہوتا ہے لیکن شہرت سے پرہیز کرتا ہے، کیوں کہ شہرت باعث فساد و رعونت ہے -

جب ولی اپنی ولایت میں صادق ہوتا ہے تو اس سے کرامت ظاہر ہوتی ہے - کرامت ولی کا خاصہ ہے، کرامت نہ عقل کے نزدیک محال اور نہ اصول شریعت کے خلاف ہے - کرامت محض "مقدور خداوندی" ہے، یعنی اس کا ظہور کسب سے نہیں بلکہ خدا کی بخششوں سے ہوتا ہے -

اس کے بعد یہ بحث ہے کہ کرامت کا ظہور کب ہوتا ہے - ابویزیدؒ، ذوالنون مصریؒ اور محمد بن خفیفؒ وغیرہ کا خیال ہے کہ اس کا ظہور سُکر کے حال میں ہوتا ہے اور صحو کے حال میں ہو وہ نبی کا معجزہ ہے - ولی جب تک بشریت کے حال میں رہتا ہے وہ محجوب رہتا ہے اور جب خدا کے الطاف و اکرام کی حقیقت میں مدہوش ہو جاتا ہے تو اس حال میں (جو سُکر ہے) کرامت ظاہر ہوتی ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب ولی کے نزدیک پتھر اور سونا دونوں برابر ہو جاتے ہیں -

حضرت جنیدؒ اور ابوالعباس سیاریؒ وغیرہ کا مسلک ہے کہ کرامت سُکر میں نہیں بلکہ صحو اور تمکین میں ظاہر ہوتی ہے - ولی خدا کے ملک کا مدبر و واقف کار اور والی ہوتا ہے اور اس سے ملک کی گتھیاں سلجھتی ہیں، اسی لیے اس کی رائے سب سے زیادہ صائب اور اس کا دل سب سے زیادہ شفیق ہوتا ہے - مگر یہ مرتبہ تلوین اور سُکر میں حاصل نہیں ہوتا کیوں کہ تلوین اور سُکر ابتدائی مدارج ہیں اور جب یہ آخری منازل تمکین اور صحو میں منتقل ہو جاتے ہیں تو ولی برحق ہوتا ہے اور اس کی کرامت صحیح ہوتی ہے۔

اس بحث کے بعد اولیاء اللہ کی کرامتوں کا بیان ہے - پھر دو فصلوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ انبیا اولیا سے افضل ترین اور انبیا و اولیا، فرشتوں پر فضیلت رکھتے ہیں -

فرقہ خرازی : یہ فرقہ حضرت ابوسعید خرازؒ کی جانب منسوب ہے، جنھوں نے سب سے پہلے مقام فنا اور بقا سے بحث کی ہے، اس لیے اس فصل میں ہجویریؒ نے صرف فنا اور بقا پر روشنی ڈالی ہے -

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فنا سے مراد اپنی ذات اور وجود کا مٹا دینا اور بقا سے مراد خدا سے متحد ہو کر اس میں حلول کر جانا ہے لیکن ہجویریؒ نے ان دونوں کی تردید کی ہے - ان کے نزدیک ذات اور وجود کا نیست ہو کر خدا میں حلول کرنا محال ہے کیونکہ حادث، قدیم سے، مصنوع، صانع سے، مخلوق، خالق سے متحد اور ممتزج نہیں ہو سکتا - ہجویریؒ کے نزدیک فنا سے مراد شہوات و لذات کو ترک کر کے خصائص بشریت سے اس طرح علٰحدہ ہو جانا ہے کہ پھر محبت و عداوت، قرب و بُعد، وصل و فراق اور

محو و سکر میں کوئی تمیز باقی نہ رہ جائے اور جب یہ مقصود حاصل ہو جائے تو یہی بقا ہے۔ اس کو مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسانیت کے تعلقات سے کنارہ کش ہونے کا نام فنا ہے اور اخلاص و عبودیت کا نام بقا ہے یا علائق دنیوی سے علیحدہ ہونا فنا ہے اور خدا کا جلال دیکھنا بقا ہے۔ اس غلبۂ جلال سے یہ کیفیت ہوتی ہے کہ سالک دین و دنیا کو فراموش کر دیتا ہے۔ حال و مقام سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اس کی زبان حق تعالیٰ سے ناطق ہو جاتی ہے۔

فرقۂ خفیفی: یہ فرقہ حضرت ابو عبداللہ بن خفیفؒ کی جانب منسوب ہے۔ اس کا مذہب تصوف غیبت و حضور ہے۔ غیبت سے مراد دل کا اپنے وجود سے غائب رہنا اور حضور سے مراد اس کا خدا کے ساتھ رہنا ہے۔ اپنے سے غیبت، حق سے حضور ہے۔ یعنی جو شخص اپنے سے غائب ہے وہ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہے۔ ایک سالک کے اپنے سے غائب ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کے وجود کی آفتوں سے دور ہو۔ اس کی صفات بشری ختم ہو گئی ہوں اور اس کے تمام ارادے پاک ہوں۔

اس سلسلہ میں صوفیائے کرام نے یہ بحث کی ہے کہ غیبت حضور پر مقدم ہے یا حضور غیبت پر۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ غیبت سے حضوری حاصل ہوتی ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ حضوری سے غیبت حاصل ہوتی ہے۔ ہجویریؒ کا بیان ہے کہ دونوں برابر ہیں۔ کیوں کہ غیبت سے مراد حضور ہے جو اپنے سے غائب نہیں ہے وہ حق سے حاضر نہیں ہے اور جو حاضر ہے وہ غائب ہے۔ یہ نکتہ حضرت جنیدؒ کے حال سے واضح ہو جاتا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ مجھ پر کچھ زمانہ گزرا ہے کہ آسمان اور زمین میرے حال پر روتے تھے۔ پھر خدا نے ایسا کر دیا کہ میں ان کی غیبت پر روتا تھا۔ اور اب یہ زمانہ ہے کہ مجھ کو نہ آسمان کی خبر ہے نہ زمین کی اور نہ خود اپنی۔

اس کے بعد مختلف ابواب میں ہجویریؒ نے سالک کے طریق آداب پر بحث کی ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ سالک ہر حال میں حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کرتا ہو، بندوں کا حق بھی ادا کرتا ہو۔ اس کے لیے کسی شیخ کی صحبت ضروری ہے، کیوں کہ تنہائی اس کے لیے آفت ہے۔ جب کوئی درویش اس کے پاس آئے تو عزت کے ساتھ اس کا استقبال کرے۔ سفر کرے تو خدا کے واسطے کرے۔ یعنی اس کا سفر حج یا غزوہ یا علم یا کسی شیخ کی تربت کی زیارت کے لیے ہو۔ اس کا کھانا اور پینا بیماروں کے کھانے اور پینے کے مانند ہو اور حلال ہو۔ وہ دنیا دار کی دعوت قبول نہ کرے۔ چلے تو خاکساری اور تواضع سے چلے۔ رعونت اور تکبر اختیار نہ کرے۔ اسی وقت سوئے جب نیند کا غلبہ ہو۔ خاموش رہے کیوں کہ خاموشی گفتار سے بہتر ہے۔ لیکن اس کی گفتار کے ساتھ حق ہو تو وہ خاموشی سے بہتر ہے۔ کسی چیز کی طلب کرے تو خدا سے کرے۔ تجرد کی زندگی سنت کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ تجرد میں نفسانی خواہشات کا غلبہ رہتا ہے۔

آخر میں سماع پر بحث ہے۔ ہجویریؒ کے نزدیک سماع مباح ہے۔ مگر اس کے لیے حسب ذیل شرطیں ہیں۔ سالک سماع بے ضرورت نہ سنے اور طویل وقفہ کے بعد سنے تاکہ اس کی تعظیم دل میں قائم رہے۔ محفل سماع میں مرشد موجود ہو۔ عوام شریک نہ ہوں۔ قوال فاسق نہ ہوں۔ سماع کے وقت دل دنیا دی علائق سے خالی ہو۔ طبیعت لہو و لعب کی طرف مائل نہ ہو۔ اگر وجد کی کیفیت

طاری ہو جائے تو اُس کو تکلف کے ساتھ نہ روکے اور یہ کیفیت جاتی رہے تو تکلف کے ساتھ اس کو جذب کرنے کی کوشش نہ کرے۔ وجد کے وقت کسی سے مساعدت کی امید نہ رکھے اور کوئی مساعدت کرے تو اس کو نہ روکے۔ قوال کے گانے کی اچھائی اور برائی کا اظہار نہ کرے۔ محفل سماع میں لڑکے نہ ہوں۔

سماع سے اجتناب آپ فرماتے ہیں مرید کو سماع کے غلبہ میں اس قدر حال چاہیے کہ اس کا سماع گنہگاروں کو گناہ سے چھڑا دے۔ فرماتے ہیں میں نے اپنی آنکھوں سے ایک درویش کو دیکھا جو آذربیجان کے پہاڑوں میں فکر میں ڈوبا ہوا یہ اشعار پڑھ رہا تھا (عربی کے اشعار نقل کرنے کے بعد آپ لکھتے ہیں) وہ درویش ان اشعار سے ایسا متاثر ہوا کہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اس کی روح پرواز کر گئی۔ آخر میں آپ لکھتے ہیں کہ میں علی بن عثمان جلالی اس کو زیادہ دوست رکھتا ہوں کہ اپنے مریدوں کو سماع میں نہ پڑنے دوں تا کہ ان کی طبیعت پریشان نہ ہو کہ اس میں بڑے خطرے اور بڑی آفتیں ہیں۔

وفات آپ کے سن وفات میں اختلاف ہے بعض کتابوں ۴۶۶ھ اور بعض میں ۴۶۵ھ مرقوم ہے۔ مؤخر الذکر زیادہ قرین قیاس ہے۔

آستانہ عالیہ داتا گنج بخشؒ کا مزار لاہور میں بھاٹی دروازہ کے باہر مغرب کی طرف میلارام کے کارخانے کے عقب میں واقع ہے۔ مزار کے گرد پہلے ایک وسیع قبرستان تھا جو رنجیت سنگھ کے عہد میں مسمار کر دیا گیا۔ صرف چند قبریں باقی ہیں۔ درگاہ کے بیرونی شرقی دروازہ پر یہ کتبہ نصب ہے:

چوں بنا شد از غلامان رسول	مسجدے بر آستانِ گنج بخشؒ
خواستم سالِ بنائش تا گہاں	ہاتفے از عاکفانِ گنج بخشؒ
گردان از سجدہ بروں آرد و گفت	سجدہ گاہِ زائرانِ گنج بخشؒ

اندر داخل ہوں تو بائیں جانب مسجد کا دروازہ ہے، جس پر علامہ اقبالؒ کی موزوں کردہ یہ تاریخ نصب ہے:

سال بنائے حرم مومناں	خواہ ز جبریل و ز ہاتف مجو
چشم بہ المسجد الاقصیٰ فگن	اَلَّذِیْ بَارَکْنَا ہم بگو

آگے بائیں طرف پہلا مزار چوہدری غلام رسول کا ہے، جو مسجد کے بانی تھے۔ پھر مشرق کی طرف سید عمر شاہ کا مزار ہے۔ اس سے آگے دائیں طرف ایک حجرہ ہے جس کے مقفل دروازہ پر "حجرہ اعتکاف حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ" لکھا ہے۔ داتا گنج بخشؒ کا مزار سنگ مرمر کے چبوترے پر ہے۔ قبر پر ہمیشہ غلاف چڑھا رہتا ہے۔ چبوترہ کے گرد ایک پنجرہ چوبی ہشت پہلو ہے جو رنجیت سنگھ کے فیل بان میاں عوض خان نے ۱۲۴۰ھ میں بنوایا تھا۔ داتا گنج بخشؒ کے دو پیر بھائی جن کے نام شیخ احمد حمادی سرخسی اور شیخ ابوسعید ہجویری تھے۔ یہ دونوں حضرت کے ساتھ لاہور آئے تھے اور ان کی قبریں بھی حضرت کی قبر کے ساتھ ہی ہیں۔

آپ کا مزار سب سے پہلے سلطان محمود غزنوی کے برادر زادہ ظہیر الدولہ سلطان ابراہیم بن سلطان مسعود غزنوی نے بنوایا تھا۔ چبوترہ اور مزار کا تعویذ اسی کے زمانے کا ہے۔ درگاہ سے ملحق ایک بارونق بازار ہے، جس میں ہر قسم کی دکانیں ہیں۔ ۱۹ اور ۲۰ صفر کو آپ کا عرس منایا جاتا ہے۔

داتا گنج بخش رح کے چند اقوال

آپ کے چند قابلِ قدر اقوال وارشادات یہ ہیں:

—— علم اسی قدر سیکھنا فرض ہے جس سے عمل درست ہو۔ بے فائدہ علم سیکھنے کی حق تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے۔

—— ایثار یہ ہے کہ تو اپنے ساتھی کا حق نگاہ میں رکھے اور اپنا حصہ اسی کو دے دے اور ساتھی کے آرام کے لیے خود تکلیف اٹھائے۔

—— حج دو طرح پر ہوتا ہے ایک غیبت میں اور ایک حضور میں۔ جو مکہ میں ہوتا ہے وہ غیبت کا حج ہے اور جو مشاہدہ میں ہوتا ہے وہ حضور میں ہوتا ہے۔ حج کا مقصد گھر کا دیدار نہیں ہوتا بلکہ مشاہدۂ حق ہوتا ہے۔

—— جس طرح بدن کی پاکیزگی کے بغیر نماز درست نہیں ہوتی اسی طرح دل کی پاکیزگی کے بغیر معرفت درست نہیں ہوتی۔

—— جب وضو کے لیے ہاتھ دھوؤ تو دل کو دنیا کی دوستی سے دھو ڈالو۔

—— الہام سے معرفت ممکن نہیں۔ اس میں بندے کا یقین کبھی زیادہ ہوتا ہے کبھی کم۔ لیکن اصل معرفت میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اس لیے معرفت کی زیادتی بھی نقصان کا باعث ہے۔

—— خدا کی شناخت پر کسی کی تقلید نہ کرنی چاہیے بلکہ اُسے اُس کی کمال کی صفتوں سے پہچاننا چاہیے۔

—— نفس کی مثال شیطان کی سی ہے اور روح کی مثال فرشتہ کی سی۔

—— علم معرفت کا طلب کرنا سب طالب علموں پر فرض ہے۔

—— محبت خداوندی کے غلبہ کو سکر کہتے ہیں اور مراد کے حصول کو صحو کہا جاتا ہے۔

—— حال وہ حقیقت ہے جو خدا کی طرف سے انسان کے دل میں آئے تکلف سے حاصل نہ ہو سکے اور کسب سے دفع نہ کی جا سکے۔

—— حال خدا کی عطا ہے اور مقام مجاہدہ سے قائم ہوتا ہے۔

—— جب تصوف خلق سے منہ پھیرنا ہوا تو یقیناً اس کے لیے کوئی رسم نہیں ہو سکتی۔

—— رضا دو طرح کی ہے۔ حق تعالیٰ کی رضا بندہ سے اور بندہ کی رضا حق تعالیٰ سے۔

—— صوفی اسے کہتے ہیں جو اپنے معاملے اور اخلاق کو مہذب بنائے اور طبیعت کی آفتوں سے کنارہ اختیار کرے۔

—— فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ اس کی کسی چیز میں خلل نہ آئے۔ نہ دنیاوی مال و اسباب کے ملنے سے مالدار بنے اور نہ اس کے نہ ہونے سے محتاج بنے، بلکہ نہ ہونے سے اور بھی خوشی ہو، کیونکہ فقیر جتنا تنگدست ہوگا اتنا اس پر حال زیادہ کشادہ ہوگا اور اسرار منکشف ہوں گے۔ جتنا وہ دنیا کے مال و متاع سے بے نیاز ہوگا اسی قدر اس کی زندگی الطافِ مخفی اور اسرارِ روشن سے وابستہ ہوگی۔

—— جو کچھ فقیر پر گزرے اسے کسی پر ظاہر نہ کرے اور جس بات کا اس پر ظہور ہو جائے اُسے پوشیدہ نہ رکھے۔ اسرار کے غالب ہو جانے سے وہ اتنا مغلوب نہ ہو جائے کہ احکام شریعت بجا نہ لا سکے۔

—— فقیر کا کمالِ فقر یہ ہے کہ اس کے فقر کے ترازو کے پلڑے میں دونوں جہاں بھی رکھ دیے جائیں تو ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہوں اور اس کی ایک سانس دونوں عالم میں نہ سمائے۔

—— خدا کے راستے کے سالکوں کا پہلا مقام توبہ ہے۔

—— اگر بندہ غنا سے سرفراز کیا جاتا ہے تو یہ اس کے لیے ایک نعمت ہے، مگر اس نعمت میں غفلت اسی طرح ہے جس طرح فقر میں حرص۔

—— فقر غنا سے بہتر ہے، مگر جب طالب خدا کے سوا دنیا کی ہر شے سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو پھر فقر اور غنا دونوں کی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رہتی۔

—— سچا فقیر بن، خواہ کافروں کی سی کلاہ پہن۔

—— نفس ایک باغی کتا ہے۔ کتے کے چمڑے کو جب تک دباغت اور رنگ نہ کیا جائے پاک نہیں ہوتا۔

—— انسان کے لیے سب چیزوں سے مشکل خدا کی پہچان ہے۔

—— غنا کا نام خاص خدائے تعالیٰ کے لائق ہے، لوگ اس نام کے مستحق نہیں ہو سکتے اور فقر کا نام لوگوں کے لئے ہے، خدائے برتر کے لیے یہ روا نہیں ہو سکتا۔

—— بندہ کی رضا یہ ہے کہ خدا کے فرمان پر قائم رہے اور اس کے حکموں سے سرتابی نہ کرے۔

—— عارف عالم ضرور ہوتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ عالم عارف بھی ہو۔

—— تصوف ایک حقیقت ہے بے نام اور آج ایک نام ہے بے حقیقت۔

—— دنیا کے ساتھی (آنکھیں، ہاتھ اور پاؤں) جو بظاہر دوست نظر آتے ہیں، در اصل تمہارے دشمن ہیں۔

—— صوفی وہ ہے جس کی گفتار اور کردار ایک سے ہوں۔

—— استاد کا حق ہرگز ضائع نہ کر۔

—— بوڑھوں کو چاہیے کہ وہ جوانوں کا لحاظ رکھیں اس لیے کہ ان کے گناہ کم ہیں اور جوانوں کو چاہیے کہ وہ بوڑھوں کا ادب کریں،

حضرت خواجہ مودود چشتیؒ

ولادت ———— ۴۳۰ھ

وفات ———— (چشت) ۵۲۷ھ

قطب الاقطاب و پیشوائے اولیائے نامدار خواجہ قطب الدین مودود چشتی خاندان چشت کے اکابر میں سے تھے۔ آپ مادر زاد ولی اور علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔ خواجہ ناصر الدین ابو یوسف چشتیؒ[1] کے فرزند ارجمند تھے۔ شمع صوفیان اور چراغ چشتیاں کے خطاب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

عالم طفولیت ہی میں آپ سے خوارق و کرامات سرزد ہونے لگی تھیں۔ چنانچہ لوگ آپ کی بہت زیادہ تعظیم کرتے تھے۔ سات برس کی عمر میں قرآن کریم حفظ کر لیا اور دوسرے علوم کی تحصیل میں لگ گئے۔ تیس برس کے تھے جب والد ماجد دنیا سے رخصت ہوئے اور آپ ان کی جگہ مسند نشین ہوئے۔ والد بزرگوار سے جب بیعت ہوئے تو بیس برس تک گوشہ نشینی کی زندگی گزاری اور لوگوں کی نظروں سے چھپ کر عبادت و ریاضت اور مجاہدے میں لگے رہتے تھے۔ جب والد بزرگوار نے خرقۂ خلافت عطا کیا تھا تو فرمایا تھا میں تجھے کامل سمجھ کر یہ خرقہ عطا کرتا ہوں۔ والد بزرگوار ہی کی نظر عنایت سے اسرار حق آپ پر منکشف ہوئے۔ تعلیم کے سلسلے میں بخارا بھی تشریف لے گئے۔ جہاں شیخ المشائخ خواجہ نجم الدین عمرؒ سے آپ نے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ بخارا کے علماء کے ساتھ آپ اکثر مباحثہ کرتے رہتے تھے۔ آپ نے اپنے علم ظاہری اور قوت باطنی سے ان سب علماء کو مطیع اور مسخر کر رکھا تھا اور ان میں سے کئی بڑے عالم آپ کے مرید تھے۔ آپ کے مریدوں کی تعداد ہزاروں تک تھی، جو کوئی آپ کی صحبت اختیار کرتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا اور باطنی کمالات حاصل کر کے جاتا۔ غرض تمام بڑے بڑے مشائخ آپ کی بہت زیادہ عزت و تکریم کرتے اور آپ کے عقیدت کیش تھے۔ شیخ احمد النامقی الجامی قدس سرہ العزیز سے بھی آپ نے فیض پایا تھا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ "شیخ الاسلام احمد جامیؒ جب علاقہ جام سے ہرات تشریف لائے، تو

---

[1] خواجہ ابو یوسف چشتیؒ ابو محمد چشتیؒ کے خواہر زادہ، مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ نے ۴۵۹ھ میں وفات پائی۔ مزار پر انوار چشت میں ہے۔ بڑے پایہ کے ولی اللہ تھے۔ کرامات و کمالات باطنی سے مالا مال تھے۔ ہمیشہ فقر و فاقہ کی حالت میں رہتے۔ بارہ سال تک ریاضت و مجاہدہ کرتے رہے۔ دن رات میں کئی بار قرآن ختم کیا کرتے تھے۔ بے حساب نذر و نیاز آتی مگر سب کچھ مساکین میں تقسیم کر دیتے۔

دور دور تک آپ کے کمالات کی شہرت پہنچی۔ شیخ نے ہرات سے موضع چشت کی طرف رُخ کیا۔ لوگوں نے آپ کو بتایا کہ خواجہ مودود چشتی اپنے مریدوں کو جمع کر کے ساتھ لے کر آ رہے ہیں تاکہ آپ کو اس علاقے سے باہر نکال دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، یعنی خواجہ مودود اپنے مریدوں کی ایک جماعت کے ساتھ شیخ الاسلام کے پاس آ پہنچے۔ اور مریدوں نے ان سے بحث شروع کر دی۔ شیخ الاسلام نے بڑے تحمل سے فرمایا یہ ملک نہ میرا ہے نہ مودود چشتی کا اور اگر ولایت سے مراد وہ ہے جو ہم جانتے ہیں اور اولیائے کرام جانتے ہیں تو کل معلوم ہو جائے گا۔

اس موقع پر آپ کی ایک کرامت کا ذکر آیا ہے جس کی برکت سے باوجود ندی کی طغیانی اور شدید بارش کے آپ اور آپ کے سب ہمراہی دریا پار کر گئے۔ خواجہ مودود چشتیؒ کے مریدوں نے آپ کو یہ خبر پہنچا دی۔ وہ اپنے مریدوں کی ایک جماعت لے کر آئے مگر شیخ احمد جامی کا سامنا ہوتے ہی گھوڑے سے اتر پڑے اور شیخ کی رکاب کو بوسہ دیا۔ آپ نے دلاسا دے کر اور سمجھا کر پھر گھوڑے پر سوار کیا اور سب مل کر ایک گاؤں میں اُترے۔ خواجہ مودود کے مریدوں نے شیخ احمد کے ساتھ پھر گستاخی کرنا چاہی اور گو خواجہ صاحب نے منع کر دیا تھا مگر وہ نہ مانے، نتیجہ یہ ہوا کہ سب کو وہاں سے فرار ہونا پڑا اور خواجہ مودود آپ کے قدموں پر گر پڑے۔ اور معافی مانگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور عرض کیا آپ جانتے ہیں کہ ان لوگوں سے میں متفق نہ تھا۔ آپ نے فرمایا سچ کہتے ہو اور خطا معاف کی۔ فرمایا ان سب کو واپس کر دو صرف دو خدمت گار ہمراہ رکھو۔ آپ نے تعمیل ارشاد کی۔ پھر شیخ نے حکم دیا کہ مصلّٰے کو طاق پر رکھو اور جا کر علم سیکھو، کیونکہ زاہد بے علم مسخرۂ شیطان ہوتا ہے۔ فرمایا میں نے قبول کیا۔ اس کے بعد کیا ارشاد ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا جب علم حاصل کر چکو تو اپنے خاندان کے روایات تازہ کرو اس لیے کہ تمہارے آباؤ اجداد بڑے بزرگ ہوئے ہیں۔ خواجہ نے عرض کیا کہ آپ تبرک کے طور پر ان بزرگوں کی جگہ بٹھا دیجیے۔ شیخ الاسلام نے فرمایا تم آگے آؤ۔ وہ آگے آئے تو آپ نے ہاتھ پکڑ کر انہیں مسند کے ایک کنارے بٹھا دیا اور تین دفعہ ارشاد فرمایا بشرط علم۔ اس کے بعد خواجہ مودود چشتی تین روز شیخ الاسلام کی خدمت میں رہے اور طرح طرح کی نوازشیں حاصل کیں۔ پھر واپس ہوئے اور بلخ و بخارا کی جانب قصد فرما کر چار سال کی مدت میں بڑی سعی و کوشش سے علم حاصل کیا، اس کے بعد موضع چشت کی طرف واپس ہو کر مریدوں کی تربیت میں مشغول ہوئے اور آپ کے کرامات و خوارق کا شہرہ دور دور تک پہنچا۔[1]

خواجہ مودودؒ کا ہر قول اور فعل شریعت کے عین مطابق ہوتا تھا۔ جو کچھ زبان مبارک سے فرماتے سب لوگ دل و جان سے قبول کرتے۔ ریاضت و عبادت کا یہ حال تھا کہ تیس سال تک شب خوابی اختیار نہ کی۔

خلیفہ محمد سعید اپنی کتاب تذکرہ میں لکھتے ہیں، جب وفات کا وقت قریب پہنچا آپ بار بار دروازہ کی طرف دیکھتے

---

[1] اخبار الصالحین۔

تھے جیسے کوئی کسی کا انتظار کرتا ہو۔ ناگاہ ایک شخص پاکیزہ نورانی لباس پہنے دروازہ سے آیا اور آپ کو سلام کر کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ اور بغل سے ایک پارۂ حریر جس پر کچھ تحریر تھا، نکال کر دستِ مبارک میں دیا۔ آپ نے اس کو دیکھ کر آنکھوں سے لگایا اور جان بحق تسلیم ہوئے۔

اس قیامت خیز واقعہ سے ہلچل مچ گئی اور شورِ عظیم برپا ہو گیا۔ اس قدر آدمی جمع ہوے کہ جس کا حد و حساب نہیں۔ جب نماز کے لیے جنازہ باہر آیا اور لوگوں نے نماز ادا کرنا چاہی، ایک ایسی ہیبت ناک آواز آئی کہ لوگ خوف کے مارے علیحدہ ہو گئے۔ . . . . . . جب جنازہ اٹھانا چاہا تو پھر ایک ہیبت ناک آواز آئی کہ لوگ ہٹ گئے اور جنازہ خود بخود بلند ہو کر روانہ ہوا، اور تمام لوگ پیچھے پیچھے چلے۔ آخر اسی مقام پر آکر ٹھہرا جہاں آپ نے مرقدِ مقدس تجویز کیا تھا اور اسی جگہ مدفون ہو کر زیارت گاہ خلائق ہوئے۔"

آپ کی وفات ستانوے برس کی عمر میں رجب ۵۲۷ھ میں ہوئی۔ مزار پر انوار چشت میں ہے۔

حضرت سیّد عبدالقادر جیلانیؒ غوث الاعظم

ولادت ——————— گیلان (ایران) ۴۷۰ھ

وفات ——————— بغداد ۵۶۱ھ

ولادت باسعادت | قصبۂ گیلان واقع ملک ایران میں محبوب سبحانی غوث صمدانی حضرت سیّد عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ۴۷۰ھ یا ۴۷۱ھ میں تولد ہوئے۔ حضور کی ولادت کے وقت والدہ ماجدہ کا سن مبارک ساٹھ برس کا تھا اور یہ پہلی کرامت اس ذات عالی کی قدرت نے اسباب پرستوں اور عقل کے گرفتاروں کو دکھائی تھی کہ جس عمر کو اولاد سے مایوس ہونے والا کہا جاتا ہے خدا تعالے اس میں بھی ایک ایسے دل و دماغ کا بچہ پیدا کر سکتا ہے، جو دنیا بھر کے بچوں میں ممتاز ہوا اور اس کی ذہنی اور دماغی قوت پر والدہ کی کمزوری کا مطلق اثر نہ پڑے۔

تمام تذکروں اور کتابوں کا اس معاملہ میں اتفاق ہے کہ حضور غوث پاکؒ کی والدہ کی عمر اس صاحبزادے کی تولید کے وقت ساٹھ برس کی تھی، اور اس میں کسی کو بھی شک نہیں ہے تو اب سوائے کرشمۂ قدرت کے اس واقعۂ عجیب کو اور کس نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

مرد اگر زیادہ سن کا ہو تو اولاد کا ہونا محل تعجب نہیں۔ مگر عورت طبی محققین کے خیال میں ساٹھ برس کی ہو جائے تو اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی، مگر خدا تعالیٰ نے اس مولودِ مسعود کی مثال سے دکھا دیا کہ ظنی اور قیاسی علوم کی بنا پر حقانی قدروں سے انکار کرنا بڑی نادانی ہے۔

اطبا کا یہ خیال بھی ہے کہ جب والدین کمزور ہوں یا ان میں ایک ناتوان اور ضعیف القویٰ ہو تو بچہ لازمی طور سے کمزور و ناتوان پیدا ہوا کرتا ہے، جسمانی حالت تدابیر ظاہر سے درست ہو جائے مگر اس بچّہ کی دماغی اور ذہنی قوّت ویسی مضبوط نہیں ہو سکتی جیسی نوجوان، تندرست والدین کے بچّوں کی ہوا کرتی ہے۔

حضور غوث پاکؒ کی مثال سے ان ظاہر پرستوں کی بھی علانیہ تردید ہوتی ہے۔ وہ اگرچہ بہ اعتبار جسم ذرا نحیف تھے۔ لیکن ان کی ذہنی و دماغی و علمی و احساسی قوتیں اس قدر زبردست تھیں کہ اس کی نظیر باوجود علم و عقل کے عام چرچوں کے اور باوجود اس کے کہ اس زمانہ میں بڑے بڑے نامور ذہین و طبّاع عالم موجود تھے ایک میں بھی نہ پائی گئی، نہ امراء میں نہ علماء میں، نہ حکماء میں نہ مشائخ میں۔

احترام ماہ صیام | تمام کتابوں کا بالاتفاق بیان ہے کہ حضور غوث پاکؒ کی شیر خوارگی کے زمانہ میں رمضان شریف آیا تو آپ نے دن کے وقت دودھ پینا چھوڑ دیا۔ آپ کی والدہ ماجدہ سے روایت ہے کہ میں نے کئی بار کوشش کی، مگر انھوں نے دن کو دودھ

نہ پیا۔ یہاں تک کہ اس رمضان میں چاند کا اختلاف پڑا۔ بعض کہتے تھے عید کا چاند ہوگیا، بعض کہتے تھے نہیں ہوا تو میں نے شہادت دی کہ میرے بچے نے آج بھی دن کو دودھ نہیں پیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کل چاند نہیں ہوا کیونکہ اس بچہ نے بسبب حرمت صیام دن کو دودھ پینا ترک کر رکھا تھا اور میں اول دن سے برابر اس کو دیکھ رہی ہوں۔

ممکن ہے کہ اس روایت پر ظاہر کی عقل والے کچھ تامل کریں اور کہیں کہ ہر مشہور و مقبول شخص کی نسبت خوش عقیدہ لوگ ایسی ہی روایتیں بنا لیا کرتے ہیں۔ - - - - - - - - - - - - - - -

لیکن یہ واقعہ کچھ زیادہ خلاف عقل نہیں ہے۔ اعصاب کی حس کا جن فلاسفروں کو علم ہے وہ گواہی دے سکتے ہیں کہ جو انسان اپنے اندر غیر معمولی قوت احساس اعصاب کی لاتا ہے وہ عالم طفلی سے ایسا احساس ہوتا ہے کہ اس میں اور بڑی عمر کے آدمیوں میں کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا۔

پس یہ دلیل ہے حضور غوث پاکؒ کے اعصابی حس کے زیادہ قوی ہونے کی قدرت نے ان کے اعصاب میں ابتدا سے ایک ایسا ادراک و احساس پیدا کیا تھا کہ ماں کی گود میں انھوں نے محسوس کر لیا کہ میں جس گھر اور جس قوم میں پیدا ہوا ہوں وہ آج کل دن کو کھاتی پیتی نہیں۔ اس لیے مجھ کو بھی غذا ترک کر دینی چاہیے۔

اِلَیَّ یَا مُبَارِکُ | تحفہ قادریہ اور اخبار الاخیار میں حضرت سیّد عبدالرزاقؒ سے روایت ہے، جو حضور غوث پاکؒ کے فرزند تھے، کہ خود حضور نے فرمایا: جب ہم بچے تھے تو بچوں کے ساتھ کھیلنے کا ارادہ کرتے اس وقت ایک آواز آتی اِلَیَّ یَا مُبَارِکُ۔ میری طرف آؤ اے مبارک۔ ہم یہ آواز سن کر ڈر جاتے اور بھاگ کر والدہ صاحبہ کی گود میں آن بیٹھتے۔ کیوں کہ آواز دینے والا کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ اب بھی وہ آواز آیا کرتی ہے۔ مگر اب وقت خاص اور خلوت کی حالت میں آتی ہے۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات | دنیا میں جو بچہ پیدا ہونے والا ہوتا ہے اس کے عہد طفلی میں اسی قسم کے حالات پیش آیا کرتے ہیں۔ حضور غوث پاکؒ کی ابتدا میں یہ صدا بازی طفلاں سے روکنے والی تھی اور انتہا میں باعث تقرب ذات الٰہی خدا کے دوسرے محبوب حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی طفلی میں بھی اسی کے قریب ایک واقعہ مذکور ہے کہ ان کے والد ماجد حضرت خواجہ سیّد احمدؒ کا انتقال ہوگیا تھا اور یہ پانچ برس کے یتیم بیوہ والدہ کے ساتھ رہتے تھے۔ گھر میں بسر اوقات کے لیے کچھ اثاثہ نہ تھا۔ والدہ، بہن، خود اور ایک لونڈی، چار کھانے والے تھے۔ والدہ سوت کات کر فروخت کرتیں تو گزارہ ہوتا تھا۔ بارہا ایسا ہوتا کہ سوت فروخت نہ ہوتا یا اس کی آمدنی کفایت نہ کرتی تو فاقہ پیش آتا، جس دن فاقہ ہوتا والدہ صاحبہ فرماتیں " بابا نظام آج ہم اللہ کے مہمان ہیں"۔ اس فقرہ کو سن کر یہ معصوم بچہ بہت خوش ہوتا اور بھوک کی شکایت اس کی زبان پر نہ آتی، بلکہ آرزومند رہتا کہ پھر فاقہ پیش آئے تاکہ اماں سے خدا کی مہمانی کا لفظ سنوں۔ چنانچہ انھوں نے خود فرمایا ہے کہ جب کئی دن برابر روٹی ملتی رہتی تو دل میں ارمان ہوتا تھا کہ فاقہ ہو اور اماں خدا کی مہمانی کا ذکر کریں۔

بچپن میں تو خدا کی مہمانی کا لفظ باعث تسکین تھا، لیکن یہ بنیاد ایسی پڑی تھی کہ بڑے ہوئے تو حقیقی ذوق مہمانی خدا

کا حاصل کرنے لگے۔

حضور غوث پاکؒ کے اس واقعہ میں نصیحت ہے غلامانِ سلسلۂ غوثیہ کے لیے کہ وہ بھی اپنے بچّوں کو کھیل کود کے وقت خدا کا نام یاد دلایا کریں۔ ان کی شان تو یہی تھی کہ خدا تعالےٰ کی آوازِ غیب ان کو پکارتی تھی۔ ہماری حالت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی مادی زبانوں سے اس ارشاد کی پیروی میں بچوں کو رغبت الی اللہ دلایا کریں تاکہ بڑے ہو کر وہ سچے خدا پرست اور راغب الی الحق ثابت ہوں۔

پہلی کرامت | حضور غوث پاکؒ اٹھارہ سال کی عمر میں والدہ ماجدہ کی اجازت سے بغرض تکمیل تعلیم بغداد شریف لے جانے لگے تو والدہ ماجدہ نے چالیس اشرفیاں ان کی صدری استر ابرے کے اندر چھپا کر سی دیں اور ان کو سچ بولنے کی نصیحت کرکے رخصت کر دیا۔ راستہ میں ڈاکہ پڑا، سارا قافلہ لُٹ گیا۔ ایک ڈاکو نے اُن سے پُوچھا کہ تیرے پاس بھی کچھ ہے۔ آپ نے فرمایا چالیس اشرفیاں ہیں جو صدری کے اندر سلی ہوئی ہیں۔ اس ڈاکو کو بہت تعجّب ہوا کہ اس لڑکے نے مال کا اقرار کیوں کر لیا۔ چوروں سے ہر شخص دولت کو چھپایا کرتا ہے۔ وہ ڈاکو حضور کو اپنے سردار کے پاس لے گیا۔ آپ نے سردار کے پوچھنے پر بھی اشرفیوں کا حال سچ سچ بیان کر دیا۔ سردار حیران ہو کر بولا، تم نے ہم لٹیروں کا خوف نہ کیا۔ تم دیکھتے نہیں کہ ہم قزّاق ہیں اور جو مال ملتا ہے لوٹ لیتے ہیں۔ پھر تم نے ان اشرفیوں کا بھید مخفی کیوں نہ رکھا۔

حضور نے فرمایا والدہ نے چلتے وقت سچ بولنے کی نصیحت فرمائی تھی، میں مخفی کیسے رکھتا۔ یہ سنتے ہی ڈاکوؤں کا افسر رونے لگا۔ اور اس نے کہا کہ یہ لڑکا اپنی والدہ کے حکم پر اتنا چلتا ہے اور میں خدا کے حکم سے غافل ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے حضورؒ کے ہاتھ پر توبہ کی اور لُوٹ کا سب مال قافلہ کو واپس کر دیا۔ اس کے ہمراہی بھی سب کے سب تائب ہو گئے۔ یہ پہلی توبہ تھی جو حضور کے ہاتھ پر ہوئی اس ضمن میں آنحضرتؐ کا ایک واقعہ ذکر ہے حدیث[1] شریف میں آیا کہ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرما رہے تھے، صحابہؓ نے وضو کا مستعمل پانی لے کر اپنے بدن پر ملنا شروع کیا۔ حضور نے یہ حالت دیکھ کر پوچھا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ عرض کیا گیا اللہ کے رسول کی محبت حاصل کرنے کے لیے۔ اس پر ارشاد ہوا:

"تم میں سے جس شخص کو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ خدا، رسولؐ سے محبت کرے یا خدا، رسول اس سے محبت کرے تو چاہیے کہ سچ بولا کرے، امانت داری شیوہ بنائے اور اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرے"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کے تبرک کو زیادہ اہمیت نہ دی اور صداقت، امانت اور پڑوسی کی خدمت کے اعمال کو اس سے مقدم فرمایا۔ پس جو لوگ بزرگوں کے تبرکات حاصل کرنے کا زیادہ شوق رکھتے ہیں مگر نہ سچ بولتے ہیں اور نہ خیانت سے ان کو احتیاط ہوتی ہے نہ پڑوس کا حق ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کی حالت کس قدر قابلِ افسوس و لائقِ اصلاح ہے۔

---

[1] یہ حدیث مشکوٰۃ شریف میں بحوالہ امام بیہقی و بروایت عبدالرحمٰن ابن ابی قرادؓ وارد ہے۔

عبادات و مجاہدات حضور اقدسؒ بغداد میں تعلیم کی تکمیل فرما چکے تو عبادات و مجاہدات شروع کیے اور ان میں بھی ایسی محنت کی کہ اپنے جدِ امجد حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید ریاضت ہائے شاقہ کا حق ادا کر دیا۔

خود ارشاد فرماتے ہیں کہ میں عراق کے جنگلوں میں ۲۵ برس تک اکیلا پھرتا رہا۔ رات دن یادِ حق کے سوا کچھ کام نہ تھا برسالہا سال عشا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی۔ بے شمار راتیں آنکھوں میں گزر گئیں اور میں نے پلک سے پلک نہ جھپکنے دی۔ نیند کا غلبہ ہوتا تو ایک پاؤں پر کھڑا ہو جاتا اور نفلوں میں پورا قرآن شریف ختم کر دیتا۔ اور یہ تو برسوں ہوا ہے کہ میں نے رات کی نماز میں کھڑے کھڑے قرآن ختم کیا۔ ایک دفعہ نیند نے بہت ستایا۔ دل نے کہا تھوڑی دیر آرام کر لو پھر تازہ دم ہو کر عبادت کرنا، مگر میں نے ذرا پروا نہ کی اور ایک لمحہ کے لیے بھی نہ سویا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ جو شخص سربلندی چاہتا ہے اس کو لازم ہے کہ راتوں کو جاگے۔ آج کل کے زمانہ والے کہتے ہیں کہ خوب سوؤ تاکہ تم کو سربلندی حاصل ہو۔ نتیجہ سب دیکھ رہے ہیں کہ نہ دین میں کسی کو اعلیٰ مراتب نصیب ہوتے ہیں نہ دنیا میں۔

ہمت اور حوصلہ حضور غوث پاکؒ خود فرماتے ہیں کہ میں نے رفتہ رفتہ مجاہدہ کی عادت ڈالی تھی۔ پہلے ایک سال تو میں مدائن کے کھنڈرات میں مقیم رہا۔ وہاں میری معاش یہ تھی کہ جنگل میں جو مباح پھل مل جاتا اس کو کھا لیتا۔ اور رات دن عبادت کرتا رہتا۔

ایک دفعہ سردی کا موسم تھا، سردی ایسی سخت تھی کہ میں برداشت نہ کر سکا اور مجبوراً کسریٰ کے ویران محل کے اندر چلا گیا تاکہ سردی سے جسم محفوظ ہو جائے اسی حالت میں مجھ کو غسل کی ضرورت ہوئی تو باہر نکلا اور شط العرب (دریا) میں نہایا۔ اتفاق کی بات اسی رات متعدد مرتبہ یہی حالت پیش آئی کہ جہاں ذرا آنکھ لگی اور نہانا ضروری ہو گیا مگر میں نے ایک مرتبہ بھی کاہلی نہ کی اور ہر دفعہ بیدار ہو کر غسل کر لیا، آخر پھر میں نے سونے کا خیال ہی چھوڑ دیا اور نیند سے بچنے کے لیے محل کی چھت پر چڑھ کر نماز شروع کر دی۔ گو سردی کے سبب یہ بات اس وقت بہت ہی دشوار معلوم ہوتی تھی۔

صرف خدا کا خیال حضور فرماتے ہیں کہ میں کئی سال کرخ کے ویران میدانوں میں رہا۔ وہاں میری خوراک صحرائی کھجور تھی اور لباس صوف کا ایک جبہ تھا جو کوئی نیک خیال شخص مجھ کو لا کر اڑھا دیتا تھا۔ میں ننگے پاؤں کانٹوں کے جنگل میں پھرتا تھا۔ میرے تلوے چھلنی ہو گئے تھے۔ وہ میری امنگوں اور ولولوں کا وقت تھا، جو شباب کا زمانہ مشہور ہے اور جس میں بہت سے لوگ خواہشاتِ نفسانی سے مغلوب ہو جاتے ہیں، مگر میں اپنی ہر خواہش پر غالب تھا۔ میرے دل میں نہ اچھا کھانے کی آرزو ہوتی تھی نہ اچھا پہننے کی، نہ اچھے مکانوں میں رہنے کی، نہ دنیا کے عیش و آرام کی، نہ عزت و جاہ کی۔ میرے جسم کا ہر جذبہ ایک ہی رُخ مصروف تھا۔ میرے وجود کی ہر خواہش ایک ہی سمت متوجہ تھی۔ میرے تصور اور خیال میں سوائے ایک چیز کے کسی دوسری شے کا گزر نہ ہوتا تھا اور وہ "خدا تھا" اور اس کی جانب چلنے کا سلوک تھا اور اس کی یاد سے کیف و ذوق میسر آنے کی طلب تھی جو مجھے ملا۔[1]

---

[1] یہ واقعات تحفۂ قادریہ مؤلفہ حضرت شاہ ابوالمعالیؒ لاہوری، اخبار الاخیار مؤلفہ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلی اور بہجۃ الاسرار مصنفہ حضرت شیخ علی شطنوفیؒ سے ماخوذ ہیں۔

حضرت شیخ ابو محمد عبداللہ بن ابوالفتح نہروی روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت غوث پاکؓ کی خدمت میں چالیس سال رہا۔ حضور رات کے اوّل حصّہ میں نمازیں پڑھتے، درمیانی حصّہ میں ذکر کرتے۔ تیسرے حصّے میں ایک قدم پر کھڑے ہو کر تلاوت قرآن فرماتے اور پھر ایک طویل سجدے میں چہرۂ مبارک زمین پر ملتے رہتے اور عجز و زاری سے دعائیں مانگتے۔ صبح جب ان کا رُخِ منوّر دیکھا جاتا تو اس پر ایسا نور ہوتا تھا کہ نگاہ اس پر ٹھہرتی نہ تھی۔

زیارتِ رسولؐ عبادت و ریاضت اور مجاہدات کی مشقتوں اور صحرا نوردی کی خلوتوں میں بہت عرصہ گزر گیا تو ۱۶ شوال منگل کے دن ۵۲۱ھ کو حضور غوث پاکؓ نے حضور سرورِ دوجہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، فرماتے ہیں: لِمَ لَا تَتَکَلَّمُ ؟ تم بات کیوں نہیں کرتے ؟ میں نے عرض کیا۔ دادا جان ! میں عجم کا رہنے والا ہوں۔ عرب کے فصحا کے سامنے کیوں کر زبان کھول سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا اچھا منہ کھول۔ میں نے کھول دیا۔ آپ نے سات مرتبہ یہ آیت پڑھ کر میرے حلق میں دم فرمائی اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ (بلا پروردگار کے راستہ کی طرف حکمت کے ساتھ اور اچھی نصیحت سے) اُسی دن ظہر کی نماز کے بعد میں منبر پر گیا اور چند کلمات وعظ کے کہے جن کو سُن کر سامعین وجد و حال میں آگئے، پھر تو یہ عالم ہوگیا کہ سارے بغداد میں میرے وعظ کی دھوم مچی ہوئی تھی۔

پُرتاثیر وعظ حضرت ابو عبداللہ عبدالوہابؒ حضور غوث پاکؓ کے صاحبزادے راوی ہیں کہ حضور ہفتے میں تین بار تقریر عام فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ جمعہ اور ہفتہ یا منگل کو اپنے مدرسہ میں اور ایک دفعہ اتوار کو رباط میں۔ ان کی مجلس وعظ میں علماء و فقہا و مشائخ کا بڑا ہجوم ہوتا تھا۔ چالیس برس تک آپ نے دین کی یہ علمی روحانی خدمت انجام دی۔ چار سو ملفوظ نویس مجلس میں حاضر رہتے تھے جو حضور کا وعظ قلمبند کرتے جاتے تھے۔ شائقین کا اس قدر اژدحام ہوتا تھا کہ مجلس میں تل رکھنے کی جگہ نہ رہتی تھی۔ آخر مجبور ہو کر خلقت حضور کی کرسی مبارک کو شہر کے باہر میدان میں لے جاتی اور پھر مشتاقوں کا وہ تانتا لگتا کہ سواریوں اور پیدل راستہ چلنے والوں سے سڑکیں بھر جاتیں۔ اخبار الاخیار میں ہے کہ بعض اوقات ستر ہزار آدمی تک مجلس حضور میں جمع ہو جاتے۔ سننے والوں پر تقریر کا ایسا اثر ہوتا تھا کہ سیکڑوں آدمی بے ہوش ہو کر گر پڑتے تھے۔ سیکڑوں یہودی و عیسائی مسلمان ہو جاتے تھے۔ چنانچہ صرف مجالس وعظ میں پانچ سو یہودیوں و نصرانیوں کے اسلام قبول کرنے کی روایتیں متعدد کتب میں موجود ہیں اور ایک لاکھ فاسقوں کے توبہ کرنے اور پابند دین ہو جانے کا بیان بھی پایا جاتا ہے۔[1]

شیخ شریف حضرت ابو عبداللہ محمد بن ابوالغنائم سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ۵۵۹ھ ہجری میں حاضرِ خدمت ہوئے تو دس ہزار اشخاص کا ہجوم آپ کا کلام سُن رہا تھا۔ حضورؓ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں تمھارے واعظوں کی طرح نہیں ہوں میں خدا تعالیٰ کے حکم سے بات کہتا ہوں اور باطن کی قوتیں میرے کلام کے ساتھ ہوتی ہیں۔

شخصیت کا اثر ایک مرتبہ آپ کے صاحبزادے حضرت ابو عبداللہ عبدالوہابؒ سیاحت ممالک اور حصول علوم و فنون

---

[1] اخبار الاخیار۔ تحفۂ قادریہ۔ قرۃ المطالب وغیرہ۔

کے بعد حاضرِ خدمت ہوئے تو منبرِ سرکار پر وعظ کہنے کی اجازت طلب کی۔ آپ نے فرمایا اجازت ہے۔ صاحبزادے صاحب کا بیان ہے کہ میں نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے اور کوئی دقیقہ مؤثر طرزِ نسائخ کا باقی نہ رکھا خود سرکار باطن مدارہم بزم میں جلوہ فرما تھے مگر میں دیکھتا تھا کہ حاضرین پر میری تقریر کا ذرا اثر نہ ہوا بلکہ اہلِ مجلس کے غل اور شور اور بے توجہی سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے بیان پر کچھ بھی متوجہ نہیں ہیں۔ محفل کا یہ رنگ دیکھ کر میں منبر سے اُتر آیا تو سرکار اقدس منبر پر تشریف لے گئے اور آپ نے یہ جملے فرمائے :

کل میں روزہ سے تھا، اُم یحییٰ نے کچھ انڈے بھون کر ایک کورے سکورے میں طاق پر رکھ دیئے تھے۔ ایک بلی نے اس سکورے کو طاق سے نیچے پھینک دیا۔ سکورا ٹوٹ گیا اور انڈے خاک میں مل گئے۔

حضور اتنی ہی تقریر کرنے پائے تھے کہ مجلس میں ہر طرف سے ہو حق کے نعرے بلند ہونے لگے اور آن کی آن میں محفل گرما گئی۔

خلوت میں حضور نے ارشاد فرمایا میاں تم کو معلوم بھی ہے کہ تمہارے عالمانہ و عاقلانہ وعظ کا اثر کیوں نہ ہوا، اور میرے معمولی الفاظ نے یہ ہنگامہ کس وجہ سے پیدا کر دیا۔ سنو تم کو اپنے سفرِ ظاہر پر ناز ہے۔ مگر تم نے عالمِ باطن کا سفر نہیں کیا، میں جب کلام کرتا ہوں، خدا تعالیٰ کی یہ تجلیاں اترنے کر نمودار ہو جاتی ہیں۔ کیوں کہ میری نظر حقیقت پر رہتی ہے۔ میں خودی گم کر کے کلام کرتا ہوں اور تم خودی میں قائم ہو کر بولتے ہو۔

بیشک حضور نے سچ فرمایا۔ ظاہر میں انڈے، خاکی سکورے اور بلی کا بیان تھا ظرف گلی اور انڈے کی شکست و خرابی کا ذکر تھا مگر حقیقت میں وجود اور نفس و شیطان کے اشارات تھے۔ سمجھنے والے سمجھ گئے اور اثر ڈالنے والے نے اپنا کام دکھا دیا۔

طرزِ بیان کے چند نمونے!

—— (۱) ——

ایک مرتبہ تقریر فرمائی جس کا خلاصہ ترجمہ لفظی میں یہ ہے :

اے طلب گار توبہ کر بہ اسمِ خدا۔ معافی مانگ بہ اسمِ خدا۔ اخلاص حاصل کر بہ اسمِ خدا۔ ایک ہفتہ میں خدا تک جا۔ نہیں ہو سکتا تو ایک ماہ میں جا۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو ساری عمر میں ایک دفعہ تو اس تک جا اور لے، کہ اسی کے پاس کچھ ہے۔

—— (۲) ——

رجز ناسوتی و ملکوتی کے طور پر ایک بار ارشاد ہوا :

میں کہ میری تلوار مشہور ہے۔ میری کمان کھنچی ہوئی ہے۔ میرا تیر سینہ شگاف ہے، میرا نیزہ نشانہ باز ہے۔ میں محفوظ ہوں۔ میں ہی محفوظ ہوں۔ روزہ دارو، آؤ۔ شب بیدارو، آؤ۔ پہاڑوں کے عبادت گزارو، آؤ۔ اور خانقاہ نشینو آؤ۔ خدا کام کے لیے میرے پاس آؤ کہ میں اسی کے امر سے تم کو بلاتا ہوں۔

میرے فیض کا دریا بے کنار ہے۔ عزتِ رب کی قسم، اچھے بُرے سب میرے سامنے ہیں۔ میری نگاہیں لوحِ محفوظ

پر ہیں میں دریاے علم و مشاہدۂ الٰہی کا تیراک ہوں۔ میں خدا تعالیٰ کی حجت ہوں۔ میں نائب وارث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔

(۳)

وصال کے وقت فرماتے تھے، مجھ میں تم میں کیا نسبت۔ وہی جو زمین آسمان میں ہے۔ امورِ خلق سے اونچا ہوں۔ عقولِ انسانی سے بالا ہوں۔ میں وہ ہوں جن کو قرآن وا علم مالا تعلمون فرمایا ہے۔ مجھ ہی کو حکم دیا جاتا تھا کہ عبدالقادر بول وہ سنایا جائے گا۔ کھا اور پی اور کہہ میں وہی کہتا ہوں جس کا حکم خدا نے دیا ہے۔ مجھے خدا تمھارے ظاہر و باطن کو دکھاتا ہے۔ میں تم کو شیشوں کی طرح اندر باہر سے دیکھتا ہوں۔

مفتی کی حیثیت سے | شروع میں اشارۃً بتایا گیا تھا کہ مجاہدات سے پہلے آپ نے بغداد میں اقامت فرماکر تمام علومِ ظاہری کی تحصیل فرمائی تھی اور جب مجاہدوں سے فراغت ہوئی تو تلقین باطن کے ساتھ وعظ و نصیحت اور درس و تدریس و فتاوے کے ذریعہ بھی خدمتِ خلق ادا کی جاتی تھی۔

آپ کے صاحبزادے حضرت عبدالوہابؒ سے روایت ہے کہ حضور نے ۵۲۸ھ ہجری سے لے کر ۵۶۱ھ تک یعنی ۳۳ برس علم ظاہر کے درس اور فتویٰ دہی کا شغل جاری رکھا۔ مدرسہ میں تفسیر و حدیث اوّل وقت، قرآن شریف بعد ظہر اور فقہ و اصول اور نحو وغیرہ دن کے باقی حصوں میں پڑھاتے تھے۔

مسائل پر اتنا عبور تھا کہ فتویٰ لکھتے وقت کتاب نہ دیکھتے، نہ کچھ سوچتے، قلم برداشتہ جواب لکھ لیتے اور تمام عراق کے علما میں اس جواب کو درست اور صحیح مانا جاتا۔ آپ حضرت امام شافعیؒ او حضرت امام حنبلؒ کے موافق فتوے کا جواب تحریر فرماتے۔

حلیہ مبارک لباس وضع قطع! | شیخ ابوسعید اور شیخ ابو محمد عبداللہؒ سے روایت ہے کہ حضور غوث پاکؒ کا جسم شریف دُبلا قد درمیانہ، اور رنگ گندم گوں، سینہ چوڑا، داڑھی لمبی اور گنجان، ابرو باہم ملے ہوئے اور آواز بھاری تھی۔

جس وقت کلام فرماتے تھے۔ مجلس گونج جاتی تھی۔ آواز میں ایک قدرتی رعب ایسا تھا کہ جہاں آپ نے گفتگو شروع کی یا مجمع عام میں کچھ ارشاد فرمایا تمام سننے والے اور مخاطب دم بخود ہو کر متوجہ ہو جاتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی جو کلام حضور سے غیر ملتفت ہو۔ یہی حالت آنکھوں کی تھی کہ جس شخص کو یا جس ہجوم کو ایک بار نظر اٹھا کر دیکھ لیتے وہ مطیع و غلام بن جاتا۔

طبیعت نفاست پسند اور مزاج از حد لطیف تھا۔ صفائی ستھرائی بہت مرغوب تھی۔ لباس بھی اعلیٰ درجہ کا شاندار استعمال فرماتے تھے، مگر خلافِ شریعت نہیں کیوں کہ تمام کتابوں کا اتفاق ہے کہ آپ کا لباس شریف عالمانہ ہوتا تھا۔ یعنی اس وقت کے علما جو لباس پہنتے تھے وہی وضع آپ کے لباس کی تھی، فرق صرف اتنا تھا کہ بیش قیمت سے بیش قیمت کپڑا (جس میں کوئی ناجائز چیز شامل نہ ہو) آپ کے لیے خریدا جاتا تھا، چنانچہ بغداد کے ایک مشہور بزاز شیخ ابوالفضل احمد بن قاسم قرشی سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضور غوث پاکؒ کا خادم میرے پاس آیا اور اس نے کہا مجھے ایک ایسا بڑھیا کپڑا درکار ہے جس کے ایک گز کی قیمت ایک اشرفی ہو۔ نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ۔ میں نے پوچھا ایسا قیمتی کپڑا کس کے واسطے درکار ہے۔ خادم نے حضورؒ کا نام لیا۔

اس وقت میرے دل میں خطرہ گزرا کہ جب فقرا ایسا قیمتی لباس زیب تن کریں گے تو بادشاہِ وقت یعنی خلیفہ کون سا کپڑا پہنے گا۔ انھوں نے تو بادشاہ کے لیے کوئی کپڑا باقی ہی نہیں چھوڑا۔

کپڑا دینے کے بعد میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تو چونکہ آپ نے میرے خطرہ کو مکاشفہ سے معلوم کر لیا تھا۔ فرمانے لگے اے ابوالفضل مجھے اپنے معبود کی عزت کی قسم جب تک میرا معبود ذوالحکم نہیں دیتا میں کوئی قیمتی کپڑا نہیں پہنتا۔ اس لباس کے متعلق بھی جس کا کپڑا تجھ سے منگایا تھا، مجھ کو یہ حکم ملا تھا الحقّ علیك البس قمیصا ذراعۃ بدینار، تجھے میرے حق کی قسم ایک کرتا ایسے کپڑے کا پہن جس کی ایک گز کی قیمت ایک اشرفی ہو۔

اے ابوالفضل! یہ لباس نہیں ہے بلکہ میت کا کفن ہے۔ درویش (عالم سلوک میں) جب ہزار بار مر چکتا ہے تو اس کو ایک کفن عطا ہوتا ہے

ما را کہ مردیم در غمش صد بار
جامۂ ما ہمہ کفن باشد
در اسم چہ مے کنی انکار
کفن است و کفن حسن باشد

داد و دہش | حضور کی خدمت میں ہدیے، تحفے اور نذریں اس کثرت سے آتی تھیں جس کا شمار نہیں ہو سکتا، مگر آپ خود ہاتھ نہ لگاتے۔ خلقت آپ ہی مصلے کے نیچے رکھ دیتی۔ آپ خادم کو ارشاد کرتے کہ لے جاؤ اور اس رقم کو نانبائی اور سبزی فروش کے حوالے کر دو۔

بادشاہوں اور دنیا کے حکام کی وقعت بحیثیت دنیا آپ کی نگاہ میں مطلق نہ تھی جو لوگ اس کی عزت اور اس کے انعام و اکرام کے مقابلہ میں دنیا کے بادشاہوں کی عزت اور انعام کو زیادہ سمجھتے ہیں ان کی نصیحت و ہدایت کے لیے آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ خلیفۂ وقت کے ہاں سے آپ کے لیے خلعتِ اعزاز آتا تو آپ حکم دیتے کہ یہ ابوالفتح نانبائی کو روٹی کی قیمت کے عوض دے دو۔

اس میں ایک بڑا گہرا اشارہ تھا کہ انسان کو روٹی کی فکر کے سوا دنیاوی عزت کا خیال تمام دل میں نہ رکھنا چاہیے۔ بڑا خلعت یہ ہے کہ پیٹ بھر جائے اور بندہ اپنے خدا کی عبادت اطمینانِ قلب سے کر سکے۔ چار روٹیاں آپ کے لیے پکائی جاتی تھیں۔ تیسرے پہر سامنے آتیں تو آپ ایک ایک ٹکڑا توڑ کر پہلے تمام حاضرین کو تقسیم فرما دیتے اور جو کچھ بچتا وہ خود تناول فرما لیتے۔ جو ہدیے آپ کی خدمت میں پیش ہوتے، آپ اسی وقت حکم دیتے کہ ان کو حاضرین میں تقسیم کر دو اور ہدیے لانے والوں کو اپنی طرف سے بطور انعام بھی کچھ علیحدہ مرحمت فرماتے اور یہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی یہی تھا اور آپ کا فرمان بھی ہے کہ جب تمھیں ہدیہ دیا جائے تو اس سے بہتر عوض دینے کی کوشش کیا کرو۔ اس سے محبت بڑھتی ہے۔

کردار و سیرت | شیخ ابوالمظفر منصورؒ کا بیان ہے کہ حضور غوث پاکؓ سے بڑھ کر میں نے کسی کو خوش خو، مہربان، فراخ حوصلہ،

کریم النفس، وعدہ وفا اور دوستی کا نباہنے والا نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ مجاہدہ میں ایک شخص نے کہا، تم یہاں ٹھہرنا میں ابھی آتا ہوں۔ آپ نے وعدہ فرما لیا۔ وہ شخص ایک سال تک نہ آیا مگر حضرت وعدہ کی پابندی کے خیال سے اس مقام پر مقیم رہے اور پورے ایک برس تک کہیں تشریف نہ لے گئے۔

آپ اتنے بڑے درجہ اور مرتبہ کے تھے کہ خلیفۂ وقت غلاموں کی طرح دست بستہ حاضر ہوتا تھا، مگر آپ کے اخلاق کی یہ حالت تھی کہ چھوٹوں پر سب سے زیادہ شفقت فرماتے اور بڑوں (بڑی عمر والوں) سے عزت و احترام کے ساتھ پیش آتے۔

آپ کی مجلس میں رعب ایسا تھا کہ کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی اور سکون و راحت بھی ایسی تھی کہ حاضر خدمت ہونے والے باہر کے سب افکار بھول جاتے تھے۔ ان کو آپ کی محبت میں ایک تسلی و تسکین حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ شیخ ابوالقاسم بزازؒ کا بیان ہے کہ آپ کی مجلس میں ہماری حالت ایسی ہوتی تھی گویا ایک نہایت شیریں خواب دیکھ رہے ہیں اور جب باہر آتے تھے تو خیال ہوتا تھا کہ اس پُر لطف خواب سے آنکھ کھل گئی۔

حسنِ سلوک، حسنِ مدارات | حضور بڑے سخی تھے، بڑے مسکین نواز تھے۔ مہمانوں خصوصاً غرباء و مساکین کے ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے اور پھر ان میں مل جل کر تشریف رکھتے اور اس طرح حالات پوچھتے گویا ان کے نہایت ہی قریبی رشتہ دار اور عزیز ہیں۔ ان کی بُرائیوں سے چشم پوشی فرماتے اور ان کی خوبیوں پر تحسین و آفرین کرتے۔ حاضرین میں کوئی شخص کسی دن موجود نہ ہوتا تو دریافت فرماتے، آج فلاں شخص نظر نہیں آتا اچھا تو ہے۔

آپ کے سامنے کوئی شخص خدا کی قسم کھاتا تو آپ فوراً یقین کر لیتے تھے۔ آپ کے پاس بیٹھنے والوں میں ہر شخص خیال کرتا تھا کہ حضرت کی عنایت مجھ پر سب سے زیادہ ہے۔ کسی کے حال پر اس قدر نوازش نہیں ہے جتنی مجھ پر ہے۔

ابوعبداللہ محمدؒ روایت کرتے ہیں کہ حضور غوث پاکؓ بہت رقیق القلب بہت خوش اخلاق اور مستجاب الدعوات تھے۔ اُن کی زبان سے فحش اور بیہودہ کلام کبھی نہیں سنا اور نہ اُن کے سامنے کوئی اور شخص فحش کلامی و بیہودہ گوئی کر سکتا تھا۔ کیونکہ ان کو اس سے سخت نفرت تھی۔ اپنی ذات کی خاطر وہ کبھی کسی پر ناراض نہیں ہوئے۔ ہاں خدا کے کاموں میں کبھی کبھی لوگوں پہ برہمی ہوتی تھی۔ یعنی اگر کسی کو خلاف احکام الٰہی کام کرتے دیکھتے تو پہلے نرمی سے سمجھاتے۔ نہ مانتا یا دوبارہ اس فعل میں اس کو دیکھا جاتا تو خفگی اور درشتی سے اس کو زجر و توبیخ فرماتے۔

مفلس کی تلاش | حضور کے فرزند حضرت عبدالرزاقؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ والد ماجد حج کے سفر کو تشریف لے گئے۔ خدام کا بڑا مجمع ساتھ تھا۔ راستہ میں ایک آبادی کے قریب شام ہوئی تو آپ نے حکم دیا، اس بستی میں تلاش کرو کہ سب سے زیادہ مفلس اور غریب کون ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ ایک گھر بہت نادار ہے، جس میں دو بوڑھے محتاج عورت مرد ہیں، اور ایک بچہ ہے۔ حضور خود اس مکان پر تشریف لے گئے اور ان دونوں سے پوچھا ہم تمھارے مکان پر ٹھہرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا بسر و چشم مکان حاضر ہے مگر ہم خدمت کے لائق نہیں ہیں۔ آپ وہاں خدام سمیت ٹھہر گئے تو بستی کے مشائخ اور دولتمند

کو حال معلوم ہوا وہ سب دوڑے ہوئے حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے مکانوں پر تشریف لے چلیے، یہ جگہ آپ کے ٹھہرنے کے قابل نہیں۔ مگر حضرت نے کسی کی التجا قبول نہ فرمائی۔ آخر ان لوگوں نے دعوت کا سامان اُسی جگہ لا لا کر جمع کر دیا۔ غلّہ بکریاں، سونے چاندی وغیرہ کا ڈھیر لگ گیا تو آپ نے فرمایا: اس میں سے کچھ بھی نہ لوں گا، نہ میرے ہمراہی کچھ لیں گے۔ یہ سب اس غریب گھرانہ کا حق ہے جس کے ہم مہمان ہیں۔ چنانچہ آپ نے ہمراہیوں سمیت شب کو کچھ تناول نہ فرمایا اور دولت واجناس کا وہ سب انبار اس غریب گھرانہ کو دے کر آگے روانہ ہو گئے۔

اس حکایت میں بے شمار نصائح ہم لوگوں کے واسطے ہیں۔ اگر ہم اس پر غور کریں: اوّل تو یہ کہ حضور نے امیروں کو چھوڑ کر غریب کا گھر پسند کیا۔ دوسرے یہ کہ اپنی نذر سب کی سب غریب کو دے دی تاکہ اس بستی کے لوگوں کو عبرت ہو کہ وہ اپنے ہم وطنوں کی غربت سے بے خبر اور بے پروا تھے۔

ذوقِ سماع | جس وجودِ پاک کے لباس ظاہر و باطن کی یہ شان ہو اور جس ہستی منورہ کی صفاتِ عالی کا یہ مرتبہ ہو اُس کے ذوق اور کیف وجدانی کا جو عالم ہوگا وہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ ذوقِ ترنّم اور ذوقِ سماع سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ جس کے حدود مقرر ہیں اور لہویات کے گانے بجانے سے اُسے کوئی سروکار نہیں۔ حضور غوث پاکؒ مظہر ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ پھر جذبۂ سماع کا ولولہ آپ میں کیوں نہ ہوتا۔ بہجۃ الاسرار جیسی کتاب معتبر میں متعدد واقعات حضور کے سماع و وجد کے مذکور ہیں۔ اسی سے دو بیان یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

— (۱) —

شیخ عمر بزاز فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور کی خدمت میں شیخ بقا اور شیخ علی بن ہیتی اور شیخ ابوسعید قیلوی حاضر ہوئے۔ اس وقت حضور ایک عالمِ کیف میں تھے۔ شیخ بقا کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کچھ بولو۔ انھوں نے عرض کیا، آپ کے سامنے بولنے کی کس کو مجال ہے۔ پھر شیخ ابوسعید کو حکم ملا تو انھوں نے کچھ عرض کیا۔ شیخ ابوسعید کے بعد خود حضور نے ایک پُرخروش اور سرشار تقریر فرمائی، جس سے حاضرین پر مستی و وجد کا عالم طاری ہو گیا۔ یہ حالت دیکھ کر لوگوں نے عرض کی، قوّال حاضر ہیں، حکم ہو تو کچھ گائیں۔ آپ نے اجازت دی۔ قوال نے گانا شروع کیا، جس کے سننے سے حضور کو حال آگیا۔ آپ بے تابانہ کھڑے ہو گئے اور اسی عالم میں کہ اہلِ مجلس اثرِ وجد سے سب کے سب مدہوش تھے۔ حضور نظروں سے غائب ہو گئے۔ لوگ تلاش کرنے نکلے تو آپ کو مدرسہ میں تشریف فرما دیکھا۔

— (۲) —

دوسری روایت بہجۃ الاسرار میں ہے کہ کسی قاری نے حضور کے سامنے یہ آیت خوش الحانی سے پڑھی لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ (آج ملک کس کے واسطے ہے) تو آپ کو حال آگیا اور جوشِ وجد میں آپ کھڑے ہو گئے۔ بار بار یہ فرماتے تھے مَنْ یَقُوْلُ الْمُلْکُ لِیْ (کون کہتا ہے کہ ملک میرے واسطے ہے)۔

حاضرین بھی آپ کی تائید میں کھڑے ہو گئے اور کسی کی مجال نہ تھی جو حضورؓ کے سوال کا جواب دے، مگر ایک شخص شیخ احمد نام نے جرأت کر کے عرض کیا (میں کہتا ہوں کہ ملک میرا ہے) کیوں کہ خداوند کریم میرا ہے تو اس کا ملک بھی میرا ہے)۔ حضورؓ نے اسی عالم وجد میں فرمایا: اے نادان جب تک تو اس کا نہ ہو وہ تیرا کب ہو سکتا ہے۔ اور جب تو اس کا نہیں تو ملک تیرا کہاں۔ شیخ احمد پر اس جواب کا ایسا اثر ہوا کہ وہ کپڑے پھینک کر جنگل کو نکل گئے۔

حضور کا ایک مکتوب | دیکھنا اس کاتب رموز و اسرار کے خط لکھنے کا ڈھنگ بھی کیسا پیارا تھا اور ان میں کیا کیا حقائق و معارف بھرے جاتے تھے۔ تحریر فرماتے ہیں:

اے عزیز! قلبے سلیم باید کہ برموز فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ اطلاع یابد۔ وعقلے کامل باید تا دقائق اسرار سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ ادراک کنند۔ ویقینے صادق باید تا شواہد معرفت وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ را بعین قلب مشاہدہ بیند۔ واز خواب غفلت یُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ بیدار گردد۔ وبرسفینہ فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰهِ سوار گردد۔ ودر دریائے معرفت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ مردانہ وار بغواصی فرود آید۔ اگر گوہر مطلوب بچنگ افتد فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا۔ واگر جان در طلب رود فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ۔

ترجمہ:

اے عزیز! قلبِ سلیم درکار ہے تاکہ آیت (عبرت پکڑو اے آنکھوں والو) کا بھید سمجھ میں آئے اور عقل کی ضرورت ہے تاکہ (ہم دکھاتے ہیں اپنی نشانیوں کو کائنات میں اور خود تمہارے نفوس میں) کی باریکیاں ہاتھ آئیں اور ان کا ادراک ہو۔ یقین صادق درکار ہے تاکہ اس آیت کے مقامات عرفان حاصل ہوں (کوئی شے بھی ایسی نہیں جو پروردگار کی حمد و تسبیح میں مشغول نہ ہو مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے) اور دل کی آنکھ سے ان کی تسبیح کا مشاہدہ ہو جائے۔ (فانی امیدوں نے ان کو دھوکا اور لالچ میں ڈال رکھا ہے۔ عنقریب ان کو معلوم ہو جائے گا) کی نیند سے ہوشیار ہو کر (خدا کی طرف بھاگو) کی کشتی میں سوار ہو اور (نہیں پیدا ہوئے جنات و انسان مگر عبادت کے لیے) کے دریائے معرفت میں غوطہ لگائے اگر گوہر مقصود ہاتھ آگیا تو (بڑی مراد مندی حاصل ہوئی) اور اگر جان اس تلاش میں گئی تو (یقیناً خدا تعالیٰ اس کو عوض دے گا)۔

مکتوبات بے شمار ہیں جن میں سے چند اخبار الاخیار میں منقول ہیں مگر میں نے صرف ایک ہی نامۂ عالی کا یہاں نمونہ پیش کیا ہے۔

تصنیفات و تالیفات | حضور غوث پاکؓ کی تصنیفات فتوح الغیب اور غنیۃ الطالبین مشہور کتابیں ہیں۔ غنیۃ الطالبین میں مسائل فقہ صوم و صلوٰۃ و حج و زکوٰۃ وغیرہ کا بیان ہے اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے عقاید کی تشریح ہے اور اہل سنت کے عقائد کے بموجب ہر گمراہ فرقہ کی تردید ہے۔ نیز بعض آیات قرآنی کی تفسیر اور اعمال و اذکار و اشغال کا

بیان ہے۔ پیر مرید کے آداب، حقوق العباد، آدابِ سماع اور ان تمام امور کا ذکر ہے جن کی سالک کو ضرورت پڑتی ہے گویا یہ کتاب شریعت وطریقت کا لبِ لباب اور خلاصہ ہے۔ فتوح الغیب میں ترک و تجرید۔ فنا و بقا۔ محب و محبوب اور امراض قلب و نفس کے علاج کا بیان ہے۔ یہ بھی طلب گارانِ سلوک کے لیے ایک نعمت عظمیٰ ہے۔

ایک مجموعہ آپ کے وعظوں کا عفیف الدین ابن مبارک نے جمع کیا ہے۔ اس میں ساٹھ مجلسوں کے وعظ فراہم کیے گئے ہیں۔ اس کو مجالس فیض اور فتح ربانی بھی کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ آپ کے بہت سے اشعار و قصائد ہیں جن میں قصیدہ غوثیہ بہت مشہور ہے جو مشائخ عظام میں بطور ایک شغل کے اکثر حاجتوں اور مرادوں کے لیے پڑھا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ نے اس میں عجیب و غریب تاثیرات رکھی ہیں۔

ایک مختصر رسالہ بھی مذاہب حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کے اصول پر آپ نے تحریر فرمایا تھا جو بہجۃ الاسرار مطبوعہ مصر کے حاشیہ پر شائع ہوا ہے۔ اس میں فرقۂ معتزلہ کی خوب تردید فرمائی ہے۔ بہجۃ الاسرار کے حاشیہ پر قصیدہ غوثیہ کے سوا اور بھی چند قصائد و اشعار آپ کے درج کیے گئے ہیں۔ ان میں ایک قصیدہ کا نام حینیہ لکھا ہے۔ اس میں ۷۴ اشعار ہیں۔ دوسرے قصیدہ کے چالیس اشعار ہیں۔ تیسرے کے پونسٹھ۔ چوتھے کے چالیس۔ پانچویں کے اٹھارہ۔ چھٹے کے ایک سو اٹھارہ۔ ساتویں کے ساٹھ۔ آٹھویں کے تینتیس۔ نویں کے بیالیس۔ دسویں کے چوبیس۔ گیارھویں کے بارہ۔ بارھویں کے بیس۔ تیرھویں کے بیس۔ اور چودھویں قصیدہ میں چودہ اشعار ہیں۔

نسب نامہ | سید محی الدین ابو محمد عبدالقادر جیلانی بن سید ابو صالح موسیٰ بن سید ابی عبداللہ بن سید یحییٰ زاہد بن سید محمد بن سید داؤد بن سید موسیٰ ثانی بن سید عبداللہ بن سید موسیٰ جون بن سید عبداللہ محض بن سید حسن مثنیٰ بن سیدنا و مولانا امیرالمومنین امام حسن بن امام العالم امیرالمومنین سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

اور مادری نسب نامہ یوں ہے: اُم الخیر فاطمہ (مادر حضور غوث پاک) بنت ابو عبداللہ صومعی۔ بن ابو جمال بن سید محمد بن سید ابو طاہر بن سید عبداللہ بن ابو کمال بن سید موسیٰ بن سید ابو علاؤالدین بن سید محمد بن سید امام علی عریض بن سیدنا امام جعفر صادق بن سیدنا امام محمد باقر بن سیدنا امام زین العابدین بن سیدنا مظلوم کربلا امام حسین بن سیدنا و مولانا امام العالم علی کرم اللہ وجہہ

اولاد امجاد | حضور غوث پاک کے نو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں۔ فرزندوں کے نام یہ ہیں: سید عبدالوہاب۔ سید عبدالرزاق۔ سید عبدالجبار۔ سید عبدالعزیز۔ سید یحییٰ۔ سید عیسیٰ۔ سید ابراہیم۔ سید عبداللہ۔ سید موسیٰ۔

بہجۃ الاسرار میں دسویں فرزند سید محمد رئیس کا نام بھی مذکور ہے۔

شیوخِ شریعت وطریقت! | حافظ ذہبی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ حضور غوث پاک نے فقہ قاضی ابو سعید مخزومی سے پڑھی اور حدیث ابو بکر بن مظفر اور ابو غالب باقلانی اور ابوالقاسم بن بنان اور ابو محمد جعفر سراج اور ابو سعد بن حبیش اور ابو طالب بن یوسف سے (اور ان علماء کی تعداد سیکڑوں سے زائد ہے، جنھوں نے حضور سے فقہ، حدیث، تفسیر اور تمام علوم دین حاصل

کیے۔ اور شیوخ طریقت کا سلسلہ یوں ہے۔

حضور غوث پاک رضؓ کے شیخ طریقت شیخ ابوسعید مخزومی۔ ان کے شیخ حضرت ابوالحسن علی ہنکاریؒ۔ ان کے شیخ حضرت ابوالفرح طرطوسیؒ۔ ان کے شیخ حضرت الواحد ابوالفضلؒ، ان کے شیخ حضرت جنید ابوالقاسمؒ، ان کے شیخ حضرت ابوبکر شبلیؒ، ان کے شیخ حضرت جنید بغدادیؒ، ان کے شیخ حضرت سری سقطیؒ، ان کے شیخ حضرت معروف کرخیؒ، ان کے شیخ حضرت خواجہ حسن بصریؒ، ان کے شیخ حضرت امام العالم سیّدنا و مولانا علی رضی اللہ عنہ۔

دوسرا طریقہ سلسلہ کا یہ ہے کہ حضرت معروف کرخیؒ تک وہی سلسلۂ شیوخ کا ہے۔ ان کے بعد یوں ہے: حضرت امام موسیٰ رضؓ، پھر حضرت امام موسیٰ کاظمؒ، پھر حضرت امام محمد باقرؒ، پھر حضرت امام زین العابدینؒ، پھر سیدنا حضرت امام العالم حضرت علی رضی اللہ عنہ۔

تلقین طریقت | فرمایا جس پیر میں یہ پانچ اوصاف نہ ہوں وہ دجّال ہے پیر نہیں ہے۔ ایک تو یہ کہ پیر ظاہری شریعت کا عالم ہو۔ دوسرے علم حقیقت جانتا ہو۔ تیسرے اپنے پاس آنے والوں کے ساتھ عمدگی اور خندہ پیشانی سے برتاؤ کرتا ہو۔ اور مسافروں کو کھانا کھلاتا ہو۔ چوتھے غربا اور بے حیثیت آدمیوں کے ساتھ قولاً و فعلاً عاجزی اور انکساری سے پیش آتا ہو۔ پانچویں یہ کہ مریدین کی باطنی تربیت و تعلیم کی لیاقت رکھتا ہو اور خود ریا، حسد، طمع، خود بینی، غفلت، عیش طلبی سے پاک ہو۔

علامہ ابن النجار کا بیان ہے کہ جبائی سے یہ روایت پہنچی ہے کہ حضور غوث پاکؒ نے فرمایا کہ مجھے فرائض کے بعد محتاجوں اور مہمانوں کو کھانا کھلانے اور عام و خاص کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آنے کے سوا کوئی بہتر کام معلوم نہیں ہوتا۔ اگر ساری دنیا کی دولت کا مالک ہو جاؤں تو سب کی سب بھوکوں کو کھلا دوں اور محتاجوں کو دے دوں۔ میرے ہاتھ میں روپیہ نہیں ٹھہرتا۔ ہزاروں اشرفیاں صبح سے شام تک ہاتھ میں آتی ہیں مگر شام کو کچھ باقی نہیں رہتا۔ مستحقوں کو بانٹ دیتا ہوں۔

کسی نے پوچھا: حضور فقیر کے معنی کیا ہیں۔ فرمایا، فَ کہتی ہے ذاتِ الٰہی میں فنا ہو جا، اور ماسوا اللہ سے دل کو فارغ کر لے قَ کہتا ہے اپنے قلب کو حُبّ خدا کی قدرت سے مضبوط کر اور اس کی رضامندی و رضا جوئی میں قائم ہو جا۔ یَ چاہتی ہے یرجوا رحمتہ و یخافہ خدا سے امیدوار رہے اور اس کا خوف دل میں رکھ۔ اور رَ کی خواہش ہے رقتِ قلب اور رجوع علی اللہ یعنی نفسانی خواہشوں سے دامن بچا کر خدا کی طرف رجوع ہو جا۔

فرمایا اپنے دل کے دروازہ پر دربان بن جاؤ۔ جس کے جانے کا خدا حکم دے اس کو اندر جانے دو۔ جس کو منع کرے اس کو روک دو۔ دلوں کی خواہشوں کو زیادہ نہ بڑھاؤ۔ ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ کسی حال اور مقام پر بھروسا کر کے یہ نہ سمجھ لینا کہ ہمیشہ اس پر قائم رہتا ہے، کیوں کہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ آیا ہے، تغیر اور تبدیلی لازمی ہے۔

فرمایا نہ کسی سے محبت کرنے میں جلدی کرو، نہ عداوت و نفرت میں۔ پہلے قرآن و حدیث کی کسوٹی پر اس کو پرکھ کر دیکھ لو ایسا نہ ہو تم نفس کی شرارت سے کسی پر بدگمانی کر بیٹھو کہ یہ گناہ ہے۔

کسی نے پوچھا حُسنِ خلق کیا ہے؟ فرمایا یہ ہے کہ تو عرفانِ حق میں سرشار ہو کہ کسی کے ظلم اور سختی سے رنج کا اثر محسوس نہ کرے

پوچھا گیا: بقا کیا چیز ہے؟ فرمایا بقائے رب ہے! اور وہ حجاب نفس کی دوری کے بغیر حاصل نہیں ہوتی اور نفس کا حجاب دور نہیں ہوتا جب تک کہ باہر کی دید سے نگاہ نہ اٹھائے اور اپنے نفس کی دید میں مصروف نہ ہو۔

نماز تہجد | سلسلہ قادریہ میں نماز تہجد کے کئی طریقے ہیں۔ ان میں ایک جس کی نسبت روایت ہے کہ حضور غوث پاکؒ کا بھی یہی طریقہ تھا، یہاں درج کیا جاتا ہے۔ نماز تہجد ایک ایسی دولت ہے جس کے سامنے تمام نفل عبادتیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ جس شخص کو یہ نعمت حاصل ہو اس کے دل میں ایک عجیب گداز اور رقت پیدا ہو جاتی ہے اور قطع نظر عقبیٰ کے اجر اور باطنی ترقیوں کے تہجد گذار کا چہرہ دور سے کہہ دیتا ہے کہ میں تہجد پڑھتا ہوں یعنی کہ برکات تہجد کا نور اس کی پیشانی اور اس کے چہرہ پر ہر وقت دمکتا رہتا ہے۔ خواہ وہ شخص کیسا ہی بدصورت ہو اور یہ ایک ایسا کھلا ہوا اور حتمی ثبوت تہجد کی تاثیر کا ہے جس کو ہر غافل اور مادہ پرست بھی آزما کر دیکھ سکتا ہے۔

تہجد کا وقت آدھی رات ڈھلنے کے بعد شروع ہو جاتا ہے۔ حضور غوث پاک کے مقلد کو تو لازمی طور سے تہجد کبھی ناغہ نہ کرنی چاہیے۔ طریقہ یہ ہے کہ دو رکعت نماز نفل تہجد کی نیت کر کے بارہ یا دس یا آٹھ یا چار رکعتیں پڑھی جائیں۔ یعنی اگر توفیق ہو اور زیادہ دیر تک جاگ سکتا ہو تو بارہ رکعتیں دو دو کر کے پڑھے، ورنہ کم، جو چار تک کم ہو سکتی ہیں۔

پہلی رکعت میں الحمد کے بعد سورۂ اخلاص ایک مرتبہ پڑھی جائے اور دوسری میں دو بار پھر جب دوبارہ نیت باندھ کر دو رکعت پڑھے تو پہلی رکعت میں الحمد کے بعد ۳ مرتبہ سورہ اخلاص اور دوسری میں چار بار اسی طرح بارہ رکعت تک ایک ایک مرتبہ سورۂ اخلاص بڑھاتا جائے یعنی بارھویں رکعت میں سورہ اخلاص بارہ مرتبہ پڑھے۔

باطنی کشائش اور ترقی سلوک عرفان کے لیے طریقہ برعکس ہے یعنی پہلی رکعت میں بارہ مرتبہ پڑھے دوسری میں گیارہ یہاں تک کہ بارھویں میں ایک مرتبہ پڑھے۔

جب نماز سے فارغ ہو جائے تو تین بار یہ استغفار پڑھے سبحان اللّٰہ وبحمدہٖ سبحان اللّٰہ العظیم وبحمدہٖ استغفر اللّٰہ واتوب الیہ۔

تہجد کے بعد ذکر | اگر خدا تعالیٰ توفیق دے تو نماز تہجد کے بعد یہ ذکر بھی کر لے کہ معمولات حضور غوث پاکؒ سے ثابت ہے۔

اوّل دو سو مرتبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ (اس کو نفی اثبات کہتے ہیں) پھر اِلَّا اللّٰہ چار سو مرتبہ (اس کو اثبات کہتے ہیں) پھر اَللّٰہ اَللّٰہ چھ سو بار (اس کو ذات کہتے ہیں)۔

یہ سب ذکر خفی کرنا چاہیے۔ یعنی آہستہ آہستہ۔ لیکن اگر کوئی عارف کامل تعلیم فرمائے اور دوسروں کی تکلیف اور نیند خراب ہونے کا اندیشہ بھی نہ ہو تو جہر کر لیا جائے۔

وجد و خوف ورجا وحیا! | وجد کی نسبت ارشاد ہوا روح ذکر کی حلاوت میں نفس لذت طرب میں اور دل فارغ ذات احد میں مصروف ہو جائیں، جس کا ظہور ایک نشہ ہے اور نشہ میں آدمی گر بھی پڑتا ہے اور بے ہوش بھی ہو جاتا ہے خوف

کی نسبت فرمایا اس کی کئی قسمیں ہیں۔ گنہگاروں کو عذاب کا خوف، عابدوں کو ثواب گھٹنے یا نہ ملنے کا خوف اور عارفوں کو عظمت الٰہی کی ہیبت سے خوف ہوتا ہے اور یہ کبھی زائل نہیں ہوتا۔ کیوں کہ عارف کے سامنے عظمت رب کبھی دور نہیں ہوتی۔ اس واسطے یہ خوف بڑا درجہ رکھتا ہے۔ رجا کی بابت ارشاد ہوا۔ اولیاء اللہ کی رجا (امید) ایک حسن ظن ہے پروردگار کے ساتھ جس کو نفع و ضرر سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ مگر اس رجا میں خوف بھی ساتھ لگا ہوا ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر مومن کے خوف و امید کو تولا جائے تو دونوں کا وزن برابر ہوگا۔ حیا کی نسبت فرمایا۔ خدا کی نافرمانی خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ اس شرم سے کہ وہ میرے مالک کی نافرمانی ہے، ترک کر دینی حیا ہے۔

دنیا دل سے نکال کر ہاتھ میں لے لو! دنیا کی تعریف تو حضورؓ نے ایسی صاف اور عام فہم فرمائی ہے جس کو ایک بچہ بھی سمجھ لے اور اس کی تشریح میں ایسی بلاغت برتی گئی ہے، جس کی نظیر حضور کے بعد کسی بلیغ جملہ میں ملنی محال ہے۔ فرمایا دنیا کو دل سے نکال لو اور ہاتھ میں لے لو، یعنی دنیا کماؤ، دولت حاصل کرو، مگر وہ تمہارے ہاتھ ہی میں رہے، دل پر قبضہ نہ کرنے پائے۔

وفات حسرت آیات آخر وہ وقت آگیا جو ہر بشری صورت کو پیش آنا ضروری ہے۔ یعنی جب حضور کا سن مبارک اکیانوے برس کا ہوا (دوسری روایت کے بموجب ۹۲ سال ہیں) تو ذات الٰہی کی محبت نے کشش فرمائی اور اس محبوب نے عالم ناسوت کو ترک فرمانے کا سامان شروع کیا۔

آپ کے صاحبزادے حضرت سید عبد الوہابؒ کا بیان ہے کہ مرض موت میں ہم لوگوں نے وصیت کی درخواست کی تو ارشاد فرمایا:

تقویٰ اور خدا کی طاعت کو اختیار کرلو، کسی سے مت ڈرو اور نہ کسی غیر خدا سے کچھ توقع رکھو۔ سوائے خدا کے کسی پر بھروسا نہ کرو اور سوائے توحید کے کسی پر اعتماد نہ رکھو کہ توحید ہی وہ چیز ہے جس پر سب کو اتفاق ہے۔

اس کے بعد فرمایا، ہم کو (سوائے خدا کے) نہ ملک الموت کی پروا ہے نہ کسی اور چیز کی۔ اس کے بعد جب بالکل آخری حالت ہوگئی تو یہ کلمات زبان مبارک پر آئے۔

استعنتُ بلا الٰہ الا اللہ الّذی لا یموتُ ولا یخشٰی، سبحان من تعزز بالقدرۃ والقہر العباد بالموت لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

مدد مانگتا ہوں اُس خدا سے جس کا شریک کوئی نہیں، جو زندہ ہے اور کبھی نہیں مرتا اور نہ کسی سے ڈرتا ہے، پاک ہے وہ جس کو بندوں پر موت طاری کرنے میں قدرت و غلبہ حاصل ہے (لہٰذا گواہی دیتا ہوں کہ) نہیں کوئی معبود مگر ایک اللہ کی ذات اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بلا شک اُس کے رسول ہیں۔

اس آخری کلمہ پر روح مبارک نے جسم شریف سے مفارقت کی۔ ربیع الآخر کا مہینہ، سترہ تاریخ اور ۵۶۱ھ ہجری کا زمانہ تھا۔

تاریخ میں بہت اختلاف ہے۔ کسی نے نویں بیان کی، کسی نے گیارھویں، کسی نے تیرھویں اور کسی نے سترھویں مگر زیادہ روایتیں سترہ کی ہیں۔

چند نادر ارشادات حضرت غوث الاعظمؓ کے چند قیمتی اقوال و ارشادات درج ذیل ہیں:

——— تم نفس کی خواہش پوری کرنے میں لگے ہو اور وہ تمھیں برباد کرنے میں مصروف ہے۔

——— انسان کا بڑا ہم جلیس اس کا بدترین دشمن ہے۔

——— حُسنِ خلق یہ ہے کہ تم پر جفائے خلق کا مطلق اثر نہ ہو۔

——— نہ کسی کے ساتھ محبت کرنے میں جلدی کرو اور نہ عداوت کرنے میں عجلت سے کام لو۔

——— اپنا مال آخرت کے لیے آگے بھیج دے اور موت کے انتظار میں لگ جا۔

——— کوشش یہی کرنی چاہیے کہ اپنی بات جواباً ہو، یعنی اپنی طرف سے کلام کی ابتدا نہ ہو۔

——— جس طرح تمہارا نفس اللہ کا حکم ماننے سے انکار کرتا ہے اسی طرح تم اپنے نفس کا کہا ماننے سے انکار کرو۔

——— مجھے اس شخص پر تعجب ہے، جو لوگوں کی عیب جوئی میں مصروف اور اپنے عیوب سے غافل ہے۔

——— تنگدستی اور بیماری صبر کے بغیر عذاب ہیں اور صبر ہو تو عزت۔

——— حسنِ خلق یہ ہے کہ تو عرفانِ حق میں اتنا مستغرق ہو جائے کہ کسی کے ظلم یا سختی سے اپنے دل کو رنجیدہ نہ کرے۔

——— جس شخص میں کوئی خوبی نہ ہو اُسے ایذا بھی کم پہنچتی ہے۔

——— اپنی خوشی کو گھٹاؤ اور رنج و محن کو بڑھاؤ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایسی ہی تھی۔

——— دنیا نے تجھ جیسے ہزاروں کو پالا اور موٹا تازہ کیا پھر خود ہی اپنی خوراک بنا لیا۔

——— مجھے اس شخص پر تعجب ہے جو یہ جانتا ہے کہ خدا اُس کے حال سے واقف ہے، پھر بھی گناہ کرتا ہے۔ تعجب ہے اس پر جو یہ جانتا ہے کہ دنیا فنا کی جگہ ہے پھر بھی اس سے محبت رکھتا ہے۔

——— لوگ متواضع ہی کو بڑا سمجھتے ہیں، تکبر کرنے والے کو نہیں۔

——— اگر ہمارا گناہ صرف یہی ہو کہ ہم دنیا سے محبت رکھتے ہیں، تب بھی ہم دوزخ کے حقدار ہیں۔

——— رحمت نہ مانگ بلکہ رحیم کو مانگ۔

——— مومن اپنے اہل و عیال کو اللہ کے سپرد کرتا ہے اور منافق اپنے مال کے سپرد۔

——— دنیا سراسر آفتوں اور مصیبتوں کا مجموعہ ہے، لہٰذا صبر اختیار کرو۔

——— جس کا انجام موت ہو اس کے لیے خوشی کا کون سا مقام ہے۔

——— مومن کے لیے سونا مناسب نہیں، جب تک اپنا وصیت نامہ سرہانے نہ رکھ لے۔

—— دنیا کو دل سے نکال کر ہاتھ میں پکڑلو، یعنی دولت کماؤ مگر اُسے ہاتھ ہی میں رکھو۔ اسے دل پر قبضہ نہ کرنے دو۔
—— ہنسنے والوں کے ساتھ مت ہنسو مگر رونے والوں کے ساتھ رو دو۔
—— اپنے نفس کی اصلاح کر، کیوں کہ نیک اعمال کی اصل بنیاد یہی ہے۔
—— اگر تو اونچی آواز سے "اللہ" بھی کہے تو حساب لیا جائے گا کہ تو نے یہ خلوص کے ساتھ کہا تھا یا محض لوگوں کو سنانے کے لیے۔
—— اخلاص اسی کا نام ہے کہ لوگوں کی تعریف یا مذمت کا کچھ خیال نہ کیا جائے۔
—— جس نے مخلوق کی طرف منہ کیا اُس نے خالق کی طرف پیٹھ پھیری۔
—— مخلوق کے ساتھ محبت کرنا یہ ہے کہ تو ان کی خیر خواہی کرے۔
—— لوگوں کی نظروں میں اپنا وقار قائم رہنے دو ورنہ افلاس کو ظاہر کرنے سے اہلِ دنیا کی نظروں میں گر جاؤ گے۔
—— آخرت کو دنیا پر مقدم رکھنے والے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں فائدہ ہی فائدہ ہے اور دنیا کو آخرت پر مقدم کرنے والے کے لیے دونوں میں خرابی
—— قول صورت ہے اور عمل اس کی روح ہے۔
—— دولت مندوں کے ساتھ وقار اور غلبہ سے ملو اور درویشوں کے ساتھ عجز و انکسار سے پیش آؤ۔
—— جو بادشاہوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے اس کا دل سخت اور وہ مغرور ہو جاتا ہے، جو لڑکوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے اس میں ہنسی مذاق کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو عورتوں کے پاس اٹھتا بیٹھتا ہے اس میں جہالت اور بُری خواہش بڑھ جاتی ہے۔ جو فاسقوں کے ساتھ نشست و برخاست رکھتا ہے وہ گناہ کرنے میں دلیر ہو جاتا ہے اور توبہ کرنے کی توفیق نہیں رہتی۔ جو عالموں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے، وہ پرہیزگار بن جاتا ہے اور علم حاصل کرتا ہے اور جو نیک لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے، وہ پرہیزگار بن جاتا ہے اور علم حاصل کرتا ہے اور جو نیک لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے اس میں طاعت الٰہی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔
—— عمل عقائد کی دلیل ہوتا ہے اور ظاہر باطن کی علامت۔
—— جو مخلوق کا ادب نہیں کرتا وہ خالق کا ادب کرنے کا دعویٰ نہ کرے اور جو اپنے نفس کو تعلیم نہیں دے سکتا تو دوسروں کو تعلیم دینے کی سعی نہ کرے۔
—— خدا کا تقویٰ اور اطاعت اختیار کرو، ظاہری شریعت کے پابند رہو، سینے کو خواہشات سے محفوظ کر لو، نفس میں جوانمردی رکھو۔ خلقِ خدا کو آزار نہ دو اور آدابِ درویشاں ملحوظ رکھو اور چھوٹوں کو نصیحت کرو۔[1]

---

[1] "احسن الکلام" از ارمان سرحدی

حضرت شیخ ابو نجیب سہروردیؒ

ولادت ——— سہرورد (زنجان) ۴۹۰ھ

وفات ——— بغداد ۵۶۳ھ

تاج الاولیا، فخر صوفیہ، ضیاء الملت والدین حضرت شیخ ابو نجیب سہروردیؒ چھٹی صدی کے سرگروہ صوفیہ اور سلسلہ عالیہ سہروردیہ کے سردار تھے۔

صفر ۴۹۰ھ میں سہرورد کے مقام پر پیدا ہوئے جو علاقہ زنجان کے قریب ایک قصبہ ہے۔ جوانی کے زمانہ میں وطن چھوڑ کر بغداد تشریف لے آئے اور وہاں کے جامعہ نظامیہ میں تحصیل علم کیا۔ امام اسعد میہنی سے فقہ، اصول فقہ اور علم کلام کی تعلیم حاصل کی۔ نحو و ادب میں علامہ ابوالحسن سے استفادہ کیا۔ امام بیہقیؒ، علامہ خطیب بغدادیؒ اور امام قشیریؒ سے حدیث سنی۔ مکہ بھی گئے اور شیخ المحدیث سے بخاری شریف سنی۔ امام واحدی کی تفسیر زبانی یاد تھی۔ قطب ربانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی صحبت مبارک کا بھی شرف حاصل کیا۔ "سفینۃ الاولیا" کے مطابق آپ نے حضرت شیخ سے خرقہ تبرک بھی حاصل کیا۔

اخبار الصالحین کے بیان کا ملخص یہ ہے:

"بچپن ہی سے اپنے چچا شیخ وجیہ الدین کی صحبت اور تربیت کا اثر آپ میں موجود تھا۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے، درس و تدریس کا سلسلہ چھوڑ کر درویشوں کی صحبت اختیار کر لی۔ چلے اور مجاہدے کیے۔ چچا کے بعد حضرت احمد غزالیؒ کی صحبت میں رہنے لگے اور انھیں کی خدمت میں رہ کر سلوک کی منزلیں طے کیں۔

آپ نے بہت سخت مجاہدے اور ریاضتیں کیں، پھر مسند ارشاد پر جلوہ گر ہوئے۔ ایک خلقت آپ کی مجلس میں رشد و ہدایت حاصل کرنے آتی تھی۔

۵۴۵ھ میں سلطان مسعود سلجوقی اور خلیفہ بغداد کی استدعا پر آپ مدرسہ نظامیہ کے صدر مقرر ہوئے۔ مگر جلد ہی ۴۷ ۵ھ میں مستعفی ہو گئے۔ شیخ الشیوخ عمر سہروردی آپ کے برادر زادہ، شاگرد اور صاحب سجادہ تھے۔ شیخ جمالی فرماتے ہیں جب خواجہ معین الدین اجمیریؒ بغداد تشریف لائے تو انھوں نے حضرت شیخ ابو نجیبؒ سے فیضان صحبت حاصل کیا، مگر ملاقات کی یہ روایت مشتبہ ہے۔

صرف عالموں اور درویشوں تک ہی آپ کا فیض محدود نہ تھا بلکہ بادشاہ اور خلیفہ وقت بھی آپ کے معتقد تھے۔ آپ کی بات مانتے تھے اور آپ کی بہت عزت کرتے تھے۔ جب الراشد باللہ ابو جعفر منصور تخت خلافت پر بیٹھا تو حضرت شیخؒ نے اس سے

بیعت حکومت ظاہری کرنے کے بعد بہت سی نصیحتیں کیں ۔ اسے عدل و انصاف اور خدا ترسی کی تلقین کی ۔

آپ کے بعض شاگردوں اور مریدوں کے نام یہ ہیں :

فقہا و محدثین : امام فخرالدین ابو علی واسطی
حافظ ابن عساکر
حافظ عبدالکریم سمعانی محدث
قاضی ابوالفتوح تکریتی
زین العلماء ابوالبرکات محدث

آپ کے خاص مرید یہ ہیں :

شیخ الشیوخ عمر سہروردیؒ شیخ نجم الدین کبریٰؒ شیخ روزبہان مصریؒ وغیرہ ۔

آپ اکثر سبز چادر اوڑھا کرتے تھے ، عالموں کا لباس زیب تن فرماتے ۔ خچر پر سواری کیا کرتے تھے اور لوگ آپ کے ساتھ ساتھ چلا کرتے تھے ۔ ۵۶۳ھ میں بہتر سال کی عمر میں وفات پائی ۔ ابن خلکان کے مطابق ۱۷ ۔ جمادی الثانی کو وفات ہوئی ۔ مگر سفینۃ الاولیاء میں ۱۲ ۔ جمادی الثانی تحریر ہے ۔

ساری عمر بغداد ہی میں گزاری ۔ مزار پر انوار بھی وہیں ہے ۔

طبقات الکبریٰ سے آپ کے بعض ارشادات نقل کیے جاتے ہیں :

فرماتے ہیں ، تصوف کا اوّل علم ، اوسط عمل اور آخر عطائے الٰہی ہے ۔ پس علم تو مراد سے پردہ اٹھا دیتا ہے ، عمل طلب میں مدد دیتا ہے اور عطائے الٰہی انتہائی امید تک پہنچا دیتی ہے ۔

فرماتے ہیں احوال میں راستی و خلوص کا نگاہ رکھنا اور مقامات میں ادب کو کام میں لانا ضروری ہے ۔ اسی سے منزلوں کے آداب کا مطالبہ ہوتا ہے اور ایسے ہی شخص کو صاحب تلوین کہتے ہیں ۔ کیونکہ یہ ایک حال سے دوسرے حال پر ترقی کرتا رہتا ہے ۔

فرماتے ہیں منتہی کے حال میں تغیر نہیں ہوتا ، اور نہ احوال اس پر کوئی اثر ڈالتے ہیں ۔ تنگی و فراخی ، بخشش و وفا ہر حالت میں یکساں رہتا ہے ، اس کے لیے بھوک اور کھانا ، سونا اور جاگنا سب برابر ہوتا ہے ۔

جب کوئی مرید خلوت میں بیٹھتا تو آپ اس کا حال دریافت فرماتے ۔ روزانہ آتے اور فرماتے کہ تمھیں فلاں چیز کا کشف ہوگا ، اور یہ حالت حاصل ہوگی ، عنقریب تمھارے پاس اس شکل کا ایک آدمی آئے گا اور تم سے یہ بات کہے گا ۔ اس سے بچنا کیونکہ وہ شیطان ہوگا ۔

حضرت شیخ احمد بن ابوالحسن رفاعیؒ

وفات ــــــــــــــ ام عبیدہ[1] ۵۷۰ھ

حضرت شیخ احمد بن ابوالحسن رفاعیؒ بڑے صاحب مرتبہ اور صاحب کرامات بزرگ تھے ۔ نفحات الانس میں لکھا ہے کہ آپ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اولاد سے تھے ۔ عرب کے ایک قبیلہ رفاعیہ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں اسی نسبت سے رفاعی کہلاتے ہیں ۔ ام عبیدہ نام قصبہ کے رہنے والے تھے اور وہیں انتقال فرمایا ۔

آپ کا سلسلۂ خلافت مندرجہ ذیل پانچ واسطوں سے خواجہ ابوبکر شبلیؒ تک پہنچتا ہے :

شیخ احمد، شیخ علی قادی، شیخ ابوالفضل، شیخ ابوعلی غلام ابن ترکان، شیخ علی رودباری۔ شیخ مجل عجمی، شیخ ابوبکر شبلیؒ ۔

آپ بڑے خدا ترس، انسان اور حیوان دونوں کے ہمدرد اور بڑے منکسر المزاج بزرگ تھے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب کبھی آپ کے بدن پر مچھر بیٹھتا تو اُسے اڑاتے نہ تھے فرمایا کرتے تھے ، جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کی قسمت میں لکھا ہے اسے پی لینے دو۔ ایک مرتبہ ایک بلی آپ کی آستین مبارک پر سو گئی۔ نماز کا وقت آگیا اور آپ اٹھنا چاہتے تھے ۔ بلی کو نہ اٹھایا بلکہ اس کے بجائے اتنی جگہ سے آستین کاٹ دی۔ واپس آئے تو بلی جا چکی تھی۔ آپ نے آستین کا ٹکڑا اٹھا کر پھر اسی جگہ سی دیا ۔ حیوانوں کے ساتھ ہمدردی کی یہ ایک نادر مثال ہے ۔

ام عبیدہ کی بستی میں ایک خارشی کتا تھا۔ لوگ اس سے سخت نالاں تھے ، چنانچہ بستی والوں نے اُسے مار مار کر بستی سے باہر جنگل کی طرف بھگا دیا۔ آپ اس کتے کے ساتھ جنگل میں چلے گئے اور وہاں اس کے رہنے کے لیے جگہ یا سائبان بنا دیا۔ اس کے بدن پر تیل ملتے ، اُسے کھانا کھلاتے اور جلد کو صاف کرتے ، یہاں تک کہ کتا تندرست ہو گیا۔ شیخ سلائی اسی واقعہ کے متعلق فرماتے ہیں :

ازاں بر ملائک شرف داشتند ــــ کہ خود را بہ از سگ نہ پنداشتند

عبادت بجز خدمتِ خلق نیست ــــ بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

امام شعرانیؒ فرماتے ہیں کہ شیخ احمدؒ کو اللہ تعالیٰ نے حیوانوں اور چارپایوں کی خدمت پر مامور فرمایا تھا ۔ علاوہ ازیں آپ اپاہج، مفلوج اور معذور لوگوں کے پاس جاتے ، ان کے کپڑے دھوتے ، انھیں نہلاتے ، سر اور بدن پر تیل ملتے ، غرض ہر طرح سے ان کی

---

[1] یہ ایک مقام ہے جو عراقین کے بیچ میں سرزمین بطائح میں واقع ہے ۔

خدمت کرتے ان کے لیے کھانا لاتے۔ خود ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔ فرمایا کرتے تھے ایسے لوگوں کی زیارت مستحب نہیں بلکہ واجب ہے۔ آپ ان لوگوں سے دعا کے بھی طالب ہوا کرتے تھے۔

ایک دفعہ کسی نے آپ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے ہزار نام ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ نہ کہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے جتنے ذرات، ریگ، پتیاں وغیرہ پیدا کی ہیں اسی قدر اس کے نام ہیں۔

ایک دفعہ آپ کچھ لڑکوں کے قریب سے گزرے۔ لڑکے آپس میں لڑ رہے تھے۔ آپ نے درمیان میں پڑ کر ان کو چھڑا دیا، پھر ایک لڑکے سے پوچھا تمھارے باپ کا کیا نام ہے۔ اس نے جواب میں نازیبا کلمات کہے۔ آپ بار بار اس کا اعادہ فرماتے اور کہتے اے لڑکے خدا تمھیں جزائے خیر دے تم نے مجھے ادب سکھایا۔

آپ اپنے ملنے والوں کو سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے۔ اپنے فرزند کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ اے بیٹے اگر تم نے مجھ جیسے کام نہ کیے تو نہ میں تمھارا باپ اور نہ تم میرے بیٹے۔ آپ کو کسی کے متعلق پتہ چل جاتا کہ وہ بیمار ہے تو خواہ وہ کتنی ہی دور دراز جگہ پر ہوتا آپ اس کی بیمار پرسی کے لیے وہاں پہنچ جاتے۔ اور ایک یا دو دن بعد واپس آ جاتے۔ اکثر اوقات راستوں پر اندھوں کے انتظار میں بیٹھ جاتے، جو اندھا بھی مل جاتا اس کا ہاتھ پکڑ کر منزل تک پہنچا آتے۔ بوڑھوں کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ مختلف محلوں میں جاتے اور لوگوں کو تلقین کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بوڑھوں کی تعظیم کیا کرو اور ان کا خیال رکھا کرو۔ جو شخص جوانی میں بوڑھوں کی عزت اور ان کی خدمت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ بڑھاپے میں کسی ایسے شخص کو اس کے لیے مسخر کر دے گا جو اس شخص کے بڑھاپے میں اس کی خدمت کرے گا۔

آپ کا معمول تھا کہ جب کبھی سفر سے اپنے شہر کو واپس آتے تو راستہ میں جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کر کے سر پر رکھ کر ساتھ لے آتے اور شہر کے غریبوں، اپاہجوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیتے۔ آپ کے عقیدت مند اور مرید آپ کے اس طرز عمل کی پیروی کرتے۔ وہ بھی لکڑیاں لاتے اور لوگوں میں بانٹ دیتے۔

آپ کبھی برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے تھے۔ اگر کوئی گالیاں دیتا تو خاموشی سے سن لیتے۔ ایک شخص نے آپ کو ملحد، کتے اور دجال جیسے الفاظ سے مخاطب کیا، آپ نے سر برہنہ کر کے اس کے سامنے زمین کو بوسہ دیا اور اس سے کہا کہ خدا کے لیے مجھ سے راضی ہو جاؤ۔

ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے اپنے مریدوں سے کہا کہ مجھ میں کوئی عیب نظر آئے تو بتا دیا کرو۔ ایک مرید نے کہا آپ میں ایک بہت بڑا عیب ہے۔ پوچھا وہ کیا؟ مرید نے کہا یہ عیب کیا کم ہے کہ ہم جیسے اشخاص آپ کے مرید ہیں۔ یہ سن کر آپ رو دیے، فرمایا میں تمھارا خادم ہوں اور تم سب سے کم تر ہوں۔ آپ منکسر المزاج تھے کہ کبھی کسی مجلس کے درمیان بیٹھتے اور نہ ہی کبھی سجادہ پر بیٹھتے۔ گفتگو بہت کم کرتے تھے۔

آپ کے ایک خادم کا بیان ہے کہ جب حضرت مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو میں نے کہا کہ آپ کی بار شاید دلمن نے جلوہ

کیا ہے، فرمایا ہاں! میں نے پوچھا کیوں؟ فرمایا وہ باتیں پیش آئی ہیں جنھیں میں نے جان کے بدلے خریدا، یعنی خلق خدا پر ایک بڑی آفت آنے والی تھی میں نے اپنی جان دے کر اسے خرید لیا۔ بیماری کے دوران آپ اپنے چہرہ اور بالوں کو زمین پر ملتے اور آف اُف کی آواز نکالتے۔ اگرچہ بیس روز سے کچھ نہ کھایا تھا مگر دست پر دست آرہے تھے اور یہی آپ کی بیماری تھی۔ فرمایا یہ دست دراصل گوشت خارج ہو رہا ہے، ہڈیوں کا مغز باقی رہ گیا ہے، آج وہ بھی خارج ہو جائے گا۔ پھر بروز پنجشنبہ بوقت ظہر ۱۲ جمادی الاول ۵۰۷ھ کو وفات پائی۔ وفات کے وقت زبان مبارک پر کلمہ شہادت جاری تھا۔ ام عبیدہ میں شیخ یحییٰ بخاری کے مقبرہ میں دفن کیے گئے۔

آپ کے بعض کلمات یہ ہیں کہ مرد متمکن وہ ہے کہ اگر دنیا کے سب سے اونچے پہاڑ پر اس کا نیزہ گاڑ دیا جائے اور ہر طرف سے ہوائیں چلیں تو اس میں تغیر واقع نہ ہو۔ فرماتے ہیں، زہد احوال پسندیدہ اور مراتب ہائے بلند کی بنیاد ہے۔ خدائے تعالیٰ کا قصد کرنے والوں میں سب کو چھوڑ کر اسی کے ساتھ ہولے والوں، اسی پر راضی ہونے والوں کا یہ پہلا قدم ہے۔ جس کسی فقیر کو صوف میں ملبوس دیکھتے تو اس سے فرماتے، دیکھو تم نے کس کا لباس پہنا اور کس کی طرف ارادہ کیا ہے۔ یہ نبیوں اور متقیوں کا لباس ہے، اسے پہنا ہے تو مقربین کے راستہ پر چلو، ورنہ یہ لباس اتار دو۔

فرماتے ہیں سینہ اس وقت صاف ہوتا ہے جب کوئی برائی باقی نہ رہے۔ خواہ وہ دشمن کے لیے ہو یا دوست کے لیے، خواہ خدا تعالیٰ کی کسی اور مخلوق کے لیے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو مردان خدا کے قیام پر پہنچانا چاہتا ہے تو پہلے اُسے اپنے نفس کے ساتھ مکلف فرماتا ہے۔ جب اس نے اپنے نفس کو مؤدب بنالیا تو اسے اہل وعیال کی تکلیف دیتا ہے۔ جب اس نے ان کے ساتھ احسان اور مدارات کی تو پڑوسیوں اور اہل محلہ کے ساتھ مکلف کرتا ہے، جب اس نے ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کیا تو پھر اللہ تعالیٰ اُسے اہل شہر کے ساتھ مکلف کرتا ہے۔ ان سے بھی اچھا سلوک کرے تو ملک کی ایک سمت اس کے سپرد کی جاتی ہے۔ اس سے بھی اچھی طرح عہدہ برآ ہو جائے تو اللہ کے ساتھ اس کا باطن اچھا ہو جاتا ہے، پھر مابین زمین و آسمان اس کے سپرد ہوتے ہیں، پھر وہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان پر ترقی کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ غوث کے رتبہ کو پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی صفت اور بلند ہوتی ہے جو بدرجہ نہایت حق تعالیٰ کی ایک صفت ہو جاتی ہے اور خدا اسے اپنے غیب پر مطلع فرماتا ہے۔ یہاں تک کہ نہ کوئی درخت اُگتا ہے نہ کوئی پتی ہری ہوتی ہے مگر اس کی نظر کے سامنے۔ پھر وہ ایسی باتیں کرنے لگتا ہے جو انسانی عقلوں سے بالا ہوتی ہے۔

فرمایا کشف ایک ایسی طاقت ہے جو اپنی بصیرت کے نور سے غیب کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ پس اس کا نور اس کے فیض سے اس طور پر متصل ہوتا ہے جس طرح صاف شیشے کی روشنی کے منبع سے مقابلہ کے وقت شعاعیں متصل ہوتی ہیں۔ پھر وہ نور چمک کر عالم عقل تک پہنچتا ہے اور معنوی اتصال کے ساتھ اس سے متصل ہوتا ہے اور قلب کی وسعت پر جو عقل کا نور آتا ہے اس میں اس نور کا اثر ہوتا ہے، تب ایسے شخص پر جو عین سر ہے عقل کا نور جگمگا اٹھتا ہے اس لیے وہ اس چیز کو دیکھتا ہے جس کی جگہ آنکھوں سے مخفی، جس کا قصد فصول کے لیے دقیق اور جس کے دیکھنے کی جگہ غیروں سے مستور ہے۔

حضرت خواجہ عبدالخالق عجدوانیؒ

ولادت ———— عجدوان (بخارا)

وفات ———— عجدوان ۵۷۵ھ

حضرت خواجہ عبدالخالق عجدوانی اپنے زمانہ کے مرجع انام تھے۔ عارف ربانی آپ کا خطاب تھا۔ سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ خواجہ بہاؤالدین نقشبندیؒ سے فیض حاصل کیا تھا۔ خواجہ ابو یوسف ہمدانیؒ کے چوتھے خلیفہ تھے۔

آپ کے والدین ملاطیہ روم (مالٹا) سے ماوراء النہر آئے اور عجدوان میں سکونت اختیار کی جو بخارا سے چھ سات کوس کے فاصلہ پر ایک قصبہ تھا۔ یہیں آپ کی ولادت ہوئی۔ ولادت کے صحیح سن کا علم نہیں ہو سکا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خواجہ خضر علیہ السلام سے آپ کی ملاقات تھی اور دونوں میں بہت محبت تھی۔ خواجہ خضر علیہ السلام ہی نے آپ کی والدہ ماجدہ کو آپ کی ولادت کی بشارت دی تھی۔

پانچ سال کی عمر میں والدہ ماجدہ نے آپ کو بخارا کے مشہور عالم شیخ صدرالدین کے پاس پڑھنے کے لیے بٹھادیا۔ کہا جاتا ہے کہ نو عمری کے اس زمانہ میں ایک مرتبہ قرآن کریم پڑھتے وقت جب یہ آیت پڑھی " ادعوا ربکم تضرعاً وخفیۃ ...." تو استاد سے پوچھا کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ استاد نے جواب دیا یہ حقیقت علم لدنی سے کھلے گی اور یہ علم اللہ تعالیٰ تمہیں عطا کرے گا۔ چنانچہ استاد کا کہنا صحیح ثابت ہوا۔

یہ بھی روایت ہے کہ جب آپ کی عمر بائیس سال کی ہوئی، خواجہ خضر علیہ السلام آپ کو خواجہ یوسف ہمدانیؒ کی خدمت میں لے گئے اور ان کا مرید کیا۔ پھر ان کی خدمت میں رہنے لگے۔ اس وقت خواجہ یوسف ہمدانی ماوراء النہر میں تشریف فرما تھے جتنی مدت وہاں رہے، خواجہ عبدالخالق انھیں کی خدمت میں رہ کر فیض حاصل کرتے رہے، پھر جب وہ خراسان چلے گئے تو خواجہ عبدالخالق یہیں رہے، ساتھ نہ گئے۔ ماوراء النہر میں رہ کر آپ ہمہ تن ریاضت و مجاہدہ میں لگے رہے۔

خواجہ خضر علیہ السلام کی تعلیم کے بموجب آپ ذکر خفی کے طریقہ پر کاربند رہے اور لوگوں سے پوشیدہ رہ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ اگرچہ خواجہ یوسف ہمدانی کا طریقہ آپ سے مختلف یعنی ذکر جہری کا تھا مگر انھوں نے آپ کے طریقے پر کبھی اعتراض نہ کیا۔ ہوش در دم، نظر بر قدم، سفر در وطن اور خلوت در انجمن کی جو اصطلاحات سلسلہ نقشبندیہ میں قائم ہوئیں، آپ ہی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔

ایک حیرت انگیز واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ عاشورہ کے روز آپ کے پاس بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ معرفت الٰہی

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک خوبصورت نوجوان آیا جو شکل و صورت سے بڑا عابد و زاہد دکھائی دیتا تھا اور چپکے سے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ خواجہ عبدالخالق نے کئی مرتبہ اسے کنکھیوں سے دیکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھ کر آپ کے سامنے آگیا اور سوال کیا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "اتقوا بفراسة المومن فانہ ینظر بنور اللہ عز وجل (یعنی مومن کی فراست سے ڈرو، اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے)" اس روایت میں کیا راز ہے؟

حضرت خواجہ صاحب نے فرمایا اس میں راز یہ ہے کہ تم زنار توڑ ڈالو اور ایمان لے آؤ۔ اس نے کہا نعوذ باللہ میرے بدن پر تو کوئی زنار نہیں۔ آپ نے خادم کی طرف اشارہ کیا کہ اٹھ کر اس شخص کے بدن پر سے خرقہ (جو وہ پہنے ہوئے تھا) کھینچ لو۔ خادم نے ایسا ہی کیا اور نیچے زنار نظر آگیا۔ وہ نوجوان اسی وقت زنار توڑ کر اسلام لے آیا۔ خواجہ صاحب اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے آؤ ہم سب بھی اپنے اپنے زنار توڑ ڈالیں اور اس نوعہد کے ساتھ ایمان لے آئیں۔ جس طرح اس نے ظاہر کے زنار کو توڑا ہے ہم بھی باطن کے زنار جن سے خود پسندی مراد ہے دور کر دیں تاکہ جس طرح اس کی آمرزش ہوئی ہے اسی طرح ہماری بھی آمرزش ہو جائے۔

یہ باتیں سن کر لوگ حیران ہو گئے۔ محفل میں ہر طرف ایک شور برپا ہو گیا۔ تمام حاضرین نے اپنے سر خواجہ صاحب کے قدموں میں رکھ دیے اور تجدید توبہ کی۔

ایک مرتبہ ایک شخص کو آپ نے یہ فرماتے سنا کہ اگر خدا مجھے دوزخ اور جنّت دونوں میں سے کسی ایک کو پسند کرنے کا اختیار دے تو میں جنّت کو کبھی پسند نہ کروں بلکہ دوزخ کو پسند کروں۔ اس لیے کہ جنت میرے نفس کو پسند ہے اور میں نے اپنے نفس کی پسند کو کبھی پورا نہیں ہونے دیا۔ خواجہ عبدالخالق یہ سن کر بولے "ایسا نہ کہو اس لیے کہ ہم بندے ہیں اور بندے کو اختیار سے کیا علاقہ؟ جو اللہ کی مرضی وہی ہماری مرضی؛ جہاں بھیجے گا وہیں جائیں گے۔"

اس شخص نے پوچھا کیا سالک راہ پر شیطان کو کوئی اختیار ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا جب تک وہ فنائے نفس کی سرحد تک نہ پہنچ جائے شیطان کو اس پر دسترس حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جو فنائے نفس کی حد تک پہنچ جائے۔ اس میں غصّہ باقی نہیں رہتا جس میں شیطان کو قابو مل جایا کرتا ہے۔ بلکہ اس میں غیرت پیدا ہو جاتی ہے اور جہاں غیرت آجائے وہاں سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔ یہ مرتبہ صرف اسے حاصل ہوتا ہے جس کا رُخ راہ حق کی طرف ہو؛ وہ اللہ کی کتاب کو دائیں ہاتھ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو بائیں ہاتھ میں تھامے ہو۔ اور انہی دونوں کی روشنی میں سلوک کی منزلیں طے کرے۔

آپ نے اپنے فرزند خواجہ اولیائے کبیر کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا "اے بیٹے! میں تجھے علم و ادب، تقویٰ اور اتباع سنت و جماعت کی وصیت کرتا ہوں۔ نماز با جماعت ادا کرتے رہنا۔ حدیث اور تفسیر کی تعلیم حاصل کرنا۔ جاہل صوفیوں سے بچے رہنا۔ اپنے احوال کو پوشیدہ رکھنا۔ کسی مسجد میں پیش امام یا موذن نہ بننا، نہ ہی قاضی یا حاکم شہر بننا، نہ کوئی قبالہ اپنے نام لکھنا، بادشاہوں سے میل جول نہ رکھنا، خانقاہیں نہ بنانا، نہ اپنے تئیں شیخ کہلوانا۔ سماع زیادہ نہ سننا اور سماع

سے انکار بھی نہ کرنا۔ کم باتیں کرنا، کم کھانا، کم سونا اور عوام الناس سے بھاگنا، امردوں اور عورتوں سے صحبت نہ رکھنا۔
دنیا کی طلب میں منہمک نہ ہونا۔

آپ نے فرمایا اے بیٹے! بہت روؤ اور کم ہنسو، قہقہہ سے پرہیز کرو۔ کسی مخلوق کو اپنے سے کمتر مت جانو اور اپنے
آپ کو کسی سے بہتر مت جانو۔ اپنی ظاہری حالت مت سنوارے رکھو اور جہاں تک ممکن ہو خدمتِ خلق میں سعی کرتے رہو۔
اور خلقِ خدا کی خدمت میں جان و مال سے دریغ نہ کرو۔ مشائخین کرام کو جان سے زیادہ عزیز رکھو اور ان کے افعال پر معترض
نہ ہو۔ دوسروں کے دلوں کو ہاتھ میں لیے رہو اور اپنے دل کو اندوہگین رکھو۔ جسم لاغر رہے اور آنکھیں گریاں۔ خلوصِ دل سے
عمل کرو اور گڑگڑا کر دعا مانگا کرو۔ پرانا کپڑا پہنو اور درویشوں کی رفاقت میں رہو۔ تمہاری سچی عبادت الٰہی اور تمہارا گھر
مسجد، تمہارا قلب ذاکر اور تمہاری زبان شاکر ہونی چاہیے۔ تمہارا مونس ذکر الٰہی اور تمہارا یار فکر رہے۔ اپنے بزرگوں کے
طریقہ پر قائم رہو۔ جس سے مراد ہوش در دم، نظر بر قدم، سفر در وطن، خلوت در انجمن، یادکرد، نگہداشت خواطر، خلق
با خلق، وقوفِ زمانی، وقوفِ عددی اور وقوفِ قلبی ہے۔

آپ کی کرامات اور خوارق بھی بکثرت بیان کیے جاتے ہیں۔ آپ کے تین بڑے خلیفہ تھے۔ خواجہ احمد صدیق، خواجہ
عارف ریوگری اور خواجہ اولیائے کبیرؒ۔ خواجہ عارف ریوگری بہت بلند مرتبے کو پہنچے۔ آپ ریوگر نام ایک قصبہ کے رہنے والے
تھے جو بخارا سے چھ کوس کے فاصلہ پر واقع تھا۔ آپ کے خلیفہ کا نام خواجہ محمود فغنوی تھا۔ ان کے خلیفہ خواجہ علی رامیتنی
تھے۔ رامیتن ایک مقام کا نام ہے جو شہر بخارا سے دو اڑھائی کوس کے فاصلہ پر تھا۔ غرض حضرت شیخ کے تمام خلفاء بخارا
کے آس پاس کے رہنے والے تھے۔ خواجہ علی رامیتنی بافندگی کا پیشہ کرتے تھے اور عزیزان کے لقب سے مشہور تھے۔ خوارزم
میں آپ کا مزار مبارک ہے۔ یہ تمام بزرگ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کی درخشندہ کڑیاں تھے۔

شیخ یوسف ہمدانیؒ | خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ کے پیر و مرشد شیخ یوسف ہمدانی امام وقت اور عارف یگانہ تھے۔ ابو یعقوب
کنیت تھی۔ ہمدان کے مضافات میں قصبہ بوزنجر کے رہنے والے تھے، وہیں سنہ ۴۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا اسم گرامی
ابو ایوب بن حسن بن شعیب تھا۔ آپ شیخ ابو علی فارمدیؒ کے مرید تھے۔ شیخ عبداللہ جوینیؒ اور شیخ حسن سمنانیؒ کی خدمت میں بھی
رہے۔ ابو اسحاق شیرازیؒ سے بھی استفادہ کیا۔ غوث الثقلین محی الدین سید عبدالقادر جیلانیؒ نے آپ سے تصوف کے بارے
میں بہت کچھ سیکھا۔ "منازل السالکین" اور "منازل السائرین" آپ کی دو تصانیف کے نام ہیں[1]۔

آپ نے تحصیل علم کے شوق میں اٹھارہ برس کی عمر میں وطن چھوڑا اور سیاحت اختیار کی۔ پہلے بغداد تشریف لائے اور
مولانا ابو اسحاق شیرازیؒ کی خدمت میں رہے۔ قرآن اور علم فقہ انھیں سے سیکھا۔ آپ مولانا ابو اسحٰق کے شاگردوں میں سب سے

---

[1] صاحبِ نفحات نے ان کی ایک اور تصنیف کا نام "زبدۃ الحیوٰۃ" بتایا ہے۔

زیادہ مقبول تھے۔ قیام بغداد کے دوران غوث الثقلین سے بھی مسلسل صحبت رہی۔

بغداد کے بعد اصفہان اور بخارا گئے اور وہاں رہ کر تحصیلِ علم کیا۔ پھر عراق، خراسان، خوارزم اور ماوراالنہر میں پھرے اور بہت مشقت و ریاضت کی، مجاہدہ نفس میں مشغول رہے۔ یہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد خواجہ ابو علی فارمدیؒ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے اور ان سے کسبِ کمال کیا۔ لوگوں کو مواعظ حسنہ سے فیض پہنچاتے رہے۔ بعد ازاں مرو میں سکونت اختیار کی، پھر ہرات تشریف لے گئے اور وہاں رہنے لگے۔ دوبارہ مرو آئے اور پھر ہرات واپس چلے گئے۔ غرض اسی طرح مختلف ملکوں، علاقوں اور شہروں میں گھومتے اور خلقِ خدا کو علوم و فنون کی اور دینی و باطنی تعلیم دیتے رہے۔ مرو جاتے وقت راستے میں ۵۳۵ھ میں وفات پائی اور مرو میں دفن کیے گئے۔

آپ کے ارشادات میں سے ایک یہ ہے کہ "سماع خدا کی طرف سے اس کا سفیر اور قاصد ہے، وہ لطائف الٰہی، موارِدِ غیب، فتح کے ابتدا اور انجام، معانی و بشارتِ کشف ہے۔ وہ ارواح کی قوت، جسموں کی غذا اور دلوں کی زندگی ہے۔ سماع پردہ کو توڑنے والا اور بھید کو کھولنے والا ہے۔ وہ برق الابصار اور آفتاب درخشاں ہے۔"

حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ

ولادت ——— قصبہ ہارون (خراسان)

وفات ——— مکہ معظمہ ۶۰۷ھ / ۶۱۷

امام ارباب طریقت و پیشوائے اولیا اہل حقیقت خواجہ عثمان ہارونیؒ اہل بصیرت کے مقتدا اور اس گروہ کے بڑے لوگوں میں تھے۔ حاجی شریف زندنیؒ[1] کے مرید اور یگانۂ عصر تھے۔ خراسان کے قصبہ ہارون کے رہنے والے تھے، جو نیشاپور کے نواح میں واقع ہے۔

آپ کی زندگی زیادہ تر سفر میں گزری اور وقت کے قریباً تمام مشہور مشائخ سے ملے۔ ان کی صحبت میں رہ کر ظاہری و باطنی استفادے کی صورت نکالی۔ تاریخ ولادت کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔ سن وفات کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ سفینۃ الاولیا اور بعض دوسری کتابوں میں تاریخ وفات سولہ شوال ۶۱۷ھ درج ہے اور بعض ۶۰۷ھ بیان کرتے ہیں۔ بہرحال اس بات پر سب متفق ہیں کہ آپ نے بڑی لمبی عمر پائی۔ مزار مبارک مکہ معظمہ میں کعبہ اور جنت المعلیٰ کے درمیان بیان کیا جاتا ہے۔ "اخبار الصالحین" میں لکھا ہے کہ نجدیوں کے اقتدار سے قبل اس قبر کے آثار موجود تھے مگر اب ناپید ہیں۔

آپ صاحب کشف و کرامات، واقف رموز حقیقت، عالم شریعت و طریقت اور بڑے پایے کے ولی اللہ تھے۔ آپ کی علو شان اور رفعت عظمت اس سے ظاہر ہے کہ آپ خواجہ اجمیریؒ جیسی ہستی کے پیر روشن ضمیر تھے۔

آپ کے پیر حاجی شریف زندنیؒ نے خرقۂ خلافت عطا فرماتے وقت آپ کے فرق مبارک پر چہار ترکی کلاہ رکھی اور فرمایا عثمان! اس کے چار گوشوں سے مراد چار چیزوں کا ترک ہے۔ یعنی ترک دنیا، ترک عقبیٰ، ترک خورد و خواب، مگر بقدر ضرورت اور ترک خواہش نفس۔ پھر فرمایا کہ یہ کلاہ اس شخص کو اپنے سر پر رکھنا جائز ہے جو ان چاروں چیزوں کو ترک کرے، سب لوگوں کو اپنے سے بہتر اور اپنے آپ کو سب سے کمتر جانے۔ جس میں یہ باتیں نہ ہوں وہ اس کلاہ کا اہل نہیں اور اس کے لیے یہ حرام ہے۔

خواجہ صاحب نے پیر طریقت کی ان باتوں پر پورا پورا عمل کیا۔ شدید ریاضت و مجاہدہ میں مصروف ہو گئے اور تیس سال تک ایسی زندگی بسر کرتے رہے۔ جب پیر و مرشد نے امتحان لے لیا اور دیکھا کہ آپ ہر طرح کامیاب ثابت ہوئے ہیں تو بڑی

---

[1] آپ بخارا کے نواح میں زندنہ نام مقام کے رہنے والے تھے۔ خواجہ مودود چشتیؒ کے مرید اور خلیفۂ اکبر تھے۔ ۱۰ رجب ۵۸۶ھ میں ایک سو بیس برس کی عمر میں وفات پائی اور زندنہ میں دفن ہوئے۔

شفقت سے خرقہ خلافت عنایت فرمایا اور اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ پیر کی اجازت سے آپ نے سفر اختیار کیا اور بہت سے دور دراز علاقوں میں پھرے، وہاں کے علما، ومشائخ سے ملاقاتیں کیں۔

خواجہ اجمیریؒ کو مرید کرنے کے بعد جب آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو خواجہ صاحب بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ مکہ سے آپ مدینہ شریف آئے، پھر بدخشاں کا رخ کیا۔ بدخشاں اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں جو بزرگانِ دین اور مشائخ رہتے تھے ان سب سے ملے۔ غرض دس سال تک سیاحت جاری رکھی۔ اس کے بعد بغداد تشریف لائے اور معتکف ہو گئے۔

کچھ مدت تک بغداد ہی میں مقیم رہے پھر دوبارہ عزمِ سفر کیا اور نکل پڑے۔ اس مرتبہ پھر دس سال تک سفر کیا اور پھر بغداد واپس آئے۔

"انیس الارواح" کے نام سے ایک کتاب میں خواجہ اجمیریؒ نے آپ کے ملفوظات جمع کیے ہیں، مگر بعض لوگوں کو اس سے انکار ہے اور وہ انیس الارواح کو منسوبات سے شمار کرتے ہیں۔

سیر العارفین میں مذکور ہے کہ جب خواجہ اجمیریؒ خرقۂ خلافت حاصل کر کے رخصت ہو گئے تو خواجہ عثمان ہارونیؒ محبت کے تقاضوں کی بنا پر خواجہ صاحب کے پاس پہنچنے کے لیے چل کھڑے ہوئے، اتفاق سے راستہ میں ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں آتش پرست رہتے تھے۔ ان لوگوں نے ایک آتشکدہ تیار کر رکھا تھا جس پہ ایک بڑا گنبد تھا۔ یہ آتشکدہ روزانہ جلایا جاتا اور وہ لوگ آگ کی پوجا کرتے۔ خواجہ صاحب اس مقام سے قدرے فاصلے پہ ایک ندی کے کنارے فروکش ہوئے اور فخر الدین نام خادم کو بھیجا کہ قریبی بستی سے جاکر آٹا اور آگ لے آئے تاکہ روٹیاں بنالی جائیں۔ خادم بستی میں گیا اور وہاں سے آٹا خریدا پھر آتشکدہ کے پاس آیا اور آتش پرستوں سے آگ مانگی۔ پجاریوں نے آگ دینے سے انکار کر دیا اور خادم آگ کے بغیر واپس آگیا اور خواجہ صاحب سے واقعہ بیان کر دیا۔

خواجہ صاحب خود آتشکدہ کے پاس گئے اور پجاریوں کو وعظ و نصیحت کی کہ اس آگ کو پوجنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ فرمایا یہ تو تھوڑے سے پانی سے فنا ہو جاتی ہے یعنی اسے بقا حاصل نہیں۔ اس لیے ایسی چیز کی پرستش بے معنی ہے جو اپنا وجود قائم نہ رکھ سکے۔ پجاریوں نے جواب دیا، آگ کا وجود بہت عظیم ہے، لہٰذا ہم اس کی پرستش کیوں نہ کریں۔

خواجہ صاحب نے فرمایا تم اتنی مدت سے اس آگ کو پوج رہے ہو، ذرا اپنا پاؤں اس میں رکھو میں دیکھوں تو یہ تمھیں جلاتی ہے یا نہیں؟

وہ بولے آگ کی خاصیت ہی جلانا ہے پھر یہ ہمیں کیسے نہ جلائے گی۔ غرض وہ لوگ بحث میں پڑ گئے اور خواجہ صاحب کے ارشاد پر کوئی توجہ نہ دی۔

تب خواجہ صاحب نے ایک ایسی کرامت صادر فرمائی جسے دیکھ کر وہ لوگ متحیر ہو گئے اور آپ سے متاثر نظر آنے لگے، بعد ازاں آپ نے پھر انھیں وعظ و نصیحت فرمائی اور وہ سب کے سب تائب ہو کر اسلام میں داخل ہو گئے۔

خواجہ عثمانؒ بڑے عابد و زاہد تھے۔ زیادہ وقت ریاضت و مجاہدہ میں گزرتا۔ بہت کم غذا کھاتے تھے۔ رات کو بھی بہت کم سوتے۔ رات دن میں دو بار قرآن ختم کیا کرتے تھے۔ مالِ دنیا سے کچھ رغبت نہ تھی۔ خواجہ اجمیریؒ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ آپ کے مریدوں میں ایک شخص تھا، جب اس نے وفات پائی تو میں بھی اس کے جنازے میں شریک ہوا۔ وہ لوگ اسے دفن کر کے لوٹ گئے مگر میں تھوڑی دیر کے لیے اس کی قبر کے پاس رک گیا۔ دیکھا کہ عذاب کے فرشتے بڑی ہیبت ناک اور بھیانک صورت میں اس کی قبر کے اندر داخل ہوئے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ خود خواجہ عثمان ہارونیؒ بھی تشریف لے آئے ہیں۔ انھوں نے فرشتوں سے فرمایا یہ میرا مرید ہے اسے عذاب نہ دو۔ فرشتوں نے اللہ کا حکم پاکر عرض کیا یہ آپ کا سچا مرید نہ تھا بلکہ آپ کے حکم کے خلاف کیا کرتا تھا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا بے شک یہ ٹھیک ہے مگر یہ اپنے آپ کو میرے ساتھ وابستہ جانتا تھا۔ حکم آیا ہم نے اسے بخش دیا۔

خواجہ عثمان ہارونیؒ کے ارشادات اور کلماتِ حکمت میں سے بعض بیان کیے جاتے ہیں۔ آپ نے علم کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں: ایک علم وہ ہے جو خدائے ذوالجلال کے لیے حاصل کیا جائے اور ایک علم وہ ہے جو بہ طریقِ عوام سیکھا جائے۔ اسی طرح عمل کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک وہ عمل جو خاص اللہ کے لیے کیا جائے اور یہ خواص کا عمل ہے۔ دوسرا وہ عمل ہے جو لوگوں کے لیے کیا جائے، یعنی محض نمائش کے طور پر۔ اس عمل کا کرنا اچھا نہیں اور نہ ہی اس کا بدلہ ملتا ہے۔ فرماتے ہیں: ایک ایمان وہ ہے کہ بندہ زبان سے تو اقرار کرے مگر دل میں شبہ رکھے یہ منافقوں کا ایمان ہے۔ دوسرا ایمان یہ ہے کہ زبان اور دل دونوں سے اقرار کرے یعنی جو کچھ زبان سے کہے دل میں یقین ہو کہ ہاں ایسا ہی ہے اور یہ نیک لوگوں کا ایمان ہے۔

فرماتے ہیں کہ مومن وہ شخص ہے جو تین چیزوں کو دوست رکھے: موت، فاقہ اور درویشی۔ فرمایا حلال کھانا کھاؤ اور حلال کمائی کا کپڑا پہنو اور توبہ کرو۔ پھر فرمایا حسد بہت بری شے ہے اسے دل میں ہرگز جگہ نہ دو۔ فرماتے ہیں مرد وہ ہے جو اللہ کے سوا کسی پر نظر نہ رکھے اور دنیا و آخرت میں مبتلا نہ ہو۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ خواجہ صاحب کی دو خواہشیں تھیں، اوّل یہ کہ میں مکہ معظمہ میں دفن کیا جاؤں، دوسری یہ کہ خواجہ اجمیریؒ کو مقامِ ولایت نصیب ہو چنانچہ دونوں خواہشیں پوری ہوئیں۔

حضرت شیخ نجم الدّین کبریٰ

ولادت ـــــــــــ ۵۰۴ھ

وفات ـــــــــــ ۶۱۸ھ

قطب ارشاد شیخ نجم الدین کبریٰ خاندان کبرویہ کے سردار اور خاندان فردوسیہ میں سر حلقۂ اہل ذوق و سماع اور علوم ظاہر و باطن کے جامع تھے۔ محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنا خرقہ مبارک بلا واسطہ انھیں عطا فرمایا تھا۔

آپ کا اسم مبارک احمد کنیت ابوالجناب اور لقب کبریٰ تھا۔ اس لقب کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جوانی کے دنوں میں آپ تحصیل علم میں بہت مصروف رہتے تھے اور مناظرہ کے بہت شوقین تھے۔ جس سے مناظرہ کرتے اُس پر غالب آتے اس وجہ سے آپ کا لقب طامۃ الکبریٰ پڑ گیا اور اسی سے مشہور ہوئے۔ کثرت استعمال کی وجہ سے لفظ "طامۃ" حذف ہوگیا اور صرف کبریٰ رہ گیا۔

والد بزرگوار کا اسم گرامی عمر بن محمد بن عبداللہ الجنوقی تھا۔ سلطان سنجر کے زمانہ میں ۵۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کو لوگ شیخ ولی تراش بھی کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ غلبات وجد میں جس کسی پر آپ کی نظر پڑتی وہ درجہ ولایت کو پہنچ جاتا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ایک روز ایک سوداگر سیر کرتا ہوا آپ کی خانقاہ کے قریب سے گزرا۔ آپ کی نظر اس پر پڑی تو وہ مرتبہ ولایت کو پہنچ گیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ جاؤ اپنے ملک میں جا کر لوگوں کو حق کے راستے پر لگاؤ۔ مولانا رومؒ کا یہ شعر

یک نظر فرما کہ مستغنی شوم زا بنائے جنس
سگ کہ شد منظور نجم الدین سگاں را سر در است

اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شیخ نجم الدین کے مرید شیخ سعدالدین حموی کو ایک دفعہ خیال آیا کہ آیا اس وقت کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کی صحبت کا اثر کتے تک میں نظر آئے۔ شیخؒ نے اپنی فراست سے یہ حال جان لیا اور خانقاہ کے دروازے پر گئے۔ اتفاق سے وہاں ایک کتا موجود تھا۔ شیخ کی نگاہ کتے پر پڑی تو وہ متحیر و بے خود ہو گیا اور شہر سے نکل کر قبرستان کی طرف چل دیا۔ شہر کے کتے اس کے گرد جمع ہو گئے اور سر دھننے لگے۔ کچھ دنوں بعد وہ مر گیا۔ شیخ نے فرمایا اسے دفن کر دو۔

شیخ نجم الدینؒ نے ابتدا میں تبریز میں کتاب شرح السنہ پڑھی۔ جب کتاب ختم ہونے کو آئی تو ایک روز شرح السنہ کا درس ہو رہا تھا اور آپ دوسرے لوگوں کے ساتھ استاد کے سامنے بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ کہ ایک درویش آیا، آپ اُسے پہچانتے نہ تھے، مگر اس کی صورت دیکھتے ہی حالت متغیر ہو گئی۔ بے قرار ہو کر ان کا نام پوچھا۔ کسی نے بتایا کہ بابا فرج تبریزی

ہیں اور مجذوبان و محبوبانِ حق میں سے ہے۔ شیخ تمام رات بے قرار رہے۔ صبح ہوتے ہی استاد کے پاس آئے اور انھیں بابا فرج کی زیارت کے لیے چلنے کو کہا۔ غرض سب کے ساتھ بابا فرج کی خانقاہ میں پہنچے۔ بابا فرج کے خادم نے اندر جاکر اطلاع کی۔ انھوں نے فرمایا کہ جس طرح خدائے عزوجل کی درگاہ میں حاضر ہوا کرتے ہیں، اسی طرح یہاں آنا چاہیں تو آسکتے ہیں۔ شیخ فرماتے ہیں کہ میں چونکہ بابا فرج کی نظر سے بہرہ مند ہو چکا تھا، اس لیے مطلب سمجھ گیا اور کپڑے اتار کر دست بستہ سامنے حاضر ہوا۔ میرے ساتھیوں نے بھی ایسا ہی کیا اور ہم سب بابا فرج کے سامنے آکر بیٹھ گئے۔ لمحہ بھر کے بعد ان کی حالت میں تبدیلی واقع ہوئی اور چہرے پر جلال چھا گیا اور وہ سورج کی طرح دمکنے لگا۔ جسم کا لباس پرزے پرزے ہو گیا۔ جب ایک پہر ساعت کے بعد حالت سنبھلی تو اُٹھے اور وہ لباس مجھے پہنا دیا اور کہا کہ "ترا وقت دفتر خواندن نیست وقت است کہ سر دفتر جہاں شوی"۔ میری حالت متغیر ہو گئی اور میرا دل غیر حق سے منقطع ہو گیا۔ جب ہم باہر آئے تو اُستاد نے کہا شرح السنہ تھوڑی رہ گئی ہے، دو تین دن میں اُسے ختم کر دو پھر جو چاہو کرو۔ دوسرے روز پڑھنے کے خیال سے پھر استاد کے پاس گیا تو دیکھا وہاں بابا فرج موجود ہیں اور کہنے لگے "دیروز ہزار منزل از علم الیقین بگزشتی امروز باز بر سر علم می روی"۔ یہ سن کر میں نے درس ترک کر دیا اور خلوت و ریاضت میں مشغول ہو گیا۔ اس شغل میں علوم باطنی اور وارداتِ غیبی ظاہر ہونے لگے۔ میں نے کہا حیف ہے اگر یہ ضائع ہو جائیں، آؤ انھیں لکھ لوں۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ بابا فرج دروازہ سے اندر آئے اور فرمانے لگے کہ شیطان تجھے تشویش دے رہا ہے، ان باتوں کو مت لکھو۔ میں نے قلم دوات پھینک دیے اور ہر طرف سے خاطر کو یکسو کر کے مشغول بحق ہوا[1]۔

خوزستان پہنچ کر شیخ نجم الدینؒ بیمار ہو گئے۔ بیماری کے عالم میں شیخ اسمٰعیل مقدی سے ملاقات ہوئی۔ یہ ایک خدا رسیدہ بزرگ اور درویش تھے۔ انھوں نے اپنی قیام گاہ میں جگہ دی۔ شیخ اسمٰعیل سماع کے شائق تھے۔ چنانچہ آپ بیماری کے عالم میں ان کی مجلس سماع میں شامل ہوا کرتے تھے۔ مگر چونکہ بیمار رہتے تھے، اس لیے سماع کے شور و غل سے جی گھبراتا تھا۔ کچھ مدت بعد تندرست ہو گئے۔ شیخ اسمٰعیل سے عقیدت بھی بڑھ گئی تھی، چنانچہ انھیں کے مرید ہو گئے۔

کچھ مدت تک انھیں کے پاس رہے اور علم ظاہری و باطنی حاصل کیا۔ بعد ازاں شیخ عمارؒ کی خدمت میں رہے اور ان سے بھی روحانی استفادہ کیا۔ پھر انھیں کے حکم سے مصر گئے وہاں شیخ روزبہان کی خانقاہ میں ٹھہرے اور کچھ مدت تک شیخ موصوف کی خدمت کرتے رہے، پھر واپس شیخ عمارؒ کے پاس پہنچے۔

شیخ عمارؒ کی خدمت میں رہ کر سلوک کے منازل طے کیے۔ شیخ نے خوارزم جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ وہاں گئے اور لوگوں میں تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بہت سے لوگوں نے آپ سے بیعت کی۔ آپ کے مریدوں اور فیض یافتہ لوگوں میں ذیل کے مقتدر حضرات قابلِ ذکر ہیں:

---

[1] اخبار الصالحین۔

شیخ مجدالدین بغدادیؒ۔ شیخ سعدالدین حموی۔ بابا کمال حموی۔ شیخ رضی الدین علی لالا۔ شیخ سیف الدین باخرزیؒ۔
لدین رازی اور شیخ جمال الدین گیلیؒ۔

آپ کے مرید اور خلیفہ شیخ مجدالدین بغدادیؒ نے "تحفۃ البررہ" نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں آپ کے ملفوظات
ہیں۔ شیخ نجم الدینؒ کا اپنا ایک رسالہ بھی تھا۔

حضرت عمار یاسرؒ اور شیخ اسمٰعیل حضریؒ سے آپ کی نسبتِ ارادت تھی۔ شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ کے واسطے سے آپ
لذکر سلسلہ اوپر تک جاتا ہے۔ دوسرا سلسلہ شیخ رکن الدین علاؤالدولہ سمنانیؒ کے ذریعہ پہنچتا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب محمد خوارزم شاہ تاتاریوں کے خوف سے بھاگ نکلا تو تاتاری اس کی تلاش میں نکلے۔ انھیں
بادشاہ خوارزم میں ہے، چنانچہ وہ ادھر کو گئے۔ یہاں شیخ نجم الدینؒ قیام فرما تھے۔ انھوں نے اپنے مریدوں کو مشورہ
تاتاری فتنہ بہت بُرا ہے لہٰذا تم لوگ اپنے اپنے علاقوں کو چلے جاؤ۔ بعض عقیدت مندوں نے عرض کیا کہ آپ دعا
کریں فتنہ دور ہو جائے۔ آپ نے فرمایا قضائے الٰہی ایسی ہی ہے۔ یہ فتنہ دعا سے دُور نہ ہوگا۔ چنانچہ مریدوں نے سواریاں
اور عرض کیا کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ آپ نے جواب دیا میں نہیں جاؤں گا اس لیے کہ میری قسمت میں یہیں
ت پانا لکھا ہے۔ اور مجھے یہاں سے جانے کی اجازت نہیں۔ پھر آپ نے سب مریدوں کو رخصت کر دیا۔ چند ساتھی رہ
گئے۔ آپ نے ان سے فرمایا، اٹھو اللہ پر توکل کر کے جہاد کریں۔ خود اٹھے، خرقہ پہنا، کمر باندھی اور نیزہ ہاتھ میں لے کر
یف لائے۔ تاتاریوں سے مقابلہ ہوا، دونوں طرف سے حملے ہوئے۔ سینہ مبارک میں تیر لگا جو آپ نے نکال کر پھینک
زیادہ زخمی ہو جانے کے باعث جانبر نہ ہو سکے۔ شہادت کا یہ واقعہ ۶۱۸ھ؁[1] میں سلطان محمد خوارزم شاہ کے عہد میں ہوا،
خان کی فوج کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

آپ فضیلت و طریقت و تصوف میں یگانہ تھے۔ بکثرت خوارق و کرامات آپ سے سرزد ہوئے۔ آپ کے نزدیک
مقابلہ میں سکر زیادہ عزیز تھا۔ اکثر اوقات فنائے احدیت میں مستغرق رہا کرتے تھے اور جو کچھ زبانِ مبارک سے نکلتا
ہر ہوتا تھا۔

نواب معشوق یار جنگ نے اپنی کتاب "اخبار الصالحین" حصہ اول کے صفحہ ۱۸۴ - ۱۸۹ پر یہ رسالہ سارے کا سارا نقل کیا ہے۔

۱ مرآۃ الاسرار۔

ا ا ۔ ۶ ۔ سجزی ۳

حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین حسن سنجری اجمیریؒ

ولادت ——— سیستان ۵۳۶ھ

وفات ——— اجمیر ۶۳۳ھ

خواجہ خواجگان معین الدین حسن سنجریؒ ان ناموروں اور اکابر اولیا میں سے ہیں جن پر زمانہ ہمیشہ فخر کرے گا اور اس اعتبار سے آپ کو منفرد حیثیت اور استثنائی حیثیت حاصل ہے کہ کفر کدۂ ہند میں۔ اسلام کی روشنی آپ ہی کی مساعی جمیلہ سے پھیلی اور یہاں اسلامی حکومت کا سنگ بنیاد بھی آپ ہی کے ہاتھوں نصب کیا گیا۔

ولادت اور حسب و نسب ۵۳۶[1] ہجری میں سیستان کے قصبہ سنجر[2] میں پیدا ہوئے۔ والد گرامی خواجہ غیاث الدین حسن بہت دولت مند تاجر اور با اثر شخص تھے۔ علاوہ ازیں بڑے عابد اور زاہد تھے۔ خواجہ صاحب نے دولت مند گھرانے میں بڑے نازو نعم سے پرورش پائی۔ آپ نجیب الطرفین سیّد تھے۔ سلسلہ نسب بارہ واسطوں سے حضرت علیؓ بن ابی طالب تک اس طرح پہنچتا ہے:

حضرت خواجہ معین الدینؒ بن غیاث الدین بن سید کمال الدین بن سید احمد حسین بن سید طاہر بن سید عبد العزیز بن سید ابراہیم بن امام علی رضا بن موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام علی بن امام زین العابدین بن سید الکونین امام حسین بن المرتضیٰ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین[3]

وطن کے حالات جس زمانے میں خواجہ اجمیریؒ کی ولادت باسعادت ظہور میں آئی، وہ اسلامی دنیا میں بڑی مصیبتوں اور ابتلا کا زمانہ تھا۔ سیستان اور خراسان کے علاقے بھی تباہی اور لوٹ مار کی زد میں آئے ہوئے تھے۔ ہر طرف افراتفری کا دور دورہ تھا۔ ملک کے اندر سیاسی جھگڑوں نے خطرناک صورت اختیار کر رکھی تھی اور آئے دن کے بلووں اور فسادات سے شہر کے شہر تباہ ہو رہے تھے۔ خود مسلمانوں کے اندر کئی فرقے پیدا ہو چکے تھے جو ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے درپے تھے۔ ملاحدہ اور باطنین نے ملک میں اندھیر مچا رکھا تھا۔ سلطان سنجر جو سلجوقی خاندان کی یادگار تھا اس علاقہ کا حکمران تھا۔

---

[1] امام غزالیؒ کی وفات کے اکتیس سال بعد۔ بعض مؤرخین پیدائش کا سن ۵۳۷ھ بیان کرتے ہیں۔

[2] سیستان کو سجستان بھی کہتے ہیں، اس لیے خواجہ صاحب کو سجزی (س ج زی) بھی کہتے ہیں اور سنجری (س ن ج ری) بھی (اخبار الصالحین حصہ اول ص ۱۹۹)

[3] خزینۃ الاصفیا (فارسی) جلد اول ص ۲۵۸

عبدالحلیم شررؔ کے بیان کے مطابق سلطان سنجر اپنے حقوقِ حکمرانی کو شوکت و سطوت اور زبردست فوجوں اور بہادر سپاہیوں کے مقابل زیادہ تر خاندانی حقوق اور حقدارِ سلطنت ہونے کی بنیاد پر ثابت کرنا چاہتا تھا گو ابھی اس کی سلطنت میں کمزوریوں کے آثار نمایاں نہ ہوئے تھے، مگر اس کا کیا علاج تھا کہ خطائی تاتاریوں کا ایک نیا پرجوش وحشی گروہ جو "غز" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا جوش و خروش سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ہر قسم کی لوٹ مار، تاخت و تاراج اور ظلم و جور پر آمادہ تھا۔ چنانچہ ۵۳۶ھ میں سلطان سنجر کو ان لوگوں سے ایک بڑی بھاری شکست ہوئی، جس میں سیستان کا حاکم جو سلطان کی طرف سے بڑی بہادری کے ساتھ لڑا تھا، اور جس کی نبرد آزمائی نے تمام دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ خطائیوں کے ہاتھ میں زندہ گرفتار ہو گیا۔ خود سنجر بے سروپائی سے بھاگا اور خراسان کے شہروں پر تاتاریوں نے طرح طرح کے ظلم کیے۔

خراسان کو ہجرت! غرض ۵۳۶ھ کے اس المناک ماحول میں خواجہ اجمیریؒ کی ولادت ہوئی۔ اس وقت ملاحدہ، باطنین اور خطائی ترکوں کے ہاتھوں آپ کا مولد تباہ و برباد ہو رہا تھا۔ ان حالات نے آپ کے والد بزرگوار کو سیستان چھوڑنے پر مجبور کیا اور وہ خراسان چلے آئے اور خواجہ اجمیریؒ یہیں نشو و نما پانے لگے، مگر یہ جگہ بھی ان سفاکوں کی دستبرد سے محفوظ نہ تھی۔ یہاں بھی وہی تباہ کاریاں ہو رہی تھیں بلکہ جلد ہی خراسان کی حالت دوسرے علاقوں سے بھی زیادہ بدتر ہو گئی اور خواجہ اجمیریؒ کے ہوش سنبھالنے تک یعنی سنِ رشد کو پہنچنے تک قتل و غارت کا یہ سلسلہ جوں کا توں جاری رہا۔ بچپن کے اس تمام عہد میں آپ نے زمانہ کے ہولناک حالات مشاہدہ کیے، جن کے باعث آپ کا دل کھٹا ہو چکا تھا۔ ۵۴۹ھ میں جب کہ آپ کی عمر تیرہ برس کی تھی، حالات نے ایک اور عبرت ناک کروٹ لی، جو تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

خراسان کی کیفیت! ان حالات کی تفصیل شررؔ لکھنوی کے الفاظ میں سنیے: آپ لکھتے ہیں کہ اسی سال (۵۴۹ ہجری میں) سلطان کو ترکانِ غز کے مقابل دوبارہ شکست ہوئی اور ایسی شکستِ فاش کہ وہ خود ان کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا اور ملک کا کوئی حامی و نگران نہ رہا، جس کی قسمت یک بیک وحشی درندوں اور بے رحم لٹیروں کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ وہ درشت مزاج اور وحشی لوگ خراسان کے علاقے میں گھس آئے۔ بلادِ طوس (شہر مقدس) اور نیشاپور کو بڑی بے رحمی سے لوٹا۔ عورتوں کو جہاں پایا بے عزت کیا، ان کی عصمتیں خراب کیں، انھیں بے حرمت و بے آبرو کیا۔ عورتوں اور لڑکوں کو پکڑ کر لونڈی غلام بنا لیے تمام مسجدیں تباہ و برباد کر دیں۔ مکانات منہدم کر دیے گئے۔ نیشاپور میں ظالموں نے ایسا ظلم کیا اور اس قدر قتل و خون کیا کہ اپنے خیال میں انھوں نے ایک شخص بھی زندہ نہ چھوڑا تھا۔ شاذ و نادر ہی کوئی ایسا خوش قسمت تھا جو کہیں چھپ چھپا کر بچ گیا ہو۔ ہر طرف لاشوں کے انبار اور تودے لگے تھے۔ بہت سے لوگوں نے جامع مسجد شعبی میں پناہ لی اور اندر سے دروازے بند کر لیے مگر وحشی جو اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے انھوں نے ہلّہ کر کے اس کے دروازے کلہاڑیوں سے چیر ڈالے اور خاص اس مقام میں جو خداوند جل و علا کا دامنِ عافیت اور دینداروں کے نزدیک دارالامان تھا گھس کر سب کو شہید کر ڈالا۔
یہی حالت وہاں کے عالی شان بیمارستان (دار الشفاء) کی ہوئی، جس کی عمارت قلعہ جیسی تھی۔ بہت سے لوگوں نے

اس میں پناہ لی۔ صرف پناہ ہی نہ لی بلکہ اس کی چھت پر چڑھ کر دشمنوں پر تیر اور پتھر برسائے، مگر ترک اس میں بھی گھسے اور جو بھی ملا خواہ وہ طبیب تھا یا مریض، زخمی تھا یا جراح، بلا استثنا و امتیاز سب کو جامِ فنا پلا دیا۔

نیشاپور کے مظلوموں اور جامِ شہادت پینے والوں میں سپاہی اور عوام ہی نہ تھے بلکہ بڑے بڑے علما و فضلا، اولیا و ابرار، اتقیا و احرار بھی تھے۔ تمام علما و شیوخ شہید ہوئے اور کل صالحین و متصوفین فنا کر دیے گئے، جن میں محمد بن یحییٰ فقیہہ شافعی تھے، جو علم و فضل میں مرجع عالم تھے۔ تبحر و مستند ہونے کی حیثیت سے دنیا میں اپنا کوئی مماثل و ہمتا نہ رکھتے تھے۔ ان کے حلقۂ درس میں مشرق و مغرب کے طلبا کا مجمع رہتا تھا۔

عبدالرحمان بن عبدالصمد اکاف نیشاپوری، جو بڑے فقیہہ اور عابد و زاہد تھے۔ جن کی خدمت میں سلطان سنجر حسنِ عقیدت سے حاضر ہوا کرتا تھا، امام قشیری کے نواسے احمد بن حسین کاتب ابوالبرکات فراوی، امام علی صباغ جو اس عہد کے ایک زبردست متکلم تھے۔ احمد بن محمد بن حامد، عبدالوہاب متابادی قاضی ساعد بن عبدالملک، حسن بن عبدالحمید رازی اور ان کے علاوہ صدہا علما و زہاد تھے، جو کمال بے دردی اور بے رحمی سے شہید کیے گئے۔

نیشاپور اس زمانے میں علم و فضل کا مخزن تھا، لہٰذا مدت ہائے دراز کے ذوقِ علم نے جو کچھ سرمایۂ علمی وہاں فراہم کیا تھا وہ سب بھی خاک میں ملا دیا گیا اور کل کتب خانوں میں آگ لگا دی گئی۔

ابتدائی زندگی غرض مصیبتوں اور آفتوں کے اس المناک ماحول میں خواجہ اجمیریؒ نے پرورش پائی اور یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، جس کے باعث عبرت اور ناپائداریِ عالم کا پہلا نقش آپ کے دل پر پڑا اور دنیا سے جی اچاٹ ہونے لگا۔ ۵۵۱ھ میں جب کہ آپ کی عمر پندرہ برس کی تھی، آپ کے والد بزرگوار خواجہ غیاث الدین حسنؒ نے وفات پائی۔[1] جس سے آپ کے دکھے دل کو ایک اور صدمہ پہنچا، مگر آپ بددل نہ ہوئے۔ والدہ ماجدہ نے جن کا نام نامی بی بی نورؒ تھا۔ آپ کی پرورش اور تربیت کی طرف پوری توجہ فرمائی، مگر وہ بھی جلد دنیا سے رحلت فرما گئیں اور آپ کشمکشِ حیات میں تنہا رہ گئے۔

والد کی وفات کے بعد ایک باغ اور ایک پن چکی ورثہ کے طور پر آپ کو ملی۔ چنانچہ آپ نے باغبانی کو ذریعہ معیشت بنایا اور سارا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ درختوں کو پانی دیتے، زمین کو ہموار کرتے، پودوں کی کاٹ چھانٹ عمل میں لاتے کھاد وغیرہ کا بندوبست کرتے اور خود ہی پھلوں کو فروخت کرتے۔

انقلابی واقعہ ایک روز آپ اپنے باغ میں آرام فرما رہے تھے کہ ابراہیم قندوزی نام ایک مشہور بزرگ اور مجذوب وہاں تشریف لائے۔ یہ بزرگ دنیا کے جھگڑوں سے بے نیاز اور الگ تھلگ ہو کر پھرتے رہتے تھے۔ خواجہ اجمیریؒ نے انھیں

---

[1] مولوی غلام سرور لاہوری کے بیان کے مطابق آپ نے عراق میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے (خزینۃ الاصفیا جلد اول صفحہ ۲۵۷) مگر اخبار العاشقین کے بیان کے مطابق آپ خراسان میں فوت ہوئے۔

دیکھا تو مہمان نوازی کے طور پر انھیں ایک سایہ دار درخت کے نیچے بٹھایا، پھر انگوروں کا ایک خوشہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ بزرگ صاحب نظر تو تھے ہی۔ پہلی نگاہ میں خواجہ اجمیریؒ کو پہچان لیا اور اپنے مطلب کا آدمی پاکر اپنی کشکول سے کھلی کا ایک ٹکڑا نکالا۔ اسے چبا کر خواجہ صاحب کے منہ میں ڈال دیا۔ کھلی حلق سے اتری ہی تھی کہ خواجہ صاحب کی کیفیت بدل گئی۔ ان کے قلبی رجحان میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا۔ زندگی نے یکسر پلٹا کھایا اور عشق الٰہی نے دل پر اثرات جمانے شروع کر دیے۔

وہ بزرگ اپنا کام کرکے چلتے بنے اور اُدھر خواجہ صاحب ایک نیا انقلابی عزم لے کر اٹھے۔ باغ، چکی اور دوسرا تمام اثاثہ فروخت کرکے ساری رقم فقرا اور مساکین کو دے دی اور خود خدا پر توکل کرکے تن تنہا نکل پڑے۔

پہلا سفر سب سے پہلے آپ نے مشرق کا راستہ لیا۔ سمرقند و بخارا ان دنوں اسلامی علوم و فنون کے مرکز سمجھے جاتے تھے، جہاں لوگ دُور دُور سے اسلامی تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ خواجہ صاحب بھی وہیں پہنچے۔ سب سے پہلے آپ نے قرآن کریم حفظ کیا پھر تفسیر، فقہ، حدیث اور دوسرے علوم ظاہری میں مہارت حاصل کی۔ آپ نے کن کن علما یا اساتذہ سے تعلیم حاصل کی؟ اس کا صحیح علم نہیں ہوسکا۔ اتنا معلوم ہے کہ آپ کو پڑھانے والوں میں ایک مولانا حسام بخاریؒ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید آپ نے انھیں سے حفظ کیا۔ پھر مرشد کامل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور نیشاپور و خراسان ہوتے ہوئے عراق کا رخ کیا۔ راستہ میں نیشاپور کا قصبہ ہارون واقع تھا جہاں اس وقت کے مشہور بزرگ خواجہ عثمان ہارونیؒ کی سکونت تھی۔

پیر مرشد سے بیعت آپ خواجہ عثمان ہارونیؒ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوکر شرف ارادت و بیعت سے مشرف ہوئے۔ خواجہ اجمیریؒ راہِ سلوک و معرفت میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے پیرو مرشد کی تلاش میں تھے ہی، خواجہ عثمان ہارونیؒ سے ملاقات ہونے پر آپ نے محسوس کیا کہ ان سے زیادہ مردِ کامل آپ کو نہیں مل سکتا۔ چنانچہ کچھ دن تک ان کی صحبت میں رہے اور عقیدت کا جذبہ آپ کے دل میں بڑھتا چلا گیا۔ خواجہ عثمان ہارونیؒ نے بھی خواجہ اجمیریؒ کی باطنی حالت کو بھانپ لیا تھا چنانچہ انھوں نے بھی خواجہ اجمیریؒ کی بیعت کو مبارک جانا۔ خواجہ اجمیریؒ کی استدعا پر خواجہ عثمان ہارونیؒ نے ان سے بیعت لے لی اور اپنے مریدوں میں شامل کر لیا۔

"چشت" کا مطلب خواجہ اجمیریؒ کو چشتی اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کا سلسلہ ارادت خواجہ اسحاق شامی المعروف چشتی تک پہنچتا ہے۔ شرر لکھنوی نے اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے کہ شیخ عثمان ہارونیؒ کو حاجی شریف زندنیؒ سے ارادت تھی، وہ خواجہ مودود چشتی کے مرید تھے، ان کو خواجہ ناصرالدین چشتی سے ارادت تھی اور خواجہ ناصرالدین چشتی شیخ یوسف چشتی کے مرید تھے، ان کا شمار خواجہ ناصرالدین ابو محمد چشتی کے مریدوں میں تھا اور وہ خواجہ ناصرالدین احمد چشتی جنھیں خواجہ اسحاق شامی المعروف بہ چشتی کی بارگاہ حقیقت دستگاہ سے فیض حاصل ہوا تھا۔ چشتی کا لقب انھیں کے وقت سے شروع ہوا ہے۔

چشت اطراف خراسان کے ایک گاؤں کا نام ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ اسحاق کا وطن مالوف تو ملک شام تھا، مگر ہدایت خلق اللہ اور مستحقین و طالبین کو رموزِ باطن کی ودیعت پہنچانے کے لیے ان حضرت نے موضع چشت کو اپنا مرکز و مستقر بنا لیا تھا۔ جہاں انھوں نے ایک چشمۂ فیض جاری کیا اور ایک ایسا مدرسۂ فیض کھول دیا کہ سلسلہ وار اسی موضع کے متعدد بزرگ ان کی شمع معرفت سے حقیقت و عرفان کا سبق لے لے کر اس گمنام گاؤں کا نام روشن کرتے رہے۔ اور واقعی یہ تھوڑی حیرت کی بات نہیں کہ آج یہ تو کوئی نہیں جانتا کہ چشت کہاں ہے یا کہاں تھا، لیکن اس کا نام ان بزرگوں کی برکت سے ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گیا۔ اس بابرکت خاندان روحانی سے صدہا بلکہ ہزارہا ولی اللہ پیدا ہوئے جنھوں نے تبلیغ رسالت محمدیؐ کی آواز چہار وانگ عالم میں پہنچائی۔ علی الخصوص ممالک مشرق کا کوئی خطہ نہیں جہاں اس خاندان طریقت کے فیوض نے۔۔۔۔ جو اہل اللہ کے سینوں میں آفتاب معرفت نہ چمکایا۔

خواجہ اجمیریؒ کا سلسلہ ارادت خواجہ صاحب کا سلسلہ ارادت و عقیدت ساتویں درجہ میں اسحاق شامیؒ چشتی تک پہنچتا ہے۔ جو گویا خاندانِ چشتیہ کے بانی اور اس متبرک اور مقدس لقب کے موجد تھے۔ اور اسحاق شامیؒ سے آگے یہ سلسلہ یوں گیا ہے کہ انھیں خواجہ ہبیرہ بصریؒ[۱] سے فیض حاصل ہوا تھا۔ وہ حضرت خواجہ حذیفہ المرعشیؒ کے صاحبانِ ارادت تھے اور وہ حضرت سلطان ابراہیم ادھمؒ کے باغِ معرفت کے خوشہ چین تھے، جنھوں نے ذوقِ وحدت کے جوش اور حق پرستی کی دُھن میں سلطنت کو لات مار کے فقیری اختیار کی تھی۔ حضرت ابراہیم ادھم عیاضؒ کے مرید تھے۔ انھیں خواجہ عبدالواحد بن زیدؒ[۲] سے فیض حاصل ہوا تھا جو حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے مرید تھے اور حضرت خواجہ حسن بصریؒ کو بارگاہ امامت اور حامل علوم باطنی رسالت امیر المومنین امام المتقین اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فیض حاصل ہوا تھا اور حضرت علیؓ نے خاص انوارِ رسالت سے کسبِ انوارِ حقیقت فرمایا تھا۔

غرض خواجہ اجمیریؒ کا سلسلہ ارادت گیارھویں درجہ میں حضرت ابراہیم ادھمؒ تک پہنچتا ہے جو دنیا کے مشہور و معروف اور نمایاں اولیاء اللہ میں سے تھے۔ پندرھویں درجے میں جناب صاحب ولایت علی بن ابی طالبؓ اور سولھویں میں خاص

---

[۱] عبدالحلیم شرر نے اپنی کتاب "خواجہ معین الدین چشتیؒ" میں خبیر بصری لکھا ہے، جو غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ خبیر بصری نام کسی بزرگ کا ذکر کتابوں میں نہیں آیا۔ ابو اسحاق شامیؒ، خواجہ ممشاد علو دینوریؒ کے مرید و خلیفہ تھے، جن کی ارادت سلسلہ عالیہ چشتیہ میں خواجہ ہبیرۃ البصری سے اور سلسلہ عالیہ قادریہ میں حضرت جنید بغدادیؒ سے تھی۔

[۲] شرر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ابراہیم ادھمؒ عیاض کے مرید تھے۔ انھیں خواجہ حبیب عجمیؒ سے فیض ہوا تھا۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ وہ خواجہ حبیب عجمی نہیں تھے بلکہ عبدالواحد بن زید تھے۔ جو حضرت امام اعظمؒ کے شاگرد تھے اور خواجہ حسن بصریؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ نے ۱۷۷ھ میں ہارون الرشید خلیفہ بنو عباس کے عہد میں وفات پائی اور مزار پرانوار بصرہ میں ہے۔

اس نقطۂ رسالت و ولایت سے مل جاتا ہے جو دنیا کی ہدایت عام اور شریعت و طریقت، حقیقت و معرفت اور علوم ظاہر و باطن کا سرچشمہ ہے۔

خواجہ اجمیریؒ کا رخصت ہونا

غرض کامل اڑھائی سال تک پیر و مرشد کی خدمت میں رہنے اور کمالات باطنی اور رموز حقیقت سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد خواجہ اجمیریؒ رخصت ہوئے۔ اس اڑھائی سال کے عرصے میں آپ نے بہت زیادہ ریاضتیں اور مجاہدے کیے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ فرماتے ہیں کہ خواجہ نے اپنی ریاضت کے ابتدائی ایام میں ایسے طریقہ سے جہاد نفس کیا کہ لوگ حیران ہوتے تھے۔ آپ نے ریاضت کا جو طریقہ اختیار کیا عارفانِ حقیقت کے گروہ میں اس کی مثال مشکل ہی سے ملتی ہے۔ مسلسل سات سات دن تک روزہ رکھتے اور صرف پانچ مثقال کی ٹکیہ سے روزہ افطار کیا کرتے۔ صرف چادر اوڑھا کرتے تھے۔ جہاں سے پھٹ جاتی اُسے سی لیتے۔

دوسرا سفر

پیر و مرشد سے رخصت ہو کر خواجہ صاحب نے دوبارہ سفر شروع کیا۔ پہلے حج کا عزم کیا اور دمشق ہوتے ہوئے حجاز پہنچے، مکہ معظمہ پہنچ کر حج ادا کیا پھر مدینہ تشریف لائے اور روضۂ رسولؐ کی زیارت کی یہاں سے بغداد کا رخ کیا۔ راستے میں علماء مشائخ کی زیارتیں کیں اور ان کی مجلسوں میں گئے۔

اس سفر میں آپ نے جن جن مشائخ سے ملاقاتیں کیں ان میں شیخ نجم الدین کبریٰ کا ذکر سب سے پہلے آتا ہے۔ یہ ملاقات بغداد سے سات میل دور سنجار نام ایک مقام پر ہوئی۔

شیخ نجم الدین بڑے پائے کے بزرگ اور علوم ظاہر و باطن کے جامع تھے۔

سماع سے بہت رغبت تھی۔ صحو کے مقابلہ میں سکر کو زیادہ پسند فرماتے تھے۔ صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ "لطائف اشرفی" میں سید اشرف جہانگیرؒ لکھتے ہیں کہ شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنا خرقہ مبارک انھیں مرحمت فرمایا تھا مگر بعض مورخین اس سے متفق نہیں۔

بغداد کے حالات

شیخ نجم الدینؒ کی خدمت میں کچھ مدت رہنے کے بعد خواجہ صاحب نے بغداد میں سکونت اختیار کی۔ اس وقت بغداد میں المستنجد باللہ ابوالمظفر یوسف بن المقتفی لامر اللہ عباسی کی خلافت تھی، جو ۵۵۵ھ میں تخت خلافت پر متمکن ہوا تھا۔ خواجہ صاحب جن دنوں بغداد میں تشریف لائے ان دنوں خلافت عباسیہ بہت نازک دور سے گزر رہی تھی۔ ان دنوں مصر میں بنو فاطمہ کی خلافت بڑی قوت پکڑ چکی تھی جس سے عباسیوں کو خطرہ لاحق تھا، مگر ۵۶۴ھ میں حالات ایسے بدلے کہ بنو فاطمہ کمزور پڑ گئے اور خلافت عباسیہ کو پھر قوت نصیب ہوگئی۔ اسی سال صلاح الدین ایوبی کے چچا اسد الدین شیرکوہ نے مصر پر قبضہ کیا، جو بنو عباس کا حامی تھا اور جس سے بنو عباس کو بڑی تقویت ملی۔

خواجہ اجمیریؒ تبریز میں

شیخ یوسف ہمدانیؒ سے ملاقات کرنے کے بعد خواجہ اجمیریؒ نے تبریز[1] کی راہ لی۔ وہاں ان

---

[1] ایران کا شہر جو ترکی اور ایران کی سرحد پر بحیرہ کیسپین کے مغرب میں واقع ہے۔

دنوں خواجہ ابوسعید تبریزی سکونت رکھتے تھے جو اپنے وقت کے مشاہیر صوفیا میں سے تھے اور عارف کامل کا درجہ رکھتے تھے۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ فرماتے ہیں کہ شیخ ابوسعید تبریزی بڑے پایے کے بزرگ اور اہل اللہ تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں ان کے مرید تھے، مگر ستّر مرید ایسے باکمال تھے کہ ہر ایک کو ولایت کا درجہ حاصل تھا اور ان میں سے ہر مرید عرفان اور حقیقت کی منزلیں طے کر چکا تھا۔ وہ سب واقفِ اسرارِ حقیقت اور رموز باطنی تھے۔ ان مریدوں میں سے ایک جلال الدینؒ تبریزی تھے جو اہلِ معرفت و حقیقت میں بڑی شہرت کے مالک ہیں۔

خواجہ اجمیریؒ نے ان کی خدمت میں چند دن گزارے اور ان چند دنوں کی صحبت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ چونکہ سیاحت کا جذبہ بہت زیادہ تھا اس لیے یہاں بھی زیادہ دیر تک قیام نہ کر سکے اور اصفہان کی راہ لی۔

خواجہ اجمیریؒ اصفہان میں

تبریز سے آپ اصفہان[۱] آئے جہاں ان دنوں شیخ محمود اصفہانی ایک مشہور بزرگ تشریف فرما تھے۔ خواجہ صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پہلی ملاقات خاصی دیر تک جاری رہی اور دونوں بزرگوں میں رموزِ معرفت کے متعلق باتیں ہوتی رہیں دونوں نے ایک دوسرے کے انکشافات و مدارج کا پتہ لگایا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی ان دنوں وہیں تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ شیخ محمود اصفہانیؒ کے مریدوں میں شامل ہونے کی خواہش رکھتے تھے مگر ابھی یہ ارادہ پورا نہ کر پائے تھے کہ خواجہ اجمیریؒ سے واسطہ پڑا، اور آپ ان سے کچھ ایسے متاثر ہوئے کہ شیخ محمود اصفہانی سے بیعت کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ خواجہ اجمیریؒ کی طرف مائل ہو گئے اور ان کے مریدوں میں شامل ہوئے۔

خواجہ اجمیریؒ نے اپنی دوتائی جسے وہ اوڑھا کرتے تھے، قطب صاحب کو مرحمت فرمائی اور اجازت دی کہ اب جا کر لوگوں کو حقیقت و معرفت کے راستے بتائیں۔

پیر و مرشد کے اس تبرک اور اعزاز کو جو خلعت اور خرقہ کی صورت میں ملا تھا حضرت قطب صاحب نے بڑی نعمت غیر مترقبہ جانا اور جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو یہی دوتائی آپ نے شیخ فریدالدین گنجشکرؒ کو مرحمت فرمائی۔ وہ دنیا سے رخصت ہونے لگے تو سلطان الاولیا شیخ نظام الدین اولیا کو مرحمت فرمایا اور ان کے دربار سے وہ قدیم تبرکِ خلعت شیخ نصیرالدین چراغ دہلویؒ کو مرحمت ہوا۔

نہیں کہا جا سکتا، خواجہ صاحب کتنی مدت تک شیخ محمود اصفہانی کی صحبت میں رہے۔ بہرحال آپ نے جلد ہی اصفہان کو چھوڑ دیا اور خرقان[۲] کی جانب کوچ کیا۔

خواجہ اجمیریؒ خرقان میں

خرقان کے گرد و نواح میں آپ کامل دو سال تک پھرتے پھراتے رہے۔ اس دوران میں آپ کا مشغلہ یہ تھا کہ خلق خدا کو وعظ و نصیحت فرماتے اور انھیں راہ راست پر لاتے۔ سینکڑوں لوگوں نے آپ کی صحبت اور آپ کے ارشادات کے ذریعہ کسب فیض کیا اور دینی و دنیوی فلاح حاصل کی۔ یہاں سے آپ استرآباد[۳] چلے گئے۔

ن۱: ایران کا شہر اور ریلوے سٹیشن۔ ن۲: ایران کا شہر اور ریلوے سٹیشن ہے جو روسی سرحد کے قریب بحیرۂ کیسپین کے جنوبی کنارے سے پہلا قصبہ ہے۔

جہ اجمیریؒ رآباد میں

استرآباد میں ان دنوں شیخ ناصر الدین نام ایک ولی کامل رہتے تھے۔ جن کا سلسلہ بیعت دو واسطوں سے بایزید بسطامیؒ تک پہنچتا ہے۔ ان کی عمر اس وقت ایک سو بائیس برس کی تھی۔ حضرت خواجہ صاحب ن سے ملاقات کی اور ان کے کمالات کے گرویدہ ہو گئے۔ چنانچہ کچھ مدت ان کے پاس رہے اور کسب فیض کیا۔ پھر وہاں گے چل دیے۔

جہ اجمیریؒ ت میں

مختلف علاقوں میں پھرتے پھراتے آپ ہرات[1] پہنچے۔ چونکہ طبیعت کسی ایک جگہ ٹھہرنے پر مائل نہ تھی اس لیے ہرات میں رہتے ہوئے سارا وقت پھرنے میں گزار دیتے اور قدرت کی بوقلمونیوں پر غور و فکر کرتے رہتے۔ میں ایک مشہور بزرگ خواجہ عبداللہ انصاریؒ کا مزار تھا۔ حضرت خواجہ صاحب دن بھر پھرتے رہتے اور رات کو اس مزار ریف لے آتے۔ ساری رات یہیں رہ کر عبادت کرتے اور عشا ہی کے وضو سے صبح کی نماز ادا کرتے۔

آپ کو عبادت و ریاضت میں اس قدر مشغول دیکھ کر لوگ آپ کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ پھر جب لوگوں پر آپ بزرگانہ عظمت کا راز کھلا تو جوق در جوق حاضر خدمت ہونے لگے۔ یہاں تک کہ آپ ہجوم خلق سے گھبرانے لگے۔ لوگ نہ دن ن لینے دیتے نہ رات کو۔ اور اس مصروفیت اور ہجوم کے باعث آپ کی عبادت میں خلل پڑنے لگا۔ چنانچہ آپ نے زیادہ وہاں قیام نہ کیا اور سبزوار کے علاقے میں چلے گئے۔

جہ اجمیریؒ زوار میں

سبزوار میں ان دنوں یادگار محمد کی حکومت تھی جو بڑا بے دین اور بد اخلاق شخص تھا۔ رقص و سرود اور عیاشی کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ اس نے اپنی سیر و تفریح کے لیے شہر سے باہر ایک باغ تعمیر کرا رکھا تھا، جس ہایت صاف ستھرا حوض تھا۔ خواجہ اجمیریؒ جب اس باغ کے قریب پہنچے تو چونکہ سفر کے باعث بہت تھکے ہوئے تھے نی کی ضرورت تھی اس لیے باغ میں حوض کے کنارے پہنچے۔

غسل فرمانے کے بعد آپ نے نماز ادا کی پھر تلاوت قرآن میں لگ گئے۔

ایک ولی اللہ کی نظر کیمیا اثر انسانی زندگی میں کیا کیا اور کیسے عظیم انقلاب لا سکتی ہے، اس واقعہ سے اس حقیقت کا را اندازہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یادگار محمد کے باغ میں خواجہ اجمیریؒ اور یادگار محمد کے درمیان جو واقعہ پیش آیا اور جس نے محمد کی کایا پلٹ دی، وہ عبدالحلیم شرر کے الفاظ میں سنیے:

لکھتے ہیں: اتفاقاً اس روز مشہور ہوا کہ یادگار محمد اپنے باغ کی سیر کو آ رہا ہے، ایک درویش جو خادم کی حیثیت سے حضرت ہمرکاب تھا، یہ خبر سنتے ہی دوڑتا ہوا آپ کے قریب آیا اور عرض کیا مناسب ہوگا کہ اب ہم باغ سے باہر چل کے ٹھہریں۔ اس کی گھبرائی ہوئی صورت دیکھ کر مسکرائے اور ارشاد فرمایا اگر تمھارا جی چاہے تو چلے جاؤ اور اس درخت کے نیچے

---

[1] افغانستان کا شہر ہے، جو ایران کی سرحد کے قریب واقع ہے۔

جاکر ٹھہرو، میں تو یہاں سے نہ اٹھوں گا۔ وہ خادم تو حسبِ اجازت اس درخت کے پیچھے چلا گیا جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا
اور ادھر شاہی فراشوں نے حوض کے کنارے حضرت خواجہ قدس سرہ العزیز کے برابر ہی اپنے بادشاہ کے لیے لا کر قالین بچھا دیا
وہ چاہتے تھے کہ حضرت سے اٹھنے کو کہیں مگر نورِ عرفان کی ان پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔

اتنے میں خود یادگار محمد آپہنچا اور حضرت خواجہ قدس سرہ العزیز کو اپنے قالین کے برابر بیٹھے دیکھ کر نہایت برہم ہوا اور اپنے
خدمت گاروں کو سخت وسست کہنے لگا کہ اس فقیر کو یہاں سے کیوں نہ نکال دیا۔

یہ کلمہ سنتے ہی حضرت نے سر اٹھایا اور اس پر جلال وغضب کی ایسی نظر ڈالی کہ اس کے ہاتھ پاؤں میں لرزہ پڑ گیا اور
اسی حالت میں تھر تھراتے تھرتھراتے زمین پر گر کے بے ہوش ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ ایک دنیا دار بندۂ ہوس ایک کامل ولی اللہ اور آشنائے حقیقت کی پُرجلال نظر کی کیا تاب لاسکتا تھا
اس کے نوکروں وغیرہ نے جب یہ حالت دیکھی تو دوڑ کر حضرت کے قدموں پر گر پڑے۔ اور عجز والحاح سے گڑگڑا گڑگڑا کر
عرض کیا کہ حضرت ان کی گستاخی معاف فرمائیں۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ آپ اتنے بڑے صاحبِ باطن ولی ہیں۔

ان لوگوں کے رونے دھونے پر آپ کو ترس آیا۔ وہ جلال کم ہوا اور اس خادم درویش کو جسے سامنے ہی ایک درخت
کے نیچے ٹھہرنے کا حکم دیا تھا، قریب بلا کے حکم فرمایا کہ اس حوض میں سے تھوڑا سا پانی لو اور اسے بسم اللہ کہہ کے اس شخص کے
منہ پر چھڑکو۔ اس درویش نے مرشد کے حکم کی تعمیل کی اور جیسے ہی پانی چھڑکا یادگار محمد کو ہوش آگیا۔ مگر اب سرکشی و نخوت کا کہیں
پتہ نہ تھا۔ اٹھتے ہی حضرت کے قدموں پر سر رکھ دیا اور حضورِ قلب کے ساتھ عرض کیا "یا شیخ! آج سے میں نے تمام ممنوعات
کو چھوڑ دیا اور آپ کے ہاتھ پر اپنے کل گناہوں سے توبہ کرتا ہوں۔ اب میرا قصور معاف ہو" آپ نے کمال مہربانی سے اس پر
دستِ شفقت بڑھائے اس کے سر کو اپنے قدموں پر سے اٹھایا اور نہایت نرمی کے الفاظ میں ارشاد فرمایا، "خاندانِ رسالت
علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کا دعویٰ کرنا اور ان کی پیروی نہ کرنا بالکل بے معنی ہے۔" اسی سلسلہ میں آپ نے آئمہ اہلبیت کے
مناقب ایسے موزون و مؤثر الفاظ میں بیان فرمائے کہ یادگار محمد اور اس کے تمام رفقاء زار و قطار رونے لگے، اور سب نے آپ
کے سامنے توبہ کی۔

یہ پند و نصائح سن کر یادگار محمد نے وضو کیا اور شکرانے کی دو رکعت نماز ادا کر کے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس
سے آپ نے اسے سرفراز فرمایا اور آپ کے مریدوں میں شامل ہو کر اسے سلسلہ مبارک چشتیہ میں داخل ہونے کی عزت حاصل ہوئی۔
یہ چیز صرف ایک ولی اللہ کی نظر کیمیا اثر کے ساتھ ہی مخصوص ہے کہ یادگار محمد حضرت کی صحبتِ فیض میں پہنچنے سے ایک لمحہ
پیشتر تو ایسا تھا کہ ہر شخص اسے نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کی صحبت سے پناہ مانگتا تھا اور اس کو بدترین خلق
تصور کرتا تھا، یا ایک رمز شناس حقیقت نے یہ معجز نما اثر کیا کہ ایک ہی گھڑی بعد وہ ایسا شخص تھا کہ ہم آپ اور سارے مسلمان
کی خوش اقبالی پر رشک کرتے ہیں اور عجیب جوش دل سے اس کلمہ کو استعمال کرتے ہیں "خوشا نصیب"۔

مرید ہوتے ہی اس نے اپنی تمام جائداد اور کُل مال و اسباب کی ایک فہرست تیار کی اور اُسے لا کے حضرت خواجہ قدس سرہ العزیز کی خدمت میں نذرانے کے طور پر پیش کر دیا۔ آپ نے قبول فرمانے سے انکار کیا اور فرمایا کہ ان میں سے جو جو چیز تم نے لوگوں پہ ظلم و جبر کر کے اور زبردستی حاصل کی ہے، ان کو لے جا کے انھیں لوگوں کو دے تا کہ کل روزِ قیامت کو تمھارا دامن پکڑیں۔

اس نے اس حکم مرشد کے مطابق تمام جائداد جو لوگوں سے زبردستی اور لوٹ مار کر کے حاصل کی تھی، اصل مالکوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کے واپس کی۔ یوں دے دلا کے جو کچھ باقی رہا، وہ فقیروں اور محتاجوں کو نذر کیا اور خود دنیا ہی سے دستکش ہو گیا، یہاں تک کہ اپنی اصلی اور منکوحہ بیوی کو بھی طلاق دے دی اور حضرت خواجہ غریب نواز کے ہمراہ ہو لیا۔

علاقہ حصار تک وہ حضرت کے ہمراہ رکاب رہا۔ وہاں پہنچ کر جب حضرت نے ملاحظہ فرمایا کہ اس کے عوض ایک خدا رسیدہ ولی بن گیا ہے تو حضرت نے اُسے حکم دیا کہ اب تمھیں میرے ہمراہ رہنے کی ضرورت نہیں، تم اسی علاقہ میں ٹھہر کے دعوتِ دین کرو اور خلق اللہ کی ہدایت اور نفع رسانی میں مشغول رہو۔

مرشد کا یہ فرمان پاتے ہی وہ علاقہ حصار میں ٹھہر گیا اور آپ نے حسبِ معمول آگے کی راہ لی۔

خواجہ اجمیریؒ بلخ میں! سبزوار سے روانہ ہو کر آپ بلخ پہنچے اور شیخ احمد خضرویہؒ[1] کی خانقاہ میں گئے جو وہاں کی نہایت مقدس اور مشہور و معروف خانقاہ تھی۔ آپ نے اسی میں قیام فرمایا۔

یہاں حکیم ضیاء الدین فلسفی نام ایک نامور حکیم اور فلسفی رہتا تھا۔ جسے تمام علوم ظاہری میں دسترس حاصل تھی لیکن تصوف پہ کوئی اعتقاد نہ تھا۔ صوفیوں اور درویشوں کو بُرا جانتا تھا۔ اپنے شاگردوں کو بھی اپنے ہی ڈھنگ کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ خواجہ اجمیریؒ سے اس کی ملاقات ہوئی تو پہلی ملاقات میں ہی اپنے سابقہ خیالات سے توبہ کی اور آپ کے مریدوں میں شامل ہو گیا۔

—— خواجہ صاحب نے کچھ دنوں تک اس کی تربیت فرمائی پھر خرقہ خلافت عطا فرمایا اور رخصت کیا۔ خواجہ اجمیریؒ تھوڑی مدت بلخ میں گزارنے کے بعد غزنی کو روانہ ہوئے۔

---

[1] شیخ احمد خضرویہؒ اپنے وقت کے مشہور بزرگ اور باکرامت ولی تھے۔ شروع میں حاتم اصمؒ کے مرید تھے۔ ابو ترابؒ کی صحبت میں بھی کافی مدت گزری۔ آپ کے متعلق ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ گھر میں چور آیا اس نے بہت تلاش کیا مگر کچھ نہ ملا۔ جب نا امید ہو کر جانے لگا تو حضرت نے دیکھ لیا اور فرمایا ڈول لے کر پانی بھر اور وضو کر کے نماز پڑھ، جو ملے گا وہ تجھے دے دیا جائے گا، تا کہ تو ہمارے گھر سے ناکام واپس نہ جائے۔

چور نے آپ کے ارشاد کے مطابق عمل کیا صبح ہوئی تو ایک شخص سو دینار لے کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے وہ رقم چور کے حوالے کر دی اور فرمایا یہ ایک رات کی نماز کا بدلہ ہے۔ چور پر اس بات کا ایسا اثر ہوا کہ اپنی سابقہ زندگی سے تائب ہو کر آپ کا مرید بن گیا اور اپنی دنیا و آخرت سنوار لی۔

خواجہ اجمیریؒ غزنی میں!

قیاس کیا جاتا ہے کہ خواجہ صاحب ۵۵۸ھ اور ۵۶۰ھ کے درمیانی عرصہ میں غزنی پہنچے ہوں گے۔
یہ وہ زمانہ تھا جب بلخ اور غزنی کی حکومتوں کے حالات بہت نازک تھے۔ چونکہ خواجہ صاحب کے قیام
زنی کے دوران بہت مہیب حالات درپیش تھے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ حالات بھی مختصر طور پر بیان کر دیے جائیں۔

غزنی کے حالات!

اس زمانہ میں تاتاری اپنے پورے عروج پر تھے اور ان کی طاقت بہت زبردست مانی جاتی تھی۔
اس وقت دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ تاتاریوں نے جدھر کا رُخ کیا، تباہی اور بربادی پھیلائی
ت، خون کی ہولیاں کھیلیں، لاشوں کے انبار لگا دیے۔ بلخ بھی تاتاریانِ غزو کے جور و ستم کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کوئی
لطنت ایسی نہ تھی جو تاتاریوں کے خوف سے لرزہ براندام نہ ہو۔ غزنی کی بھی یہی کیفیت تھی۔ غزنی کے باشندے بھی
ت آ چکے تھے۔ یہ علاقہ سلطان محمود غزنوی جیسے باہیبت اور پُرشکوہ بادشاہ کی یادگار تھا، جس نے وقت کے بڑے بڑے
دشاہوں کو نیچا دکھایا تھا۔ ہندوستان کی بے پناہ دولت جو سلطان محمود غزنوی لے گیا تھا اُس سے اُس نے غزنی کی ترقی و
ش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ چنانچہ غزنی نہایت خوبصورت اور دولت مند شہر بن چکا تھا۔ نہ صرف دولت کے لحاظ سے
مال تھا، بلکہ بڑے بڑے علماء و فضلا بھی غزنی میں آکر رہنے لگے تھے۔ چنانچہ غزنی کو علوم و فنون کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

محمود غزنوی کے بعد ایک دو جانشینوں تک سلطنت خاصی مضبوط رہی مگر بعد ازاں اُس میں کمزوری آنے لگی۔ چنانچہ
ب نئی طاقت ابھری جس نے جلد ہی غزنوی سلطنت کو الٹ کر رکھ دیا۔ اور غزنی خاندانِ غوری کے زیرِ اقتدار آگیا۔

جب خواجہ اجمیریؒ غزنی پہنچے تو خسرو شاہ جو چھٹی پیڑھی پر محمود غزنوی کی اولاد میں تھا، انتقال کر چکا تھا (۵۵۵ ہجری)
د اس کا لڑکا تخت نشین تھا۔ اس کی تخت نشینی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد علاؤالدین غوری نے غزنی پر حملہ کر کے اس کا
اصرہ کر لیا، مگر سخت سردی اور برف باری کے باعث یہ محاصرہ ناکام رہا اور وہ بے نیل و مرام لوٹا۔ اس کا خیال تھا کہ آئندہ سال
بارہ غزنی پر حملہ کرے گا، مگر قضا نے اسے مہلت نہ دی اور ۵۵۶ھ میں وفات پا گیا۔

علاؤالدین کی جگہ اس کا بیٹا سیف الدین محمد تخت نشین ہوا۔ یہ بیس سالہ نوجوان تھا اور ناتجربہ کار تھا۔ اس نے سوچا کہ
لے تاتاریوں کو ختم کیا جائے پھر غزنی پر حملہ ہو۔ چنانچہ اس نے ایک بہت بڑا لشکر جمع کیا اور ۵۵۸ھ میں تاتاریانِ غزو پر حملہ کر دیا۔
گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ کشت و خون کا بازار گرم ہوا۔ جنگ کے دوران علاؤالدین لشکر سے الگ ہو گیا۔ دشمن موقع کی
ل میں تھے اُسے پکڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ فوج کو بادشاہ کے مارے جانے کا علم ہوا تو بھاگ کھڑی ہوئی۔ زبردست شکست
ائی۔ ہزاروں آدمی مارے گئے اور غوریوں کو شدید نقصان پہنچا۔

اگلے سال تاتاریوں نے خود غزنی پر حملہ کر دیا۔ غزنی کے فرمانروا ملک شاہ نے دیکھا کہ ان سے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا
اپنے قدیم خاندانی دار السلطنت کو چھوڑ کر بھاگ نکلا اور ہندوستان کا رخ کیا اور لاہور پہنچ کر پناہ گزین ہو گیا۔
غزو لوگوں نے غزنی کو بُری طرح لوٹا پھر یہاں اپنا ایک نائب مقرر کر کے واپس چلے گئے۔ ملک شاہ نے حالات

موافق دیکھے تو واپس آیا اور دوبارہ غزنی پر حملہ کر دیا۔ تاتاری حکمران فرار ہو گیا اور ملک شاہ نے دوبارہ غزنی پر قبضہ کر لیا۔

شیخ عبدالواحد غزنوی سے ملاقات!

غزنی میں ان دنوں شیخ عبدالواحد غزنویؒ بڑے باکمال اور صاحب باطن مشائخ میں سے تھے۔ یہ حقیقت شناس ولی اللہ شیخ نظام الدین ابوالمؤید کے مرشد تھے اور ان کی ذات سے اس علاقہ میں لوگوں کو روحانی برکتیں حاصل ہو رہی تھیں۔ ان سے مل کے اور ایک دوسرے سے روحانی ذوق حاصل کر کے آپ نے ہندوستان کا رخ کیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد

سرزمین پاکستان و ہند میں مسلمانوں نے ۹۲ھ ۷۱۲ء میں قدم رکھا۔ مسلمانوں کی آمد کا یہ آغاز محمد بن قاسم کے حملے سے ہوا، جس نے سندھ کے برہمن راجہ چا بیرج کے لڑکے داہر پر حملہ کیا اور سندھ کو فتح کر کے وہاں اسلامی سلطنت قائم کی۔ اس فتح کے بعد مسلمان ہندوستان کے اندرونی حصے کی طرف نہ بڑھے؛ بلکہ محمد بن قاسم کے ساتھ مسلمانوں کی جو جماعت یہاں آئی تھی وہ سندھ ہی میں ٹھہر گئی۔ چنانچہ اس حملے کا اثر باقی ہندوستان پر نہ پڑ سکا۔ پھر کامل تین صدیوں تک ہندوستان پر مسلمانوں نے کوئی حملہ نہ کیا۔

۹۷۶ء میں سلطان سبکتگین غزنوی نے جب پنجاب کے راجہ جے پال سے جنگ کی تو اس کے بعد ہندوستان پر مسلمانوں کے لگاتار حملے ہوئے۔ محمود غزنوی نے اگرچہ ہندوستان پر متعدد حملے کیے اور فتوحات حاصل کیں، مگر اس نے یہاں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم کرنے کے متعلق کبھی نہ سوچا۔ ۱۰۳۰ء میں سلطان محمود کا انتقال ہو گیا، تو اس کے بعد غوریوں نے ہندوستان پر حملے کیے۔ یہ غوری ہی تھے جنھوں نے ہندوستان میں مستقل اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور اس وقت مسلمانوں کے قدم یہاں جمنے شروع ہوئے۔

محمد بن قاسم کے ساتھ جو مسلمان یہاں آئے تھے انھوں نے دینِ حق کی اشاعت کا کام ضرور کیا اور اس زمانہ میں سندھ میں بعض اکابر اور صوفیا کا پتہ چلتا ہے، جنھوں نے سندھ، پنجاب اور کشمیر میں اسلام کو پھیلانے کے لیے جد و جہد کی مگر یہ کام صرف انھیں علاقوں تک محدود رہا، اندرونِ ہند اس کے کوئی اثرات نظر نہ آتے تھے۔

ہندوستان کی کیفیت!

ہندوستان میں ہر طرف پرانے ہندو مذہب کے پیرو آباد تھے۔ جس مذہب اور کیش و آئین کے لوگ اس سے پیشتر آپ کی نظر سے کبھی نہ گزرے ہوں گے۔ ان لوگوں میں جو سچی اور پرانی توحید تھی وہ بت پرستی کے دام میں بالکل چھپ گئی تھی۔ پرانے بانیانِ مذہب کی تعلیمیں اور عہدِ عتیق کے مشرقی خدا پرستوں کی شان اس قدر فنا ہو گئی تھی کہ یہاں کی حالت دیکھ کے اس کا پتہ لگانا غیر ممکن تھا۔ بت ہر جگہ، ہر شہر اور ہر قریہ میں پوجے جاتے تھے اور خود ان بتوں میں ایسے ایسے کرشمے مانے جاتے تھے کہ اصل خالقِ مطلق اور قادرِ یکتا سے کسی کو علاقہ نہیں باقی رہا تھا۔ یہ اصول کہ بت، درخت، جانور اور تمام عجیب و غریب چیزیں خدا کی قدرت کا نمونہ خیال کی جائیں اور اس کی عظمت ماننے کے لیے ان کے سامنے سر جھکایا جائے۔ صنم پرستی کے دامن میں پوشیدہ ہوتے ہوتے مٹ جانے کے قریب پہنچ گیا تھا اور صاف نظر آتا تھا کہ ہندوستان کے سوا

کوئی ایسا ملک نہیں جہاں کے لوگ سب سے زیادہ گمراہ ہوں اور جہاں خالق کے دھوکے میں کھُلی کھُلی مخلوق پرستی ہو رہی ہو۔

خواجہ اجمیریؒ کے تاثرات | اب اس کے بعد اس بات کا خیال کیجیے کہ ایک حقیقت شناس، صاحبِ معرفت اور دریائے وحدت میں ڈوبے ہوئے ولی اللہ کے دل پر یہ حالت دیکھ کے کیا اثر ہوا ہوگا۔ اُسے یقیناً نظر آیا ہوگا کہ اس سے زیادہ کوئی ملک ہدایت کا محتاج نہیں اور حق پرست کا پہلا فرض یہی ہے کہ ان بندگانِ خدا کی ہدایت و دستگیری کرے اور انھیں عذابِ آخرت کے اندیشوں سے چھڑا کے نجات کا امیدوار بنائے۔ چنانچہ یہ خیال دل میں آتے ہی حضرت خواجہ کے رگ و پے میں سرایت کر گیا اور وہ ولی اللہ جس کی اتنی مدت اِدھر اُدھر جانے اور شہروں شہروں پھرنے میں بسر ہوئی تھی اور جس کی ظاہری حالت بتا رہی تھی کہ کسی جگہ ایک مہینے کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتا، اُس کی یہ حالت ہوگئی کہ بلا تامل ہندوستان میں ٹھہرنے، ایک جگہ جم کے بیٹھنے اور خدا کے بندوں کو راہِ راست کی طرف متوجہ کرنے پر آمادہ ہوگیا۔

ورودِ لاہور | الغرض تبلیغ و ہدایت کی اس دھن کو دل میں لیے ہوئے آپ لاہور[1] پہنچے اور غور فرمانے لگے کہ کس جگہ کو اپنا مسکن قرار دیں۔

اگر انصاف کی نگاہ سے دیکھا جائے تو آپ کا یہ انتخاب ہی اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ آپ کتنے بڑے نیک نفس، پاک باطن اور بے طمع و قانع ولی اللہ تھے۔ ظاہری حالت کا یہ تقاضا تھا کہ آپ لاہور کو اپنا مرکز و مرجع قرار دیتے۔ اُن دنوں یہ شہر مسلمانانِ ہندوستان کا مستقر اور اکثر مسلمان امیروں اور دولتمندوں کا مسکن تھا۔ یہاں مسلمان عالموں، فاضلوں اور ولیوں اور عارفوں ہی کی انتہا سے زیادہ قدر و منزلت نہیں ہوتی تھی بلکہ ہر نووارد مغربی مسافر و سیاح کے لیے آنکھیں بچھائی جاتی تھیں اور اسے اس قدر دولت و حشمت مل جاتی تھی کہ زندگی کی ساری آرزوئیں پوری ہو جاتی تھیں۔

اگر لاہور کو کسی وجہ سے نہ بھی اختیار کیا جاتا تو پنجاب کے بہت سے شہر اور گاؤں موجود تھے جو کابل اور غزنی کے راستے پر واقع تھے، جن میں سے ہو کر ہمیشہ بڑے بڑے شاہانِ اولوالعزم امرائے بلند حوصلہ اور مسلمان سیاحوں کے قافلے گزرتے رہتے تھے اور ایک مسلمان ولی اللہ کی پوری طرح اعانت و خبرگیری کر سکتے تھے، مگر نہیں آپ نے اپنی سکونت کے لیے نہ لاہور کو پسند فرمایا اور نہ پنجاب کے کسی شہر کو، اس لیے کہ یہ مقامات پہلے ہی اسلام کے مرکز بنے ہوئے تھے اور ہدایت کرنے کے لیے یہاں صدہا ولی اللہ اور علما[2] موجود تھے۔

عزمِ اجمیر | ممکن تھا کہ آپ اپنی خانقاہ دہلی میں جا کے قائم کرتے، جس میں گو ابھی تک مسلمانوں کی سلطنت قائم نہیں ہوئی تھی

---

[1] آپ پشاور ہوتے ہوئے لاہور آئے اور شیخ المشائخ حضرت داتا گنج بخش علی مخدوم ہجویریؒ کے آستانہ مبارک پر حاضری دی۔ کہا جاتا ہے کہ دو ماہ تک آپ داتا صاحب کے آستانہ پر معتکف رہے اور جب روانہ ہوتے تو زبان سے بے ساختہ یہ شعر نکلا ؎ گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا • ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما
آج یہ تاریخی شعر حضرت داتا گنج بخشؒ کی چوکھٹ پر کندہ ہے اور ان کی بزرگی کا معترف ہے۔

[2] جیسے شیخ حسین زنجانیؒ اور داتا گنج بخشؒ جنھیں وفات پائے بہت کم مدت گزری تھی۔

مگر ہندوستان کا قدیم مرکز اور مرجع و ماویٰ تھا۔ مگر نہیں، آپ نے اپنا مرکز اور اپنا توحید و معرفت کا روحانی دارالسلطنت شہر اجمیر کو قرار دیا، جس کا انتخاب سچ پوچھیے تو ایسا حیرت انگیز کام تھا کہ محض انسانی عقل بغیر الہامی مدد کے ایسا انتخاب ہرگز نہیں کر سکتی۔

یہ خطہ سچ پوچھیے تو ہر طرح مرکز ہدایت بلکہ مرکز سلطنت بننے کے لیے بھی نہایت موزوں تھا۔ مرکز ہدایت اس لیے کہ وہاں تک اسلام نے ہنوز جڑ نہیں پکڑی تھی۔ بعض فاتحانِ اسلام کا لشکر بے شک اُدھر سے گزرا تھا، مگر اس سرزمین کے کسی پتلے کو اس سے پیشتر شاید نورِ اسلام سے بہرہ یاب ہونے کی عزت و فضیلت اس وقت تک نہ حاصل ہوئی ہوگی۔

ہر چہار طرف راجپوتانہ کی سلطنتیں تھیں جو ترقی دین اور توحید اسلام کی تعلیم سے مانع تھیں، لہٰذا سب سے زیادہ وہیں کے لوگوں کو تبلیغ و ہدایت کی ضرورت تھی اور یہ شہر مرکز سلطنت بننے کے لیے اس واسطے تھا کہ پورے جزیرہ نمائے ہند کے وسط میں واقع ہوا ہے۔ ہر جگہ سے اسے یکساں نسبت ہے۔ وہاں ٹھہر کے جیسے تعلقات شمالی ہند سے قائم رکھے جا سکتے ہیں ویسے ہی جنوبی ہند سے۔ اور جو نسبت اسے صوبہ جات مشرقی سے ہے وہی صوبہ جات مغربی سے ہے۔ شہر کے چاروں طرف پہاڑوں کا حلقہ ہے جو اس کی حد بندی کرتے اور اس کے لیے مضبوط اور زبردست شہر پناہ کا کام دے سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اجمیر اپنے موقع اور اپنی حالت کے لحاظ سے بلاتشبیہ ہندوستان کا کعبہ قرار دیا جا سکتا تھا، اور بادشاہ ہو تو اور ولی ہو تو دونوں کے لیے حکومت و تبلیغ کا عمدہ مرکز و مستقر بنایا جا سکتا تھا۔

سیاسی ماحول | ہندوستان کی حالت ان دنوں نہایت نازک ہو رہی تھی۔ غزنوی حملے لوگوں کو بھول گئے تھے کمزور وارثانِ محمود غزنوی کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ سرحدی مسلمانوں کو ایک طرف خوارزمیوں اور دوسری طرف تاتاریوں کی دستبرد سے اس بات کا موقع ہی نہیں ملتا تھا کہ ہندوستان کی طرف توجہ کریں، مگر ہاں غوریوں کا کوکب اقبال نیا نیا چمکا تھا، جو غزنی و ہرات کے جھگڑوں کی وجہ سے ناکامی کی گھٹاؤں میں چھپ چھپ کر نکلتا اور زیادہ تیزی سے چمکتا تھا۔ شہاب الدین غوری کی سطوت ہندو راجاؤں کو دھمکا رہی تھی۔ لاہور فرمانروائے غزنی کے قبضے میں تھا، مگر اس کے قریب سے لے کر سندھ اور سواحل بحیرۂ عرب تک قرامطہ کی حکومت تھی، جو محمود کے حملوں سے پامال ہونے کے بعد پھر سنبھل گئے تھے اور بنی فاطمہ مصر سے تعلقات بڑھا رہے تھے۔ شہاب الدین غوری اجمیر اور دہلی کے راجاؤں سے شکست کھا کے گیا تھا اور جوشِ انتقام میں بے چینی اور بے قراری کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

منزل گاہِ دہلی | ان حالات میں خواجہ اجمیریؒ چالیس خدا پرست درویشوں کی معیت میں دہلی پہنچے اور ایک میدان میں قیام فرمایا۔

اس زمانہ میں دہلی کا ہندو راجہ پورے عروج پر تھا، شہاب الدین غوری جیسا بہادر اور جری حکمران بھی جو بہان حکمرانِ دہلی و اجمیر سے دو مرتبہ بھاری شکست کھا کر ہندوستان سے ناکام و نامراد واپس جا چکا تھا۔ بدیں وجوہ فرزندانِ توحید کے خلاف

ہندوؤں میں سخت نفرت و تعصب پھیلا ہوا تھا۔ ہندوستان میں ہر طرف ہندو راجاؤں کی حکومت تھی جن میں پرتھوی راج کی حکومت بہت بڑی اور مضبوط مانی جاتی تھی۔ دہلی اور اجمیر اہل ہنود کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

دہلی میں اشاعت حق خواجہ اجمیریؒ نے دہلی پہنچ کر تبلیغ اسلام کا کام شروع کر دیا۔ اگرچہ ہندوؤں کے نزدیک اسلام کا نام لینا ہی انھیں بھڑکا دینے کے لیے کافی تھا اور وہ دین اسلام کی تبلیغ کسی طرح گوارا نہ کر سکتے تھے، مگر خواجہ اجمیریؒ کی روحانیت، خلوص کی کشش، موعظہ حسنہ کی شان، ان کی نرمی اور خوش خلقی کے طفیل ہندو آپ کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ جس طرح دوسرے مسلمان آپ کی طرف توجہ دیتے تھے اس طرح ہندو بھی آپ کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ خلقت کا ہجوم جس میں مسلم اور غیر مسلم سب شریک ہوتے تھے، آپ کی طرف کھنچا چلا آتا تھا، مگر آپ نے دہلی کو اپنا مستقر بنانا پسند نہ کیا اور جلد ہی اجمیر کا قصد کیا۔

دہلی چھوڑنے سے قبل آپ نے اپنے مشہور اور نامور خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو دہلی میں اپنا خلیفہ مقرر کیا اور دہلی میں رہ کر اشاعتِ حق کا فرض ادا کرنے کا حکم دیا، پھر خود اجمیر پہنچے۔

اجمیر کی ناموافق فضا آپ کے ورود کے وقت اجمیر[1] اور اس کے قرب و جوار میں رائے پتھورا کی حکومت تھی، مگر آپ وہاں رہ کر ایسی خاموشی کی زندگی بسر کرنی شروع کی کہ پتھورا کو کسی قسم کی شکایت نہ پیدا ہونی چاہیے تھی، ہاں اگر ممکن تھا ہو سکتا تھا تو یہ کہ آپ کی نظر کیمیا اثر اور آپ کی زبان معجز بیان اپنا غیر معمولی اثر دکھا رہی تھیں[2]۔ جو کوئی آپ کے پاس آیا معتقد ہو گیا اور چند ہی روز میں اس کو توحید کی سچی حقیقت اور یزداں پرستی کی شان معلوم ہو گئی۔ ہزارہا خلقت آپ کے ہاتھ

---

[1] اس زمانہ میں اجمیر کا شہر وہاں آباد نہ تھا جہاں اب ہے بلکہ تارا گڑھ کے نیچے واقع تھا۔ اب بھی کہیں کہیں اس آبادی کے کھنڈر پائے جاتے ہیں۔

[2] خواجہ صاحب کی مخالفت کے سلسلے میں مختلف کتابوں میں مختلف واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ پھر اسی ضمن میں ان کی بعض کرامتوں کا بھی ذکر ہے۔ یہاں ہمارا مقصد محض خواجہ اجمیریؒ کی کرامت بیان کرنا نہیں۔ تاہم اونٹوں کا واقعہ بیان کیے دیتے ہیں جو مختلف کتابوں میں آیا ہے۔ "انوار کے الفاظ میں اس کی تفصیل یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے حسب معمول شہر سے باہر میدان میں ایک درخت کے نیچے آرام فرمایا۔ کہتے ہیں کہ احاطہ میں جہاں اب چھوٹا سا چبوترہ اولیا مسجد نامی ہے۔ یہی خواجہ کی پہلی اجمیری نشست گاہ کا مقام ہے جہاں خواجہ آکر اترے۔

اس جگہ راجہ اجمیر کے اونٹ بیٹھا کرتے تھے۔ جب ساربانوں نے اس جماعتِ مسلمان فقرا کو دیکھا تو آکر کہا کہ یہاں سے اٹھ جاؤ راجہ کے اونٹ بیٹھا کرتے ہیں۔ خواجہ نے کہا کیا ہرج ہے وسیع میدان ہے وہ بھی آکر بیٹھ جائیں گے، ہم کو بھی آرام کرنے دو۔

وہ سختی سے پیش آئے۔ اس پر خواجہ نے فرمایا، اچھا ہم چلے جاتے ہیں راجہ کے اونٹ ہی بیٹھے رہیں گے۔ آپ کہہ کر یہاں سے
شام کو راجہ کے اونٹ چرتے پھرتے آئے اور حسب معمول اس میدان میں بیٹھ گئے۔ رات تو آرام سے بے خبری میں کٹی
کہ ساربانوں نے جب اونٹوں کو اٹھانا چاہا تو ایک بھی نہ اٹھ سکا۔ زمین نے ان کے گوشت کو ایسے پکڑ لیا کہ چھڑانا محال ہو گیا۔ اسی طرح کچھ دیر

(باقی اگلے صفحہ پر)

ایمان لائی اور وہ سرزمین جہاں ایک مسلمان بھی نہ تھا لاکھوں آدمی محض آپ کے تصرف باطنی کی برکت سے مسلمان ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ عام لوگوں میں آپ کی کرامات اور خوارق عادات کی بھی شہرت ہوئی۔ غرض یہ چیزیں راجہ پتھورا کو ناگوار گذریں۔ اس لیے کہ اول تو ان ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف تعصب بہت زیادہ تھا جیسے فطرتاً ہونا چاہیے تھا۔ دوسرے یہ کہ اسی زمانہ میں شاہان اسلام ہندوستان پر حملے کر رہے تھے اور اس کوشش میں تھے کہ سارے آریہ ورت کو اپنے قبضے میں لے آئیں۔ لہٰذا خواجہ صاحب قدس سرہ العزیز کا یہ اثر ہندوؤں کی قومیت کو توڑ کے وطنی اور ملکی حکمرانوں کو سیاسی حیثیت سے بھی کمزور کر رہا تھا۔

راجہ کی برہمی غرض ایسے اتفاقات پیش آئے کہ راجہ پتھورا آپ کی کارروائیوں سے برہم ہوا۔ اور آپ کے خالص دینی اور الہامی مشن کو سیاسی کارروائی سمجھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لیکن اونٹ نہ اٹھے۔ اب تو یہ لوگ جان گئے کہ یہ درویشوں کی ناراضگی کا پھل ہے۔ سب نے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ راجہ کو صورت حال کی اطلاع کی جائے۔ آخر راجہ کے پاس جا کر سب ماجرا کہہ سنایا۔ اس نے کہا جس کی بددعا سے یہ اونٹ بیٹھے ہیں اسی کی دعا سے اٹھیں گے بھی اور اس کا کوئی علاج نہیں۔ جاؤ فقیروں سے معافی مانگو۔ بے رحم دل لوگ ہوتے ہیں معاف کر دیں گے اور اونٹ اٹھ جائیں گے۔

اب سب ساربان دست بستہ آئے اور عذر تقصیر کیا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے تو ذات بھی تو تھے ہی رحم فرمایا اور کہا جاؤ جس کے حکم سے وہ بیٹھ گئے ہیں اسی کے حکم سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

ساربانوں نے واپس جا کر سب اونٹوں کو صحیح سالم اور کھڑے پایا۔

اجمیر کی اس پہلی کرامت نے کافروں کو ایسا ڈرایا کہ ان کے ہوش بجا نہ رہے اور سب مل کر اس کے متعلق جلسے اور کمیٹیاں کرنے لگے کہ آخر اس زبردست طاقت کا مقابلہ کیسے ممکن ہے۔ اگر یہ درویش کچھ عرصہ یہاں جم گئے تو پھر ان کے نکال دینے کا تھوڑا بہت امکان جو اب ہے وہ بھی جاتا رہے گا اور پچھتانا بیکار ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے ابھی سے باہمی معاونت کے ذریعہ اس کا تدارک کریں۔

لہ سابقہ فٹ نوٹ میں بتایا گیا تھا کہ خواجہ صاحب کو راجہ کے ساربانوں نے اس میدان سے اٹھا دیا تھا۔ چنانچہ وہاں سے اٹھ کر آپ انا ساگر کے کنارے تشریف لے گئے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں بکثرت ہندوؤں کے مندر تھے۔ یہ مندر ندی کے چاروں طرف واقع تھے۔ ان میں ایک مندر بہت بڑا تھا کہ بڑے بڑے پجاری، امراء اور خود راجہ بھی اس مندر میں آیا کرتے تھے۔ کئی گاؤں اس مندر کے مصارف کے لیے وقف تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان تمام مندروں میں کئی من تیل روزانہ جلا کرتا تھا اور کئی سو پجاری ہر وقت موجود رہتے تھے۔ خواجہ اجمیریؒ ایسے ماحول میں آکر قیام پذیر ہو گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ پجاریوں اور تمام ہندوؤں کو خواجہ صاحب اور ان کے ساتھیوں کا یہ قیام کسی طرح گوارا نہ ہو سکتا تھا چنانچہ انھوں نے ایک وفد کی صورت میں راجہ سے درخواست کی ان لوگوں کو یہاں سے نکال دیا جائے۔ کیونکہ یہ ہمارے مذہب کے خلاف ہیں۔ راجہ نے ان کے مطالبہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور انھیں اجازت دے دی کہ سرکاری آدمیوں کی مدد سے انھیں وہاں سے نکال دیا جائے۔ اس اجازت کے ملتے ہی وہ خواجہ صاحب اور ان کے ساتھیوں کے مقابلے پر آ گئے۔

اشتعال انگیز واقعہ اس کی ناراضی کی ابتدا یوں ہوئی کہ حضرت خواجہ صاحب کے ایک معتقد مسلمان کو جو آپ کی خدا شناسی اور پاک نفسی کا والہ و شیدا تھا، رائے پتھورا کے دربار میں بھی باریابی کی عزت حاصل تھی۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ باوجود اختلاف مذہب کے پتھورا اس کی قدر و منزلت کرتا تھا۔

اس کی زبان سے پتھورا نے حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی جو زیادہ تعریفیں سنیں اور اسے آپ کی شانِ ولایت کا گرویدہ دیکھا تو اس پر بہت بگڑا، عتاب کرنا شروع کیا اور روز بروز زیادہ ستانے لگا۔ اس شخص کو شاید اس بات کی خبر نہ تھی کہ اس ناراضی کی اصل وجہ حضرت قدس سرہ العزیز ہیں۔ اور خود بارگاہِ ولایت میں آکر عرض کیا کہ راجہ صاحب مجھ سے ناراض ہوتے جاتے ہیں اور ان کی برہمی سے اندیشہ ہے کہ مجھے کوئی سخت ضرر نہ پہنچ جائے۔ اگر کوئی مضائقہ نہ ہو تو آپ اس کی خدمت میں میری سفارش فرما دیں۔

آپ نے بلا تامل راے پتھورا سے نہایت نرمی اور استمالت کے الفاظ میں اس کی سفارش کر دی۔

اس سفارش نے اس کی آتشِ غضب کو اور بھڑکایا اور اپنے اہلِ دربار سے برہمی و نخوت کے الفاظ میں کہا اس شخص (خواجہ صاحب) کو کیا حق تھا جو یہاں آیا ہے۔ وہ طرح طرح کے کرشمے دکھا دکھا کے اور غیب کی باتیں بتا بتا کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بناتا اور گمراہ کرتا ہے۔

ادھر اس نے اپنے دربار میں یہ نامناسب کلمات آپ کی نسبت زبان سے نکالے ادھر لوگوں نے اس کی خبر حضرت خواجہ تک پہنچا دی۔

رائے پتھورا پر عتاب خواجہ رائے پتھورا کے پاس فوج اور اسلحہ سب کچھ تھا۔ وہ بڑی سے بڑی فوج کے ساتھ مقابلہ کرنے کی قوت رکھتا تھا مگر خواجہ صاحب کی روحانی قوتوں کے سامنے وہ بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر وقت کے مشورہ جوگی کے اعمال نے اُسے اور بھی درماندہ کر دیا تھا اور خواجہ صاحب اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگے تھے۔ اگرچہ راجہ کی ماں نے اسے بہت سمجھایا کہ خواجہ صاحب سے مخالفت اچھی نہیں اس سے تم خود اور تمھاری حکومت بھی برباد ہو جائے گی مگر وہ نہ مانا۔ ادھر مسلمانوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، اُدھر راجہ کا غصہ اور تیز ہوتا جا رہا تھا۔ اس دوران میں خواجہ صاحب نے رائے پتھورا کو اسلام کی دعوت بھی دی اور اسے اسلام کی بزرگیوں سے آگاہ کیا۔ آپ نے اسے سمجھایا کہ بت پرستی کا انجام بُرا ہے اور پشیمانی کا موجب ہوگا، مگر اس نے آپ کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دی اور اب اعلانیہ آپ کی اور دوسرے مسلمانوں کی مخالفت کرنے لگا۔

راجہ نے غصے میں جو الفاظ منہ سے نکالے تھے، وہ خواجہ صاحب تک پہنچائے گئے۔ چنانچہ خواجہ صاحب بھی غصے میں آگئے اور کاغذ کے پرزے پر یہ الفاظ لکھ کر راجہ کے پاس بھیج دیے کہ "من ترا زندہ بدست لشکرِ اسلام بسپردم"۔ یعنی (تو نکالے نہ نکالے) میں نے تجھے زندہ پکڑ کے لشکرِ اسلام کے حوالے کیا۔

سیاسی معرکے یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان سیاسی معرکوں کا بھی ذکر کر دیا جائے جو رائے پتھورا اور مسلمانوں کے درمیان ہو رہے تھے، یعنی ہندوستان پر غوریوں کے حملے۔

محمد غوری کے معرکے

محمد غوری ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا چنانچہ سب سے پہلے اس نے ہندوستان کے سرحدی صوبوں پر قبضہ کیا۔ اُچھ، ملتان اور پشاور آسانی سے فتح کر لیے، مگر انہلواڑہ پر قبضہ نہ کر سکا۔ یہ مرحلے طے کرنے کے بعد اس نے لاہور کا رُخ کیا اور پانچ سال کی کوششوں کے بعد سیالکوٹ اور لاہور فتح کیے اور خسرو ملک کو قید کیا۔
پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد محمد غوری کے مقبوضات کی سرحد ہندو راجاؤں کی سرحدوں سے مل گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طرف لڑائی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

رائے پتھورا اور محمد غوری کی پہلی جنگ!

سب سے پہلے اجمیر اور سانبھر کے چوہان راجاؤں نے محمد غوری کا مقابلہ کیا۔ رائے پتھورا جسے پرتھوی راج بھی کہتے ہیں، ان کا سردار تھا اور فخر راجپوت کہلاتا تھا۔ ہر طبقے اور ہر ذات کے ہندو اب تک فخر سے اس کا نام لیتے ہیں اور گھر گھر اس کی بہادری کے گیت گائے جاتے ہیں۔
مسلمانوں کو ہندوستان میں اب تک جتنے حریفوں سے واسطہ پڑا تھا، رائے پتھورا ان میں سب سے زیادہ دلیر، طاقتور اور قابل تھا۔ محمد غوری نے سرہند کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اسی دن سے مسلمانوں اور راجپوتوں میں لڑائی ٹھن گئی تھی۔ ۵۸۷ھ (۱۱۹۱ء) میں جب کہ خواجہ اجمیریؒ اجمیر میں مقیم تھے۔ دونوں فوجیں ترائن کے میدان میں صف آرا ہوئیں۔ راجپوتوں نے اسلامی فوج کے دونوں پہلوؤں پر نہایت شدید حملہ کیا اور ان کی صفوں کو درہم برہم کر دیا۔ مسلمانوں کو زبردست شکست ہوئی۔ محمد غوری گرفتار ہونے سے بال بال بچا۔ راجپوتوں نے شاندار فتح پائی۔
یہ لڑائی اور رائے پتھورا کو یہ کامیابی اس وقت حاصل ہوئی تھی جب حضرت خواجہ قدس سرہ العزیز سے نہیں بگڑی تھی، غالباً اسی فتح کے غرور اور اسی مقصدوری کے نشے نے اُسے اس قدر بے پروا کر دیا کہ خواجہ صاحب کی خاموشی اور امن و سکون کی زندگی کی قدر نہ کی اور درپے آزار ہو گیا۔
بہر حال اس شکست کے بعد محمد غوری واپس چلا گیا، مگر دل میں انتقام کی آگ سلگ رہی تھی۔ قسم کھائی کہ جب تک بدلہ نہ لے گا آرام سے نہ بیٹھے گا۔ چنانچہ تمام عیش و آرام ترک کر دیا۔ اور دوبارہ ہندوستان پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس اثنا میں رائے پتھورا اور خواجہ اجمیریؒ کے درمیان رنجش بڑھتی چلی جا رہی تھی، یہاں تک کہ حالات نے پھر پلٹا کھایا۔

رائے پتھورا اور محمد غوری کی دوسری جنگ!

آتشِ انتقام بجھانے کے لیے محمد غوری نے پورے اہتمام کے ساتھ دوبارہ ہندوستان پر حملہ کر دیا اور لاہور سے آگے بڑھ آیا۔ بہ الفاظِ دیگر رائے پتھورا نے مقابلے کا سامان پہلے ہی کر رکھا تھا اور قریب قریب ہندوستان کے تمام راجاؤں کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کر لیا تھا۔ فرشتہ معتبر روایات سے بیان کرتا ہے کہ رائے پتھورا کے لشکر کی تعداد تین لاکھ سواروں سے زیادہ تھی جس میں راجپوت بھی تھے اور افغانی لوگ بھی۔ اس کے ہاتھی بھی تین ہزار سے زیادہ تھے اور تقریباً ڈیڑھ سو راجہ اس کے وطنی جھنڈے کے نیچے تھے۔ محمد غوری کو اب بھی اپنی طرف کمی نظر آتی تھی، مگر نہایت ہی ہوشیاری، حکمت عملی اور مستعدی سے لڑا۔

ہندو راجاؤں کی تباہی

غرض ۵۸۸ھ میں تراوڑی کے میدان میں مقابلہ ہوا اور بڑی سخت لڑائی ہوئی جس نے ایک ہی دن میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ غوریوں کے حق میں کر دیا۔ کھانڈے راؤ راجہ دہلی اور بہت سے اور راجہ بھی میدان میں مارے گئے۔ رائے پتھورا نے بھاگ کر جان بچائی، مگر دریائے گنگا سے آگے نہیں بڑھنے پایا تھا کہ کسی نے گرفتار کر کے شہاب الدین کے پاس پہنچا دیا، اور شہاب الدین نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر کے بلندی ہند کی ہندو قوت کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دیا۔ غرض یوں خواجہ کی پیش گوئی پوری ہوئی۔[1]

ہند میں اسلامی حکومت کا قیام!

فتح کے بعد سلطان شہاب الدین اجمیر آیا اور رائے پتھورا کے بیٹے کو اپنا مطیع و باجگذار بنا کے باپ کی گدی پر بٹھا دیا اور قطب الدین ایبک کو جو آئندہ زمانہ میں شہنشاہ ہند ہونے والا تھا اپنا نائب اور دہلی ہی نہیں ساری قلمرو ہند کا والی مقرر کر کے اپنے وطن کو واپس گیا۔

اجمیر کا اسلامی دَور

قطب الدین ایبک نے اپنی طرف سے سید السادات سیّد حسن مشہدی کو جو خدنگ سوار کے لقب سے مشہور تھے، شہر اجمیر کا داروغہ مقرر کیا اور جب رائے پتھورا کا بیٹا باپ کی گدی پر بٹھایا گیا تو داروغگی کے سوا اس کا اور کوئی مطلب نہیں ہو سکتا کہ وہ شہنشاہی دولت کی طرف سے ریاست اجمیر کا رزیڈنٹ تھا۔ سید حسن مشہدی کی نسبت بتایا گیا ہے کہ مذہب شیعہ اثنا عشری کے پابند تھے۔ بڑے ہی نیک نفس اور پرہیزگار تھے اور اولیاء اللہ کے زمرے میں شامل تھے۔ ان سے حضرت خواجہ سے صحبت بڑھی اور وہ آپ کے نہایت ہی گرویدہ ہو گئے اور تبلیغ اسلام اور ہدایت خلق اللہ میں بھی ان کی بدولت آپ کو بڑی مدد ملی۔

خواجہ اجمیریؒ کا آخری دَور

اب آپ کا اس قدر اثر تھا کہ جو لوگ آپ کے ہاتھ پر ایمان نہیں لائے وہ بھی آپ کی قدر و منزلت کرتے تھے اور آپ کے ربانی مشن کی تقویت کے لیے روپیہ پیسہ اور تحف و ہدایہ کے ذریعہ سے مدد کیا کرتے تھے۔

---

[1] کہا جاتا ہے کہ جب دن خواجہ اجمیری نے غصہ میں آکر رائے پتھورا کو لکھ بھیجا تھا کہ "میں نے تجھے زندہ پکڑ کے لشکر اسلام کے حوالے کر دیا" اسی رات خواجہ صاحب نے خواب میں شہاب الدین کو ہندوستان پر فوراً حملہ کرنے کا حکم دیا تھا، ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا تھا کہ اس دفعہ خدا تمھیں فتح دے گا۔

بعض بیان کرتے ہیں کہ سلطان نے خواب میں دیکھا کہ ایک نورانی صورت بزرگ تخت پر جلوہ افروز ہے۔ خدام دست بستہ کھڑے ہیں، ایک خادم نے سلطان کا ہاتھ پکڑ کر لشکر اسلام کے حوالے کیا اور فرمایا تجھے ہندوستان کی سلطنت بخشی۔

سلطان نے صبح کے وقت یہ خواب اپنے مصاحبوں سے بیان کیا۔ معبروں نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ ہندوستان عنقریب آپ کے ہاتھوں فتح ہوگا۔ اگرچہ یہ ایک نیک تعبیر تھی مگر سلطان دوبارہ حملہ کرتے ہوئے قدرے متامل تھا اس لیے کہ اُسے حال ہی میں رائے پتھورا سے شکست ہوئی تھی اور اس نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی تھی۔ تاہم غور و خوض کے بعد یہی طے پایا کہ دوبارہ قسمت آزمائی کی جائے۔ چنانچہ اسی خواب کے تحت سلطان نے ہندوستان پر دوبارہ لشکر کشی کی اور اسی لیے مورخین سلطان کے اس حملے کو خواجہ اجمیری کی پیشگوئی سے تعبیر کرتے ہیں۔

آپ کے مرید اور خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے آپ کی اجازت سے دہلی کی سکونت اختیار کر لی تھی اور آپ ہی کے انوارِ ہدایت کی ایک شمع ان کی برکت سے خاص دہلی میں روشن کی تھی، جو اب مسلمان تاجدارانِ ہند کا مرکزِ سلطنت اور منشا و ماویٰ قرار پا گیا تھا۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے مرشد شیخ عثمان ہارونی قدس سرہ العزیز بھی سلطان التمش کے دور میں وارد دہلی ہوئے تھے اور شہنشاہ التمش ان کا مرید ہوا تھا، جس نے ان کی نہایت ہی تعظیم و تکریم کی۔ خواجہ صاحب بھی اپنے خلیفہ قطب الدین صاحب قدس سرہٗ سے ملنے کے لیے دو مرتبہ شہنشاہ التمش کے زمانے میں دہلی تشریف لے گئے۔ لیکن اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہاں آپ کو اپنے مرشد کی قدمبوسی بھی حاصل ہوئی یا نہیں۔ اگر اس زمانے میں تشریف رکھتے ہوں گے تو قطعاً ملاقات ہوئی ہوگی مگر ممکن ہے کہ آپ کے دونوں سفرِ دہلی حضرت پیر و مرشد کے ورود سے پہلے ہوں۔

شمس الدین التمش قطب الدین ایبک کا زر خرید غلام اور داماد تھا جسے اس نے اپنی زندگی ہی میں اس درجے پر پہنچا دیا تھا کہ ہندوستان کا تاجِ شاہی اس کے سر پر رکھا گیا۔

وفات | التمش ۶۰۷ھ میں تخت پر بیٹھا تھا اور چھبیس برس حکومت کر کے ۶۳۳ھ میں جادہ پیمائے آخرت ہوا اور یہ امر شاید کسی قدر تعجب سے دیکھا جائے کہ اسی سال ۶۳۳ھ میں حضرت خواجہ خواجگان قدس سرہ العزیز نے بھی دنیا کو رخصت فرمایا۔ اجمیر شریف میں آپ کا مزارِ اقدس مرجع خلائق ہے۔

شادی اور اولاد | خواجہ صاحب کی تمام عمر نفس کے خلاف جہاد اور اسلام کی اشاعت میں گزری۔ اس دوران میں شادی کے متعلق سوچنے کا وقت ہی نہ ملا۔ چنانچہ عمر مبارک نوّے سال کی ہو چکی تھی۔ اب اس سنتِ نبوی کی تکمیل کرنا چاہتے تھے، چنانچہ آپ نے شادی کر لی۔

کتب تواریخ سے آپ کی دو بیویوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک کا نام بی بی امۃ اللہ اور دوسری کا نام بی بی عصمت ہے اخبار الاخیار کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پہلے بی بی امۃ اللہ سے نکاح کیا۔ اخبار الصالحین حصہ اوّل میں بھی ایسا ہی مذکور ہے۔ مگر "انوارِ خواجہ" نام کتاب میں بتایا گیا ہے کہ آپ نے پہلے بی بی عصمت سے نکاح کیا۔

آپ کی اولاد کے بارے میں اختلاف ہے بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ آپ کے کوئی اولاد نہ تھی، مگر یہ غلط ہے۔ بیشتر کتب تواریخ سے آپ کی اولاد کا ہونا ثابت ہے۔

آپ کے تین لڑکے تھے جن کے نام یہ ہیں:

۱ - ابو سعید خواجہ فخر الدین

۲ - ابوالخیر خواجہ ضیاء الدین

۳- شیخ حسام الدین

خواجہ فخرالدینؒ ایک معرکہ میں شہید ہوئے۔ ان کا مزار مبارک ریاست کشن گڈھ کے قصبہ سروار میں ہے جو اجمیر سے سولہ کوس کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ بڑی پُرفضا جگہ ہے۔ مزار ایک تالاب کے قریب واقع ہے، جہاں ہر سال یکم سے ۵ شعبان المعظم تک آپ کا سالانہ عرس منایا جاتا ہے۔

آپ بڑے باعظمت بزرگ تھے۔ خواجہ صاحب کے بعد تیس سال تک زندہ رہے۔ خواجہ اجمیریؒ کی نسل انھیں سے چلی۔ سید وجیہ الدین مشہدی کے بھتیجے سید حسن مشہدی نے آپ کو تبلیغ دین کے سلسلہ میں بہت مدد دی۔

شیخ حسام الدینؒ صاحب کرامت بزرگ تھے، مجاہدہ و ریاضت میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ سلطان المشائخ محبوب الٰہیؒ سے بھی صحبت رہی تھی۔ آپ کا مزار مبارک قصبہ سانبھر میں واقع ہے، جہاں ہر سال شعبان میں ان کا عرس منایا جاتا ہے۔ آپ حضرت خواجہؒ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔

بی بی حافظ جمال | حضرت خواجہ کی ایک صاحبزادی تھیں جن کا نام بی بی حافظ جمال تھا۔ شیخ رضیؒ[1] آپ کے شوہر کا نام تھا۔ بی بی حافظ جمال وہی ہیں جن کی تربیت خود خواجہ صاحب نے فرمائی اور انھیں بندگی کے درجہ تک پہنچایا۔ آپ نے حضرت خواجہ صاحب کے لائحہ عمل کے مطابق ہندو عورتوں میں تبلیغ اسلام کا کام سرانجام دیا۔ بڑی صاحب علم و فضل تھیں۔ آپ کے دو صاحبزادے صغر سنی ہی میں وفات پا گئے۔

آپ کی قبر مبارک مزار خواجہ کے گنبد سے بالکل متصل واقع ہے۔

خلفاء | خواجہ صاحب کے خلیفہ اکبر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ تھے جو نہایت عظمت اور شہرت کے مالک ہیں۔ آپ نے انھیں ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مقرر فرمایا۔ ان کے علاوہ آپ کے چند خلفاء کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

خواجہ برہان الدین
شیخ حمید الدین ناگوری
بی بی حافظ جمال
شیخ وجیہ الدین
سلطان مسعود غازی
شیخ وحید الدین خراسانی

کارنامے | خواجہ صاحب اپنے عہد کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت آپ کا ست

---

[1] شیخ رضی کی قبر ناگور میں تالاب کے منڈیر پر واقع ہے۔

بڑا کارنامہ ہے۔ آپ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے کفرزار ہند میں ایک ایسی سیڑھی قائم کی جس کے ذریعہ نہ صرف عام
نے اسلام قبول کرنے کے بعد منازل عرفان طے کیے، بلکہ کئی قدسی صفت بزرگوں نے بھی اسی سیڑھی کے ذریعہ روحانیت ا
وجدانیت کے مراحل طے کیے۔

جب خواجہ صاحب ہندوستان میں تشریف لائے تو کیفیت یہ تھی کہ کہیں اسلامی شکل نظر نہ آتی تھی پھر یہ حالا
ہوئی کہ آپ کی زندگی ہی میں آپ کی مساعی جمیلہ سے چاروں طرف اسلام کا بول بالا ہونے لگا۔ مسلمان روز بروز بڑھنے لگے
دہلی اور اجمیر جیسے عظیم گہوارہ ہائے کفر میں اذان کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور آپ ہی کی مساعی سے اسلامی حکومت بھی پ
جاہ و جلال کے ساتھ ہندوستان میں قائم ہو گئی۔

خواجہ صاحب نے جو کام انجام دیا وہ معمولی نوعیت کا کام نہیں اور نہ ہی کسی معمولی انسان کا کام ہے۔ آپ تنہا غیر ملک
میں ایسے لوگوں کے درمیان آئے ہیں جو آپ کے دین کے اشد دشمن ہیں۔ پھر یہ کہ اس ملک میں ان کی اپنی حکومت ہے جہ
خواجہ صاحب کا کوئی حامی اور مددگار بھی یہاں موجود نہیں۔ اس کے باوجود آپ اشاعت اسلام کے لیے ایک وسیع اور عظ
نظام قائم کرتے ہیں، جس کی سخت مخالفت کی جاتی ہے، پھر یہ کہ راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ہیں، یہاں تک کہ جان کا
خطرہ ہے، مگر آپ کے قدم نہیں ڈگمگاتے اور اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے پورے طور پر سرگرم عمل ہو جاتے
ان تمام امور سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خواجہ صاحب کس دل گردے کے بزرگ تھے اور عام انسانوں اور ان میں کیا فرق ہو
ہے اور وہ کتنی عظیم شخصیت کے مالک تھے۔

خواجہ صاحب کے پیش نظر کوئی چھوٹا سا علاقہ نہ تھا، بلکہ سارا ہندوستان تھا، لہٰذا آپ نے صرف اجمیر یا دہلی پر ہی
نہ کیا، بلکہ ایک زبردست تبلیغی مہم جاری کی۔ آپ نے صرف مردوں ہی میں نہیں بلکہ عورتوں میں بھی تبلیغ کا اہتمام کیا۔ اپنی صاح
حافظ جمال صاحبہ کو جن کی تربیت آپ نے اپنے ہی ہاتھوں سے کی تھی اور بزرگی کے درجۂ کمال کو پہنچایا تھا۔ عورتوں میں تبلیغ
کا فرض تفویض کیا۔ چنانچہ ان کی زندگی کا نصب العین بھی یہی تھا، وہ جب تک بقید حیات رہیں ہندو عورتوں میں اشاعت اسلام
کا کام کرتی رہیں۔ اور بہت سی عورتوں نے آپ کی تبلیغ اور آپ کے ذاتی اوصاف سے متاثر ہو کر دین حق اختیار کیا۔

پھر حضرت خواجہؒ نے اپنے قابل اور لائق خلفاء کو ہندوستان کے مختلف اطراف میں اسی کام کے لیے مامور فرمایا،
ہندوستان کے دور دراز گوشوں میں پھیل گئے اور ان تاریک گوشوں کو ضیائے اسلام سے منور کیا۔ اجمیر میں آپ نے عظیم الشا
مسجد اور مدرسہ قائم کیا، جہاں بہت سے لوگ دینی علم حاصل کرتے تھے۔ پھر یہ کہ یہیں سے متعدد مقتدر ہستیاں اٹھیں۔
لوگ اولیا بن کر نکلے اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں بیٹھ کر خلق خدا کی رہنمائی میں لگ گئے۔ آج برعظیم ہند و پاکستان میں
بھی مسلمان نظر آتے ہیں وہ اجمیر کے چشتی اور ملتان کے سہروردی خاندان کی برکات ہیں۔ خواجہ نے اپنے خاص خلیفہ حضرت قطب
کو دہلی جیسے مرکزی مقام میں متعین فرمایا۔ ان تمام بزرگان کرام کے پیش نظر صرف تبلیغ دین اور اصلاح مسلمین تھی اور انھوں

اپنے اخلاق، اپنی قوت ایمان اور اپنی دینی و دنیوی صلاحیتوں سے بڑے بڑے کام انجام دیے یہاں تک کہ ظلمت کدۂ ہندوستان میں اس شان کی اسلامی حکومت قائم کی جس کی نظیر نہیں ملتی، پھر ان بزرگانِ کرام کی اپنی شان یہ رہی کہ وقت کے فرمانروا بھی ان کی غلامی پہ فخر کرتے تھے۔

صاحب سیر الاولیا نے خواجہ اجمیریؒ کے اسی عظیم کارنامے کو ان کی سب سے بڑی کرامت قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اس سے بڑھ کر علاوہ جو اور کرامت کیا ہوگی کہ جو لوگ اس بزرگ کے ساتھ وابستہ ہوئے وہ خود دین کے بادشاہ ہوئے کہ انھوں نے بندگانِ خدا کی مدد کی اور انھیں دنیا کے فریب سے نکالا اور دار السرور عقبیٰ کی اعلیٰ منزل میں داخل کیا۔ ان بادشاہانِ دین کی عظمت کا نقارہ قیامت تک بجتا رہے گا اور ان کی محبت کے طفیل خلق اللہ فردوس بریں میں جگہ پائے گی۔"

دوسری کرامت یہ کہ پورا ہندوستان اس حد تک کہ جہاں سے سورج نکلتا ہے کفر و بت پرستی میں مبتلا تھا اور یہاں کے سرکش اور بڑے لوگ خدائی کا دعویٰ کرتے تھے اور خدائے برتر کا شریک گردانتے تھے (ایسی حقیر چیزوں کو جیسے ڈھیلا، درخت، گھوڑا، گائے اور ان کے گوبر تک کو سجدہ کرتے تھے) اور ان کے دل پر تاریکی کے مضبوط قفل پڑے ہوئے تھے آفتاب اہل یقین (حضرت خواجہ خواجگانؒ) کے قدوم میمنت لزوم سے کہ جو حقیقت میں معین الدین اور اسم بامسمیٰ تھے ملک کی تاریکی کفر اسلام کی روشنی سے بدل گئی، جس جگہ مشرکوں کے مشرکانہ نعرے اور دہائیاں تھیں وہاں اللہ اکبر کا نعرہ لگ گیا حضرت خواجہ کے قدوم میمنت لزوم سے جس قدر مسلمان ہوئے اور آیندہ قیامت تک جس قدر مسلمان ہوں گے اس طرح قیامت تک ان کی جو اولاد مسلمان پیدا ہوگی ان کا اجر و ثواب شیخ الاسلام معین الدین چشتیؒ کی روح پر فتوح کو پہنچے گا۔

خواجہ صاحب کی تصانیف

یہ تو ظاہر ہی ہے کہ خواجہ اجمیریؒ کے پیشِ نظر زندگی کا بنیادی مقصد اسلام کی نشر و اشاعت اور تبلیغ کرنا تھا، چنانچہ اس معاملہ میں دوسری تمام مساعی کے علاوہ ایک ذریعہ تصنیف و تالیف ہے یعنی رسالے اور کتابوں کے ذریعہ تبلیغ کا حق ادا کرنا۔ چنانچہ ہو سکتا ہے اس ضرورت کے لیے خواجہ صاحب نے کتابیں بھی لکھی ہوں۔ ان کی ایک کتاب موسومہ "انیس الارواح" پر تو سب مؤرخین کا اتفاق ہے کہ یہ خواجہ صاحب کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی چند کتابیں آپ سے منسوب ہیں مگر تاریخ سے ان کے متعلق صحیح سند نہیں ملتی کہ خواجہ صاحب کی تصانیف ہیں۔

انیس الارواح یہ کتاب خواجہ اجمیریؒ کے پیر و مرشد خواجہ عثمان ہارونیؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، جسے خواجہ نے مرتب فرمایا اور سب مؤرخ اسے خواجہ صاحب کی تصنیف مانتے ہیں۔ یہ فارسی میں ہے۔

گنج الاسرار اس کتاب کا اردو ترجمہ مختلف ناموں سے چھپا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب خواجہ عثمان ہارونیؒ تشریف لائے تو آپ نے خواجہ اجمیریؒ کو ہدایت فرمائی کہ سلطان شمس الدین التمش کی تعلیم و تلقین کے لیے ایک رسالہ

لیں جو سفر و حضر میں اس کے لیے رہنمائی کا کام دے۔ چنانچہ خواجہؒ نے ستر سے زیادہ کتابیں فراہم کرکے علم سلوک پر یہ کتاب مرتب فرمائی۔ اس کتاب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خواجہ اجمیریؒ کو اجمیر میں قیام فرمانے کی ہدایت ان کے پیر و مرشد خواجہ عثمان ہارونیؒ نے ہی دی تھی۔ خواجہ عثمانؒ کے سفرِ ہند کا کہیں مطلقاً ذکر نہیں آتا اور دہلی کے قیام وغیرہ کا بھی کوئی سراغ نہیں ملتا۔[1]

حدیث المعارف | اس نام سے ایک کتاب بھی خواجہ صاحب کی تصنیف بیان کی جاتی ہے، مگر یہ کتاب آج کل دستیاب نہیں۔ لہذا اس کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

دیوانِ معین یا دیوانِ خواجہ | اس نام سے فارسی اشعار کا ایک دیوان بھی خواجہ معین الدین چشتیؒ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس میں تمام غزلیں ہیں۔ غزلوں کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔ غزلیں صوفیانہ رنگ میں ہیں۔ مقطع میں معینؔ اور معینیؔ تخلص آتا ہے۔ غزلوں کی کل تعداد ۱۲۱ ہے۔ تصوف کے بڑے عالی پایہ مضامین باندھے گئے ہیں۔ کہیں کہیں مستی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ اکثریت کا یہی خیال ہے کہ یہ دیوان خواجہ اجمیریؒ ہی کا ہے، مگر بعض نقاد جن میں حافظ محمود شیرانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اسے خواجہ اجمیریؒ کا دیوان قرار نہیں دیتے، بلکہ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ یہ دیوان کسی اور "معین" کا ہے، جسے لوگوں نے غلطی سے خواجہ صاحب سے منسوب کر دیا۔

---

[1] انوارِ فریدیہ ' مصنفہ سید ظفر حسین آزاد ص ۵۲

حضرت شہاب الدّین سہروردیؒ

ولادت ——— سہرورد ۵۴۹ھ

حضرت شہاب الدین ابوالفتوح السہروردی، المعروف بہ "شیخ مقتول" سہرورد میں پیدا ہوئے۔ یہ عراق عجم میں زنجان کا ایک مقام ہے۔ آپ کی ولادت ۵۴۹ھ میں ہوئی۔ امام مجد الدین الجیلی کے سامنے آپ نے زانوے شاگردی تہ کیا اور ان سے حکمت اور اصولِ فقہ کا درس حاصل کیا۔ حلب کے متعدد فقہا سے آپ کے زبردست مناظرے بھی ہوئے۔ یہ مناظرے مختلف نزاعی مسائل پر ہوئے۔ ان مناظروں کا نتیجہ یہ نکلا کہ فقہا آپ کے مخالف اور دشمن ہو گئے۔ آپ پر طنز و طعن کرنے لگے۔ الحاد و زندقہ کا الزام آپ پر عائد کیا جانے لگا۔

سلطان صلاح الدین | یہاں تک کہ آپ کی شکایت سلطان صلاح الدین ایوبی کے گوش گزار کی گئی۔ اس نے اپنے بیٹے الظاہر، سلطان حلب کو لکھا کہ حضرت سہروردی کو قتل کر دیا جائے۔ اس نے باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ کے قتل کا حکم خود سلطان الظاہر نے دیا تھا۔ ۵۸۷ھ میں آپ قتل کیے گئے۔

ایک دوسری روایت یہ ہے کہ سہروردی کو جب معلوم ہوا کہ فقہائے حلب ان کے قتل کا فتوی دے چکے ہیں، تو آپ نے الظاہر سے استدعا کی کہ ایک مکان میں آپ کو قید کر دیا جائے۔

وہاں آپ کھانے پینے سے بالکل ہاتھ اٹھا لیں، یہاں تک کہ وفات پا جائیں۔ چنانچہ الظاہر نے ایسا ہی کیا۔ لیکن ان دونوں واقعات میں صحیح اور قرین صواب واقعہ پہلا ہے۔ یعنی صلاح الدین تک آپ کی شکایت پہنچی، حلب کے فقہا نے آپ کے خلاف قتل کا فتوی دیا اور صلاح الدین کے بیٹے الظاہر، سلطانِ حلب کے حکم سے آپ قتل کیے گئے۔

سہروردی کو حکمتِ قدیمہ سے بہت شغف تھا۔ چنانچہ وہ اس کے حقائق تک پہنچے اور اس کے دقائق انھوں نے حاصل کیے۔ فارس اور یونان کے حکما کے اقوال کا خاص طور پر مطالعہ کیا۔ خود بھی اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھیں اور رسائل تحریر کیے۔ ان تصانیف میں حقائق عقلیہ پر آپ نے روشنی ڈالی۔ تعلیم صوفیا سے آپ نے بحث کی اور انھیں ایک خاص رنگ میں پیش کیا۔ اذواق روحیہ کی کیفیتیں بیان کیں۔

رمز و اشارہ | اپنی ان کتابوں میں سہروردی نے شرح و وضاحت کے بجائے رمز و اشارہ پر اکتفا کیا۔ آپ نے ایسی وجدانی باتیں لکھیں جن میں آپ کی تعلیم کے معانی پوشیدہ تھے۔ چنانچہ معاصرین میں سے بعض نے آپ کے عقیدہ اور ایمان پر جرح کی اور شک و شبہ کا اظہار کیا۔ چنانچہ آپ نے فقہائے حلب کو اپنے قتل کی خود ترغیب دی۔

ایک مشہور روایت ہے کہ آپ حلب میں جب علم میں مشغول تھے، تو آپ کے بارے میں لوگوں کی دو رائیں پائی جاتی تھیں، ایک گروہ آپ سے بدظنی رکھتا تھا، دوسرا گروہ آپ سے عقیدت رکھتا تھا اور آپ کو اہل کرامات میں سے سمجھتا تھا۔

سہروردی کی شخصیت | اسلام کی حیاتِ روحیہ کی تاریخ میں سہروردی کی شخصیت بہت زیادہ اہمیت اور عظمت رکھتی ہے، اس لیے نہیں کہ آپ بہت بڑے صوفی تھے اور صوفیائے اولین کے نقشِ قدم پر چلتے تھے، اس لیے بھی نہیں کہ آپ بڑے فلسفی تھے اور معاملات و مسائل پر خالص فلسفیانہ نقطۂ نظر سے غور و فکر کے عادی تھے، بلکہ اس لیے کہ آپ کا مذہب و مسلک حکمتِ اشراق پر مبنی تھا اور یہ وہ مذہب ہے، جو تصوف اور فلسفہ کے مابین ایک خلیج کی طرح حائل تھا، چنانچہ خود سہروردی اس سلسلہ میں اپنی کیفیات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سب سے پہلے میں کسی بات پر حجت اور دلیل کو دیکھتا ہوں، اگر میں حجت سے قطع نظر کر لوں، تو پھر کوئی بھی مسلک مجھے شک میں نہیں ڈال سکتا۔[1]

آثار منظومہ و منثورہ | سہروردی کے بہت سے آثار نظم اور نثر کی شکل میں موجود ہیں، جو ان کی ثقافتِ فلسفیہ، ذوقِ مصقول اور حکمتِ مشرقیہ پر دلالت کرتے ہیں۔

ان کے آثار میں:

۱۔ حکمت الاشراق ۲۔ ہیاکل النور

۳۔ غربت الغربیہ، کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

حکمۃ الاشراق | جن کتابوں نے مسلمانوں کی تاریخ فکر و روح پر گہرا اثر ڈالا ہے، ان میں "حکمۃ الاشراق" کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ کتاب دو قسموں میں منقسم ہے۔

پہلی قسم میں منطق اور استدلال سے مسائل و معاملات پر بحث و گفتگو کی گئی ہے۔

دوسری قسم میں انوارِ الٰہی اور تجلیاتِ ربانی کی روشنی میں معاملات و مسائل کا ذکر ہے۔

قسم ثانی پانچ مقالات پر مشتمل ہے:

(۱) مقالہ اول:

اس میں نور اور حقیقت پر بحث کی گئی ہے۔

(۲) مقالہ دوم:

اس میں ترتیب وجود پر گفتگو کی گئی ہے۔

---

[1] حکمۃ الاشراق۔

(۳) مقالہ سوم :
اس میں نور الانوار اور انوار قاہرہ کے موضوع پر گفتگو کی گئی ہے ۔

(۴) مقالہ چہارم :
تقسیم برازخ اور ان کی ہیئت و ترکیب پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

(۵) مقالہ پنجم :
نبوات ، منامات اور معاد ۔ یعنی اس مقالہ میں مسئلہ نبوت ، مسئلہ خواب اور مسئلہ حشر پر گفتگو کی گئی ہے ۔

ان مقالات خمسہ میں سہروردی نے رموز و اشارات کی زبان میں گفتگو کی ہے ۔
چنانچہ جب وہ نور و ظلمت کا ذکر کرتے ہیں تو نور سے ان کی مراد ہوتی ہے روح اور ظلمت سے مراد ہوتا ہے مادّہ ۔ اسی طرح جب انوار کا لفظ آتا ہے تو عقل مراد ہوتی ہے ۔ عقول الافلاک سے وہ انوار قاہرہ مراد لیتے ہیں ۔ انوار مجردہ سے ان کا مطلب ہوتا ہے نفوس انسانیہ ۔ انوار الانوار وہ خدا کو کہتے ہیں ۔ جوہر سے مراد جسم ۔ غاسق سے مراد تاریکی ۔ عالم برزخ ان کی اصطلاح میں عالم اجسام ہے ۔

سہروردی کا مذہب

اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ سہروردی کا مذہب و مسلک کیا تھا ؟ اور حکمت اشراق سے وہ کیا مراد لیتے تھے ۔
ذات الٰہی کے صفات و افعال کی لذّت اور معرفت اور حکمت علم کلام ، فلسفہ اور تصوّف میں مشترک ہے اور یہ لذّت دو طریقوں سے حاصل ہوتی ہے :
پہلا طریقہ ، فلسفہ اور استدلال عقلی کا ہے ۔
دوسرا طریقہ ، ذوق رُوحی اور وجد صوفی کا ہے ۔
جو لوگ پہلے طریقے پر عامل ہیں ، وہ اسلام کی تعلیمات کو دلیل عقلی سے ثابت کرتے اور مانتے ہیں ، یہی حضرات متکلّمین کہلاتے ہیں ۔
اور جو لوگ صرف نظر عقلی کو کافی سمجھتے ہیں ، یہ وہ لوگ ہیں جو حکمائے مشائین کہلاتے ہیں ۔
لیکن جو لوگ دوسرے طریقے پر عامل ہیں ، وہ اسلام کی تعلیمات کو مانتے ہیں ، اس کے نصوص اور احکام کی حسب موقع تاویل کرتے ہیں ۔ یہ وہ لوگ ہیں ، جو صوفیا کہلاتے ہیں ۔
اسی گروہ میں جو لوگ اس راستے سے ذرا ہٹ کر چلتے ہیں ، یعنی ذوق اور وجدان کو مقدّم رکھتے ہیں ، یہ وہ لوگ ہیں جو حکمائے اشراقی کہلاتے ہیں ۔
اس تعریف کی روشنی میں حکمت اشراق ایک روحانی فلسفہ ہے ، اس مذہب کا قوام ذوق اور وجدان ہے ۔ یہی

سہروردی کا مسلک ہے۔

حکما کے مراتب سہروردی کے نزدیک حکما کے چند مراتب ہیں:

(۱) حکیم الٰہی:

یہ لوگ الہیت میں بہت زیادہ غلو کرتے ہیں۔ صوفیا میں ان لوگوں کی مثال ابو یزید بسطامی۔ سہل بن عبداللہ التستری اور حسین بن منصور حلاج وغیرہ اصحاب الہیت ہیں۔

(۲) حکمائے مشائین:

یہ لوگ الہیت میں شغف نہیں رکھتے۔ یہ لوگ ارسطو کے متبعین میں ہیں۔ مثلاً فارابی اور ابن سینا وغیرہ۔

شیرازی کا قول ہے، وہ حکیم الٰہی جو الہیت سے بحث کرتا ہو اور اس مسئلہ میں اپنا ایک خاص مسلک رکھتا ہو، سہروردی خود ہیں اس میدان میں ان سے بڑا کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔

حکیم الٰہی کی دو قسمیں ہیں:

ایک تو وہ جو بحث و گفتگو میں اس مسئلہ کو غلو کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے مسلک میں حد درجہ غالی ہوتا ہے۔

اور دوسرا وہ جو بحث و گفتگو میں اعتدال و توسّط کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔

جو حکیم الٰہی تالہ اور بحث میں غلو رکھتا ہے، وہی ان تمام حکما میں کمال و شرف کی بنیاد پر ممتاز ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کا علم ذوقی اور عقلی ہوتا ہے۔ اس حکیم میں صفات الٰہیہ کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ چنانچہ سہروردی اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

"ایسا حکیم امام متالہ ہے، وہ ظاہر بھی ہوتا ہے اور مخفی بھی ہوتا ہے۔ اس کو عرف عام میں قطب کہتے ہیں، اور یہی مملکت روحیہ کا صحیح معنی میں تاجدار ہوتا ہے۔"[۱]

طلاب حکمت حکما کی طرح طلاب حکمت کی بھی متعدد قسمیں ہیں، اور ان کے بھی کئی مراتب ہیں:

ایک طالب تو وہ ہوتا ہے جو الہیت اور بحث و گفتگو سے شغف رکھتا ہے، دوسرا وہ جو صرف الہیت سے سروکار رکھتا ہے اور تیسرا وہ جسے صرف بحث سے شغف ہوتا ہے۔ سہروردی کے نزدیک سب سے بہتر طالب وہ ہے جو الہیت اور بحث و گفتگو دونوں سے شغف اور انہماک رکھتا ہو۔ جس طرح حکما میں سب سے بڑا حکیم الٰہی وہ ہے جو تالہ اور بحث میں غیر معمولی شغف رکھتا ہو۔

سہروردی کہتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب حکمۃ الاشراق صرف اسی طالب کے لیے لکھی ہے جو تالہ اور بحث سے شغف اور انہماک رکھتا ہو، لیکن وہ طالب جو بحث سے سروکار رکھتا ہو اور الہیت سے شغف نہ رکھتا ہو، یا وہ جو الہیت سے سروکار رکھتا ہو، مگر بحث سے بھاگتا ہو، اسے اس کتاب سے کچھ بھی نہیں حاصل ہو سکتا۔

---

[۱] حکمۃ الاشراق۔

فلسفۂ خالصہ اور حکمت اشراق

ان الفاظ میں گویا سہروردی نے وہ فرق نمایاں کر دیا، جو فلسفۂ خالصہ اور حکمت اشراق کے مابین موجود ہے۔ گویا سہروردی کے نزدیک اُن کی کتاب حکمت اشراق سے مستفید ہونے کی کم سے کم شرط یہ ہے کہ تجلی الٰہی کا وروداس پہ ہو چکا ہو، لیکن جو اس سے محروم ہو اور صرف بحث وگفتگو میں سر کھپانا چاہتا ہو، اُسے چاہیے کہ وہ طریقہ مشائین سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

دوسرے الفاظ میں اس عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ فلسفۂ خالصہ کی بنیاد صرف بحث ونظر پر ہے۔ اور اس کے بالکل برعکس حکمت اشراقیہ کی بنیاد سوانح نوریہ پہ ہے، جس کی بنیادی عناصر میں ذوق اور مشاہدۂ روحانیات، خلوت اور ستر منازل شامل ہیں اس مطلب کو اگر اور زیادہ واضح الفاظ میں ادا کرنا چاہیں تو یوں کہیں گے کہ حکمت اشراق نہ تو خالص تصوف ہے، نہ صرف فلسفہ، بلکہ ان دونوں کی ایک درمیانی چیز ہے۔

حضرت شمس الدین محمد تبریزی سبزواریؒ

ولادت ————— سبزوار (عراق) ۵۶۰ھ

وفات ————— ملتان ۶۷۵ھ

شمس الفقرا حضرت شمس الدین محمد تبریزیؒ اپنے وقت کے کاملین میں سے تھے۔ اصل نام محمد تھا۔ عراق کے ایک شہر سبزوار کے رہنے والے تھے۔ جمعہ ۱۵۔ شعبان ۵۶۰ھ میں تولد ہوئے۔ اس وقت عراق پر محمد یار مرزا کی حکومت تھی۔ حضرت شمس الدینؒ کے والد بزرگوار کا نام سید صلاح الدین محمد نور بخش تھا۔ انھوں نے ۶۷۴ھ میں وفات پائی۔

حضرت شمس الدین تبریزیؒ کا سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادقؑ سے اس طرح ملتا ہے:

محمد تبریزی ابن سید صلاح الدین محمد نور بخش ابن سید علی ملقب سلام الدین ابن سید عبدالمومن بادشاہ افریقہ ابن سید علی خالد الدین ابن سید محمد محب الدین ابن سید محمود سبزواری ابن سید محمد ابن ہاشم علی ابن سید احمد ہادی ابن سید منتظر باللہ ابن سید عبدالمجید ابن سید غالب الدین ابن سید محمد منصور ابن اسماعیل ثانی ابن سید محمد عریضی ابن سید اسماعیل اعرج اکبر ابن حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام۔[1]

حضرت شمس الدین محمد تبریزیؒ کے متعلق نام کی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ شمس الدین محمد تبریزیؒ کا مزار تبریز میں ہے اور ملتان میں جن شمس الدین کا مزار ہے وہ کوئی اور بزرگ ہیں۔ اسی طرح ان کے حالات کے بارے میں بھی بعض اختلافی روایات ملتی ہیں۔ یہاں ہم آسمان سرحدی کی کتاب "عرس اور میلے" سے حضرت شمس الدین تبریزیؒ کے حالات پیش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں: "شاہ شمس الدین کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ چونکہ آپ کی ولادت سبزوار میں ہوئی اس لیے آپ کو 'سبزواری' بھی کہتے ہیں۔ جب اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ کشمیر گئے تو وہاں میر شمس الدین عراقی کہلائے۔ چونکہ آپ اکثر سفر ہی میں رہتے تھے اس لیے جب قونیہ (ترکستان) گئے تو وہاں کے لوگ انھیں "شمس پرندہ" کہہ کر بلانے لگے۔ شام اور مصر میں آپ کو "شمس مغربی" کہتے تھے۔ جب تبریز میں زیادہ مدت رہے تو "شمس تبریزی" کہلائے۔" "شاہ قاسم انوار" بھی آپ کا خطاب تھا۔

ان مختلف ناموں کے باعث بعض مؤرخوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ شاید یہ الگ الگ ہستیاں ہیں۔ چونکہ بعض کہتے ہیں کہ شمس الدین تبریزیؒ جن کا مزار ملتان میں ہے یہ وہ شمس الدین نہیں جن کی مولانا رومؒ سے ملاقات تھی بلکہ یہ کوئی اور بزرگ ہیں۔ شمس الدین تبریزیؒ کا مزار تبریز میں ہے۔ خزینۃ الاصفیاء کے مصنف کا بھی یہی خیال ہے۔ بعض دوسرے حضرات بھی یہی لکھتے ہیں، مگر حقیقت ان کے بیان کا ساتھ نہیں دیتی۔ ہم یہاں اصل کیفیت بیان کرنے سے پہلے ضروری سمجھتے ہیں کہ ان مؤرخین کے اختلافی اور متضاد بیانات

---

[1] کنز الانساب صفحہ

کا خلاصہ بھی نقل کر دیں تاکہ ان کی روشنی میں قارئین ہمارے بیان کی صحت کا اندازہ کرنے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہ کریں۔

اختلافی بیانات ۱۔ نواب معشوق جنگ بہادر لکھتے ہیں کہ شیخ شمس الدین تبریزیؒ کے والد کا نام علی بن ملک داؤد تبریزی تھا۔ اور تبریز میں کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ اس کے برعکس مولوی غلام سرور لاہوری[1] آپ کے والد بزرگوار کا نام محمد بن ملک داؤد بتاتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں آپ شیخ ابوبکر سلہ باف تبریزیؒ کے مرید تھے۔ بعض آپ کو بابا کمال خجندیؒ کا اور بعض رکن الدین سنجاسیؒ کا مرید بتاتے ہیں۔ صاحب نفحات الانس لکھتے ہیں کہ شیخ شمس الدین تبریزیؒ نے شیخ سلہ باف،[2] بابا کمال خجندیؒ اور شیخ رکن الدین سنجاسیؒ تینوں سے استفادہ کیا۔

۲ مجالس المومنین جو حضرت شیخ کے حالات پر مستند کتاب سمجھی جاتی ہے اس میں لکھا ہے کہ جب شیخ شمس تبریزیؒ مولانا روم کے پاس قونیہ گئے تو مولانا کے آس پاس تلامذہ بیٹھے تھے اور سامنے کتابوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ شمس تبریزیؒ سلام کر کے بیٹھ گئے، پھر کتابوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا یہ کیا ہے؟ مولانا نے کہا یہ وہ چیز ہے جسے تم نہیں جانتے۔ مولانا کا یہ کہنا تھا کہ کتابوں کو آگ لگ گئی۔ مولانا گھبرا کر بول اٹھے یہ کیا ہے؟ شمس تبریزیؒ بولے یہ وہ چیز ہے جسے تم نہیں جانتے۔ یہ کہا اور اٹھ کر چلے گئے۔ مولانا [illegible] [illegible] گھر آ [illegible] چکے تھے۔ مولانا [illegible] کا کو [illegible] اگر شمس تبریزیؒ [illegible]

اس کے برعکس خزینۃ الاصفیا جلد دوم صفحہ ۲۶۶ پر مولوی غلام سرور نے کتابوں کا جلنا نہیں بلکہ پانی میں ڈوب جانا بتایا ہے یعنی وہ لکھتے ہیں کہ شمس تبریزی نے کتابوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا مولانا یہ کیا ہے؟ وہ بولنے سے قیل و قال ہے۔ شمس تبریزی نے کتابیں اٹھا کر پاس ایک حوض میں ڈال دیں۔ مولانا متحیر ہو کر بولے یہ کیا۔ آپ نے کتابیں حوض میں سے نکال کر پھر مولانا کے سامنے رکھ دیں۔ مولانا یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ کسی کتاب کو پانی نے چھوا تک نہ تھا۔ حیران ہو کر پوچھا اے شیخ یہ کیا۔ شمس تبریزیؒ نے فرمایا یہ ذوق و حال ہے جس کی تمہیں خبر نہیں۔

۳۔ شمس تبریزیؒ کی وفات کے متعلق بھی مورخین کے بیانات میں اختلاف ہے۔ اخبار الصالحین کے مصنف کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ آپ مولانا روم کے پاس خلوت میں بیٹھے تھے کہ کسی نے باہر سے اشارہ کر کے حضرت کو بلایا۔ آپ نے مولانا سے فرمایا کہ مجھے قتل کرنے کے لیے بلاتے ہیں پھر اٹھ کر باہر چلے گئے، جہاں سات افراد کھڑے تھے۔ انھوں نے آپ پر حملہ کر کے قتل کر دیا۔ قتل ہوتے وقت آپ نے اس زور سے نعرہ لگایا کہ ساتوں آدمی بے ہوش ہو گئے۔ ان میں مولانا رومؒ کا بیٹا علاؤالدین محمد بھی تھا۔ قتل کی جگہ آپ کی لاش موجود نہ تھی، صرف خون کے چند قطرے دکھائی دیے۔ علاؤالدین ایک عجیب بیماری میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ مولانا روم نے اس کے جنازے میں شرکت نہ کی۔

قتل کا یہ واقعہ ۶۴۵ھ میں ہوا۔

---

[1] اخبار الصالحین صفحہ ۲۹۱ [2] خزینۃ الاصفیاء جلد دوم صفحہ ۲۶۸

آپ کی لاش کے متعلق بھی دو روایتیں ہیں، ایک یہ کہ قاتلوں نے جسم کے ٹکڑے کر کے کنوئیں میں ڈال دیا۔ کچھ عرصہ بعد مولانا روم کے فرزند سلطان ولد کو خواب میں ہدایت ملی کہ میرے جسم کے ٹکڑوں کو فلاں کنوئیں سے نکال کر مدرسہ کے بانی امیر بدرالدین کے پہلو میں دفن کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

بعض کہتے ہیں کہ آپ قتل نہیں ہوئے بلکہ غائب ہو گئے اور پھر آپ کا سُراغ نہ ملا۔

نتیجہ | ان اختلافی مباحث سے قطع نظر سب اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ شیخ شمس الدین تبریزیؒ وہی باکمال بزرگ اور ولی اللہ ہیں جن کی مولانا رومؒ سے صحبت رہی، اور ملتان میں جو شمس تبریزی مدفون ہیں یہ وہی شمسؒ ہیں۔ ان کے علاوہ کسی اور شمس تبریزی کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ مولوی غلام سرور خزینۃ الاصفیا جلد دوم صفحہ ۲۲۲ پر لکھتے ہیں:

> در روضہ شیخ شمس الدین تبریزی کہ در ملتان مشہور و معروف است آن شمس الدین غیر از شمس الدین تبریزی است و شیخ شمس الدین ملتانی از سادات عظام مولوی است کہ روا[ئے] او امجاد ش بمذہب شیعہ دارند و در لاہور وغیرہ بسادات شمسی مشہور و معروف اند۔[۱]

"خزینۃ الاصفیا" میں جن "شمس الدین ملتانی" کا ذکر کیا گیا ہے، [illegible] کسی شخصیت کا تذکرہ تاریخوں میں نہیں اور شمس الدین تبریزیؒ کے وجود کو سب مؤرخین تسلیم کرتے ہیں۔ اوپر کے اقتباس میں خط کشیدہ عبارت انہیں سے متعلق ہے۔

اجداد | آپ کے اجداد میں سے سید محمد عریضی امام جعفر صادق کی موجودگی میں طبرستان سے چلے گئے اور محمد آباد شہر بسایا جو آپ کے نام سے منسوب ہے۔ ان کی اولاد سندھ، خراسان اور قندھار وغیرہ میں پھیلی۔ سید صلاح الدین محمد نور بخش ہی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے، سبزوار میں سکونت تھی، پردۂ تصوف میں ان کا طریقہ اثنا عشری صوفی تھا، داعی الی الحق کہتے اور نائب امام کہلاتے تھے۔[۲]

تعلیم | ہوش سنبھالنے پر شمس تبریزیؒ کو تعلیم و تربیت کے لیے ان کے چچا عبدالہادیؒ کے سپرد کیا گیا جو شاہ مراکو کے پوتے اور متبحر عالم تھے۔ چچا نے بھتیجے کو بڑی محنت سے تعلیم دی۔ تفسیر، فقہ، حدیث اور دوسرے علوم ظاہری سے بھی آراستہ کر دیا۔

سفر | ۵۶۰ھ میں جب سید صلاح الدین محمد نور بخشؒ دعوتِ اسلام کے لیے بدخشاں کی طرف روانہ ہوئے تو شمس سبزواری کو بھی ساتھ لے گئے۔ اس وقت ان کی عمر انیس سال کی تھی۔ بدخشاں میں ہزاروں لوگوں کو طریقۂ حق کی تعلیم دی۔

۱۔ صاحب خزینۃ الاصفیا نے خود بھی کسی ایسی شخصیت کا سراغ نہیں دیا۔

۲۔ کنز الانساب المعروف انوار السادات، صفحہ ۲۰۱ - ۲۰۲

پھر تبت کو چک کو گئے اور لوگوں کو دینِ اسلام میں داخل کیا۔ وہاں سے کشمیر کا رخ کیا، جہاں کے لوگ آفتاب پرست تھے۔ باپ بیٹے کی کوششوں سے اس علاقے کے ہزاروں افراد نے اسلام قبول کیا۔ اس علاقے کی چنگڑ قوم نے انھیں بہت پریشان کیا، مگر یہ لوگ بھی جلد مطیع ہو گئے۔

مؤرخ "فرشتہ" کا بیان! تاریخ فرشتہ[1] میں لکھا ہے کہ "مرزا حیدر ترک نے اپنی کتاب رشیدی میں لکھا ہے کہ فتح شاہ بادشاہ کے زمانہ میں ایک مرد میر شمس الدین نام تھا۔ اس نے عراق عجم سے آ کر اپنے تئیں میر سید صلاح الدین محمد نور بخش سے منسوب کر کے مذہب غیر معروف جاری کیا اور نام اس مذہب کا نور بخشی رکھا۔ قبل ازیں کشمیر میں آفتاب پرستی ایک مذہب تھا۔ سید صلاح الدین محمد نور بخش کو طائفہ چکاں اس تقریر پر دعویٰ کرتے تھے کہ سید میر شمس الدین عراقی شیعہ مذہب رکھتا تھا۔ تمام مردم کشمیر اور سلاطین اس زمانہ کے اس کے مقتدی ہوئے اور سب نے خطبۂ ائمہ اثنا عشرہ اس کے حکم سے پڑھ لیا۔[2]

سبزوار کو واپسی اور شادی ۵۸۶ھ میں باپ بیٹا واپس اپنے وطن سبزوار تشریف لے گئے۔ شمس سبزواریؒ نے شادی کی۔ ان کے دو فرزند تولد ہوئے، جن کے نام نصیر الدین محمد اور سید علاؤالدین احمد تھے۔ سید علاؤالدین احمد "زندہ پیر" کے لقب سے مشہور ہوئے۔

تبریز میں آمد شمس سبزواریؒ کو تبریز بہت پسند تھا چنانچہ ۶۰۰ھ میں والد کی اجازت سے وہاں تشریف لے گئے۔ قونیہ میں قیام فرمایا اور مولانا رومؒ سے ملاقات ہوئی۔ مولانا روم اور شمس سبزواری کی ملاقات کا حال اور کتابوں کا واقعہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اس لیے اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد مولانا رومؒ کو شمس سبزواری کے عظیم مرتبے کا احساس ہو گیا، چنانچہ انھوں نے ان سے بیعت کر لی۔

شمس سبزواریؒ بارہ سال تک تبریز میں سُکر کی حالت میں رہے۔ اتنے طویل قیام کے باعث شمس تبریزیؒ[3] کہلانے لگے۔ تین ماہ تک آپ اور مولانا روم دونوں چلہ کش حجرے میں خلوت گزیں بھی رہے۔

اہلِ تبریز کی مخالفت کہتے ہیں مولانا روم کو چونکہ آپ سے بہت عقیدت تھی، وہ آپ کا بے حد احترام کرتے تھے اور ہر وقت ساتھ رکھتے تھے،[4] اس لیے مولانا کے بعض عقیدت مندوں کو یہ شاق گزرتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ مولانا ایک ننگ دھڑنگ فقیر کے قبضہ میں آ گئے ہیں۔ چنانچہ وہ شمس تبریزیؒ کے مخالف ہو گئے۔

تبریز سے رخصت شمس تبریزیؒ نے تبریز چھوڑ کر سبزوار کی راہ لی پھر بغداد چلے آئے۔ بغداد سے ایک مرتبہ تبریز بھی آئے

---

[1] جلد دوم ص ۱۴۲ تا ۱۴۵ بحوالہ کنز الانساب ص ۲۶۔ [2] "کنز الانساب" ص ۲۰۲

[3] واضح رہے کہ آپ کو اپنے اجداد کی نسبت سے شمس الدین مرتضیٰ اسماعیلی بھی کہتے ہیں۔

[4] مولانا روم نے اپنے اشعار میں جگہ جگہ شمس تبریزیؒ کی تعریف بیان کی ہے۔

پھر دمشق چلے گئے۔[1]

علمائے بغداد کا عتاب! بعض بیانات کے مطابق علمائے بغداد کو آپ کے خیالات سے اختلاف ہوگیا، چونکہ ان علما کا بادشاہ پر خاصا اثر تھا اس لیے انھوں نے شمس سبزواریؒ پر بے دینی کا الزام لگا کر شاہی حکم سے انھیں شہر بدر کردیا اور یہ کاظمین چلے آئے۔

بادشاہ کی قدر شناسی بادشاہ نے انھیں شہر بدر کرنے کا حکم تو دے دیا تھا، مگر اس نے علما کے اصرار پر ایسا کیا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ بادشاہ ان کا دل سے قدر دان تھا۔ اتفاق سے بادشاہ کا لڑکا وفات پاگیا، جس سے بادشاہ کو یہ خیال گزرا کہ شاید اُسے یہ سزا شمس سبزواریؒ کو شہر بدر کرنے کے باعث ملی ہے، چنانچہ اس نے اپنے مشیروں کو شمس سبزواریؒ کے پاس بھیج کر انھیں واپس بلالیا اور بغداد میں رہنے کی اجازت دے دی۔

ایک واقعہ کہا جاتا ہے کہ شمس سبزواریؒ نے بغداد پہنچ کر بادشاہ کے لیے دعا کی اور اس کا بیٹا زندہ ہوگیا۔ یہ کرامت دیکھ کر بغداد کے علما پھر آپ کے خلاف ہوگئے اور دوبارہ کفر کا فتویٰ لگا کر ان کی کھال اتروانے کے درپے ہوگئے۔

کھال اتروا دی گئی کہا جاتا ہے کہ حضرت نے کپڑا اوڑھ کر اپنی کھال کھنچوا دی جو لوگوں کو عبرت دلانے کے لیے شہر میں پھرائی گئی۔ پھر آپ عازم ہندوستان ہوئے۔ شاہ بغداد کے بیٹے کو جس کا نام محمد تھا آپ سے عقیدت تھی، لہٰذا وہ بھی آپ کے ساتھ ہندوستان کی طرف روانہ ہوگیا۔

ملتان میں ورود ہندوستان کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد آپ نے ملتان کا رُخ کیا اور یہیں اقامت گزیں ہوگئے۔ ان دنوں شیخ بہاؤالدین زکریاؒ بہ قیدِ حیات تھے۔ کہتے ہیں، شیخ نے دودھ کا پیالہ شمس سبزواریؒ کی خدمت میں پیش کیا، انھوں نے ایک پھول پیالے میں ڈال دیا۔ مطلب یہ کہ ہم ملتان میں پھول بن کر رہیں گے۔ اور ہماری وجہ سے کسی کو کوئی ضرر نہ پہنچے گا۔

لعل ہی لعل ایک روز آپ شہزادہ محمد کے ہمراہ کشتی میں سوار تھے۔ کشتی ڈگمگانے لگی، یوں معلوم ہوتا ہے کہ ڈوب جائے گی۔ شمس سبزواری نے شہزادے سے کہا تمھارے پاس جو چیز ہے وہ دریا میں پھینک دو، ورنہ کشتی ڈوب جائے گی۔ شہزادے کے پاس وہ جواہرات تھے جو وہ ساتھ لایا تھا۔ اس نے ارشاد کی تعمیل میں جواہرات دریا میں ڈال دیے۔ دیکھا تو دریا میں دُور دُور تک جواہرات ہی جواہرات دکھائی دے رہے تھے۔

ملتان میں گرمی کی شدت کا باعث بغداد کی طرح ملتان کے لوگوں نے بھی آپ کی مخالفت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، یہاں تک کہ ایک دفعہ گوشت بھوننے کے لیے آگ کی ضرورت پڑی تو شہزادے کو بھیجا کہ کہیں سے آگ لے آئے مگر سارے شہر میں کسی نے آگ نہ دی۔ ایک شخص نے تو شہزادے کو پیٹ ہی دیا۔ شمس سبزواریؒ نے جب لوگوں کا یہ رویہ

---

[1] کنزالانساب

دیکھا تو جلال میں آکر آسمان کی طرف نظر اٹھائی۔ سورج سے کہا، شمس! میں تیرا ہم نام ہوں نیچے آ، تاکہ تیری گرمی سے میں گوشت بھون لوں۔

کہتے ہیں سورج اتنا نیچے آگیا کہ اس کی حدت سے لوگ تڑپنے لگے۔ لوگوں کی چیخ پکار سُن کر شمس سبزواری کو رحم آگیا اور غصہ فرو ہوا۔ سورج سے کہا "بازبرو" اور وہ اپنی جگہ پر چلا گیا۔ ملتان کی گرمی کو عوام اسی واقعہ کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

دیوان شاہ شمس الدین | آپ کے فارسی غزلیات کا ایک مجموعہ دیوان شاہ شمس الدین کے نام سے مشہور ہے۔ اس مجموعے میں سے ایک غزل نمونہ کے طور پر درج کی جاتی ہے:۔

اے دستۂ گل مرحبا از بوئے ریحاں آمدی	جانِ عالم را تو ہم از عالم جاں آمدی
عیسیٰ غلام درگہت موسیٰ بصیرہ در رہت	رفرف شدہ جولاں گہت تا تو بمیداں آمدی
کردہ خلیل چاکری موسےٰ بجاں فرماں بری	کز عالم پیغمبری محبوب خوباں آمدی
دنیا نزیبد جائے تو در سندِ بالائے تو!	اُں عرش خاکِ پائے تو گنج بویراں آمدی
خصم نافرمانِ تو زد شک مردندانِ تو	خسرع شد یک بار تو پُرخون دنداں آمدی

اے شمس حسینی با صفا می گو تو نعتِ مصطفےٰ

زیرا کہ در بستانِ او تو مرغان خوش خواں آمدی

اولاد | صاحب کنزالانساب کا بیان ہے کہ شمس سبزواریؒ نے ۶۶۵ھ میں ملتان میں سکونت اختیار کی آپ نے سید عبدالہادی کو واپس وطن کو روانہ کیا۔ بادشاہ احمد نگودار نے ہمراہ شاہزادوں کی فوج کر دی اور ۶۶۶ھ میں افلہ سادات عظام اسماعیلیہ کا ملتان میں پہنچا۔ آنجناب سے بال بچہ نے آکر تعظیم تکریم کر دی اور وہاں سکونت پذیر ہوئے۔

آپ کے دو صاحبزادے تھے: نصیر الدین محمدؒ نے ۲۱۔ رمضان ۶۸۲ھ میں بعمر ۴۹ برس وفات پائی۔ ان کا مزار لعہ لاہور کے تہ خانہ میں بتایا جاتا ہے۔ دوسرے فرزند کا نام سید علاؤالدین احمدؒ تھا جو سید احمد شکر بار بھی کہلاتے تھے ن کا مزار ریاست جے پور کے قصبہ نرڑ میں بتایا جاتا ہے۔

شاہ شمس الدین کا روضہ | شاہ شمس الدین محمد تبریزیؒ کا مزار ملتان میں ایک قلعہ نما فصیل کے اندر شیخ محمد جمال ملتانی کے روضہ سے قدرے فاصلہ پر ہے۔

یہ روضہ حضرت کے وصال کے دو سال بعد ۶۷۷ھ میں تعمیر ہوا۔ پیر حاجی صدر الدین، آپ کے صاحبزادے سید احمد شکر بار اور شہزادہ محمد نے (جو آپ کے ساتھ ہی سبزوار سے ملتان آیا تھا) مل کر اس کی تعمیر ں حصہ لیا۔ اُس وقت روضے کی عمارت بالکل سفید تھی۔

دوسری مرتبہ ۱۱۹۴ھ میں سید میر صفدر علی شاہ کے زمانے میں روضہ تعمیر ہوا۔ اُس وقت حسب ذیل تحریر روضے کے دروازے پر لکھی گئی جواب تک موجود ہے۔ ؎

حکم بنائے روضہ شد از درگاہِ لم یزل ‏ ‏ گشت ارشاد بر چہار گاہ درویشاں ولی
بود زلفِ ماتسعین احمد ہجری ‏ ‏ کہ کرد بسم اللہ تاریخ سنت موجدی
تعمیرِ خانقاہش روضہ دریافت جلی! ‏ ‏ محمد مولوی در عہد حیات میر صفدر علی
یکہزار یک صد نود چہار ہجری ‏ ‏ کہ پُر دُر شد ایں نامہ ابیات قلندری

حضرت محیؒ الدین عربیؒ

ولادت ——— مرسیا (اندلس) ۵۶۰ھ

وفات ——— دمشق ۶۳۸ھ

ولادت آپ کا پورا نام محمد بن علی بن احمد بن عبداللہ تھا۔ کنیت ابوبکر، لقب محی الدین عرف حاتمی، ابن عربی کے نام سے بھی معروف ہیں۔ مغرب میں آپ کو ابن العربی ہی کہا جاتا ہے۔ اندلس کے ایک مقام مرسیا میں آپ پیدا ہوئے۔ سال ولادت ۵۶۰ھ ہے۔ اشبیلیہ میں آپ نے حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی اور ان علوم وفنون میں غیر معمولی درک حاصل کیا اور بہت جلد فن کے ممتاز اصحاب میں ان کا شمار ہونے لگا۔

۵۹۸ھ میں آپ نے مشرق کی طرف کوچ کیا اور بہت سے شہروں کی سیاحت کرڈالی۔ مصر، حجاز اور ایشیائے کوچک کے متعدد شہروں کی آپ نے زیارت کی اور وہاں کے احوال کا معائنہ کیا۔ کیفیت علمی کا مشاہدہ کیا اور روحانی مجلسوں کی سیر کی۔ آخر میں آپ ملک شام میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوگئے اور ۶۳۸ھ میں آپ نے بمقام دمشق وفات پائی۔

ابن عربی کی تصنیفات ابن عربی نے نظم ونثر میں بہت سی کتابیں تحریر کیں۔ جن کی تعداد کسی طرح دو سو سے کم نہیں ہے۔ بروکلمان نے اپنی کتاب "تاریخ الادب العربی" میں آپ کی تصنیفات کی تعداد ڈیڑھ سو بتائی ہے۔

خاص خاص اور چیدہ چیدہ کتابیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ "الفتوحات المکیہ"

یہ کتاب اپنے مغز اور موضوع کے اعتبار سے بے حد اہم ہے۔ اس میں مختلف مذاہب اور مسالک پر سیر حاصل بحث وگفتگو کی گئی ہے۔

۲۔ "فصوص الحکم"

یہ کتاب تصوف میں ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ اس فن میں نہایت معرکۃ الآرا اور اہم ہے، تو ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا اس میں تصوف اور فلسفہ کے مسائل مہمہ کی عقدہ کشائیاں کی گئی ہیں۔

۳۔ "ذخائر الاخلاق"

یہ اشعار کا دیوان ہے۔ اس میں شاعر نے اپنی حب الٰہی کی کیفیتیں بیان کی ہیں۔ تمام اشعار فتوحات الٰہیہ اور الہامات روحیہ کی کیفیات صادقہ پر مشتمل ہیں۔ اشعار میں زیادہ تر رمز اور اشارہ سے کام لیا گیا ہے اور اپنی اصل کیفیات کو

مخفی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان اسرار الٰہی کو خاص طور پر بخل کے ساتھ اور وہ بھی اشارہ وکنایہ میں بیان کیا ہے، جنھیں عام لوگ اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے، نہ صحیح طور پر ان کی کیفیات صحیحہ سے آشنا ہو سکتے ہیں۔

مذکورہ کتابوں کے علاوہ بھی ابن عربی کی جو کتابیں ہیں وہ اپنی براعت فائقہ اور قدرت عجیبہ کے لحاظ سے ایک خاص رنگ کی حامل ہیں۔ ان تالیفات میں مختلف عناصر کو ممزوج کیا گیا ہے۔ دین، تصوّف، فلسفہ سب ہی کچھ موجود ہے۔ ان کتابوں میں مختلف رنگ ہیں پھر بھی ان سب کی یک رنگی نظر کو خیرہ کرتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر ابن عربی کو "الشیخ الاکبر" و "الکبریت الاحمر" کے لقب سے ملقب کیا جائے تو بالکل صحیح ہوگا۔

فقہا کی مخاصمت | ابن عربی بھی فقہا کی زد سے نہیں بچ سکے۔ تیسری صدی ہجری کے نصف آخر میں ہم نے صوفیا اور فقہا کے درمیان جنگ اور مخاصمت کی جو کیفیت دیکھی تھی، وہ اس دور میں بھی نظر آرہی ہے۔ اسی صورت کا نتیجہ وہ ہولناک صورت تھی جو حسین بن منصور حلاج کو پیش آئی تھی۔ جس کا موقع پر ہم تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں۔

ابن عربی کا مسلک ومذہب جس مرکز کا تابع تھا اور جس محور پر گردش کر رہا تھا، وہ "وحدۃ الوجود" کا مسئلہ تھا۔ اس مسلک میں فقہا نے محسوس کیا کہ یہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ چنانچہ ابن عربی کی کتابوں کے خلاف فقہا نے بہت زیادہ شورش کی۔ انھیں بہت زیادہ متہم کیا اور ان کے خلاف کفر وضلال کے فتوے صادر کیے۔ چنانچہ مصر میں تو ان کے قتل کی باقاعدہ کوشش بھی کی گئی۔

لیکن جو لوگ ابن عربی کے ادا شناس تھے، وہ ان کی شخصیت اور مسلک سے بہت زیادہ متاثر تھے اور دوسرے مخالف۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی وفات کے بعد ان کے مخالف اتنے نہیں تھے، جتنے ماتم گسار، لیکن مخالفین میں بھی ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو ان کی وفات کے بعد بھی اپنے کام میں مصروف رہے۔ اس صف میں ہمیں بڑی جلیل القدر ہستیاں نظر آتی ہیں، مثلاً علاّمہ ابن تیمیہؒ، المتوفی ۷۲۸ھ اور ابن خلدون، المتوفی ۸۰۸ھ اور علاّمہ ابن حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ اور ابراہیم البقاعی، المتوفی ۸۸۵ھ اور ان کے علاوہ بہت سے اکابر اور اصحاب ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

بقاعیؒ اور ابن عربیؒ | ابن عربی کے تمام دشمنوں اور مخالفوں میں کسی نے بھی ابن عربی کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا، جو بقاعی نے کیا۔

بقاعی نے دو کتابیں خاص طور پر لکھیں:

۱۔ "تنبیہ الغبی علیٰ تکفیر ابن عربی"

۲۔ "تحذیر العباد من اہل العناد ببدعۃ الاتحاد"

ان کتابوں میں بقاعی نے مطاعن کا ایک سمندر ابن عربی کے خلاف بھر دیا ہے۔ ان کے عقیدہ اخلال کو کفر وضلال سے تعبیر کیا ہے اور ان کی تمام کتابوں کو گمراہ کن ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ایک جماعت ایسی بھی ہے اور اس میں بھی اکابر رجال شامل ہیں، جو ابن عربی کو قرار واقعی اہمیت دیتی ہے، ان کی ادا شناس ہے اور ان کے نظریہ و مسلک کو قبول کرتی ہے۔ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی کوشش کرتی ہے۔

ان لوگوں میں قابلِ ذکر

۱۔ مجد الدین الفیروز آبادی،
۲۔ قطب الدین الحموی،
۳۔ صلاح الدین الصفدی،
۴۔ شہاب الدین السہروردی،
۵۔ فخر الدین الرازی،
۶۔ جلال الدین السیوطی

اور دوسرے اصحاب علم و فضل ہیں۔

جلال الدین سیوطی نے ابن عربی کی مدافعت میں ایک کتاب لکھی، جس کا نام ہے

"تنبیہ الغبی فی تبرئۃ ابن عربی"۔

عبد الرزاق القاشانی اور عبد الغنی النابلسی نے بھی ابن عربی کی بابت میں کتابیں لکھیں۔

ابن عربی کے ممیزات

ابن عربی کے خصائص اور ممیزات پر یوں تو بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ ان کا احاطہ کرنا آسان بھی نہیں، لیکن ان کے خصائص اور ممیزات میں ایک بات بہت صاف اور واضح ہے۔ وہ یہ کہ اگرچہ ابن عربی بہت بڑے صوفی تھے ان کا شمار اصحاب ذوق اور ارباب فکر و عمل میں کیا جاتا تھا نہ اس ذوق اور وجدان کے حامل تھے جو کشف حقیقت کا موجب ہوتا ہے، لیکن بایں ہمہ انھیں فلسفہ سے بھی پورا شغف تھا اور وہ اس فن سے پوری دلچسپی لیتے تھے، چنانچہ ان کے مؤلفات پر ایک نظر ڈالی جائے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

مسلک وحدۃ الوجود

ابن عربی کا مذہب دعائم ذوقیہ پر قائم تھا۔ اس میں فلسفہ کی بہت زیادہ آمیزش تھی۔ اسی بنا پر فقہا کے نزدیک میں وہ معتوب تھے۔ ان کا اصل مسلک "وحدۃ الوجود" تھا۔

ابن عربی کا خیال تھا، وجود واحد ہے اور مخلوقات کا وجود عین وجود خالق ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے خالق اور

ن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جو شخص خالق اور مخلوق کے وجود میں امتیاز کا قائل ہے' ابن عربی کی نظر میں وہ ادراک حقیقت
ا آشنا ہے' جو خود اس کی ذات کے اندر موجود ہے وہ اپنے اس قول کی دلیل "سبحان من خلق الاشیاء وھو عینھا"
استے ہیں۔

پس جب وجود حق عین وجود خلق ہے' تو پھر حقیقت بھی ایک ہے' اس میں فرق و امتیاز کیوں کر روا رکھا جا سکتا ہے؟

[حقی]قت محمدیؐ | ابن عربیؒ

وحدۃ الوجود کے سلسلہ میں ابن عربی کے دو نظریے ہیں:

(۱) حقیقت محمدیہؐ (۲) وحدت ادیان

حقیقت محمدیہؐ کے بارے میں ابن عربی دو لفظ استعمال کرتے ہیں۔ کبھی قطب اور کبھی روح خاتم۔ ان کے نزدیک کمالات [و]علمیہ کا یہ قدیم ترین منبع ہے۔ حضرت آدم سے لے کر آنحضرتؐ تک یہی حقیقت جو حقیقت محمدیہ کے رنگ میں جلوہ گر رہی ہے [آنحضرت صلی] اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کا وجود آپ کی پیروی کرنے والے اولیاء میں نظر آتا ہے۔ اس مسلک کا حلاج کے سلسلہ میں [تفصیل] و وضاحت کے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔

وحدت ادیان کے بارے میں ابن عربی کا نظریہ یہ ہے کہ تمام مذاہب کی اصل و حقیقت ایک ہے اور یہ بالکل وہی مسلک جو حلاج کا تھا۔ جب ہر دین کا مقصد و منتہا ذات الٰہی ہے تو پھر اس کی حقیقت بھی ایک ہی ہے۔

حضرت بہاء الدین زکریا سہروردی ملتانی

ولادت ــــــــــــ سلاقہ ملتان ۵۶۵[1] ھ

وفات ــــــــــــ ملتان ۶۶۶ ھ

حضرت بہاء الدین زکریاؒ کا وطن مکہ مکرمہ ہے۔ قبیلہ ہبادی اسدی (قریشی) ہے۔ یہ قبیلہ دوسری صدی ہجری میں مکہ سے خوارزم آیا، پھر وہاں سے ملتان آکر آباد ہوا۔ شیخ بہاؤالدین زکریا قدس سرہ العزیز کے جدِ بزرگوار کا نام حضرت کمال الدین علی شاہ تھا۔ ان کے فرزند وجیہہ الدین محمد ملتان میں تولد ہوئے، جن کی شادی مولانا حسام الدین ترمذی کی لڑکی سے ہوئی۔ مولانا حسام الدین تاریوں کے حملہ کی وجہ سے ملتان کے نواحی قلعہ کودر میں متوطن تھے۔ مولانا وجیہہ الدین بھی خسر کے ساتھ قلعہ کودر ہی میں رہنے لگے اور یہیں حضرت بہاؤالدین زکریا کی ولادت باسعادت ہوئی۔

بارہ سال کے ہوئے تو والد بزرگوار عالم جاودانی کو سدھارے۔ والد ماجد کی وفات کے بعد کلام پاک کا حفظ کرنا شروع کیا۔ ساتوں قراتوں کے ساتھ حفظ کر چکے تو مزید تعلیم کے لیے خراسان کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ یہاں پہنچ کر سات سال تک بزرگانِ دین سے علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل کرتے رہے۔ وہاں سے بخارا جاکر علم میں کمال حاصل کیا۔ ان کے اوصافِ پسندیدہ اور خصائل حمیدہ کی وجہ سے بخارا کے لوگ ان کو بہاؤالدین فرشتہ کہا کرتے تھے۔ یہاں آٹھ سال تک تحصیل علم کرتے رہے، پھر بخارا سے حج کے ارادہ سے مکہ معظمہ گئے۔ وہاں سے روضۂ اقدس کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور پانچ سال جوارِ رسول میں زندگی بسر کی۔ اُس مدت میں مولانا کمال الدین محمد سے جو اپنے عہد کے جلیل القدر محدث تھے حدیث پڑھی۔ مولانا کمال الدین محمد نے ترپن سال تک مجاور کی حیثیت سے حرم نبوی کی خدمت کی۔ حضرت بہاؤالدین زکریاؒ نے حدیث کی تعلیم سے فراغت کے بعد روضۂ اقدس کے پاس تزکیۂ قلب اور تصفیہ باطن کے لیے مجاہدہ شروع کیا، پھر وہاں سے چل کر بیت المقدس پہنچے اور وہاں سے بغداد تشریف لے گئے۔

بغداد میں حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ العزیز کی صحبت سے فیض یاب ہو کر خرقۂ خلافت پایا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شیخ بہاؤالدین زکریا قدس سرہٗ نے اپنے مرشد کے پاس صرف سترہ روز

---

[1] سن ولادت میں اختلاف ہے۔ اخبار الصالحین میں "۵۶۵ یا ۵۶۶ھ" لکھا ہے۔ سفینۃ الاولیاء میں ۵۶۵ھ تحریر ہے۔ اسی طرح ۶۶۶ھ کے متعلق بھی مختلف روایتیں ہیں۔

قیام فرمایا تھا کہ ان کو پیر دستگیر کی طرف سے ساری روحانی نعمتیں مل گئیں اور خرقۂ خلافت سے بھی سرفراز کیے گئے۔ اس سے شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی کے مریدوں کے دل میں رشک پیدا ہوا اور شیخ سے شکوہ بھی کیا، مگر شیخ نے ان کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ تم تر لکڑیوں کے مانند ہو جن میں آگ مشکل اور دیر سے لگ سکتی ہے۔ بہاؤالدین زکریا خشک لکڑیوں کے مانند تھے، جس پر آگ جلد اثر کرتی ہے۔

خرقۂ خلافت پانے کے بعد حکم ملا کہ ملتان واپس جا کر قیام کریں اور وہاں کے باشندوں کو فیض پہنچائیں۔ حضرت جلال الدین تبریزی بھی شیخ الشیوخ کے ساتھ مقیم تھے۔ جب حضرت بہاؤالدین زکریا بغداد سے رخصت ہونے لگے تو نہایت محبت میں وہ بھی اپنے پیر سے اجازت لے کر ان کے ساتھ ہو گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب دونوں بزرگ نیشاپور پہنچے تو شیخ جلال الدین تبریزی، حضرت شیخ فریدالدین عطار کی خدمت میں تشریف لے گئے۔ ملاقات کے بعد واپس ہوئے تو حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا نے ان سے دریافت کیا کہ آج کی سیر میں درویشوں میں کس کو سب سے بہتر پایا۔ بولے شیخ فریدالدین عطار کو۔ حضرت بہاؤالدین زکریا نے پوچھا کہ ان سے کیا کیا صحبت رہی۔ جواب دیا کہ مجھ کو دیکھتے ہی انھوں نے دریافت کیا کہ آپ لوگوں کا کہاں سے آنا ہوا۔ میں نے عرض کی کہ خطۂ بغداد سے آنا ہوا۔ پھر استفسار کیا کہ وہاں کون درویش مشغول بحق ہے۔ میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا نے حضرت جلال الدین تبریزیؒ سے پوچھا کہ اپنے مرشد شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا ذکر کیوں نہ کیا۔ جواب دیا کہ شیخ فریدالدین کی عظمت میرے دل پر ایسی چھائی ہوئی تھی کہ شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کو بھول گیا۔ یہ سن کر شیخ بہاؤالدین زکریا کو بہت ملال ہوا اور وہ حضرت جلال الدین تبریزیؒ سے علٰحدہ ہو کر ملتان چلے آئے اور حضرت جلال الدین تبریزیؒ خراسان جا کر مقیم ہو گئے۔

ملتان کی مدتِ قیام میں نہ صرف ملتان بلکہ سارا ہندوستان حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض و برکات کے انوار سے منور ہو گیا یہاں تک کہ ان کا عہد خیر الاعصار کہا جاتا ہے۔

شیخ محمد نوربخش مؤلف سلسلۃ الذہب میں رقمطراز ہیں:

"حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ ہندوستان میں رئیس الاولیا تھے۔ علوم ظاہری کے عالم اور مکاشفات و مشاہدات کے مقامات و احوال میں کامل تھے۔ ان سے اکثر اولیاء اللہ کے سلسلے جاری ہوئے۔ لوگوں کو رشد و ہدایت فرمائی اور ان کو کفر سے ایمان کی طرف معصیت سے اطاعت کی طرف اور نفسانیت سے روحانیت کی طرف لائے، اور ان کی شان بڑی تھی۔"

رشد و ہدایت عوام و خواص دونوں کے لیے تھی اور وہ دونوں طبقوں کو اپنی ذات بابرکت سے فیض پہنچانے کی کوشش فرماتے۔ اس وقت ملتان کا حکمراں ناصرالدین قباچہ تھا، جو سلطان شمس الدین التمش کا حریف بھی تھا، حضرت شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کا قلبی رجحان سلطان التمش کی طرف تھا، کیونکہ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے، وہ اپنے زہد و تقویٰ، دینداری اور شریعت کی

پاسداری کے لحاظ سے اولیاء اللہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ ناصرالدین قباچہ نے سلطان التمش کی بڑھتی ہوئی سطوت و قوت کو دیکھ کر اس کے خلاف معاندانہ سازش شروع کی۔ اُس کو ملتان کے قاضی مولانا شرف الدین اصفہانی اور خود شیخ بہاؤالدین زکریا نے پسند نہ کیا۔ قاضی شرف الدین اصفہانی بہت ہی متدین عالم تھے، انھوں نے دین کی فلاح اسی میں سمجھی کہ سلطان التمش کو قباچہ کی سازش سے مطلع کر دیں۔ شیخ بہاؤالدین زکریا نے بھی ان کی حمایت کی اور دونوں نے علیحدہ علیحدہ سلطان التمش کو خطوط لکھے، مگر دونوں مکتوب قباچہ کے آدمیوں کے ہاتھ لگ گئے۔ قباچہ ان کو پڑھ کر بہت مشتعل ہوا اور ایک محضر کے ذریعہ دونوں کو طلب کیا۔ جب وہ دونوں مجلس میں تشریف لے گئے تو قباچہ نے شیخ بہاؤالدین زکریا کو اپنی داہنی جانب بٹھایا اور قاضی شرف الدین اصفہانی کو اپنے مقابل بیٹھنے کا حکم دیا اور ان کا خط ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ قاضی شرف الدین اصفہانی نے خط پڑھ کر خاموشی اختیار کی۔ قباچہ نے جلاد کو حکم دیا کہ اسی وقت وہ تہ تیغ کر دیے جائیں۔ جلاد نے آگے بڑھ کر سر قلم کر دیا۔ جب شیخ بہاؤالدین زکریا کے ہاتھ میں ان کا مکتوب دیا گیا، تو انھوں نے اُس کو دیکھتے ہی فرمایا کہ بے شک یہ خط میرا ہے، مگر میں نے حق تعالےٰ کے حکم سے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے۔ یہ سُن کر قباچہ پر لرزہ طاری ہو گیا اور اس نے معذرت کر کے شیخ بہاؤالدین زکریا کو اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کر دیا۔

مگر خلق اللہ کی خاطر شاہی حکام کے ساتھ اشتراک عمل کرنے میں بھی دریغ نہ فرماتے۔ ملتان میں ایک بار سخت قحط پڑا، والی ملتان کو غلہ کی ضرورت ہوئی۔ شیخ بہاؤالدین زکریا نے غلہ کی ایک بڑی مقدار اپنے ہاں سے اس کے پاس بھیجی۔ جب غلہ اس کے پاس پہنچا تو اس کے انبار سے نقرئی سکے کے سات کوزے بھی نکلے۔ والی ملتان نے شیخ کو اس کی اطلاع دی، انھوں نے فرمایا ہم کو پہلے سے معلوم تھا، لیکن غلہ کے ساتھ اسے بھی ہم نے بخشا۔

شیخ بہاؤالدین زکریا کے مطبخ میں طرح طرح کے کھانے پکتے تھے، مگر شیخ کو ان نعمتوں سے کھانے میں اسی وقت لذت ملتی جب وہ مہمانوں، مسافروں اور درویشوں کے ساتھ مل کر کھاتے، جو شخص کھانا رغبت سے کھاتا تھا اس کو بہت دوست رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ فقراء کی ایک بڑی جماعت دسترخوان پر شریک تھی، حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا نے ہر فقیر کے ساتھ ایک ایک لقمہ کھایا۔ ایک فقیر کو دیکھا تو روٹی شوربے میں بھگو کر کھا رہا ہے۔ فرمایا سبحان اللہ ان سب فقیروں میں یہ فقیر خوب کھانا جانتا ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نان تر کو اور کھانوں پر وہی فضیلت ہے جو فضیلت مجھ کو تمام انبیاء پر ہے۔ اور عائشہ کو تمام دنیا کی عورتوں پر ہے۔

شیخ کو کبھی دولت کی کمی محسوس نہ ہوئی، مگر وہ خود اس سے ہمیشہ مستغنی و بے نیاز رہے۔ ایک روز خادم سے فرمایا کہ جاؤ جس صندوقچہ میں پانچ ہزار دینار سرخ رکھے ہیں، اس کو اٹھا لاؤ۔ خادم نے ہر چند تلاش کیا، مگر صندوقچہ کہیں نہ ملا، وہ مایوس ہو کر واپس آیا اور شیخ کو اطلاع دی۔ کچھ تامل کے بعد فرمایا الحمد للہ! تھوڑی دیر کے بعد خادم پھر آیا اور صندوقچہ کے مل جانے کی اطلاع دی، پھر الحمد للہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ حاضرین نے عرض کی کہ حضرت نے صندوقچہ گم ہونے پر بھی الحمد للہ فرمایا،

اور مل جانے پر بھی۔ اس میں کیا حکمت تھی۔ ارشاد فرمایا کہ فقیروں کے لیے دنیا کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں" ان کو کسی چیز کے آنے پر خوشی ہوتی ہے اور نہ اس کے جانے کا غم ہوتا ہے۔ اور تمام دینار حاجت مندوں میں تقسیم کرا دیے۔

مزاج میں حلم و بردباری بہت تھی۔ ایک روز خانقاہ میں تشریف فرما تھے کہ دلق پوش قلندروں کی ایک جماعت پہنچی اور ان سے مالی مدد کی خواستگار ہوئی۔ انھوں نے اس جماعت سے بیزاری کا اظہار فرمایا۔ اس پر قلندروں نے گستاخی شروع کر دی اور اینٹ پتھر سے ان کو مارنے لگے۔ حضرت شیخ نے خادم سے فرمایا کہ خانقاہ کا دروازہ بند کر دو۔ جب دروازہ بند ہو گیا تو قلندروں نے دروازہ پر پتھر مارنے شروع کیے۔ حضرت شیخ نے کچھ تامل کے بعد خادم سے فرمایا "دروازہ کھول دو، میں اس جگہ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی قدس سرہ کا بٹھایا ہوا ہوں۔ خود سے نہیں بیٹھا ہوں۔ خادم نے دروازہ کھول دیا۔ اس وقت قلندر نادم ہوئے اور اپنے قصور کی معافی چاہی۔

غایت تواضع میں اپنی تعظیم و تکریم پسند نہیں فرماتے تھے۔ ایک بار خانقاہ میں کچھ مرید حوض کے کنارے وضو کر رہے تھے، حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ان کے پاس پہنچ گئے۔ مریدوں نے وضو ختم نہیں کیا تھا کہ تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے اور سلام عرض کیا، مگر ایک مرید نے وضو تمام کر کے مراسم تعظیم ادا کیے۔ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا نے فرمایا، تم سب درویشوں میں افضل اور زاہد ہو۔

مگر وہ خود دوسروں کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ جب وارد ہندوستان ہوئے اور ملتان آکر ٹھہرے، حضرت شیخ بہاؤالدین زکریاؒ ان سے تعظیم و محبت اور شفقت سے ملے اور اصرار کر کے کچھ دنوں ان کو اپنے یہاں روکا۔ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ بھی حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا کی بڑی قدر کرتے تھے۔ چنانچہ جب معتقدین نے اُن کو ملتان میں قیام کرنے کی دعوت دی تو فرمایا کہ ملتان کی سرزمین پر شیخ بہاؤالدین کا قبضہ اور سایہ کافی ہے، یہاں ان ہی کی حمایت تم لوگوں کے ساتھ رہے گی۔

حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا بابا گنج شکرؒ کی بھی بہت عزت کرتے تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ دونوں خالہ زاد بھائی بھی تھے اور باہم بڑی محبت اور مودت تھی۔ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا نے ایک موقع پر کسی بات کی معذرت کرتے ہوئے بابا صاحب کو لکھا :

" میان ما و شما عشق بازی است "

بابا گنج شکر نے اس کا جواب دیا :

" میان ما و شما عشق بازی نیست "

ایک موقع پر حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے ساتھ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریاؒ نے عزت و احترام کا جو نمونہ پیش کیا تھا، اس کا ذکر بادۂ تصوف کے سرشاروں کے لیے بہت ہی خمار آگیں ہے۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت جلال الدین

تبریزیؒ نیشاپور میں حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ سے علٰحدہ ہو کر خراسان چلے گئے تھے، کچھ عرصہ کے بعد دہلی تشریف لائے،
سلطان التمش ان کی عظمت اور بزرگی کی شہرت پہلے سے سُن چکا تھا۔ چنانچہ جب وہ دہلی کے قریب پہنچے تو سلطان نے علماء و
مشائخ کی ایک جماعت کے ساتھ شہر کے باہر جاکر ان کا استقبال کیا اور ان کو دیکھتے ہی گھوڑے سے اُتر آیا اور ان کو آگے کر کے
خود پیچھے شہر کی طرف روانہ ہوا۔ یہ تعظیم و تکریم شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کو پسند نہ آئی۔ ان کے دل میں حضرت جلال الدین تبریزی
کی طرف سے رشک و حسد کی آگ بھڑک اُٹھی، مگر اس کا اظہار نہیں کیا اور سلطان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ حضرت جلال الدین
تبریزیؒ اس کی (یعنی نجم الدین صغریٰ) قیامگاہ کے قریب ہی فروکش ہوں اور قیام کے لیے ایک مکان تجویز کیا، جو بیت الجن کے
نام سے مشہور تھا۔ سلطان نے اپنے عزیز اور محبوب مہمان کو جنوں کے مکان میں ٹھہرانا پسند نہ کیا، مگر نجم الدین صغریٰ نے کہا اگر
حضرت جلال الدین تبریزیؒ کامل درویش ہوں گے تو مکان خود جنات سے پاک ہو جائے گا اور اگر ناقص ہوں گے تو اپنی فریب
دہی کی سزا پائیں گے۔ یہ گفتگو بالکل علٰحدہ ہوئی تھی کہ حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے خود اس مکان میں رہنے کا اعلان کر دیا۔
جب وہ اس مکان میں داخل ہوئے تو ان کے قدم کی برکت سے مکان تمام بلاؤں سے پاک ہو گیا اور ان کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچا
دوسرے روز خواجہ بختیار کاکیؒ کی ملاقات کے لیے شہر کی تنگ گلیوں میں سے ہو کر چلے۔ حضرت بختیار کاکیؒ کو کشف ہوا کہ حضرت
جلال الدین تبریزیؒ ان سے ملنے آ رہے ہیں تو وہ خود گلیوں میں ہوتے ہوئے ان کے استقبال کو بڑھے۔ راستہ میں قران السعدین
واقع ہوا، جس وقت حضرت خواجہ جلال الدین خواجہ بختیارؒ کے ہمراہ ان کی خانقاہ میں پہنچے، اس وقت یہاں مجلس سماع ہو رہی
تھی، فقراء جمع تھے۔ اس بیت پر خواجہ صاحب کو وجد آگیا۔

در میکدۂ وحدت ایثار نمی گنجد در عالم یکرنگی اغیار نمی گنجد

سلطان التمش حضرت جلال الدین تبریزی کے ساتھ مرشد کا یہ لگاؤ دیکھ کر ان کا اور بھی معتقد ہو گیا۔ اس سے نجم الدین
صغریٰ کا حسد اور زیادہ بڑھا۔ ایک روز موسم بہار میں سلطان التمش نے فجر کی نماز سے پہلے نجم الدین صغریٰ کو اپنے محل میں
بلایا اور ان کو امام بنایا۔ نماز شاہی محل کی چھت پر ہوئی۔ چھت کے سامنے حضرت جلال الدین تبریزی کی قیامگاہ تھی، وہ صبح
کی نماز سے فراغت کے بعد صحن خانہ میں چادر اوڑھے آرام فرما رہے تھے، اور ایک ملازم جس کو اللہ تعالیٰ نے حسن صورت بھی
عطا کیا تھا، ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔ نجم الدین کو خیال ہوا کہ حضرت جلال الدین تبریزیؒ نماز سے غافل ہو کر محو استراحت ہیں،
اسی وقت سلطان کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ آپ ایسے ہی دنیا پرست درویشوں کے معتقد ہیں، یہ سونے کا کون سا وقت ہے اور
ایک صاحبِ جمال غلام بھی پاس بیٹھا ہے۔ حضرت جلال الدین تبریزیؒ کو نور باطن سے نجم الدین صغریٰ کی بدگمانی معلوم ہو گئی
تو اُسی وقت اُٹھے اور صحن خانہ ہی میں سلطان کو حقیقت سے آگاہ کیا۔ سلطان نادم ہوا اور نجم الدین صغریٰ سے کہنے لگا کہ
تم شیخ الاسلام ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو۔ تم کو نیک و بد کی بھی پہچان نہیں، مگر نجم الدین صغریٰ شرمندہ ہونے کی بجائے اندرونی
طور پر اور زیادہ برہم ہو گئے اور حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے ساتھ پرخاش بہت زیادہ بڑھ گئی اور شہر کی ایک حسین و جمیل

مطربہ کو پانچ سو اشرفیاں دینے کا وعدہ کر کے آمادہ کیا کہ وہ حضرت جلال الدین تبریزیؒ پر فسق و زنا کا الزام لگائے۔ مطربہ نے سلطان کے پاس جا کر حضرت جلال الدین تبریزیؒ کو متہم کیا۔ سلطان یہ سن کر ششدر ہو گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ جھوٹا الزام ہے اور مطربہ کو اس کی دروغ گوئی کی پوری سزا دے سکتا تھا۔ لیکن تاوان کی وجہ سے معذور تھا۔ مدعیہ خود اپنے بیان سے واجب التعذیر فاحشہ ثابت ہو رہی تھی۔ مگر حضرت جلال الدین تبریزیؒ پر بغیر شہادت کے تہمت زنا ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ مدعیہ کا تنہا بیان کافی نہ تھا۔ لیکن اس کا مقدمہ سامنے آ جانے کے بعد اس کی شرعی تحقیقات بھی ضروری تھی۔ اس لیے سلطان نے مشورے کے بعد ایک محضر طلب کرنے کا فیصلہ کیا۔ محضر میں شرکت کے لیے ہندوستان کے مشاہیر علما و مشائخ کو دعوت دی گئی۔ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریاؒ نے بھی اس دعوت کو قبول کیا اور دہلی تشریف لائے۔ اس محضر میں دو سو صرف اولیائے کرام شریک ہوئے۔ محضر جامع مسجد میں منعقد ہوا۔

شیخ الاسلام نجم الدین صغری کو حضرت شیخ بہاؤالدین زکریاؒ اور حضرت جلال الدین تبریزیؒ کی کشیدگی کا علم تھا، چنانچہ وہ ان دونوں کی اس کشیدگی و ناراضی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ شیخ الاسلام کی حیثیت سے انھوں نے شیخ بہاؤالدین زکریاؒ ہی کو حکم مقرر کیا۔ جمعہ کی نماز کے بعد مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ مطربہ پیش کی گئی۔ حضرت جلال الدین تبریزیؒ کو بھی طلب کیا گیا۔ جس وقت وہ مسجد کے دروازے پر پہنچے، سارے علما و اولیا ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے، اور جب حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے اپنی جوتیاں اتاریں تو شیخ بہاؤالدین زکریاؒ نے بڑھ کر ان کی جوتیاں اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ سلطان التمش بہت متاثر ہوا کہ ایک جلیل القدر حکم اپنے سامنے پیش ہونے والے ملزم کی ایسی توقیر و عظمت کر رہا ہے، جو حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے معصوم ہونے کی دلیل ہے اور تحقیقات کی کارروائی روک دینا چاہی، مگر شیخ بہاؤالدین زکریاؒ نے فرمایا

"میرے لیے فخر کی بات ہے کہ شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے پاؤں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بناؤں، کیوں کہ وہ میرے مرشد شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کے ساتھ سات سال تک سفر و حضر میں رہے، لیکن شاید شیخ الاسلام نجم الدین کے دل میں یہ خیال ہو کہ بہاؤالدین نے شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی تعظیم کر کے ان کے عیب پر پردہ ڈال دیا ہے، تو یہ اہل اللہ پر بخوبی روشن ہے کہ حضرت جلال الدینؒ سے ایسے فعل شنیع کا واقع ہونا محال ہے، لیکن پھر بھی دلائل بیّنہ کا اظہار ضروری ہے۔ اس لیے مدعیہ مطربہ کو سامنے لاؤ۔"

چنانچہ مطربہ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کے سامنے لائی گئی، مگر اس پر ایسا رعب طاری ہو گیا کہ اس نے تہمت ثابت کرنے کے بجائے شروع سے آخر تک صحیح واقعہ بیان کر دیا کہ نجم الدین صغری نے اس کو طمع دلا کر حضرت جلال الدین تبریزیؒ پر الزام رکھنے کے لیے آمادہ کیا تھا۔ اس سازش کے افشا پر نجم الدین صغری ایسے ذلیل اور پشیمان ہوئے کہ مجلس ہی میں ان کو غش آ گیا اور حضرت جلال الدین تبریزیؒ کی معصومیت ثابت ہو گئی۔ سلطان التمش نے اس کذب و بہتان کی سزا میں نجم الدین صغری

کو شیخ الاسلام کے عہدہ سے برطرف کرکے حضرت بہاؤالدین زکریا سے یہ عہدہ قبول کرنے کی استدعا کی۔ انھوں نے قبول فرمایا اور ایک مدت مدید تک شیخ الاسلام کا عہدہ ان کے خاندان میں جاری رہا۔

حضرت شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کے صحیفۂ کمال میں جود و سخا کی بھی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں۔ ایک بار ان کے معتقدوں اور مریدوں کا جہاز غرق ہو رہا تھا۔ غایت اضطراب میں انھوں نے حضرت شیخ الاسلام بہاؤالدینؒ سے روحانی استمداد کی۔ اللہ جل شانہٗ کی قدرت سے وہ جہاز محفوظ رہ گیا۔ جہاز پر موتی اور جواہرات کے بڑے بڑے تاجر تھے۔ جب جہاز ساحل پر پہنچا تو ان تاجروں نے اپنے مال کا ایک ثلث حضرت شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کی خدمت میں نذر کرنے کا عہد کیا۔ ان کی جانب سے خواجہ فخرالدین گیلانی نقد و جواہرات لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جواہرات کی قیمت اور نقد رقم ملا کر ستر لاکھ چاندی کے ٹنکے ہوتے تھے۔ شیخ نے اس کو قبول تو کر لیا لیکن تین دن کے اندر یہ کل رقم حقداروں، محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم کرا دی۔ خواجہ فخرالدین گیلانی اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اسی وقت اپنا تمام مال اسباب فقرا میں بانٹ دیا اور فقیری اختیار کر لی۔ پانچ برس شیخ کی خدمت میں گزار کر بیت اللہ کے حج کو روانہ ہوئے، مگر جدہ پہنچ کر جنت کی راہ لی۔

سماع سے بھی کبھی کبھی شغل فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ عبداللہ رومی قوال ملتان میں وارد ہوا اور خدمت عالی میں حاضر ہو کر عرض کی کہ اس کا گانا حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ نے شوق کے ساتھ سنا ہے اور وہ ان کی خدمت میں اکثر حاضر رہا ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ جب شیخ الشیوخ نے سنا ہے تو زکریا بھی سنے گا۔ چنانچہ قوال کو ایک خاص حجرہ میں بلایا گیا۔ عشا کی نماز کے بعد ایک پہر رات گزری ہوگی کہ خود حجرہ میں تشریف لائے، دو پارے کلام پاک تلاوت کرکے قوال کو سنانے کا حکم دیا اور حجرے کے دروازہ میں زنجیر لگا دی۔ قوال نے گانا شروع کیا

مستاں کہ شراب ناب خوردند   از پہلوئے خود کباب خوردند

جب اس بیت کی تکرار کی تو حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا وجد میں کھڑے ہو گئے اور حجرہ کا چراغ گل کر دیا۔ قوال کا بیان ہے کہ اس کو کچھ معلوم نہ ہوتا تھا اور کچھ نظر نہ آتا تھا کہ شیخ کی کیا کیفیت ہو رہی ہے۔ صرف دامن معلوم ہوتا تھا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ تھوڑے وقفہ کے بعد شیخ حجرہ سے باہر تشریف لے گئے اور وہ (یعنی قوال) اپنے رفیقوں کے ساتھ حجرہ ہی میں رہا۔ جب صبح ہوئی تو شیخ نے خادم کے ہاتھ خلعت اور بیس نقرئی ٹنکے بھجوا دیے۔

عبادت و ریاضت میں کلام پاک کی تلاوت سے بڑا شغف رکھتے تھے۔ ایک بار اپنے خلفا کے ساتھ مجلس میں بیٹھے تھے کہ ان سے مخاطب ہو کر فرمایا، تم میں سے کوئی ایسا شخص ہے کہ دو رکعت نماز کی نیت باندھے اور ایک رکعت میں نماز کے درمیان کلام پاک ختم کرے۔ حاضرین میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی۔ پھر خود ہی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے، اور دو رکعت نماز کی نیت کرکے پہلی ہی رکعت میں پورا کلام مجید ختم کر دیا، اور چار پارے زائد پڑھے۔ دوسری رکعت میں سورۂ اخلاص پڑھی۔ بارہا فرماتے تھے کہ اہل دل سے مجھ کو جو کچھ فیض پہنچا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو عمل میں لانے کی بھی توفیق عطا فرمائی ہے اور

جس کام کے لیے جو عزم کیا، وہ پورا ہوا۔ لیکن ایک کام اب تک نہیں ہو سکا۔ ایک بزرگ آغاز صبح سے طلوع آفتاب تک قرآن شریف ختم کر لیتے ہیں، میں نے بھی ہر چند اس کی کوشش کی، مگر یہ حوصلہ پورا نہیں ہو سکا، تین چار پارے باقی رہ جاتے ہیں۔ مگر سیر العارفین کے مؤلف کا بیان ہے کہ میں نے اپنے پیر دستگیر شیخ سماء الحق والدین سے سنا تھا کہ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا کا معمول تھا کہ تہجد کی نماز کے بعد کلام پاک کا آغاز کرتے اور فجر کی نماز کی سنتوں تک پورا ختم کر لیتے تھے۔

وفات کے روز اپنے حجرہ میں عبادت میں مشغول تھے کہ حجرہ کے باہر ایک نورانی چہرہ کے مقدس بزرگ نمودار ہوئے، اور حضرت شیخ صدرالدین کے ہاتھ میں ایک سربمہر خط دیا۔ حضرت شیخ صدرالدین خط کا عنوان دیکھ کر متحیر ہوئے۔ والد بزرگوار کی خدمت میں پیش کر کے باہر آئے تو قاصد کو نہ پایا۔ خط پڑھنے کے ساتھ ہی حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور آواز بلند ہوئی:

"دوست بہ دوست رسید"

یہ آواز سن کر حضرت شیخ صدرالدین دوڑتے ہوئے حجرے میں آ گئے تو دیکھا آواز حقیقت بن چکی تھی۔ سن وفات میں اختلاف ہے۔ اخبار الاخیار میں سال وفات ۶۶۱ھ ہے۔ سفینۃ الاولیا و تاریخ فرشتہ میں ۶۶۶ھ اور مرآۃ الاسرار میں ۶۶۵ھ ہے۔ سفینۃ الاولیا میں پیدائش کا سن ۵۶۵ھ لکھا ہے اس لحاظ سے ان کی عمر سو سال سے زیادہ ہوتی ہے۔ مزار شریف ملتان میں ہے۔

حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی نہ کسی تصنیف کا پتہ ہے اور نہ ملفوظات کا ذکر تذکروں میں ہے مگر انھوں نے اپنے مریدوں کے لیے جو وصایا اور خطوط لکھے تھے، ان کو اخبار الاخیار نے نقل کیا ہے۔ ان سے ان کی صوفیانہ تعلیمات پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے ان کے اقتباسات ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ بندہ پر واجب ہے کہ سچائی اور اخلاص سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور اس کے عبادت و اذکار میں غیر اللہ کی نفی ہو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے احوال کو درست اور اقوال و افعال میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔ ضرورت کے سوا نہ کوئی بات کہے اور نہ کوئی کام انجام دے۔ ہر قول و فعل سے پہلے اللہ تبارک و تعالیٰ سے التجا کرے اور اس سے نیک عمل کی توفیق چاہے۔ دوسرے موقع پر اپنے مرید کو نصیحت فرماتے ہیں کہ تم اللہ تبارک و تعالیٰ کے ذکر کو اپنے اوپر لازم کر لو۔ ذکر ہی سے طالب محب تک پہنچتا ہے۔ محبت ایسی آگ ہے، جو تمام میل کچیل کو جلا ڈالتی ہے۔ جب محبت راسخ ہو جاتی ہے تو مذکور کے مشاہدہ کے ساتھ ذکر حقیقی ذکر ہو جاتا ہے، یہی وہ ذکر کثیر ہے، جس کا اللہ تعالیٰ کے اس قول وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ میں فلاح کا وعدہ کیا گیا ہے۔

پھر فرماتے ہیں کہ مرید کو چاہیے کہ اپنے روزگار کی حفاظت کرتا رہے۔ ماسوائے اللہ کو دل سے دور کر دے۔ دنیا کے لوگوں کی صحبت کو اپنے اوپر حرام کر لے اور حق تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہے۔ اگر اس کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے موانست نہ ہوگی

تو خدائے تعالیٰ کی محبت کی بُو بھی وہ نہ سونگھ سکے گا۔

ایک نصیحت میں ارشاد فرمایا کہ بدن کی سلامتی قلتِ طعام میں، روح کی سلامتی ترکِ گناہ میں اور دین کی سلامتی حضرت خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے میں ہے۔ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا مریدوں میں شیخ حسن افغان کو بہت ہی محبوب رکھتے تھے۔ گو آپ ان پڑھ تھے، مگر ان کا ظاہر و باطن روحانی تعلیم سے آراستہ تھا۔ ان کی بزرگی کا یہ حال تھا کہ ایک بار ایک کاغذ پر تین سطریں لکھ دی گئیں، جن میں ایک کلام پاک کی آیت تھی۔ ایک حدیث شریف اور ایک میں کسی شیخ کا قول منقول تھا۔ یہ کاغذ دکھا کر شیخ حسن افغان سے پوچھا گیا کہ کونسی سطر میں کیا چیز ہے۔ شیخ حسن افغان نے قرآن مجید کی سطر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ یہ کلام ربانی ہے۔ اس کا نور مجھ کو زمین سے عرشِ معلیٰ تک نظر آ رہا ہے۔ حدیث شریف کی سطر پر انگلی رکھ کر کہا یہ حدیث مقدس کی سطر ہے۔ اس کا نور ساتویں آسمان تک دکھائی دیتا ہے۔ پھر شیخ کے قول پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اس کا نور زمین سے آسمان تک دیکھتا ہوں۔ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ اکثر فرماتے تھے کہ اگر قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں مجھ سے پوچھا گیا کہ ہماری بارگاہ میں کیا کمائی لایا ہے تو میں عرض کروں گا کہ میری کمائی حسن افغان ہے۔

حضرت شیخ فریدالدّین مسعُود گنج شکرؒ اجودھنی

ولادت ——— ملاقہ ملتان ۵۸۲ھ

وفات ——— پاک پٹن ۶۶۶ھ

سلطان السالکین شمس العارفین فرید الحق والشرع والدین شیخ فریدالدین گنج شکرؒ خطۂ ملتان کے ان اولیائے کرام میں سے ہیں جن پر زمانہ ہمیشہ فخر کرے گا۔ قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مرید اور معین الحق والدین خواجہ معین الدین چشتیؒ ان کے دادا پیر ہیں۔

پیدائش اور نام و نسب | حضرت بابا صاحب کا اصل نام فریدالدین تھا۔ فاروقی بتائے جاتے ہیں۔ سلسلہ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ آپ کے آباؤ اجداد شہاب الدین محمد غوری کے عہد میں افغانستان سے ہندوستان آئے اور لاہور میں مقیم ہوئے۔ آپ کے دادا کا نام قاضی شعیب اور والد کا نام قاضی جمال الدین سلیمان تھا۔ جو لاہور میں قاضی تھے۔ خاندان کچھ مدت تک لاہور میں رہا پھر ملتان کے ایک قصبہ میں مقیم ہو گیا۔ یہیں ۵۸۲ھ میں بابا صاحب کی ولادت ہوئی۔

ابتدائی حالات | ابھی بچے ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ نے اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کی۔ نماز کی پابندی کرانے کے لیے حضرت کی والدہ جانماز کے نیچے شکر کی پڑیا رکھ دیا کرتی تھیں اور اپنے بچے مسعود سے فرمایا کرتی تھیں جو بچے نماز پڑھتے ہیں ان کی جانماز کے نیچے سے روزانہ ان کو شکر مل جاتی ہے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ والدہ شکر کی پڑیا رکھنا بھول گئیں اور انھوں نے گھبرا کر حضرت سے کہا مسعود تم نے نماز پڑھی یا نہیں؟ حضرت نے جواب دیا ہاں اماں نماز پڑھ لی اور شکر کی پڑیا بھی مل گئی۔

یہ جواب سن کر حضرت کی والدہ کو بہت تعجب ہوا اور وہ سمجھیں کہ اس بچے کی غیب سے مدد ہوتی ہے اور اس وقت سے انھوں نے اپنے بچے مسعود کو شکر بار اور شکر گنج کہنا شروع کیا جو آج تک مشہور ہے۔

تعلیم | حضرت کی والدہ نے حضرت کو کھتوال میں بہت اچھی تعلیم دلوائی تھی۔ مگر جب یہاں کی تعلیم پوری ہو گئی تو حضرت کو تعلیم کے لیے ملتان بھیجا گیا جہاں اس وقت بڑے بڑے علما درس دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت ملتان میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور ایک مسجد میں رہتے تھے۔ جہاں بہت عسرت اور تنگی سے بسر اوقات ہوتی تھی۔

ارادت | ایک دن حضرت اس مسجد میں بیٹھے ہوئے نافع کا مطالعہ کر رہے تھے کہ ایک درویش وہاں آئے جنھوں نے

ان کو کتاب کے مطالعہ میں مصروف دیکھ کر پوچھا، یہ کیا پڑھ رہے ہو۔ حضرت نے کتاب سے نظر اٹھا کر ان درویش کو دیکھا اور جواب دیا نافع پڑھ رہا ہوں۔ ان درویش نے مسکرا کر پوچھا کیا یہ کتاب تم کو کچھ نفع دے گی؟ جونہی حضرت کی ان درویش سے آنکھیں چار ہوئیں ایک خاص اثر حضرت کے دل پر ہوا اور حضرت نے کھڑے ہو کر جواب دیا۔ جی نہیں مجھے اس کتاب سے نفع نہیں ہوگا بلکہ آپ کی نظر فیض اثر سے نفع ہوگا یہ کہہ کر حضرت نے فوراً ان درویش کے قدموں میں سر رکھ دیا اور ان درویش سے کچھ باطنی رموز کے سوالات کیے جن کو باتوں باتوں میں ان درویش نے حل کر دیے۔ حضرت نے ان درویش سے پوچھا آپ کون ہیں؟ انھوں نے جواب دیا میرا نام قطب الدین بختیار ہے اور میں دہلی جا رہا ہوں۔ حضرت نے عرض کی مجھے بھی اپنے ساتھ دہلی لے چلیے۔ درویش نے فرمایا چلو میرے ساتھ چلو۔

بیعت | دہلی میں آ کر حضرت خواجہ قطب صاحب نے بابا صاحب کو مشائخ دہلی کے ایک مجمع میں مرید کیا اور حضرت سے مجاہدے کرانے شروع کیے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ دہلی سے ہانسی میں چلے گئے اور وہاں مجاہدے کرتے رہے پھر دہلی میں آئے اور یہاں تلقین حاصل کی اور اوچہ تشریف لے گئے اور وہاں جا کر مجاہدے کیے۔ پھر دہلی میں حاضر ہوئے اور حضرت خواجہ قطب صاحب نے ان کو خلافت عطا فرما دی۔ یہاں سے حضرت ہانسی میں آئے اور ہانسی سے کھتوال تشریف لائے۔ اور کھتوال میں جب لوگوں کا ہجوم ہوا تو اجودھن میں آ کر اقامت اختیار کی جو دریا کے کنارے ایک غیر مشہور مقام تھا اور پھر آخر عمر تک اسی جگہ رہے، لیکن دہلی میں حضرت خواجہ قطب صاحب کے پاس آتے رہتے تھے۔

فیضان | ابتدائی زمانہ میں ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ دہلی میں آئے ہوئے تھے اور حضرت بابا صاحب بھی دہلی میں حضرت خواجہ قطب صاحب کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ نے خواجہ قطب صاحب سے فرمایا آؤ ہم تم دونوں مسعود کو فیض اور نعمت دیں۔ چنانچہ انھوں نے بابا صاحب کو بیچ میں کھڑا کر لیا اور دونوں بزرگوں نے بابا صاحب کو کھڑے ہو کر توجہ دینی شروع کی اور باطنی نعمتوں سے مالا مال کر دیا۔ اس کے بعد حضرت خواجہ قطب صاحب نے بابا صاحب سے فرمایا مسعود! دادا پیر کے قدموں میں سر رکھو۔ بابا صاحب نے حضرت خواجہ صاحب کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا میں کہتا ہوں دادا پیر کے قدموں میں سر رکھو، تم میرے قدموں میں سر جھکاتے ہو۔ بابا صاحب نے جواب دیا، ان قدموں کے سوا اور قدم نظر نہیں آتے۔ یہ جواب سن کر حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ نے فرمایا، بختیار۔ بختیار! مسعود ٹھیک کہتا ہے۔ وہ منزل کے دروازے پر پہنچ گیا ہے جہاں وحدت کے سوا دوئی کا نام باقی نہیں رہتا پھر کیوں کر اس کو تیرے سوا میں نظر آؤں۔

آخری تبرکات | حضرت خواجہ قطب صاحب کی وفات کے وقت بابا صاحب دہلی سے دور ہانسی میں تھے مگر حضرت خواجہ قطب صاحب نے وصیت فرما دی تھی کہ میرے تبرکات مسعود کو دیے جائیں اور وہی میرا جانشین ہو۔ چنانچہ وہ ہانسی سے دہلی میں آئے اور حضرت خواجہ قطب صاحب کا خرقہ پہنا اور تبرکات حاصل کیے اور ان کی جگہ پر بیٹھے اور پھر کچھ دن کے بعد

خلقت کے ہجوم سے گھبرا کر ہانسی تشریف لے گئے اور ہانسی سے اجودھن میں تشریف لے آئے اور یہیں آخر عمر تک قیام کیا۔

نظامِ اوقات اجودھن میں بابا صاحب ہر وقت یادِ خدا میں مصروف رہتے تھے اور ان کی مجلس میں علمی اور روحانی چرچے رہتے تھے۔ آدھی رات تک دروازہ کھلا ہوتا اور لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی ان کی علمیت اتنی اعلیٰ تھی کہ مولانا خواجہ سید بدرالدین اسحٰق محض اسی علمیت کی وجہ سے باوجود انکارِ فقرا ان کے مرید ہوئے تھے ان کی بات بات میں علمی لطیفے ہوتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت بہاؤالدین زکریاؒ ملتانی نے خط لکھا تو اس میں یہ بھی لکھا کہ میری تو تم سے عشق بازی ہے۔ بابا صاحب نے جواب دیا میری آپ کی محبت تو ہے مگر بازی نہیں ہے۔ اس واسطے میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے خطوط میں عشق اور محبت کی حد کے اندر رہیں بازی تک نہ آئیں۔

بادشاہ کے نام خط حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت شیخ العالم نے دہلی کے بادشاہ بلبن کو کسی شخص کی سفارش لکھی تو عربی زبان میں اس طرح خط لکھا:

رَفَعْتُ قِصَّتَهٗ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ اِلَیْکَ فَاِنْ اَعْطَیْتَهٗ شَیْئًا فَالْمُعْطِیْ هُوَ اللّٰہُ وَاَنْتَ الْمَشْکُوْرُ وَاِنْ لَّمْ تُعْطِهٖ شَیْئًا فَالْمَانِعُ هُوَ اللّٰہُ وَاَنْتَ الْمَعْذُوْرُ۔

میں نے اس شخص کی ضرورت کو خدا کے سامنے پیش کیا پھر تیرے پاس بھیجا اگر تو اس کو کچھ دے گا تو یہ دین اللہ کی ہوگی اور یہ شخص تیرا شکر گزار ہوگا اور کچھ نہ دے گا تو روک خدا کی طرف سے ہوگی اور تو معذور سمجھا جائے گا۔

اس سے حضرت کی فصاحت و بلاغت بھی ظاہر ہوتی ہے اور یہ بھی کہ ان کی نظر ہر وقت اللہ کی طرف رہتی تھی اور اہلِ دنیا کی کوئی ہیبت اُن کے دل میں نہ تھی۔

ہاتھ کی لکڑی ایک دفعہ بابا صاحب بیمار تھے اور لکڑی کے سہارے چل رہے تھے یکایک لکڑی انھوں نے اپنے ہاتھ سے پھینک دی۔ حاضرین نے وجہ پوچھی تو حضرت نے فرمایا میرے دل میں خیال آیا کہ میرا چلنا اس لکڑی کے بھروسہ پر ہے، اس لیے میں نے اس کو پھینک دیا۔ انسان کا بھروسہ صرف اللہ ہی پر ہونا چاہیے۔

ایک مُلّا کا قصہ حضرت سلطان المشائخ حضرت مولانا خواجہ سید بدرالدین اسحٰق کے حوالے سے فرماتے تھے کہ اجودھن کے قریب کوئی مُلّا صاحب رہتے تھے جن کو اپنے علم کا بہت گھمنڈ تھا اور درویشوں کو بے علم سمجھ کر حقارت سے دیکھا کرتے تھے۔ ایک دن وہ حضرت شیخ العالم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت مجلس میں کئی لوگ موجود تھے مُلّا صاحب نے اپنی علمیت اور ہمہ دانی کے قصے بیان کرنے شروع کیے۔ حضرت شیخ العالم نے ان کے قصے سنتے سنتے اُن سے پوچھا کہ مولانا اسلام کے رکن کتنے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا پانچ ہیں ایک کلمہ دوسرا نماز تیسرا روزہ چوتھا زکوٰۃ، پانچواں حج۔ حضرت شیخ العالم نے فرمایا، میں نے تو چھٹا رکن بھی سُنا ہے۔ مُلّا صاحب نے بگڑ کر جواب دیا۔ چھٹا رکن کوئی نہیں ہے۔ آپ نے جو کچھ سُنا غلط سُنا۔ حضرت نے جواب دیا۔ جی نہیں میں نے معتبر اہلِ علم سے سُنا ہے کہ اسلام کا چھٹا رکن روٹی ہے۔

اس پر مُلّا صاحب کو غصہ آیا اور انھوں نے کہا مجھے آپ لوگوں سے اسی لیے اختلاف رہتا ہے کہ آپ لوگ بے علم اور کم علم ہوتے ہیں، لیکن عالم بننے کی کوشش میں خواہ مخواہ دخل در معقولات کرتے رہتے ہیں۔ میں نے جو پانچ رکن بیان کیے ہیں، یہ حدیثوں میں موجود ہیں۔ فقہ میں موجود ہیں۔ آپ جس چھٹے رکن کو بیان کرتے ہیں وہ نہ حدیثوں میں ہے نہ فقہ میں ہے۔ حضرت شیخ العالم نے تبسم کے بعد فرمایا نہیں مولانا وہ قرآن میں بھی ہے۔ حدیث میں بھی ہے اور فقہ میں بھی ہے۔ یہ سُن کر مولانا کو اتنا زیادہ غصہ آیا کہ وہ کھڑے ہو گئے اور انھوں نے کہا اللہ فرماتا ہے فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ نصیحت کے بعد ظالم قوم کے پاس نہ بیٹھ۔ اس لیے میں جاتا ہوں۔ شیخ العالم نے بہت نرمی کے ساتھ ان کو ٹھہرانا چاہا۔ مگر مُلّا صاحب نہ ٹھہرے اور چلے گئے۔

مُلّا صاحب کی مصیبت! جب مُلّا صاحب حضرت بابا صاحب کی مجلس سے ناراض ہو کر چلے گئے تو انھوں نے کچھ عرصے کے بعد حج کے سفر کا ارادہ کیا اور پوری تیاری کے بعد روانہ ہوئے مکّہ معظمہ میں پہنچ کر سات برس وہاں قیام کیا۔ اس کے بعد ہندوستان کے جہاز میں سوار ہو کر واپسی کے خیال سے روانہ ہوئے۔ دو چار دن کے بعد سمندر میں سخت طوفان آیا اور مُلّا صاحب کا جہاز طوفان کے باعث تباہ ہو گیا۔ مُلّا صاحب جہاز کے ایک تختے پہ بہتے ہوئے کنارے پر پہنچے اور تختے سے اُتر کر خشکی میں آئے وہاں سوکھے پہاڑ تھے۔ نہ درخت تھے نہ گھاس تھی۔ مُلّا صاحب تین دن بھوک پیاس کی حالت میں پہاڑ کے ایک غار میں بیٹھے رہے۔ یکایک وہاں ایک آدمی آیا، جس کے سر پر خوان تھا۔ اس نے آواز دی میں روٹی فروخت کرتا ہوں۔ انھوں نے اس سے کہا میں عالم ہوں اور میں نے سات حج کیے ہیں، میرا جہاز تباہ ہو گیا ہے، میرے پاس ایک پیسہ بھی موجود نہیں ہے۔ اور میں تین رات دن سے بھوکا پیاسا ہوں۔ اس شخص نے جواب دیا میرے پاس کھانا بھی ہے اور پانی بھی ہے، مگر میں دوکاندار ہوں۔ بغیر قیمت کے کھانا پانی نہیں دے سکتا۔ انھوں نے کہا کیا تم مسلمان ہو۔ اس نے جواب دیا ہاں الحمد للہ! مُلّا صاحب نے اُس کو مسافروں، مہمانوں اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنے کی نسبت وعظ سنایا اور سمجھایا کہ تو مجھ بھوکے پیاسے کو کھانا اور پانی دے دے۔ اس نے کہا یہ سب کچھ ٹھیک ہے، لیکن میں بغیر قیمت کے کھانا پانی نہیں دے سکتا۔ یہ کہہ کر وہ جانے لگا تو مُلّا صاحب نے اُس سے کہا تو کیسا مسلمان ہے، تجھے رحم نہیں آتا۔ اُس نے مُڑ کر جواب دیا، اگر میں رحم کروں تو آج ہی میری دوکانداری کا خاتمہ ہو جائے۔ اچھا میں رحم کرتا ہوں، تم اپنی زبان سے یہ کہہ دو کہ سات حج کا ثواب تم نے مجھے دیا۔ مُلّا صاحب نے خیال کیا زبان سے کہہ دینا کوئی چیز نہیں ہے اور اس سے میرا ثواب نہیں جا سکتا۔ اس لیے انھوں نے کہا میں نے تجھے روٹی اور پانی کے بدلے سات حج کا ثواب دیا۔ اس شخص نے یہ سنتے ہی خوان اس کے آگے رکھ دیا اور انھوں نے پیٹ بھر کے روٹی کھائی اور ٹھنڈا پانی پیا۔ اس کے بعد اُس سے پوچھا تو کہاں رہتا ہے اور کیا یہاں کوئی آبادی بھی ہے؟ اُس نے جواب دیا میں روٹی فروخت کرتا ہوں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ یہ کہہ کر وہ اپنے خالی برتن لے کر غار سے باہر گیا اور مُلّا صاحب جھپٹ کر اس کے پیچھے

روانہ ہونے تاکہ دیکھیں وہ کدھر سے آیا تھا۔ لیکن باہر نکلتے ہی وہ پہاڑوں کے پیچ و خم میں کہیں غائب ہو گیا۔ ہر چند تلاش کیا کہیں نہ ملا۔ آخر مجبور ہو کر ملّا صاحب دریا کے کنارے آن بیٹھے کہ شاید کوئی کشتی یا جہاز ادھر سے گزرے۔ یہاں تک کہ تین رات دن گزر گئے اور ان کی حالت بھوک اور پیاس سے پھر خراب ہو گئی۔ تب وہی شخص پھر سر پر خوان رکھے دکھائی دیا، اور اس نے اس شرط پہ ان کو روٹی کھلائی کہ ساری عمر کے روزوں کا ثواب زبانی ان سے لے لیا۔ آج بھی جب وہ جانے لگا تو ملّا صاحب اس کے پیچھے دوڑے مگر وہ پھر کہیں غائب ہو گیا اور تین رات دن غائب رہا اور جب ان کی حالت بھوک پیاس کے سبب بہت خراب ہو گئی۔ تب وہ پھر کھانا لے کر آیا اور ساری عمر کی زکوٰۃ کا ثواب لے کر چلا گیا۔ اس کے بعد وہ تین رات دن کے بعد پھر کھانا لے کر آیا اور ساری عمر کی نمازوں کا ثواب لے کر چلا گیا۔ آخر اب کے تین رات دن کی بھوک پیاس کے بعد وہ کھانا لے کر آیا تو ملّا صاحب نے کہا میں سات حج کا ثواب دے چکا، ساری عمر کے روزوں کا ثواب دے چکا ساری عمر کی زکوٰۃ کا ثواب دے چکا، ساری عمر کی نمازوں کا ثواب دے چکا۔ اب میرے پاس کچھ نہیں جو میں تجھے دوں۔ اس شخص نے کہا یہ کاغذ اور قلم دوات لایا ہوں۔ اس پر لکھ دیجیے کہ میں نے ایک وقت کی روٹی اور پانی کے بدلے سات حجوں کا ثواب فروخت کیا، پھر ساری عمر کے روزوں کا ثواب فروخت کیا، پھر ساری عمر کی زکوٰۃ کا ثواب فروخت کیا۔ پھر ساری عمر کی نمازوں کا ثواب فروخت کیا، اور آج میں ایک وقت کی روٹی اور پانی کے بدلے یہ تحریر دیتا ہوں۔ چنانچہ ملّا صاحب نے یہ عبارت لکھ دی اور اس کے بعد انھوں نے اپنا نام اور مقام اس کاغذ پر لکھ دیا اور وہ کاغذ اس کو دے دیا۔ اس نے کھانا پانی ملّا صاحب کے سامنے رکھا اور ملّا صاحب نے کھانے کے بعد عاجزانہ انداز سے کہا خدا کے لیے مجھے بتاؤ تم کہاں رہتے ہو تاکہ میں تمھارے ساتھ وہاں چلوں اور اپنی روزی کے لیے کچھ محنت مزدوری کروں، کیوں کہ اب میرے پاس تمھیں دینے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا ہے۔ اس شخص نے خفا ہو کر کہا میں تمھیں کچھ نہیں بتا سکتا۔ یہ کہہ کر اس نے برتن اٹھائے اور کاغذ جیب میں رکھا اور پہاڑ کی طرف چلا۔ ملّا صاحب تازہ دم تھے دوڑے کہ اس کو پکڑ کر مجبور کریں اور آبادی کا راستہ پوچھیں۔ وہ بھی بھاگا اور ملّا صاحب بھی اس کے پیچھے بھاگتے رہے۔ یہاں تک کہ آگے جا کر اس نے ٹھوکر کھائی اور وہ گرا۔ ملّا صاحب خوش ہوئے کہ اب میں اس کو پکڑ لوں گا، اس لیے انھوں نے زیادہ تیزی سے دوڑنا شروع کیا، لیکن انھوں نے بھی ٹھوکر کھائی اور گر پڑے اور قبل اس کے کہ وہ اٹھیں وہ شخص اپنے برتن لے کر بھاگا اور نظروں سے غائب ہو گیا آخر مجبور ہو کر ملّا صاحب سمندر کے کنارے آئے اور عادت کے موافق وہاں بیٹھ گئے۔ یکایک انھوں نے دور سے دیکھا ایک جہاز جا رہا ہے۔ انھوں نے اپنا عمامہ سر سے اتار لیا اور اس کو ہلا ہلا کر چیخنا شروع کیا کہ میری مدد کرو، میری مدد کرو، میری مدد کرو۔ جہاز والوں نے جہاز روک لیا اور ایک کشتی ان کے پاس بھیجی۔ اس میں سوار ہو کر جہاز پہ آئے اور جہاز میں سوار ہوئے۔ اس جہاز میں حاجی لوگ سوار تھے اور ہندوستان جا رہے تھے۔ انھوں نے ملّا صاحب کی بڑی خاطر کی اور بہت آرام سے ملّا صاحب ہندوستان پہنچ گئے۔ اپنے گھر میں آئے بال بچوں کو دیکھا اور اس کے بعد ایک دن حضرت شیخ العالم

سے ملنے آئے۔

باباصاحبؒ کی بارگاہ میں

جب مُلا صاحب حضرت باباصاحب کی مجلس میں حاضر ہوئے اس وقت بڑے بڑے علما اور مشا حضرت کی خدمت میں دست بستہ حاضر تھے۔ حضرت باباصاحب کی نظر ملا صاحب پر پڑی تو تعظ کے لیے کھڑے ہو گئے اور بہت ہی اخلاق کے ساتھ ارشاد فرمایا۔ آئیے مُلا صاحب بہت عرصے کے بعد آنا ہوا۔ ہم تو ہمیشہ آپ کو یاد کرتے رہتے تھے۔ کہیے کیا وجہ ہوئی جو اتنے عرصے تک آپ یہاں نہیں آئے۔

مُلا صاحب نے اپنی خشک عادت کے موافق حضرت سے مصافحہ کیا اور حضرت کے قریب بڑی نخوت اور تمکن کے ساتھ بیٹھ گئے۔ حاضرین مجلس کو ملا صاحب کی یہ ادا بہت ناگوار ہوئی۔ کیوں کہ مُلا صاحب حضرت کے قریب اس طرح بیٹھے تھے گویا وہ حضرت کے ہمسر ہیں یا حضرت سے بھی زیادہ ان کا درجہ اور مرتبہ ہے، مگر حضرت باباصاحب رُعب کے سبب سب خاموش تھے اور کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ حضرت کے مہمان کو ادب سے بیٹھنے کے لیے کچھ کہتا۔

آخر حضرت باباصاحب نے مُلا صاحب سے پوچھا " ہاں مُلا صاحب آپ نے بتایا نہیں کہ اتنی مدت تک نہیں آئے تھے۔ مُلا صاحب نے نہایت غرور اور تکبر کے انداز سے جواب دیا، جناب میں اس ملک میں موجود نہ تھا کہنے گیا تھا، سات برس تک مکہ معظمہ میں رہا۔ اور سات دفعہ مدینے منورہ کی زیارت کی اور سات حج کیے۔ حرمین میں نماز اور روزوں کا جو زیادہ ثواب ملتا ہے، وہ سب میں نے حاصل کیا اور اب سات برس کے بعد وہاں سے واپس آیا واپسی میں جہاز کی تباہی کا صدمہ بھی اٹھایا، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے راستے کی مصیبتیں ختم ہوئیں اور میں بخیر تمام اپنے گھر پہنچ گیا اور سب اہل و عیال کو سلامت اور خوش و خرم دیکھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالایا۔

باباصاحب کا سوال!

حضرت باباصاحب نے ملا صاحب کا بیان سُن کر ارشاد کیا آپ بڑے خوش نصیب ہیں سات بار حج سات بار مدینہ منورہ کی زیارت کی، سات برس تک حرمین میں نمازیں پڑھیں، سات رمضانوں روزے رکھے۔ سبحان اللہ بڑی سعادتیں آپ نے حاصل کیں مگر یہ تو فرمائیے کہ آپ اب تو ہم سے خفا نہیں؟ ملا صاحب جواب دیا، میں خفا ہی کب تھا۔

حضرت نے فرمایا سات سال پہلے آپ یہاں سے ناراض ہو کر گئے تھے، میں اسی خفگی کا ذکر کر رہا ہوں۔

مُلا صاحب نے کہا مجھے یاد نہیں کیا بات ہوئی تھی، آپ یاد دلائیے شاید مجھے یاد آجائے۔

حضرت نے فرمایا ہم نے آپ سے سوال کیا تھا کہ اسلام کے رُکن کتنے ہوتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا تھا کہ پانچ رکن ہوتے ہیں، ایک کلمہ، دوسرے نماز تیسرے رمضان کے روزے۔ چوتھے زکوٰۃ۔ پانچویں کعبے کا حج۔ تو ہم نے کہا تھا کہ اسلام کا چھٹا رکن روٹی بھی ہے۔ اس سے آپ خفا ہو گئے تھے اور خفا ہو کر یہاں سے چلے گئے تھے اور قرآن کی ایک آیت پڑھی تھی کہ نصیحت کرنے کے بعد ظالموں کے پاس نہ بیٹھو۔ گویا اس طرح آپ نے ہم کو ظالم قرار دیا تھا

ہم کو اس بات کا بڑا صدمہ تھا اور ہم روزانہ آپ کو یاد کرتے رہتے تھے۔

ملا صاحب کی بیعت! یہ سن کر مولانا ہنسے اور انھوں نے کہا ہاں ہاں مجھے یاد آیا یہ ٹھیک ہے میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ درویش لوگ بے علمی اور کم علمی کے سبب ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں جو شریعت کے خلاف ہوتی ہیں۔ اسلام کے رکن تو پانچ ہی ہیں، چھٹا رکن کوئی نہیں ہے۔ حضرت نے فرمایا مولانا میں اگرچہ بے علم یا کم علم ہوں، لیکن میں نے یہ بات لکھی ہوئی دیکھی ہے کہ اسلام کا چھٹا رکن روٹی ہے۔ مولانا نے خفا ہو کر کہا، اگر لکھا ہوا دیکھا ہے تو مجھے بھی دکھا دیجیے۔ حضرت نے اپنے خادم کو آواز دی کہ میری فلاں کتاب لانا۔ خادم ایک موٹی کتاب لے کر آیا۔ حضرت نے حاضرین سے فرمایا تم میرے پاس سے ذرا دور ہٹ جاؤ۔ سب لوگ دور ہٹ گئے۔ حضرت نے مولانا کو اور قریب بلایا انھوں نے کتاب کے ورق اُلٹ اُلٹ کر کتاب کو دیکھا، مگر اس کتاب میں کوئی حرف نظر نہ آیا، سادہ ورق تھا، چاہتے تھے کہ یہ کہیں یہ ورق تو سادہ ہے، یکایک مولانا کو ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ عبارت نظر آئی جو انھوں نے پہاڑ کے کھانا کھلانے والے کو دی تھی۔ جونہی مولانا نے اپنے ہاتھ کی تحریر پڑھی ایک چیخ ماری۔ حضرت نے کتاب بند کر دی اور مولانا حضرت کے قدموں میں گر پڑے، توبہ کی اور اسی وقت بیعت کے شرف سے مشرف ہوئے اور اس دن سے سکوت اختیار کیا۔ پھر مرتے دم تک کبھی انھوں نے کسی سے بات نہ کی۔ اکثر گریہ ان پر طاری رہتا تھا۔

ایک اور قصہ حضرت شیخ العالم کے پاس ایک شخص آیا، اور اس نے اپنی مصیبت بیان کی کہ اُس کی بیوی کو ڈاکو چھین کر لے گئے ہیں اور اس وقت سے اس نے کھانا چھوڑ دیا ہے۔ حضرت نے اس سے فرمایا میں دعا کروں گا تمھاری بیوی تم کو مل جائے گی، تم کھانا نہ چھوڑو۔ چنانچہ اس نے کھانا کھا لیا اور چند روز حضرت کی خدمت میں حاضر رہا۔ ایک دن وہ حضرت کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک شخص بادشاہی آدمیوں کی حراست میں ہتھکڑیاں بیڑیاں پہنے ہوئے آیا اور اس نے حضرت سے دعا کی درخواست کی اور کہا مجھے دہلی کے بادشاہ کے پاس لے جا رہے ہیں، معلوم نہیں میرا کیا حشر ہو، اس واسطے میں ان سپاہیوں کو راضی کر کے یہاں تک پہنچا ہوں اور اب دہلی جا رہا ہوں۔ حضرت نے جواب دیا ہم دعا کریں گے، ہمارے اس مہمان کو بھی اپنے ساتھ دہلی لیتے جاؤ۔ اگر تم کو دہلی جا کر رہائی مل جائے تو ہمارے اس مہمان کو ایک لونڈی دلوا دینا۔ اس شخص نے جواب دیا بسر و چشم اس کی تعمیل کروں گا۔ چنانچہ وہ شخص حضرت کے مہمان کو لے کر دہلی گیا اور بادشاہ کے سامنے اس کی پیشی ہوئی۔ بادشاہ نے اس کو بے قصور سمجھ کر رہا کر دیا۔ رہا ہونے کے بعد اُس نے بازار سے ایک خوب صورت لونڈی خریدی اور حسب وعدہ حضرت شیخ العالم کے مہمان کو دے دی۔ مہمان نے دیکھا کہ یہ لونڈی اس کی وہی بیوی تھی جسے ڈاکو چھین کر لے گئے تھے۔

مجاہدے حضرت بابا صاحب کے مجاہدوں کے اور سیاحت کے بہت زیادہ قصے مشہور ہیں، لیکن مستند کتابوں میں ان کا ذکر درج نہیں ہے۔ البتہ اوچھ میں کنوئیں کے اندر لٹک کر جو انھوں نے چالیس رات تک صلوات معکوس پڑھی تھی اس کا ذکر

سیرالاولیا میں ہے۔

ٹھیکری کا نقش البتہ بعض پرانی کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ آپ زمانۂ سیاحت میں جنگل میں جارہے تھے اور سواری میں ایک گدھا تھا۔ یکایک بارش ہونے لگی۔ قریب میں کمہاروں کا ایک مکان دکھائی دیا۔ حضرت وہاں تشریف لے گئے اور کمہاروں سے گھر کے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ انھوں نے کہا یہاں ایک عورت کے بچہ ہونے والا ہے، کئی دن سے درد ہے' بچہ نہیں ہوتا ایسی حالت میں تم کو جگہ کہاں سے دیں۔ حضرت نے جواب دیا مجھے جگہ دے دو بچہ ابھی پیدا ہو جائے گا۔ کمہاروں نے جگہ دے دی تو حضرت نے فرمایا میرے گدھے کو بھی جگہ دو۔ کمہاروں نے کہا یہاں آدمیوں کے لیے تو جگہ ہے نہیں گدھے کو کہاں سے جگہ دیں۔ حضرت نے فرمایا جب تک میرے گدھے کو جگہ نہ دو گے میں بھی اندر نہ آؤں گا۔ آخر مجبوراً انھوں نے گدھے کو بھی جگہ دے دی۔ تب حضرت نے کمہاروں کے آوے سے ایک ٹھیکرا اٹھایا اور کوئلے سے اس پر یہ شعر لکھا ؎

مرا جائے شد، خر مرا جائے شد   تو خواہی بزائی، نہ خواہی مزا

ترجمہ: مجھے جگہ مل گئی اور میرے گدھے کو بھی جگہ مل گئی، اب اسے عورت تو چاہے بچہ جَن یا نہ جَن۔

اس کے بعد حضرت نے وہ ٹھیکری کمہاروں کو دی کہ عورت کے پیٹ پر رکھ دو۔ ٹھیکری پیٹ پر رکھتے ہی بچہ پیدا ہو گیا' حالانکہ اس شعر میں نہ خدا اور رسول کا نام تھا نہ کوئی اور متبرک عبارت تھی' بلکہ ہنسی اور طعن کا شعر تھا۔ مگر اس وقت سے آج تک کئی لوگوں نے ٹھیکری کا یہ تعویذ آزمایا ہے اور اس کی تاثیر کا عجب تماشا دیکھا ہے۔

مقبولیت بابا صاحب کے تقدس اور ان کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ وقت کے مشہور بزرگوں اور کئی باکمال اولیاء اللہ نے ان کے دست حق پر بیعت کی۔ اوچ اور ملتان کے لوگ بڑی کثرت سے ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہوتے گئے۔ شاہانِ وقت بھی ان کی عظمت کے معترف اور ان سے عقیدت رکھتے تھے۔

سلطان ناصرالدین کی عقیدت سلطان ناصرالدین محمود اپنے لشکر کے ساتھ اجودھن سے گزرا تو لشکریوں نے جس عقیدت کا اظہار کیا اس کے متعلق شیخ نظام الدین اولیاؒ لکھتے ہیں" جن دنوں سلطان ناصرالدین اوچہ اور ملتان کی طرف روانہ ہوا تو اجودھن پہنچ کر سارا لشکر شیخ کی زیارت کے لیے روانہ ہوا۔ شیخ اتنا انبوہ دیکھ کر حیران ہو گئے۔ شیخ کی آستین گلی کی طرف لٹکا دی گئی، لوگ آکر بوسہ دیتے اور چلے جاتے۔ آستین بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ پھر مسجد میں آکر مریدوں کو حکم دیا کہ میرے گرد اگرد حلقہ باندھو تاکہ کوئی شخص اندر نہ آسکے، دور ہی سے سلام کر کے چلے جائیں۔ مریدوں نے ایسا ہی کیا۔ ایک بوڑھا شخص آکر مریدوں کے حلقہ سے گزر کر شیخ کے قدموں پر گر پڑا اور پائے مبارک بوسہ دینے کے لیے کھینچا۔ شیخ کو یہ بات اچھی نہ معلوم ہوئی۔ اسی بوڑھے نے کہا شیخ الشائخ حضرت شیخ فریدالدین آپ کیوں ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اس سے بھی اچھا شکر ادا کرو۔ جب بوڑھے نے یہ کہا تو شیخ نے نعرہ مارا۔ بوڑھے کے حال پر نوازش فرمائی اور اس سے معافی مانگی"[1]

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص ۱۵۹-۱۶۰

سلطان ناصر الدین جب قدم بوسی کے بعد واپس گیا تو چار گاؤں اور بہت سا زر نقد بابا صاحب کو مرحمت کیا۔ بابا صاحب نے یہ سب مال و دولت غربا میں تقسیم کر دیا۔ چار گاؤں کی بخشش کا پروانہ یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ یہ عطیہ کسی مستحق کو دے دیں۔

سلطان بلبن کی عقیدت | شہنشاہ بلبن کو شہزادگی کے زمانے سے ہی بابا صاحب سے عقیدت تھی۔ جب وہ بادشاہ بنا تو یہ عقیدت اور بڑھ گئی۔ متعدد مرتبہ بابا صاحب کی خدمت میں قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔ ایک مرتبہ عرض کیا حضور میں خود تو کئی مرتبہ خدمت میں حاضر ہو چکا ہوں مگر بیگمات بھی قدم بوسی کی بڑی آرزو مند ہیں۔ میرے ہمراہ دہلی تشریف لے چلیں تو بڑا احسان ہو گا۔ بابا صاحب کسی طرح رضامند نہ تھے۔ مگر بلبن کے اصرار پر دہلی چلے گئے۔ جہاں آپ کا بڑا زبردست استقبال ہوا۔

بلبن کی بیٹی سے عقد | محل میں کچھ دن گزارے۔ اس اثنا میں بلبن نے اپنی بیٹی آپ کے نکاح میں دینا چاہی۔ بابا صاحب نے قبول فرمایا اور نکاح ہو گیا۔ شہزادی کو شاہانہ ٹھاٹھ باٹ کے ساتھ بابا صاحب کے گھر بھیج دیا گیا مگر بابا صاحب کی ہدایت کے بموجب شہزادی نے شاہانہ طریق زندگی ترک کر کے عام عورتوں کا لباس اور ان کا طرز زندگی اختیار کیا۔ یہ نیک خاتون بھی بابا صاحب کی طرح زاہدانہ اور درویشانہ زندگی بسر کرنے لگی۔ شہزادی کو دنیوی عیش ترک کرنے کا یہ نتیجہ ملا کہ بابا صاحب کی دوسری بیویوں کے ہوتے ہوئے ساری اولاد اسی بیوی کے بطن سے ہوئی جس کا سلسلہ آج تک قائم ہے۔

وفات | حضرت بابا صاحبؒ نے پچانوے برس کی عمر پائی۔ بڑھاپے میں آپ بے حد کمزور ہو گئے تھے۔ ایک روز بخار چڑھا، کمزوری زیادہ ہو گئی، عشاء کی نماز پڑھی مگر فراغت پاتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ اس خیال سے کہ شاید میں نے نماز نہیں پڑھی دوبارہ نماز کے لیے کھڑے ہوئے مگر حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی اور "یا حیّ یا قیوم" کا ورد کرتے ہوئے ۶۶۴ھ میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

اولاد | بابا صاحب کے پانچ صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تھیں۔ شیخ نصیر الدین نصر اللہ، شیخ بدر الدین سلیمان، شیخ شہاب الدین، خواجہ نظام الدین، شیخ یعقوب۔ یہ پانچ صاحبزادے تھے۔ صاحبزادیوں کے نام بی بی مستورہ، بی بی شریفہ اور بی بی فاطمہ ہیں۔

شیخ نصیر الدین نصر اللہ سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ مدت تک زراعت کرتے رہے۔ ان کے ایک فرزند کا نام بایزید تھا جو درویش صفت انسان تھے۔ شیخ کمال الدین جو خواجہ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ اور مالوہ کے مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ بایزیدؒ کے فرزند تھے۔

شیخ بدر الدین سلیمانؒ بابا صاحب کی وفات کے بعد ان کے جانشین بنے۔ شیخ علاؤ الدین اجودھنی جو اپنے زہد و تقدس

کی بنا پر بہت مشہور تھے اور جن کی عقیدت مندوں میں سلطان محمد تغلق بھی شامل تھا انھیں کے فرزند تھے۔ شیخ شہاب الدین اور خواجہ نظام الدین اولیاء میں بڑی محبت اور دوستی تھی۔ ان کے چھ فرزند تھے۔ خواجہ نظام الدین بابا صاحب کے فرزندوں میں انھیں سب سے زیادہ عزیز تھے۔ آپ بلبن کی فوج میں ملازم تھے۔ ان کے بیٹے کا نام خواجہ ابراہیم تھا۔

شیخ یعقوب بابا صاحب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے، جو امروہہ کے گرد و نواح میں رہتے تھے۔ ان کے دو فرزند تھے، خواجہ معزالدین اور خواجہ قاضی۔ خواجہ قاضیؒ نے دہلی میں رحلت فرمائی۔

اُمرائے پائیگاہ | حیدرآباد دکن میں اُمرائے پائیگاہ بھی حضرت بابا صاحب کی اولاد ہیں۔ گزشتہ زمانے میں حیدرآباد کی سب فوج اُن کے اختیار میں تھی اور اس کے خرچ کے لیے ان کو ایک کروڑ روپے آمدنی کی جاگیر دی گئی تھی۔ پھر اس خاندان کے تین حصے ہو گئے ایک نواب معین الدولہ مرحوم کے بیٹے نواب ظہیر یار جنگ ہیں جن کی جاگیر تیس لاکھ روپے سالانہ کی ہے۔ دوسرے نواب خورشید جاہ کی اولاد ہے جن کی جاگیر اٹھارہ لاکھ روپے سالانہ کی ہے۔ تیسرے نواب سروقار الامرا کی اولاد ہے ان کی جاگیر بھی اٹھارہ لاکھ روپے سالانہ کی ہے۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام کے شاہی خاندان کے سب لوگ سُنّی ہیں اور دانش مندی اور بصیرت دوستی سب میں پائی جاتی ہے اور اب تو حیدرآباد بھی ختم ہو گیا، اُمرائے پائیگا بھی!

خلفاء | بابا صاحب کے خلفاء میں ذیل کے بزرگ ہیں:

شیخ جمال الدین ہانسویؒ
شیخ نظام الدین اولیاءؒ
شیخ علی احمد صابرؒ
شیخ بدرالدین اسحاقؒ
شیخ عارفؒ

شیخ جمال الدین ہانسویؒ بابا صاحب کو بہت عزیز تھے۔ چنانچہ بابا صاحبؒ کئی سال تک ان کے پاس ہانسی میں مقیم رہے۔ کہا جاتا ہے کہ بابا صاحب جسے بھی خلافت عطا کرتے اس سے کہتے کہ اس خلافت نامہ پر جمال الدین سے دستخط کرالو۔ آپ کی وفات بابا صاحبؒ کی زندگی میں ہوئی۔

شیخ نظام الدین اولیاءؒ وہ مشہور و معروف بزرگ ہیں جنھوں نے چشتیہ سلسلے کو معراج تک پہنچایا۔ بابا صاحبؒ کے خلفاء میں صرف آپ ہی وہ خلیفہ ہیں جنھوں نے اپنے سلسلے کے نظام کو قائم رکھا اور آگے فروغ دیا۔

شیخ علی احمد صابرؒ کے مفصل حالات بہت کم ملتے ہیں جس سے ان کے کام کی نوعیت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔

شیخ بدرالدین اسحاقؒ بابا صاحب کے خلیفہ ہونے کے علاوہ ان کے داماد بھی تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کو ان سے بہت عقیدت تھی۔ عبادت و ریاضت کا یہ عالم تھا کہ خوفِ الٰہی سے آنکھیں ہمیشہ پُرنم رہتی تھیں۔ آپ کے دو فرزند تھے

م اور خواجہ محمد موسیٰ۔ شیخ بدر الدین کی وفات کے بعد ان کی اہلیہ اور دونوں صاحبزادے خواجہ نظام الدین اولیاؒ
ی چلے گئے اور دونوں لڑکوں کی تربیت خود کی۔ پھر نظام الدین اولیاؒ نے خواجہ محمد امام کو خلافت عطا فرمائی۔
و| حضرت بابا صاحبؒ سے چشتیہ خاندان کے تین سلسلے جاری ہوئے ہیں: ایک نظامیہ دوسرا صابریہ
۔ جمالیہ سلسلہ نظامیوں میں مدغم (شامل) ہوگیا ہے کیوں کہ بابا صاحبؒ کے خلیفہ اول حضرت مخدوم
ہانسویؒ کے جانشین ان کے پوتے حضرت مولانا قطب الدین منور کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیا سے خلافت
ریہ خاندان حضرت مخدوم علاؤ الدین علی احمد صابرؒ سے جاری ہوا، جو حضرت بابا صاحب کے بھانجے تھے اور
یر شریف میں ہے جو رڑکی سہارن پور کے علاقے میں ہے۔
فات کے وقت بابا صاحب نے وصیت فرمائی تھی کہ میرا خرقہ، عصا، کھڑاویں اور دوسرے تبرکات نظام الدین
جائیں وہی میری قبر بھی بنائیں گے۔ چنانچہ بابا صاحب کی نعش امانت کے طور پر دفن کی گئی۔ جب نظام الدین
ن آئے تو یہ امانتیں حاصل کیں اور حضرت کو وہاں دفن کیا جہاں آج کل ان کا مزار ہے۔ ایک چھوٹا سا قبہ
شرق اور جنوب کی طرف دروازے رکھے گئے۔
مرت کے مزار کے قریب حضرت کے پوتے شیخ علاؤ الدین کا مزار ہے جس پر عالیشان گنبد ہے۔ گنبد کے
ن تمام سجادہ نشینوں کے مزار ہیں جو اب تک بابا صاحب کی گدی پر بیٹھتے رہے۔
ازہ| کہا جاتا ہے کہ جب حضرت نظام الدین اولیاء نے مزار تعمیر کرایا تو ایک روز آپ جنوبی دروازہ کے
تھے کہ اچانک فرطِ جوش میں پکار اٹھے "حضور نبی کریمؐ تشریف لائے اور فرماتے ہیں جو اس دروازے میں
ات پائے گا۔"
واقعے کے بعد سے صرف شرقی دروازہ زائرین کے لیے کھلا رکھا گیا۔ جنوبی دروازہ جسے "بہشتی دروازے" کا
، بند کر دیا گیا۔ صرف عرس کے موقعہ پر یعنی ۵ محرم کی شام کو اسے کھولا جاتا ہے اور لوگ اس میں سے گزرتے ہیں
ادات| حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے چند چیدہ چیدہ اقوال وارشادات یہ ہیں:
ی اپنے ظاہر سے واقفیت رکھتے ہو اس سے زیادہ اپنے باطن سے آگاہ رہو۔
ن کو نیک مشورہ سے شکست دو اور دوست کو تواضع سے اپنا گرویدہ بنالو۔
ن کو خود اپنے نفس کا معالج ہونا چاہیے۔
ہل عشق ہیں اور علما اہل عقل، لیکن کامل وہی ہیں جن میں یہ دونوں چیزیں ہوں۔
عاملہ صرف خدا کے ساتھ رکھو اس لیے کہ سب لیتے ہیں اور وہ دیتا ہے اور جو وہ دیتا ہے اسے کوئی نہیں لے سکتا
نی کا کوئی مقام ایسا نہیں جو خوف اور امید سے خالی ہو۔

—— دنیا خدا اور بندے کے درمیان سب سے بڑا حجاب ہے۔

—— اپنے سے بھاگنا خدا سے ملنا ہے۔

—— دل کو خدا کے خوف سے زندہ کرو۔

—— فقیر کے لیے سب سے مضر شے دولت مند کی صحبت ہے۔

—— ہر کسی کا کھانا نہ کھاؤ بلکہ ہر کسی کو کھلاؤ۔

—— دشمن خواہ تم سے خوش نظر آئے، مگر اس سے بے خوف مت ہو۔

—— دیتے وقت اپنی ذات کو درمیان سے ہٹا دو اور اپنے اوپر نظر نہ رکھو۔

—— قیاس پر گفتگو نہ کرنی چاہیے اور دل کو شیطان کا کھلونا نہ بنانا چاہیے۔

—— عدل و انصاف ہی میں عزت پوشیدہ ہے۔

—— آسودگی کی خواہش ہو تو حسد سے دور رہو۔

—— درویشی پردہ پوشی کا نام ہے اور درویش کو ان چار چیزوں سے بچنا چاہیے، اول لوگوں کے عیب نہ دیکھے، جو باتیں سننے کے لائق نہیں انھیں نہ سنے، جو کہنے کے لائق نہیں وہ نہ کہے اور جہاں جانا مناسب نہ ہو وہاں نہ جائے۔

—— جب لوگ کھانا کھائیں تو انھیں لازم ہے کہ طاعت بھی کر دکھائیں کیونکہ طاعت کے لیے کھانا بھی طاعت ہے، اور محض ہوائے نفس کے لیے کھانا نہیں چاہیے۔

—— اگر لوگوں کو علم کی قدر و قیمت کا پتہ چل جائے تو سارے کام چھوڑ کر علم کے پیچھے لگ جائیں۔

—— مومنوں کا دل پاک زمین کی طرح ہے، اگر اس میں محبت کا بیج بویا جائے تو قسم قسم کی نعمتیں پیدا ہوتی ہیں۔

—— جب تک تو سانپ کی طرح کینچلی نہ اتارے، محبت حق کے دعوے میں صادق نہیں ہو سکتا۔

—— انسان جو کچھ بھی کرے یہی سمجھے کہ یہ سب خدا کی مرضی سے ہو رہا ہے اور اس کی اپنی ذات درمیان میں نہیں۔

—— خرقہ پہن لینا آسان ہے مگر اس کا حق ادا کرنا مشکل ہے اور صرف خرقہ پہن لینے سے ہی نجات حاصل ہو سکتی تو سب لوگ خرقہ پہن لیتے۔

—— اہل توکل پر ایسی گھڑی بھی آتی ہے کہ جب انھیں آگ میں ڈالا جائے یا زخمی کیا جائے تو انھیں اس کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔

—— جو شخص خدا سے جتنا غافل ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ دنیا میں مبتلا ہوگا۔

—— جو شخص ہمیشہ موت کو یاد رکھتا ہے، خدا ہمیشہ اس سے خوش رہتا ہے۔

—— درد و مصیبت عاشقوں کی خوراک ہے، جس دن ان پر کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی اس دن انھیں فکر

لاحق ہو جاتی ہے کہ آج دوست نے یاد نہیں کیا۔ اور جب دوبارہ مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو شکر ادا کرتے ہیں کہ دوست نے یاد فرمایا۔

——— فقیر جب جامہ پہنے تو یہ نہ سمجھے کہ جامہ پہنا ہے بلکہ یہ سمجھے کہ کفن پہنا ہے۔

——— آتش عشق وہ آگ ہے جو درویش کے دل ہی میں قرار حاصل کر سکتی ہے۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکی رح

ولادت ——————— اوش (ترکستان) ۵۸۳ھ

وفات ——————— دہلی ۶۳۳ھ

قطب الاقطاب، پیشوائے اصحاب، مجاہد، فخرِ سلاسل درویشی، کشتۂ خنجرِ تسلیم و رضا خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس سرہ العزیز اقطاب عالم اور نوادر زمانہ میں سے تھے۔ معین الملت والدین خواجہ معین الدین چشتی رح کے مرید خاص و خلیفۂ اکبر اور بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رح کے پیر و مرشد تھے۔

نام و نسب | حضرت خواجہ قطب الدین کا اصل نام بختیار اور قطب الدین لقب تھا۔ عرفِ عام میں خواجہ کاکی کہلاتے تھے۔ حسینی سادات میں سے ہیں۔ سلسلۂ نسب اس طرح بیان کیا جاتا ہے:

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح بن سید کمال الدین بن سید موسیٰ بن سید احمد اوشی بن سید کمال الدین بن سید محمد بن سید احمد بن سید رضی الدین بن سید حسام الدین بن سید رشید الدین بن سید جعفر بن حضرت نقی الوجود بن علی موسیٰ رضا علیہ السلام بن موسیٰ کاظم علیہ السلام بن حضرت جعفر صادق علیہ السلام بن محمد باقر علیہ السلام بن زین العابدین علیہ السلام بن حضرت سیدنا امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام[1]

تعلیم و تربیت | عمر مبارک دو سال سے کم تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ محترمہ نے بڑی محنت سے تربیت کیا۔ پانچ سال کی عمر میں مولانا ابو حفص سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ مولانا نے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل اور سلوک کے آداب طرق سکھائے۔ سیکھنے میں بہت محنت سے کام لیا۔ جب خواجہ معین الدین چشتی رح اوش میں تشریف لائے تو ان سے بیعت کی اور سترہ سال کی عمر میں انھیں سے خرقۂ خلافت بھی حاصل کر لیا[2]۔

عبادت و ریاضت | زہد و ریاضت کی عادت بچپن ہی میں شروع ہو چکی تھی۔ خواجہ اجمیری سے بیعت کرنے کے بعد عبادت

---

[1] سیر الاقطاب، ص ۱۴۳ و خزینۃ الاصفیا ص ۲۶۷

[2] سیر الاقطاب میں لکھا ہے کہ جب خواجہ صاحب اوش سے بغداد گئے اور وہاں ابو اللیث سمرقندی کی مسجد میں فروکش ہوئے تو وہیں خواجہ اجمیری رح سے شرف ملاقات حاصل ہوا اور ان سے بیعت کر لی۔ اس موقعہ پر شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ اوحد الدین کرمانی، شیخ برہان الدین چشتی اور شیخ محمد اصفہانی بھی موجود تھے۔

میں اور زیادہ انہماک ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ رات دن میں قریباً سو رکعت نماز ادا کیا کرتے تھے اور ہر رات تین ہزار مرتبہ درود شریف کا ورد کیا کرتے تھے۔

اس سلسلے میں ایک مشہور واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ شادی کی ابتدائی تین راتوں میں درود شریف کا ناغہ ہوگیا۔ چنانچہ رئیس احمد نام ایک دیندار شخص کو خواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بختیار سے دریافت کریں کہ تین دن سے ہمیں ان کی طرف سے تحفہ (درود) نہیں پہنچا۔ جب یہ پیغام خواجہ صاحب تک پہنچا تو بے تاب ہو گئے۔ اُسی وقت بیوی کو طلاق دے کر رخصت کیا اور دنیاوی علائق سے بالکل الگ ہو گئے۔

مشائخ سے ملاقاتیں خواجہ صاحب نے اپنے ملفوظات میں اپنی سیاحت کا حال لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب آپ غزنی گئے تو وہاں ایک بزرگ سے ملے۔ ان کی خانقاہ میں روزانہ کئی فتوحات آتیں اگر صبح کو جو کچھ آتا وہ غریبوں کو دے دلا کر شام تک ختم کر دیا جاتا اور جو رات کو آتا وہ رات ہی میں تقسیم کر دیا جاتا۔ یہ بزرگ اپنے پاس کچھ نہ رکھتے تھے۔ بڑے صاحب نعمت بزرگ تھے۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ بزرگ خود فرماتے تھے کہ میں نے چالیس سال تک مجاہدہ کیا مگر کچھ نہ ہوا۔ پھر سونا، بولنا، کھانا اور لوگوں سے ملنا کم کر دیا تو مجھے روشنی نظر آئی اور اب عرش اور حجابِ عظمت تک کی چیزیں مجھے نظر آنے لگی ہیں۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ سے فیض یاب ہونے کے بعد آپ بغداد تشریف لے گئے اور وہاں متعدد بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کے ہم نشین رہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ اوحد الدین کرمانی سے بھی وہیں استفادہ کیا۔ آپ اپنے ملفوظات میں لکھتے ہیں کہ شیخ شہاب الدین سہروردی واقعی بہت بڑے بزرگ اور عابد و زاہد ہیں۔

خواجہ صاحب نے خواجہ ابو یوسف چشتیؒ سے بھی ملاقات کی۔ اس ملاقات کا حال بھی اپنے ملفوظات میں بیان کیا ہے۔

ہندوستان میں آمد! بیان کیا جاتا ہے کہ سیاحت کے دوران جب آپ بغداد میں تھے آپ کو خبر ملی کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ خراسان سے ہندوستان جا رہے ہیں۔ چنانچہ آپ بھی ہندوستان کی طرف چل پڑے۔ بعض لکھتے ہیں کہ آپ پیر و مرشد کی معیت میں ہندوستان تشریف لائے پھر مرشد نے اجمیر سے دہلی جانے کا حکم دیا۔

ورودِ دہلی! دہلی کے سفر میں آپ ملتان پہنچے اور یہاں کے مشہور شیخ حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ سے ملاقات کی۔ وہ خواجہ صاحب سے بڑی شفقت سے ملے۔ خواجہ صاحب نے کچھ دن وہاں قیام فرمایا۔ بزمِ صوفیہ میں لکھا ہے کہ اسی اثنا میں مغلوں نے ہندوستان پر یورش کی تو ملتان کا حاکم قباچہ حضرت قطب صاحب سے فیوض و برکات کا طلبگار ہوا اور کہا جاتا ہے کہ انھیں کی کرامت سے مغل شکست کھا کر فرار ہوئے۔ ملتان سے وہ دہلی آئے اور دہلی کے قریب پہنچے تو

سیر الاقطاب، ص ۱۳۹، سیر العارفین ص ۴۹

سلطان شمس الدین التمش نے خدم وحشم کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور ان کے قیام کا انتظام شہر کے اندر کرنا چاہا، لیکن انھوں نے کیلوکھری میں سکونت پسند کی۔ سلطان التمش ہفتہ میں دوبار ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے فیوض و برکات سے مستفیض ہوتا تھا۔ آخر میں سلطان التمش نے عرض کی کہ شہر سے اتنی دور آنے میں سلطنت کے کاروبار میں خلل پڑتا ہے تو مجبوراً وہ شہر دہلی کے اندر فروکش ہونے پر راضی ہو گئے اور ملک عزیز الدین کی مسجد میں قیام فرمایا[1]۔

شیخ الاسلام جمال الدین بسطامی کی وفات کے بعد التمش نے حضرت قطب صاحب کو ان کی جگہ پر مامور کرنا چاہا لیکن جب انھوں نے انکار کیا تو شیخ نجم الدین صغریٰ کو اس عہدہ پر مامور کیا گیا۔ شیخ نجم الدین صغریٰ حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ کے مرید تھے اور برگزیدہ بزرگوں میں شمار کیے جاتے تھے، لیکن حضرت خواجہ قطب الدین کی مقبولیت سے ان کے دل میں رشک وحسد کی آگ بھڑک اٹھی۔

دہلی سے حضرت قطب صاحب نے حضرت خواجہ بزرگ کی خدمت میں شوق ملاقات، اور اشتیاق قدم بوسی کا عریضہ ارسال کیا۔ خواجہ صاحب اپنے مہجور مرید کی آتش شوق بجھانے کے لیے خود دہلی تشریف لائے اور یہاں کے تمام خواص وعوام اور مشائخ کبار ان کے دیدار سے مشرف ہونے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، مگر دہلی کے شیخ الاسلام شیخ نجم الدین صغریٰ نہیں آئے تو خواجہ صاحب خود ان سے ملنے کے لیے گئے۔ انھوں نے شکایت کی کہ قطب صاحب کے ساتھ لوگوں کی گرویدگی اور فریفتگی کی وجہ سے ان کا وقار اور دبدبہ معرض خطر میں آگیا ہے۔ شیخ الاسلام کی خاطر حضرت خواجہ صاحب نے قطب صاحب کو دہلی چھوڑ کر اپنے ساتھ اجمیر چلنے کا حکم دیا۔ التمش نے بڑی منت وزاری کی، لیکن حضرت خواجہ صاحب نے اس کی بات نہ مانی اور قطب صاحب کو لے کر روانہ ہو گئے۔

دہلی کے باشندوں نے قطب صاحب کو جاتے دیکھا تو عاشق زار کی طرح آہ وبکا کرنے لگے۔ جس جگہ قطب صاحب قدم رکھتے تھے وہاں کی خاک اٹھا کر تبرکاً آنکھوں سے لگاتے تھے۔ خواجہ صاحب نے دہلی والوں کو قطب صاحب پر ایسا شیفتہ اور فریفتہ پایا تو ارشاد فرمایا کہ" بابا قطب الدین تم یہیں رہو تمھارے چلے جانے سے دہلی کے لوگوں کا دل خراب وکباب ہوتا ہے مجھ کو یہ منظور نہیں، چنانچہ آخر وقت تک وہ دہلی ہی میں مقیم رہے[2]۔

مرشد کی وفات سے قبل خواجہ صاحب دہلی سے اجمیر گئے اور شرف ملاقات حاصل کیا۔

قطب صاحب اور التمش! التمش کو خواجہ صاحب سے جو عقیدت تھی اس کا شاہی دربار پر بہت اچھا اثر پڑا اور ملک بھی اس اثر سے محروم نہ رہا کیوں کہ خواجہ صاحب بادشاہ کو اپنی رعایا، فقرا اور درویشوں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کرتے رہتے تھے، التمش اس پر کاربند رہتا تھا۔ التمش خود بھی بڑا عابد وزاہد تھا۔ نماز روزے کا سختی سے پابند تھا۔

---

[1] سیر الاقطاب (اردو ترجمہ) ص ۱۹۴، ۱۹۵ [2] سیر الاولیا ص ۵۴، ۵۵

اسلام کے ارکان ہمیشہ بجا لاتا رہا۔ بادشاہ ہونے کے باوجود اپنے بیشتر کام خود کرتا تھا اور نوکروں کو تکلیف نہ دیتا تھا۔ رات کو بھیس بدل کر رعایا کی تکالیف معلوم کرتا اور ان کا ازالہ کرتا۔ غربا اور حاجت مندوں کو مالی مدد دیتا۔ عدل و انصاف کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتا۔ التمش کی اس نیک نفسی کے باعث لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ خواجہ صاحب اپنے ملفوظات میں لکھتے ہیں کہ ایک رات بادشاہ میرے پاس آیا اور میرے پاؤں پکڑ لیے۔ میں نے پوچھا۔ مجھے کب تک تکلیف دیتے رہو گے، جو ضرورت ہو بیان کرو۔ کہنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بادشاہی دی ہے لیکن قیامت کے روز جب مجھ سے اس کی بازپرس ہوگی اور اس کا حساب مانگا جائے گا تو اس وقت بھی آپ مجھے نہ چھوڑیں۔ وہ اس وقت تک واپس نہ گیا، جب تک میں نے اس کی بات قبول نہ کر لی[1]

استغنا اور صبر و تحمل | بادشاہ کی اس قدر ارادت کے باوجود خود خواجہ صاحب کے گھر میں ہمیشہ فقر و فاقہ ہی ہوتا۔ کے اہل خانہ بھی عسرت سے زندگی بسر کرتے تھے بعض اوقات پڑوسیوں سے قرض لے کر گزارا کرنا پڑتا۔ اس ناداری پر بھی جود و سخا کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ لنگر میں آتا فوراً دوسروں میں تقسیم کر دیتے۔

ایک مرتبہ شاہی حاجب اختیار الدین ایبک خدمت میں آیا اور کچھ گاؤں آپ کے لیے وقف کرنے کی خواہش ظاہر کی مگر آپ نے اُسے ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔ التمش کے وزیر نے بھی ایک مرتبہ اسی قسم کی خواہش کا اظہار کیا، مگر آپ نے فرمایا ہمارے خواجگان نے کسی سے گاؤں قبول کیے ہوتے تو ہم بھی قبول کر لیتے۔ اگر ہم یہ گاؤں لے لیں تو قیامت کے دن اپنے خواجگان کو کیا منہ دکھائیں گے۔

سماع | آپ کو سماع سے بہت رغبت تھی۔ اکثر سماع کی مجلسیں منعقد کرایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی آپ قاضی حمید الدین ناگوری کے یہاں ایسی مجلسیں منعقد کراتے۔ ایک روز سماع کی ایک مجلس میں یہ شعر پڑھا گیا ؎

سرود چیست کہ چندیں فسونِ عشق در وست　　　　سرود محرم عشق است و عشق محرم اوست

خواجہ صاحب پر اس شعر نے عجیب کیفیت پیدا کر دی۔ سات دن رات تک بے ہوش رہے۔ نماز کے وقت ہوش آ جاتا اور نماز ادا کرنے کے بعد پھر وہی کیفیت طاری ہو جاتی۔ سماع ہی کے باعث وصال ہوا۔

وفات | وصال کی کیفیت یہ تھی کہ ایک مرتبہ شیخ علی سجستانی کی خانقاہ میں محفل سماع منعقد تھی۔ خواجہ صاحب اس میں موجود تھے۔ قوالوں نے شیخ احمد جام کا قصیدہ سنایا۔ جب یہ شعر پڑھا ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را　　　　ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

خواجہ صاحب پر یہ شعر سنتے ہی وجد طاری ہو گیا اور تڑپنے لگے۔ اسی حالت میں شیخ حمید الدین ناگوری اور مولانا بدرالدین غزنوی انھیں گھر تک لے گئے۔ تین دن اور تین رات وجد کی حالت طاری رہی، نماز کے وقت ہوش آ جاتا تو وضو

---

[1] فوائد السالکین ۲۹

کرکے نماز ادا کرتے، پھر اسی عالم میں چلے جاتے، یہاں تک کہ وفات پا گئے۔
وفات کے وقت سر مبارک خواجہ حمید الدین ناگوریؒ کے زانو پر تھا اور پاؤں شیخ بدرالدین غزنوی کی آغوش میں سلطان التمش نے نماز جنازہ پڑھائی۔ وفات سے کچھ دن قبل عید کی نماز سے فارغ ہو کر گھر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں ایک مقام پر ٹھہر گئے، فرمایا یہاں سے عشق کی بو آتی ہے۔ چنانچہ وہ زمین آپ نے خرید لی، اسی خطۂ زمین پر آپ کا روضۂ مقدس تعمیر ہوا۔

تصانیف | آپ کی طرف دو کتابیں منسوب کی جاتی ہیں، ایک دیوان ہے اور دوسری کتاب کا نام فوائد السالکین ہے۔ موخر الذکر کتاب میں آپ کی سات مجلسوں کے ملفوظات ہیں جنھیں حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ نے جمع کیا ہے اس میں سالک کے لیے تمام ضروری باتیں درج ہیں۔

اس کتاب سے آپ کی جن تعلیمات کا پتہ چلتا ہے وہ یہ ہیں کہ سالک کو پیٹ بھر کر نہیں کھانا چاہیے، بلکہ صرف عبادت کی قوت قائم رکھنے کے لیے ضرورت کے مطابق کھایا جائے۔ دکھاوے کے لیے لباس پہننے والا راہِ سلوک کا رہزن ہے۔ کم بولنا، کم سونا، آرائش دنیوی سے پاک رہنا ہر سالک کے لیے لازم ہے۔ پھر فرماتے ہیں سالک کو ہر وقت محبت الٰہی میں غرق رہنا چاہیے سکر میں اس کی حالت ایسی ہو کہ اس کے سینہ میں زمین و آسمان بھی داخل ہو جائیں تو اسے خبر نہ ہو۔ جو کچھ دوست کی جانب سے ملے اُسے نعمت غیر مترقبہ جان کر لے لینا چاہیے۔

خواجہ صاحب نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ اسرار الٰہی پوشیدہ رکھے جائیں۔ فرمایا راہ سلوک میں حوصلہ وسیع ہونا چاہیے تاکہ اسرار فاش نہ ہونے پائیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ بیس مدت تک اپنے پیر و مرشد کی صحبت میں رہا مگر کبھی اسرار الٰہی فاش نہیں ہونے دیے۔ یہ بھی فرمایا کہ سالک کے لیے شریعت کی پابندی از بس ضروری ہے، خواہ وہ سکر یا کسی بھی حالت میں ہو۔

خلفاء | آپ کے خلفا بہت سے ہیں، جو مختلف مقامات پر رشد و ہدایت کی مسند پر جلوہ افروز ہوئے اور لوگوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت کو سدھارنے کا کار عظیم انجام دیا۔ حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے بنگال میں رہ کر بہت سے غیر مسلموں کو حلقہ بگوش اسلام کیا، مسجد تعمیر کرائی اور خانقاہ قائم کرکے وسیع پیمانے پر اسلام کی نشر و اشاعت کی۔ خلفاء کے نام یہ ہیں:

شیخ فریدالدین گنج شکرؒ (پاک پٹن)	شیخ احمد نامی
شیخ بدرالدین غزنوی (دہلی)	شیخ حسین
شیخ برہان الدین بلخی	شیخ فیروز
شیخ ضیاء الدین رومی (دہلی)	شیخ بدرالدین موتاب (دہلی)
شمس الدین التمش (دہلی)	شاہ خضر قلندر
شیخ بابا سنجری بحر دریا (دہلی)	شیخ نجم الدین قلندر
مولانا فخر الدین صحرائی	شیخ سعدالدین

شیخ محمود بہاری
مولانا محمد حاجزی
سلطان نصیرالدین غازی
قاضی حمیدالدین ناگوری (دہلی)
مولانا شیخ محمد

شیخ صوفی بدھن
شیخ جلال الدین ابوالقاسم تبریزی
شیخ نظام الدین ابوالموید (دہلی)
شیخ تاج الدین منور اوشی
مولانا سعید

قاضی حمیدالدین ناگوری خواجہ صاحب نے اپنے ملفوظات "فوائد السالکین" میں حضرت حمیدالدین ناگوری کو اپنے "یارِ غار" کے نام سے یاد کیا ہے۔ سیرالاقطاب میں لکھا ہے کہ حضرت حمیدالدین خواجہ صاحب کے استاد تھے اور خواجہ صاحب نے انھیں سے علوم ظاہری کی تعلیم حاصل کی تھی۔

حضرت حمیدالدین ناگوری کا اصلی نام محمد تھا۔ آپ نے پہلے شہاب الدین سہروردی سے شرف بیعت کیا پھر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے گہرے مراسم ہوگئے اور کئی سفروں میں ان کے ساتھ رہے۔ خواجہ صاحب کی اجازت سے مدینہ منوّرہ گئے۔ وہاں سال سے زیادہ عرصہ تک روضۂ نبوی کے مجاور رہے۔ وہاں سے مکہ معظمہ گئے تین سال تک وہاں رہے۔ پھر التمش کے زمانہ میں آئے اور خواجہ صاحب کے ساتھ رہنے لگے۔ وفات کے بعد خواجہ صاحب کے پہلو میں دفن ہوئے۔

قطب الاقطابؒ کا آستانہ عالیہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مزار اقدس جامع مسجد دہلی سے گیارہ میل دور پرانی دہلی میں قصبہ مہرولی (جہاں قطب مینار ہے) میں واقع ہے۔ یہ قصبہ عام طور پر قطب صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں بہت سے اولیاء اللہ دفن ہیں یہ جگہ دہلی کی سب سے قدیم زیارت گاہ ہے، جہاں لوگ سیر و تفریح کے لیے جاتے ہیں۔ برسات کے دنوں میں یہاں زائرین کی خاصی چہل پہل ہوتی ہے۔

خواجہ صاحب کا مزار کھلا ہوا اور کچا ہے۔ بہت چوڑا چکلا ہے۔ اس کے چاروں طرف نواب خورشید جاہ حیدرآبادی کا بنوایا ہوا سنگِ مرمر کا جالی دار کٹہرا لگا ہوا ہے۔ جسے ۱۹۴۷ء کے قتل عام میں ہندوؤں نے غارت کر دیا، پھر گاندھی جی کی مداخلت سے دوبارہ بنا۔ مزار ہموار نہیں ہے، اس میں اونچے نیچے نشانات ہیں اور کہا جاتا ہے کہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ نے خود مٹی کی ٹوکریاں یہاں ڈالی تھیں اور اس مٹی کو ہموار نہیں کیا تھا۔

اس مزار کے غرب میں ایک اونچی دیوار ہے جس پر رنگین پھولدار چینی لگی ہوئی ہے یہ دیوار حضرت کے زمانے کی ہے کیونکہ شیرشاہ سوری کے زمانے میں ایسی چینی استعمال نہیں ہوتی تھی جس نے یہاں عمارات بنوائی تھیں۔

حضرت کے مزار کے چاروں طرف بہت بڑا صحن ہے اور وہاں بے شمار چھوٹی چھوٹی قبروں کے نشان ہیں اور حضرت کے سرہانے گوشۂ غرب اور شمال میں ایک بڑا مزار ہے اور اس کے پاس بھی پرانے زمانے کی چینی کی ایک محراب ہے حضرت کے مزار کے بائیں ایک اونچا چبوترہ ہے جس پر حضرت قاضی حمیدالدین ناگوریؒ کا مزار ہے۔ سیرالاولیا سے معلوم ہوتا ہے کہ

ضرت قاضی حمیدالدین ناگوریؒ نے وصیت فرمائی تھی کہ ان کو حضرت خواجہ صاحبؒ کے پائیں دفن کیا جائے مگر قاضی صاحب
ے لڑکے اُس کو باپ کی توہین سمجھتے تھے، اس واسطے انھوں نے حضرت کے پائیں ایک اونچا چبوترہ بنایا اور اس کے اوپر
ضرت قاضی صاحب کو دفن کیا۔ سیرالاولیا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت قاضی صاحب نے اپنے لڑکوں سے خواب
ں فرمایا تم نے مجھے اونچے چبوترے پر دفن کر کے حضرت کے سامنے شرمندہ کر دیا۔

حضرت کے مزار کے شرق اور گوشۂ جنوب کی طرف سنگ مرمر کی جالیاں اور دروازہ مغل شہنشاہ فرخ سیر نے بنوایا تھا
جالیوں کے باہر مشرق کی طرف حضرت کی پرانی مسجد کی غربی دیوار کے نیچے حضرت مولانا فخرالدین چشتی نظامی مجدد سلسلہ
امیہ کا مزار ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد بھی حضرت کے زمانے کی ہے۔ اس مسجد کا صحن بہت چھوٹا تھا کیوں کہ پرانے زمانے
ے حجرے وہاں بنے ہوئے تھے اور وہ حجرے ہٹا کر صحن بڑا کر دیا گیا ہے اور گوشۂ شرق و جنوب میں جو ایک بڑی باؤلی
لوں کے زمانے میں بنائی گئی تھی اب اس کو بھی پاٹ کر مسافروں کے لیے مکانات بنا دیے ہیں اور ان مکانوں کی چھت مسجد
صحن کا کام دیتی ہے۔ مسجد کے جنوب میں درگاہ کا مجلس خانہ ہے جہاں قوالی ہوتی ہے اور مجلس خانے کے شمالی صحن میں چند
رات ہیں جن میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے دادا حکیم محمد شریف خاں کا مزار بھی ہے اور حضرت مولانا فخرالدین کی اولاد میاں
ب الدین صاحب اور میاں نصیر الدین کالے صاحب وغیرہ کے مزارات بھی ہیں۔

حضرت کے مزار شریف کے غرب میں چینی کی دیوار کے باہر مغلوں کی بنوائی ہوئی سنگ مرمر کی موتی مسجد ہے اور اس کے
رب میں شہنشاہ عالم اور شہنشاہ اکبر ثانی کی قبریں ہیں اور ان قبروں کے غرب میں باہر نکل کر آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ کا
ایا ہوا شاندار محل ہے جس کو مغلوں کی آخری عمارت کہنا چاہیے، کیونکہ اس کے بعد انھوں نے کوئی عمارت نہیں بنوائی۔

یہاں پرانے زمانے کی متبرک یادگاروں میں اولیا مسجد، حوض شمسی، اور بے شمار مسجدیں اور قبرستان ہیں۔

حضرت کی اولاد میں اب کوئی باقی نہیں ہے۔ اس درگاہ میں جتنے لوگ ہیں وہ یا خدام ہیں یا قاضی زادگان ہیں اُن
ں بھی حضرتؒ کے وقت سے آج تک کوئی شخص ایسا سننے میں نہیں آیا نہ کسی کتاب میں اس کا ذکر دیکھا، جس نے
ضرت کے روحانی مشن کو ترقی دینے کی کوشش کی ہو۔

مغل حکومت کے زوال کے عقلی اسباب بے شمار ہیں، مگر روحانی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے بعد سے
ب مغلوں نے عیاشی پر کمر باندھ لی تو اس مقدس مقام کو اپنی عیاشیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔ برسات کے موسم میں وہ اپنے عیش
نوں کو ساتھ لے کر یہاں آتے تھے اور شرمناک عیاشیاں کرتے تھے، انھوں نے حوض شمسی سے پانی کی ایک موری نکالی تھی
ر پہاڑوں میں ایک جھرنا بنایا تھا، جہاں آموں کے درخت ہیں وہاں اُن کی عورتیں جھولے ڈالتی تھیں اور عیش کرتی تھیں
لوں نے پرانے مقبروں اور مسجدوں کی عزت اور حرمت اور حفاظت کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا اور وہ ان مقدس مزارات
ر پاک مقبروں اور پاک مسجدوں کے اندر برسات میں رہ کر عیش و عشرت کرتے تھے۔ انھوں نے دلی کے ہندو مسلمانوں

کے لیے بھی ایک میلا مقرر کیا تھا جو برسات کے موسم میں ہوتا تھا، اور جس کو پھول والوں کی سیر کہتے تھے اور جواب بھی ہوتا ہے۔
الغرض مغلوں کی ان بے ادبیوں اور گستاخیوں اور عیاشیوں نے ان کو بھی تباہ کر دیا اور ان کی سلطنت بھی برباد کر دی۔
سلطان علاؤالدین خلجی اور سلطان قطب الدین خلجی کے عالی شان مقبرے قطب مینار کے غرب میں تھے ان کو توڑ کر ان کا سفید پتھر اودھ کے نوابوں کے مورث اعلیٰ منصور علی خاں، صفدر جنگ کے مقبرے میں لگا دیا گیا اور خلجیوں کی قبریں بالکل نیست و نابود کر دی گئیں، جن کو لارڈ کرزن کے زمانے میں بنوایا گیا۔

حضرت خواجہ صاحب قطب صاحبؒ کے رہنے کا مکان حویلیوں کے نام سے اب بھی موجود ہے قطب مینار سے شرق میں قلعہ تغلق آباد کی طرف جاتے ہوئے لب سڑک دائیں ہاتھ کو یہ حویلی موجود ہے، تا بوتی چھتوں کی دو تین کوٹھریاں ہیں اور کوئی عمارت وہاں نہیں ہے۔

اس درگاہ کے اطراف میں میلوں تک ہزاروں لاکھوں قبریں ہیں۔ قلعہ لال کوٹ کے غرب میں شمس الدین التمش کی بنائی ہوئی پُرانی عیدگاہ بھی ہے اور حوض شمسی کے کنارے بہت سی پرانی خانقاہوں کی عمارتیں کھنڈروں کی صورت میں پڑی ہیں اور اس حوض کے کنارے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا مزار بھی ہے۔

حضرت کے نام کے ساتھ کاکی کا لفظ شروع سے استعمال ہوتا آرہا ہے۔ تاریخوں میں اس کی بہت سی وجوہ بیان کی گئی ہیں، لیکن کاکی لفظ کی یادگار اب بھی موجود ہے۔ یعنی حضرت کی درگاہ سے جو تبرک تقسیم ہوتا ہے اس کو کاک کہتے ہیں۔ یہ تین انچ کی ایک گول آٹے کی پکی ہوئی ٹکیہ ہوتی ہے، جس کے چاروں طرف پاؤ یا آدھ انچ اونچے کنارے ہوتے ہیں۔ یہ کاک تنوروں میں پکائے جاتے ہیں۔ معمولی قسم کے کاک آٹے میں نمک ڈال کر پکاتے ہیں اور بڑھیا قسموں میں گھی، روغن اس بھی ملاتے ہیں اور ان کاکوں کے اوپر حلوہ بھی رکھا جاتا ہے۔ پُرانے زمانے کی روٹیوں میں یا غذاؤں میں کاک بھی ایک قسم کی غذا تھی یا ایک قسم کی روٹی تھی، جس کا ذکر تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ پس حضرت کے نام کے ساتھ کاکی کا استعمال ممکن ہے اس وجہ سے ہوا ہو کہ حضرت اس قسم کی روٹی مسافروں اور فقیروں کو تقسیم کرتے ہوں گے۔

چند اقوال و ارشادات قطب صاحب کے چند نادر اقوال و ارشادات حسب ذیل ہیں:

—— یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آدمی آلائش نفسانی بھی رکھے اور خدا کی بارگاہ میں باریاب بھی ہو۔

—— جو درویش خالق کے لیے نہیں بلکہ خلق کے لیے عمدہ لباس پہنے وہ راہ سلوک کا رہزن ہے اور جو نفس کے لیے اچھا کھانا کھائے وہ جھوٹا اور خود پرست ہے۔ جو امرا کے ساتھ بیٹھتا ہے وہ مرتد طریقت ہے اور جو نفس کے لیے خوب سوتا ہے اسے اس نعمت سے کچھ نہیں ملا۔

—— جو اولیا اسرار الٰہی کو ظاہر کر دیتے ہیں وہ غلبات شوق سے مجبور ہو کر ایسا کرتے ہیں اور بعض پختہ اولیا کسی حال میں بھی بھید کو ظاہر نہیں کرتے۔ پس سالک کا حوصلہ وسیع ہونا چاہیے تاکہ اسرار الٰہی کو پوشیدہ رکھے۔

—— عارف وہ ہے کہ عالمِ اسرار سے اس میں ہزارہا اسرار ہر وقت پیدا ہوتے رہیں اور وہ عالمِ سُکر میں رہے۔ اس عالم میں اٹھارہ ہزار عالم بھی اس کے سینے میں ڈال دیے جائیں تو بھی اسے خبر نہ ہو۔

—— اہلِ معرفت کے نزدیک بلائے دوست رضائے دوست ہے۔

—— وہ اولیا جو ابتدائے مرتبہ ہی میں حال کو ظاہر کر دیتے ہیں انھیں کامل نہیں کہا جا سکتا، بلکہ کامل وہ ہیں جو تمام مراحل طے کرنے تک کسی بات کو ظاہر نہیں کرتے۔

—— راہِ درویشی چلنا اور بات ہے اور ذخیرہ جمع کرنا اور بات ہے۔ یا درویش بن یا ذخیرہ جمع کر۔

—— درویش کا فاقہ اس کے اختیار میں ہے اور دنیا اسے دی گئی ہے کہ جس طرح چاہے خرچ کرے۔ وہ اپنے لیے بھی خرچ کر سکتا ہے، مگر ایسا نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو دیتا ہے اور خود فاقہ کرتا ہے جس سے اس کے کام میں ترقی ہوتی ہے۔

—— جو محبت کا دعویٰ کرے اور مصیبت کے وقت چلّائے وہ جھوٹا ہے۔

—— انسان کے لیے بُری صحبت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔

اگر راہگیر ایک خاص راستے پر چلتا رہے اور یقین کامل اور امیدِ کمال رکھے تو وہ ضرور درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔

—— بزرگوں کی مجلس میں جہاں جگہ پاؤ وہیں بیٹھ جاؤ۔

—— چار چیزیں گوہرِ نفس ہیں، درویشی جو تونگری دکھائی دے۔ بھوک جو سیری نظر آئے۔ غم جو خوشی نظر آئے اور باوجود دشمنی کے دوستی کا برتاؤ۔

—— انسان کو چاہیے کہ جس چیز سے توبہ کرے اسے ہمیشہ اپنا دشمن جانے۔

—— جب تک کوئی شخص دنیا میں مشغول رہتا ہے وہ خدا رسیدہ نہیں ہو سکتا۔

—— درویش کو راہِ سلوک میں روزانہ ایک لاکھ منزل سے گزرنا چاہیے پھر بھی قدم آگے ہی بڑھتا رہے۔

—— شیخ کے دل میں اتنی قوت اور صحتِ ضمیر ہونی چاہیے کہ اپنے مرید کے سینہ کے زنگار، ہوس کی آلودگی اور آلائش دنیا کو اپنی باطنی قوت سے پاک کر دے، تاکہ اس میں کوئی دغا، فریب، کھوٹ، حسد، برائی یا کدورت باقی نہ رہے، پھر اُسے معرفت کے اسرار سے آگاہ کرے اگر یہ نہ ہو تو پیر و مرید دونوں گمراہی کے راستے پر ہیں۔

—— دعا دو قسم کی ہوتی ہے، نیک و بد۔ کسی کے حق میں بددعا نہ کرنی چاہیے۔ نیک دعا بہت اچھی ہے خصوصاً وہ جو بزرگوں کی زبان سے نکلے۔

—— بیعت دوبارہ ہو سکتی ہے، یعنی اگر کوئی شخص بیعت سے پھر جائے یا اس کی توبہ میں شک پڑ جائے تو از سرِ نو بیعت کر لینی چاہیے۔

—— مرید کو اپنے پیر کی موجودگی اور عدم موجودگی دونوں میں یکساں خدمت کرنی چاہیے۔ یعنی جس طرح اس کی زندگی میں خدمت کرتا تھا اسی طرح اس کی وفات کے بعد بھی اس کی خدمت کرے، بلکہ اس سے زیادہ کرے۔

حضرت خواجہ عزیزاں علی رامیتنیؒ

ولادت ——— رامیتن (بخارا) ۵۹۱ھ

وفات ——— خوارزم ۷۲۱ھ

قطب الاقطاب، صاحب اسرار و کرامات حضرت خواجہ عزیزاں علی رامیتنی رحمۃ اللہ علیہ شریعت و طریقت میں کامل اور مشائخ وقت میں بڑا اونچا درجہ رکھتے تھے۔ شیخ محمود انجیر فغنویؒ کے خلیفۂ اعظم اور سلسلہ عالیہ نقشبندیہ سے منسلک تھے۔ شیخ علاؤالدولہ سمنانیؒ کے ہم عصر تھے اور ان کے ساتھ آپ کی خط و کتابت بھی ہوتی رہی۔ عزیزاں آپ کا لقب تھا۔

آپ بافندگی کا کام کرتے تھے، اسی پیشے سے روزی کماتے۔ جب بخارا سے خوارزم کو گئے تو اپنے آدمیوں کے ذریعہ بادشاہ وقت خوارزم شاہ کو پیغام بھیجا کہ فقیر بافندہ آپ کے شہر کے دروازے پر کھڑا ہے اور اجازت چاہتا ہے کہ شہر میں داخل ہو کر یہاں سکونت اختیار کرے۔ آپ نے پیغام لے جانے والوں سے کہہ دیا تھا کہ اگر بادشاہ اجازت دے دے تو اس سے اس امر کی تحریر لکھوا لانا۔

بادشاہ نے یہ پیغام ہنسی میں اڑا دیا۔ وزیر اور اعیانِ سلطنت نے بھی اسے کوئی اہمیت نہ دی تاہم ایک کاغذ پر اجازت نامہ لکھ کر خواجہ صاحب کے آدمیوں کے حوالے کر دیا۔ وہ اُسے لے کر خواجہ صاحب کے پاس آئے اور خواجہ صاحب شہر میں داخل ہو گئے۔ وہیں سکونت اختیار کر لی اور رشد و ہدایت کا کام انجام دینے لگے۔

شہر سے جو لوگ محنت مزدوری کے لیے وہاں سے گزرتے، آپ انھیں بلا کر اپنی خانقاہ میں لے جاتے، وضو کراتے اور نماز پڑھاتے، ذکر و فکر میں اپنے ساتھ شریک کرتے، پھر سارے دن کی مزدوری دے کر رخصت کر دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کو اس جگہ سے دلچسپی ہو گئی۔ کئی آدمی وہاں آ کر عبادت کرنے لگے۔ انھیں اس کی اجرت بھی مل جاتی اور اس طرح تھوڑے ہی دنوں میں بہت سے عقیدت مند آپ کے گرد جمع ہو گئے، جن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔

کسی نے بادشاہ تک خبر پہنچا دی کہ ایک درویش یہاں آئے ہوئے ہیں انھوں نے بہت سے لوگوں کو اپنے گرد جمع

---

[1] خواجہ محمود انجیر فغنویؒ خواجہ محمد عارف ریوگریؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ خلوت و جلوت میں ان کے دمساز تھے۔ وقت کے مشائخ میں بہت اونچا درجہ رکھتے تھے۔ کمالات ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔ آپ کا پیشہ گل کاری تھا۔ ذکر بالجہر کے قائل تھے۔ آپ کا وطن انجیر فغنی تھا جو بخارا سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ آپ اسی مقام پر پیدا ہوئے۔ ۱۰ ربیع الاول ۶۷۱ھ میں وفات پائی۔ مزار پُر انوار قصبہ مرایکنے میں ہے جو بخارا کے قریب واقع ہے۔

کر رکھا ہے ۔ ایسا نہ ہو کوئی آفت آجائے ۔ بادشاہ یہ خبر سن کر محتاط ہو گیا اور حکم دیا کہ درویش کو شہر سے نکال دو۔
خواجہ صاحب نے اپنے انھیں آدمیوں کو جو پہلی مرتبہ بادشاہ کے دربار میں گئے تھے دوبارہ بادشاہ کے پاس اس کی تحریر دے کر بھیجا۔ وہ گئے اور خوارزم شاہ کو وہ پروانہ دکھایا، جس پر اس نے خواجہ صاحب کو شہر میں رہنے کی اجازت دی تھی اور اس پر اپنے دستخط کیے تھے۔ خوارزم شاہ پروانہ دیکھ کر شرمندہ ہوا۔ اور پہلا حکم منسوخ کر دیا۔ پھر بنفسِ نفیس خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آپ کے جاں نثاروں میں شریک ہو گیا۔
بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے ہاں کوئی مہمان آیا۔ گھر میں کچھ نہ تھا جو اُسے پیش کیا جاتا۔ آپ پریشانی کی حالت میں گھر سے باہر نکلے۔ ناگاہ ایک شخص نظر آیا جو سر پر ایک برتن میں پلاؤ لیے جا رہا تھا۔ اس نے آپ کو دیکھ کر پلاؤ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ بہت خوش ہوئے اور اُسے لا کر مہمان کے سامنے رکھ دیا اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔
فارغ ہونے پر آپ اس شخص سے مخاطب ہوئے اور پوچھا مانگو کیا مانگتے ہو۔ اس نے کہا میری خواہش یہ ہے کہ آپ جیسا ہو جاؤں اس کے علاوہ اور کوئی خواہش نہیں۔ آپ نے فرمایا یہ بڑی مشکل بات ہے۔ وہ کہنے لگا مجھے تو اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے۔ آپ نے فرمایا تم اس کے متحمل نہ ہو سکو گے۔ جب اس کا اصرار جاری رہا تو آپ نے اس کی طرف نظرِ کرم کی جس کے اثر سے وہ صاحب باطن ہو کر درجہ کمال کو پہنچا، مگر صرف چالیس دن تک زندہ رہا۔
ایک مرتبہ شیخ علاؤ الدولہ سمنانی نے آپ کو لکھا کہ میں اور تم دونوں فقیر کہلاتے ہیں مگر لوگ آپ سے راضی ہیں اور مجھ سے ناخوش۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ آپ نے جواب دیا خدمت کر کے احسان جتانے والے بہت ہیں، آپ خدمت کر کے احسان ماننے والے بنیں، پھر کوئی آپ کی غیبت نہ کرے گا۔
آپ کے دو بیٹے تھے، اور یہ دونوں عارف کامل تھے۔ بڑے کا نام خواجہ محمد اور چھوٹے کا نام خواجہ ابراہیم تھا۔ آپ نے چھوٹے لڑکے کو خلافت عطا فرمائی۔ بڑے لڑکے نے خواجہ صاحب کی وفات کے چالیسویں دن وفات پائی۔ خواجہ صاحب خود ۷۲۱ھ میں خوارزم میں فوت ہوئے۔
آپ کے ارشادات میں سے چند ایک یہ ہیں:
فرماتے ہیں آدمی کو چاہیے کہ عمل کرے اور سمجھے کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ فرمایا دو موقعوں پر بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے، بات کرتے وقت کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور کھانا کھاتے وقت کہ کیا کھا رہے ہو۔
فرمایا سالک کو منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے بڑی محنت و ریاضت کی ضرورت ہے، لیکن نزدیک ترین اور راستہ یہ ہے کہ اہلِ دل کے دل میں جگہ پیدا کرے، کیوں کہ ان کے دل حق تعالیٰ کی نظر کی جگہ ہے اور ان کے دل پر نظر کرنے والا بھی ضرور حصہ پائے گا۔
فرمایا مرد کو چاہیے کہ چڑیاں پالنے والے کی طرح ہو۔ جو پرند کا حوصلہ (پوٹا) دیکھ کر اُسے غذا دیتا ہے۔ مرشد کو بھی اپنے

مریدوں کی تربیت ان کی استعداد کے مطابق کرنی چاہیے۔

فرمایا اس زبان سے دعا کیا کرو جس سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوا کسی نے پوچھا حضرت وہ کون سی زبان ہے - فرمایا دوستانِ خدا کے سامنے تواضع و نیازمندی ظاہر کرو تاکہ وہ تمھارے حق میں دعا کریں۔

کسی نے آپ سے پوچھا کہ ذکرِ کثیر جس کا ذکر آیت اذکروا اللہ ذکراً کثیراً میں آیا ہے۔ زبانی ذکر ہے یا قلبی - فرمایا مبتدی کے لیے زبانی ہے اور منتہی کے لیے قلبی۔ کیوں کہ مبتدی تکلف میں جان لڑاتا ہے اور منتہی نے جہاں دل میں ذکر کیا اس کے سارے اعضا ذکر میں لگ جاتے ہیں -

کسی نے پوچھا ایمان کیا ہے؟ فرمایا توڑنا اور جوڑنا -

مندرجہ ذیل پانچ رباعیاں آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں :

نفس مرغ قید در درون است   نگہدارش کہ خوش مرغے است دمساز
زپایش بند تگسل تا نہ پرد   کہ نتوانی گرفتن بعد پرواز

با ہر کہ نشینی و نشد جمع دلت !   ور نہ تو نہ امید زحمت آب و گلت
از صحبت وے کہ سبرا برکنی   ہرگز نہ کز روح عزیزاں بحلت

بے چارہ دلم کہ عاشق روئے تو بود   تا وقت صبوح دوش در کوئے تو بود
چوگان سر زلف تو از حال بحال   مے بروش و ہمچناں یکے گوئے تو بود

چوں ذکر بدل رسد دلت دور کند   آں ذکر ترا از زیستن فرو کند
ہر چند کہ خاصیت آتش دارد   لیکن در جہاں بر دل تو سرد کند

خواہی کہ بحق رسی بیارام اے تن   واندر طلب دوست بیارام اے تن
خواہی کہ امداد از روحِ عزیزاں خواہی   یا از سرِ خود ساز و بیارام اے تن

آپ کے خلفا میں خواجہ محمد بابا سماسیؒ بڑے پایے کے بزرگ گزرے ہیں۔ ان کا مولد و مسکن سماس تھا جو قصبہ رامیتن سے ایک کوس اور بخارا سے تین کوس کے فاصلہ پر ایک مقام ہے۔ خواجہ محمد بابا ۱۰۔ جمادی الاول ۷۵۵ھ میں فوت ہوئے ان کا مزار مبارک سماس میں ہے -

آپ اولیاے نامدار اور اولیائے کبار میں سے تھے۔ کہا جاتا ہے خواجہ بہاؤالدین نقشبندؒ کی ولادت پر ان کے جدِ امجد انھیں حضرت بابا سماسیؒ کی خدمت میں لے گئے تھے۔ جو آپ نے دیکھ کر فرمایا تھا یہ میرے فرزند ہیں پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا یہی وہ مرد ہے جس کی خوشبو مجھے آیا کرتی تھی۔ پھر آپ نے اپنے خلیفہ سید امیر کلال کو حکم دیا کہ ان کی تربیت میں دریغ نہ کرنا -

---

حضرت شیخ اوحدالدّین کرمانیؒ

وفات ——— بغداد ۶۳۵ھ

حضرت شیخ اوحدالدین کرمانیؒ اپنے وقت کے اجل علما اور بڑے صاحب کمال اولیا اللہ میں سے تھے۔ لوگوں سے زیادہ میل جول نہ رکھتے تھے ہر وقت باطنی صفائی اور عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے تھے۔ شیخ رکن الدین سنجاسیؒ کے مرید تھے۔ شیخ رکن الدین سنجاسیؒ حضرت شیخ قطب الدین بہری کے مرید تھے اور انھیں شیخ ابوالنجیب سہروردیؒ کی مریدی کا شرف حاصل تھا۔

آپ کے سنِ ولادت کا علم نہیں ہو سکا۔ ابتدا میں خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ العزیز سے بھی ان کے قیام بغداد کے دوران خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ چنانچہ خواجگانِ چشت کے ملفوظات میں اس بات کا ذکر آیا ہے۔ شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے جلیسوں میں سے تھے اور اپنے زمانہ کے بہت بلند مرتبت بزرگ تھے۔ شیخ ابن عربی نے اپنی کتاب فتوحات مکیہ میں ان کا ذکر کیا ہے اور نفحات الانس میں ان کی زبانی یہ واقعہ نقل ہے کہ میں ایام جوانی میں اپنے شیخ حضرت رکن الدین سنجاسیؒ کی خدمت بابرکت میں رہا کرتا تھا۔ ایک دفعہ ان کے ساتھ سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ شیخ عماری میں تشریف فرما تھے اور انھیں پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔ دورانِ سفر ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں شفاخانہ موجود تھا۔ میں نے پیرو مرشد سے درخواست کی کہ اگر آپ پسند فرمائیں تو میں شفاخانے میں جا کر آپ کے لیے دوا لے آؤں شاید اللہ تعالیٰ اس سے آپ کو صحت دے دے۔ حضرت شیخ نے میری خواہش کا پاس کرتے ہوئے اجازت دے دی۔ میں شفاخانے میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ خیمہ میں ایک شخص بیٹھا ہے اور چاروں طرف ملازم کھڑے ہیں۔ اس شخص کے سامنے ایک شمع جل رہی تھی۔ اس نے مجھے نہ پہچانا، مگر مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور میرے سامنے آ کر دونوں ہاتھ پکڑ کر پوچھنے لگا، کیا چاہیے؟ میں نے اپنے پیرو مرشد کی بیماری کی کیفیت بیان کی۔ وہ سن کر دوا لے آیا اور مجھے دے کر ساتھ ہی خود بھی میرے ہمراہ باہر آ گیا۔ نوکر کو حکم دیا کہ شمع لے کر میرے آگے آگے چلے۔ مجھے ڈر محسوس ہوا کہ پیرو مرشد مجھے اس حالت میں دیکھ کر ناخوش نہ ہو جائیں؛ اس لیے میں سمجھا بجھا کر ملازم کو واپس کر دیا اور خود جا کر وہ دوا شیخ کی خدمت میں پیش کی اور دوا دینے والے نے جس طرح میری عزت اور احترام کیا تھا، وہ سب شیخ سے بیان کر دیا۔ وہ متبسم ہوئے، فرمایا اے فرزند! جب میں نے تیرا اضطراب دیکھا تو تجھے دوا لانے کی اجازت دے دی، لیکن جب تو وہاں پہنچا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ شخص اس علاقے کا رئیس ہے تیری طرف التفات نہ کرے گا تو تو شرمندہ ہو گا۔ اس لیے میں اپنے مکان سے جدا ہو کر اس کی صورت میں متشکل ہوا اور اس کی

جگہ بیٹھ گیا۔ جب تو آیا تو میں نے تیرا احترام کیا بعد ازاں جو کچھ تجھ پر گزرا وہ سب تجھے معلوم ہی ہے۔

شیخ علاؤالدین سمنانیؒ "چہل مجلس" میں فرماتے ہیں کہ شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ آپ کو مبتدع کہتے تھے اور سامنے نہیں بلاتے تھے۔ ایک دن شیخ اوحدالدین کرمانیؒ کے سامنے اس بات کا ذکر ہوا۔ آپ نے فرمایا گو شیخ مجھے مبتدع کہتے ہیں لیکن میرے لیے یہی فخر بہت ہے کہ آپ زبان مبارک سے میرا نام تو لیتے ہیں۔ پھر عربی کا یہ شعر پڑھا ؎

ماساء فی ذکرك لی بمسا ئة بل سـ را نی خطرات ببالکا

جب شیخ شہاب الدین عمرؒ کو اس کا پتہ چلا تو آپ کے اخلاق کی بہت تعریف فرمائی۔ کہا جاتا ہے کہ مبتدع سے حضرت کی مراد غالباً یہ تھی کہ شیخ اوحدالدین شہود حقیقت میں مظاہر صوری سے میل رکھا کرتے تھے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کے سامنے ایک مرتبہ کسی نے بیان کیا کہ "شیخ اوحدالدین کرمانی شاہد باز است اما پاکباز است" مولانا نے سن کر فرمایا "کاسکے کردی و درگزشتی"۔ انہی معنوں میں آپ کی ایک رباعی ہے ؎

زاں می نگرم بہ چشم سر در صورت زیرا کہ زمعنی است اثر در صورت
ایں عالم صورتست ما در صوریم! معنی نتواں دید مگر در صورت

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ شیخ شمس الدین تبریزیؒ نے شیخ اوحدالدین کرمانیؒ سے پوچھا "درچہ کاری" (یعنی کیا کام کرتے ہو) فرمایا "ماہ را در طشت آب می بینم" (چاند کو پانی کے طشت میں دیکھتا ہوں) شیخ شمس الدین نے فرمایا "در قفا دنبل نہ داری چرا بر آسمان نمی بینی"۔

کہا جاتا ہے کہ خلیفہ بغداد کو آپ کے متعلق بتایا گیا تو اس نے کہا کہ "مبتدع اور کافر ہے" اگر ایسی حرکت یہاں کرے گا تو قتل کر دیا جائے گا۔ شیخ اوحدالدین ان دنوں بغداد میں تھے۔ اتفاق سے ایک روز سماع ہو رہا تھا خلیفہ کا خوبصورت لڑکا بھی اس محفل میں موجود تھا۔ جب مجلس سماع گرم ہوئی تو شیخ اوحدالدین نے لڑکے کی طرف مخاطب ہو کر یہ رباعی پڑھی ؎

سہل است مرا بر سرِ خنجر بودن در پائے مرادِ دوست بے سر بودن
تو آمدئے کہ کافرے را بکشی! غازی چو توئی رواست کافر بودن

لڑکے نے سن کر آپ کے پائے مبارک پر سر رکھ دیا اور اسی وقت مرید ہو گیا۔

اخبار الصالحین کے بیان کے مطابق "نفحات" میں اس واقعہ کے سلسلے میں مذکور ہے کہ اہل تحقیق و توحید کے نزدیک کامل و مکمل وہ شخص ہے کہ جمال حق سبحانہٗ کو مظاہر کونی حسی میں بصر سے اسی طرح مشاہدہ کرے، جس طرح کہ بصیرت سے مظاہر روحانی میں مشاہدہ کرتا ہے مگر غیر عارف کے لیے یہ نظر بازی جائز نہیں ہے۔ اہل طریقت میں ایسے بھی لوگ ہوئے ہیں جو دیکھنے کو تو مظاہر قدرت و صور زیبا کے عشق میں گرفتار رہے ہیں مگر ان کا باطنی مشاہدہ جمال حقیقی ہی میں مشغول رہا ہے۔ چنانچہ مصنوع کی زیبائش میں گرفتار رہنا اور صانع کی طرف نظر نہ کرنا ممنوع ہے۔ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ

سے ہم پناہ مانگتے ہیں کہ پہچاننے کے بعد بھی نہ پہچانیں اور انکشافِ حقیقت کے بعد بھی صور کونیہ ہمارے لیے حجاب بنے رہیں ایسے بزرگوں کے ساتھ حسنِ ظن رکھنا چاہیے۔ اس قسم کے لوگوں میں سے شیخ احمد غزالی، شیخ فخر الدین عراقی اور شیخ اوحد الدین کرمانی قدس سرہم تھے۔ ان بزرگوں نے مظاہر صوری حسی کے جمال کے مطالعہ سے شغل رکھا ہے۔ درحقیقت ان کی حالت یہ تھی کہ اس جمال ظاہری میں جمال مطلق حق انھیں نظر آتا تھا اور محض صور حسی کے ساتھ مقید نہیں رہتے تھے۔ اسی خیال کو حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح ادا فرماتے ہیں:

ما در پیالہ عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم	اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدامِ ما!

لیکن بعض بزرگوں نے جو ان کی شان سے انکار کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے احتیاط کا پہلو مدنظر رکھا ہے کہ کہیں محجوب لوگ اسے اپنا دستور نہ بنا لیں اور اپنی حالت کو اسی طرح سمجھنے نہ لگیں، جیسی کہ ان بزرگوں کی حالت تھی۔"

حضرت شیخ اوحد الدین کرمانی کے کئی مرید تھے جن میں شیخ صدر الدین علی رہانی بڑے صاحب کمال تھے۔ میر سید قاسم تبریزی نے انھیں سے تربیت حاصل کی تھی۔ شیخ صدر الدین ۷۸۳ھ میں جام میں فوت ہوئے اور وہیں دفن ہیں۔ شیخ اوحد الدین کے ایک اور مرید شیخ اوحد الدین اصفہانی تھے۔ جنھوں نے حدیقہ حکیم سنائی کے وزن پر جام جم نام سے مثنوی کی ایک کتاب لکھی اس کتاب کے چند شعر ہدیۂ ناظرین ہیں:

اوحدی شصت سال سختی دید	تا شبے روئے نیک بختی دید
سرِ گفتارِ ما مجازی نیست	باز کن دیدہ کیں بر بازی نیست
سالہا چوں فلک بسر گشتم	تا فلک وار دیدہ ور گشتم
بر سرِ پائے چلہ داشتہ ام	چوں نہ از بہر قبلہ داشتہ ام
از بروں درمیاں بازارم	وز درون خلوتے ست یارم

انھوں نے ۶۳۵ھ میں تبریز میں انتقال فرمایا۔ مزار مبارک بھی وہیں ہے۔

شیخ اوحد الدینؒ کے بہت سے خوارق و کرامات بیان کیے جاتے ہیں۔ شیخ فرید الدین گنج شکرؒ نے اپنی کتاب راحت القلوب میں ان کی بعض کرامتوں کا حال لکھا ہے۔ شیخ فریدؒ فرماتے ہیں کہ میں کچھ دن آپ کی خدمت میں رہ کر فیض بھی حاصل کرتا رہا۔ آپ اشعار بھی کہا کرتے تھے۔ "مصباح الارواح" سے آپ کے بعض اشعار منتخب کر کے پیش کیے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

تا جنبشِ دست ہست مادام	سایہ متحرک است ناکام
چوں سایہ ز دست یافت مایہ	پس نیست خود اندر اصل سایہ
چیزے کہ وجود او بخود نیست	ہستیش نہادنی از خرد نیست

هست است ولیک هست مطلق　　نزدیک حکیم نیست جز حق
هستی که بر حق قوام دارد!　　او نیست ولے که نام دارد
هر نفس خود است نقش نقاش　　کس نیست دریں میاں تو خوش باش
پس با دیقیں کہ نیست واللہ　　موجود حقیقی سوے اللہ

آپ کی بعض رباعیات یہ ہیں :

دانم ز ورائے حرف بیروں احد است　　وز چشمہ لطف آب حیاتم مدد است
علت ز احد باو حسد آمد حرفے　　علت بہ گذار اینک او حد احد است

او حد در دل می زنی آخر دل کو　　عمریست کہ راہ می روی منزل کو
در دینی درون بے وفا می گردی　　پنجاہ و دو چلہ داشتی حاصل کو

جز نیستی تو نیست ہستی بخدائی　　اے ہوشیاران خوش است ہستی بخدائی
گر ما نکنے بتے بحق پرستی ناگاہ!　　حقا کہ رسی ز بت پرستی بخدائی!

اسرار حقیقت نہ شود حل بہ سوال　　نے نیز بدر یافتن حشمت و مال
تا خون نہ کنی دیدہ و دل پنجہ سال　　ہرگز نہ دہندت راہ قال محال

منتخب التواریخ میں آپ کا سال وفات ۶۳۵ھ بیان کیا گیا ہے۔ بغداد میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے۔ عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور بن ظاہر ملقب بہ مستنصر باللہ کا زمانہ تھا۔

حضرت شیخ ابوالحسن شاذلیؒ

ولادت ــــــــــــ قصبہ عمان (شمال افریقہ) ۵۹۳ھ

وفات ــــــــــــ عیذاب (افریقہ کا ایک جنگل) ۶۵۶ھ[1]

قطب زماں، زینت اصحاب عرفاں حضرت شیخ ابوالحسن شاذلیؒ جامع مراتب قطبیت و غوثیت تھے۔ مشائخ صوفیہ میں آپ کا درجہ بہت بلند تھا۔ بہت سے اولیا اور مشائخ نے آپ سے کسب فیض کیا۔ علامہ ابن تیمیہ آپ کے ہم عصر تھے۔

اصل نام علی بن عبداللہ بن عبدالجبار تھا۔ شاذلہ کے رہنے والے تھے جو اسکندریہ (مصر) کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ آپ کی ولادت ۵۹۳ھ میں شمالی افریقہ کے شہر مرسیہ کے ایک گاؤں عمان میں ہوئی۔ سلسلہ نسب یوں بیان کیا جاتا ہے[2]:

ابوالحسن علی الشاذلی بن عبداللہ بن عبدالجبار بن تمیم بن ہرمز بن حاتم بن قصی بن یوسف بن یوشع بن ورد بن علی بن احمد بن محمد بن عیسیٰ بن ادریس بن عمر بن ادریس بن عبداللہ بن حسن مثنیٰ بن حضرت امام حسن علیہ السلام بن سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

اخبار الصالحین کے الفاظ میں آپ کے حالات قدرے ترمیم اور اختصار کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں:

ابن تیمیہ آپ کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے آپ کی سخت مخالفت کی، مگر آپ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔ آپ نے دو شیخوں سے خرقہ پہنا تھا، ابو عبداللہ محمد بن شیخ ابوالحسن [illegible] ہیں اور شیخ ابو عبداللہ عبدالسلام بن مشیش۔ پہلا حضرت صدیق اکبرؓ تک پہنچتا ہے اور دوسرا حضرت علی علیہ السلام تک۔

آپ کا شجرۂ طریقت یہ ہے:

شیخ ابوالحسن شاذلی، سید عبدالسلام، سید عبدالرحمان مدنی حسنی، شیخ تقی الدین، شیخ فخرالدین، شیخ نورالدین ابوالحسن علی، شیخ تاج الدین محمد، شیخ شمس الدین محمد، شیخ زین الدین قزوینی، شیخ ابواسحٰق ابراہیم البصری، شیخ ابوالقاسم احمد مروانی، شیخ سعید، شیخ ابو محمد فتح السعودی، شیخ سعد الغزوانی، شیخ ابو محمد جابر، حضرت امام حسن علیہ السلام، حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

آپ کا رنگ گندمی، جسم نحیف و لاغر اور قد لمبا تھا۔ ہاتھوں کی انگلیاں بھی لمبی تھیں۔ رخساروں پر گوشت بہت کم تھا۔

---

[1] بقول نفحات الانس ۶۵۴ھ اور بقول طبقات الکبریٰ ۶۵۶ھ

[2] جامع الاصول۔

بہت شیریں زبان تھے۔ بڑی فصیح گفتگو کرتے تھے۔ کلام کرتے وقت محو ہو جاتے تو فرمایا کرتے:

الا رجل من الاخیار یعقل عنا ھذا الاسرار ھلموا الی رجل سیرہ الی بحر الانوار (کیا کوئی ایسے نیک آدمی ہیں، جو ہم سے ان اسرار کو آکر سمجھیں۔ اے لوگو! اس کی طرف آؤ جس کی سیر بحر انوار کی طرف ہے)۔

وعظ کے دوران آپ کبھی کبھی یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے رسول خدا سے میراث پائی ہے اور آسمان کے خزانے کا مالک ہو گیا ہوں۔ اگر جن و انس قیامت تک مجھ سے یہ اسرار لکھتے رہیں تو لکھیں آخر کار تھک جائیں گے۔

بچپن ہی میں آپ تونیسیہ کے شہر میں چلے گئے تھے۔ پھر بلادِ مشرق کی طرف گئے۔ کئی حج کیے۔ عراق میں شیخ ابوالفتح واسطی سے ملاقات کی۔ شیخ کے متعلق فرماتے ہیں کہ میں نے سارے عراق میں ان جیسا کوئی نہیں دیکھا۔ میں قطب وقت کو تلاش کرتا تھا۔ آپ نے فرمایا وہ تو ہمارے ہی ملک میں ہیں۔ یہ سن کر میں بلادِ مغرب کی طرف واپس ہوا اور شیخ ابومحمد عبدالسلام کی خدمت میں پہنچا، جو ان دنوں ایک پہاڑ کی چوٹی پر غار میں رہتے تھے۔ میں نے پہاڑ کے دامن میں ٹھہر کر غسل کیا اور علم و عمل دونوں کے خیال کو بالائے طاق رکھ کر فقیرانہ طریق پر پہاڑ پر چڑھا۔ آپ میری ہی طرف آ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا مرحبا یا علی، یعنی تم خوب آئے۔ پھر فرمایا تم عمل و علم دونوں کا خیال چھوڑ کر میرے پاس آئے ہو، تم دنیا و آخرت کے مشائخ میں سے ہو گے۔

جامع الاصول کمشخانوی میں ہے کہ آپ کا طریقہ عجیب تھا۔ علم و عمل، حال و مقام، ہمت و مقال اس میں جمع فرمائی تھی۔ یہ طریقہ جذب و مجاہدہ و عنایت پر مشتمل ہے۔ ادب و قرب و تسلیم پر محتوی اور باطن کے علوم سے مضبوط کیا گیا ہے اور تمام تر ہرایہ اسرار کرامت اور قرب ہی ہے۔ اس طریقہ کی بنیاد طلب علم و کثرت ذکر و حضور پر ہے۔ مجاہدے زیادہ نہیں اس لیے کہ نفس میں جتنا اصلی نور ہوتا ہے وہ نور علم اور نورِ ذکر سے قوی کیا جاتا ہے اور مشاغل ظاہری کے باوجود قوت یقین، کثرت عرفان و فتح و انوار کی زیادتی اور قلوب کا تزکیہ شاغل کو نصیب ہوتا ہے۔ اس طریقہ کے لوگ اپنے اقوال میں محفوظ اور اپنے اعمال کے محافظ نظر آتے ہیں اور ان کے قلوب اسرار علوم سے لبریز اور حقائق و حکم سے منور ہوتے ہیں۔

آپ نے پہلے تمام علوم ظاہری و باطنی حاصل کیے، پھر علم مناظرہ میں پوری دسترس حاصل کی۔ بعدہٗ گروہ اہل تصوف میں شامل ہوئے۔ شیخ تقی الدین دقیق السعید کہا کرتے تھے کہ میں نے شیخ ابوالحسن شاذلی سے بڑھ کر کوئی عارف باللہ نہیں دیکھا۔

کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے پیر و مرشد کون ہیں۔ فرمایا پہلے میں اپنے آپ کو شیخ عبدالسلام ابن شیش سے منسوب کرتا تھا، مگر اب کسی کی طرف منسوب نہیں کرتا، بلکہ دس دریاؤں کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتا ہوں، یعنی محمدؐ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، جبرئیلؑ، میکائیلؑ، عزرائیلؑ، اسرافیلؑ اور روح اکبر۔

شیخ مکین الدین فرمایا کرتے تھے کہ لوگ تو اللہ تعالیٰ کے دروازے کی طرف بلاتے ہیں، مگر ابوالحسن شاذلی لوگوں

کو اللہ جل شانہٗ کے حضور میں داخل کر دیتے ہیں۔

آپ کا بیان ہے کہ ابتدائے حال میں مجھے تردد تھا کہ لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہوں یا ان سے الگ تھلگ۔ شہر میں رہوں یا جنگل میں چلا جاؤں۔ مجھے خبر ملی کہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایک خدا رسیدہ بزرگ رہتے ہیں، میں ان کی ملاقات کے لیے گیا اور رات کو وہاں پہنچا۔ خیال آیا کہ رات کے وقت ان کے پاس جانا ٹھیک نہیں، دن نکلنے پر جاؤں گا۔ چنانچہ میں غار کے دروازے پر ہی سو رہا۔ اندر سے میں نے آواز سنی کہ کوئی دعا مانگ رہا ہے: "خدایا تیرے بعض بندے ایسے بھی ہیں جو تجھ سے چاہتے ہیں کہ خلق ان سے مسخر ہو جائے اور تو نے خلق کو ان کے لیے مسخر کر بھی دیا اور وہ لوگ تجھ سے راضی ہو گئے، مگر میں چاہتا ہوں کہ لوگوں کو میرے لیے بدخو کر دے، تاکہ تیری بارگاہ کے سوا میرے لیے اور کوئی جائے پناہ نہ رہے۔"

شیخ فرماتے ہیں یہ سن کر میں نے اپنے آپ سے کہا کہ ذرا اس پر شیخ کس سے کیا کہہ رہا ہے۔

جب صبح ہوئی تو میں ان کی خدمت میں گیا اور سلام عرض کیا۔ ان کی ہیبت اور جلال سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ان کا مزاج پوچھا، فرمانے لگے جس طرح تو خدائے عز و جل کی گرمی تدبیر و اختیار کی شکایت کرتا ہے، میں اس کی خنکی تسلیم و رضا کی شکایت کرتا ہوں۔ اس وقت میرا یہی حال ہے۔

میں نے دریافت کیا رضا و تسلیم کی خنکی کیا ہوتی ہے اور آپ اس کی شکایت کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا میں ڈرتا ہوں کہ مجھے اس کی حلاوت کہیں خدائے عز و جل کی طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مشغول نہ کرے۔

میں نے عرض کیا، رات میں نے آپ کو یہ کہتے سنا ہے کہ خدایا بعض ایسے بندے ہیں جو تجھ سے چاہتے ہیں کہ خلق ان کی مسخر ہو جائے تو نے خلق کو ان کی مسخر کر بھی دیا اور وہ تجھ سے راضی ہو گئے۔

شیخ یہ سن کر مسکرا دیے، فرمایا اے فرزند! "اَللّٰھُمَّ سَخِّرْ لِیْ" کی بجائے "اَللّٰھُمَّ کُنْ لِیْ" کہا کرو۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ جس کے لیے خود خدائے تعالیٰ ہو جائے وہ کسی اور شے کا محتاج رہ سکتا ہے، کیوں اپنا دل برا کرتے ہو۔

امام یافعی فرماتے ہیں کہ میں نے بعض مشائخ سے سنا ہے کہ ابوالحسن شاذلیؒ جب کسی کے لیے دعا کرتے تھے تو کہا کرتے تھے: کان اللّٰہ لک "(خدا تمھارا ہو جائے) حدیث شریف میں آیا ہے مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ۔

آپ کا ارشاد ہے کہ جس فقیر میں یہ چار باتیں نہ ہوں اُسے مٹی کے برابر سمجھو:

چھوٹوں پر رحمت کرنا۔ بڑوں کی خدمت کرنا۔ اپنے نفس سے دوسروں کی داد طلب کرنا اور خود اپنے نفس کی داد دوسروں سے نہ چاہنا۔

آپ فرماتے ہیں خواہ تم سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوا ہو پھر بھی ہمیشہ استغفار کیا کرو۔ فرماتے ہیں جب کشف کتاب و سنت کا معارض ہو تو کتاب و سنت پر جمے رہو۔ اسی پر اجماع ہے۔

فرماتے ہیں جب حق کے ہاتف تمھیں اپنی طرف کھینچیں تو خبردار علمی حقائق کے محسوسات سے دلیل طلب نہ کرنا اور انھیں

کرنا ورنہ جاہل رہ جاؤ گے۔

اگر تم خدا کے بندے ہو اور تمہارے پاس علم و عمل نہیں ہے تو کچھ پروا نہیں، علم میں علم توحید اور عمل میں اللہ اور اس کے رسول اور صحابہ کرام کی محبت اور جماعت کی نسبت حق ہونے کا اعتقاد کافی ہے اور جب تک یہ نہ ہو کہ تمہارے علم و جد و جہد کے ساتھ تمہارے قلب میں کوئی تعلق باقی رہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا سب سے ناامید نہ ہو جاؤ، اس وقت تک نہ روحانی راحت حاصل کر سکو گے نہ مدد اور نہ مُردوں کا مقام حاصل ہوگا۔

فرمایا جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مملکت میں کوئی گناہ نہ کرے وہ گویا پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت ظاہر نہ ہو۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت بھی ظاہر نہ ہو۔

فرمایا قبض کے تین اسباب ہیں: گناہ جس کا تم نے ارتکاب کیا ہو۔ دنیا جو تم سے چلی گئی ہو، یا کوئی شخص ہے جو تمہاری جان یا آبرو کی نسبت تمہارے درپے آزار ہے۔ پس اگر تم نے گناہ کیا ہے تو استغفار کرو اور اگر دنیا چلی گئی ہے تو اپنے رب کی طرف رجوع ہو اور اگر تم پر ظلم کیا گیا ہے تو صبر و تحمل کرو، اور اگر اللہ تعالیٰ تمہیں قبض کے سبب پر مطلع نہ فرمائے تو اجرائے احکام الٰہی کے تحت مقیم رہو، وہ چلتا پھرتا بادل ہے۔

کسی نے آپ سے پوچھا پیر کیا ہے۔ فرمایا پیر وہ ہوتا ہے جو تمہیں مصیبت کی نہیں بلکہ راحت کی راہ دکھلائے۔

فرماتے ہیں جب تمہیں اپنے ظاہری یا باطنی احوال میں سے کوئی حال اچھا معلوم ہو اور اس کے زائل ہونے کا اندیشہ ہو، تو مَا شَآءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ پڑھا کرو۔

فرماتے ہیں کہ عالم اس گروہ کی راہ میں صرف اس وقت چل کر کمال کو پہنچ سکتا ہے جب کہ کسی برادر صالح یا پیر ناصح کی صحبت ہو۔ یہ راہ نہ رہبانیت کی راہ ہے اور نہ جوار اور بھوسہ کھانے کی۔ یہ راہ اوامر پر صبر کرنے اور ہدایت کی نسبت یقین رکھنے سے طے ہوتی ہے۔

فرماتے ہیں مومنوں کی جماعت کو نہ چھوڑو اگر وہ گنہگار اور بدکار کیوں نہ ہوں۔ ان پر حدود قائم کرو اور اگر انھیں چھوڑ دو تو ان پر رحم کی وجہ سے نہ کہ اپنے آپ کو ان سے بڑا سمجھ کر یا انھیں سرزنش کرنے کے خیال سے۔

جس اسم کے ذریعہ سے تم کوئی نعمت حاصل کرنا چاہو، یا کسی زحمت سے بچنا چاہو، وہ ذات اور توحید بالصفات سے ایک حجاب ہے، مگر یہ مراتب اور مقامات والوں کے لیے ہے اور عام مومنین اس سے علیحدہ ہیں اور اپنی اپنی حدوں کی طرف

ؒ امید و بیم کی حالت سے ترقی کرنے میں عارف پر قبض و بسط کی دو حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ عارف کے لیے قبض و بسط ایسا ہی ہے جیسا کہ مقامات کے لیے خوف۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ امید و بیم، بندہ کی مکروہ یا محبوب امر سے متعلق ہوتی ہے اور قبض و بسط موجود فی الوقت امر کے متعلق ہوتا ہے۔ جس کا غلبہ واردات غیبی کی طرح عارف کے قلب پر ہوتا ہے۔ (نعمت علی)

رجوع کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے اجروں سے کچھ کم کرنے والا نہیں۔

جس نے نماز اور روزہ پر کچھ اجرت یا رشوت لی اور سر جھکانے اور ذکر میں مشغول ہونے کے وقت لوگوں کی نگاہیں پڑنے سے لطف اٹھایا اس کے لیے کوئی اجر نہیں۔

اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند وہ شخص ہے جو صبح کے وقت طاعت کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی چاپلوسی اس لیے کرتا ہے کہ اسے اپنی مسرت مطلوب ہے۔

اپنے آپ کو بار بار گناہ میں پڑنے سے بچاؤ۔ کیونکہ جو کوئی حدودِ الٰہی سے تجاوز کرتا ہے، وہی ظالم ہے اور ظالم امام نہیں ہوتا۔

جس نے گناہ چھوڑ کر جس حالت میں مبتلا کیا گیا ہے، اس حالت پر صبر کیا اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ وعید کا یقین کیا، وہی امام ہے خواہ اس کے پیرو تھوڑے ہوں۔

فرمایا ہم اللہ تعالیٰ کی طرف ایمان و ایقان کی بصیرتوں سے دیکھتے ہیں، اس لیے دلیل اور برہان سے بے نیاز ہیں بصیرت کا بھی یہی حال ہے جو بصارت کا ہے۔ یعنی جس طرح آنکھ میں ادنیٰ سی چیز پڑ جانے سے بصیرت میں خلل آجاتا ہے اسی طرح برائی کی صفت کا خطرہ بصیرت کی نگاہ میں خلل پیدا کرتا ہے۔ فکر و ارادہ کو دھندلا اور نیکی کو سرے سے غائب کر دیتا ہے۔

فرماتے ہیں، چیزوں کو صفات میں اسی طرح مرکوز تصوّر کرو جس طرح وہ اپنے وجود سے پہلے تھیں، اس کے بعد نگاہ دوڑاؤ تو کیا تم کو ذات کے لیے مقام یا ہستی کی کوئی ہستی یا اس چیز کی کوئی شان دکھائی دے گی۔ پس یہی حال وجود کے بعد بھی ہے۔

فرماتے ہیں تصوّف نفس کو بندگی کا خوگر کرنا اور احکامِ ربوبیت کی طرف پھیرلاتا ہے۔ صوفی اپنے وجود کو اس طرح دیکھتا ہے جس طرح ہوا میں اڑنے والے ذروں کو جو معدوم ہیں نہ موجود۔ اور جس نے وجود کو پالیا وہ ہر جگہ موجود سے فنا ہو گیا اور جو وجود کے ساتھ رہا اس کے لیے ہر موجود ثابت ہوا۔

جب تک بندے کے ساتھ خواہشوں میں سے کوئی خواہش اور اپنی مشیتوں میں سے کوئی مشیت رہے گی وہ ہرگز اللہ تک نہ پہنچے گا۔

جو پرہیزگاری تمہارے دلوں میں علم و فہم نہ پیدا کرے اس کا کوئی اجر شمار میں نہ لاؤ اور جس برائی کے بعد خوف اور اللہ کی طرف بھاگنا و تورع میں آئے اس کا کوئی وبال حساب میں نہ لو۔

جب تجھے اوپر نہ چڑھایا جائے اوپر نہ جا، ورنہ تیرا پاؤں پھسل جائے گا۔

فرماتے ہیں نفس کے چار مرکز ہیں، ایک خواہش نفسانی کے لیے مخالفتوں میں ہے۔ دوسرا خواہش نفسانی کے لیے

طاعتوں میں ہے۔ تیسرا مرکز آرام کی طرف میلان میں ہے۔ اور چوتھا مفروضات کے ادا کرنے سے عاجزی میں ہے۔

فرماتے ہیں اگر چاہتے ہو کیمیا بنانے میں کامیاب ہو تو لوگوں کو اپنے دل سے دُور کر دو اور اپنے رب سے اس کی طمع نہ رکھو۔ کیوں کہ مقدرات کے سوا تمھیں کچھ اور عطا کرے، اس کے بعد جس چیز کو تم ہاتھ لگاؤ گے اور جو تم چاہو گے وہی ہوگا۔

فرمایا چار چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے علم کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ دنیا کی محبت، آخرت سے غفلت، افلاس کی دہشت اور آدمی کی ہیبت۔

فرمایا ایک ہی خصلت ایسی ہے کہ اگر بندہ اسے اختیار کرے تو اپنے زمانہ کے لوگوں کا پیشوا بن جائے اور وہ دنیا سے منہ پھیر لینا اور اہل دنیا کی تکلیفیں برداشت کرنا ہے۔ مگر ترک دنیا میں حد سے تجاوز نہ کرو، ورنہ اس کی تاریکی تمھیں ڈھانک لے گی اور تمھارے اعضا اس کے لیے کھل جائیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس سے باہر نکل آنے کے بعد تم ہمت، فکر، ارادہ یا حرکت کے ذریعہ سے اُسے گلے لگانے کو دوڑو گے۔

فرماتے ہیں ایک ہی خصلت، یہی ہے جو اعمال کو باطل کر دیتی ہے اور اکثر لوگوں کو اس میں تنبہ نہیں ہوتا اور وہ اللہ جل شانہٗ کے حکم پر بندے کا ناراض ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ذَالِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ۔ (اس سبب سے ہے کہ خدا نے جو اتارا اُسے ان لوگوں نے ناپسند کیا، پس ان کے اعمال غارت کر دیے)۔

فرماتے ہیں دو نیکیاں ایسی ہیں کہ ان کے ساتھ گناہوں کی کثرت بھی ہو تو ضرر نہیں ہوتا۔ ایک قضائے الٰہی پر رضامندی دوسرے اللہ جل شانہٗ کے بندوں سے درگزر۔

فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو ولی و شفیع بنا لینا بھی اللہ کے ساتھ دوسرے کو شریک ٹھہرانے کی ایک صورت ہے، وہ فرماتا ہے:

مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ۔ (اس اللہ کے سوا تم لوگوں کا نہ تو کوئی کارساز ہے اور نہ سفارشی کیا تم نہیں سوچتے)

فرماتے ہیں اللہ جل شانہٗ کے سوا خلق سے مدد چاہنا اللہ تعالیٰ سے سوء ظن رکھنا ہے۔

فرماتے ہیں جو کامل ہوتے ہیں وہ اوصاف حق کے بھی حامل ہوتے ہیں اور اوصاف خلق کے بھی۔ خَلق کے اعتبار سے انھیں دیکھو گے تو تمھیں بشر کے اوصاف نظر آئیں گے اور اگر حق کی حیثیت سے دیکھو گے تو ان میں حق کے اوصاف پاؤ گے۔ جن سے حق تعالیٰ نے انھیں آراستہ کیا ہوگا۔ پس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی پیروی سے تمھیں ان کے ظاہر میں فقر اور باطن میں غنا نظر آئے گا۔

فرماتے ہیں پہلی منزل جس میں پستی سے ترقی کر کے اوپر کی طرف جانے کے لیے عاشق قدم رکھتا ہے نفس ہے۔ پس

جب وہ اس کی سیاست وریاست میں مشغول ہوا، یہاں تک کہ اس کی شناخت اور تحقیق تک پہنچ گیا تب اس پر دوسری منزل کے انوار چمکتے ہیں اور وہ قلب ہے۔ اور جب اس کی سیاست میں مشغول ہو کر اسے پہچان لیا اور اس کا کچھ بھی اثر اس پر نہ ہوا تب تیسری منزل کے انوار اس پر چمکتے ہیں اور وہ روح ہے۔ پس جب اس کی سیاست میں مشغول ہوا اور اس کی معرفت کامل ہوگئی، تب اس پر تھوڑے تھوڑے یقین کے انوار چمکتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اس کی تہ تک پہنچ جاتا ہے، مگر یہ عوام کا راستہ ہے۔ خواص کا جو راستہ ہے وہ بادشاہی راہ ہے، جس کی اقل قلیل کی شرح بھی عقل میں نہیں آسکتی۔

آپ نے متعدد حج کیے اور ایک مرتبہ حج ہی کے ارادہ سے جا رہے تھے کہ افریقہ کے ایک جنگل سے گزر ہوا۔ اس جنگل کا نام عیذاب تھا، جس میں کہیں میٹھا پانی نہ تھا۔ آپ کو پیاس نے بہت پریشان کیا، چنانچہ پیاس ہی کے باعث ۲۹۵ھ یا ۲۹۶ھ میں وہاں وفات پائی اور اسی جگہ دفن ہوئے۔

حضرت شیخ حمید الدین ناگوریؒ

ولادت ——————— بخارا

وفات ——————— دہلی ۶۴۱ / ۶۴۳ھ [۱]

سرچشمۂ ہدایت و منبع علم و معرفت قاضی شیخ حمید الدین ناگوریؒ برعظیم پاکستان و ہند کے ان مشائخ کرام میں سے ہیں، جنھوں نے علم و معرفت کی ضیا باریوں سے اس خطہ کو منور کیا۔ غوثِ دوراں خواجہ بختیار کاکیؒ کے دوست اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید تھے۔ اولیائے چشت میں شمار کیے جاتے ہیں۔

نام اور خاندان آپ کا اسم گرامی محمد تھا، مگر حمید الدین کے نام سے مشہور ہوئے۔ والد کا نام نامی عطاء اللہ محمود البخاری تھا جو سلطان معز الدین عرف شہاب الدین غوری کے زمانہ میں بخارا سے واردِ ہند ہوئے اور دہلی میں قیام فرمایا۔ ان کی وفات بھی یہیں ہوئی۔

ابتدائی حالات علوم ظاہری میں آپ درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے اور درس دیا کرتے تھے۔ اسی وصف کے طفیل والد کی وفات پر بادشاہ نے آپ کو ناگور کا قاضی مقرر کر دیا۔ تین سال تک اس منصب پر فائز رہے۔ پھر دل برداشتہ ہو کر اس عہدے کو چھوڑ دیا اور بغداد پہنچ کر شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے بیعت کی اور سال بھر ان کی خدمت میں رہ کر مجاہدے اور ریاضتیں کیں۔ شیخ نے دولتِ خرقہ خلافت سے فیض یاب کیا۔ اس زمانہ میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی بغداد میں تشریف فرما تھے۔ ان سے گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔ ایک دوسرے سے بہت محبت ہو گئی اور یہ تعلقات آخر دم تک قائم رہے۔

بغداد میں ایک سال گزارنے کے بعد مدینہ طیبہ کا رُخ کیا۔ ایک سال سے زیادہ عرصہ تک روضۂ اطہر کے مجاور بنے رہے پھر مکہ معظمہ گئے۔ "اخبار الصالحین" کے بیان کے مطابق ایک سال، اور "بزم صوفیہ" کے بیان کے مطابق تین سال تک مکہ معظمہ میں رہے اور وہاں کے بزرگوں سے کسبِ فیض کیا۔

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ایک روز قاضی حمید الدین ناگوری نے ایک بزرگ کو بیت اللہ کا طواف کرتے دیکھا۔ آپ بھی ان کے پیچھے طواف میں مشغول ہو گئے۔ اور تبرک کے طور پر ان کے قدم پہ قدم رکھتے جاتے تھے۔ اس بزرگ کو اس بات

---

[۱] "بزم صوفیہ" میں تاریخ وفات رمضان ۶۴۱ھ درج ہے اور اخبار الصالحین کے مصنف نے ۵ رمضان ۶۴۳ھ تحریر کی ہے۔

کا علم ہوگیا تو کہا حمیدالدین! ظاہری متابعت کرنی آسان ہے۔ متابعت اس شے کی کرو جو مجھے طواف میں حاصل ہے۔ حمیدالدین نے پوچھا وہ کیا ہے۔ بزرگ نے جواب دیا، میں ہر قدم پر قرآن ختم کرتا ہوں۔ ان کے دل میں خیال آیا کہ شاید معانی قرآن سے مراد ہے۔ بزرگ نے صفائی باطن سے معلوم کرکے فرمایا کہ معناً نہیں بلکہ لفظاً۔ غرض ایسے بزرگوں سے ملاقات کرکے مکہ معظمہ سے لوٹے اور سلطان شمس الدین التمش کے زمانہ میں دہلی تشریف لائے جو صدر مقام تھا۔

دہلی میں قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملاقات ہوئی اور ان کے ساتھ رہنے لگے۔ یہ تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ دونوں بزرگوں کے مزارات بھی ایک ہی جگہ پر ہیں۔

لطائف اشرفی میں لکھا ہے کہ خواجہ بختیار کاکیؒ نے قاضی صاحب کو خرقۂ خلافت بھی عطا کیا تھا۔ سیر الاقطاب کا بیان ہے کہ حمیدالدین ناگوری خواجہ بختیار کاکیؒ کے استاد تھے۔ خواجہ صاحب نے علوم ظاہری کی تعلیم انھیں سے حاصل کی تھی۔

> اگرچہ حضرت قاضی حضرت خواجہ کے استاد تھے، لیکن ادب اور خدمت میں اس قدر لگے رہتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ خواجہ قطب الدین قطب المشائخ ہیں اور قاضی حمیدالدین سے ہزار درجہ بزرگ اور برتر۔ وہ ان کے ایک بال کی بھی برابری نہیں کر سکتے۔ بالآخر قاضی کو حضرت خواجہ سے خلافت ملی حالانکہ ان کے پیر سے مل چکی تھی۔ (سیر الاقطاب)

بختیار کاکیؒ نے اپنے ملفوظات میں حضرت حمیدالدین ناگوری کو استاد کی حیثیت سے یاد نہیں فرمایا بلکہ اپنا "یارِ غار" بتاتے ہیں۔ (فوائد السالکین، مجلس اول)

سماع کا شوق آپ کو سماع کا بہت شوق تھا اور اکثر ایسی محفلیں منعقد کیا کرتے تھے۔ خواجہ بختیار کاکیؒ بھی ان کی ایسی مجالس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ چونکہ بہت سے علمائے عصر سماع کو جائز نہ سمجھتے تھے، اس لیے انھیں قاضی صاحب سے پرخاش ہوگئی اور آپ کی مخالفت میں لگ گئے۔ خصوصاً مولانا رکن الدین سمرقندی جو اس زمانہ کے جید علما تھے اور سماع کے سخت خلاف تھے وہ آپ کی مخالفت شدت سے کرنے لگے۔

ایک مرتبہ سلطان التمش کے محل کے قریب ایک مکان میں مجلس سماع منعقد تھی۔ قاضی حمیدالدین اور خواجہ بختیار کاکیؒ دونوں اس مجلس میں موجود تھے۔ رکن الدین سمرقندی کو خبر ملی تو کچھ ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچے کہ مجلس کو روک دیں۔ قاضی صاحب کو پتہ چلا کہ رکن الدین آتے ہیں تو صاحب خانہ سے کہا کہ تم کہیں چھپ جاؤ، تاکہ جب رکن الدین آئیں اور اندر آنے کی اجازت تم سے طلب کریں تو تمھیں غیر حاضر پاکر واپس چلے جائیں، اور اگر بلا اجازت گھر میں داخل ہو گئے تو یہ فعل خلاف شرع ہوگا اور ہم ان سے مواخذہ کریں گے۔ صاحب خانہ نے ایسا ہی کیا۔ مولانا رکن الدین آئے اور اندر آنے کی اجازت چاہی تو یہ معلوم کرکے کہ صاحب خانہ غیر حاضر ہے واپس چلے گئے اور اس طرح معاملہ ٹل گیا۔

کئی اور موقعوں پر بھی قاضی حمیدالدین پر سماع کے سلسلے میں پابندی عائد کرنے کی کوشش کی گئی اور ان کی مجالس کو

روکا گیا۔ مگر وہ اس سے مجتنب ہوئے ۔

فوائد الفواد میں لکھا ہے کہ قاضی صاحب کو بابا فرید الدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی بہت محبت تھی۔ ایک دن بابا صاحب کا بھی جی چاہا کہ مجلس سماع میں آئیں، لیکن جس مجلس میں جانے کا خیال تھا اس میں اتفاق سے قوال ہی نہ آئے۔ بابا صاحب نے شیخ بدر الدین اسحاق سے فرمایا مجھے قاضی حمید الدین نے خط لکھا تھا وہ لاکر پڑھو۔ خط میں لکھا تھا "فقیر حقیر نحیف محمد عطا کہ بندۂ درویشاں است و از سر و دیدۂ خاک قدم ایشاں"۔ بابا صاحب نے جب یہ الفاظ سنے ایک حالتِ ذوق طاری ہوئی، اور خواجہ فرمانے لگے۔ پھر یہ رباعی پڑھی جو خط میں درج تھی :

آں عقل کجا کہ در کمالِ تو رسد — آں روح کجا کہ در جلالِ تو رسد
گیرم کہ تو پردہ برگرفتی ز جمال — آں دیدہ کجا کہ در جمالِ تو رسد

شیخ نصیر الدین اودھی کا بیان ہے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ایک مرتبہ دہلی میں سخت قحط پڑا اور غلہ بہت کم یاب ہو گیا۔ لوگ فاقوں مرنے لگے۔ سلطان التمش نے یہ حال دیکھا تو قاضی حمید الدین اور دوسرے بزرگوں سے درخواست کی کہ وہ توجہ فرمائیں تاکہ بارش ہو اور غلہ ارزاں ہو سکے۔ قاضی حمید الدین نے کہلا بھیجا کہ محفل سماع منعقد کی جائے اور درویش ذوق سماع میں مشغول ہوں، انشاء اللہ ضرور بارش ہوگی۔ سلطان حکم بجالایا۔ مجلس منعقد کی گئی۔ سماع شروع ہوا جب مجلس گرم ہوئی تو بارانِ رحمت کا نزول شروع ہو گیا۔ اور خوب پیداوار ہوئی۔ قحط جاتا رہا۔ اس مجلس میں کئی اولیاء اللہ موجود تھے۔ مثلاً شیخ علی سنجری (قاضی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید)، شیخ احمد نہروانی، شیخ بدر الدین سمرقندی، شیخ سیف الدین ۔ ۔ ۔ شیخ رکن الدین سمرقندی الفردوسی، سید قطب الدین غزنوی، برادر زادہ شیخ نور الدین مبارک، شیخ نظام الدین ابو المؤید اور شیخ موعنہ دوز۔

درجۂ کمال | شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ حضرت حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی بعض تصانیف میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں میرے بہت سے خلفاء ہیں جن میں بزرگ ترین خلیفہ شیخ حمید الدین ناگوری ہیں۔ بابا فرید الدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تصانیف میں قاضی صاحب کا ذکر بار بار کیا ہے۔ مولانا قطب الدین کاشانی دہلی تشریف لائے تو فرمایا کہ مجھے حمید الدین کا عشق یہاں کھینچ کر لایا ہے۔ انھوں نے قاضی صاحب کی تمام تصانیف منگا کر مطالعہ کیں۔ اور ساتھیوں سے فرمایا دوستو، جو کچھ میں نے اور تم نے پڑھا ہے وہ سب ان کتابوں میں موجود ہے اور جو کچھ نہیں پڑھا وہ بھی ان میں لکھا ہے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کا ارشاد ہے کہ جو حال اور کمال شیخ حمید الدین کو خدا کی طرف سے عطا ہوا وہ ہر کسی کے حصے میں نہیں آیا۔ مولانا عبد الحق محدث دہلوی اپنی کتاب اخبار الاخیار میں فرماتے ہیں: "او جامع بود میان علوم شریعت و طریقت و حقیقت"۔

سفینۃ الاولیا میں لکھا ہے: "در تجرید و تفرید یگانۂ عصر و از متقدمان مشائخ ہند و جامع میان علوم ظاہری و باطنی و

صاحب کرامات و مقامات علیہ بودند"

آپ نے ان تمام محاسن اور کمالات صوری و معنوی کے باوجود صرف تین حضرات کو مرید کیا اور تینوں صاحب کشف و کرامات تھے۔ شیخ احمد تروانی، شیخ رسی تاب اور شیخ معین الدین قصاب، شیخ رسن تاب بعد میں شیخ شاہی موئے تاب کے نام سے مشہور ہوئے۔

آپ کے صاحبزادے ناصح الدین آپ کے بعد سجادہ نشین ہوئے اور رشد و ہدایت کی تلقین کرتے رہے۔

سلوک اور اسرار میں آپ کی تصانیف بہت ہیں۔ ان میں سے صرف طوالع الشموس کا پتہ ملتا ہے۔ یہ کتاب حقیقت و معرفت سے لبریز ہے۔ اخبار الاخیار میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس کتاب کے بعض اقتباسات دیے ہیں۔ کتاب کے بعض مندرجات یہ ہیں[1]:

اے برادر عالم سلوک میں جمعیت محال ہے اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ، پس کسی کو اگر جمعیت نصیب ہو سکتی تو سَیَهْدِیْنِ نہ کہتے۔ جب بندہ واصل ہو جاتا ہے تو تفرقہ ضلالت کہا جاتا ہے۔ انا الحق و سبحانی اسی معنی کو آشکارا کرتے ہیں، جس مقام پر اَنَا کہنا چاہیے وہاں ھُو کہنا گمراہی ہے اور جہاں ھو کہنا چاہیے وہاں انا کہنا محال ہے۔

اے برادر حس کا اشارہ محسوسات کی طرف ہوتا ہے اور وہم کا اشارہ موہومات کی طرف ہوتا ہے اور عقل کا اشارا معقولات کی طرف ہوتا ہے۔ خالق جل علی کی ذات پاک ان عوالم سے نسبت نہیں رکھتی۔ پس اس کی طرف اشارہ کرنا شرک کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگر وہ غائب ہے تو کس کی طرف تم اشارہ کرتے ہو اور اگر حاضر ہے تو اشارا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ خالق الخلق ہم سب کو دیکھتا ہے، لیکن اسے کوئی نہیں دیکھتا۔ خدائے عز و جل کی عزت کی قسم اس کی طرف اشارا کرنا بس غفلت دل ہی سے ہوتا ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه جس دل پر اس کی نعمت کی تجلّی ہوتی اسے اس کی یادداشت کی پرواہی نہ رہتی چونکہ دل یادداشت سے باز نہیں رہ سکتا، اس لیے زبان بھی یاد کرنے سے باز نہیں رہ سکتی۔

اے برادر تو اپنے آپ کو بھول جا اور چپ رہ۔ یہی خود فراموشی عجیب طرح پر یاد کرنے میں داخل سمجھی جائے گی اذْكُرْ رَبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ، قبل اذا نسیت نفسک۔ اے عزیز! اسم ھو اس ذات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو موجود ازلی، ہست لم یزلی، موصوف بہ اوصاف کمال و مقدس، از نقائص و نقد زوال ہے۔ وہ ایسا موجود ہے کہ اس کی زیست کی ابتدا نہیں ہے اور ایسا ہست ہے کہ اس کی ہمیشگی کی انتہا نہیں ہے اور ھو پہلا اسم ہے جو غیب کے پردوں پر عالم ظہور میں آیا ہے۔

اے برادر یہی اسم ھو اسم ذات مطلق ہے۔ یہ نہ مشتق ہے اور نہ معلوم ہے اسم مشتق اشتراک غیر سے خالی نہیں ہوتا اور وحدت کی بنیاد بلند اس پر قائم نہیں ہوتی۔ تمام عشاق کا اتفاق ہے کہ اسم اعظم ھو مشتق نہیں ہے اور سوائے وحدت مطلق

---

[1] منقول از "اخبار الصالحین"

اور کسی پر اس کا اطلاق نہیں ہے۔ اسی نسبت کے لحاظ سے بھی ھُو اسم اعظم ہے۔ جو اسم کسی چیز سے مشتق نہیں ہے وقت طلب
طالب کی نظر دو چیزوں پہ پڑتی ہے اور عقل کا حق یہ ہے کہ جس کسی چیز پر نظر ڈالے تو جب تک اس کی حقیقت معلوم نہ ہو جائے
دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کرے۔ یہ لفظ کسی چیز سے مشتق نہیں ہے تاکہ طالب میں دُور بینی پیدا کرے۔ طالب کو یہ غیر سے منقطع
کر کے مطلوب سے ملا دیتا ہے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اس میں ھو اللہ اور احد تین اسمائے باری تعالیٰ ہیں۔ راہِ عشق کے چلنے
والے بھی تین ہیں۔ ظالم، مقتصد و سابق مراتب نفوس بھی تین ہیں۔ امّارہ، لوّامہ و مطمئنہ۔ اسم مقربانِ سابق کو ملا جو ارباب
نفوس مطمئنہ ہیں اور پرتو انوار احدیت میں جل بھن گئے ہیں۔ غیر کے دیکھنے سے انھوں نے اپنی آنکھ سی لی ہے اور
مقامِ استغراق میں ہر شے سے بے شعور ہیں اور اس کے لطف کے نور میں جذب ہو گئے ہیں۔ اسم ھو اسم اللہ کی منتہا ہے۔ جس کی
جان بادشاہ کے عشق میں ڈوبی ہوئی ہے وہی اس راز سے آگاہ ہے۔ اے عزیز جس کسی کو کہ ہیبت محبوب کے عالم میں حاضری
کی اجازت دی گئی ہے وہ اپنی انانیت میں نہیں پڑتا بلکہ غلبہ مشاہدہ جلال سے گھل جاتا ہے اور اپنے سے بے شعور اس نور
کے سایے میں چلا جاتا ہے۔ مقامات و کرامات اور سکر و صحو اور محو اور اثبات و محو اور فنا و بقا اور خوف و رجا اور بسط و قبض اور نفل
و فرض اور انس و ہیبت اور سرور و ہیبت کی اس کی طرف اضافت نہیں ہو سکتی جیسا کہ محبوب بے نشان ہے وہ بھی بے نشان
ہو جاتا ہے۔ اے برادر جو اسے پہچان لیتا ہے شان بیچونی سے پہچانتا ہے۔ بے چون کی طرف اشارہ کرنا محال ہے اور بیچون
کی حقیقت عبارت میں لانا ضلال ہے۔ انجام کار یہی کہنا پڑتا ہے لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ۔
اپنی جان کی قسم اگر شروع ہی میں وہ معنی معلوم ہو جائے تو انتہائے کار میں زبان کو گنگ کر دیا کرتے ہیں تو ہر روز سو بار استغفار
کرنا پڑتا ننانوے ناموں کے حساب سے ننانوے بار اور استغفار کے واسطے ایک مرتبہ استغفار۔ اے برادر جس کسی کی
زبان مقام تحمید میں نہ کھلی وہ مقام توحید میں کیا دم مار سکتا ہے۔ لا احصی ثناءً علیک لا الٰہ الا اللہ!

حُبُّ مُنَاجَاتِ الْحَبِیْبِ بِاَوْجُهٍ　　وَلٰکِنْ لِسَانَ الْعَاشِقِیْنَ کَلِیْلُ

یعنی اپنے حبیب سے بہتر طرح پر مناجات کرنا پسند کرتا ہوں لیکن کیا کروں عاشقوں کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔

ما ہر چہ داشتیم فدائے تو کردہ ایم　　جان را اسیر بند ہوائے تو کردہ ایم
ما کردہ ایم ترک خود و ہر دو کون نیز!　　دینہا کہ کردہ ایم برائے تو کردہ ایم

غرض اس کتاب میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسما کی شرح ہے اور دو جلدوں پر مشتمل ہے۔
خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ نے قاضی صاحب کی دو کتابوں تواریخ اور راحۃ الارواح کا حوالہ اپنے ملفوظات میں دیا ہے۔
سیرالعارفین میں قاضی صاحب کی ایک اور کتاب لوائح کا بھی ذکر ہے۔

حضرت شیخ جلال الدین تبریزی سہروردیؒ

ولادت ——————— تبریز

وفات ——————— بنگال ۶۴۲ھ

علوم ظاہر و باطن کے مدارج اور عشق و محبت کے شہباز شیخ المشائخ ابوالقاسم جلال الدین تبریزی قدس سرہ العزیز اپنے زمانے کے اولیاء اللہ میں سے تھے۔ صاحب علم و معرفت اور کشف و کرامت بزرگ تھے۔

ترک سلطنت | آپ ابتدا میں بڑے پُرشکوہ اور زبردست بادشاہ تھے۔ اچانک عشق الٰہی سے دل روشن ہوگیا اور بادشاہت اپنے بیٹے کے سپرد کرکے بہت سا مال و دولت لے کر شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ سب کچھ نذر کے طور پر ان کے سامنے رکھ دیا۔ شیخ نے ارشاد فرمایا کہ اسے مساکین میں تقسیم کر دو۔ پھر فرمایا ابھی تک بادشاہی کی بُو تم میں باقی ہے۔ لہٰذا تمھارے سپرد یہ کام کیا جاتا ہے کہ چار سال تک درویشوں کے استنجے کے لیے ڈھیلے اور وضو کے لیے پانی مہیا کرتے رہو۔ آپ نے دل و جان سے یہ خدمت قبول کی۔ شیخ آپ کی خدمات سے بہت خوش ہوئے۔ جس شوق اور تن دہی کے ساتھ آپ نے اپنا فریضہ ادا کیا، اس نے شیخ کو بے حد متاثر کیا اور شیخ نے پہلی ہی نظر میں دولت عرفان سے مالا مال کر دیا۔ آپ سفر میں شیخ کے ساتھ رہتے اور خوراک کا سامان، چولہا اور آگ ہمیشہ پاس رکھتے، تاکہ جب بھی پیرومرشد کھانا طلب کریں فوراً بنا دیں۔ چولہا ہمیشہ سر پر اٹھائے پھرتے تھے۔

خلوص اور ریا کا فرق! | مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے سفر کے دوران شیخ کی سواری کے ساتھ سخت گرمی اور دھوپ میں پیدل چلے جاتے تھے اور پاس ادب کی خاطر اونٹ پر سوار نہ ہوتے تھے۔ ایک دفعہ واپسی پر معتقدین نے بہت سے تحائف پیش کیے۔ ایک غریب عورت آگئی اس نے بھی ایک درم نذر کیا۔ شیخ نے درویشوں کو حکم دیا کہ جس کا جو جی چاہے اٹھا لے۔ سب نے مختلف چیزیں اٹھالیں مگر آپ نے بڑھیا کا وہ درم لے لیا۔ شیخ نے دیکھا تو فرمایا، جلال الدین! اگرچہ بظاہر تو نے ایک درم اٹھایا ہے جو حقیر چیز ہے مگر حقیقت میں تو نے وہ چیز اٹھائی ہے جو زر و جواہر کے اس سارے انبار میں قیمتی اور انبار کی روح تھی۔ تُو نے تو دوسروں کے لیے کچھ نہ چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ کمی بیشی کو نہیں دیکھتا۔ خلوص نیت کو دیکھتا ہے۔ ایک نیک عورت نے جو درہم پیش کیا تھا، پورے خلوص اور جوش کے ساتھ پیش کیا تھا اس لیے جو کچھ تھا وہی تھا۔

ورود دہلی | شیخ کی خدمت میں آپ سات سال تک رہے۔ اس اثنا میں مخدوم بہاؤالدین بغداد تشریف لائے۔ یہ بھی حضرت شیخ کے خلیفہ تھے۔ ان میں اور شیخ جلال الدین میں باہم دوستی ہوگئی اور ایک دوسرے سے بہت انس پیدا

ہو گیا۔ دونوں زبردست عارف تھے۔ مخدوم بہاؤالدین کو پیرومرشد نے ملتان جانے کا حکم دیا تو باہمی دوستی کے باعث شیخ جلال الدین بھی ان کے ساتھ ملتان آ گئے۔ پھر کچھ مدت بعد آپ دہلی چلے گئے۔

دہلی پہنچنے پر چاروں طرف آپ کے کمالات کا چرچا ہونے لگا۔ پورا شہر آپ کے استقبال کے لیے آ پہنچا۔ خود سلطان التمش اپنے اعیانِ سلطنت کے ساتھ پیشوائی کے لیے آیا۔ اور شاہانہ طریقہ پر آپ کو اپنے ہاں مہمان ٹھہرایا۔ بعد ازاں آپ قطب صاحب سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے۔ اس وقت قطب صاحب سماع کی مجلس میں تشریف فرما تھے۔ خبر ملتے ہی باہر تشریف لائے اور بڑی محبت اور عزت کے ساتھ اندر لے گئے۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

قطب صاحب اور شیخ جلال الدین میں صحبتیں ہونے لگیں۔ ان محفلوں میں قاضی حمید الدین ناگوری بھی ہوتے۔ کبھی کبھی مخدوم بہاؤالدین بھی ملتان سے تشریف لے آیا کرتے تھے۔ کبھی قطب صاحب اور شیخ جلال الدین ملتان چلے جاتے۔ غرض تینوں بزرگوں میں دوستی بڑھ گئی۔ شیخ الاسلام نجم الدین ان بزرگوں کے خلاف دل میں کینہ رکھتے تھے، چنانچہ وہ سماع کے مسئلہ کو لے کر ہر دو بزرگوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ طرح طرح کے فتوے شائع کرائے، جن میں سماع کو خلاف شریعت قرار دیا گیا۔ غرض بعض علما کو نجم الدین نے ان کے خلاف صف آرا کر دیا۔

ان علماء نے بادشاہ کو بھی ان بزرگوں کے خلاف اکسانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اور ہر جائز ناجائز طریق سے ان کے خلاف لوگوں کو برانگیختہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک حسین طوائف کو بے شمار روپیہ دے کر اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ شیخ پر زنا کی تہمت لگائے، مگر اس سے بھی ان کا مقصد پورا نہ ہوا[1]۔ اتنا ضرور ہوا کہ مجلس سماع پر فوجی پہرے بٹھا دیئے گئے۔

بدایوں میں سکونت ان حالات کو دیکھ کر شیخ جلال الدینؒ نے دہلی چھوڑ دی اور بدایوں تشریف لے گئے جو اس زمانے میں ملتان، اجمیر، دہلی، لاہور اور پاک پٹن کی طرح نہایت اہم، مشہور اور بارونق شہر تھا۔ دہلی کے بعد اس شہر کو جنوب و مشرق میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ صوبے کا صدر مقام اور علماء و فضلا کا گہوارہ تھا۔ بہت سے قدیم بزرگ بھی اسی جگہ دفن تھے۔ کئی سہروردی بزرگ یہاں پہلے سے موجود تھے۔ اس لیے یہ روحانی و خاندانی تعلق شیخ جلال الدین کو یہاں لے آیا۔ آپ کی تشریف آوری سے یہاں اور زیادہ رونق ہو گئی اور شہر کی تقدیس اور عظمت میں بھی اضافہ ہو گیا۔

قاضی کمال الدین بدایوں کا حاکم تھا۔ شیخ جلال الدینؒ کی ان سے بڑی دوستی ہو گئی۔ الف خاں محل کے نزدیک ایک مسجد آج بھی موجود ہے، وہ آپ ہی نے بنوائی تھی۔ اس کا سنگ بنیاد نصب کرتے وقت آپ نے معماروں کو کعبہ شریف

---

[1] اخبار الصالحین میں لکھا ہے کہ تہمت کا پروگرام تیار ہو جانے کے بعد شیخ نجم الدین نے ایک محضر تیار کرایا جس میں شیخ بہاؤالدین زکریا کو بھی بلایا، وہ بھی آ گئے۔ سلطان اور دوسرے علما بھی بلائے گئے۔ نماز جمعہ کے بعد طوائف کو بلایا گیا۔ شیخ بہاؤالدین نے طوائف سے پوچھا کہ تجھے لازم ہے کہ سچ بولے ورنہ جھوٹ کی سزا پائے گی۔ وہ بولی کہ حق تعالیٰ حاضر و ناظر ہے یہ الزام محض دروغ و افترا ہے۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزی آب حیات سے زیادہ پاک و صاف ہیں۔ شیخ نجم الدین نے مجھے پانسو دینار دلا کے بابا عضد کے ذریعہ سے اس طرح بات کہنے کی ہدایت کی تھی۔ اس بقال کو بھی بلا کر پوچھا گیا تو اس نے تائید کر دی۔ چنانچہ سلطان نے شیخ نجم الدین کو بلا کر شیخ الاسلام کے منصب سے معزول کر دیا اور خاندان شیخ بہاؤالدین زکریا کو یہ منصب عطا کر دیا۔

آنکھوں سے دکھا دیا تھا، تاکہ سمجھنے کے رُخ میں فرق واقع نہ ہو۔

ایک روز ایک ندی کے کنارے اپنے دوستوں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ دفعتہً اٹھے اور وضو کرنے لگے فرمایا "نجم الدین صغریٰ کے جنازہ کی نماز پڑھ لیں، اگرچہ مجھے اسی کی شرارتوں کے باعث دہلی چھوڑنی پڑی، مگر بالآخر وہ میرے پیر و مرشد کی برکت سے ملک عدم کو سدھارا"۔ کچھ دنوں بعد نجم الدین کی وفات کی خبر مل گئی۔ حساب لگانے پر معلوم ہوا کہ آپ نے ٹھیک موت کے دن اس کی نماز جنازہ پڑھی تھی۔

حاکم بدایوں سے دوستی کے باعث اس کے ہاں آپ جایا کرتے تھے۔ ایک دن آپ اس کے ہاں گئے تو خادم نے عرض کیا آپ تشریف رکھیے وہ نماز پڑھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا "کیا قاضی بھی نماز پڑھنی جانتا ہے؟" اور واپس چلے گئے۔

حاکم چونکہ علوم ظاہری کا منتہی تھا اور پھر حاکم بھی تھا، اپنے متعلق شیخ جلال الدینؒ کا یہ جملہ سُن کر مکدر ہو گیا۔ سیدھا آپ کے مکان پر آیا اور پوچھا کیا آپ نے میرے متعلق یہ جملہ کہا تھا۔ حاکم کا خیال تھا کہ شیخ میرے رعب میں آ جائیں گے مگر شیخ نے ذرا پروا نہ کی اور جواب دیا ہاں میں نے ایسا کہا تھا۔ وہ بولا اگر میں عالم و فاضل ہونے کے باوجود نماز پڑھنا نہیں جانتا تو پھر اور کون ہے جو نماز پڑھنی جانتا ہے۔ فرمایا بھائی علماء کی نماز اور ہے اور فقراء کی اور۔ حاکم نے جواب دیا کہ کیا فقرا کوئی اور قسم کا قرآن پڑھتے ہیں، اور ان کا رکوع اور سجدہ بھی کسی اور طریقہ کا ہوتا ہے؟ آپ نے جواب دیا قرآن اور طریقہ دونوں ہی ہیں مگر علما تو صرف قیاساً کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں لیکن فقرا جب تک کعبہ کو دیکھ نہیں لیتے تکبیر نہیں کہتے اور ان کی اوّل درجہ کی نماز یہ ہے کہ عرش پہ پڑھی جائے۔ حاکم اس بات کو بھی خاطر میں نہ لایا۔ اس نے خیال کیا کہ شیخ اپنی کرامت کا اظہار کرتے ہیں اور بتانا چاہتے ہیں کہ میں کعبہ کو دیکھتا اور عرش پہ نماز ادا کرتا ہوں۔ مگر چونکہ دوستانہ تعلقات تھے اس لیے کچھ نہ کہا اور چلا گیا۔ رات کو قاضی صاحب (حاکم) نے خواب میں دیکھا کہ شیخ عرش معلّیٰ پر جا نماز بچھائے نماز پڑھ رہے ہیں۔

یہ محض ایک اتفاق تھا کہ قاضی صاحب ایک ضیافت میں شریک ہوئے۔ شیخ نے گفتگو کے دوران فرمایا کہ علماء کی معراج صرف یہی ہے کہ وہ متولی ہوں یا مدرس اور پڑھیں تو قاضی بن جائیں۔ اس سے بھی زیادہ ترقی کی تو صدر الصدور بن گئے اور بس۔ لیکن فقراء کے مراتب کی کوئی حد نہیں۔ ان کا پہلا مرتبہ وہ ہے جو آج ہی رات کو قاضی صاحب نے خواب میں دیکھا۔

علی مولا قاضی صاحب رات خواب دیکھ ہی چکے تھے اور حقیقت نے ان کی حکومت کے غرور کو پامال کر دیا تھا اور عار کا خیال چھوڑ کر بھری محفل میں اٹھے اور اپنا سر آپ کے قدموں میں رکھ دیا اور اپنے لڑکے برہان الدین کو بھی اس وقت حضرت شیخ کا مرید کرایا۔ شیخ برہان الدین نے بعد ازاں درجہ کمال کو پہنچ کر حضرت شیخ سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ شیخ علی مولا بھی آپ کے خلیفہ تھے اور یہ دونوں بدایوں میں رہے۔ نظام المشائخ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز آپ اپنے دروازہ کی چوکھٹ پر بیٹھے تھے کہ ایک شخص سر پر دہی کا مٹکا رکھے فروخت کر رہا تھا۔ یہ شخص چندوں کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ آپ نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا "سبحان اللہ دنیا میں ایسے مرد

بتی ہیں۔" اور حالت ایسی متحیر ہو گئی کہ اسی وقت ہندو مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر لیا اور مولا کی بجائے اس کا علی نام رکھا گیا۔ علی مولا نے ایک لاکھ روپیہ جو مدفون رکھا تھا لا کر نظام المشائخ کی خدمت میں پیش کیا، اور مرید ہو کر خلافت کے درجہ کو پہنچا۔

سیاحت شیخ جلال الدین بدایوں سے اودھ گئے پھر بہار کی سیاحت کرتے ہوئے بنگال پہنچے جو اس وقت کفرستان کا مرکز تھا۔ وہاں پہنچ کر پنڈوہ کے قصبہ میں سکونت اختیار کی۔ جو ضلع مالدہ میں لکھنوتی کے قریب ایک مشہور اور قدیم قصبہ تھا۔ یہ جگہ ہندوؤں کے متبرک تیرتھ کی حیثیت رکھتی تھی۔ ہندوؤں کے بہت سے مندر تھے اور ہر وقت ناقوسوں کی صدا گونجتی رہتی تھی۔ بنگال میں اسلامی سلطنت کو قائم ہوئے تھوڑی ہی مدت گزری تھی اور لکھنوتی اس کا صدر مقام قرار پایا تھا۔ شیخ جلال الدینؒ نے اس کے قریب ہی پنڈوہ کے مقام کو اپنی سکونت کے لیے منتخب کیا۔ تاکہ حکومت کو بھی متاثر کر سکیں، پھر یہ کہ یہاں رہنے سے طول و عرض بنگال میں اسلام کی تبلیغ کے لیے ہر قسم کی سہولتیں میسر آ سکتی تھیں۔ اس مقام پر بنگال کے ہر گوشے سے لوگ تیرتھ یاترا کے لیے آتے تھے۔ ہر وقت میلا سا لگا رہتا تھا۔ لاکھوں ہندوؤں کا اجتماع ہوتا تھا مشہور سیاح ابن بطوطہ بھی تغلقوں کے عہد میں یہاں آیا تھا۔ شیخ جلال الدین سے بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ پنڈوہ کے متعلق ابن بطوطہ لکھتا ہے:

> "پنڈوہ میں ہندوؤں کا ایک مشہور مندر تھا جہاں کالی کی پوجا ہوتی تھی، جس کی زیارت کے لیے دُور دُور سے لوگ آتے تھے۔ بڑا اجتماع ہوتا تھا۔ اس مندر اور بت خانہ کی وجہ سے پنڈوہ کی شہرت سارے بنگال میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں بکثرت پجاری تھے اور بکثرت بت تھے۔ شیخ جلال الدین تبریزی سہروردی کی عمر ۱۵۰ سال کی ہو چکی ہے۔ دُبلے پتلے اور کشیدہ قامت شخص ہیں۔ میرے آنے کا حال اپنے کشف سے معلوم کر کے اپنے مریدوں کو دو منزل آگے میرے استقبال کو بھیج دیا۔ انھیں دیکھا ایک عمدہ قسم کا چغہ پہنے بیٹھے ہیں جو مجھے بہت پسند آیا۔ دل میں کہنے لگا کاش حضرت یہ چغہ مجھے عطا فرمائیں۔ انھوں نے اسی وقت چغہ اُتار کر مجھے عطا کر دیا اور مریدوں سے کہا کہ دے تو رہا ہوں مگر یہ چغہ ان کے پاس رہے گا نہیں۔ ایک کافر بادشاہ ان سے چھین کر میرے ہی بھائی کو دے دے گا۔ میں نے اسی وقت سے اس کی پوری حفاظت کی اور اس امر کا تہیہ کر لیا تھا کہ میں اسے کسی بادشاہ کے سامنے پہن کر جاؤں گا ہی نہیں، مگر ایک شیخ وقت کے منہ سے نکلی ہوئی بات ہرگز غلط نہ ہو سکتی تھی۔ چین میں جب پہنچا تو وہاں کے بادشاہ نے وہ چغہ مجھ سے بہ جبر چھین لیا کہ بہت خوبصورت اور قیمتی تھا، لیکن اس کے عوض اپنی طرف سے ایک بیش بہا خلعت، ایک گھوڑا اور کچھ نقد روپیہ عطا کیا۔ مجھے اس وقت شیخ کا قول یاد آیا، لیکن میری حیرت کا وہ عالم بھی دیکھنے کے قابل تھا، جب میں نے چین ہی کے ایک اور شہر میں وہ چغہ ایک اور درویش شیخ برہان الدین کو پہنے دیکھا۔ انھوں نے خود ہی

فرمایا، علامہ اس میں تحیّر کی کون سی بات ہے، میرے بھائی شیخ جلال الدین نے یہ چغہ حقیقت میں میرے ہی لیے بنایا تھا اور مجھے ایک خط میں اطلاع دی تھی کہ اطمینان رکھو تمھیں یہ چغہ کسی نہ کسی ذریعہ سے ضرور پہنچ جائے گا، یہی نہیں انھوں نے مجھے وہ خط بھی دکھایا۔"

اس کے بعد علامہ مغفور نے لکھا ہے کہ "شیخ تبریزی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ بہت مقتدر اور بلند پایہ بزرگ ہیں، جنھیں صرف ہندوستان ہی نہیں تمام دنیا کے معاملات میں بہت دخل ہے۔"

اس وقت پنڈوہ کی حالت یہ تھی کہ کسی مسلمان کی جرأت نہ تھی وہاں قدم رکھ سکتا۔ لیکن آپ تن تنہا وہاں گئے، اور ایک بڑے درخت کے نیچے بیٹھ رہے۔ سونے کی حاجت ہوتی تو زمین پر وہیں سو جاتے۔ درختوں کے پتے ان کی غذا تھی پاس کوئی زادِ راہ نہ تھا۔ کپڑے میلے ہو جاتے تو خود دھو لیتے۔ پجاریوں میں آپ کی آمد سے ایک شور مچ گیا۔ مخالفت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ آپ کو وہاں سے ہٹانے کی کوشش کی گئی مگر آپ نہ ہٹے۔ چنانچہ لوگوں نے آپ کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کیں، مگر بے سود۔ بالآخر آپ کی مساعی سے صدیوں کا کفر بنا ہوا شہر ایک انقلاب عظیم سے دوچار ہو گیا۔ لوگ آپ کی تعلیمات اور قوت روحانی سے متاثر ہو کر جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ پجاریوں کی دنیا میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا اور یہاں کا عظیم الشان بت خانہ اپنی شوکت و سطوت کھو بیٹھا۔ پھر وہ مسمار کر دیا گیا۔ اس لیے کہ کوئی اس بت خانے کا پجاری باقی نہ رہا سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ ہندو جوق در جوق آپ کے پاس کھچے چلے آتے تھے۔ وہی پجاری جو دن رات کالی کے مندر میں بیٹھے ناقوس بجایا اور گایا کرتے تھے۔ اسلام کے شیدائی ہو کر پانچ وقت نماز ادا کرنے لگے۔ جہاں پہلے مندر ہی مندر دکھائی دیتے تھے اب مسجدوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ بنگال میں آج مسلمانوں کی جو کثرت نظر آتی ہے وہ سب حضرت جلال الدین سہروردی ہی کے برکات و فیوض کا نتیجہ ہے۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ شیخ ہر روز صبح کی نماز کعبہ شریف میں پڑھا کرتے تھے ہر سال حج کے موقع پر طواف بیت اللہ میں موجود ہوتے، عرفہ اور عید کے روز ہمیشہ غائب رہتے، کسی کو یہ علم نہ ہوتا کہ آپ کہاں تشریف لے گئے۔

اخبار الصالحین کے بیان کے بموجب شیخ جلال الدینؒ بندرگاہ دیو محل کی طرف تشریف لے گئے، وہاں کفار کا ایک بڑا بت خانہ تھا۔ اس ملک کے لوگ جوق در جوق اس کی زیارت کے لیے جاتے تھے۔ شیخ نے تصرف باطنی سے ان بتوں کو شکست کیا اور اس ملک کے تمام کفار کو مسلمان کیا اور وہیں اپنا تکیہ بنایا اور جب انتقال ہوا تو وہیں دفن ہوئے۔ اب تک اسی بت خانہ میں قبر مبارک ہے۔ صاحب سیر العارفین لکھتے ہیں کہ اب تک وہاں کی نصف آمدنی آستانہ کے لیے وقف ہے۔ بنگالہ میں جہاں کہیں حضرت شیخ تشریف فرما ہوئے تھے، آج تک لوگ وہاں جبین اخلاص خاک پر ملتے ہیں۔ چنانچہ چند جگہ اور زیارت گاہیں مشہور ہیں۔ بعض لوگ غلطی سے آپ کو شمس الدین تبریزی کہتے ہیں۔ غرض آپ کے کمالات اور خوارق عادات اتنے زیادہ ہیں کہ اس مختصر کتاب میں نہیں سما سکتے۔ آپ کے احوال پیران چشت کے ملفوظات میں اکثر جگہ نظر پڑتے ہیں۔ چنانچہ

جوامع العلم میں ہے کہ حضرت شیخ جلال الدین جب سفر کرتے کرتے شیخ فرید الدین گنجشکرؒ کے وطن پہنچے تو حضرت گنج شکرؒ اس وقت کم سن تھے۔ شیخ جلال الدین نے پوچھا کہ یہاں کوئی درویش ہیں؟ لوگوں نے کہا ہاں، ایک قاضی بچہ دیوانہ ہے یہ سُن کر شیخ جلال الدینؒ آپ کے دیکھنے کو آئے اور ایک انار آپ کو دیا۔ آپ اس وقت روزہ سے تھے۔ انار سب تقسیم کر دیا۔ صرف ایک دانہ افطار کے لیے رکھا۔ جب یہ بڑے ہوئے اور حضرت قطب الاسلام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں آئے اور آپ سے یہ ذکر کیا تو آپ نے فرمایا اسی ایک دانہ میں تمہارے لیے تمام نعمتیں تھیں۔

آپ کا کلام ہے کہ جس کسی نے صانع کو چھوڑ کر مصنوع سے دل لگایا وہ ریا کا بندہ ہوگیا۔ آپ نے شیخ بہاؤالدین زکریاؒ ملتانی کو ایک خط لکھا تھا کہ جس کسی نے عورتوں کے سرینوں سے محبت پیدا کی اُسے کبھی فلاح نہیں ہوسکتی۔ خزینۃ الاصفیا اور مرآۃ الکونین میں آپ کے وصال کی تاریخ ۶۴۲ھ (چھ سو بیالیس ہجری) لکھی ہے۔

آپ کے کشف و کرامات کا ایک واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ جن دنوں آپ دہلی تشریف لے گئے اور سلطان التمش نے آپ کا استقبال کیا تو بادشاہ نے شیخ نجم الدین صغریٰ سے جو ان دنوں شیخ الاسلام تھے، پوچھا آپ کو کہاں ٹھہرانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ بیت الجن میں ٹھہرائیں۔ یہ ایک شاہی مکان تھا جو محل کے قریب تھا۔ اس کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ اس میں آسیب ہے اور جن رہتے ہیں، اور ہمیشہ مقفل رہتا تھا۔ سلطان نے کہا مہمان کے ساتھ ایسا سلوک اچھا نہیں۔ نجم الدین نے کہا اگر یہ مردِ کامل ہے تو جن انھیں کوئی تکلیف نہ دیں گے اور اگر ناقص ہیں تو یہی ان کی سزا ہے۔ ابھی بادشاہ نے نجم الدین کے مشورے سے اتفاق نہیں کیا تھا کہ شیخ جلال الدین کو اس کی خبر ہوگئی۔ آپ نے فرمایا: نجم الدین اس مکان کی چابی کہاں ہے؟ بھیج دو تاکہ اترنے سے پہلے ایک درویش کو بھیج کر اس کی صفائی کرالی جائے۔ کنجی آگئی تو آپ نے تراب نام ایک درویش کو دی کہ قفل کھول کر اندر جاؤ اور بلند آواز سے کہو "اے جنو! شیخ جلال الدین تبریزی یہاں آئے ہیں عرصہ تک تم یہاں رہے، اب حضرت شیخ یہاں رہیں گے، تم یہاں سے چلے جاؤ"۔ اور میری یہ حمائل وہاں ٹانگ دینا۔ خادم نے حکم کی تعمیل کی۔ جنوں نے مکان خالی کر دیا اور حضرت نے وہاں قیام فرمایا۔

حضرت شیخ امیر حسینیؒ

ولادت ———— علاقہ غور (ہرات)

وفات ———— سرخس ہری (ہرات) ۷۱۹ھ

شیخ امیر حسینیؒ مشہور صوفی بزرگ اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ نظم اور نثر میں ان کی کئی کتابیں مقبول ہوئیں۔ آپ نے نواح خراسان میں علم و عرفان کی شمعیں روشن کیں پھر ملتان تشریف لائے اور شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کی خدمت میں فیضیاب ہوئے۔

خاندان اور ابتدائی حالات آپ کا اسم گرامی حسین بن عالم بن ابی الحسین ہے۔ سیر العارفین میں پورا نام شیخ صدرالدین احمد بن نجم الدین المعروف بہ سید حسین بتایا گیا ہے۔ غور کے ایک گاؤں کزیو کے رہنے والے تھے۔ بعد ازاں ہرات چلے آئے۔ اسی بنا پر آپ کے نام کے ساتھ ہروی بھی لکھا جاتا ہے۔

بیعت آپ کی بیعت کے بارے میں مختلف روائتیں ہیں۔ بعض لکھتے ہیں کہ آپ شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کے مرید تھے، بعض نے شیخ ابوالفتح رکن الدین کا مرید بتایا ہے۔ سیر العارفین میں شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کے حالات میں شیخ امیر حسینی کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

> ایک مرید منجملہ مریدانِ صادق العمل والقول کے شیخ صدرالدین احمد بن نجم الدین ہروی بھی ہیں جو سید حسینی کے نام سے بھی مشہور و معروف ہیں۔ ان کی تصنیفات نظم و نثر میں بکثرت مقبول و مشہور عام و خاص ہیں۔ نثر میں نزہت الارواح اور طرب المجالس اور نظم میں زاد المسافرین اور کنز الرموز بمقام متبرک ملتان شیخ بہاؤالدین کی خدمت میں رہ کر وہیں تصنیف کیں اور شیخ بہاؤالدین نے کتب مذکورہ کا مطالعہ بغور فرما کر مصنف کی تحسین و آفرین کی اور وہ سوالات بھی جو شیخ محمود شوستری سے کیے گئے تھے۔ اور شوستری مرحوم نے ان کے جوابات میں نسخۂ گلشنِ راز تصنیف کیا۔ سید حسین کی تصنیف میں سے ہیں۔ چنانچہ اپنے زمانہ میں نواحی خراسان میں علم معرفت و طریقہ درویشی میں سید صاحب بے نظیر و بے ہمتا گزرے ہیں اور ریاضت عظیم فرماتے تھے۔ اول مرتبہ ملتان میں اپنے والد بزرگوار سید نجم الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ بسبیل تجارت آئے تھے اور بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں فیضیاب ہوئے، لیکن بوجہ زعم علم و کمال مرید نہ ہوئے تھے، مگر وفات پدر بزرگوار دفعۃً ترک تعلق دنیا نے دنی کر کے آزادی اور خدا طلبی اختیار کی اور اپنا تمام مال و اسباب فی سبیل اللہ سالکین و فقرا پر ایثار کر کے ملتان آئے اور بصدق عقیدت شیخ بہاؤالدین زکریا قدس اللہ روحہٗ کے مرید ہو گئے اور تین

برس تک پیر کی خدمت میں رہ کر بڑی بڑی ریاضتیں کر کے کمالات وکرامات سے مالا مال ہو گئے۔
مزار متبرک سید موصوف کا موضع ہری میں واقع ہے۔ اس دیار کے لوگ ان کی زیارت کے واسطے دوشنبہ
کے دن جایا کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ مرقد منور ان کا زائروں کے جسم بے جان میں روح تازہ بخشتا ہے
عجب دلکشا اور جانفزا مقام ہے۔ جن ایام میں یہ ضعیف جمالی مقام ہری میں پہنچا تھا، اس وقت مولانا
عبدالرحمان جامی اور مولانا عبدالغفور قدس سرہ العزیز بھی سید صاحب کی زیارت کے واسطے تشریف لائے
تھے۔ بعد حصولِ زیارت ہم سب نے مل کر نماز ظہر و عصر کی اسی جگہ ادا کی تھی اور بہت کچھ فیض حاصل کیا تھا۔[1]

وفات | نفحات الانس کے بیان کے مطابق آپ نے ۱۷ شوال ۷۱۸ھ میں وفات پائی۔ تذکرۂ دولت شاہ میں سن وفات ۷۱۹ھ بتایا گیا ہے۔ مگر شیخ امیر حسینی کی ایک کتاب زاد المسافرین میں ان کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۷۲۹ھ تک زندہ تھے۔ شعر یہ ہے:

درہفت صد وبست و نہ ز ہجرت گشت آخر ایں کتاب ختمت[2]

تصانیف | شیخ امیر حسینی کی تصانیف یہ ہیں:

نزہت الارواح، الارواح، طرب المجالس، صراط مستقیم، زاد المسافرین، کنز الرموز، سوالات وگلشنِ راز اور دیوان۔ یہ تمام کتابیں غیر مطبوعہ ہیں اور بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ان تمام کتابوں کا موضوع معرفت اور سلوک و طریقت ہے۔

ان تصانیف کے ضمن میں "بزم صوفیہ" کے مصنف نے شیخ امیر حسینی کی تحریر اور ان کے کلام کے بعض نمونے پیش کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

" نزہتہ الارواح کے متعلق لطائف اشرفی میں ہے:

لمعات حضرت فخر الدین عراقی و نزہتہ الارواح حضرت امیر حسینی بشرف نظر شیخ (یعنی حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی) در آوردند فرمودند کہ لمعات بہ نسبت خاص واقع شدہ و نزہتہ الارواح ہم خاص وہم عام حسب حیثیت خود بہرہ بردا المعات لمعۂ دیگر دارد (ص ۳۶۷)

زاد المسافرین کے متعلق ہم جو کچھ معلومات فراہم کر سکے ہیں، ان کو ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ مثنوی کا آغاز حمد باری تعالے شانہٗ سے ہوتا ہے۔ پروردگارِ عالم کی نعمتوں اور رحمتوں کا اعتراف کرتے ہوئے دنیا داروں کو خطاب اس طرح کیا جاتا ہے:

---

[1] سیر العارفین، اردو ترجمہ جلد اول ص۲۰ بحوالہ بزم صوفیہ از سید صباح الدین عبدالرحمان ص ۱۴۲، ۱۴۳

[2] فہرست کتب خانہ شاہ اودھ ص۴۳ بحوالہ بزم صوفیہ

بشنو پسرا بیانِ حالت — علم وجد است قیل وقالت
علمے کہ خدائے واں شوی تو — اینست کجا ہمی دوی تو
آں علم طلب کہ با تو ماند — و آں دم کہ ترا از تو رہاند
آں علم فریضہ تا نہ خوانی — تحقیق صفاتِ حق نہ دانی
اے طبع ہوا معلّم تو! — تا کے لم و لانسلّم تو!
خود را بگذر زت کردۂ گرم — آخر ز خدا نیایدت شرم
از خود بخدا مرو بتاویل — تشبیہ مکن بوجہِ تمثیل
زنہار بجہت قیاسی — غرّہ نشوی بحق شناسی

اس کے بعد مقالات شروع ہو جاتے ہیں جن میں جا بجا متعدد حکایات بھی ہیں۔ پہلا مقالہ حق سبحانہ تعالیٰ کی تنزیہ وتقدیس اور سالک کو ریاضت و مجاہدہ کی تلقین و تشویق میں ہے۔ اس میں بھی خطیبانہ رنگ اور واعظانہ انداز بیان قائم ہے۔ فرماتے ہیں:

ہندو کہ ہمیشہ بت پرستد — ہر صبح دعات می فرستد
جز ذکرِ تو نیست در زبانش — زنار وناست در میانش
ایں جملہ ز دین و ملّتِ خویش — جز تیر چناں نہ دیدہ در کیش

دوسرے مقالہ میں فضیلت و شرفِ انسانی پر بحث ہے۔ اس میں فارسی زبان کی سلاست و لطافت کے ساتھ ساتھ بعض غیر معمولی عربی الفاظ یا نامانوس کلمے بھی کہیں کہیں آگئے ہیں۔ اس کی پہلی حکایت ملاحظہ ہو:

موسیٰ ز مے فراق مخمور — مستانہ دوید بر سرِ طور
گفت اے ز تو بود ہر چہ بودہ — مارا بتو جسم تو راہ نمودہ
گر نزد منے کجاست جویم — تا با تو حدیث خویش گویم
در دور ترے بر آرم آواز — باشد کہ بخود دام کنی باز
بشنو ز ہاتفے جوابے — کے از تو بہ پیشِ تو نقابے
ایں جائے حوالہ نیست بگذار — من با توام از خودم طلبدار
افتادن مہر و ابشش در — ایں جا بود اے حریف بنگر
شاہانِ جہاں دریں خیالات — بر نطع غم شد جملگی مات
از غایت قرب دور دوراست — ہر مرغ بہ دانہ صبور است

ایں آتشِ ما چگونہ میرد — کیں درد دوائے پذیرد
یاد آر زخود کہ نیست یادت — بے شرم کسے کہ شرم بادت

تیسرا مقالہ طریقت اور سلوک کی کیفیت میں ہے۔ چوتھا ارشاد و معاملت پر ہے۔ اس میں کئی حکایتیں ہیں۔ پانچویں میں عشق اور اس کے مرتبہ کا بیان ہے۔ چھٹا مقالہ معرفت نفس انسانی اور اس کی عفت میں ہے۔ ساتویں میں معرفت کا ت اور اس کی تحقیق ہے۔ آٹھویں مقالہ کا عنوان ہے "درمیان حال شرف بادشرف می رسد"۔ یہ مقالہ دیگر مقالوں سے کچھ زیادہ بل اور تمثیلات سے معمور ہے اور اسی پر چند در چند مواعظ و نصائح و مخاطبات کے ساتھ مثنوی ختم ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

دُر نیست گراں بہا کہ سفتم — دریاب کہ گفتنی بگفتم
ہم دستہ گلبنِ یقین است — ہم توشہ رہ روانِ دین است
از بس کہ فسانہ بحر من دُر — شد دامنِ آخر الزمان پُر
ایں گلشکرے کہ من سرشتم — در ہشت مقالتش بنشتم
شمع است کہ از الم برافروخت — ہفتاد و ہزار پردہ را سوخت
یک نکتہ او کہ جاں کند رشاد — بر دل در ہشت باغ بکشاد
آں کس کہ بیافت اندکے بود — دانست کہ چوں شگافتم بود
تا جست سرانِ نامور را — نہ پارہ و مست کون خر را
چوں اہلِ خرد بہر دیارے — زیں تحفہ برند یادگارے
ایں نور بہر طرف کہ تابد — یعنی کہ قبول ہر کہ یابد
زیں گنج کہ رائگاں کشادم — دار و بدعائے خیر یادم
در ہفتصد و بیست و نہ ز ہجرت — گشت آخر ایں کتاب تمت

اس مثنوی میں ۱۴۵۶ اشعار ہیں۔ اس کی مقبولیت اور اہمیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس کا بڑا حصہ تذکرہ دولت شاہ اور آتشکدہ میں بھی ہے، جس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

ایں طرفہ حکایتیست بنگر — در زرے مگر از قضا سکندر[1]
سے رفت و ہمہ سپاہ با او — صد حشمت[2] و مال و جاہ با او
ناگہ بخرابہ گزر کرد — پیرے ز خرابہ سر بدر کرد

---

[1] آتشکدہ میں یہ مصرع اس طرح ہے: روزے ز قضا مگر سکندر۔ [2] آتشکدہ: آں حشمت

[1] پیرے کر نہ کہ آفتاب پر نور   دو چشم سکندر آمد از دور
پرسید کہ ایں چہ شاید آخر   ایں کیست کہ مے نماید آخر
درگوشہ ایں ک ۔ نگیر   بیہودہ نہ باشد ایں چنیں پیر
چوں راند بداں مناک چوں گرد   پیر از سر وقت خود نہ شد دور
چوں باز نہ کرد سوے او چشم   پرسید سکندرش بصد خشم
گفت اے شدہ غول ایں گزرگاہ   غافل چہ نشستہ دریں راہ
ہرچہ نکردی احترامم   آخر نہ سکندر است نامم
دانی کہ منم بہ بخت فیروز   پشتت ہمہ روئے عالم افروز
دریا دل و آفتاب دایم   فرق فلکست زیر پایم
پیر از سر وقت بانگ برزد   گفت ایں ہمہ جو نیر زدہ
ز پشت نہ روے عالمے تو   یک دانہ ز کشبت آدمی تو
دوران فلک کہ بیشمار است   ہر ساعتش از تو صد ہزار است
ز غول و غافلم دریں کوئی   ہشیار تر از توام بصد روی
از روز پسیں چو آگہم من !   چوں منتظر آں دریں رہم من
غافل توئی کز برائے بیشی   مغرور دو روزہ عمر خویشی
چوں آخر کارہا جدائیست   با خلق مرا چہ آشنائیست [2]
در بندۂ من کہ حرص و آز ند   بر تو ہمہ روز سرفراز ند
با من چہ برابری کنی تو   چوں بندۂ بندۂ منی تو
گریاں شد ازیں سخن سکندر   بفگند کلاہ شاہی آذر
از خجلت خود نفیر می زد   سر بر کف پائے پیر می زد
پیر از سر حال راہ نمودش   کاندر ہمہ وقت یاد بودش

آتشکدہ میں کچھ اور اشعار بھی منقول ہیں۔ مثلاً:

بخدا کہ دردمندم ز غم فراق یارا   نہ خلاف گویدا نکس کہ حکم کند خدارا

---

[1] آتشکدہ: آمد بیاں مناک پر نور   [2] یہ شعر تذکرۂ دولتشاہ میں نہیں ہے۔

اے سایۂ تو مردِ صحبت نور شد	رو ماتم خود گیر گزیں سور شد
اندیشۂ وصل آفتابت نرسد	می‌ساز بایں قدر کہ او دوا نہ شد[1]

کنزالرموز میں امیر حسینی نے حضرت شیخ بہاؤالدین زکریاؒ اور ان کے فرزند ارجمند شیخ صدرالدین کی مدح میں جو اشعار کہے ہیں، ان میں سے چند یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

شیخِ ہفت اقلیم قطبِ اولیا	واصلِ حضرت ندیمِ کبریا
مغزِ ملت بہائے شرع و دیں	جاں پاکش منبعِ صدق و یقیں
از وجودِ او بہ نزدِ ہندوستاں	جنت الماویٰ شدہ ہندوستاں
ملکہ او از نیک و از بد تافتم	ایں سعادت از قبولش یافتم
رخصتِ ہستی ہما بر عل بیاز میاں	کرد پرواز ہما بر آشیاں
آں بلند آوازۂ عالم پناہ	سرورِ عصر افتخارِ صدر گاہ

صدرِ دین و دولت آں مقبولِ حق
نہ فلک بر خوانِ جودش یک طبق[2]

---

[1] تکملہ ص ۲۱ [2] نفحات الانس قلمی نسخہ دارالمصنفین و فرشتہ جلد دوم ص ۴۰۶ ۔

حضرت امام علی لاحق رح

ولادت ــــــــــــــ

وفات ــــــــــــــ سیالکوٹ ۶۸۶ھ

سیالکوٹ شہر میں قلعہ کے قریب سید امام علی لاحق رح کا مزار مرجع خلائق ہے، جو تغلقوں کے عہد میں سیالکوٹ سے ہندو راجہ کا خاتمہ کرکے اسے اسلامی سلطنت کے زیر نگین لانے کا موجب تھے۔ بہت بڑے بزرگ اور اولیاء اللہ تھے۔ عام طور پر امام صاحب کے نام سے مشہور ہیں۔

امام صاحب کون تھے؟ سید امام علی لاحق رح، سید اسحاق زنجانی، سید حسین زنجانی اور سید یعقوب زنجانی (صدر دیوان لاہوری) چاروں آپس میں رشتہ دار تھے اور چاروں اکٹھے ترکستان سے ہندوستان آئے تھے اور لاہور میں سکونت اختیار کی تھی۔

والد بزرگوار کا نام سید حسن مکی رح تھا۔ پہلے شاہی منصب پر فائز تھے، پھر اسے ترک کرکے کانگڑہ کے قریب کسی جگہ گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔

سلسلہ نسب آپ کا سلسلہ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یوں ملتا ہے:

امام علی بن سید حسن مکی بن سید احمد بن سید یوسف بن سید اسحاق بن سید ہاشم بن سید عبدالرزاق بن سید عربی بن سید محمد صالح بن سید علی اکبر بن سید طاہر بن سید محی الدین بن سید عبداللہ بن سید ابوالحسن سر آہنگ احمد بن سید موسیٰ بن سید ابراہیم اصغر بن سید امام موسیٰ کاظم بن سید امام جعفر صادق بن سید امام باقر بن سید امام زین العابدین بن سید امام حسین بن حضرت علی علیہم السلام۔

بابا فریدالدین شکر گنج رح کے خلیفہ[1] تھے۔ بعض روایات بتاتی ہیں کہ آپ اپنے مرشد کے حکم سے سیالکوٹ آئے تھے۔

سیالکوٹ کی کیفیت جن دنوں امام صاحب ہندوستان آئے ان دنوں سیالکوٹ پر ایک ہندو راجہ حکومت کرتا تھا اگرچہ ہندوستان پر تغلق حکمران تھے، مگر انھوں نے راجہ سے حکومت چھیننے کا کبھی خیال نہ کیا تاہم راجہ کو ہر وقت اپنی حکومت

---

[1] خزینۃ الاصفیا جلد اول صفحہ ۲۶۱ پر صاحب معارج الولایت کے حوالے سے مذکور ہے کہ جب امام علی سے پہلے دو علی یعنی علی احمد صابر رح اور ایک دیگر بزرگ بابا شکر گنج رح سے بیعت کر چکے تھے۔ جب امام علی بیعت کے لیے حاضر ہوئے تو بابا صاحب نے فرمایا "ایں علی نیز بآں ہر دو علی لاحق باشد"۔ چنانچہ اس دن سے لاحق آپ کا خطاب ہو گیا اور "امام علی لاحق" کہلانے لگے۔

کا خطرہ رہتا تھا۔

سیالکوٹ کے راجہ کی نازیبا حرکت

کہا جاتا ہے کہ ایک جوتشی نے راجہ کو مشورہ دیا کہ اگر کسی مسلمان کا خون قلعہ کی دیواروں پر چھڑک دیا جائے تو قلعہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے حملے سے محفوظ ہو جائے گا۔
راجہ نے ایسا ہی کیا۔ اس نے ایک مسلمان بڑھیا کے بیٹے کو قتل کر کے اس کا خون قلعے کی دیواروں پر چھڑکا۔

راجہ کی شامت

ان دنوں تخت دہلی پر فیروز شاہ تغلق متمکن تھا۔ اتفاق سے اس کی ملاقات امام صاحب سے ہوئی تو انھوں نے بڑھیا کی فریاد بادشاہ تک پہنچائی۔ فیروز شاہ کو راجہ کے اس ظلم پر بڑا طیش آیا، چنانچہ اس نے امام صاحب ہی کو امیر بنا کر ان کی سرکردگی میں ایک لشکر سیالکوٹ کی طرف روانہ کیا تاکہ راجہ کو اس کی ظالمانہ حرکت کی سزا دے۔

امام صاحب کی پہلی فتح

اس لشکر میں امام صاحب کے ساتھ سید میر باز خاں ایک قابل جرنیل بھی تھا۔ علاوہ ازیں امام صاحب کے بھائی امام ناصرالدین[1] بھی شریک تھے۔ جب لشکر جالندھر پہنچا تو ناصرالدین نے علالت سے وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔ لشکر آگے بڑھا تو جگت پور[2] نام ایک مقام پر سیالکوٹ کے راجہ کا بھائی جگت رام مقابلے میں آیا۔ سخت لڑائی کے بعد امام صاحب نے راجہ کو شکست دی مگر اس جنگ میں امام صاحب کا قابل جرنیل سید میر باز خاں شہید ہو گیا۔

امام صاحب کی دوسری فتح

جگت پور کا معرکہ سر کرنے کے بعد لشکر آگے بڑھا تو ہنس پور کے مقام پر سیالکوٹ کے راجہ کا ایک اور بھائی مقابلہ پر آیا۔ یہاں بھی معرکے کی جنگ ہوئی جس میں راجہ مارا گیا اور امام صاحب سیالکوٹ پر چڑھے۔

سیالکوٹ کی جنگ!

سیالکوٹ کے راجہ نے قلعہ کی حفاظت کے تمام انتظامات کر رکھے تھے اور مقابلے کی ٹھان رکھی تھی۔ امام صاحب نے ایک کے جنوب میں ڈیرے ڈال دیے۔ پھر پورے زور شور کے ساتھ قلعے پر حملہ کیا۔ دو دن کی سخت لڑائی کے بعد امام صاحب شہر میں داخل ہو گئے۔

قلعے کی فتح اور امام صاحب کی شہادت

راجہ قلعے میں گھر گیا۔ امام صاحب نے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور کئی روز تک لڑائی ہوتی رہی۔ بالآخر راجہ نے شکست کھائی اور قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا، مگر مسلمانوں کو اس کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی یعنی امام صاحب اور ان کے ساتھ دوسرے کئی بزرگ شہید ہو گئے۔ امام صاحب کی شہادت

---

[1] امام ناصرالدین کا مزار جالندھر میں ہے۔

[2] کہتے ہیں یہی وہ مقام ہے جسے اب پسرور کہتے ہیں۔ امام صاحب کے لشکر نے جگت پور کو فتح کرنے کے بعد اس کا نام بدل کر پیہ سرور رکھا جو پسرور بن گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ پسرور کو راجہ پرس رام نے آباد کیا تھا۔

۶۸۶ھ میں ہوئی[1]

چونکہ جو جس جگہ شہید ہوا وہیں اُسے دفن کیا گیا۔ اسی لیے قلعہ کے اُس پاس امام صاحب کے علاوہ، اور بھی کئی شہیدوں کی قبریں ہیں، جو امام صاحب کے ہمراہ اس جنگ میں شریک ہوکر شہید ہوئے۔

سید سُرخ روؒ کا مزار امام صاحب کے ساتھ شہید ہونے والوں میں ایک کا نام سید سُرخ رو تھا جو لڑائی کے وقت قلعے کے دروازے کے سامنے شہید ہوئے تھے۔ چنانچہ قلعہ کے دروازے کے اندر ان کا مزار ہے۔

بڑھیا اور اس کے بیٹے کا مزار جس بڑھیا کے بیٹے کو راجہ نے قتل کیا تھا، وہ بھی اپنے ایک اور بیٹے کے ہمراہ جنگ میں شامل تھی دونوں شہید ہوگئے تھے، چنانچہ ان دونوں کے مزارات بھی قلعے کے اندر موجود ہیں۔

پیر مرادؒ کا مزار قلعہ کے ایک گوشے میں پیر مراد کا مزار ہے، جنھیں عام لوگ "پیر مرادیا" کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ مزار ایک چھوٹی سی شکستہ عمارت کی شکل میں ہے، جہاں کبھی کبھی لوگ دیے جلا دیتے ہیں۔

بہلولؒ کا مزار امام صاحب کے ساتھ شہادت پانے والوں میں ایک کا نام بہلول بتایا جاتا ہے، جن کا مزار امام صاحب کے مزار سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر چوک امام صاحب میں لب سڑک واقع ہے۔

ایک بڑے پھاٹک سے گزر کر مزار کے احاطہ میں داخل ہوتے ہیں، جہاں بائیں جانب ایک اونچے پلیٹ فارم پر تین قبریں ہیں۔ ایک بہلولؒ کی قبر ہے اور ساتھ دوسری دو قبریں ان کے ساتھیوں کی ہیں۔ قبروں کو چند درخت احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

پلیٹ فارم کے دائیں جانب چند رہائشی کمرے ہیں، جن میں مزار کے متولی وغیرہ رہتے ہیں۔ پھاٹک کے عین سامنے بارہ دری کے نمونہ پر ایک چھوٹی سی عمارت ہے، جس کے عین پیچھے ایک مسجد ہے۔ قبروں کے ساتھ ہی ذرا آگے ایک بوسیدہ دو منزلہ عمارت یا مکان ہے، جو متولی کی اقامت گاہ بیان کی جاتی ہے۔

---

[1] مولوی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیا (جلد اوّل) میں شجرۂ چشتی اور سیر الاصفیا کے حوالے سے امام علی کا یہی سن وفات تحریر کیا ہے۔

حضرت علی احمد صابر کلیریؒ (حضرت شیخ علاؤالدین)

ولادت ــــــــــــــــــ ۵۹۲ھ

وفات ــــــــــــــ کلیر شریف ۶۹۰ھ

بھارت کے ضلع سہارن پور میں پیراں کلیر نام ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس میں حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے خلیفہ مخدوم شیخ علاؤالدین علی احمد صابر کلیریؒ کا مزار مرجع خلائق ہے۔

کلیر شریف پیراں کلیر کو کلیر شریف بھی کہتے ہیں۔ آج کل کلیر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، مگر اس زمانے میں یہ ایک مشہور شہر تھا۔ دہلی کے قریب ہونے کے باعث اس کی آبادی، شادابی، دولت مندی اور رونق میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ شہر بہت بڑا نہ تھا، مگر بڑا با رونق اور مشہور شہر تھا۔ بڑے بڑے بازار تھے، بہت سی مسجدیں تھیں، بہت سے مسلمان امراء اور رؤساء یہاں رہتے تھے، مگر ان لوگوں کا اخلاق گر چکا تھا۔

سلسلۂ نسب آپ کا اصل نام علی احمد ہے۔ لقب ہائے گرامی علاؤالدین و مخدوم و صابر ہیں۔ سلسلۂ نسب حضرت غوث اعظم میراں محی الدین سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ تک اس طرح پہنچتا ہے:

علی احمد صابر بن سید شاہ عبدالرحیم بن سید عبدالسلام بن سید سیف الدین بن حضرت سید عبدالوہاب بن حضرت غوث اعظم عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ کی والدہ ماجدہ فرید الملت والدین بابا شکر گنجؒ کی ہمشیرہ ہیں۔ صاحب اخبار الاخیار لکھتے ہیں لکھتے ہیں کہ آپ حضرت بابا صاحب کے داماد بھی تھے۔

۱۹۔ ربیع الاول ۵۹۲ھ[1] کو تولد ہوئے۔ آپ بچے ہی تھے کہ والد ماجد وفات پا گئے۔ چنانچہ آپ کی والدہ ماجدہ آپ کو لے کر اپنے برادر معظم حضرت شیخ الشیوخ العالم بابا فریدالدین گنجشکرؒ کی خدمت میں قصبہ اجودھن میں حاضر ہوئیں۔ حضرت شیخ شیوخ العالم انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اپنے مسلک ارادت میں داخل کر لیا۔ لنگر فقرا کی تقسیم اور مطبخ کی خدمت ان کے سپرد کر دی۔ بارہ سال تک آپ بابا صاحب کی خدمت میں رہے، اور علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل فرمائی۔

آپ اکثر اوقات تنہا رہا کرتے تھے۔ ترک و تجرید کا یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ آپ کا زہد و تقویٰ کمال درجہ کا تھا۔ دنیا و اہلِ دنیا سے بالکل لاتعلق رہتے تھے۔ ہمیشہ روزے سے رہتے۔ درختوں کے پتے کھا کر گزارا کیا کرتے تھے۔ ہمیشہ پا برہنہ رہتے۔

---

[1] سن ولادت کے متعلق مختلف بیانات ہیں۔ اخبار العالمین میں ۱۷ شعبان ۵۱۲ھ لکھا ہے جو غلط ہے (مکتبہ)

کبھی نعلین زیب پا نہیں فرمائیں۔ ذکر و جذب میں استغراق کے باعث اپنی یا غیر کی کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ بہت کم ہوش میں رہتے۔
اجودھن میں عرصہ تک یہ عالم رہا کہ کام سے فارغ ہوتے ہی حجرے میں چلے جاتے اور ذکر و فکر میں مشغول ہو جاتے۔
اس وقت ایسا جذبہ طاری ہوتا اور ایسا جلال ظاہر ہوتا کہ کسی کو آپ کے قریب جانے کی ہمت نہ ہوتی۔ کہا جاتا ہے کہ خود آپ کے ماموں بابا صاحب کے دولڑکے کھیلتے ہوئے حجرے کے قریب پہنچ گئے اور آپ کے نادانستہ جلال کی نذر ہو گئے۔

عطائے خلافت | ۶۲۵ھ میں حضرت بابا صاحب نے آپ کو خلافت عطا کر دی اور اخبار الصالحین کے بیان کے مطابق حضرت سلطان المشائخ سے قبل آپ کو دہلی کی طرف روانہ فرما دیا کہ وہاں سکونت اختیار کریں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ بابا صاحب نے آپ کو اختیار دیا تھا کہ جس مقام پر چاہو قیام کرو۔ شیخ علی احمد صابرؒ نے عرض کیا کہ اجازت ہو تو دہلی میں قیام کروں۔ یہ سن کر بابا صاحب نے اجازت نامہ لکھ کر آپ کو دیا اور فرمایا کہ پہلے ہانسی جانا وہاں شیخ جمال الدین ہانسویؒ کو یہ مثال دکھانا اس کے بعد دہلی جانا
چنانچہ آپ پہلے ہانسی تشریف لے گئے اور شیخ جمال الدین ہانسویؒ سے ملاقات کی جو بابا صاحب کے محبوب ترین خلیفہ تھے۔
اجازت نامہ آپ کے ہاتھ میں دے کر اسی وقت رخصت کی درخواست کی۔ شیخ جمال الدین ہانسوی نے فرمایا کہ آخر اتنی جلدی کیوں ہے۔ دہلی کے صاحب ولایت کو بہت کچھ بردباری چاہیے اور تم ہو کہ ایک ساعت بھی بیٹھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ تم سے یہ کام کیوں کر ہوگا۔ شیخ علی احمد صابر نے غلبہ استغنا سے ایک بے نیازانہ جواب دیا۔ شیخ جمال الدین باوجود اس جمال و کمال کے جو خدائے عزوجل نے انھیں عطا فرمایا تھا یہ جواب سُن نہ سکے اور اجازت نامہ کو پارہ پارہ کر دیا۔
شیخ علی احمد صابر جو عین مظہر جلال تھے بھلا کہاں تاب لا سکتے تھے، جذبہ حال میں ان کی زبان سے نکل گیا کہ میں نے تمھارا سلسلہ قطع کر دیا، تم سے مشائخ کا کوئی سلسلہ جاری نہ ہوگا۔ آخر وہی ہوا۔ شیخ جمال الدین کے بڑے لڑکے عالم و فاضل اور سجادگی کے لائق تھے، وہ انھیں ایام میں دیوانے ہو گئے اور چھوٹے لڑکے جن کا نام برہان الدین تھا آخر وقت میں جب اپنے والد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو شیخ جمال نے انھیں مرید کر کے تلقین کرنا اور اجازت بیعت دینا چاہی لیکن زبان نے کسی طرح یاری نہ دی اور گو اور باتیں کرتے رہے، مگر شیخ برہان الدین کے حق میں کوئی وصیت نہ کر سکے۔ شیخ برہان الدین آخر کار بابا صاحب کے مرید ہوئے اور ان کے صاحبزادے شیخ قطب الدین منور حضرت سلطان المشائخ کے مرید ہوئے [۱]
شیخ علی احمد ہانسی سے اجودھن واپس چلے گئے اور بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سارا واقعہ کہہ سنایا۔ بابا صاحب نے انھیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ جو پروانہ شیخ جمال الدین نے تلف کر دیا ہے اس کی فکر نہ کرو میں تمھیں اس سے بہتر پروانہ دے دوں گا۔ پھر ایک اور اجازت نامہ لکھ کر دیا کہ کلیر جاؤ اور وہاں رہ کر کام کرو۔ چنانچہ آپ کلیر تشریف لے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔

---

[۱] اخبار الصالحین ص ۳۷۵ - ۳۷۶

آپ قلندرانہ مشرب کے بزرگ تھے اور ظاہری رسوم کے زیادہ پابند نہ تھے لہذا بعض لوگوں کی نظروں میں آپ کھٹکنے لگے۔ پھر جب آپ کی اصل حقیقت کو جاننے والوں نے جاجوق درجوق آنا شروع کیا تو مخالف علما اور دوسرے لوگوں کا حسد اور بڑھا اور آپ کو آزار پہنچانے کی تدبیریں کرنے لگے۔

ایک روز آپ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے ساتھ جامع مسجد میں تشریف فرما تھے کہ کچھ لوگ وہاں آئے اور آپ کے قیام پر اعتراض کیا اور وہاں سے اٹھانا چاہا۔ آپ نے ہرچند انھیں سمجھایا مگر انھوں نے سختی سے کام لیا چنانچہ آپ مسجد سے نکل گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کلیر کا قاضی بھی آپ کے سخت خلاف تھا آپ نے ہرچند اُسے سمجھایا مگر وہ آپ کے خلاف معاندانہ سرگرمیوں میں حصہ لینے لگا۔ چنانچہ آپ نے اہل علاقہ اور قاضی کے اس رویے کے متعلق بابا صاحب کو خط لکھ کر خبر کر دی۔

بابا صاحب کو یہ خط پڑھ کر خواجہ صاحب کے مخالفوں پر غصہ آیا۔ چنانچہ آپ نے لکھ بھیجا کہ "کلیر تمھاری بکری ہے میں تمھیں پورا اختیار دیتا ہوں کہ خواہ تم اس بکری کا دودھ پیو یا گوشت کھاؤ۔"

"اب تک آپ کا جو طریق عمل تھا اس سے صاف واضح ہو رہا تھا کہ آپ "بکری کا دودھ" ہی پینا چاہتے ہیں۔۔۔ لیکن بکری کی سرکشی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ آپ مجبور ہو گئے۔ اس اجازت کے بعد ایک جمعہ کو پھر مسجد میں نماز کے لیے حاضر ہوئے۔ انھوں نے پھر آپ کو ہٹاتے ہٹاتے مسجد سے باہر نکال دیا جس کے بعد آپ کے ضبط و تحمل کا پیمانہ چھلک گیا۔ آپ مسجد سے باہر نکل کر کچھ دُور کھڑے ہو گئے، خطبہ سنتے رہے۔ جب خطبہ ختم ہوا تو آپ نے مسجد کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا" اے مسجد! دیکھ امام تو اپنا کام ختم کر چکا، خطبہ پڑھا جا چکا لیکن تُو ابھی تک کھڑی ہوئی ہے۔ تجھے کس کا انتظار ہے، تُو بھی سجدہ کر۔" یہ الفاظ آپ کی زبان مبارک سے صادر ہونا تھے کہ مسجد دھڑام سے نیچے آرہی اور تمام رعونت پسندان کلیر اور نخوت پرست امراء اس کے نیچے دب کر رہ گئے۔ مسجد کی عمارت تھی بہت عالی شان، جتنے آدمی بھی مسجد کے اندر تھے سب کے سب اس کے نیچے دب کر مر گئے۔ کوئی ایک متنفس بھی اپنی جان سلامت نہ لے جا سکا۔ اتنی بھی ہمت کسی میں نہ تھی جو ان مغرور و خودپسند امراء کی لاشیں ہی ملبہ کے نیچے سے نکال سکتا۔

اس کے بعد آپ پر جلال و غضب کا اور جذبہ طاری ہوا، شمشیر صابری بے نیام ہو گئی، جس سے لوگ پناہ مانگتے تھے مگر پناہ نہ ملتی تھی۔ تباہ وہی ہوئے تھے جو مسجد کے اندر تھے باقی شہر تمام کا تمام موجود تھا، جو عورتوں، بچوں اور بوڑھوں، مردوں پر مشتمل تھا۔ شہر میں ایک وبائے عظیم پھیلی جس نے ہر طرف ایک قیامت برپا کر دی۔ یہ حالت ہو گئی کہ ایک ایک گھر سے ایک ایک وقت میں دس دس جنازے نکلتے تھے۔ وہ بازار مرگ گرم ہوا کہ بھرے شہر میں ایک کہرام مچ گیا۔ لاشوں کو دفنانے والا کوئی بھی نہ ملتا تھا۔ بھاگڑ پڑی ہوئی تھی، جدھر جس کا منہ اٹھا بھاگ نکلا، لیکن بھاگنے والوں کو کہیں پناہ نہ ملی، جو جس طرف گیا موت اس کے پیچھے گئی، کہیں کسی کو پناہ نہ ملی۔ چند روز کے اندر اندر ہی ہندوستان کا یہ دولت مند اور بارونق شہر گور کا میدان

ہو گیا۔ جو لوگ جہاں اور جس جگہ مرے وہیں پڑے رہ گئے[1]۔

اخبار الصالحین میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شیخ علی احمد صابرؒ کو عالم تحیّر میں ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ بابا صاحب کو جب خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا کون ہے جو میرے صابر کو عالم بیداری میں لائے۔ حضرت خواجہ شمس الدین ترک وہاں موجود تھے، عرض کیا کہ غلام حاضر ہے۔ آپ نے کہا کہ اچھا جاؤ۔ خواجہ شمس الدین ترک لحن داؤدی رکھتے تھے اور بہت شیریں آواز تھے۔ آپ نے کلیر شریف پہنچ کر حضرت کے قریب گنگنانا شروع کیا، پھر ایک تان لگائی۔ اس نغمہ کے اثر سے تھوڑی دیر میں حضرت چونک پڑے اور عالم تحیر سے صحو و بیداری کے عالم میں مراجعت فرمائی۔ حضرت شمس الدین ترک آداب بجالائے۔ حضرت شیخ نے بابا صاحب اور دوسرے پیر بھائیوں کا حال دریافت فرمایا اور نوازشات فرما کر رخصت کر دیا۔ خواجہ صاحب نے گنجشکرؒ کو اطلاع دی اور انعام کے خواستگار ہوئے۔ حضرت نے فرمایا مانگو کیا مانگتے ہو۔ آپ نے حضرت شیخ علی احمد صابرؒ کی خدمت گزاری کی عزت طلب کی۔ حضرت نے قبول فرما کر روانہ کیا۔ چنانچہ خواجہ شمس الدین ترک عرصہ تک حضرت شیخ علی احمد صابرؒ کی خدمت میں رہے۔ آپ ہی سے خلعت حاصل کیا اور پانی پت تشریف لے جا کر وہیں سکونت اختیار فرمائی۔

سیر الاقطاب سے نقل ہے کہ بعد ویرانی کلیر شریف کے ہر روز حضرت کی زیارت کرنے اس قدر خلقت آتی تھی کہ وہ جنگل آبادی شہر سے بھی بہتر معلوم ہوا کرتا تھا۔ ایک نقل مشہور ہے کہ حسن قوال بابا صاحب کا اجودھن سے واسطے کچھ حاصل کرنے زر کے عازم ہندوستان ہوا۔ جس مرید کے پاس گیا، اس نے بہت کچھ دیا۔ اس کو یہ خیال ہوا کہ اب کلیر چلیے کہ سید علاؤالدین علی احمد صابرؒ اعظم خلیفہ اور بابا صاحب کے بھانجے اور کلیر کے شاہ ولایت ہیں، بہت کچھ ملے گا۔ الغرض جب یہ کلیر میں آیا، اس کو ویران دیکھا، آس پاس کے گاؤں والوں سے دریافت کیا کہ خانقاہ صابر کس جگہ ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ ایک ٹیلہ پر گولر کے درخت کے نیچے ایک پھونس کی جھونپڑی ہے، وہاں رہتے ہیں۔ الغرض قوال اسی پتا پر آیا۔ جھونپڑی کو خالی پایا۔ سمجھا کہ کسی حاجت ضروری کو گئے ہوں گے۔ جب بہت دیر گزری اس نے گرد جھونپڑی کے دیکھنا شروع کیا۔ دیکھا کہ گولر کا ٹہنا پکڑے بیخود کھڑے ہیں۔ یہ باادب کھڑا رہا۔ بہت دیر کے بعد آنکھ کھولی اور فرمایا کہ تو کیستی۔ اس نے عرض کیا کہ فریدالدین کا قوال۔ آپ نے فرمایا کہ کون فرید۔ اس نے جل کر جواب دیا کہ تمہارے شیخ۔ اس وقت آپ نے تبسم کر کے فرمایا کہ میرے شیخ اچھے ہیں اور اس قوال کو ہمراہ لے کر جھونپڑی میں آئے۔ چولھے پر مٹی کی ایک ہانڈی رکھی ہوئی تھی، اس میں چند گولر تھے وہ اس قوال کو مرحمت فرما کر رخصت کیا۔ قوال اپنے دل میں بہت جلا اور کہا کہ میں بھی یہ گولر بابا صاحب کو دکھاؤں گا، اور کہوں گا کہ آپ کے پیارے مرید نے یہ داتاری کی۔ یہ سمجھ کر اجودھن آیا جب بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، آداب بجالایا۔ بعد قدمبوسی ہر ایک مرید کی خیریت عرض کی۔ آپ ہر ایک کا حال استفسار فرماتے رہے۔ آخر آپ نے پوچھا کہ میرے صابر کو بھی

---

[1] رسالہ "مولوی" دہلی۔ اولیا نمبر ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ

دیکھا۔ اس نے عرض کیا کہ میں تو ان تک بہت کچھ اُمید کر کے گیا تھا مگر وہاں جھونپڑی تابت بھی نہیں اور بڑے مغرور ہیں، بڑی دیر تک کھڑا رہا، آپ حالت استغراق میں رہے، جب آنکھ کھولی میں نے سلام کیا، پوچھا تو کون ہے؟ میں نے کہا کہ بابا فرید الدینؒ کا قوال۔ اس پر انجان ہو کر پوچھا کون فرید؟ میں نے کہا کہ تمھارے پیر۔ اس وقت کہا کہ ہمارے شیخ اچھے ہیں، اور یہ گوار دانا ری کے ہیں، کمر سے نکال کر پیش کیے۔ آپ نے دو نوش فرمائے باقی حاضرین کو دیے اور دو رکعت دوگانہ ادا کی کہ آج میں شیخ ہوا۔ حاضرین نے عرض کیا کہ آپ پہلے شیخ نہیں تھے؟ فرمایا کہ وہ صابر نہ تھا وہ کھنے والا اور تھا۔ جس نے ان گولروں میں سے قدرے کھایا اس کے نور باطن میں ترقی ہوئی۔

صاحب مرآۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ حضرت سلطان المشائخ اور شیخ علی احمد صابرؒ میں باکمال محبت والفت تھی حضرت سلطان المشائخ سے پینتیس سال قبل تیرھویں ربیع الاول ۶۹۰ھ کو آپ نے رحلت فرمائی اور قصبہ کلیر میں دفن ہوئے، جو اب پیران کلیر کے نام سے مشہور ہے اور رڑکی کے قریب واقع ہے۔

پہلے آپ کا مزار مبارک خام تھا لیکن حضرت عبدالقدوس گنگوہی نے پختہ مزار بنوایا اور جہانگیر کے زمانہ میں مقبرہ تعمیر ہوا۔ مزار مبارک گنبد کے اندر واقع ہے اور دُور دُور سے خلقت آکر فیض حاصل کرتی ہے۔ طالبانِ حق و مریدانِ صادق کو آپ کی روحانیت پاک سے برابر فیض پہنچتا رہتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آپ میانہ قد، نحیف البدن تھے۔ کان بڑے بڑے، پیشانی بلند، ابرو کشادہ و سیاہ چشم تھی۔ گردن دراز اور سینہ کشادہ تھا اور محاسن مبارک باریک و نرم تھی۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے بعد خاندانِ چشت کے صرف دو سلسلے جاری ہوئے ہیں۔ ایک حضرت سلطان نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ سے، جن کے سجادہ نشین حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ ہوئے اور دوسرا حضرت شیخ علی احمد صابر کلیری رحمہ سے، جن کے خلیفہ خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی ہوئے۔ ان دونوں سے شاخیں پھوٹیں اور اتنی مہک اٹھی کہ تمام ہندوستان خوشبو سے مہک اٹھا۔[1]

خلیفہ اعظم | خواجہ شمس الدینؒ ترکؒ[2] آپ کے خلیفہ اور جانشین تھے۔ آپ ہی کے واسطے سے سلسلہ صابری چشتی جاری ہوا۔ آپ خواجہ احمد یسوی کی اولاد سے تھے اور سلسلہ نسب حضرت محمد بن حنفیہؒ تک پہنچتا ہے۔ جو حضرت علی علیہ السلام کے فرزند تھے۔ پہلے ترکستان میں تحصیل علم کرتے رہتے۔ پھر ہندوستان آئے اور کلیر شریف پہنچے اور شیخ پانی پتی کے والہ و شیدا ہو گئے۔ ان کی خدمت میں رہنے لگے۔ بہت مجاہدے کیے اور کسب سلوک میں ترقی حاصل کی اور ایسے کمال کو پہنچے کہ دوسروں کو صاحب کمال بنا دیا۔

---

[1] اخبار الصالحین   [2] اس کتاب میں بو علی قلندر پانی پتی کے ضمن میں فٹ نوٹ میں ان کے متعلق بعض باتیں بیان ہوئی ہیں۔

آپ نے خرقۂ خلافت شیخ جلال الدین پانی پتی کو عنایت فرمایا اور انھیں اپنا جانشین مقرر کیا۔ خواجہ شمس الدین ترک نے ۱۹۔شعبان ۷۱۵ھ کو وفات پائی۔

سیر الاقطاب نے لکھا ہے کہ بعد وفات مجاوران درگاہ بخوف آمد شیراں دور جا رہے تھے۔ بعد ایک مدت کے اہل ہنود نے روضہ عالیہ کے قریب دیبی کا مندر تیار کرایا، قریب تھا کہ روضہ مطہرہ منہدم ہو مگر ایک بزرگ کا فت آن پہنچا اور بہت سے ہندوؤں کو ہلاک کیا باقی فرار ہوئے اور پھر اس طرف منہ نہ کیا۔ ایک روز ایک ہندو فقیر اس جگہ آگیا، نورانی جگہ دیکھ کر سمجھا کہ یہ کسی واصل بہ حق کا مزار ہے مگر بسبب خصومت قدیم مذہبی کے اندر روضہ کے آیا اور تربت کو مسمار کرنا چاہا اور اپنی کلہاڑی سے مزار کو ڈھانے لگا۔ چند اینٹیں نکالی تھیں اور چاہتا تھا کہ اندر سے قبر کو دیکھے کہ اس میں کیا ہے، اسی وقت غضب الٰہی میں گرفتار ہوا، دم اس کا بند ہو کر ہلاک ہوا۔ جب رات ہوئی، خدام آستانہ کو خواب ہوا کہ گویا شیخ تشریف لائے اور فرماتے ہیں کہ ایک شخص بے ادبی مزار کے لیے آیا تھا، اپنی سزا کو پہنچا، ابھی تک گرفتار ہے، جاؤ اور اس کو نکالو۔ صبح جلدی سے مجاور پہنچے اور اس فقیر کے مردہ کو گھسیٹ کر دور ڈالا۔ اس روز سے پھر کچھ آبادی ہوئی۔ بہت روز تک یہی کیفیت رہی۔ عرس شریف میں بھی رات کو کوئی مزار شریف کے قریب نہ ٹھہر سکتا تھا۔ اب ہزارہا آدمی جمع ہوتے ہیں نہ وہاں چوکی ہر کسی قسم کا پہرہ نہ پولیس و تحصیل کوئی محافظ ہوتا ہے مگر چوری حرامکاری نہیں ہوتی اور حاضرین کو علیٰ قدر مراتب سرور رہتا ہے۔

آپ کی وفات کے بعد سلاطین دہلی نے چاہا کہ کلیر کو از سر نو آباد کریں، مگر تصرفات ولایت حضرت سے میسر نہ ہوا۔ صاحب اقتباس الانوار تحریر فرماتے ہیں کہ بعد انتقال حضرت قریب مزار پُر انوار حضرت کے کوئی نہ جا سکتا تھا۔ کس واسطے کہ جہاں کسی نے قریب مزار شریف کے قدم رکھا ایک برق مزار معلّٰے سے پیدا ہو کر اس کو جلا دیتی تھی۔ جب حضرت قطب عالم بندگی عبد القدوس گنگوہی قدس سرہٗ بہ قصد زیارت جانب کلیر روانہ ہوئے اور مزار مبارک سے ایک کوس کا فاصلہ رہا، یکایک برق چمک کر ان کے نزدیک آتی ہی تھی کہ آپ نے بصد عجز عرض کیا کہ غلام مشتاق زیارت ہے آگے جیسے مرضی۔ اُسی وقت وہ برق غائب ہو گئی۔ جب قریب روضہ کے پہنچے پھر برق بدستور چمکی۔ حضرت نے پھر بصد نیاز عرض کیا کہ بندہ برائے زیارت حاضر ہوا ہے، سر دینے کو تیار ہے، اسی وقت برق غائب ہو گئی۔ جب آپ قریب تربت اقدس کے گئے، پھر بدستور برق چمکی چاہتی تھی، ان پر گرے مگر یہ نہ ٹلے استقلال سے عرض حال کیا برق غائب ہو گئی اور روحانیت حضور کی مجسم ہو کر مزار سے باہر آئی اور بندگی شیخ عبد القدوس کو بغل میں لیا اور مہربانی سے فرمایا کہ تو میرے سلسلہ میں ہے اس وجہ سے بچ گیا، ورنہ اس جگہ پہنچنے کی کسی کو مجال نہیں ہے۔ حضرت قطب عالم نے عرض کی اپنی برق جلال کو نیام میں کیجیے اور سر جمال آئیے۔ خلق اللہ کو اپنی زیارت سے مشرف کیجیے کہ عالم آپ کی برکات سے فیض حاصل کرے۔ حضرت نے فرمایا کہ عبد القدوس تیری خاطر سے برق ذاتی کو عالم لامکان میں مسطور کیا اور اپنی صفات جمالیہ سے بقدر ایک ذرہ کے اس تربت پر جلوہ دیتا ہوں، اسی روز سے تقریب عرس شروع ہوئی اور خوان فیض کا عام طور پر عالم کے واسطے کشادہ ہوا۔

حضرت شیخ فخرالدین عراقیؒ

ولادت ———— نواح ہمدان ۶۰۰ھ

وفات ———— دمشق ۶۸۸ھ[1]

آپ کا پورا نام شیخ فخرالدین ابراہیم ہے۔ تاریخ گزیدہ میں سلسلۂ نسب یہ ہے:

فخرالدین ابراہیم بن بزرجمہر بن عبدالغفار ابجوالقی، مگر تذکرۂ دولت شاہ، مرآۃ الخیال، سیرالعارفین، مخزن الغرائب اور برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست میں ان کے والد بزرگوار کا اسم گرامی شہریار مرقوم ہے۔ سیرالعارفین کے مولف کا بیان ہے کہ شیخ فخرالدین محمد شہریار بہاؤالدین زکریا کی بہن کے بیٹے یعنی بھانجے تھے:

مگر بعض تذکروں میں ان کو شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کا بھانجا بتایا جاتا ہے۔ ہمدان کے نواح میں قریہ کمجان (دباکونجان) میں پیدا ہوئے۔ صغر سنی میں کلام پاک حفظ کیا۔ ہمدان کے لوگ ان کی خوش گلوئی پر شیفتہ تھے۔

سترہ سال کی عمر میں ہمدان کے مدرسہ سے معقولات و منقولات پڑھ کر فارغ ہو گئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہ ہمدان سے بغداد آئے اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خدمت میں رہ کر روحانی تعلیم پائی، اور ان سے شرف بیعت حاصل کیا۔ ان کے پاس رہ کر برسوں عبادت و ریاضت کرتے رہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی نے اسی مدت میں ان کو عراقی کا تخلص عطا فرمایا اور ہندوستان جانے کا حکم دیا۔ یہاں پہنچ کر حضرت شیخ بہاءالدین زکریا کی خدمت میں ملتان آئے اور ان کے فیض صحبت میں روحانی اور باطنی دولت سے مالامال ہوئے۔ ایک دوسری روایت ہے کہ تعلیم سے فارغ ہو کر ہمدان کے مدرسہ میں درس دے رہے تھے کہ قلندروں کی ایک جماعت پہنچی، اور مندرجہ ذیل غزل پڑھنے لگی۔

ما رخت ز مسجد بخرابات کشیدیم	خط بر ورق زہد و کرامات کشیدیم
در کوئے مغاں در صف عشاق نشستیم	جام از کف رنداں خرابات کشیدیم
از زہد و مقامات گذشتیم کہ بسیار	کاس تعب از زہد و مقامات کشیدیم

ان اشعار کو سن کر شیخ فخرالدین ابراہیم بے تاب ہو گئے اور ان پر ایک وجد طاری ہو گیا۔ قلندروں میں سے ایک قلندر اپنے حسن و جمال میں بے نظیر تھا۔ اس کے حسن کو دیکھ کر ان کے دل میں عشق حقیقی کی آگ بھڑک اٹھی۔ کپڑے پھاڑ ڈالے اور

---

[1] سنہ وفات میں اختلاف ہے۔ چنانچہ نفحات الانس میں ۶۸۸ھ ہے۔ تاریخ گزیدہ میں ۶۸۶ھ اور تذکرہ دولت شاہ میں ۷۰۹ھ۔ اول الذکر صحیح سمجھا جاتا ہے۔

عمامہ سر سے اتار پھینکا اور اسی وقت فرمایا

چہ خوش باشد کہ دل دارم تو باشی   ندیم و مونس و یارم تو باشی!

اور پھر ان قلندروں کے ساتھ ہمدان سے چل کھڑے ہوئے اور عراق و عرب و عجم کی سیاحت کرتے ہوئے ہندوستان پہنچے۔ جب ملتان آئے تو قلندروں کے ساتھ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا کی خانقاہ میں قیام کیا۔ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا کی نظران پر پڑی تو اُن کو صورت آشنا پایا۔ شیخ فخرالدین عراقی نے بھی شیخ بہاؤالدین زکریا کی طرف کشش محسوس کی اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ شیخ کی جانب مقناطیس کی طرح کھنچا جا رہا ہوں اور یُوں معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے مجھے قید کر لیا ہے۔

چنانچہ ملتان سے دہلی چلے آئے۔ دہلی سے سومنات کی طرف جا رہے تھے کہ راستہ میں سخت آندھی آئی۔ آندھی میں قلندر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ شیخ فخرالدین عراقی ساتھیوں سے چھوٹ کر اِدھر اُدھر پریشان خاطر پھرتے رہے۔ بالآخر ملتان کی طرف مراجعت کرنے کا تہیہ کیا۔ وہاں پہنچے تو شیخ بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھتے ہی فرمایا۔

"عراقی! از ما گریختی!"

شیخ فخرالدین نے جواب میں کہا

از تو نہ گریزد دل من یک زماں   کالبد را کے بود از جاں گزیر

دانۂ لطف مرا در بر گرفت   دانہ بیش از مادرم صد گونہ شیر

شیخ بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ ان کو اپنی خلوت میں لے گئے، جہاں وہ دس روز تک چلہ میں بیٹھے۔ گیارھویں روز ان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی، وہ روتے تھے اور یہ غزل پڑھتے تھے:

نخستیں بادہ کاندر جام کردند   ز چشم مست ساقی وام کردند

چو بے خود خواستند اہل طرب را   شراب بے خودی در کام کردند

برائے صید مرغ جان عاشق   ز زلف فتنہ جویاں دام کردند

بعالم ہر کجا رنج و بلا بود   بہم بردند و عشقش نام کردند

چو خود کردند از خویشتن فاش   عراقی را چرا بد نام کردند

شیخ بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں نے چلہ میں شیخ فخرالدین عراقی کو نغمہ سرائی کرتے دیکھا تو مرشد کو اطلاع دی کہ ان چیزوں کی تو ممانعت ہے، پھر شیخ فخرالدین عراقی اس کے کیسے مرتکب ہو رہے ہیں۔ پھر مرشد نے فرمایا کہ

"شمارا ازیں چیزہا منع است او را منع نیست"

اس کے کچھ دنوں کے بعد شیخ عمادالدین شہر میں نکلے۔ ایک خرابات سے گذر رہے تھے کہ رندوں کو مندرجہ بالا غزل چنگ و چغانہ کے ساتھ پڑھتے سنا۔ شہر سے واپس ہوئے تو اپنے مرشد شیخ بہاؤالدین زکریا کو یہ واقعہ سنایا۔ مرشد نے یہ سن کر شیخ فخرالدین

عراقی کے متعلق فرمایا کہ

" کار او تمام شد "

اور پھر شیخ فخرالدین عراقی کے پاس خلوت میں پہنچ کر ارشاد فرمایا :

" عراقی ! مناجات در خرابات می کنی بیروں آئی !

شیخ عراقی باہر آئے، مرشد کے قدموں پر سر رکھ دیا اور دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے۔ مرشد نے اپنے دست مبارک سے ان کا سر اٹھایا اور سینہ سے لگایا۔ شیخ عراقی نے اسی وقت ایک غزل کہی جس کا مطلع یہ ہے :

در کوئے خرابات کسے را کہ نیاز است — ہشیاری و مستیش ہمہ عین نماز است

مرشد نے اسی وقت اپنا خرقہ اتار کر ان کو پہنا دیا اور اسی مجلس میں اپنی صاحبزادی کو ان کے حبالۂ نکاح میں دے دیا۔
شیخ عراقی اپنے مرشد اور خسر کی خدمت میں پچیس سال رہے۔ اس اثنا میں ان کے فرزند ارجمند شیخ کبیرالدین کی پیدائش ہوئی۔
حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا نے اپنے وصال کے وقت شیخ فخرالدین عراقی ہی کو اپنا خلیفہ اور جانشین بنایا تھا، مگر شیخ فخرالدین عراقی نے مرشد کی دیرینہ روایات کی پابندی نہ کی۔ وہ خصوصیت کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار شعر و شاعری کے ذریعہ سے کیا کرتے تھے، جس کو شیخ بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مرید اپنے مرشد کے طریقے اور مسلک کے خلاف سمجھتے تھے۔
شیخ فخرالدین نے یہ محسوس کیا تو اس منصب سے علیحدہ ہو کر عدن کی طرف روانہ ہو گئے۔ عدن کا سلطان ان کی شہرت سن چکا تھا اور ان کی شاعری کا معتقد تھا، چنانچہ وہ عدن پہنچے تو علما و صلحا کی معیت میں ان کا شاندار استقبال کیا اور شاہی خانقاہ میں ٹھہرایا اور ہر قسم کی خاطر تواضع کی۔ حج کا موسم آیا تو شیخ فخرالدین عراقی نے خانۂ کعبہ کی زیارت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سلطان ان کا اس قدر گرویدہ ہو گیا تھا کہ ان کی مفارقت گوارا نہ کی۔ مگر وہ خانۂ کعبہ کی زیارت کے اشتیاق میں سلطان کی اجازت کے بغیر چپ چاپ عدن سے چل کھڑے ہوئے۔ سلطان کو ان کے جانے کی خبر ملی تو ان کی علیحدگی سے بے تاب ہو کر خود بھی عازم حج ہوا مگر پھر لوٹ آیا، اور بے انتہا مال و دولت کا نذرانہ ان کی خدمت میں اس ہدایت کے ساتھ بھیجا کہ اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو ان کے خادموں اور مریدوں میں تقسیم کر دیا جائے۔
شیخ فخرالدین عراقی مست و سرشار مکہ معظمہ پہنچے، احرام باندھتے وقت انھوں نے ایک قصیدہ تحریر فرمایا جس کا مطلع یہ تھا:

اے جلالت فرش عزت جاودان انداختہ
گوئے در میدان وحدت کامران انداختہ

اور جب خانۂ کعبہ پر ان کی نظر پڑی تو اس کے انوار و تجلیات سے مسحور ہو کر ایک دوسرا قصیدہ کہا جس کے دو شعر یہ ہیں :

تَعَالٰی مَنْ تَوَحَّدَ بِالْکَمَالِ — تَقَدَّسَ مَنْ تَفَرَّدَ بِالْجَمَالِ
حبذا صفۂ بہشت مثال — کہ بود آسمانش صف نعال

مدینہ منورہ پہنچے تو ان پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوگئی اور ایک رات میں پانچ قصیدے کہے ' ان قصیدوں کے صرف مطلعے ملاحظہ ہوں :

(۱)

عاشقاں چوں بر در دل حلقہ سودا زنند　　　آتشِ سودائے جاناں در دل شیدا زنند

(۲)

شہبازم وچو صید جہاں نیست در خورم　　　ناگہ .بود کہ از کفِ ایام بر پرم

(۳)

اے رخت مجمع خیال شدہ　　　مطلع نور ذوالجلال شدہ

(۴)

راہ باریکست و شب تاریک و مرکب لنگ و پیر　　　اے سعادت رُخ نمائی و اے عنایت دستگیر

(۵)

دل ترا دوست تر زجان دارد　　　جان زبہر تو در میاں دارد

مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہو چکے تو اقصائے روم کی سیاحت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ قونیہ پہنچ کر وہاں حضرت شیخ محی الدین عربی کے خلیفہ اور سجادہ نشین حضرت شیخ صدر الدین کی خدمت میں پہنچے، ان کی صحبت میں روحانی دلچسپی ہوئی تو ایک عرصہ تک قونیہ میں قیام پذیر رہے اور حضرت شیخ صدر الدین کی صحبت میں فصوص الحکم کا مطالعہ کیا، جس کے بعد اپنی مشہور کتاب لمعات تصنیف کی۔ حضرت شیخ صدر الدین نے اس کو پڑھ کر فرمایا کہ

" اے فخر الدین عراقی سرِ سخن مرداں آشکارا کردی "۔

چنانچہ یہ کتاب اربابِ تصوف کے حلقہ میں برابر مقبول رہی۔ مُلا نور الدین عبدالرحمٰن جامی نے اشعۃ اللمعات اور مولانا صائن الدین علی ترکہ اصفہانی نے ضوء اللمعات کے نام سے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔ سیر العارفین کے مؤلف کا بیان ہے کہ صدر خاوری نے بھی اس کی شرح تحریر کی ہے اور خود سیر العارفین کے مؤلف نے لمعات کی مدح ان الفاظ میں کی ہے:۔

" اربابِ بصیرت پر مخفی نہیں ہے کہ لمعات ایک قطرۂ سحاب فیض کا ہے، جو دریائے معرفت سے شیخ بہاؤالدین زکریا قدس سرہ العزیز کے فخر الدین کی زبان پر ٹپکا "۔

یہ کتاب فصوص الحکم کے طرز پر لکھی گئی ہے اور اس میں بھی فصوص کی طرح اٹھائیس فصلیں ہیں۔ میخانہ کے مؤلف کا خیال ہے کہ " لمعات بحقیقت لبِ فصوص است "۔

یہاں کے قیام کے زمانہ میں امیر معین الدین شیخ فخر الدین عراقی کا بے حد معتقد ہوگیا تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ وہ کوئی جگہ

انتخاب کر کے اپنے لیے خانقاہ بنا لیں۔ پہلے تو انھوں نے اس کو پسند نہ کیا، لیکن پھر توقات میں خانقاہ بنوائی۔ ایک بار امیر معین الدین کچھ نقد رقم لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا، مگر انھوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا، امیر معین الدین نے شکستہ خاطر ہو کر کہا کہ آپ مجھ سے نہ کوئی خدمت لیتے ہیں، اور نہ میری طرف التفات فرماتے ہیں۔ شیخ نے ہنس کر جواب دیا کہ

" اے امیر با ما را بہ زر نمی توان فریفت !"

طبیعت میں وارفتگی تھی اور اس وارفتگی کے عالم میں بعض اوقات ان کے حرکات و اعمال ارباب ظاہر کے لیے ناپسندیدہ ہو جاتے تھے۔ ایک روز معین الدین ان کی قیامگاہ پر آیا تو اُن کو وہاں نہ پایا۔ ان کی تلاش میں باہر نکلا تو دیکھا کہ کچھ لڑکے ان کے گلے میں رسی ڈال کر ان کو ادھر اُدھر دوڑا رہے ہیں۔ بعض لوگوں نے شیخ عراقی کی اس حرکت پر طنز بھی کیا، لیکن امیر معین الدین نے طنز و تشنیع پر توجہ نہ کی اور شیخ کی معیت میں ان کی قیامگاہ پر واپس آیا۔

اسی طرح ایک روز شیخ اپنی قیامگاہ سے باہر گئے تو دو دن تک واپس نہ آئے۔ امیر معین الدین نے ہر طرف آدمی دوڑائے لیکن ان کا کہیں پتہ نہ چلا، تیسرے روز خبر ملی کہ وہ پہاڑ کے دامن میں مقیم ہیں۔ امیر معین الدین اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچا تو شیخ کی عجیب کیفیت دیکھی۔ وہ برہنہ پا و برہنہ سر برف کے تودوں میں رقص کر رہے تھے۔ ان کے جسم سے پسینہ جاری تھا۔ بڑی مشکل سے شہر کی طرف مراجعت کرنے کے لیے رضامند ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد امیر معین الدین کے بُرے دن آ گئے۔ ارباب سلطنت اس سے برگشتہ ہو گئے اور حکومت کی طرف سے اس کی املاک ضبط کر لی گئی۔ اس کو اپنی زندگی کی خاطر شہر کو بھی خاموشی سے چھوڑ دینا پڑا، مگر جب وہ شہر سے باہر جانے لگا تو رات کو شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جواہرات کا ایک ذخیرہ پیش کر کے گذارش کی کہ ان جواہرات کو جس طرح چاہیں خرچ کریں، مگر میرا لڑکا مصر میں مقید ہے، اگر ممکن ہو تو اس کی رہائی کی کوشش کریں۔ اس کو رہا کر کے اپنے پاس رکھیں اور ایک لمحہ کے لیے اپنے سے جدا نہ کریں۔ اُس کو اپنا پرانا خرقہ بھی پہنائیں اور اس کو موقع نہ دیں کہ وہ اس خرقہ کو ضائع کرے۔ امیر یہ باتیں کہتے وقت اشکبار ہو رہا تھا۔ خود شیخ پر بھی گریہ طاری تھا۔ بالآخر شیخ کے پاؤں کو بوسہ دے کر وہ رخصت ہو گیا۔ شیخ نے جواہرات کو بطور امانت اپنے پاس رکھ لیا۔

امیر معین الدین کی معزولی کے بعد اس علاقہ کی نگرانی خواجہ شمس الدین کے سپرد کی گئی۔ اس کی معیت میں مولانا امین الدین بھی تشریف لائے توقات میں پہنچ کر مولانا امین الدین شیخ فخر الدین عراقی سے بھی ملنے آئے۔ دونوں بڑی گرمجوشی سے ایک دوسرے سے ملے اور جب سیر و سلوک پر گفتگو شروع ہوئی تو دونوں ایسے محو ہوئے کہ رات کا کافی حصہ گذر گیا، پھر بھی دونوں کی تشنگی باقی رہی یہاں تک کہ تین دن گذر گئے۔ چوتھے روز مولانا امین الدین خواجہ شمس الدین سے ملے تو مؤخر الذکر نے تین دن کی مفارقت کی شکایت کر کے اپنے ملال کا اظہار کیا۔ مولانا امین الدین نے خواجہ شمس الدین کی دلجوئی کر کے فرمایا، شیخ فخر الدین عراقی کی صحبت میں تھا اور ان سے ایسی باتیں سُنیں جو کسی سے عمر بھر نہ سُنی تھیں۔ ان کی صحبت میں تین سال رہتا یا تمام زندگی رہنے کا موقع مل جاتا تو بھی ان کی مفارقت گوارا نہ کرتا۔ مولانا امین الدین کی اس عقیدت مندی کو سن کر خواجہ شمس الدین کو بھی شیخ فخر الدین عراقی سے ملنے کا اشتیاق ہوا اور

ان کو لانے کے لیے خلعت کے ساتھ ایک اونٹ بھیجا۔ شیخ فخرالدین عراقیؒ جب قریب پہنچے تو خواجہ شمس الدین معزز لوگوں کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے گیا۔ شیخ نے مولانا امین الدین کو دیکھ کر کہا " اِنْ هِیَ اِلاَّ فِتْنَتُكَ " یعنی مجھ کو یہاں بلا بھیجنے میں تمھارا ہی فتنہ ہے۔ خواجہ شمس الدین ان سے بڑی تعظیم کے ساتھ پیش آیا اور جب سلوک پر گفتگو شروع ہوئی تو شیخ کی گفتگو میں اتنی تاثیر اور گرمی تھی کہ خواجہ شمس الدین کی آنکھوں سے بہت دیر تک بے اختیار آنسو جاری رہے۔

کچھ ہی عرصہ کے بعد حاسدوں نے ارباب حکومت کے پاس مخبری کی کہ امیر معین الدین کی ساری دولت شیخ فخرالدین عراقی کے پاس جمع ہے، مگر ان کی گرفتاری سے پہلے خواجہ شمس الدین نے ان کو اس کا موقع دیا کہ وہ توقات چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو جائیں، چنانچہ وہ امیر معین الدین کی امانت کو لے کر دو آدمیوں کے ساتھ یثرب کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں سے مصر پہنچے، یہاں خانقاہ صالحیہ میں قیام کر کے امیر معین الدین کے لڑکے کی رہائی کی تدبیریں کیں۔ جب کوئی صورت کارگر نہ ہوئی تو سلطان مصر کے دربار کے دروازے پر پہنچے۔ حاجبوں نے پہلے تو روکا، مگر پھر اندر جانے کی اجازت دے دی۔ سلطان کو دیکھ کر سلام کیا اور امیر معین الدین کی امانت اُس کے سامنے رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ سلطان نے ان کو دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ کوئی اعلیٰ پایہ کے بزرگ ہیں، چنانچہ اس نے ان کو عزّت سے بٹھایا اور جواہرات کی گٹھڑی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ اس میں کیا ہے؟ شیخ فخرالدین عراقی نے جواب دیا کہ یہ امانت ہے۔ سلطان نے اس کو کھولنے کا حکم دیا اور بیش بہا جواہرات دیکھ کر متحیر ہوا۔ مزید تفصیل پوچھی تو شیخ فخرالدین عراقی نے ساری باتیں بتائیں۔ سلطان کو تعجب تھا کہ اس شخص نے جواہرات کو میرے سامنے لا کر تحفہ کے طور پر حاضر کر دیا ہے اور اپنے لیے اس کو پسند نہیں کیا۔ شیخ کو نور باطن سے سلطان کے اس تعجب کا کشف ہو گیا، چنانچہ اسی وقت کلام پاک کی اس آیت قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا کی تفسیر بیان فرمائی۔ سلطان ان کی تقریر سے متاثر ہو کر اپنی مسند سے نیچے اُتر آیا اور شیخ کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھ گیا اور ان کی باتیں سنتا رہا۔

اسی روز سلطان نے امیر معین الدین کے لڑکے کو قید سے رہا کرنے کا حکم جاری کیا اور اس کے ساتھ بہت ہی لطف و کرم کے ساتھ پیش آیا۔ غایت عقیدت میں اُس نے شیخ فخرالدین عراقیؒ کو سلطنت کا شیخ الشیوخ بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ دوسرے دن اس منصب کے عطا کرنے کی تقریب میں تمام صوفیہ و علما اور اکابر سلطنت کو مدعو کیا۔ اس دعوت پر دربار میں چھ ہزار صوفیہ جمع ہوئے اور بڑے اعزاز کے ساتھ شیخ فخرالدین عراقی کو خلعت اور طیلساں پہنایا گیا۔ اس کے بعد ایک جلوس مرتب کیا گیا جس میں صرف شیخ فخرالدین عراقیؒ گھوڑے پر سوار تھے اور باقی تمام صوفیہ، علما اور امراء ان کے رکاب میں پا پیادہ تھے۔ شیخ نے اپنی یہ عظمت اور توقیر دیکھی تو انھوں نے اپنے میں نفس کا استیلا اور غلبہ محسوس کیا اس لیے اضطراراً طیلسان اور دستار کو اتار کر گھوڑے کی زین کے آگے رکھ لیا۔ کچھ دیر کھڑے رہ کر پھر دستار کو سر پر رکھ لیا۔ حاضرین یہ دیکھ کر ہنسے اور آپس میں کہنے لگے کہ ایسا دیوانہ اور مسخرہ شیخ الشیوخ کے منصب کے لیے کیوں کر موزوں ہو سکتا ہے۔ وزیر نے شیخ سے پوچھا یا شیخ لِمَا فَعَلْتَ هٰذَا (اے شیخ آپ نے ایسا کیوں کیا) شیخ نے جواب دیا وَ اَنْتَ مَا تَعْرِفُ الْحَالَ (آپ کو حال سے واقفیت نہیں) اور جب سلطان کو اس کی خبر ملی

تو شیخ کو بلا کر اس واقعہ کے متعلق استفسار کیا۔ شیخ نے جواب دیا کہ

"میں اپنے نفس کا استیلا و غلبہ محسوس کر رہا تھا، اگر ایسا نہ کرتا تو عقبیٰ سے غافل ہو جاتا۔"

اس جواب کو سن کر سلطان کا اعتقاد اور بھی بڑھ گیا اور شیخ کے وظیفے میں مزید اضافہ کر دیا، مگر شیخ کی طبیعت کی بیقراری اور مزاج کی آشفتگی بدستور قائم رہی۔ وہ بازاروں، سڑکوں اور گلیوں میں بلا تکلف گھومتے نظر آتے تھے اور اس بے تکلفی میں ان سے بعض ایسی باتیں سرزد ہو جاتیں جو درویشی اور مشیخیت کے لیے ناموزوں ہوتیں۔ پھر بھی ان سے لوگوں کی عقیدتمندی قائم رہی۔ سلطان نے حکم دے رکھا تھا کہ وہ اس کے پاس جس وقت بھی تشریف لانا چاہیں ان کی مزاحمت نہ کی جائے۔ چنانچہ اگر وہ حرم یا خوابگاہ میں بھی ہوتا تو فوراً قدمبوسی کے لیے حاضر ہو جاتا۔ کچھ روز کے بعد شیخ کی طبیعت مصر سے گھبرا گئی تو دمشق کی طرف جانے کا قصد کیا۔ سلطان نے روکنا چاہا، مگر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد سلطان نے شام کے ملک الامرا کو ان کے استقبال اور پذیرائی کے لیے لکھا۔ چنانچہ اُس نے تمام علماء و مشائخ کے ساتھ ان کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ یہاں اُن کے قیام کے چھ مہینے کے بعد ان کے فرزند شیخ کبیر الدین ہندوستان سے ملنے آئے۔ بیٹے کے آنے کے کچھ دنوں بعد ان کے چہرے پر دموی ورم ظاہر ہوا، جس سے وہ پانچ روز تک سو نہ سکے اور یہی عارضہ ان کے لیے مرض الموت ثابت ہوا۔ موت کے وقت اپنے بیٹے شیخ کبیر الدین کو پاس بلایا اور یہ آیت پڑھی:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَ اُمِّهٖ وَ اَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيْهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ (عبس۔۱)

(جس روز ایسا آدمی اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ ان میں ہر شخص کو ایسا مشغلہ ہوگا جو اس کو اور طرف متوجہ نہ ہونے دے گا۔)

اس کے بعد کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے عالم جاودانی کو سدھارے۔

"قبر ان کی برابر مزار شیخ محی الدین عربی کے ہے۔ چنانچہ یہ فقیر جمالی بھی وہاں جا کر زیارت سے فیض یاب ہوا ہے۔ محلہ مشہور صالحیہ میں مزار ان کا واقع ہے اور اس علاقے کے زائر دونوں مزاروں کی نسبت الفاظ سے یوں کہتے ہیں کہ ہٰذا بحر العرب یعنی یہ قبر شیخ محی الدین عربی کی سمندر پر فیض عرب شریف کا ہے اور نسبت قبر شیخ مولانا فخر الدین کی کہتے ہیں ہٰذا بحر العجم یعنی یہ سمندر عجم کا ہے۔ بڑا فیض پہنچانے والا اور صدر الدین کرمانی کی قبر بھی ایسی متبرک جگہ پر ہے۔"

شیخ فخر الدین عراقی کی تصانیف میں لمعات کے علاوہ ایک مثنوی اور ایک دیوان بھی ہے۔ مثنوی کا نام برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست میں عشاق نامہ درج ہے۔ میخانہ میں مثنوی کا نام مرقوم نہیں ہے۔ کہیں کہیں اس کا ذکر آیا ہے۔

حضرت شیخ بوعلی قلندر پانی پتی

ولادت ——— پانی پت ۶۰۵ ھ

وفات ——— کرنال ۷۲۴ ھ

نام شیخ شرف الدین اور لقب بوعلی قلندر تھا۔ امام اعظم ابوحنیفہ کی اولاد سے تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے :

شیخ شرف الدین بوعلی قلندر بن سالار۔ فخرالدین بن سالار، حسن بن سالار عزیز بن ابوبکر غازی بن فارس بن عبدالرحمن بن عبدالرحیم بن محمد بن وانک بن امام اعظم ابوحنیفہؒ۔

آپ کے والد ماجد ۶۰۰ ہجری میں عراق سے ہندوستان آئے وہ بڑے متبحر اور جید عالم تھے۔ ان کی پہلی شادی حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کی دختر نیک اختر سے ہوئی، لیکن وہ لاولد فوت ہوگئیں۔ ان کے بعد مولانا سید نعمت اللہ صاحب ہمدانی کرمانی کی ہمشیرہ بی بی حافظہ جمال سے عقد ہوا، جو حضرت شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ کی والدہ تھیں۔

۶۰۵ ھ میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ کم سنی میں تمام علوم ظاہری حاصل کیے اور بیس برس تک دہلی میں قطب مینار کے پاس ان کے درس و تدریس کا فیض جاری رہا۔ دہلی کے اکابر علما مولانا قطب الدین، مولانا وجیہہ الدین پائلی، قاضی ظہورالدین بخاری، قاضی حمیدالدین صدر شریعت، مولانا فخرالدین پائلی وغیرہ ان کے علمی تبحر اور فضیلت کے معترف تھے۔

لیکن جب تصوف کے کوچہ میں قدم رکھا اور ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہوئے تو جذب و سلوک کی حالت میں علوم و فنون کی تمام کتابوں کو دریا میں ڈال کر جنگل کی راہ لی اور پانی پت کے مضافات باگھونی اور کرنال کے نواح بڈھاکھیڑہ میں آخر وقت تک مقیم رہے۔ خزینۃ الاصفیا میں ہے کہ ان کی ارادت اور خلافت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی طرف بھی منسوب ہے۔

سکر اور مستی کی حالت میں ایک بار مونچھیں شرعی حدود سے بہت بڑھ گئی تھیں۔ کسی کو تراشنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ان کے ہمعصر بزرگ مولانا ضیاءالدین سنامی کو شریعت کی پابندی کا بڑا جوش تھا۔ انھوں نے شیخ کی ریش مبارک پکڑ کر مونچھوں کو شرعی حد کے مطابق تراش دیا۔ جب وہ تراش کر تشریف لے گئے تو شیخ بوعلی قلندرؒ اپنی داڑھی پکڑ کر بار بار فرماتے تھے کہ یہ ریش کیسی مبارک ریش ہے کہ شرع محمدی کی راہ میں پکڑی گئی۔

شیخ بوعلی قلندر کے قیام پانی پت کے زمانہ میں شمس الدین ترک اپنے مرشد تاج الاولیا حضرت خواجہ علاؤالدین صابر رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے یہاں آکر قیام پذیر ہوئے۔

حضرت خواجہ شمس الدین ترکستان کے سادات میں اور حضرت خواجہ احمد یسوی کے فرزند تھے، جن کا سلسلۂ نسب حضرت

علی المرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے ۔ خواجہ شمس الدین علوم نقلی و عقلی کی تعلیم پانے کے بعد علم سلوک کی طرف مائل ہوئے ، اور ماوراء النہر کے بہت سے بزرگوں کی صحبت میں رہے ، مگر جب کہیں تشنگی نہ بجھی تو مرشد کامل کی طلب میں ہندوستان کی طرف چل کھڑے ہوئے ۔ ملتان پہنچ کر بابا فرید گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تربیت پانے کے بعد وہاں سے بابا فرید گنج شکرؒ کی ہدایت کے مطابق شیخ علاؤ الدینؒ کی خدمت میں "کلیر" پہنچے ۔

شیخ نے اپنی چار ترکی کلاہ ان کے سر پر رکھ دی ۔ وہ گیارہ سال تک پیر دستگیر کی خدمت میں رہے ۔ مرشد کو اپنے ہاتھوں سے نہلاتے اور وضو کراتے ، ان کے لیے جنگلوں سے لکڑیاں لا کر کھانا پکاتے اور خود فقر و فاقہ سے مجاہدہ و ریاضت میں مشغول رہتے اور مرشد سے علوم سینہ کی تحصیل کے بعد پانی پت میں قیام کرنے کا حکم ملا ، لیکن روحانی طور سے اس مقام کا بار اٹھانے کی صلاحیت نہیں پائی ، اس لیے مرشد کی اجازت سے مزدوری کی طرف متوجہ ہو گئے ۔ اس وقت سلطان غیاث الدین بلبن کا دور حکومت تھا ۔ دہلی آ کر اس کی فوج میں سواروں کے زمرہ میں داخل ہو گئے ۔ کچھ دنوں میں ان کے پاس کافی دولت ہو گئی ، لیکن امارت کی کسی چیز سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا ۔ شب و روز ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے ۔

سیر الاقطاب کے مؤلف کا بیان ہے :

"ایک مرتبہ سلطان غیاث الدین بلبن نے ایک قلعہ کا محاصرہ کیا ۔ ایک زمانہ اسی حالت میں گزر گیا اور قلعہ فتح نہ ہو سکا ، اس دوران میں ایک رات ایسی سخت آندھی آئی اور بارش ہوئی کہ سپاہیوں اور امرائے اسلام کے خیمے گر پڑے ۔ بارش تیزی سے جاری رہی ۔ سخت سردی پڑنے لگی ———— شاہی سقا بادشاہ کے وضو کا پانی گرم کرنے کے لیے آگ کی تلاش میں نکلا ، دفعتہً دور سے دیکھا کہ ایک خیمہ میں چراغ جل رہا ہے ، اور وہ خیمہ حضرت (یعنی خواجہ شمس الدین ترک) کا تھا ، سقا دوڑا ہوا خیمہ کے پاس گیا ۔ دیکھا کہ ایک فقیر کلام مجید کی تلاوت کر رہا ہے ۔ حضرت نے سر اٹھایا اور فرمایا کہ اے بھائی آؤ ، اور جتنی آگ چاہتے ہو لے جاؤ ۔ وہ سامنے آیا اور ایک لکڑی آگ سے جلائی اور لوٹ کر لوٹ گیا ۔ اس واقعہ سے سقا کو بیقراری تھی ۔ صبح کے وقت مشک لے کر اس خیمہ کی طرف چلا اور جب وہاں پہنچا تو حضرت کو اس میں نہ پا کر حیران ہوا ۔ اور وہاں سے واپس آ کر ایک تالاب پر جو لشکرگاہ کے پاس تھا گیا ۔ وہاں دیکھا کہ ایک بزرگ وضو کر رہے ہیں ۔ غور کیا تو وہی پاک صورت نظر آئی جن کے چراغ سے رات کو آگ جلا کر لے گیا تھا ۔ یہ دیکھ کر ایک گوشہ میں کھڑا رہا ، یہاں تک کہ وہ بزرگ وضو کے بعد نماز ادا کر کے اپنے خیمہ کی طرف تشریف لے گئے ۔ سقا نے اسی جگہ سے مشک میں پانی بھر لیا ، باوجودیکہ جاڑے کا زمانہ تھا اور ہر جگہ پانی جم گیا تھا ، لیکن جس جگہ حضرت نے وضو کیا تھا ، وہاں کا پانی اس قدر گرم تھا گویا کسی نے اس کو ابھی گرم کیا ہے ۔ اُس کو لے کر اپنے کارخانہ میں گیا ، اور اپنی عقل سے معلوم کیا کہ یہ سب کچھ اسی مرد خدا کی عظمت و برکت کے سبب ہوا ہے ، لیکن اس راز کو کسی سے ظاہر نہیں کیا ۔ دوسرے دن حضرت

کے پہنچنے سے پہلے جب دو چار گھڑی رات رہ گئی، تالاب پر پہنچا اور پانی کو دیکھا کہ جما ہوا ہے۔ قریب ہی ایک درخت تھا اس کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا، یہاں تک کہ حضرت تشریف لائے۔ ان کے پہنچنے کے ساتھ ہی تالاب کے پانی نے جوش مارا۔ حضرت نے وضو کیا اور نماز ادا کر کے اپنے خیمہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سقا نے گرم پانی کو مشک میں بھرا اور سلطان غیاث الدین بلبن کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس وقت جب سلطان دربار عام میں بیٹھا تھا سقا نے فریاد کی۔ سلطان نے اس کو بلا کر استفسار کیا۔ اُس نے عرض کی اگر جہاں پناہ میرے راز کو خلوت میں سنیں تو گزارش کروں۔ سلطان نے اُس کو موقع دیا۔ سقا نے حضرت کا تمام حال بیان کیا۔ سلطان سُن کر متحیر ہوا اور اپنی خوابگاہ میں اس کو ٹھہرنے کا حکم دیا۔ جب رات ہوئی تو سلطان خیمہ کے اندر چلا گیا اور دروازہ کی کنجی سقا کے حوالہ کر دی، جب تین چار گھڑی رات باقی رہ گئی تو سقا نے دروازہ کھول کر سلطان کو جگا دیا۔ سلطان مسلح ہو کر باہر نکلا اور سقا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہاں تک کہ حضرت تشریف لائے۔ ان کے پہنچتے ہی حسب معمول پانی جوش میں آ گیا، جس کو سلطان نے خود دیکھا۔ حضرت نے وضو کر کے نماز ادا کی اور اپنے خیمہ کی طرف تشریف لے چلے۔ سلطان نے پانی دیکھا تو گرم تھا۔ وہ متحیر ہوا اور حضرت کے پیچھے پیچھے چلا۔ حضرت خیمہ میں پہنچ کر قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ سلطان دست بستہ وہیں کھڑا رہا۔ جب وہ تلاوت سے فارغ ہو چکے تو بادشاہ کو دیکھ کر تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے اور سلام کیا۔ سلطان نے اظہار ادب کر کے عرض کیا کہ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے بزرگ میرے عہد میں موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہزار افسوس ہے کہ ابھی تک یہ قلعہ فتح نہیں ہو سکا۔ حضرت نے ہر چند اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود تھا مجبوراً دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور فاتحہ پڑھ کر فرمایا کہ اسی وقت حملہ کیا جائے۔ قلعہ فتح ہو گیا۔ سلطان جب مسرت سے معمور اپنے فتحمند لشکر میں پہنچا تو دوسرے دن برہنہ پا حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا۔ حضرت نے اپنے نور باطن سے اس کا ارادہ معلوم کر لیا، اپنے گھوڑے کو طلب کر کے فرمایا کہ یہاں سے قریب ایک بیوہ عورت رہتی ہے، اس کی ایک لڑکی جوان ہے کتخدائی کرنے سے معذور ہے۔ تو اس کے پاس جا اور اپنی قیمت اس عورت کو پیش کر۔ گھوڑا حسب ارشاد بیوہ کے پاس گیا، بیوہ نے غیب سے آواز سنی بوڑھی عورت! اس گھوڑے کو بیچ کر اس کی قیمت اپنی لڑکی کے کار خیر میں صرف کر۔ اس عورت نے ایسا ہی کیا۔ حضرت نے اپنا بقیہ تمام اسباب و مال متاع فقراء کو دے دیا اور کمبل اوڑھ کر لشکر سے چل کھڑے ہوئے اور اپنے پیر دستگیر کی خدمت میں پہنچے۔ کچھ دنوں وہاں رہ چکے تو پانی پت میں مامور کیے گئے۔"

جب حضرت شمس الدین ترک پانی پتی کا نزول اجلال پانی پت میں ہوا تو دودھ سے بھرا ہوا پیالہ اپنے خادم کے ہاتھ شیخ بو علی قلندر کی خدمت میں بھیجا۔ شیخ بو علی قلندر خادم کو دیکھ کر مسکرائے۔ چند پھول ان کے سامنے پڑے تھے ان کی

پنکھڑیاں دودھ میں ڈال کر اسے شمس الدین ترکؒ کے پاس واپس کر دیا۔ وہ پیالے میں گلاب کی پتیاں دیکھ کر متبسم ہوئے۔ حاضرین مجلس نے تبسم کی وجہ پوچھی۔ فرمایا کہ شیخ بوعلی قلندرؒ کو دودھ سے بھرا ہوا پیالہ بھیجنے سے مراد یہ تھی کہ یہ ملک میرے شیخ نے مجھ کو عطا کیا ہے جو مجھ سے پُر ہو گیا ہے۔ شیخ بوعلی قلندرؒ نے گلاب کی پنکھڑیاں ڈال کر دودھ کا پیالہ واپس کر دیا تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ میرے ملک سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے اور یہاں اسی طرح رہیں گے، جس طرح دودھ میں گلاب کی پنکھڑیاں رہیں۔ شیخ بوعلی قلندرؒ سے پوچھا گیا تو انھوں نے بھی یہی فرمایا۔ چنانچہ دونوں میں آخر وقت تک اخلاص اور محبت قائم رہی۔

میراں اولیا حضرت شیخ جلال الدین محمود پانی پتیؒ شیخ بوعلی قلندرؒ ہی کے فیض نظر سے راہِ طریقت پر گامزن ہوئے۔ ایک دن شیخ بوعلی قلندر رحمۃ اللہ علیہ سرِ راہ بیٹھے ہوئے تھے کہ کم سنی کے زمانہ میں شیخ جلال الدین گھوڑے پر سوار ادھر سے گزرے۔ ان کو دیکھ کر شیخ بوعلی قلندرؒ نے فرمایا:

ع   زہے اسپ و زہے سوار

کانوں میں آواز پڑتے ہی شیخ جلال الدین بے خود ہو گئے۔ گھوڑے سے اتر پڑے اور اسی وقت گریبان چاک کر کے جنگل کی راہ لی اور چالیس سال تک جنگل میں پھرتے رہے۔ اس دوران میں مختلف درویشوں اور فقیروں کی صحبت اختیار کی۔ جب وطن واپس آئے تو شیخ بوعلی قلندر سے بیعت کے لیے مصر ہوئے۔ شیخ نے فرمایا:

"اے فرزند! نیز کشائش تو موقوف بر مرد دیگر است۔"

چنانچہ جب حضرت شمس الدین ترکؒ پانی پتی کا ورود مسعود پانی پت میں ہوا تو شیخ بوعلی قلندر نے شیخ جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے پاس ارادت کے لیے بھیجا، جو آگے چل کر ان کے خلیفہ ہوئے۔

سلطان جلال الدین خلجی کو حضرت خواجہ بوعلی قلندرؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ ان کے حلقۂ ارادت میں بھی شامل ہو گیا تھا اور بزرگانِ دین ہی کی صحبت کا شاید یہ اثر تھا۔ اس میں حلم، نرمی اور خدا ترسی کے اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے۔

مگر ان خوبیوں کے باوجود حضرت سیدی مولاؒ کا خون اس کے سر پر ہے۔ گو اس واقعہ کی تفصیل ہمارے موضوع سے متعلق نہیں، لیکن ناظرین کو اس سے دلچسپی ہوگی، اس لیے اس کو مجملاً مولانا ضیاء الدین برنی کی زبانی بیان کرتے ہیں:

"سیدی مولاؒ ایک درویش تھے جو سلطان بلبن کے عہد میں ولایت ملک بالا سے شہر (یعنی دہلی) میں آئے وہ عجیب خیالات رکھتے تھے۔ خرچ کرنے اور کھانا کھلانے میں بے نظیر تھے، جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے نہیں آتے تھے گو وہ نماز کے پابند تھے اگرچہ جماعت کے ساتھ نماز ادا نہیں کرتے تھے، جس کی پابندی تمام بزرگانِ دین نے کی ہے۔ وہ مجاہدہ و ریاضت بہت کرتے تھے۔ جامہ اور چادر پہنتے اور چاول کی روٹی معمولی سالن سے کھاتے تھے۔ ان کے پاس کوئی عورت، کنیز اور خدمت گار نہ تھا اور نہ وہ کسی نفسانی خواہش میں مبتلا تھے۔ کوئی کچھ دیتا تو اس کو قبول نہ کرتے، لیکن ان کے اخراجات اتنے تھے کہ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔

عام کا خیال تھا کہ وہ علم کیمیا جانتے ہیں۔ اپنے دروازہ کے سامنے میدان میں انھوں نے ایک خانقاہ بنوائی تھی، اس کی تعمیر میں ہزاروں روپے خرچ کیے تھے۔ اس خانقاہ میں بڑی مقدار میں کھانا پکتا تھا۔ بری و بحری سفر کرنے والے مسافر یہاں اگر مقیم ہوتے تھے، اور ان کو دو وقت کھانا ملتا تھا۔ کھانا ایسا ہوتا تھا کہ اس زمانہ کے خوانین و ملوک کو میسر نہ تھا۔ خانقاہ میں ہزاروں من میدہ خرچ ہوتا تھا۔ پانچ سو جانور ذبح کیے جاتے تھے۔ دو تین سو من شکر اور سو دو سو من نبات خریدی جاتی تھی۔ خانقاہ کے سامنے آدمیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ان کے پاس (یعنی حضرت سیدی مولائی) نہ کوئی گاؤں تھا اور نہ ان کو شاہی وظیفہ ملتا تھا اور نہ وہ کسی سے فتوح قبول کرتے تھے۔ جب کسی سے کوئی چیز خریدتے یا کسی کو کچھ رقم دینا چاہتے تو کہتے "جاؤ فلاں پتھر یا اینٹ کے نیچے جاکر اتنے نقرئی ٹکے لے لو"۔ وہ جاتا تو واقعی اینٹ یا پتھر کے نیچے یا طاق میں طلائی اور نقرئی سکے مل جاتے۔ یہ سکے ایسے ہوتے جیسے دار الضرب سے بالکل نئے نکلے ہوں"

آگے چل کر مولانا ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں:

"حضرت سیدی مولائی کی خانقاہ کے اخراجات سلطان جلال الدین خلجی کے عہد میں اور [illegible] زیادہ بڑھ گئے تھے سلطان جلال الدین کا بڑا لڑکا خانخاناں ان کا معتقد ہو گیا تھا وہ اپنے کو حضرت سیدی مولائی کا بیٹا کہتا تھا اور امراء اور حکام کی آمد و رفت ان کے پاس بڑھ گئی تھی۔ قاضی جلال کاشانی نے جو اس ز[illegible] بڑا قاضی تھا، لیکن فتنہ انگیز تھا۔ سیدی سے تعلقات پیدا کیے۔ وہ دو تین راتیں خانقاہ میں بسر کرتا، اور وہاں کے لوگوں سے گفتگو کرتا۔ بلبن کے عہد کے مولانا زادے جو امراء اور ملوک کی اولاد سے تھے۔ اس گفتگو میں شریک رہتے۔ یہ سب عہد جلالی میں بالکل بے سروسامان بے اقطاع اور بے حشم ہو گئے تھے۔ برنج تن اور ہتھیا پایک سے کوتوال جو آزاد اور پہلوانوں کے گروہ میں اور بلبنی عہد میں ایک لاکھ جیتل وظیفہ پاتے تھے۔ بے وظیفہ ہو گئے تھے اور بعض دوسرے اکابر جو عہدوں سے معزول کر دیے گئے تھے۔ سیدی کی خانقاہ میں آکر رات کو سوتے اور ان سے کچھ چیزیں پاتے۔ لوگ سمجھتے کہ ان اکابر کی آمد و رفت محض حصول برکت کے لیے ہوتی ہے، لیکن معلوم ہوا کہ قاضی جلال کاشانی، شہزادے، ملک زادے، برنج تن، ہتھیا پایک کے کوتوال نے ارادہ کیا کہ جمعہ کے روز جب نماز کے لیے سلطان جلال الدین کی سواری نکلے تو اس پر حملہ کر دیا جائے اور سیدی کو خلیفہ بنا کر ان کا نکاح سلطان ناصر الدین کی لڑکی سے کر دیا جائے اور قاضی جلال کو قاضی خاں کے عہدہ اور ملتان کا اقطاع دار مقرر کیا جائے۔ اسی طرح اور اقطاعات ملک زادوں اور خان زادوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ ان بیکار لوگوں میں سے ایک شخص نے جو مشورے میں شریک تھا ان سے منحرف ہو کر یہ تمام خبریں سلطان جلال الدین تک پہنچا دیں۔ سیدی اور ان کے ساتھی متہم کر کے سلطان کے سامنے لائے گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

. . . . . . سلطان نے تفتیش کرنی چاہی تو سب نے انکار کر دیا۔ اس زمانہ میں یہ رواج نہ تھا کہ انکار کرنے والوں سے لات، اور ڈنڈے کے ذریعے اقرار کرایا جاتا۔ چنانچہ وب کے لیے حکم جاری کیا گیا۔ سلطان اور دوسرے لوگوں کو سازش کا پورا یقین تھا، لیکن سازش کرنے والے منکر تھے۔ دوسرا کوئی ثبوت نہ تھا، وران پر کوئی حکم نافذ نہ کیا جا سکتا تھا، اس لیے بہار پور کے میدان میں آگ روشن کی گئی۔ سلطان، ملوک، اور خوانین کے ساتھ وہاں پہنچا۔ ایک کوشک خاص نصب کیا گیا۔ سلطان نے شہر کے تمام اکابر علماء و مشائخ کا محضر طلب کیا۔ اس میدان میں شہر کے خواص و عوام بھی جمع ہوئے۔ سلطان نے حکم دیا کہ سازش کرنے والوں کو آگ میں ڈال دیا جائے تاکہ جھوٹ اور سچ روشن ہو جائے، لیکن اس کے بارے میں جب علما سے استفسار کیا گیا تو متدین علماء نے کہا کہ "وب" نامشروع ہے اور آگ کے ذریعہ سے جھوٹ اور سچ کی تمیز نہیں کی جا سکتی ہے۔ سازش کی خبر صرف ایک شخص نے دی ہے اور ایسے جرم میں ایک شخص کی شہادت قابل سماعت نہیں، اس لیے سلطان نے "وب" کا ارادہ ترک کر دیا اور قاضی جلال کو جو فتنہ کا سرغنہ تھا، بدایوں کا قاضی بنا کر بھیج دیا۔ خان زادوں اور ملک زادوں کو جلاوطن کر دیا اور ان کی املاک ضبط کر لیں۔ برنجی تن اور ہتھیا پایک کے کوتوال کو سزا دی۔ اس کے بعد سیدی مولائی کو باندھ کر سلطان کے کوشک کے پاس لایا گیا۔ سلطان نے ان سے خود مباحثہ کیا۔ معاً بحری نامی ایک حیدری نے بڑھ کر سیدی کو استرے سے زخمی کر دیا اور کلی خان نے کوشک کے اوپر سے فیلبانوں کو اشارہ کیا۔ ایک ہاتھی سیدی کی طرف دوڑا اور ان کے پاؤں تلے مسل ڈالا۔ اس کے بعد مولانا ضیاءالدین برنی اپنے تاثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایسا حلیم و بردبار بادشاہ اس معاملہ میں مشوروں کو سننے کی طاقت نہ پیدا کر سکا، اور ایسا حکم صادر کر دیا جس سے درویشی کی عزت جاتی رہی۔ مجھ کو یاد ہے کہ جس روز سیدی مولائی کا قتل ہوا، ایک سیاہ طوفان آیا، اور تاریکی چھا گئی۔ سیدی مولائی کے قتل کے بعد ایک سال بارش نہیں ہوئی۔ دہلی میں قحط پڑ گیا اور غلہ ایک جیتل میں ایک سیر ملنے لگا۔ سوالک کے علاقہ میں ایک قطرہ بھی بارش نہ ہوئی۔ اس زمین کے ہندو عورتوں اور بچوں کے ساتھ دہلی چلے آئے۔ بیس بیس اور تیس تیس آدمی ایک جگہ رہتے اور بھوک سے بیتاب ہو کر اپنے کو جمنا میں غرق کر دیتے تھے۔ اہل لوگ سلطان اور امراء کے صدقات پر زندگی بسر کرتے تھے۔

اخبار الاخیار کے مصنف کا بیان ہے:

"جس روز سیدی مولائی کا قتل ہوا، بے اندازہ باد و غبار فضا میں اٹھا، دنیا تاریک ہو گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قیامت آ گئی ہے۔ سلطان جلال الدین نے یہ حال دیکھا تو سیدی مولائی سے اس کو اعتقاد پیدا ہو گیا جو

پہلے نہ تھا۔"

۱۳-رمضان المبارک ۷۲۴ھ میں شیخ بو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا۔ تاریخ وفات "یا شرف الدین ابدال" سے نکلتی ہے۔ کرنال میں مدفون ہوئے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اعزہ و اقربا نے ایک رات پوشیدہ طور پر نعش مبارک کو پانی پت میں لیجاکر دفن کر دیا۔ چنانچہ کرنال پانی پت بڈھا کھیڑہ اور باگھونی میں آج بھی ان کے معتقدین کا ہجوم رہتا ہے۔

حضرت شیخ بو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے حسب ذیل تصانیف منسوب ہیں:

مکتوبات بنام اختیار الدین، حکم نامہ شرف الدین۔ مثنوی کنز الاسرار، رسالہ عشقیہ۔

سلطان شمس الدین التمش کے شاہی حاجب کا نام بھی اختیار الدین تھا۔ شاید یہ مکتوبات اسی کے نام ہوں بعض مکتوبات کے نمونے ملاحظہ ہوں۔

"اے برادر! جب تم پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی عنایت شروع ہو جائے، تم میں جذبہ پیدا ہونے لگے اور تم کو تم سے دور کیا جائے تو گویا تم میں عشق کا آغاز اور تم پر حسن کا جلوہ ظاہر ہو گیا اور جب تم کو حسن کا مشاہدہ ہو جائے تو معشوق کو پہچانو اور عاشق بن کر معشوق ہو جاؤ۔ اور جب عاشق بن کر معشوق ہو گئے تو اسی طرح کام کرو۔ معشوق کی سنت اور عاشق کے فریضہ کو قائم رکھو۔ اس وقت معشوق کو عاشق کے ذریعہ سے پہچان لوگے۔"

"اے برادر! معشوق کو تمھاری ہی صورت میں پیدا کر کے تمھارے درمیان بھیجا گیا ہے، تاکہ براہ راست تمھیں دعوت دے۔"

"اے برادر! خدائے عزوجل نے بہشت و دوزخ پیدا کیا اور اس کا حکم ہے کہ دونوں پُر کیے جائیں معشوق کو عاشقوں کے ساتھ بہشت میں جگہ دی جائے گی اور شیطان اپنے ساتھیوں کے ساتھ دوزخ کو پُر کرے گا۔ بہشت و دوزخ میں عاشقوں کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔ دونوں عاشق ہی کے حسن سے پیدا ہوئے ہیں، اور دونوں مقام غیر نہ ہوں گے۔ بہشت دوستوں سے وصال کا مقام ہے۔ دوزخ دشمنوں کے لیے جائے فراق ہے۔ یہ فراق کافروں اور منافقوں کو حاصل ہوگا اور وصال محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقوں اور دوستوں کو نصیب ہوگا۔"

"اے برادر! چشم دل کو کھولو اور اچھی طرح سے دیکھو اور یہ جانو کہ عاشق نے اپنے عشق سے تمھارے لیے کیا کیا چیزیں اور کیا کیا تماشے پیدا کیے ہیں۔ اپنا حسن ایک درخت میں منتقل کر دیا ہے اور گوناگوں میوے پیدا کیے۔ ہر میوہ میں علٰحدہ مزا رکھا اور اس درخت کو نہ اپنی ذات کی خبر اور نہ اپنے پھول کی خبر اور نہ اپنے میوہ کی خبر ہے۔ گنا تمھارے لیے پیدا کیا ہے اور اس کو شکر کی خبر نہیں۔ مشک کو ہرن کی ناف میں رکھا، جو تمھارے لیے ہے، ہرن کو مشک کی کوئی خبر نہیں۔ گائے سے عنبر کو تمھارے لیے

پیدا کیا اور گائے کو عنبر کی خبر نہیں۔ نباد کو بلّی سے تمہارے لیے پیدا کیا اور بلّی کو زباد کی خبر نہیں۔ کافور کو تمہارے لیے درخت سے پیدا کیا اور درخت کو کافور کی خبر نہیں۔"

"اے برادر! عاشق ہو جاؤ اور دونوں عالم کو معشوق کا حسن جانو اور اپنے آپ کو معشوق کا حسن رکھو۔ عاشق نے اپنے عشق سے تمہارے وجود کا ملک بنایا، تاکہ اپنے حسن و جمال کو تمہارے آئینہ میں دیکھے، اور تم کو محرم اسرار جانے اور اَلْاِنْسَانُ سِرِّیْ (انسان میرا بھید ہے) تمہاری شان میں آیا ہے۔ عاشق ہو جاؤ تاکہ حسن کو ہمیشہ دیکھو، اور دنیا و عقبےٰ کو پہچانو۔ عقبیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ملک ہے اور دنیا شیطان کی ملکیت ہے۔ دونوں میں معلوم کرو کہ تمہارے لیے کس کو پیدا کیا ہے۔ اے برادر! نفس کو اچھی طرح پہچانو۔ جب تم نفس کو پہچان لوگے، تو دنیا کو بھی پہچان سکو گے اور اگر روح کو پہچان لوگے تو عقبےٰ کو بھی پہچان لوگے۔"

"اے برادر دنیا! کفر میں جو حسن رکھا گیا ہے، عاشق جانتے ہیں کہ اس نے (یعنی حسن نے) کفر کو اپنے عاشقوں کے سامنے کس قدر آراستہ کر دیا ہے۔ جو دنیا کا عاشق ہے، اس کا معشوق کفر کا حسن ہے۔"

"اے برادر! تم جانتے ہو کہ حسن کا جو غمزہ کفر میں رکھا گیا ہے، اُس نے کس قدر پُر لطف تیر دنیا والوں پر مارا ہے اور ان کو اپنا عاشق بنالیا ہے۔"

"اے برادر! اپنی جستجو میں رہو اور اپنے کو پہچانو، جب تم اپنے نفس کو پہچان لوگے، تو عشق کو بھی جان سکوگے، اور جب عشق کو اپنے حسن پر دیکھو گے تو حقیقی احساس کی کیفیت، اپنے میں پاؤ گے۔ عاشق ہو جاؤ اور معشوق کو اپنی گود میں دیکھو اور حسن کو اپنے دل کے آئینہ میں معاینہ کرو۔"

"اے برادر! قند کا ایک گولہ لاؤ اور اس سے سو گولے بنالو اور ہر گولہ سے ایک صورت بناؤ اور ہر صورت کا ایک نام رکھو۔ بعض کو گھوڑا اور بعض کو ہاتھی کہو تو قند کا نام جاتا رہے گا اور صرف وہ صورت باقی رہے گی۔ جب کل صورتوں کو توڑ کر قند کا گولہ بنالو تو قند کا نام پھر ظاہر ہو جائے گا۔"

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں:

اے برادر! یہ نہیں معلوم کہ ہم لوگوں کو کس لیے پیدا کیا گیا اور ہم لوگوں کے ساتھ کیا ہوگا، لیکن خیال ہمیشہ فکر کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔ کبھی فکر ہمارے دل کے آئینہ کو آراستہ کر دیتا ہے اور عاشق کے سامنے معشوق کو ظاہر کرتا ہے اور عاشق کا وہ حکم جس کو معشوق نے پہچانا ہے، عاشق کے فرض اور معشوق کی سنت کے مطالعہ میں بجا لاتا ہے، عاشق کے عشق اور معشوق کے حسن سے باطن کو معمور رکھتا ہے اور حسن کے تماشہ سے عاشق اپنے ظاہر کو بھلا دیتا ہے اور اپنے باطن کے تماشہ میں مصروف ہو جاتا ہے، تاکہ عاشق کا حکم جس کو معشوق نے پہنچایا ہے، نافذ ہو جائے۔"

"اے برادر! کبھی خیال نفس کا دوست ہو جاتا ہے اور حال خیال کے ساتھ متحد ہو کر دنیا کی روزی کی طرف لے آتا ہے۔ خیال دنیا کی آرائش نفس کو دکھلاتا ہے، وہ اس کے شوق میں اس کو پریشان کرتا ہے اور اس کو یعنی نفس کو معشوق کے دروازے پر پھراتا ہے۔ ہر دروازہ پر ذلیل کرتا ہے اور (نفس) شوق اور آرائش کی آسائش کی وجہ سے اس ذلت سے واقف نہیں ہوتا اور باز نہیں آتا اور یہ نہیں سوچتا کہ دنیا نے کسی کے ساتھ نہ وفا کی ہے اور نہ وفا کرے گی، نہ اس کو (نفس کو) موت کی فکر ہوتی ہے کہ دفعتاً آکر اس کو فنا کر دے گی۔ دنیا کی آرائش کا حسن دنیا کے عاشقوں کو اپنے عشق میں ایسا بے خبر کر دیتا ہے کہ نہ اس کو دنیا کی خبر ہوتی ہے، جس کو انھوں نے معشوق بنایا ہے اس کی بھی ان کو خبر نہیں ہوتی کہ دنیا اگر ختم ہو جائے گی تو کیا واقعات ظہور پذیر ہوں گے اور نہ عقبیٰ کی خبر ان کو ہوتی ہے کہ ان کے سامنے کیا مہم درپیش ہے۔"

"اے برادر! سوچو کہ تمھارے سامنے ایک مہم درپیش ہے اور تم نے خیال اور فکر کو اپنا مونس بنایا ہے، خیال کی نسبت ہوش رکھو کہ وہ نفس کا دوست ہو گیا ہے۔"

"اے برادر! میں نہیں جانتا ہوں کہ میں کیا کروں اور مجھ سے کون سا کام بن پڑے گا اور کیا میری زبان سے نکلے گا۔ زبان خدا کی قدرت میں ہے۔ اگر تم پر خدا کا فضل ہوا تو تمھاری زبان سے وہ بات نکلے گی جو دونوں جہان کو پسند ہو گی۔"

"اے برادر! اس قدر معلوم ہوا ہے کہ خدا نے اپنی مشیت سے تم کو پیدا کیا اور اپنی مشیت سے باقی رکھتا ہے۔ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (یعنی جو کچھ اس نے چاہا، اس کو کیا اور جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے، کسی کو اس کی مشیت میں دخل نہیں)۔"

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ

ولادت ——————— بلخ سنہ ۶۰۴ھ

وفات ——————— قونیہ (ترکستان) سنہ ۶۷۲ھ

نام ونسب ولادت وتعلیم وتربیت محمد نام۔ جلال الدین لقب، عرف مولانائے روم۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد میں تھے۔ حسین بلخی مولانا کے پردادا بہت بڑے صوفی اور صاحب کمال تھے۔ سلاطین وقت اس قدر ان کی عزت کرتے تھے کہ محمد خوارزم شاہ نے اپنی بیٹی کی ان سے شادی کردی تھی۔ بہاؤالدین اسی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سلطان محمد خوارزم شاہ بہاؤالدین کا ماموں اور مولانا کا نانا تھا۔[۱]

مولانا کے والد شیخ بہاؤالدین مولانا کے والد کا لقب بہاؤالدین اور بلخ وطن تھا۔ علم وفضل میں یکتائے روزگار گنے جاتے تھے۔ خراسان کے تمام دور دراز مقامات سے ان ہی کے یہاں فتوے آتے تھے۔ بیت المال سے کچھ روزینہ مقرر تھا اسی پر گزر اوقات تھی۔ وقف کی آمدنی سے مطلقاً متمتع نہیں ہوتے تھے۔ معمول تھا کہ صبح سے دوپہر تک علوم درسیہ کا درس دیتے ظہر کے بعد حقائق اور اسرار بیان کرتے، پیر اور جمعہ کا دن وعظ کے لیے خاص تھا۔

یہ خوارزم شاہیوں کی حکومت کا دور تھا، اور محمد خوارزم شاہ جو اس سلسلہ کا گل سرسبد تھا، مسند آرا تھا۔[۲] وہ بہاؤالدین کے حلقہ بگوشوں میں تھا اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ اسی زمانہ میں امام فخرالدین رازی بھی تھے اور خوارزم شاہ کو ان سے بھی خاص عقیدت تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جب محمد خوارزم شاہ بہاؤالدین کی خدمت میں حاضر ہوتا تو امام صاحب بھی ہم رکاب ہوتے۔

مولانا کی ولادت مولانا روم سنہ ۶۰۴ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد شیخ بہاؤالدین سے حاصل کی۔ شیخ بہاؤالدین کے مریدوں میں سید برہان الدین محقق بڑے پایہ کے فاضل تھے، مولانا کے والد نے مولانا کو ان کی آغوش تربیت میں دیا۔ وہ مولانا کے اتالیق بھی تھے اور استاد بھی۔ مولانا نے اکثر علوم وفنون ان ہی سے حاصل کیے۔ ۱۸ یا ۱۹ برس کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ

---

[۱] مدینۃ العلوم از شبلی۔ [۲] محمد خوارزم شاہ سلسلۂ خوارزم کا بہت بڑا با اقتدار فرماں روا تھا۔ خراسان سے کر تمام ایران، ماوراء النہر، کاشغر اور عراق تک اس کے زیر اثر تھا۔ خبر غرض ارادہ کیا کہ سلطنت عباسیہ کو مٹا کر اس کے بجائے اپنی ذات کی سلطنت قائم کرے۔ اس ارادے سے بغداد کو روانہ ہوا لیکن راہ میں اس قدر برف پڑی کہ واپس آنا پڑا۔ سنہ ۶۱۶ھ میں چنگیز خانیوں سے شکست کھائی اور بالآخر ناکامی کی حالت میں سنہ ۶۱۷ھ میں وفات پائی۔ دیکھیں تذکرہ دولت شاہ سمرقندی۔

قونیہ میں آئے۔ جب اُن کے والد نے انتقال کیا تو اس کے دوسرے سال یعنی ۶۲۹ھ میں جب ان کی عمر ۲۵ برس کی تھی، تکمیل فن کے لیے شام کا قصد کیا[1]۔ اس زمانہ میں دمشق اور حلب علوم و فنون کے مرکز تھے۔ ابن جبیر نے ۵۸۰ھ میں جب دمشق کا سفر کیا تو خاص شہر میں ۲۰ بڑے بڑے دار العلوم موجود تھے[2]۔ حلب میں سلطان صلاح الدین کے بیٹے الملک الظاہر نے قاضی ابوالمحاسن کی تحریک سے ۵۹۱ھ میں متعدد بڑے بڑے مدرسے قائم کیے۔ چنانچہ اس زمانہ سے حلب بھی دمشق کی طرح مدینۃ العلوم بن گیا[3]۔

مولانا نے اوّل حلب کا قصد کیا اور مدرسہ حلاویہ کی دار الاقامۃ (بورڈنگ) میں قیام کیا[4]۔ اس مدرسہ کے مدرس کمال الدین ابن عدیم حلبی تھے۔ ان کا نام عمر بن احمد بن ہبۃ اللہ ہے۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ وہ محدث، حافظ، مورخ، فقیہ، کاتب، مفتی اور ادیب تھے۔ حلب کی تاریخ جو انھوں نے لکھی ہے اس کا ایک ٹکڑا یورپ میں چھپ گیا ہے۔

مولانا کے مدرسہ حلاویہ کے سوا حلب کے اور مدرسوں میں بھی علم کی تحصیل کی۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں عربیت، فقہ، حدیث اور تفسیر اور معقول میں یہ کمال حاصل کیا کہ جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا اور کسی سے حل نہ ہوتا تو لوگ ان کی طرف رجوع کرتے تھے[5]۔

مناقب العارفین میں لکھا ہے کہ مولانا نے سات برس تک دمشق میں رہ کر علوم کی تحصیل کی اور اس وقت مولانا کی عمر چالیس برس کی تھی[6]۔

یہ امر قطعی ہے کہ مولانا نے تمام علوم درسیہ میں نہایت اعلیٰ درجہ کی مہارت پیدا کی تھی۔ جواہر مضیئہ میں لکھا۔ مکان عالماً بالمذاھب واسع لفقہ عالمًا بالخلاف وانواع العلوم خود ان کی مثنوی اس کی بہت بڑی شہادت ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے جو کچھ پڑھا تھا اور جن چیزوں میں کمال حاصل کیا تھا وہ اشاعرہ کے علوم تھے مثنوی میں جو تفسیری روائتیں نقل کی ہیں۔ اشاعرہ یا ظاہریوں کی روایتیں ہیں، انبیا کے قصص وہی نقل کیے ہیں جو عوام میں مشہور تھے۔ معتزلہ سے ان کو وہی نفرت ہے۔

سید برہان الدین سے استفادہ

مولانا کے والد نے جب وفات پائی تو سید برہان الدین اپنے وطن ترمذ میں تھے، یہ خبر سن کر ترمذ سے روانہ ہوئے اور قونیہ میں آئے۔ مولانا اس وقت لارندہ میں تھے۔ سید برہان الدین نے مولانا کو خط لکھا اور اپنے آنے کی اطلاع دی۔ مولانا اسی وقت روانہ ہوئے۔ قونیہ میں شاگرد و اُستاد کی ملاقات ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا، دیر تک دونوں پر بے خودی کی کیفیت طاری رہی۔ افاقہ کے بعد سید نے مولانا کا امتحان لیا اور جب تمام علوم میں کامل پایا تو کہا کہ صرف علم باطنی رہ گیا ہے اور یہ تمھارے والد کی امانت ہے، جو میں تم کو دیتا ہوں۔ چنانچہ نو برس تک طریقت اور سلوک کی تعلیم دی۔ بعضوں کا بیان ہے کہ اسی زمانے میں مولانا ان کے مرید بھی ہو گئے۔

---

[1] مناقب العارفین صفحہ ۵۲ [2] سفرنامہ ابن جبیر ذکر دمشق [3] ابن خلکان ترجمہ قاضی بہاؤالدین [4] سپہ سالار صفحہ ۲۹

[5] سپہ سالار صفحہ ۱۶ [6] مناقب العارفین صفحہ ۵۲

یہ سب کچھ تھا۔ لیکن مولانا پر اب تک ظاہری علوم ہی کا رنگ غالب تھا۔ ان کی زندگی کا دوسرا دور درحقیقت شمس تبریز کی ملاقات سے شروع ہوتا ہے۔ جس کو ہم تفصیل سے لکھتے ہیں:

شمس تبریز کی ملاقات

جواہر مضیئہ جو علمائے حنفیہ کے حالات میں سب سے پہلی اور سب سے زیادہ مستند کتاب ہے، اس میں لکھا ہے کہ ایک دن مولانا گھر میں تشریف رکھتے تھے، تلامذہ آس پاس بیٹھے تھے۔ چاروں طرف کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اتفاقاً شمس تبریز کسی طرف سے آنکلے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ مولانا کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کہ یہ (کتابوں کی طرف اشارہ کر کے) کیا ہے۔ مولانا نے کہا یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے۔ یہ کہنا تھا کہ دفعتہً تمام کتابوں میں آگ لگ گئی۔ مولانا نے کہا یہ کیا ہے۔ شمس نے کہا یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے۔ شمس تو یہ کہہ کر چل دیے۔ مولانا کا یہ حال ہوا کہ گھر بار، مال، اولاد سب چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے اور ملک بہ ملک خاک چھانتے پھرے، لیکن شمس کا کہیں پتہ نہ لگا۔ کہتے ہیں کہ مولانا کے مریدوں میں سے کسی نے شمس کو قتل کر ڈالا۔

شمس تبریز کے والد کا نام علاؤالدین تھا، وہ اس بزرگ کے خاندان سے تھے جو فرقہ اسمٰعیلیہ کا امام تھا، لیکن انھوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا تھا۔ شمس نے تبریز میں علم ظاہری کی تحصیل کی۔ پھر بابا کمال الدین جندی کے مرید ہوئے، لیکن عام صوفیوں کی طرح پیری مریدی اور بیعت و ارادت کا طریقہ نہیں اختیار کیا۔ سوداگروں کی وضع میں شہروں کی سیاحت کرتے رہتے۔ جہاں جاتے کارواں سرا میں اترتے اور حجرے کا دروازہ بند کر کے مراقبے میں مصروف ہوتے۔ معاش کا یہ طریقہ رکھا تھا کہ کبھی کبھی ازار بند بُن لیتے اور اسی کو بیچ کر روزی حاصل کرتے۔ ایک دفعہ مناجات کے وقت دعا مانگی کہ الٰہی کوئی ایسا بندہ خاص ملتا جو میری صحبت کا متحمل ہو سکتا۔ عالم غیب سے اشارہ ہوا کہ روم کو جاؤ۔ اسی وقت چل کھڑے ہوئے۔ قونیہ پہنچے تو رات کا وقت تھا، برنج فروشوں کی سرائے میں اترے۔ سرائے کے دروازہ پر ایک بلند چبوترہ تھا۔ اکثر امرا اور عمائد تفریح کے لیے وہاں آ بیٹھتے تھے، شمس بھی اسی چبوترے پر بیٹھا کرتے تھے۔ مولانا کو ان کے آنے کا حال معلوم ہوا تو ان کی ملاقات کو چلے۔ راہ میں لوگ قدمبوس ہوتے جاتے تھے، اسی شان سے سرائے کے دروازے پر پہنچے۔ شمس نے سمجھا کہ یہی شخص ہے جس کی نسبت بشارت ہوئی ہے۔ دونوں بزرگوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور دیر تک زبانِ حال میں باتیں ہوتی رہیں۔ شمس نے مولانا سے پوچھا کہ حضرت بایزید بسطامیؒ کے ان دو واقعات میں کیونکر تطبیق ہو سکتی ہے کہ ایک طرف تو یہ حال تھا کہ تمام عمر خربوزہ نہیں کھایا کہ معلوم نہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کس طرح کھایا ہے؟ دوسری طرف اپنی نسبت یوں فرماتے تھے کہ سبحانی ما اعظم شانی (یعنی اللہ اکبر میری شان کس قدر بڑی ہے) حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باایں ہمہ جلالت شان فرمایا کرتے تھے کہ میں دن بھر میں ستر دفعہ استغفار کرتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا کہ بایزید اگرچہ بہت بڑے پایہ کے بزرگ تھے، لیکن مقام ولایت میں وہ ایک خاص درجے پر ٹھہر گئے اور اس درجہ کی عظمت کے اثر سے ان کی زبان سے ایسے الفاظ نکل جاتے تھے، بخلاف اس کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منازلِ تقرب میں برابر ایک پایہ سے دوسرے پایہ پر چڑھتے جاتے تھے، اس لیے جب بلند پایہ پر پہنچتے تھے تو پہلا پایہ اس قدر پست نظر آتا تھا کہ اس سے استغفار کرتے تھے۔

چلہ کوشی سپہ سالار کا بیان ہے کہ چھ مہینے تک برابر دونوں بزرگ صلاح الدین زرکوب کے حجرہ میں چلہ کش رہے۔ اس مدت میں آب و غذا قطعاً متروک تھی اور بجز صلاح الدین کے اور کسی کو حجرہ میں آمد و رفت کی مجال نہ تھی۔ مناقب العارفین نے اس مدت کو نصف بتایا ہے۔ اس زمانے سے مولانا کی حالت میں ایک نمایاں تغیر جو پیدا ہوا، وہ یہ تھا کہ اب تک سماع سے محترز تھے۔ اب اس کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ چونکہ مولانا نے درس و تدریس اور وعظ و پند کے اشغال دفعتہً چھوڑ دیے اور حضرت شمس کی خدمت سے دم بھر کو جدا نہیں ہوتے تھے۔ تمام شہر میں ایک شورش مچ گئی، لوگوں کو سخت رنج تھا کہ دیوانہ بے سروپا نے مولانا پر ایسا سحر کر دیا کہ وہ کسی کام کے نہیں رہے۔ یہ برہمی یہاں تک پھیلی کہ خود مریدانِ خاص اس کی شکایت کرنے لگے۔ شمس کو ڈر ہوا کہ یہ شورش فتنہ انگیزی کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ چپکے گھر سے نکل کر دمشق کو چل دیے۔ مولانا کو ان کے فراق کا ایسا صدمہ ہوا کہ سب لوگوں سے قطع تعلق کر کے عزلت اختیار کی۔ مریدانِ خاص کو بھی خدمت میں بار نہیں مل سکتا تھا۔ مدت کے بعد شمس نے مولانا کو دمشق سے خط لکھا، اس خط نے شوق کی آگ بھڑکا دی۔ مولانا نے اس زمانے میں نہایت رقت آمیز اور پُر اثر اشعار کہے۔ جن لوگوں نے شمس کو آزردہ کیا تھا، ان کو سخت ندامت ہوئی۔ سب نے مولانا سے آکر معافی کی درخواست کی۔

شمس تبریز کا گم یا قتل ہونا یہ عجیب بات ہے کہ سپہ سالار نے جو بقول خود ۴۰ برس تک مولانا کی خدمت میں رہے۔ شمس تبریز کی نسبت صرف اس قدر لکھا ہے کہ وہ رنجیدہ ہو کر کسی طرف نکل گئے اور پھر ان کا پتہ نہ لگا۔ لیکن اور تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ ان کو اسی زمانہ میں جب کہ وہ مولانا کے پاس مقیم تھے، مولانا کے بعض مریدوں نے حسد کی وجہ سے قتل کر دیا۔[1]

مولانا کی شاعری کی ابتدا تذکرہ نویسوں نے گو تصریح نہیں کی، لیکن قرائن صاف بتاتے ہیں کہ شمس کی ملاقات سے پہلے مولانا کے شاعرانہ جذبات اسی طرح ان کی طبیعت میں پنہاں تھے، جس طرح پتھر میں آگ ہوتی ہے۔ شمس کی جدائی گویا چقماق تھی اور شرارے ان کی پُرجوش غزلیں۔ مثنوی کی ابتدا اسی سے ہوئی۔

مولانا کی کرامت اسی زمانے میں ہلاکو خاں کے سپہ سالار بیجو خاں نے قونیہ پر حملہ کیا اور اپنی فوجیں شہر کے چاروں طرف پھیلا دیں۔ اہلِ شہر محاصرہ سے تنگ آکر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ایک ٹیلے پر جو بیجو خاں کے خیمہ گاہ کے سامنے تھا جا کر مصلا بچھا دیا، اور نماز پڑھنی شروع کی۔ بیجو خاں کے سپاہیوں نے مولانا کو تاک کر تیر باراں کرنا چاہا، لیکن کمانیں کھنچ نہ سکیں۔ آخر گھوڑے بڑھائے کہ تلوار سے قتل کر دیں، لیکن گھوڑے جگہ سے ہل نہ سکے۔ تمام شہر میں غل پڑ گیا، لوگوں نے بیجو خاں سے جا کر یہ واقعہ بیان کیا۔ اس نے خود خیمہ سے نکل کر کئی تیر چلائے، لیکن سب اُچٹ کر اِدھر اُدھر نکل گئے۔ جھلا کر گھوڑے سے اتر پڑا اور مولانا کی طرف چلا، لیکن پاؤں اٹھ نہ سکے۔ آخر محاصرہ چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ پوری روایت مناقب العارفین میں ہے۔ (صفحہ ۱۵۴)

---

[1] جواہر مضیہ۔

صاحبِ حال | مدت تک مولانا کو شمس کی جدائی نے بے تاب رکھا۔ ایک دن اسی جوش و خروش کی حالت میں گھر سے نکلے۔ راہ میں شیخ صلاح الدین زرکوب کی دوکان تھی۔ وہ چاندی کے ورق کوٹ رہے تھے۔ مولانا پر ہتھوڑے کی آواز نے سماع کا اثر پیدا کیا، وہیں کھڑے ہو گئے اور وجد کی حالت طاری ہو گئی۔ شیخ مولانا کی حالت دیکھ کر اس طرح ورق کوٹتے رہے، یہاں تک کہ بہت سی چاندی ضائع ہو گئی لیکن انھوں نے ہاتھ نہ روکا۔ آخر شیخ باہر نکل آئے۔ مولانا نے ان کو آغوش میں لے لیا اور اس جوش و مستی میں کافی دیر تک یہ شعر گاتے رہے۔

یکے گنجے پدید آمد ازیں کان زرکوبی ۔۔۔ زہے صورت، زہے معنی، زہے خوبی، زہے خوبی

شیخ صلاح الدین نے وہیں کھڑے کھڑے دوکان لٹا دی اور دامن جھاڑ کر مولانا کے ساتھ ہو گئے۔ وہ ابتدا سے صاحبِ حال تھے۔ سید برہان الدین محقق سے اُن کو بیعت تھی، اور اس لحاظ سے مولانا کے ہم استاد اور مولانا کے والد کے شاگرد تھے[1]

حسام الدین چلپی | صلاح الدین کی وفات کے بعد مولانا نے حسام الدین چلپی کو جو معتقدانِ خاص میں تھے، ہمدم و ہمراز بنایا اور جب تک زندہ رہے، وہ بھی مولانا کا اس قدر ادب کرتے تھے کہ پورے دس برس کی مدت میں ایک دن بھی مولانا کے وضو خانہ میں وضو نہیں کیا۔ شدت کے جاڑے پڑتے ہوتے اور برف گرتی ہوتی، لیکن گھر جا کر وضو کر آتے۔

حسام الدین ہی کی درخواست اور استدعا پر مولانا نے مثنوی لکھنی شروع کی۔ چنانچہ تفصیل اس کی مثنوی کے ذکر میں آئے گی۔

٦٧٢ھ میں قونیہ میں بڑے زور کا زلزلہ آیا اور مسلسل ۴۰ دن تک قائم رہا۔ تمام لوگ سراسیمہ و حیران پھرتے تھے۔ آخر مولانا کے پاس آئے کہ یہ کیا بلائے آسمانی ہے۔ مولانا نے فرمایا زمین بھوکی ہے، لقمہ تر چاہتی ہے اور انشاءاللہ کامیاب ہو گی۔

انتقالِ پُر ملال | چند روز کے بعد مزاج ناساز ہوا، اکمل الدین اور غضنفر کہ اپنے زمانے کے جالینوس تھے علاج میں مشغول ہوئے، لیکن نبض کا یہ حال تھا کہ ابھی کچھ ہے ابھی کچھ۔ آخر تشخیص سے عاجز آئے اور مولانا سے عرض کی کہ آپ خود مزاج کی کیفیت سے مطلع فرمائیں۔ مولانا مطلق متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ لوگوں نے سمجھا کہ اب کوئی دم کے مہمان ہیں۔

بیماری کی خبر عام ہوئی تو تمام شہر عیادت کے لیے ٹوٹا۔ شیخ صدرالدین جو محی الدین اکبر کے تربیت یافتہ اور روم و شام میں مرجع عام تھے، تمام مریدوں کو ساتھ لے کر آئے۔ مولانا کی حالت دیکھ کر بے قرار ہوئے اور دعا کی کہ خدا آپ کو جلد شفا دے۔ مولانا نے فرمایا شفا آپ کو مبارک ہو۔ عاشق اور معشوق میں بس ایک پیرہن کا پردہ رہ گیا ہے، کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ بھی اُٹھ جائے اور نور نور میں مل جائے۔ شیخ روتے ہوئے اُٹھے، مولانا نے یہ شعر پڑھا ؎

چہ دانی تو کہ در باطن چہ شاہی ہم نشیں دارم
رُخِ زرّیں من منگر کہ پائے آہنیں دارم

---

[1] نفحات الانس و رسالہ سپہ سالار، حالات شیخ صلاح الدین زرکوب۔

شہر کے تمام امرا، علما، مشائخ اور ہر طبقہ و درجہ کے لوگ آتے تھے اور بے اختیار چیخیں مار مار کر روتے تھے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ آپ کا جانشین کون ہوگا؟ اگرچہ مولانا کے بڑے صاحبزادے سلطان بہاؤالدین ولد سلوک اور تصوف میں بڑے پایہ کے شخص تھے، لیکن مولانا حسام الدین چلپی کا نام لیا۔ لوگوں نے دوبارہ سہ بارہ پوچھا، پھر بھی جواب ملا۔ چوتھی مرتبہ سلطان ولد کا نام لے کر کہا کہ ان کے حق میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ وہ پہلوان ہے۔ اس کو وصیت کی حاجت نہیں۔

مولانا پر ۵۰ دینار قرضہ تھا۔ مریدوں سے فرمایا کہ جو کچھ موجود ہے ادا کرکے باقی قرضخواہ سے بحل کرالو، لیکن قرضخواہ نے کچھ لینا گوارا نہ کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ الحمد للہ اس سخت مرحلے سے رہائی ہوئی۔ چلپی حسام الدین نے پوچھا آپ کے جنازے کی نماز کون پڑھائے گا۔ فرمایا مولانا صدرالدین۔ یہ وصیتیں کرکے جمادی الثانی سنہ ۶۷۲ھ کی پانچویں تاریخ یکشنبہ کے دن غروب آفتاب کے وقت انتقال کیا۔

رات کو تجہیز و تکفین کا سامان مہیا کیا گیا۔ صبح کو جنازہ اٹھا۔ بچے، جوان، بوڑھے، امیر، غریب، عالم، جاہل ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے آدمی جنازے کے ساتھ اور چیخیں مار مار کر روتے جاتے تھے۔ ہزاروں آدمیوں نے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ عیسائی اور یہودی تک جنازے کے آگے آگے انجیل اور توریت پڑھتے اور نوحہ کرتے جاتے تھے۔ بادشاہ وقت جنازے کے ساتھ تھا۔ اس نے ان کو بلا کر کہا کہ تم کو مولانا سے کیا تعلق؟ بولے کہ یہ شخص اگر تمہارا محمدؐ تھا تو ہمارا عیسیٰ اور موسیٰ تھا۔ صندوق جس میں تابوت رکھا تھا، راہ میں چند دفعہ بدلا گیا اور اس کے تختے توڑ کر تبرک کے طور پر تقسیم کیے گئے۔ شام ہوتے ہوتے جنازہ قبرستان میں پہنچا۔ شیخ صدرالدین نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے، لیکن چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے۔ آخر قاضی سراج الدین نے نماز پڑھائی۔ ۴۰ دن تک لوگ مزار کی زیارت کو آتے رہے۔

مولانا کا مزار مبارک اس وقت سے آج تک بوسہ گاہ خلائق ہے۔ ابن بطوطہ جب قونیہ میں پہنچا ہے تو وہاں کے حالات میں لکھا ہے کہ مولانا کے مزار پر بڑا لنگر خانہ ہے، جس سے ہر آنے والے کو کھانا ملتا ہے۔

سلسلہ باطنی | مولانا کا سلسلہ اب تک قائم ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ ان کے فرقے کے لوگ جلالیہ کہلاتے ہیں۔ چونکہ مولانا کا لقب جلال الدین تھا۔ اس لیے ان کے انتساب کی وجہ سے یہ نام مشہور ہوا ہوگا، لیکن آج کل ایشیائے کوچک، شام، مصر اور قسطنطنیہ میں اس فرقہ کو مولویہ کہتے ہیں۔ یہ لوگ نمد کی ٹوپی پہنتے ہیں، جس میں جوڑ یا درز نہیں ہوتی، مشائخ اس ٹوپی پر عمامہ بھی باندھتے ہیں۔ خرقہ یا کرتہ کے بجائے ایک چنٹ دار جامہ ہوتا ہے۔ ذکر و شغل کا یہ طریقہ ہے کہ حلقہ باندھ کر بیٹھتے ہیں، ایک ایک شخص کھڑا ہو کر ایک ہاتھ سینے اور ایک ہاتھ پھیلائے ہوئے رقص شروع کرتا ہے۔ رقص میں آگے یا پیچھے بڑھنا یا ہٹنا نہیں ہوتا، بلکہ ایک جگہ جم کر متصل چکر لگاتے ہیں۔ سماع کے وقت دف اور نے بھی بجاتے ہیں۔ چونکہ مولانا پر ایک وجد اور سکر کی حالت طاری رہتی تھی اور جیسا کہ آگے آئے گا، وہ اکثر جوش کی حالت میں ناچنے لگتے تھے۔ مریدوں نے تقلیداً اس طریقے کو اختیار کیا۔ اس سلسلہ میں جب کوئی شخص داخل ہونا چاہتا ہے، تو قاعدہ یہ ہے کہ چالیس دن تک

چارپائیوں کی خدمت کرتا ہے۔ چالیس دن فقرا کے دروازے پر جھاڑو دیتا ہے۔ چالیس دن آب کشی کرتا ہے۔ چالیس دن فراشی۔ چالیس دن ہیزم کشی۔ چالیس دن طباخی۔ چالیس دن بازار سے سودا سلف لانا۔ چالیس دن فقرا کی مجلس کی خدمت گاری۔ چالیس دن داروغہ گری۔ جب یہ مدت تمام ہو چکتی ہے تو غسل دیا جاتا ہے اور تمام محرمات سے توبہ کرا کے حلقہ میں داخل کر لیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ خانقاہ سے لباس (وہی جامہ) ملتا ہے اور اسم جلالی کی تلقین کی جاتی ہے۔

اخلاق و عادات

—(۱)—

مولانا کے اخلاق و عادات اس تفصیل سے تذکرہ نویسوں نے نہیں لکھے کہ ترتیب سے الگ الگ عنوان قائم کیے جائیں، اس لیے جستہ جستہ جن باتوں کا پتہ لگ سکا ہے، ہم بلا ترتیب لکھتے ہیں:

—(۲)—

مولانا جب تک تصوف کے دائرے میں نہیں آئے ان کی زندگی عالمانہ جاہ و جلال کی شان رکھتی تھی۔ ان کی سواری جب نکلتی تھی تو امرا اور طلبہ بلکہ امراد کا ایک بڑا گروہ رکاب میں ہوتا تھا۔ مناظرہ اور مجادلہ جو علما کا عام طریقہ تھا، مولانا اس میں اوروں سے چند قدم آگے تھے۔ سلاطین اور امرا کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا، لیکن سلوک میں داخل ہونے کے ساتھ یہ حالت بدل گئی۔

—(۳)—

ریاضت اور مجاہدہ حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ سپہ سالار برسوں ساتھ رہے ہیں، ان کا بیان ہے کہ میں نے کبھی ان کو شب خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا۔ بچھونا اور تکیہ بالکل نہیں ہوتا تھا۔ قصداً لیٹتے نہ تھے، نیند غالب ہوتی تو بیٹھے بیٹھے سو جاتے۔ ایک غزل میں فرماتے ہیں:

چہ آسایدیہ ہر پہلو کہ خسپد   کسے کز خار دارد او نہالیں

—(۴)—

سماع کے جلسوں میں مریدوں پر جب نیند غالب ہوتی تو ان کے لحاظ سے دیوار سے ٹیک لگا کر زانو پر سر رکھ لیتے کہ وہ بے تکلف ہو کر سو جائیں۔ وہ لوگ پڑ کر سو جاتے تو خود اٹھ بیٹھتے اور ذکر و شغل میں مصروف ہوتے۔ ایک غزل میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

ہمہ خفتند و من دل شدہ را خواب نبرد   ہمہ شب دیدۂ من بر فلک استارہ شمرد

خوابم از دیدہ چناں رفت کہ ہرگز ناید   خواب من زہر فراق تو بنوشید و بمرد

—(۵)—

روزہ اکثر رکھتے تھے، آج تو لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا، لیکن معتبر راویوں کا بیان ہے کہ مسلسل دس دس بیس بیس

دن کچھ نہ کھاتے تھے ۔

(۶)

نماز کا وقت آتا تو فوراً قبلہ کی طرف مڑ جاتے اور چہرہ کا رنگ بدل جاتا ۔ نماز میں نہایت استغراق ہوتا تھا ۔ سپہ سالار کہتے ہیں کہ بارہا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اوّل عشا کے وقت نیت باندھی اور دو رکعتوں میں صبح ہوگئی ۔ مولانا نے ایک غزل میں اپنی نماز کی کیفیت بیان کی ہے ۔ مقطع میں لکھتے ہیں :

بخدا خبر ندارم چو نماز می گزارم   کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے

(۷)

ایک دفعہ جاڑوں کے دن تھے ۔ مولانا نماز میں اس قدر روئے کہ تمام چہرہ اور داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی ۔ جاڑے کی شدت کی وجہ سے آنسو جم کر یخ بن گئے ، لیکن وہ اسی طرح نماز میں مشغول رہے ۔ حج والد کے ساتھ ابتدائے عمر میں کر چکے تھے ، اس کے بعد پھر اتفاق نہیں ہوا ۔

(۸)

مزاج میں انتہا درجہ کی قناعت تھی ۔ تمام سلاطین اور امرا نقدی اور ہر قسم کے تحائف بھیجتے تھے ، لیکن مولانا اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے ، جو چیز آتی تھی ، اسی طرح صلاح الدین زرکوب یا چلپی حسام الدین کے پاس بھجوا دیتے ۔

(۹)

کبھی کبھی ایسا اتفاق ہوتا کہ گھر میں نہایت تنگی ہوتی اور مولانا کے صاحبزادے سلطان ولد اصرار کرتے تو کچھ رکھ لیتے ۔[۱] جس دن گھر میں کھانے کا کچھ سامان نہ ہوتا بہت خوش ہوتے اور فرماتے کہ آج ہمارے گھر میں درویشی کی بو آتی ہے ۔

(۱۰)

فیاضی اور ایثار کا یہ حال تھا کہ کوئی سائل سوال کرتا تو عبا یا کرتا جو کچھ بدن پہ ہوتا اتار کر دے دیتے ۔ اسی لحاظ سے کرتہ ، عبا کی طرح سامنے سے کھلا ہوتا تھا کہ اتارنے میں زحمت نہ ہو ۔[۲]

(۱۱)

باوجود عظمت وشان کے نہایت درجہ بے تکلف ، متواضع اور خاکسار تھے ۔ ایک دفعہ جاڑوں کے دنوں میں حسام الدین چلپی کے پاس گئے ، چونکہ نا وقت ہو چکا تھا ، مدرسہ سب بند تھے ، وہیں ٹھہر گئے ۔ برف گر گر کر سر پر جمتی جاتی تھی ، لیکن اس خیال سے کہ ان لوگوں کو زحمت نہ ہو ، نہ آواز دی نہ دروازہ کھٹکھٹایا ۔ صبح کو بوّاب نے دروازہ کھولا تو یہ حالت دیکھی ۔ حسام الدین کو خبر ہوئی ، وہ آکر پاؤں پر گر پڑے اور رونے لگے ۔ مولانا نے گلے سے لگا لیا اور ان کی تسکین کی ۔

---

[۱] سپہ سالار ص ۲۰
[۲] سپہ سالار ص ۵۰

(۱۲)

ایک دفعہ بازار میں جا رہے تھے، لڑکوں نے دیکھا تو ہاتھ چومنے کے لیے بڑھے۔ آپ کھڑے ہو گئے۔ لڑکے ہر طرف سے آتے اور ہاتھ چومتے جاتے۔ مولانا بھی ان کی دلداری کے لیے اُن کے ہاتھ چومتے۔ ایک لڑکا کسی کام میں مشغول تھا، اس نے کہا مولانا ذرا ٹھہریے، میں کام سے فارغ ہو لوں۔ مولانا اس وقت تک وہیں کھڑے رہے کہ لڑکا فارغ ہو کر آیا اور دست بوسی کی عزت حاصل کی۔

(۱۳)

ایک دفعہ سماع کی مجلس تھی، اہلِ محفل اور خود مولانا پر وجد کی حالت تھی۔ ایک شخص بیخودی کی حالت میں تڑپتا تو مولانا سے جا کر ٹکر کھاتا۔ چند دفعہ یہی اتفاق ہوا۔ لوگوں نے بزور اس کو مولانا کے پاس سے ہٹا کر دور بٹھا دیا۔ آپ نے ناراض ہو کر فرمایا "شراب اس نے پی ہے اور بدمستی تم کرتے ہو۔"

(۱۴)

قونیہ میں گرم پانی کا ایک چشمہ تھا، مولانا کبھی کبھی وہاں غسل کے لیے جایا کرتے تھے۔ ایک دن وہاں کا قصد کیا۔ خدام پہلے سے جا کر ایک خاص جگہ متعین کر آئے، لیکن قبل اس کے مولانا پہنچیں چند جذامی پہنچ کر نہانے لگے۔ خدام نے ان کو ہٹانا چاہا۔ مولانا نے خدام کو ڈانٹا اور چشمے میں اسی جگہ سے پانی لے کر اپنے بدن پر ڈالنا شروع کیا، جہاں جذامی نہا رہے تھے۔

(۱۵)

ایک دفعہ معین الدین پروانہ کے گھر میں سماع کی مجلس تھی، کرجی خاتون نے شیرینی کے دو طبق بھیجے۔ لوگ سماع میں مشغول تھے۔ اتفاق سے ایک کتے نے آکر طبق میں منہ ڈال دیا۔ لوگوں نے کتے کو مارنا چاہا۔ مولانا نے فرمایا کہ اس کی بھوک تم لوگوں سے زیادہ تیز تھی، اس نے کھایا تو اسی کا حق تھا۔

(۱۶)

ایک دفعہ مولانا کی زوجہ کرا خاتون نے اپنی لونڈی کو سزا دی۔ اتفاق سے مولانا بھی اُسی وقت آگئے۔ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ اگر وہ آقا ہوتی اور تم اس کی لونڈی تو تمھاری کیا حالت ہوتی۔ پھر فرمایا کہ درحقیقت تمام لوگ ہمارے بھائی بہنیں ہیں کوئی شخص خدا کے سوا کسی کا غلام نہیں۔ کرا خاتون نے اسی وقت اس کو آزاد کر دیا، اور جب تک زندہ رہیں غلاموں اور کنیزوں کو اپنے جیسا کھلاتی اور پہناتی رہیں۔

(۱۷)

ایک دفعہ مریدوں کے ساتھ جا رہے تھے، ایک تنگ گلی میں ایک کتا سرِ راہ سو رہا تھا، جس سے راستہ رُک گیا تھا،

مولانا وہیں رک گئے اور دیر تک کھڑے رہے۔ اُدھر سے ایک شخص آ رہا تھا، اُس نے کتے کو ہٹا دیا۔ مولانا نہایت آزردہ ہوئے اور فرمایا ناحق اس کو تکلیف دی۔

(۱۸)

ایک دفعہ دو آدمی سرِ راہ لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ او لعین تو ایک کہے گا تو دس سنے گا۔ اتفاق سے مولانا کا گزر اُدھر ہوا۔ آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ بھائی جو کچھ کہنا ہے مجھ کو کہہ لو، مجھ کو اگر ہزار کہو گے تو ایک بھی نہ سنو گے۔" دونوں مولانا کے پاؤں پر گر پڑے اور آپس میں صلح کر لی۔

(۱۹)

ایک دفعہ قونیہ کی مسجد میں جمعہ کے دن وعظ کی مجلس تھی۔ تمام امراء و رؤسا حاضر تھے۔ مولانا نے قرآن مجید کے دقائق اور نکات بیان کرنا شروع کیے۔ ہر طرف سے بے اختیار واہ واہ اور سبحان اللہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اس زمانے میں وعظ کا یہ طریقہ تھا کہ قاری، قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھتا تھا اور واعظ انہی آیتوں کی تفسیر بیان کرتا تھا۔ مجمع میں ایک فقیہ صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ ان کو حسد پیدا ہوا، بولے کہ آیتیں پہلے سے مقرر کر لی جاتی ہیں، ان کے متعلق بیان کرنا کون سی کمال کی بات ہے۔ مولانا نے ان کی طرف خطاب کر کے کہا کہ آپ کوئی سورۃ پڑھیے، میں اس کی تفسیر بیان کرتا ہوں۔ انھوں نے والضحیٰ پڑھی۔ مولانا نے اس سورۃ کے دقائق اور لطائف بیان کرنے شروع کیے تو صرف والضحیٰ کے واؤ کے متعلق اس قدر شرح و بسط سے بیان کیا کہ شام ہو گئی۔ تمام مجلس پر ایک وجد کی حالت طاری تھی۔ فقیہ صاحب ایسے سرشار ہوئے کہ کپڑے پھاڑ ڈالے اور مولانا کے قدموں پر گر پڑے۔ اس جلسے کے بعد مولانا نے پھر وعظ نہیں کہا۔ فرمایا کرتے تھے کہ جس قدر میری شہرت بڑھتی جاتی ہے، میں بلا میں مبتلا ہوتا جاتا ہوں، لیکن کیا کروں، کچھ تدبیر بن نہیں پڑتی۔ مثنوی میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

خویشتن را رنجور سازی زار زار ۔ تا ترا بیرون کنند از اشتہار
اشتہار خلق بندِ محکم است ۔ در رہ ایں از بندِ آہن کی کم است

(۲۰)

سراج الدین قونوی، بڑے رتبے کے فاضل تھے، لیکن مولانا سے ملال رکھتے تھے۔ کسی نے اُن سے کہا کہ مولانا کہتے ہیں کہ میں تہتر وں مذہبوں سے متفق ہوں، انھوں نے اپنے ایک مستعد شاگرد کو بھیجا کہ مولانا سے پوچھنا کہ کیا واقعی آپ کا یہ قول ہے اور اگر وہ اقرار کریں تو ان کی خوب خبر لینا، اُس نے بھرے مجمع میں مولانا سے سوال کیا۔ آپ نے کہا ہاں میرا یہ قول ہے۔ اُس نے مغلظ گالیاں دینی شروع کیں۔ مولانا نے ہنس کر فرمایا کہ یہ جو آپ فرماتے ہیں، میں اس سے بھی متفق ہوں۔ وہ شرمندہ ہو کر چلا گیا۔

معاش | معاش کا یہ طریقہ تھا کہ اوقاف کی مد سے پندرہ دینار ماہوار روزینہ مقرر تھا، چونکہ مولانا مفت خوری کو نہایت ناپسند کرتے تھے، اس لیے اس کے معاوضے میں فتوے لکھا کرتے تھے۔ مریدوں پر تاکید تھی اگر کوئی فتویٰ لائے تو میں گو کسی حالت

ہوں تو ضرور خبر کردو تاکہ یہ آمدنی مجھ پر حلال ہو۔ چنانچہ معمول تھا کہ عین وجد و مستی کی حالت میں بھی مرید دوات اور قلم ہاتھ میں لیے رہتے تھے۔ اس حالت میں کوئی فتویٰ آجاتا تو لوگ مولانا سے عرض کرتے اور مولانا اسی وقت جواب لکھ دیتے۔

ایک دفعہ اسی حالت میں فتویٰ لکھا، شمس الدین ماردینی نے اس کی تغلیط کی۔ مولانا نے سنا تو کہلا بھیجا کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر یہ مسئلہ موجود ہے۔ چنانچہ لوگوں نے تحقیق کی تو جو مولانا نے کہا تھا وہی نکلا[1]

ایک دفعہ کسی نے کہا کہ شیخ صدر الدین کو ہزار دن روپے کا وظیفہ ملتا ہے اور آپ کو کل پندرہ دینار ماہوار ملتے ہیں۔ مولانا نے کہا شیخ کے مصارف بھی بہت ہیں اور حق یہ ہے کہ یہ پندرہ دینار بھی انہی کو ملنے چاہئیں[2]

امرا کی صحبت سے اجتناب ایک دفعہ ایک امیر نے معذرت کی کہ اشغال سے فرصت نہیں ہوتی، اس لیے کم حاضر ہو سکتا ہوں، معاف فرمایئے گا۔ فرمایا معذرت کی ضرورت نہیں، میں آنے کی بہ نسبت نہ آنے سے زیادہ ممنون ہوتا ہوں۔

ایک دفعہ معین الدین پروانہ چند امرا کے ساتھ ملاقات کو گیا۔ مولانا چپ بیٹھے۔ معین الدین کے دل میں خیال گزرا کہ سلاطین اور امرا اولوالامر ہیں، اور قرآن مجید کی رو سے ان کی اطاعت فرض ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا نے بطور خود فرمایا کہ ایک دفعہ سلطان محمود غزنوی شیخ ابوالحسن خرقانی کی ملاقات کو گیا، دربانوں نے آگے بڑھ کر شیخ کو خبر کی، لیکن وہ بے خبر رہے۔ حسن میمندی جو وزیر تھا اس نے کہا کہ حضرت قرآن مجید میں اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ آیا ہے، سلطان تو اولوالامر ہونے کے ساتھ عادل اور نیک سیرت بھی ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ مجھ کو ابھی اطیعوا اللہ سے فرصت نہیں کہ اطیعوا الرسول میں مشغول ہوں، اولوالامر کا کیا ذکر ہے۔

معین الدین اور تمام امرا یہ حکایت سن کر رونے لگے اور اٹھ کر چلے آئے۔

وجد واستغراق مولانا پر اکثر استغراق، وجد اور محویت کی حالت طاری رہتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے یکبارگی اٹھ کھڑے ہوتے، اور رقص کرنے لگتے، کبھی کبھی چلتے چلتے کسی طرف نکل جاتے، اور ہفتوں غائب رہتے۔ لوگ ہر طرف ڈھونڈتے پھرتے، آخر کسی ویرانہ میں پتہ لگتا۔ لوگ خاص خاص وہاں سے جا کر لاتے۔ سماع کی مجلسوں میں کئی کئی دن گزر جاتے کہ ہوش میں نہ آتے۔ راہ میں چلے جا رہے ہیں کسی طرف سے آواز کانوں میں آگئی وہیں کھڑے ہو گئے اور مستانہ رقص کرنے لگے۔ معمول تھا کہ وجد کی حالت میں جو کچھ بدن پر ہوتا اتار کر قوالوں کو دے ڈالتے۔ مریدوں میں خواجہ مجد الدین نام ایک امیر صاحب مقدرت تھا، وہ ہمیشہ کپڑوں کے کئی کئی صندوق مہیا رکھتا تھا۔ مولانا جب کپڑے اتار کر دے ڈالتے تو وہ فوراً نئے لاکر پہنا دیتا۔

معین الدین پروانہ نے ایک خانقاہ کو تولیت ... سپرد کرنا چاہا۔ انھوں نے تین شرطیں پیش کیں، ... کہ جو شخص ... ہے اسے ہٹا دیا جائے، خانقاہ کے تمام پہلے ... نکال دیے جائیں اور نئے جو تقرر ہوں ان کو حکم دیا جائے کہ کسی سے

---

[1] مناقب العارفین ص۱۳۰۔ [2] مناقب العارفین ص۱۲۶۔

کچھ لینے نہ پائیں۔ معین الدین نے دو شرطیں منظور کیں، پہلی شرط اس وجہ سے قبول نہ کی کہ خود مولانا رباب سنتے تھے۔ فاضل مذکور بھی ہٹ کے پورے تھے۔ قضا کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مولانا نے سنا تو فرمایا کہ "رباب کی ایک ادنیٰ کرامت یہ ہے کہ فاضل صاحب کو قضا کی بلا میں پڑنے سے بچا لیا۔"

ایک دن سلطان ولد نے شکایت کی کہ تمام صوفیہ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں، لیکن ہمارے حلقے والے رات دن خواہ مخواہ لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ مولانا نے کہا ہاں ہزار مرغیاں ایک مکان میں رہ سکتی ہیں، لیکن دو مرغ ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔

تصنیفات | مولانا کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

فیہ مافیہ: یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے وقتاً فوقتاً معین الدین پروانہ کے نام لکھے۔ یہ کتاب بالکل نایاب ہے۔

دیوان: اس میں قریباً پچاس ہزار شعر ہیں۔

مثنوی: یہی کتاب ہے جس نے مولانا روم کے نام کو آج تک زندہ رکھا ہے اور جس کی شہرت اور مقبولیت نے ان کی تمام تصنیفات کو دبا لیا ہے۔ اس کے اشعار کی مجموعی تعداد جیسا کہ کشف الظنون میں ہے ۲۶۶۶ ہے۔

سبب تصنیف | ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ حسام الدین چلپی نے مولانا سے درخواست کی کہ منطق الطیر کے طرز پر ایک مثنوی لکھی جائے۔ مولانا نے فرمایا کہ خود مجھ کو کبھی رات یہ خیال آیا اور اسی وقت یہ چند شعر موزوں ہوئے:

بشنو از نے چوں حکایت می کند

مثنوی کی تصنیف میں حسام الدین چلپی کو بہت دخل ہے اور درحقیقت یہ نایاب کتاب انہی کی بدولت وجود میں آئی۔ وہ مولانا کے مریدان خاص میں سے تھے اور مولانا اس قدر ان کی عزت کرتے تھے کہ جہاں ان کا ذکر کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ پیر طریقت اور استاد کا ذکر ہے۔ مثنوی کے چھ دفتر ہیں اور بجز دفتر اوّل کے ہر دفتر ان کے نام سے مزین ہے۔ دفتر دوم میں لکھتے ہیں:

مدتے ایں مثنوی تاخیر شد — مہلتے بایست تا خوں شیر شد
چوں ضیاء الحق حسام الدین عناں — باز گردانید ز اوج آسماں
چوں بمعراج حقائق رفتہ بود — بے بہارش غنچہ ہا نشگفتہ بود

مثنوی کی شہرت اور مقبولیت | مثنوی کو جس قدر مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی فارسی کی کسی کتاب کو آج تک نہیں ہوئی۔ صاحب مجمع الفصحا نے لکھا ہے کہ ایران میں چار کتابیں جس قدر مقبول ہوئیں کوئی کتاب نہیں ہوئی۔ شاہنامہ، گلستان، مثنوی مولانا روم، دیوان حافظ۔ ان چاروں کتابوں کا موازنہ کیا جائے تو مقبولیت کے لحاظ سے مثنوی کو ترجیح ہوگی۔ مقبولیت کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ علماء و فضلاء نے مثنوی کے ساتھ جس قدر اعتنا کی اور کسی کتاب کے ساتھ نہیں کی۔ جس قدر شرحیں لکھی گئیں ان کا ایک مختصر سا نقشہ ہم اس موقع پر درج کرتے ہیں۔ یہ نقشہ کشف الظنون سے ماخوذ ہے۔ کشف الظنون کے بعد اور بہت سی شرحیں لکھی گئیں، جن کا ذکر کشف الظنون میں نہیں ہے اور نہ ہو سکتا تھا۔ مثلاً شرح محمد افضل الٰہ آبادی و ولی محمد عبد العلی بحر العلوم

و محمد رضا وغیرہ وغیرہ ۔

کیفیت	سن وفات	نام شارح
۶ جلدوں میں ہے	۹۶۹ھ	مولیٰ مصطفےٰ ابن شعبان
	تقریباً ۱۰۰۰ھ	سعدی
اس کا نام کنوز الحقائق ہے	۸۴۰ھ	کمال الدین خوارزمی
چھ جلدوں میں ہے ۔	۱۰۴۲ھ	شیخ اسماعیل انقروی
جید اوّل کی شرح ہے ۔ یوسف المتوفی ۹۵۲ھ نے مثنوی کا خلاصہ کیا تھا ۔ یہ اس کی شرح ہے ۔	-	عبداللہ بن محمد بن الکاتب مدرس قول نامہ علمی
اس کا نام کاشف الاسرار ہے ۔ بعض اشعار کی شرح ہے ۔	-	ظہیفی حسن چلپی
خلاصہ مثنوی کی شرح ہے ۔ اس کے دیباچہ میں دس مقالے ہیں ، جن میں اصطلاحات تصوف اور فرقہ مولویہ کے مشائخ کے حالات ہیں ۔	۸۸۵ھ	علاؤالدین منتشگ حسین واعظ
سلطان احمد کے حکم سے تصنیف کی ۔	۱۰۴۹ھ	عبدالمجید سیواسی
-	-	علائی بن یحییٰ واعظ شیرازی
اس کا نام ازہار مثنوی ہے ۔ صرف احادیث و آیات قرآنی و الفاظ مشکلہ کی شرح کی ہے ۔	-	اسماعیل ودہ

مثنوی کی ترتیب | مثنوی سے پہلے جو کتابیں اخلاق و تصوف میں لکھی گئیں ، ان کا یہ انداز تھا کہ مصنف اخلاق و تصوف کے مختلف عنوانات قائم کر کے اخلاقی حکایتیں لکھتے تھے ، اور ان کے نتائج پیدا کرتے تھے ۔ منطق الطیر اور بوستان کا یہی انداز ہے ۔ حدیقہ میں اکثر مسائل کو مستقل طور پر بھی بیان کیا ہے ۔ مثلاً نفس ، عقل ، عشق ، تنزیہ ، صفات ، معرفت ، وجد ، توکل ، صبر و شکر وغیرہ کے عنوان قائم کیے ہیں اور ان کی حقیقت بیان کی ہے ، لیکن مثنوی کا یہ انداز نہیں ۔ مثنوی میں کسی قسم کی ترتیب و تبویب نہیں ۔ دفتروں کی جو تقسیم ہے ، وہ خصوصیتِ مضمون کے لحاظ سے نہیں ، بلکہ جس طرح بلا تشبیہ قرآن مجید کے پارے یا ایک شاعر کے متعدد دیوان ہوتے ہیں ۔

مثنوی کی خصوصیات | سب سے بڑی خصوصیت جو مثنوی میں ہے وہ اس کا طرزِ استدلال اور طریقۂ افہام ہے ۔ استدلال کے تین طریقے ہیں : قیاس ۔ استقرا ۔ تمثیل ۔ چونکہ ارسطو نے بھی ان تینوں میں قیاس کو ترجیح دی تھی ، اس لیے اس کی تقلید سے حکمائے اسلام میں بھی اسی طریقہ کو زیادہ تر رواج ہوا ۔ علامہ ابن تیمیہ نے الرد علی المنطق میں ثابت کیا ہے کہ قیاس شمولی کو قیاس تمثیلی پر کوئی ترجیح نہیں ، بلکہ بعض وجوہ سے تمثیلی کو ترجیح ہے ۔ ہم اس موقع پر یہ بحث چھیڑنی نہیں چاہتے ، بلکہ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مولانا [؟]

نے زیادہ تر اسی قیاس تمثیلی سے کام لیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ عام طبائع کے افہام و تفہیم کا آسان اور اقرب الی الفہم یہی طریقہ ہے۔ استدلال تمثیلی کے لیے تخیل کی بڑی ضرورت ہے، جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہے۔ اس بنا پر مثنوی کے لیے یہی طریقہ زیادہ مناسب تھا۔ مولانا کی شاعری کو جس بنا پر شاعری کہا جاتا ہے، وہ یہی قوت تخیل ہے۔ تصوف اور سلوک کے مسائل اور مسلمات عام اور ادراک بشری سے خارج ہیں، اس لیے جو شخص خود اس عالم میں نہ آئے وہ ان باتوں پر یقین نہیں کر سکتا۔ الہیات کے اکثر مسائل بھی عام لوگوں کی فہم سے برتر ہیں، اس لیے ان مسائل کے سمجھانے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ ان کو مثالوں اور تشبیہوں کے ذریعہ سے سمجھایا جائے۔ ایک اور نکتہ قابل لحاظ یہ ہے کہ الہیات کے مسائل میں اکثر متکلمین امکان کے ثابت کرنے سے کام لیتے ہیں، لیکن امکان کو ایسے دلائل سے ثابت کرتے ہیں جو دل میں جاگزین نہیں ہوتے، بلکہ ان سے صرف طباعی اور زور آوری کا ثبوت ملتا ہے، حالانکہ امکان کے ثابت کرنے کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ مثالوں کے ذریعہ سے ثابت کیا جائے۔ اسی بنا پر مولانا نے اس طریقہ استدلال کو اختیار کیا، وہ ان دقیق مسائل کو ایسی نادر اور قریب الفہم تمثیلوں سے سمجھاتے ہیں، جن سے بقدر امکان ان کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے یا کم از کم ان کے امکان کا یقین ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ مسئلہ کہ خدا کا تعلق عالم سے اور روح کا تعلق جسم سے اس طرح ہے کہ نہ اس کو متصل کہہ سکتے ہیں، نہ منفصل نہ قریب نہ بعید، نہ داخل نہ خارج، ایک ایسا مسئلہ ہے جو بظاہر سمجھ میں نہیں آسکتا۔ مولانا اس کو اس طرح تمثیل کے ذریعہ سے سمجھاتے ہیں۔

قرب بیچوں است عقلت را بہ تو	آں تعلق ہست بیچوں اے عمو
اتصالے بے تکیف بے قیاس	ہست رب الناس را با جان ناس
زانکہ فصل و وصل نبود در رواں	غیر فصل و وصل نندیشہ گماں
نیست آں جنبش کہ در اصبع تراست	پیش اصبع یا پسش یا چپ راست
از چہ رو مے آید اندر اصبعت	کا صبعت بے او نہ داند منفعت
نور چشم و مردمک در دیدہ است	از چہ رہ آید؟ بغیر از شش جہت
ایں تعلق را خرد چوں پے برد	بستۂ فصل ست و وصل ست ایں خرد
تاب نور چشم با پیہ است جفت	نور دل در قطرۂ خونی نہفت
شادی اندر گردۂ و غم در جگر	عقل چوں شمعے درون مغز سر
رائحہ در انف و منطق در لساں	لہو در نفس و شجاعت در جناں

حاصل یہ کہ آنکھ میں قوت باصرہ، ناک میں شامہ، زبان میں گویائی، دل میں شجاعت۔ تمام چیزیں اسی قسم کا تعلق رکھتی ہیں، جس کو نہ متصل کہہ سکتے ہیں نہ منفصل، نہ قریب نہ بعید۔ اسی طرح روح کا تعلق جسم سے اور خدا کا تعلق مخلوقات سے ہے۔

دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فرضی حکایتوں کے ضمن میں اخلاقی مسائل کا جو طریقہ مدت سے چلا آتا تھا مولانا نے

اس کو کمال کے مرتبہ تک پہنچا دیا۔ اس طریقۂ تعلیم کا کمال امورِ ذیل پر موقوف ہے۔

۱۔ نتیجہ فی نفسہٖ اچھوتا اور نادر اور اہم ہو۔

۲۔ نتیجہ حکایت سے نہایت مطابقت رکھتا ہو، گویا حکایت اس کی تصویر ہو۔

۳۔ حکایت کے اثناء میں نتیجہ کی طرف ذہن منتقل نہ ہو سکے، بلکہ خاتمہ پر بھی جب تک خود مصنّف اشارہ یا تصریح نہ کرے نتیجہ کی طرف ذہن منتقل نہ ہونے پائے۔ اس سے طبیعت پر ایک استعجاب اثر پڑتا ہے اور مصنّف کی قوّتِ تخیّل کی قوت ثابت ہوتی ہے۔ یہ تمام باتیں جس قدر مثنوی کی حکایتوں میں پائی جاتی ہیں، اس قسم کی اور کتابوں میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ مولانا نے ان حکایتوں کے ضمن میں نفسِ انسانی کے جن پوشیدہ اور دُور از نظر عیوب کو ظاہر کیا ہے، عام لوگوں کی نگاہیں وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں، پھر ان کو ادا اس طرح کیا ہے کہ ہر شخص حکایت کو پڑھ کر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ یہ تو خاص میرا ہی ذکر ہے چنانچہ چند مثالیں ہم ذیل درج کرتے ہیں :

۱۔ ایک حکایت ہے کہ ایک شیر اور صحرائی جانوروں میں یہ معاہدہ ٹھہرا کہ وہ ہر روز شیر کو گھر بیٹھے اس کی خوراک پہنچایا کریں گے۔ پہلے ہی دن جو خرگوش شیر کی خوراک کے لیے متعین کیا گیا وہ دو ایک دن کی دیر کر کے گیا۔ شیر غصّہ میں بھرا ہوا بیٹھا تھا۔ خرگوش گیا تو اس نے دیر کی وجہ پوچھی۔ خرگوش نے کہا، میں اسی دن چلا تھا، لیکن راہ میں ایک دوسرے شیر نے روک لیا۔ میں نے اس سے ہتیرا کہا کہ میں حضور کی خدمت میں جاتا ہوں، لیکن اس نے ایک نہ سُنی۔ بڑی مشکل سے ضمانت لے کر مجھ کو چھوڑا۔ شیر نے بپھر کر کہا کہ "وہ شیر کہاں ہے؟" میں اس کو ابھی چل کر سزا دیتا ہوں۔ خرگوش آگے آگے ہو لیا اور شیر کو ایک کنوئیں کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا کہ حریف اس میں ہے۔ شیر نے کنوئیں میں جھانکا اور اپنے ہی عکس کو اپنا حریف سمجھا بڑے غصّہ سے حملہ آور ہو کر کنوئیں میں کود پڑا۔ مولانا یہ حکایت لکھ کر فرماتے ہیں :

عکس خود را او عدوئے خویش دید لاجرم بر خویش شمشیرے کشید
اے بسا ظلمے کہ بینی در کساں خوئے تو باشد در ایشاں اے فلاں
اندر ایشاں تافتہ ہستیِ تو از نفاق و ظلم و بد مستیِ تو
آں توئی واں زخم بر خود می زنی بر خود آں دم تارِ لعنت می تنی
در خود آں بد را نمے بینی عیاں ورنہ دشمن بودۂ خود را بجاں
حملہ بر خود می کنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد
چوں بہ قعرِ خوئے خود اندر رسی پس بدانی کز تو بود آں ناکسی
شیر را در قعر پیدا شد کہ بود نقش او آں کش دگر کس می نمود
اے بدیدہ خالِ بد بر روئے عم عکسِ خالِ تست آں از عم مرم

یہ مضمون کہ انسان کو اپنے عیب نظر نہیں آتے اور دوسروں کے عیب اچھی طرح نظر آتے ہیں، اخلاق کا متداول مسئلہ ہے۔ اسے مختلف طریقوں سے ادا کیا گیا ہے۔ انجیل میں اُس کو یوں بیان کیا ہے کہ اے بنی آدم تو اوروں کی آنکھ کا تنکا دیکھتا ہے، لیکن اپنی آنکھوں کا شہتیر نہیں دیکھتا۔ لیکن مولانا نے اس کو جس پیرایہ میں ادا کیا ہے، سب سے بڑھکر موثر طریقہ ہے۔ شیر نے جب اپنا عکس کوئیں میں دیکھا تو بڑے غصہ سے اس پر حملہ کیا، لیکن اس کو یہ خیال نہ آیا کہ میں خود اپنے آپ پر حملہ کر رہا ہوں۔ ہماری بھی یہی حالت ہے، ہم دوسروں میں جو عیوب دیکھتے ہیں ہم کو نہایت بدنما معلوم ہوتے ہیں۔ ہم کو ان سے سخت نفرت ہوتی ہے۔ ہم ایک سختی سے اس کی برائی بیان کرتے ہیں، لیکن ہم یہ نہیں خیال کرتے کہ یہی عیب خود ہم میں موجود ہے اور اس بنا پر ہم خود اپنے آپ کو برا کہہ رہے ہیں۔

اخلاق | اخلاق کا اصلی عنصر خلوص ہے، لیکن خلوص کی حیثیت و ماہیت کے متعین کرنے میں نہایت سخت غلطیاں ہوتی ہیں ہر شخص اپنے افعال کے متعلق خیال رکھتا ہے کہ خلوص پر مبنی ہے۔ ایک شخص کوئی قومی کام کرتا ہے اور نہایت جد و جہد اور سرگرمی سے کرتا ہے۔ خود اس کو اور نیز عام لوگوں کو اس کے کسی فعل سے محسوس نہیں ہوتا کہ اس میں خود غرضی کا کوئی شائبہ ہے، لیکن جب اصلی موقع آتا ہے تو خود غرضی کا مخفی اثر جس کی اب تک خود اس شخص کو خبر نہ تھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ اخلاق کے بارے میں سب سے اہم یہ ہے کہ انسان اپنے افعال کی نسبت نہایت غور و تدقیق سے اس بات کا پتہ لگاتا رہے کہ وہ کہاں تک خلوص پر مبنی ہیں۔ مولانا نے خلوص کی ماہیت و حقیقت نہیں متعین کی اور نہ اس قسم کی چیز ہے، جس میں خلوص کو مجسم کر کے رکھ دیا جائے۔ اور گویا ایک معیار قائم کر دیا ہے، جس سے ہر شخص اپنے افعال کو مطابق کر کے خلوص کے ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ حکایت یہ ہے:

از علیؓ آموز اخلاص عمل | شیر حق را داں منزہ از دغل
در غزا بر پہلوانے دست یافت | زود شمشیرے بر آورد و شتافت
او خدو انداخت بر روئے علیؓ | افتخار ہر نبی و ہر ولی!
در زماں انداخت شمشیر آں علیؓ | کرد او اندر غزایش کاہلی!
گشت حیراں آں مبارز زیں عمل | از نمودن عفو و رحم بے محل
گفت بر من تیغ تیز افراشتی | از چہ افگندی مرا بگذاشتی
آنچہ دیدی بہتر از پیکار من | تا شدی تو سست در اشکار من
آنچہ دیدی کہ چناں خشمت نشست | تا چنیں برقے نمود و باز جست
گفت امیر المومنین با آں جواں | کہ بہ ہنگام نبرد اے پہلواں
چوں خدو انداختی بر روئے من | نفس جنبید و تبہ شد خوئے من

نیم بہر حق شد و نیمے ہوا ۔۔۔ شرکت اندر کارِ حق نبود روا
تو نگاریدہ کفِ مولیستی ۔۔۔ آں حق کردۂ من نیستی
نقشِ حق را ہم بہ امرِ حق شکن ۔۔۔ بر زجاجہ دوست سنگِ دوست زن

حکایت کا ماحصل یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جہاد میں ایک کافر پر قابو پایا اور اس کو تلوار سے مارنا چاہا۔ اس نے جناب موصوف کے منہ پر تھوک دیا۔ آپ وہیں رک گئے اور تلوار ہاتھ سے ڈال دی۔ کافر نے متحیر ہوکر پوچھا کہ یہ کیا موقع تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میں تجھ کو خالصۃً لوجہ اللہ قتل کرنا چاہتا تھا، لیکن جب تو نے میرے منہ پر تھوک دیا تو میرے نفس کو نہایت ناگوار ہوا اور سخت غصہ آیا۔ اس صورت میں خلوص نہیں رہا۔ کیونکہ خواہش نفسانی بھی شامل ہوگئی

نیم بہرِ حق شدہ نیمے ہوا ۔۔۔ شرکت اندر کارِ حق نبود روا

الٰہیات | خدا کے اثبات کے مختلف طریقے ہیں اور ہر طریقہ ایک خاص گروہ کے مناسب ہے۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ آثار سے موثر پر استدلال کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ خطابی ہے اور عوام کے لیے یہی طریقہ سب سے بہتر ہے۔ یہ صاف نظر آرہا ہے کہ عالم ایک عظیم الشان کل ہے جس کے پرزے رات دن حرکت میں ہیں۔ ستارے چل رہے ہیں، دریا بہہ رہے ہیں، پہاڑ آتش فشاں ہیں، ہوا جنبش میں ہے، زمین نباتات اگا رہی ہے، درخت جھوم رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر انسان کو خود بخود خیال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی پرزور ہاتھ ہے جو ان تمام پرزوں کو چلا رہا ہے۔ اسے مولانا اس طرح ادا کرتے ہیں:

دست پنہاں، قلم بیں خط گذار ۔۔۔ قلم لکھ رہا ہے، لیکن ہاتھ چھپا ہوا ہے۔
اسپ در جولاں و ناپیدا سوار ۔۔۔ سوار کا پتہ نہیں لیکن گھوڑا دوڑ رہا ہے۔
پس یقیں در عقلِ ہر داننده است ۔۔۔ ہر سمجھدار یہ یقین رکھتا ہے کہ
ایں کہ با جنبیدہ جنبانندہ ہست ۔۔۔ جو چیز حرکت کرتی ہے اس کا کوئی حرکت دینے والا ضرور ہوتا ہے۔
گر تو آں را مے نہ بینی در نظر ۔۔۔ اگر تم اس کو آنکھوں سے نہیں دیکھتے،
فہم کن آں را بہ اظہارِ اثر ۔۔۔ تو اس کے اثر کو دیکھ کر سمجھو۔
تن بجاں جنبد نمی بینی تو جاں ۔۔۔ بدن جو حرکت کرتا ہے جان کی وجہ سے کرتا ہے
لیک از جنبیدنِ تن جاں بداں ۔۔۔ تم جان کو نہیں جان سکتے تو بدن کی حرکت سے جان کو جانو۔

دوسرا طریقہ جو حکما کا ہے، یہ ہے کہ تمام عالم میں نظام اور ترتیب پائی جاتی ہے، اس لیے ضرور اس کا کوئی صانع ہے۔ اس طریقہ پر ابن رشد نے بہت زور دیا ہے۔ مولانا نے اس طریقہ کو ایک مصرعہ میں ادا کر دیا ہے۔ ع

گر حکیمے نیست ایں ترتیب چیست!

صفتِ باری | اسلام میں اختلافِ مذہبی کی جو بنیاد پڑی، جس نے بڑھتے بڑھتے اسلام کا تمام شیرازہ منتشر کر دیا، وہ یہ

اسی مسئلہ کی بدولت تھا، اسی مسئلہ نے معتزلہ، اشعریہ، حنبلیہ میں سینکڑوں برس تک وہ نزاعیں قائم رکھیں کہ لوگوں نے بجائے قلم کے تلوار سے کام لیا۔ ہزاروں آدمی اس جرم میں قتل ہوئے کہ وہ کلام الٰہی کو قدیم کہتے تھے۔ اشعریہ نے ان لوگوں کا استیصال کر دینا چاہا جو یہ کہتے تھے کہ خدا عرش پر جاگزیں ہے۔ یہ اختلافات ایک مدت تک قائم رہے اور آج بھی قائم ہیں، گو عملی صورت میں اس کا ظہور نہیں۔

مولانا نے ان نزاعوں کا یہ فیصلہ کیا کہ یہ بحث سرے سے فضول ہے۔ خدا کی نسبت صرف اس قدر معلوم ہو سکتا ہے کہ ہے، باقی یہ کہ کیسا ہے، کہاں ہے، اس کے کیا اوصاف ہیں؟ ادراکِ انسانی سے بالکل باہر ہے۔

مولانا نے اسی سلسلہ میں ایک حکایت لکھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک چرواہے کو دیکھا کہ وہ خدا سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ اے خدا تو کہاں ہے؟ تو مجھ کو ملتا تو میں تیرے بالوں میں کنگھی کرتا، تیرے کپڑوں سے جوئیں نکالتا، تجھ کو مزے مزے کے کھانے کھلاتا۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو سزا دینی چاہی، وہ بے چارہ بھاگ نکلا۔ حضرت موسیٰ پر وحی آئی۔

وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا — بندۂ ما را چرا کردی جدا!
تو برائے وصل کردن آمدی — یا برائے فصل کردن آمدی؟
ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم — ہر کسے را اصطلاحے دادہ ایم
در حقِ او مدح و در حقِ تو ذم — در حقِ او شہد و در حقِ تو سم
ما بروں را ننگریم و قال را — ما دروں را بنگریم و حال را
موسیا! آداب داناں دیگر اند — سوختہ جاں و رواناں دیگر اند
در درونِ کعبہ رسمِ قبلہ نیست — چہ غم ار غواص را پاچیلہ نیست
عاشقاں را ہر زمانے عشر نیست — بر دہِ ویراں خراج و عشر نیست
خونِ شہیداں را ز آب اولیٰ تر است — ایں گناہ از صد ثواب اولیٰ تر است
ملتِ عشق از ہمہ ملت جدا ست — عاشقاں را ملت و مذہب خدا ست

اس حکایت سے مولانا کا یہ مقصود ہے کہ خدا کے اوصاف اور حقیقت بیان کرنے کے متعلق تمام لوگوں کا یہی حال ہے۔ حکماء اور اہلِ نظر جو کچھ خدا کی ذات و صفات کی نسبت کہتے ہیں، وہ بھی ایسا ہی ہے جیسا وہ چرواہا خدا کی نسبت کہہ رہا تھا۔

ہاں وہاں گر حمد گوئی در سپاس — ہمچو نافرجام آں چوپاں شناس
حمد تو نسبت بہ تو گر بہتر است — لیک آں نسبت بہ حق ہم ابتر است

مولانا نے اس حکایت میں یہ بھی ظاہر کیا کہ مقصود اصلی اخلاص و تضرع ہے، طریقِ ادا سے بحث نہیں۔

مولانا کی اصلی تعلیم یہ ہے کہ خدا کی ذات و صفات کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہیے اور جو کچھ کہا جائے گا وہ خدا کے

انصاف نہ ہوں گے، کیونکہ انسان جو کچھ تصور کرسکتا ہے محسوسات کے ذریعہ سے کرسکتا ہے، اور خدا اس سے بالکل بری ہے۔

ہرچہ اندیشی پذیرائے فناست	وانکہ در اندیشہ ناید آں خداست
آں مگو، چوں در اشارت نایداں	دم مزن چوں در عبارت نہ نشاں
نہ اشارت مے پذیرد نہ عیاں	نہ کسے زو علم دارد، نہ نشاں
ہر کسے نوعِ دگر، در معرفت	مے کند موصوف غیبی را صفت
فلسفی از نوعِ دیگر کردہ شرح	واں دگر مرگفتِ او را کردہ جرح
واں دگر بر ہر دو طعنہ مے زند	واں دگر از زرق جانی مے کند
ہر یک از رہ ایں نشانہا زاں دہند	تا گماں آید کہ ایشاں زاں دہند
اختلافِ خلق از نام او فتاد	چوں بہ معنی رفت آرام او فتاد

نبوت | یہ مسئلہ علم کلام کے مہات مسائل میں سے ہے اور اسی وجہ سے علم کلام کی کتابوں میں اس کے متعلق بہت طول طویل بحثیں پائی جاتی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ حشو اور زوائد پر صفحہ کے صفحہ سیاہ کیے گئے ہیں اور مغز سخن پر ایک دو سطریں بھی مشکل سے ملتی ہیں۔ مولانا نے اس بحث کے تمام اجزا پر لکھا ہے اور اس خوبی سے لکھا ہے گویا اس راز سربستہ کی گرہ کھول دی ہے۔

نبوت کے متعلق امور ذیل بحث طلب ہیں:

نبوت کی حقیقت،

وحی کی حقیقت،

مشاہدۂ ملائکہ،

معجزہ،

نبوت کی تصدیق کیونکر ہوتی ہے۔

مولانا نے ان تمام مباحث کو نہایت خوبی سے طے کیا ہے، چنانچہ ہم ان سب کو بہ ترتیب بیان کرتے ہیں:

نبوت کی حقیقت | روح کے بیان میں آگے آئے گا کہ روح کا سلسلۂ ترقی اس حد تک پہنچتا ہے کہ روح انسانی اور اس اعلیٰ روح میں اس قدر فرق پیدا ہو جاتا ہے، جس قدر روح حیوانی اور انسانی میں، لیکن اس درجہ کے مراتب بھی متفاوت ہیں۔ ادنیٰ طبقہ کو ولایت اور انتہائی اعلیٰ طبقہ کو نبوت کہتے ہیں۔

باز غیر از عقل و جانِ آدمی	عام آدمیوں کی عقل اور روح کے علاوہ
ہست جانے در نبی و در ولی	انبیا اور اولیا میں ایک اور روح ہوتی ہے۔
روحِ وحی از عقل پنہاں تر بود	وحی کی روح عقل سے بھی زیادہ مخفی ہوتی ہے،
زانکہ او غیب است و او زاں سر بود	کیونکہ یہ روح عالم غیب کی چیز ہے اور یہ عالم دوسرے سرے کا عالم ہے۔

وحی کی حقیقت : مادہ پرستوں کے نزدیک ادراک کا ذریعہ صرف حواس ظاہری ہیں، جو چیزیں حواس ظاہری کی مدرکات سے بظاہر خارج معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً کلیات اور مجردات ان کے ادراکات کا ذریعہ بھی حواس ہی کے محسوسات ہیں۔ ان ہی محسوسات کو قوتِ دماغی خصوصیات سے مجرّد کر کے کلی اور مجرد بنا لیتی ہے، لیکن حضرات صوفیہ کے نزدیک انسان میں ایک اور خاص قوت ہے جو حواس ظاہری کے توسّط کے بغیر اشیاء کا ادراک کرتی ہے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں :

پنج حسّے ہست جز ایں پنج حس ؛ — ان پانچ حواس کے سوا اور بھی پانچ حواس ہیں۔

آں چو زر سرخ وایں حس ہا چو مس — یہ حواس تانبے کی طرح ہیں اور وہ سونے کی طرح۔

حسِّ ابداں قوتِ ظلمت مے خورد — حواس جسمانی کی غذا ظلمت ہے

حسِّ جاں از آفتابے مے چرد — اور حاسۂ روحانی کی غذا آفتاب !

آئینۂ دل چوں شود صافی و پاک — دل کا آئینہ جب صاف ہو جائے

نقش ہا بینی بروں از آب و خاک — تو تم کو ایسی چیزیں نظر آئیں گی جو آب و خاک سے پاک ہیں۔

پس بدانی چونکہ رستی از بدن — جب تم جسم سے بری ہو جاؤ گے

گوش و بینی چشم مے تاند شدن — تو جان لوگے کہ سامعہ اور شامہ آنکھ کا کام بھی دے سکتی ہیں۔

فلسفی کو منکرِ حنانہ است — فلسفی جو حنانہ کے واقعہ کا انکار کرتا ہے

از حواسِ انبیا بیگانہ است — وہ انبیا کے حواس سے بے خبر ہے۔

پس محلِّ وحی گردد گوشِ جاں — روح کے کان وحی کے محل ہیں،

وحی چہ بود؟ گفتن از حسِّ نہاں — وحی کس چیز کا نام ہے؟ حس مخفی کے ذریعہ سے کہنا۔

یہ ادراک انبیا کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اولیا اور اصفیا کو بھی حاصل ہوتا ہے۔

مولانا نے وحی کے وجود کو اس طرح ثابت کیا ہے کہ دنیا میں آج جس قدر علوم و فنون، صنائع و حرف ہیں تعلّم و تعلیم سے حاصل ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ اب دو صورتیں ہیں، یا یہ تسلیم کیا جائے کہ تعلّم و تعلیم کا یہ سلسلہ ابتدا کی جانب کہیں ختم نہیں ہوتا، بلکہ الیٰ غیر النہایۃ چلا جاتا ہے، یا یہ فرض کیا جائے کہ یہ سلسلہ ایسے شخص پر جا کر ختم ہوتا ہے، جس کو بغیر تعلّم و تعلیم کے محض القا اور الہام کے ذریعہ سے علم حاصل ہوا ہوگا۔ پہلی صورت میں تسلسل لازم آتا ہے جو محال ہے، اس لیے ضروری ہے کہ دوسری صورت تسلیم کی جائے اور اسی کا نام وحی ہے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں :

ایں نجوم و طب وحیِ انبیاست — عقل و حس را سوئے بے سو رہ کجاست

لہ اس سے حواسِ خمسہ باطنی مراد نہیں ہیں، بلکہ روحانی حاسہ مراد ہے۔ چنانچہ عبد العلی بحر العلوم کی شرح میں اس کو توضیح کے ساتھ لکھا ہے۔

قابلِ تعلیم و فہم ست ایں خرد   لیک صاحب وحی تعلیمش دہد
جملہ حرفت ہا یقیں از وحی بود   اول او لیک عقل او فزود
ہیچ حرفت را ببیں کیں عقل ما   ماند او آموخت بے ہیچ اوستا
دانش پیشہ ازیں عقل ار بدے   پیشہ بے اوستا حاصل شدے

نبوت کی تصدیق اس بناء پر یہ قوی شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ حالت ہے تو آخر نبی اور متنبی میں تمیز کا کیا ذریعہ ہے۔ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ نبی کے دل میں جو مضامین القا ہوتے ہیں، وہ خدا کی طرف سے ہوتے ہیں، اور متنبی کے دل میں شیطان کی طرف سے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح میٹھے اور کھاری پانی کے پہچاننے کا ذریعہ صرف قوتِ ذائقہ ہے، اسی طرح نبوت کی تمیز کا ذریعہ صرف وجدانِ صحیح اور ذوقِ سلیم ہے۔

جز صاحبِ ذوق نشناسد بیاب   صاحبِ ذوق کے سوا اور کون پہچان سکتا ہے؟
او شناسد آبِ خوش را از شور آب   وہی تمیز کر سکتا ہے کہ یہ پانی میٹھا ہے اور یہ کھارا۔
جز کہ صاحبِ شوق نشناسد طعوم   صاحبِ ذوق کے سوا مزے کی تمیز کون کر سکتا ہے،
شہد را نا خوردہ کے دانی زموم   جب تک شہد کو نہ کھاؤ موم اور شہد میں کیونکر تمیز کر سکتے ہو۔
سحر را با معجزہ کردہ قیاس   اس نے سحر کو معجزہ پر قیاس کیا۔
ہر دو را بر مکر پندار و اساس   اور یہ سمجھا کہ دونوں کی بنیاد فریب پر ہے۔
زر قلب و زر نیکو در عیار   تم کھوٹے اور کھرے روپیہ کو
بے محک ہرگز نہ دانی اعتبار   کسوٹی کے بغیر تمیز نہیں کر سکتے۔
ہر کرا در جاں خدا بنہد محک   خدا نے جس کی طبیعت میں کسوٹی رکھی ہے۔
ہر یقیں را باز داند او ز شک   وہی یقین اور شک میں تمیز کر سکتا ہے۔
چوں شود از رنج و علت دل سلیم   جب آدمی کے دل میں بیماری نہیں ہوتی۔
طعمِ صدق و کذب را باشد علیم   تو وہ صدق اور کذب کے مزے کو پہچان لیتا ہے۔

معجزہ معجزہ کے تین امر بحث طلب ہیں:

(۱) خرقِ عادت ممکن ہے یا نہیں!

(۲) معجزہ شرطِ نبوت ہے یا نہیں؟

(۳) معجزہ سے نبوت کی تصدیق ہوتی ہے یا نہیں؟

امام رازی نے تفسیر کبیر اور مطالبہ عالیہ میں لکھا ہے کہ خرقِ عادت کے متعلق تین رائیں ہیں۔ حکما کا مذہب ہے کہ کسی حالت

میں ممکن نہیں، اشاعرہ کہتے ہیں کہ ہر وقت ممکن ہے۔ یہ نزاع اصل میں اس بنا پر ہے کہ حکما کے نزدیک کائنات میں علت و معلول کا سلسلہ قائم ہے اور معلول کبھی علت سے متخلف نہیں ہو سکتا۔ اشاعرہ کے نزدیک کوئی چیز کسی کی علت نہیں، نہ کسی شے میں کوئی خاصہ اور تاثیر ہے۔ معتزلہ کا مذہب ہے کہ خرقِ عادت کبھی کبھی اتفاقیہ وقوع میں آتی ہے۔

مولانا نے معتدل طریقہ اختیار کیا، وہ اشاعرہ کے برخلاف اس بات کے قائل ہیں کہ عالم میں ایک قانونِ قدرت اور ایک سلسلہ انتظام ہے اور اگر یہ نہ ہو تو انسان کسی کام کے لیے کوئی کوشش اور تدبیر نہ کر سکے، کیوں کہ جب یہ معلوم ہے کہ کوئی چیز کسی کی علت نہیں تو کسی کام کے اسباب اور علت کی تلاش کیوں ہوگی!

چوں سبب نبود چہ رہ جوید مرید | پس سبب در راہ مے آید پدید

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ خدا کے تمام قانونِ قدرت کا احاطہ نہیں ہو چکا ہے، جن چیزوں کو تم اسباب سمجھ رہے ہو ممکن ہے کہ ایسا قانونِ قدرت ثابت ہو جس کے سامنے یہ تمام سلسلۂ اسباب غلط ہو جائے۔

اے گرفتارِ سبب بیروں مپر | لیک عزلِ آں مسبب ظن مبر

ہر چہ خواہد آں مسبب آورد | قدرتِ مطلق سبب ہا بر درد

اس بحث میں مولانا نے ایک اور دقیق نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سلسلۂ اسباب پر زیادہ غور کرنے کا اکثر یہ بھی نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان خدا کے وجود سے بالکل منکر ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اخیر علۃ العلل کوئی چیز نہیں، بلکہ اسباب کا ایک سلسلۂ غیر متناہی ہے، جو قدیم سے قائم ہے اور برابر چلا جاتا ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے، اسی سلسلہ کا نتیجہ ہے۔ ان اسباب کا اخیر میں چل کر کسی علۃ العلل پر منتہی ہونا کچھ ضرور نہیں۔

اس مہلکہ سے بچنے کے لیے انسان کو چاہیے کہ سلسلۂ اسباب کے ساتھ ہر وقت اس بات پر نظر رکھے کہ گو واسطہ در واسطہ سینکڑوں ہزاروں اسباب کا سلسلہ قائم ہے۔ لیکن در اصل یہ تمام کلیں ایک قوتِ اعظم کے چلانے سے چل رہی ہیں۔ اس لیے یہ اسباب اصلی اسباب نہیں، اصلی سبب وہی قوتِ اعظم ہے، جہاں تک یہ سلسلہ پہنچ کر ختم ہوتا ہے۔

ایں سبب ہا بر نظر ہا پردہ ہاست | کہ نہ ہر دیدار صنعش را سزاست

دیدۂ باید سبب سوراخ کن! | تا حجب را بر کند از بیخ و بن

تا مسبب بیند اندر لامکاں | ہرزہ بیند جہد و اسباب دوکاں

از مسبب می رسد ہر خیر و شر | نیست اسباب و وسائط را اثر

معجزہ دلیل نبوت ہے یا نہیں؟ مولانا کے نزدیک نبوت کی تصدیق کے لیے معجزہ شرط نہیں۔ جس کے دل میں ایمان کا مزہ ہوتا ہے، پیغمبر کی صورت اور اس کی باتیں اس کے حق میں معجزہ کا کام دیتی ہیں:

در دل ہر کس کہ از دانش مزہ است | روئے و آواز پیغمبر معجزہ است

لیکن مولانا نے اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ صاف صاف تصریح کی کہ معجزہ ایمان کا سبب نہیں ہوتا اور اس سے جو پیدا ہوتا ہے تو جبری ایمان پیدا ہوتا ہے۔ نہ ذوقی۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

موجب ایمان نباشد معجزات	معجزے ایمان کا سبب نہیں ہوتے
بوئے جنسیت کند جذب صفات	جنسیت کی بو [illegible] جذب کرتی ہے۔
معجزات از بہر قہر دشمن است	معجزے [illegible] دشمن دب جاتا ہے
بوئے جنسیت سوئے دل بردن است	لیکن جنسیت کی بو [illegible] کے لیے ہے کہ دل تک پہنچ جائے۔
قہر گردد دشمن اما دوست نے	دشمن دب جاتا ہے لیکن دوست نہیں ہوتا۔
دوست کے گردد بہ بستہ گردنے	وہ شخص کیونکر دوست ہوگا جو گردن پکڑ کر لایا گیا ہے۔

مولانا نے اس بحث میں ایک اور دقیق نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔ معجزہ سے نبوت پر جو استدلال ہے۔ اس کی منطقی ترتیب یہ ہوتی ہے :

اس شخص سے یہ فعل (معجزہ) صادر ہوا ہے،
اور جس شخص سے یہ فعل صادر ہو، وہ پیغمبر ہے،
اس لیے یہ شخص پیغمبر ہے۔

اس صورت میں پیغمبر کا اثر بالذات خارجی چیز پر ہوتا ہے، مثلاً دریا کا پھٹ جانا، سنگریزوں کا بولنا وغیرہ وغیرہ، اس اثر کا بواسطہ قلب پر اثر پڑتا ہے، یعنی آدمی اس بنا پر ایمان لاتا ہے کہ جب اس شخص نے دریا کو شق کر دیا تو ضرور پیغمبر ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ معجزہ کسی پتھر یا دریا اور جمادات پر اثر کرے یہ زیادہ آسان ہے کہ پہلے پہل دل ہی پر اثر کرے جس سے یہ ہوتا ہے کہ پیغمبر پر لوگ ایمان لائیں، تو یہ زیادہ آسان اور زیادہ دل نشین طریقہ ہے کہ بجائے جمادات کے خود لوگوں کو متاثر کر دے کہ وہ ایمان قبول کریں اور یہی اصلی معجزہ کہا جا سکتا ہے۔ مولانا اس نکتہ کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں :

معجزہ کاں بر جمادے کرد اثر	یا عصا، یا بحر یا شق القمر
گر اثر بر جاں زند بے واسطہ	متصل گردد بہ پنہاں رابطہ
بر جمادات آں اثر عاریہ است	آں پئے روح خوشِ متواریہ است
تا ازاں جامد اثر گیرد ضمیر	جند آنانِ بے ہیولائے خمیر
بر زند از جانِ کامل معجزات	بر ضمیر جانِ طالب چوں حیات

اخیر شعر میں معجزہ کی اصلی حقیقت بتائی ہے یعنی پیغمبر کا روحانی اثر خود طالب کی روح پر پڑتا ہے کسی واسطہ اور ذریعہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

دفتر ششم حکایت رنجور شدن بلال۔

روح | روح اگرچہ تمام حیوانات میں پائی جاتی ہے اور اگرچہ حیوانات کے مختلف انواع میں اس کے مراتب نہایت متفاوت ہیں، تاہم حیوانات میں جو روح ہے، وہ ترقی کی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس حد کو روح حیوانی کہتے ہیں۔ اس سے آگے جو درجہ ہے وہ روح انسانی ہے۔

غیر فہم و جاں کہ در گاؤ و خر است　　　آدمی را عقل و جانِ دیگر است

اس روح کے خواص اور اوصاف مولانا کے فلسفہ کے مطابق یہ ہیں:

۱ - وہ ایک جوہر مجرد اور جسمانیت سے بالکل بری ہے، اس کا تعلق جسم سے نہیں، بلکہ اس روح حیوانی سے ہے، جو انسان میں موجود ہے۔ یہ تعلق اس قسم کا ہے جس طرح آفتاب کا آئینہ سے۔ آفتاب اپنی جگہ پر موجود ہے لیکن اس کا عکس آئینہ پر پڑتا ہے اور اس کو روشن کر دیتا ہے۔ اسی طرح روح عالم ملکوت میں ہے اس کا پرتو روح حیوانی پر پڑتا ہے اور اس کی وجہ سے انسان عجیب و غریب قوی کا مظہر بن جاتا ہے:

حاشا اللہ تو برونی زیں جہاں	حاشا! تو اس جہاں سے باہر ہے،
ہم بوقت زندگی ہم بعد آں	زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی۔
در ہوائے غیر مرغے مے پرد	ہوا میں ایک مرغ اڑا جاتا ہے
سایہ او بر زمیں مے گسترد	اور اس کا سایہ زمین پر پڑتا ہے۔
جسم سایۂ سایہ دل است	جسم روح کے سایہ کا سایہ ہے،
جسم کے اندر خور پایہ دل است	جسم کو دل سے کیا نسبت۔
مرد خفتہ روح او چوں آفتاب	جب آدمی سو جاتا ہے تو روح آفتاب کی طرح
در فلک تاباں و در تن جامہ خواب	آسمان پر چمکتی ہے اور بدن شب خوابی کپڑوں میں ہوتا ہے۔
جاں نہاں اندر خلا ہمچو سجاف	روح خلا میں سنجاف کی طرح مخفی ہے
تن تقلب مے کند زیر لحاف	اور بدن لحاف کے نیچے کروٹیں بدلتا ہے۔
روح من چوں امر ربی مختفی ست	میری روح خدا کے امر کی طرح مخفی ہے
ہر مثالے کہ بگویم منتفی ست	میں کی جو مثال دی جائے سب غلط ہے۔

۲ - روح کی ترقی کے مراتب سلسلہ بہ سلسلہ بڑھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کا ایک ایسا درجہ آتا ہے جو عام روح انسانی سے اسی قدر بالاتر ہے جس قدر انسانی روح حیوانی سے۔ یہی درجہ نبوت کا ہے۔

غیر فہم و جاں کہ در گاؤ خر است	آدمی را عقل و جانِ دیگر است
باز غیر عقل و جانِ آدمی	ہست جانے در نبی و در ولی

روح وحی از عقل پنہاں تر بود ‏ زانکہ او غیب ست واو زاں سر بود

عقول مجردہ اور روحانیت جو نظام عالم کے کام پر مامور ہیں، اسی روح کے سلسلہ میں واقع ہیں۔

۳ - جس طرح انسان کا جسم جو کام کرتا ہے، اس وجہ سے کرتا ہے کہ اس پر روح کا پرتو ہے، اسی طرح پر عالم قدس کا پرتو ہے:

آنچناں کہ پرتو جاں بر تن است ‏ پرتو جانانہ بر جانِ من است

جانِ جاں چوں واکشد پا از جہاں ‏ جاں چناں گردد کہ بے تن جاں بداں

چوں تو ندہی راہ جاں خود بردہ گیر ‏ جاں کہ بے تو زندہ باشد مردہ گیر

حاصل یہ ہے کہ روح ایک جوہر مجرد ہے اور انسان میں جو روح حیوانی ہے (جس کو جان بھی کہتے ہیں) یہ اس کے کام کرنے کا ایک آلہ ہے۔ جس طرح کاریگر آلہ کے بغیر کام نہیں کر سکتا۔ روح بھی اس روح حیوانی کے بغیر کام نہیں کر سکتی، لیکن فی نفسہٖ وہ بالکل ایک جداگانہ شئے ہے اور چونکہ وہ جوہر مجرد ہے، یعنی نہ مادہ ہے نہ مادہ سے مرکب ہے، اس لیے اس کو فنا نہیں۔ انسان دراصل اسی روح کا نام ہے اور یہ جسم اور روح حیوانی اس کا قالب ہے۔

معاد | اصل یہ ہے کہ اخلاقی حیثیت سے تو معاد کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ گفتگو جو کچھ ہے یہ ہے کہ بظاہر یہ نہایت بعید معلوم ہوتا ہے کہ انسان جب مر کر سڑ گل جائے تو پھر اس کو دوبارہ زندگی حاصل ہو۔ مولانا نے اس استبعاد کو تمثیلوں اور تشبیہوں سے رفع کیا ہے۔ عمر خیام نے ایک رباعی میں لطیفہ کے طور پر معاد سے انکار کیا تھا اور کہا تھا کہ انسان کوئی گھاس نہیں ہے کہ ایک دفعہ کاٹ ڈالی جائے تو پھر اُگ آئے۔ مولانا اس کا جواب اسی انداز بیان میں دیتے ہیں:

کدام دانہ فرو رفت در زمیں کہ نہ رست

چرا بدانۂ انسانیت ایں گماں باشد

یہ استدلال اگرچہ بظاہر ایک لطیفہ ہے، لیکن دراصل یہ علمی استدلال ہے۔ چنانچہ آگے تفصیل آتی ہے۔ مولانا نے معاد کے استبعاد کو اس طریقہ سے رفع کیا کہ انسان پہلے جماد تھا۔ جماد سے نبات ہوا اور نبات سے حیوان ہوا، حیوان سے انسان ہوا:

آمدہ اوّل بہ اقلیم جماد ‏ از جمادی در نباتی اوفتاد

سالہا اندر نباتی عمر کرد ‏ وز جمادی یاد نا ورد از نبرد

وز نباتی چوں بہ حیواں اوفتاد ‏ نامدش حال نباتی ہیچ یاد

جز ہماں میلے کہ دارد سوئے آں ‏ خاصہ در وقت بہار و ضیمراں

ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت ‏ تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت

عقلہائے اولینش یاد نیست ‏ ہم ازیں عقلش تحول کردنی ست

تا رہد زیں عقل پر حرص و طلب ‏ صد ہزاراں عقل بیند بوالعجب

گرچہ خفتہ گشت و ناسی شد ز پیش | کے گذارندش دراں نسیان خویش
باز ازاں خوابش بہ بیداری کشند | کہ کند بر حالت خود ریشخند

انسان کی خلقت کے یہ انقلابات مذہباً اور حکمتاً دونوں طرح سے ثابت ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ	اور بے شک ہم نے انسان کو گیلی مٹی سے پیدا کیا،
طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَكِينٍ	پھر ہم نے اس کو ایک معین مقام میں نطفہ بنایا، پھر ہم نے
ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ	نطفہ کو خون کی پھٹکی بنایا، پھر اس کو گوشت کا لوتھڑا بنایا،
مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا	پھر ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر ہم نے
الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ۔[1]	اس کو دوسری مخلوق بنایا (یعنی حیوان سے بالاتر)

فلسفۂ حال کے موافق بھی یہ ترتیب درست ہے۔ ڈارون کی تھیوری کے موافق انسان پر جمادی، نباتی، حیوانی سب حالتیں گزری ہیں، صرف یہ فرق ہے کہ ڈارون روح انسانی کا قائل نہیں۔ اس بنا پر وہ انسان کو الگ مخلوق نہیں سمجھتا، بلکہ حیوانات ہی کی ایک نوع خیال کرتا ہے، جس طرح گھوڑا، ہاتھی، شیر، بندر وغیرہ۔

بہرحال جب یہ ثابت ہوا کہ انسان پہلے جماد تھا، جمادیت کے فنا ہونے کے بعد نبات ہوا، نباتیت کے فنا ہونے کے بعد حیوان، تو اس میں کوئی استبعاد نہیں معلوم ہوتا کہ یہ حالت بھی فنا ہو کر کوئی اور عمدہ حالت پیدا ہو اور اسی کا نام دوسری زندگی یا معاد یا قیامت ہے۔ کسی چیز کے فنا ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ سرے سے معدوم ہو جائے، بلکہ ایک ادنیٰ حالت سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرنے کے لیے ضرور ہے کہ موجودہ صورت فنا ہو جائے۔ مولانا نے نہایت تفصیل اور بسط سے اس مسئلہ کو بیان کیا ہے کہ ترقی کے عجیب و غریب مدارج کے لیے فنا اور نیستی ضرور ہے۔ پہلے اس کو نہایت عام فہم مثالوں میں بیان کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

لوح را اوّل بشوید بے وقوف	نادان پہلے تختی کو دھوتا ہے،
آنگہی بروے نویسد او حروف	تب اس پر حرف لکھتا ہے۔
وقت شستن لوح را باید شناخت	تختی کے دھونے کے وقت یہ سمجھ لینا چاہیے
کہ مراں را دفترے خواہند ساخت	کہ اس کو ایک دفتر بنائیں گے۔
چوں اساس خانۂ نو افگنند	جب نئے مکان کی بنیاد ڈالتے ہیں
اوّلیں بنیاد را برمی کنند	تو پہلی بنیاد کو کھود کر گرا دیتے ہیں۔

---

[1] ان آیتوں کو عبدالعلی بحرالعلوم نے مولانا کے اشعار مذکورۂ بالا کی شرح میں لکھا ہے اور ان سے مولانا کے دعوے کی صحت پر استدلال کیا ہے۔

گل برآرند اوّل از قعرِ زمین   پہلے زمین سے مٹی نکالتے ہیں
تا بہ آخر برکشی ماءِ معین   تب صاف پانی نکلتا ہے۔
کاغذے جویہ کہ آں بنوشتہ نیست   لکھنے کے لیے سادہ کاغذ تلاش کیا جاتا ہے۔
تخم کارد موضعے کہ کشتہ نیست   بیج اس زمین میں ڈالا جاتا ہے جو ان بوئی ہوتی ہے۔
ہستی اندر نیستی بتواں نمود   ہستی نیستی ہی میں دکھائی جا سکتی ہے۔
مال داراں بر فقیر آرند جود   دولت مند لوگ فقیر ہی پہ سخاوت کا استعمال کرتے ہیں۔

ان عام فہم مثالوں کے بعد مولانا نے فطرت کے سلسلہ سے استدلال کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

تو از آں روزے کہ در ہست آمدی   تم جس دن سے کہ وجود میں آئے
آتشی یا خاک یا بادی بدی!   پہلے آگ، خاک، ہوا تھے۔
گر بداں حالت ترا بودے بقا   اگر تمہاری وہی حالت قائم رہتی
کے رسیدے مر ترا ایں ارتقا   تو یہ ترقی کیونکر نصیب ہو سکتی۔
از مبدّل ہستیِ اوّل نماند   بدلنے والے نے پہلی ہستی بدل دی،
ہستیِ دیگر بجائے او نشاند   اور اس کی جگہ دوسری ہستی قائم کر دی۔
ہم چنیں تا صد ہزاراں ہستہا   اسی طرح ہزاروں ہستیاں بدلتی چلی جائیں گی،
بعد یک دیگر دوم بہ ز ابتدا   یکے بعد دیگرے اور پچھلی پہلی سے بہتر ہوگی۔
ایں بقاہا از فناہا یافتی   یہ بقا تم نے فنا کے بعد حاصل کی ہے،
از فنا پس رو چرا بر تافتی   پھر فنا سے کیوں جی چراتے ہو!
زاں فناہا چہ زیاں بودت کہ تا   ان فناؤں سے تم کو کیا نقصان پہنچا۔
بر بقا چسپیدۂ اے بے نوا   جو اب بقا سے چمٹے جاتے ہو۔
چوں دوم از اولیں بہتر ست   جب دوسری ہستی پہلی ہستی سے بہتر ہے
پس فنا جوئے و مبدّل را پرست   تو فنا کو ڈھونڈو اور انقلاب کنندہ کو پوجو۔
صد ہزاراں حشر دیدی اے عنود   تم سینکڑوں قسم کے حشر دیکھ چکے،
تاکنوں ہر لحظہ از بدو وجود   ابتدائے وجود سے اس وقت تک۔
از جمادی بے خبر سوئے نما   پہلے تم جماد تھے، پھر تم میں قوت نمو پیدا ہوئی،
وز نما سوئے حیات و ابتلا   پھر تم میں جان آئی۔

باز سوئے عقل و تمییزات خوش	پھر عقل و تمیز،
باز سوئے خارجِ ایں پنج و شش	پھر حواسِ خمسہ کے علاوہ اور حواس حاصل ہوئے۔
در فناہا ایں بقاہا دیدہٗ	جب فناؤں میں تم نے یہ بقائیں دیکھیں
بر بقائے جسم چوں چفسیدہٗ	تو جسم کے بقا پر کیوں جان دیتے ہو۔
تازہ مے گیر و کہن را مے سپار	نیا لو، اور پرانا چھوڑ دو
کہ ہر امسالت فزون ست از سر پار	کیوں کہ تمھارا ہر سال پارسال سے اچھا ہے۔

مولانا کا یہ استدلال بالکل جدید سائنس کے مطابق ہے، جدید تحقیقات سے ثابت ہو گیا کہ کوئی چیز پیدا ہو کر فنا نہیں ہو سکتی بلکہ کوئی دوسری صورت بدل لیتی ہے۔ انسان دو چیزوں کا نام ہے، جسم اور روح۔ روح کو گو سائنس والے مصطلح معنوں میں تسلیم نہیں کرتے، لیکن کم از کم ان کو یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ وہ ایک قوّت ہے۔ سائنس والوں کے نزدیک دنیا میں دو چیزیں پائی جاتی ہیں، مادّہ مثلاً خاک، پانی وغیرہ۔ اور قوّت، مثلاً حرارت، حرکت وغیرہ۔ انسان انھی دو چیزوں کا مجموعہ ہے، جسم مادہ ہے اور روح قوّت ہے اور چونکہ سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ مادہ اور قوّت کبھی فنا نہیں ہو سکتی، اس لیے ضرور ہے کہ انسان جب فنا ہو تو اس کا مادّہ اور قوت کوئی دوسری صورت اختیار کر لے۔ اسی کو ہم انسان کی دوسری زندگی یا معاد یا قیامت کہتے ہیں؛ اس لیے ملحد سے ملحد بھی مطلق معاد کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا۔

<u>جبر و قدر</u>: عقائد کے مسائل اکثر ایسے ہیں کہ ان میں کچھ دقّت اور اشکال ہے، وہ مذہبی اصول کے لحاظ سے ہے ورنہ اگر مذہب کا لحاظ نہ رکھا جائے تو آسانی سے اس کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ اگر اس کا ثبوتی پہلو مشکل ہو گا تو سلبی میں کچھ دقّت نہ ہو گی۔ مثلاً روح، معاد، جزا و سزا، لیکن جبر و قدر کا مسئلہ ایسا پُر پیچ ہے کہ مذہبی حیثیت الگ بھی کر لی جائے، تب بھی یہ عقیدہ حل نہیں ہوتا۔ ایک ملحد اس مسئلہ کا بالکل آزادانہ طریقہ سے فیصلہ کرنا چاہے، تب بھی نہیں کر سکتا۔ نفی اور اثبات سے الگ کوئی پہلو نہیں ہے، اور دونوں صورتوں میں ایسے اشکالات پیدا ہوتے ہیں جو رفع نہیں ہو سکتے۔

مثلاً اگر تم یہ پہلو اختیار کرو کہ انسان بالکل مجبور ہے تو انسان کے افعال کا اچھا اور بُرا ہونا بالکل بے معنی ہو گا، کیوں کہ جو افعال کسی سے محض مجبوراً صادر ہوتے ہیں، ان کو نہ ممدوح کہا جا سکتا ہے نہ مذموم۔ دوسرا پہلو اختیار کرو تو وہ بھی خلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ غور سے دیکھو کہ انسان کسی کام کو کیوں کرتا ہے؛ اور کیوں ایک کام سے باز رہتا ہے؟ انسان میں خدا نے خواہش کا ایک مادہ پیدا کیا ہے، جس کو ارادہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ خواہش خاص اسباب اور مواقع کے پیش آنے سے خود بخود حرکت میں آتی ہے۔ انسان میں ایک اور قوّت ہے، جس کو ہم قوّتِ اجتناب سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی ایک کام سے باز رہنا۔ جب کوئی بُرا کام ہم کرنا چاہتے ہیں تو ان دونوں قوتوں میں معارضہ ہوتا ہے۔ اگر قوّتِ ارادی فطرۃً قوّتِ اجتنابی سے قوی تر ہے تو انسان اس فعل کا مرتکب ہوتا ہے ورنہ باز رہتا ہے۔

فرض کرو کہ ایک شخص کے سامنے کسی نے شراب پیش کی۔ شراب کو دیکھ کر قوتِ ارادی کا ظہور ہوا، ساتھ ہی قوتِ اجتنابی بھی برسرِ کار آئی، لیکن چونکہ یہ قوت فطرۃً اس شخص میں کمزور تھی، قوتِ ارادی کا مقابلہ نہ کرسکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس شخص نے شراب پی لی۔ یہ فعل بالکل فطرت کا نتیجہ لازمی تھا، اس لیے انسان اس کے کرنے پر مجبور تھا۔

اشاعرہ نے اپنی دانست میں ایک تیسری صورت اختیار کی۔ یعنی یہ کہ افعال انسانی خدا کی قدرت سے سرزد ہوتے ہیں، لیکن چونکہ انسان کے ذریعہ سے وجود میں آتے ہیں، اس لیے انسان کو ان سے کسب کا تعلق ہے۔ لیکن کسب محض چونکہ ایک مہمل لفظ ہے جس کی کچھ تعبیر نہیں کی جاسکتی۔ اس بنا پر اکثر کتب کلام میں لکھا ہے کہ اس لفظ کی حقیقت نہیں بیان کی جاسکتی مسلم الثبوت میں ہے کہ کسب اور جبر توام بھائی ہیں۔

مولانا روم نے اس مسئلہ پر مختلف حیثیتوں سے بحث کی ہے۔ سب سے پہلے مولانا نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ گو جبریہ و قدریہ دونوں غلطی پر ہیں، لیکن دونوں کو نسبتہً دیکھا جائے تو قدریہ کو جبریہ پر ترجیح ہے۔ کیونکہ اختیار مطلق ہدایت کے خلاف نہیں اور جبر مطلق ہدایت کے خلاف ہے۔ اس قدر ہر شخص کو بداہتہً نظر آتا ہے کہ وہ صاحبِ اختیار ہے۔ باقی یہ امر کہ یہ اختیار خدا نے دیا، ایک نظری مسئلہ ہے، یعنی استدلال کا محتاج ہے، بدیہی نہیں:

منکرِ حس نیست آں مرد قدر	فعلِ حق حسّے نباشد اے پسر
منکرِ فعلِ خداوندِ جلیل	ہست در انکارِ مدلولِ دلیل

اس کے بعد مولانا نے اختیار کو متعدد قوی دلائل سے ثابت کیا ہے۔

مولانا نے اختیار کے ثبوت کے لیے جو دلائل پیش کیے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ ہر شخص کے دل میں اختیار کا یقین ہے اور گو سخن پروری کے موقع پر کوئی شخص اس سے انکار کرے، لیکن اس کے تمام افعال اور اقوال سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اختیار کا معترف ہے۔ اگر کسی شخص کے سر پر چھت ٹوٹ کر گرے تو اس کو چھت پر مطلق غصہ نہیں آتا، لیکن اگر کوئی شخص اس کو پتھر کھینچ مارے تو اس شخص پر اس کو سخت غصہ آئے گا، یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ چھت کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں، اور آدمی جس نے پتھر کھینچ مارا وہ فاعل مختار ہے۔

گر ز سقفِ خانہ چوبے بشکند	بر تو افتد سخت مجروحت کند
ہیچ خشمے آیدت بر چوبِ سقف	ہیچ اندر کینِ او باشی تو وقف
کہ چرا بر من زد و دستم شکست	یا چرا من فتاد و کرد پست
وانکہ قصد عورتِ تو مے کند	صد ہزاراں خشم از تو سر زند
در بیاید سیل درختِ تو برد	ہیچ با سیل آورد، کینی خرد

گر بیاید باد و دستارت ربود   کے ترا با باد دل خشمے نمود
خشم در تو شد بیان اختیار   تا نہ گوئی جبریانہ اعتذار

ایک نہایت لطیف استدلال مولانا نے یہ کیا کہ جانور تک جبر وقدر کے مسئلہ سے واقف ہیں۔ کوئی شخص اگر ایک کتے کو دور سے پتھر کھینچ مارے تو چوٹ پتھر کے ذریعہ سے لگے گی، لیکن کتا پتھر سے معترض نہ ہوگا، بلکہ اس پر حملہ کرے گا۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ کتا بھی سمجھتا ہے کہ پتھر مجبور تھا، اس لیے وہ قابلِ الزام نہیں۔ جس شخص نے باختیار اذیت دی وہ مواخذہ کے قابل ہے:

ہم چنیں گر بر سگے سنگے زنی   بر تو آرد حملہ گردی منثنی
گر شتربان اشترے را می زند   آں شتر قصدِ زنندہ می کند
خشمِ اشتر نیست باآں چوبِ او   پس ز مختاری، شتر بردہ ست بو
عقلِ حیوانی چو دانست اختیار   ایں مگو اے عقلِ انساں شرم دار
روشن ست ایں لیک از طمعِ سحور   آں خورندہ چشم بربندد ز نور
چونکہ کلی میلِ آں ناں خوردنیست   رو بہ تاریکی کند کہ روز نیست

٢ ۔ انسان کے تمام افعال واقوال سے اختیار کا ثبوت ملتا ہے۔ ہم جو کسی کو کسی بات کا حکم دیتے ہیں، کسی کام سے روکتے ہیں، کسی پر غصہ ظاہر کرتے ہیں، کسی فعل پر نادم ہوتے ہیں، یہ تمام امور اس بات کی دلیل ہیں کہ ہم مخاطب کو اور اپنے آپ کو فاعل مختار خیال کرتے ہیں:

ایں کہ فردا "آں کنم یا ایں کنم"   ایں دلیلِ اختیارست اے صنم
واں پشیمانی کہ خوردی از بدی   ز اختیارِ خویش گشتی مہتدی
جملہ قرآں امر ونہی ست و وعید   امر کردن سنگِ مرمر را کہ دید
ہیچ دانا ہیچ عاقل ایں کند؟   با کلوخ و سنگ خشم و کیں کند
غیرِ حق را گر نباشد اختیار   خشم چوں مے آیدت بر جرم دار
چوں ہمی خائی تو دنداں بر عدو   چوں ہمی بینی گناہ و جرمِ او
ہیچ خشمے آیدت بر چوبِ سقف   ہیچ اندر کینِ او باشی تو وقف

٣ ۔ جبر کے ثبوت میں سب سے قوی استدلال جو پیش کیا جاتا ہے اور کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا اگر ہمارے افعال کا فاعل نہیں تو مجبور ہے اور اگر قادر ہے تو ایک فعل کے دو فاعل نہیں ہو سکتے۔ مولانا نے اس شبہ کا ایسا جواب دیا۔ جواب بھی ہے اور بجائے خود ثبوتِ اختیار پر مستقل استدلال بھی ہے، وہ یہ کہ جو چیز جس چیز کے ذاتیات میں ہے

وہ اس سے کسی حالت میں منفک نہیں ہو سکتی۔ صناع جب کسی آلہ سے کام لیتا ہے تو صناع کی قوتِ فاعلہ آلہ کو باختیار نہیں بنا سکتی، جس کی وجہ یہ ہے کہ جمادیت جماد کی ذاتیات میں ہے، اس لیے کسی فاعلِ مختار کا عمل اس کی جمادیت کو سلب نہیں کر سکتا۔

تصوف عموماً یہ مسلّم ہے کہ مثنوی کا اصل موضوع شریعت کے اسرار اور طریقت کے مسائل کا بیان کرنا ہے، اس لیے پہلے ان الفاظ کے معنی سمجھنے چاہئیں۔ ان تینوں چیزوں کی حقیقت خود مولانا نے دفترِ پنجم کے دیباچہ میں یہ لکھی ہے۔

"شریعت ہمچوں شمعے است کہ راہ می نماید، چوں در راہ آمدی این رفتن تو طریقت است وچوں بمقصود رسیدی آں حقیقت است، حاصل آنکہ شریعت ہمچوں علم کیمیا آموختن ست از استاد یا از کتاب، طریقت استعمال کردن دارو ہا ومس را در کیمیا مالیدن وحقیقت زر شدن مس۔"

"یا مثالِ شریعت ہمچوں علم طب آموختن است وطریقت پرہیز کردن بموجب علم طب وداروخوردن وحقیقت صحت یافتن۔"

یعنی مثلاً ایک شخص نے علم طب پڑھا، یہ شریعت ہے۔ دوا استعمال کی، یہ طریقت ہے۔ مرض سے افاقہ ہو گیا یہ حقیقت ہے۔ حاصل یہ کہ شریعت علم ہے، طریقت عمل ہے، حقیقت عمل کا اثر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت چار چیزوں کا نام ہے۔ اقرارِ زبانی۔ اعتقادِ قلبی۔ تزکیۂ اخلاق۔ اعمال یعنی اوامر و نواہی۔

اعتقاد تین طریقہ سے پیدا ہوتا ہے۔ تقلید سے، استدلال سے، کشف و حال سے۔ پہلی دونوں قسموں کو شریعت کہتے ہیں، یعنی ان طریقوں سے کسی کو اگر اعتقاد حاصل ہو تو کہا جائے گا کہ اس کو شرعی اعتقاد حاصل ہے۔ تیسری قسم کا اعتقاد طریقت ہے۔ یہ قسم بھی شریعت سے باہر نہیں، لیکن امتیازاً ایک خاص نام رکھ لیا گیا ہے، کیوں کہ یہ اعتقاد سلوک و تصوف اور مجاہدہ و ریاضت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

اسی طرح تزکیۂ اخلاق کے جو احکام شریعت میں مذکور ہیں، ان کا نام شریعت ہے، لیکن محض احکام کے جاننے سے تزکیۂ اخلاق نہیں ہوتا۔ علمائے ظاہر اخلاق کی حقیقت و ماہیت سے بخوبی واقف ہوتے ہیں، لیکن خود ان کے اخلاق پاک نہیں ہوتے۔ یہ مرتبہ مجاہدات اور فنائے نفس سے حاصل ہوتا ہے۔ اور اسی کا نام طریقت ہے۔ تعمیل فرائض اور اجتناب منہیات کا بھی یہی حال ہے۔[1]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شریعت اور طریقت دو متناقض چیزیں نہیں بلکہ دونوں میں جسم و جان، جسد و روح، ظاہر و باطن، پوست و مغز کی نسبت ہے۔

تصوف میں بھی ان ہی مسائل سے بحث ہوتی ہے، لیکن تصوف میں ان عقائد کی حقیقت اور طرح پر بیان کی جاتی ہے چنانچہ

---

[1] یہ تفصیل قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کے مکتوب بشتم سے ماخوذ ہے۔

ل تفصیل آگے آئے گی۔ یہی حصہ تصوف کا علمی حصہ ہے، لیکن تصوف کے اس حصہ میں جو چیز اصلی مابہ الامتیاز ہے، یہ ہے کہ
یں علم اور ادراک کا طریقہ عام طریقہ سے مختلف ہے۔ تمام حکما اور علما کے نزدیک ادراک کا ذریعہ حواس ظاہری اور باطنی
حافظہ، تخیل، حس مشترک وغیرہ ہیں، لیکن ارباب تصوف کے نزدیک ان وسائل کے سوا ادراک کا ایک اور بھی ذریعہ
حضرت صوفیہ کا دعویٰ ہے کہ مجاہدہ، ریاضت، مراقبہ اور تصفیۂ قلب سے ایک اور حاسہ پیدا ہوتا ہے، جس سے ایسی
معلوم ہوتی ہیں، جو حواس ظاہری و باطنی سے معلوم نہیں ہوتیں۔ امام غزالیؒ نے اس کی تشبیہ دی کہ مثلاً ایک حوض ہے جس
لوں اور جدولوں کے ذریعہ سے باہر پانی آتا ہے۔ یہ گویا علوم ظاہری ہیں۔ خود حوض کی تہ میں ایک سوت بھی ہے جس سے
دکی طرح پانی اچھلتا ہے اور حوض میں آتا ہے یہ علم باطن ہے۔ یہی علم ہے جس کو علم لدنی اور کشف اور علم غیبی کہتے ہیں اور
لم ہے جو انبیاء و اولیا کے ساتھ مخصوص ہے۔

انبیاء اور اولیاء میں فرق یہ ہے کہ انبیاء میں علم نہایت کامل اور فطری ہوتا ہے، یعنی مجاہدہ اور ریاضت کا محتاج نہیں
بخلاف اس کے اولیاء کو مجاہدات اور ریاضات کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

اہل ظاہر اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ تحقیقات علمیہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ انسان کو جو علم ہوتا ہے، صرف اس طرح
اہے کہ وہ اشیائے خارجی کو کسی حاسہ سے محسوس کرتا ہے، پھر اس قسم کی بہت سی چیزوں کو محسوس کر کے ان میں قدر مشترک
اکرتا ہے، جس کو کلی کہتے ہیں، پھر ان ہی جزئیات و کلیات کے باہمی نسبت اور مقابلہ سے سینکڑوں ہزاروں نئی نئی باتیں پیدا
اہے، لیکن ان تمام معلومات کی اصلی بنیاد حواس ہی ہوتے ہیں، اس کو الگ کر دیا جائے تو تمام سلسلہ بے کار ہو جاتا ہے۔ اس
حضرات صوفیا کا یہ دعویٰ کہ حواس کے سوا کوئی اور ذریعہ ادراک بھی ہے، تحقیقات علمی کے خلاف ہے۔ حضرت صوفیہ کا جواب
ہے کہ ع

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

حضرات صوفیہ کہتے ہیں کہ جس طرح علوم ظاہری کے سیکھنے کا ایک خاص طریقہ مقرر ہے، جس کے بغیر وہ علوم حاصل نہیں
سکتے، اسی طرح اس علم کا بھی ایک خاص طریقہ ہے۔ جب تک اس طریقہ کا تجربہ نہ کیا جائے۔ اس سے انکار کرنے کی وجہ نہیں
امر مسلّم ہے کہ بہت سے مسائل علمی ایسے ہیں جن کو کسی خاص حکیم یا عالم نے دریافت کیا اور لوگ صرف ان کی شہادت کی بنا پر
ن مسائل کو تسلیم کرتے ہیں۔ اسی قیاس پر جب سینکڑوں بزرگ جن کے فضل و کمال، صدق و دیانت، دقت نظر اور
رست ذہن سے کوئی انکار نہیں کرسکتا مثلاً حضرت بایزید بسطامی، سلطان ابوسعید، امام غزالی، شیخ محی الدین اکبر، شیخ [illegible]
نظام الدین، شاہ ولی اللہ وغیرہ وغیرہ نہایت وثوق اور اطمینان سے اس کی شہادت دے رہے ہیں کہ علم باطن حواس سے
لگ جداگانہ چیز ہے تو ان کی اس شہادت پر کیوں نہ اعتبار کیا جائے۔ سینکڑوں ایسے علما گزرے ہیں جن کو علم باطن سے قطعاً
انکار تھا، لیکن جب وہ اس کوچہ میں آئے اور خود ان پر وہ حالت طاری ہوئی تو وہ سب سے زیادہ اس کے معترف بن گئے

چونکہ یہ مسئلہ تصوف کے تمام علمی مسائل کی بنیاد ہے۔ اس لیے مولانا نے اس کو بار بار بیان کیا ہے۔ اور مختلف مثالوں سے سمجھایا ہے کہ اسبابِ ظاہر کا اس سے منکر ہونا ایسا ہی ہے جیسے کہ ایک بچہ مسائل فلسفہ سے انکار کرتا ہے یا اُن کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ ہم مختلف مقامات سے اس کے متعلق مثنوی کے اشعار نقل کرتے ہیں:

آئینہ دل چوں شود صافی و پاک | نقش ہا بینی بروں از آب و خاک
پنج حسے ہست جز ایں پنج حس | آں چو زرِ سُرخ و ایں حس ہا چو مس
اے ببردہ رخت حس ہا سوئے غیب | دست چوں موسیٰ بروں آور زجیب
تو ز صد ینبوع شربت مے کشی | ہر چہ زاں صد کم شود کاہد خوشی
چوں بجوشید از دروں چشمہ سنی | زاجتذابِ چشمہ ہا گردی غنی!
قلعہ را چوں آب آید از بروں | در زمانِ امن باشد بر فزوں
چونکہ دشمن گرد آں حلقہ کند | تا کہ اندر خونِ شاں غرقہ کند
آب بیروں را ببرند آں سپاہ | تا نباشد قلعہ را زاں ہا پناہ
آں زماں یک چاہ شوری اندروں | بہ ز صد جیحونِ شیریں در بروں
علم کاں نبود ز ہو بے واسطہ | آں نپاید ہمچو رنگِ ماشطہ
ہمچو موسیٰ نور کے ماند زجیب | سخرۂ استاد و شاگردِ کتیب
خویش را صافی کن از اوصافِ خود | تا بہ بینی ذاتِ پاکِ صافِ خود
بینی اندر دل علومِ انبیاء | بے کتاب و بے معید و اوستا
بے صحیحین و احادیث و رواۃ | بلکہ اندر مشربِ آبِ حیات
رومیاں آں صوفیانند اے پسر | نے ز تکرار و کتاب و نے ہنر
لیک صیقل کردہ اند آں سینہ ہا | پاک از آز و حرص و بخل و کینہ ہا
آں صفائے آئینہ وصفِ دل ست | صورتِ بے منتہا را قابل ست
صورتے بے صورتے بے حد غیب | آئینہ دل راست در ضمنِ جیب
تا ابد ہر نقش نو کامد بر او | بے حجابی مے نماید رُو برو
پس بدانکہ چونکہ رستی از بدن | گوش و بینی چشم مے تاند شدن
راست گفت ست آں شہِ شیریں زباں | چشم گردد مو بموئے عارفاں
نور را با پیہ خود نسبت نبود | نسبتش بخشید خلاقِ ودود

علت دیدن بداں پیرا اے پسر — ورنہ خواب اندر نہ دیدی کس صور
پس چو آہن گرچہ تیرہ ہیکلی — صیقلی کن صیقلی کن صیقلی !
تا دلت آئینہ گردد پُر صُور — اندرو ہر سو ملیحے سیمبر!
آہن ارچہ تیرہ و بے نور بُود — صیقلی آں تیرگی از وے زدود
گر تنِ خاکی غلیظ و تیرہ است — صیقلش کن زانکہ صیقل گیرہ است
تا درو اشکال غیبی رو دہد — عکسِ حوری و ملک درو ے جہد
صیقل عقلت بداں دادہ است حق — کہ بداں روشن شود دل را ورق

وحدۃ الوجود

علمائے ظاہر کے نزدیک توحید کے یہ معنی ہیں کہ ایک خدا کے سوا کوئی اور خدا نہیں، نہ خدا کی ذات و صفات میں کوئی اور شریک ہے لیکن تصوف کے لغت میں اس لفظ کے معنی بدل جاتے ہیں۔ حضرات صوفیہ کے نزدیک توحید کے یہ معنی ہیں کہ خدا کے سوا اور کوئی چیز عالم میں موجود ہی نہیں یا یہ کہ جو کچھ موجود ہے سب خدا ہی ہے، اسی کو ہمہ اوست کہتے ہیں۔ یہ مسئلہ اگرچہ تصوف کا اصول موضوعہ ہے، لیکن اس کی تعبیر اس قدر نازک ہے کہ ذرا سا بھی انحراف ہو تو یہ مسئلہ بالکل اتحاد سے مل جاتا ہے، اس لیے ہم اس کو ذرا تفصیل سے لکھتے ہیں :

صوفیہ اور اہل ظاہر کا پہلا ما بہ الاختلاف یہ ہے کہ اہلِ ظاہر کے نزدیک خدا سلسلۂ کائنات سے بالکل الگ ایک جداگانہ ذات ہے۔ صوفیہ کے نزدیک خدا سلسلۂ کائنات سے الگ نہیں۔ اس قدر تمام صوفیہ کے نزدیک مسلّم ہے لیکن اس کی تعبیر میں اختلاف ہے۔ ایک فرقہ کے نزدیک خدا وجود مطلق اور ہستی مطلق کا نام ہے۔ یہ وجود جب تشخصات اور تعینات کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے تو ممکنات کے اقسام پیدا ہوتے ہیں۔

چو ہستِ مطلق آمد در عبارت — بہ لفظِ "من" کنند از وے اشارت

جس طرح حباب اور موج مختلف ذاتیں خیال کی جاتی ہیں، لیکن درحقیقت ان کا وجود بجز پانی کے اور کچھ نہیں۔

گفتم از وحدت و کثرت سخنے گوی بہ رمز — گفت موج و کف و گرداب ہما نا دریاست

یہ تشبیہ کسی قدر ناقص تھی کیونکہ حباب میں تنہا پانی نہیں بلکہ ہوا بھی ہے اس لیے ایک اور نکتہ داں نے اس فرق کو بھی مٹا دیا۔

با وحدتِ حق ز کثرتِ خلق چہ باک — صد جائے اگر گرہ زنی رشتہ یکیست

دھاگے میں جو گرہیں لگا دی جاتی ہیں، اُن کا وجود اگرچہ دھاگے سے متمایز نظر آتا ہے، لیکن فی الواقع دھاگے کے سوا گرہ کوئی زائد چیز نہیں، صرف صورت بدل دی گئی ہے۔ دوسرے فرقہ نے وحدت وجود کے یہ معنی قرار دیے ہیں، کہ مثلاً آدمی

کا جو سایہ پڑتا ہے، وہ اگرچہ بظاہر ایک جدا چیز معلوم ہوتا ہے، لیکن واقع میں اس کا کوئی وجود نہیں، جو کچھ ہے آدمی ہی ہے، اسی طرح اصل میں ذات باری موجود ہے۔ ممکنات جس قدر موجود ہیں، سب اسی کے اظلال اور پرتو ہیں، اس کو توحید شہودی کہتے ہیں وحدت وجود اور وحدت شہود میں یہ فرق ہے کہ وحدت وجود کے لحاظ سے ہر چیز کو خدا کہہ سکتے، جس طرح حباب اور موج کو پانی بھی کہہ سکتے، لیکن وحدت شہود میں یہ اطلاق جائز نہیں، کیونکہ انسان کے سایہ کو انسان نہیں کہہ سکتے۔ وحدت وجود کا مسئلہ بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے اور اہل ظاہر کے نزدیک تو اس کے قائل کا وہی صلہ ہے، جو منصور کو دار پر ملا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وحدت وجود کے بغیر چارہ نہیں۔ اس مسئلہ کے سمجھنے کے لیے پہلے مقدمات ذیل کو ذہن نشین کرنا چاہیے:-

۱ - خدا قدیم ہے۔

۲ - قدیم، حادث کی علت نہیں ہو سکتا، کیونکہ علت اور معلول کا وجود ایک ساتھ ہوتا ہے۔ اس لیے اگر علت قدیم ہو تو معلول بھی قدیم ہوگا۔ عالم حادث ہے۔

اب نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا، عالم کی علت نہیں ہو سکتا، کیوں کہ خدا قدیم ہے اور قدیم حادث کی علت نہیں ہو سکتا اور چونکہ عالم حادث ہے اس لیے اس کی بھی علت نہیں ہو سکتا۔

اس اعتراض سے بچنے کے لیے ارباب ظاہر نے یہ پہلو اختیار کیا ہے کہ خدا کا ارادہ یا اس ارادہ کا تعلق حادث ہے، اس لیے وہ عالم کی علت ہے۔ لیکن سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے ارادہ یا ارادہ کے تعلق کی علت کیا ہے؟ کیوں کہ جب ارادہ یا اس کا تعلق حادث ہے تو وہ علت کا محتاج ہوگا، اور وہ ضرور ہے کہ یہ علت بھی حادث ہو، کیوں کہ حادث کی علت حادث ہی ہوتی ہے اور چونکہ علت حادث ہے تو اس کے لیے بھی علت کی ضرورت ہوگی۔ اب یہ سلسلہ اگر الیٰ غیر النہایہ چلا جائے تو غیر متناہی کا وجود لازم آتا ہے، جس سے متکلمین اور ارباب ظاہر کو انکار ہے اور اگر کسی علت پر ختم ہو تو ضرور ہے کہ یہ علت قدیم ہے کیونکہ حادث ہوگی تو پھر سلسلہ آگے بڑھے گا، قدیم ہونے کی حالت میں حالت میں لازم آئے گا کہ قدیم حادث کی علت ہو اور یہ پہلے ہی باطل ثابت ہو چکا ہے۔ اس بناء پر تین صورتوں سے چارہ نہیں:

۱ - عالم قدیم اور ازلی ہے اور باوجود اس کے خدا کا پیدا کیا ہوا ہے، لیکن جب خدا بھی قدیم اور ازلی ہے تو ازلی چیزوں میں سے ایک کو علت اور دوسرے کو معلول کہنا ترجیح بلا مرجح ہے۔

۲ - عالم قدیم ہے اور کوئی اس کا خالق نہیں۔ یہ ملحدوں اور دہریوں کا مذہب ہے۔

۳ - عالم قدیم ہے، لیکن وہ ذات باری سے علیحدہ نہیں، بلکہ ذات باری ہی کے مظاہر کا نام عالم ہے۔ حضرات صوفیہ کا یہی مذہب ہے اور اس پر کوئی اعتراض لازم نہیں آتا۔ کیونکہ تمام مشکلات کی بنیاد اس پر ہے کہ عالم اور اس کا خالق دو جداگانہ چیزیں اور ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں۔ غرض فلسفہ کی رو سے تو صوفیہ مذہب کے بغیر چارہ نہیں۔ البتہ یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شریعت اور نصوص قرآنی اس کے خلاف ہیں، لیکن یہ شبہ بھی صحیح نہیں۔

قرآن مجید میں بکثرت اس قسم کی آیتیں موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ظاہر و باطن، اوّل و آخر جو کچھ ہے خدا ہی ہے۔ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ۔

مولانا وحدتِ وجود کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک تمام عالم اسی ہستی مطلق کی مختلف شکلیں اور صورتیں ہیں۔ اس بنا پر صرف ایک ذاتِ واحد موجود ہے اور تعداد جو محسوس ہوتا ہے، محض اعتباری ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

گر ہزاراں اندیک کس بیش نیست	جز خیالاتِ عدد اندیش نیست
بحر وحدانیست جفت و زوج نیست	گوہر و ماہیش غیر موج نیست
نیست اندر بحر، شرک ہیچ ہیچ!	لیک با احوال چہ گویم ہیچ، ہیچ
اصل بیند، دیدہ چوں اکمل بود	دو ہمے بیند چو مرا احول بود
چونکہ جفتِ احولانیم اے صنم شمن	لازم آید مشرکانہ دم زدن
ایں دوئی اوصاف دید احول ست	ورنہ اوّل آخر، آخر اوّل ست
کل شیءٍ ما خلا اللہ باطل	انّ فضل اللہ غیم ہاطل

وحدتِ وجود کی صورت میں بھی یہ امر بحث طلب رہتا ہے کہ ذاتِ باری اور مظاہر کائنات میں کس قسم کی نسبت ہے۔ مولانا کی یہ رائے ہے کہ ذاتِ باری کو ممکنات کے ساتھ جو خاص نسبت اور تعلق ہے، وہ قیاس اور عقل میں نہیں آسکتا، نہ کیف و کم کے ذریعہ سے بیان کیا جا سکتا ہے:

اتصالے بے تکیف بے قیاس	ہست ربّ النّاس را با جانِ ناس

مولانا فرماتے ہیں کہ اس قدر مسلّم ہے کہ جان کو جسم سے، بصارت کو روشنی سے، خوشی کو دل سے، غم کو جگر سے، خوشبو کو شامّہ سے، گویائی کو زبان سے، ہوا پرستی کو نفس سے، شجاعت کو دل سے ایک خاص تعلق ہے، لیکن یہ تعلق بیچوں و بیچگوں ہے۔ اسی طرح خدا کو ممکنات سے جو نسبت ہے وہ کیف اور کم سے بری ہے:

آخر ایں جاں با بدن پیوستہ است	ہیچ ایں جاں با بدن مانستہ است
تابِ نورِ چشم با پیہ است جفت	نورِ دل در قطرۂ خونی نہفت
رائحہ در انف منطق در لساں	لہو در نفس و شجاعت در جناں
شادی اندر گردہ و غم در جگر	عقل چوں شمعے درونِ مغز سر
ایں تعلقہا نہ بے کیف است چوں	عقلہا در دانش چونے زبوں

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

قرب بے چون ست عقلت را بہ تو	نیست از پیش و پس و سفل و علو

نیست آں جنبش کہ در اصبع تراست　　پیش اصبع یا پسش یا چپ و راست
وقت خواب و مرگ از وے مے رود　　وقت بیداری قرینش مے شود
نور چشم و مردمک در دیدہ است　　از چہ راہ آید بغیر شش جہت

تشبیہات کے بعد کہتے ہیں:

بے تعلق نیست مخلوقے بہ او　　آں تعلق ہست بیچوں اے عمو
زانکہ فصل و وصل نبود در میاں　　غیر فصل و وصل نندیشد گماں
ایں تعلق را خرد چوں رہ برد　　بستۂ فصل ست و وصل ست ایں خرد
بے جہت داں عالم امر و صفات　　عالم خلق ست جس با وجہات
بے جہت داں عالم امر اے صنم　　بے جہت تر باشد آمر لاجرم
جاں بتو نزدیک و تو دوری ازو　　قرب حق را چوں بدانی اے عمو
آنکہ حق ست اقرب از حبل الورید　　تو فگندی تیر فکرت را بعید

نکتہ: مولانا نے عوام کو سمجھانے کے لیے جو تشبیہ دی، آج یورپ کے بڑے بڑے حکما کا وہی مذہب ہے۔ حکمائے یورپ کہتے ہیں کہ عالم میں تین چیزیں محسوس ہوتی ہیں، مادہ، قوت اور عقل (وزڈم) یہ عقل تمام اشیا میں اسی طرح جاری و ساری ہے جس طرح انسان کے بدن میں جان اسی عقل کا اثر ہے کہ تمام سلسلۂ کائنات میں ترتیب اور نظام پایا جاتا ہے۔ غرض تمام عالم ایک شخصِ واحد ہے اور اس شخصِ واحد میں جو عقل ہے، وہی خدا ہے، جس طرح انسان باوجود متعدد الاعضا ہونے کے ایک شخص واحد خیال کیا جاتا ہے، اسی طرح عالم باوجود ظاہری تعداد اور تکثر کے شے واحد ہے اور جس طرح انسان میں ایک ہی عقل ہے اسی طرح تمام عالم کی ایک عقل ہے اور اسی کو خدا کہتے ہیں۔

<u>فلسفہ و سائنس</u> | اگرچہ علم کلام، تصوف، اخلاق سب فلسفہ میں داخل ہیں اور اس لحاظ سے مثنوی تمام تر فلسفہ ہے۔ لیکن چونکہ علم اخلاق نے ایک مستقل حیثیت قائم کر لی ہے اور علم کلام و تصوف مذہب کے دائرہ میں آگئے ہیں، اس لیے فلسفہ کے عام اطلاق سے یہ علوم متبادر نہیں ہو سکتے۔ اس بنا پر فلسفہ سے فلسفہ کی دو شاخیں مراد ہیں جو علوم مذکورہ سے خارج ہیں۔

مولانا کے اگرچہ مثنوی میں فلسفہ کے مسائل کا بیان کرنا پیش نظر نہ تھا، لیکن ان کا دماغ اس قدر فلسفیانہ واقع ہوا تھا کہ بلاقصد فلسفیانہ مسائل ان کی زبان سے ادا ہوتے جاتے ہیں۔ وہ معمولی بات بھی کہنا چاہتے ہیں تو فلسفیانہ نکتوں کے بغیر نہیں کہہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کوئی مختصر سی حکایت شروع کرتے ہیں تو جزئیات میں جاکر ختم ہوتی ہے۔ ہم اس موقع پر فلسفہ اور سائنس کے چند مسائل درج کرتے ہیں جو ضمناً اور تبعاً مثنوی میں بیان کیے گئے ہیں۔

تجاذب اجسام یعنی یہ کہ تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی جانب کھینچ رہے ہیں اور اسی کشش کے مقابلۂ باہمی سے تمام سیارے اور اجسام اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ اس مسئلہ کی نسبت تمام یورپ بلکہ تمام دنیا کا خیال ہے کہ نیوٹن کی ایجاد ہے، لیکن لوگوں کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ سینکڑوں برس پہلے یہ خیال مولانا روم نے ظاہر کیا تھا، چنانچہ فرماتے ہیں:

جملہ اجزائے جہاں زاں حکم پیش — جفت جفت و عاشقان جفت خویش
ہست ہر جزوے بعالم جفت خواہ — راست ہمچوں کہربا و برگ کاہ
آسماں گوید زمیں را مرحبا — با توام چوں آہن و آہن رُبا

اسی بنا پر زمین کے معلق رہنے کی وجہ ایک حکیم کی زبان سے اس طرح بیان کی ہے:

گفت سائل چوں بماند ایں خاکداں — درمیان ایں محیطِ آسماں
ہمچو قندیلے معلق در ہوا — نے بر اسفل می رود نے بر علا
آں حکیمش گفت کز جذبِ سما — از جہاتِ شش بماند اندر ہوا
چوں ز مقناطیس قبہ ریختہ — درمیاں ماند آہنے آویختہ

یعنی چونکہ اجرام فلکی ہر طرف سے کشش کر رہے ہیں، اس لیے زمین بیچ میں معلق ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے اگر مقناطیس کا ایک گنبد بنایا جائے اور لوہے کا کوئی ٹکڑا اس طرح ٹھیک وسط میں رکھا جائے کہ ہر طرف سے مقناطیس کی کشش برابر پڑے تو لوہا ادھر ہی لٹکا رہ جائے گا، یہی حالت زمین کی ہے۔

تجاذب ذرّات تحقیقاتِ جدیدہ کی رُو سے یہ ثابت ہوا ہے کہ جسم کی ترکیب نہایت چھوٹے ذرّات سے ہے، جن کو جزء دیمقراطیسی کہتے ہیں۔ ان ذرّات میں بھی باہم کشش ہے، لیکن کشش کے مدارج یکساں نہیں، بلکہ بعض ذرّات نہایت شدّت سے کشش کرتے ہیں۔ اس لیے ان میں نہایت اتصال ہوتا ہے اور اسی قسم کے اتصالِ ذرّات کو عام محاورہ میں ٹھوس کہتے ہیں۔ مثلاً لوہا بہ نسبت لکڑی کے زیادہ ٹھوس ہے کیوں کہ ایسے ذرّات سے مرکب ہے جن میں باہمی کشش نہایت قوی ہے۔ لکڑی کے ذرّات میں یہ کشش کم ہے۔ بعض چیزوں میں یہ کشش اور بھی کم ہوتی ہے اور اس بنا پر وہ بہت جلد ٹوٹ یا پھٹ سکتی ہیں۔ تخلخل اور تکاثف کے معنی بھی یہی ہیں، یعنی اجزا کے اتصال کا کم اور زیادہ ہونا۔

تجاذبِ ذرّات کے مسئلہ کو بھی نہایت صراحت کے ساتھ مولانا نے بیان کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

میل ہر جزئی بہ جزئی مے نہد — ز اتحادِ ہر دو تولید جہد
ہر یکے خواہاں دگر را ہمچو خویش — از پئے تکمیل فعل و کار خویش
دور گردوں را ز موج عشق داں — گر نبودے عشق بفسردے جہاں
کے جمادی محو گشتے در نبات — کے فدائے روح گشتے نامیات

ہر یکے بر جا فسردہ ہمچو سنگ ! کے بدے پران و جویاں چوں ملخ !

ان اشعار میں مولانا نے جذب کو عشق کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور یہ صوفیانہ اصطلاح ہے۔ ان اشعار میں مولانا نے بیان کیا ہے کہ نباتات جن اجزا سے پرورش پاتے ہیں، وہ جمادی اجزا ہیں لیکن چونکہ ان میں نباتی اجزا میں باہمی کشش اور تجاذب ہے اس لیے وہ اجزا نبات بن جاتے ہیں۔ اسی طرح نباتی اجزا حیوانی اجزا بن جاتے ہیں۔ اگر یہ کشش اور تجاذب نہ ہوتا تو ہر جزو اپنی جگہ جم کر رہ جاتا اور یہ مرکبات ظہور میں نہ آتے۔

تجدد امثال تحقیقات جدیدہ سے ثابت ہوا ہے کہ جسم کے اجزا نہایت جلد فنا ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے اجزا آتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایک مدت کے بعد انسان کے جسم میں سابق کا ایک ذرہ بھی باقی نہیں رہتا بلکہ بالکل ایک نیا جسم پیدا ہو جاتا ہے لیکن چونکہ فوراً پرانے اجزا کی جگہ نئے اجزا قائم ہو جاتے ہیں اس لیے کسی وقت جسم کا فنا ہونا محسوس نہیں ہوتا۔

مولانا نے اس مسئلہ کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے :

پس ترا ہر لحظہ مرگ و رجعتے ست	مصطفےٰ فرمود دنیا ساعتے ست
ہر نفس نو مے شود دنیا و ما	بے خبر از نو شدن اندر بقا
عمر ہمچوں جوئے نو نو مے رسد	مستمرے مے نماید در جسد
آں ز تیزی مستمر شکل آمدہ ست	چوں شرر کش تیز جنبانی بدست
شاخ آتش را بہ جنبانی بساز	در نظر آتش نماید بس دراز

مولانا بحرالعلوم ان اشعار کی شرح میں لکھتے ہیں :

"بیان ہست مرمسئلہ تجدد امثال را و آں ایں است کہ صور ہمہ کائنات در ہر آں تبدیل می شود کہ در ہر آں صورتے معدوم می شود و صورتے اخری در آں موجود می شود با وحدت عین و ایں نیست کہ یک صورت باقی باشد و رود آں را لیکن چونکہ صورت زائلہ شبیہہ صورت حادثہ است۔ حس ایں متبدل را نمی یابد و گماں می شود کہ ہمہ صورت مستمرہ است۔"

مسئلہ ارتقا موجودات عالم کی تقسیم چار قسموں میں کی گئی ہے: جمادات، نباتات، حیوانات، انسان۔ لیکن ان کے مبدء آفرینش کے متعلق حکماء میں اختلاف رائے ہے۔ عام رائے یہ ہے کہ یہ چاروں اپنے وجود میں مستقل ہیں، یعنی فطرت نے ان کو ابتدا ہی سے اسی صورت میں پیدا کیا۔ دوسرے فریق کا خیال ہے کہ اصل میں صرف ایک چیز تھی، وہی ترقی کرتے کرتے اخیر درجہ یعنی انسان تک پہنچی انسان پہلے جماد تھا، پھر نبات، پھر حیوان، پھر انسان۔ یہ سلسلہ ارتقا خود انواع کے ماتحت انواع میں بھی جاری ہے۔ مثلاً فاختہ، قمری، کبوتر جداگانہ نوعیں نہیں ہیں، بلکہ اصل میں ایک ہی پرندہ تھا، جو خارجی اسباب سے مختلف صورتیں بدلتا گیا اور صورت کے انقلاب کے ساتھ سیرت بھی بدلتی گئی۔ اس مسئلے کا موجد ڈارون خیال کیا جاتا ہے اور درحقیقت ڈارون نے جس تفصیل اور تدقیق سے اس مسئلہ کو ثابت کیا اس کے لحاظ سے وہی اس مسئلہ کا موجد کہا جا سکتا ہے۔ مولانا نے اس مسئلہ کو اشعار ذیل میں بصراحت لکھا ہے :

آمدہ اوّل بہ اقلیم جماد — وز جمادی در نباتی او فتاد

سالہا اندر نباتی عمر کرد — وز جمادی یاد ناورد از نبرد

وز نباتی چوں بہ حیواں او فتاد — نامدش حال نباتی ہیچ یاد

جز ہماں میلے کہ دارد سوئے آں — خاصہ در وقتِ بہار ضیمراں

ہمچو میلِ کودکاں با مادراں — سرّ میل خود نداند در لباں

ہمچنیں اقلیم تا اقلیم رفت — تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت

مولانا کے چند چیدہ چیدہ اقوال حسب ذیل ہیں :

——— اگرچہ بجلی نور نظر آتی ہے، مگر خاصیت کے لحاظ سے بینائی کی چور ہے -

——— دانا کی زیارت عبادت ہے جس سے نیک بختی کے دروازے کھلتے ہیں -

——— بہت سے ابلیس انسان کی صورت پر ہیں، لہذا ہر ایک کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہ دو -

——— اگر ہماری جان یادِ خدا میں بیدار نہیں تو یہ بیداری ہمارے لیے قید خانہ ہے -

——— جس میں بُو سونگھنے کی طاقت نہیں وہ ناک کے بغیر ہے اور بُو وہ بُو ہے جو مذہبی ہو -

——— ساری کائنات ایک ہی ذات ہے جسے دو نظر آتی ہیں وہ بھینگا ہے -

——— جب بڑوں کی قسمت میں درد و رنج ہے تو چھوٹے چین کیسے پا سکتے ہیں؟

——— سورج جو آگ کی طرح دہکتا نکلتا ہے، دوسری گھڑی ڈھلنے لگتا ہے -

——— اہل علم کا علم انھیں اٹھاتا ہے اور اہل تن کے علوم ان کے لیے بوجھ ہیں -

——— اگر تیری تعریف کرنے والا تیری ہجو کہے تو کئی دن تک تیرا دل اس سے جلتا رہے -

——— جب قضا آتی ہے تو عقل و فہم چلا جاتا ہے - خدا کے سوا قضا کو کوئی نہیں جانتا -

——— درویشی کا کام تیری سمجھ سے بالا ہے، تو فقیروں کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھ -

——— فقر کا دو ایک دن کے لیے امتحان کر تاکہ تو اس میں دگنی بے نیازی دیکھے -

——— کمینہ آدمی بڑا دشمن ہوتا ہے اور ہر دکان کا گاہک بن جاتا ہے -

——— اے پیاری عمر! ہم غذا میں مٹی کھاتے رہے، سو آخر کار ہمیں مٹی نے کھالیا -

——— جب تو بھوکا ہوتا ہے تو کتا بن جاتا ہے اور تند مزاج اور بُرے کے ساتھ مل کر بدخصلت بن جاتا ہے -

——— جب تو سیر ہوتا ہے تو مردار بن جاتا ہے اور دیوار کی تصویر کی طرح بے خبر رہ جاتا ہے -

——— اگر تو راستہ نہیں جانتا تو جو کچھ تیرا نفس کہتا ہے اس کا الٹ کر کیونکہ وہی سیدھا راستہ ہے -

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ

ولادت ——————— ملتان ۶۱۱ھ[1]

وفات ——————— ملتان ۶۸۶ھ

شیخ صدرالدین عارفؒ خطۂ ملتان کے اکابر اولیا میں سے ہیں۔ شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کے فرزند ارجمند اور انھیں کے تربیت یافتہ ہیں۔ اپنے زمانے کے سرحلقۂ اولیا سمجھے جاتے تھے۔ جب کلام پاک پڑھتے یا ختم کرتے تو معرفت کے نئے نئے اسرار و رموز ان پر عیاں ہوتے، اسی لیے "عارف" کے لقب سے مشہور ہوئے۔

والد کی وفات پر لاکھوں روپے ترکے میں ملے مگر سب کے سب راہِ خدا میں خرچ کر دیے اور پھوٹی کوڑی تک پاس نہ رکھی۔ اس کے باوجود بہت روپیہ آتا تھا، مگر جود و سخا کا یہ عالم تھا کہ سب فقرا و مساکین میں تقسیم کر دیتے۔ کسی نے کہا آپ کے والد بزرگوار کے خزانے تو ہر وقت بھرے رہتے تھے اور وہ ان سے دنیوی فائدے بھی اٹھاتے تھے، مگر آپ کا عمل ان کے برعکس ہے۔ فرمایا "والد بزرگوار دنیا پر غالب تھے اس لیے دنیوی مال و دولت انھیں غلط راہ پر نہ ڈال سکتی تھی مگر میں دولت سے ڈرتا ہوں، اس لیے اپنے پاس کچھ نہیں رکھتا۔"

اپنے والد بزرگوار کے مسلک پر چل کر نعمت باطنی سے مالامال ہوئے۔ نہ صرف خود درجۂ کمال کو پہنچے بلکہ کئی دوسروں کو بھی علم و عرفان کی منزلیں طے کرائیں۔ شیخ جمال خنداں جیسے عظیم بزرگ جو اگرچہ شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کے مرید تھے، مگر انھوں نے شیخ صدرالدین کے کمالات باطن سے فیض حاصل کیا۔ ان کا مزار مبارک اچھ میں ہے۔ آپ کے مریدوں میں ایک بزرگ شیخ محمد معشوق گزرے ہیں جنھیں شیخ احمد بن محمد قندھاری بھی کہتے ہیں۔ وہ بڑے تاجر تھے، عیش پسند تھے۔ آپ کی نظرِ عنایت اور تربیت کا نتیجہ تھا کہ وہ تربیت باطنی کی طرف متوجہ ہوئے اور کمال کو پہنچے۔

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے خوارق و کرامات کی بہت سی حکایتیں مشہور ہیں، ان میں سے ایک واقعہ غور طلب ہے:

بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنے بڑے لڑکے شہزادہ محمد سلطان کو مغلوں کی یورش روکنے کے لیے ملتان بھیجا۔ شہزادہ کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی، جو سلطان رکن الدین ابراہیم ابن شمس الدین التمش کی لڑکی تھی۔ یہ شہزادی اپنی نیکی، حیا اور حسن کے لیے مشہور تھی، مگر شہزادے کی شراب خوری اور بدمستی سے عاجز تھی۔ ملتان پہنچ کر ایک روز شہزادہ نے شراب کے نشے میں بیوی کو طلاق

---

[1] سن ولادت میں اختلاف ہے۔ اخبار الصالحین میں یہ سن ۶۱۱ھ تحریر ہے مگر بعض دوسری کتابوں میں ۶۴۱ھ بتایا گیا ہے۔

دے دی اور اس سے علیحدگی اختیار کرلی۔ مگر شہزادے بعد بیوی کی مفارقت گوارا نہ ہوئی اور علما کو جمع کرکے مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ شہزادی اس کی زوجیت میں اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک کہ حلالہ نہ کرے۔ شہزادے کی تنک مزاجی اور حمیت نے اس کو گوارا نہ کیا اور وہ غصہ میں اٹھ کر خلوت میں چلا گیا اور قاضی امیر الدین خوارزمی کو بلا کر کہا کہ باپ کے غیظ و غضب اور دوزخ کے عذاب سے ڈرتا ہوں لیکن اس کی (یعنی شہزادی) کی مفارقت اور دوری بھی گوارا نہیں ہے۔ قاضی امیر الدین خوارزمی نے رائے دی کہ شیخ صدر الدین عارف نیک اور اچھے بزرگ ہیں پوشیدہ طور پر ان سے شہزادی کا نکاح کرکے طلاق دلا دی جائے۔ شہزادہ اس پر راضی ہو گیا اور حضرت شیخ صدر الدین عارف سے شہزادی کا نکاح کر دیا گیا۔ جب نکاح ہو چکا تو شہزادی نے حضرت شیخ صدر الدین عارف کے پاؤں پر گر کر کہا کہ اگر آپ مجھ کو پھر اس ظالم اور فاسق کے حوالہ کر دیں گے تو قیامت کے روز آپ کی دامن گیر ہوں گی۔ شیخ صدر الدین عارف کو اس کی عجز و زاری پر رحم آگیا اور انھوں نے شہزادی کو طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ شہزادہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی اور اس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ دوسرے دن شیخ کے گھر کو خون سے رنگین کر دیا جائے۔ شیخ کو اس حکم کی خبر دی گئی تو ان میں کوئی تغیر نہ ہوا اور وہ ارادہ پر قائم رہے۔ اسی دوران میں اچانک مغل حملہ آور ہو گئے۔ شہزادہ کی فوج پسپا ہوئی اور وہ خود ان کے ہاتھوں قتل ہوا۔

"فرشتہ نے اس واقعہ کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے، مگر تعجب ہے کہ فرشتہ نے اس روایت کو صحیح سمجھ کر اپنی تاریخ میں کس طرح قلمبند کیا۔ اس نے سلطان غیاث الدین بلبن کے ذکر میں شہزادہ محمد سلطان کے اخلاق حسنہ اور اوصاف حمیدہ کی جو تصویر کھینچی ہے، اس سے روایت کی تکذیب ہوتی ہے۔

فرشتہ لکھتا ہے:

"بلبن کے فرزندوں میں سب سے بہتر اور افضل شہزادہ محمد سلطان خاں شہید ہے۔ یہ شہزادہ سلطان غیاث الدین بلبن کا بڑا پیارا اور محبوب ترین فرزند تھا۔ تمام عمدہ صفتیں اور پسندیدہ عادتیں جو ایک شہزادہ میں ہونی چاہئیں، سب حق سبحانہ و تعالیٰ نے اس کو مرحمت کی تھیں۔ یہ شہزادہ اپنی فضیلت، دانش اور ہنرمندی میں بے مثل تھا۔ اس کی مجلس ہمیشہ بڑے بڑے فاضلوں اور شاعروں سے آراستہ رہتی تھی، اور وہ ان کو ہر طرح کی عنایتوں اور مہربانیوں سے سرفراز کرتا رہتا تھا۔ زمانہ اس کے جود و کرم کی وجہ سے بہار اور چمن بنا ہوا تھا اور اس کی (یعنی زمانہ کی) جیب اور دامن نسرین اور نسترن سے پُر تھا۔ امیر خسرو اور خواجہ حسن جیسے لوگ ملتان میں اس کے ندیم خاص رہے۔ وہ دوسرے درباریوں سے زیادہ ان دونوں کی عزت کرتا تھا اور ان کی نظم و نثر سے محظوظ ہوا ہوتا۔ وہ اس قدر مہذب اور شائستہ تھا کہ اگر کسی مجلس میں تمام دن اور رات بیٹھنا پڑتا تو بھی اپنا زانو اونچا نہ کرتا تھا۔ قسم کے وقت صرف حقا کا لفظ اس کی زبان پر ہوتا۔ شراب کی مجلس اور غفلت و بدمستی میں اس کی زبان سے کوئی نامناسب لفظ نہ نکلتا۔

اس کی خوشگوار علمی مجلس میں شاہنامہ، دیوان خاقانی، انوری، خمسۂ نظامی اور امیر خسرو کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔

ارباب فہم و دانش اس کی شعر فہمی کے معترف تھے۔ امیر خسرو فرماتے تھے کہ میں نے سخن فہمی، باریک بینی، ذوق صحیح اور متقدمین اور متاخرین کے اشعار کی یادداشت میں سلطان محمد جیسا کسی کو نہ پایا۔ اس کے پاس ایک بیاض تھی جس میں مشہور شعراء کے منتخب اشعار خوشخط منقول تھے۔ امیر خسرو اور خواجہ حسن کے اشعار کے انتخاب کی خوبی اور اس کی شہادت کے بعد سلطان غیاث الدین بلبن نے یہ بیاض امیر علی جامدار کو دی جس کے بعد امیر خسرو کو ملی۔ اس زمانہ کے تمام شعراء نے اس بیاض کو دیکھا، منتخب اشعار کو اپنی اپنی بیاض میں نقل کیا اور اس نوجوان شہزادہ کی وفات پر رنجیدہ ہوئے۔ جس زمانہ میں سلطان محمد ملتان میں مقیم تھا، شیخ عثمان ترمذی جو اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ وہاں تشریف لائے۔ انہوں نے ان کی بڑی تعظیم اور خاطرداری کی۔ ان کی خدمت میں نذرانہ اور ہدیہ پیش کیا۔ بہت اصرار کیا کہ وہ ملتان میں قیام فرمائیں اور ان کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کرائی جائے اور اس کے مصارف کے لیے گاؤں وقف کیے جائیں۔ مگر شیخ عثمان ترمذی نے اس کو قبول نہ کیا اور وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔ ایک روز شیخ عثمان اور شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے صاحبزادے شیخ صدرالدین شہزادہ کی مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ مجلس میں عربی اشعار پڑھے جاتے تھے کسی شعر کو سُن کر ان بزرگوں اور مجلس کے تمام درویشوں پر وجد طاری ہو گیا اور وہ رقص کرنے لگے۔ محمد خاں سلطان شہید ان کے سامنے دست بستہ کھڑا رہا، اور برابر زار و قطار روتا رہا۔ اگر کوئی شخص اس کی مجلس میں کوئی نصیحت آمیز شعر پڑھتا تو وہ دنیا کو دل سے بھلا کر اس کو بڑے شوق سے سنتا اور اس پر رقّت طاری ہو جاتی"

فرشتہ کے مندرجہ بالا بیان کی لفظ بہ لفظ تصدیق مولانا ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی سے بھی ہوتی ہے، جو بلبن کے عہد کی سب سے زیادہ معتبر اور مستند تاریخ ہے۔ مولانا ضیاء الدین برنی نے شہزادہ محمد سلطان کی بیوی کے طلاق اور پھر شیخ صدرالدین سے نکاح کا ذکر مطلق نہیں کیا ہے بلکہ وہ شہزادہ کے ان تمام محاسن و اوصاف کو لکھ کر جن کا فرشتہ نے ذکر کیا ہے ان الفاظ میں شہزادہ کی وفات کا ماتم کرتے ہیں:

"میں نے بارہا امیر خسرو اور امیر حسن کو حسرت اور افسوس کے ساتھ کہتے سُنا کہ اگر ہم لوگوں اور دوسرے ارباب ہنر کی قسمت یاور ہوتی تو خان شہید زندہ رہتا اور بلبنی تخت پر متمکن ہوتا اور ہم اور تمام ارباب روپیوں میں غرق ہو جاتے لیکن ارباب فضل و کمال کی قسمت کھوٹی تھی۔ زمانہ نے ان کی طرف کبھی انصاف کی آنکھوں سے نہیں دیکھا اور نہ کبھی ان کو صاحب دولت و استطاعت دیکھ سکتا ہے۔ غدار اور سفلہ نواز فلک میں اتنی طاقت کہاں سے ہو سکتی تھی کہ ایک مہربان، ہنر شناس اور ہنر پرور بادشاہ کو شاہی تخت پر بیٹھنے دیتا اور ارباب ہنر کو فروغ ہوتا۔ فلک کے کام میں یہی شتر گربگی ہے کہ زمانہ کی بے نظیر و عدیم المثال شخصیتوں کو حاجت مند اور ضرورت مند بنائے رکھتا ہے اور گمنام اور ناکام لوگوں کو جن کے حلق میں گندہ پانی اور ناپاک چیزیں ہونی چاہئیں، ہزار ناز و نعمت

کے ساتھ پرورش کرتا ہے۔ ریچھ اور سور کو تو مرصع اور مکلل اور عندلیب و بلبل کو قفس میں ذلت کے ساتھ مہجور و محبوس اور مایوس رکھتا ہے۔"

خود امیر خسرو شہزادہ محمد سلطان کے ساتھ مغلوں کی مہم میں تھے اور شہزادہ کی شہادت کے بعد مغلوں کے ہاتھوں گرفتار ہوکر محبوس بھی رہے۔ شہزادہ کی شہادت پر ایک خونچکاں مرثیہ بھی کہا ہے مگر کہیں اس کی بیوی کے طلاق و نکاح کا ذکر نہیں کیا ہے۔ میر حسن نے بھی نثر میں شہزادہ کی وفات حسرت آیات پر آنسو بہائے ہیں، مگر اس میں بھی شہزادہ کی بیوی کے حلالہ کا کہیں ذکر نہیں۔ امیر خسرو اور امیر حسن کے مراثی و ماتم نامے اس قدر مقبول ہوئے کہ لوگ شہزادہ کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے ان کو برابر اپنے مطالعہ میں رکھتے تھے چنانچہ تیموری دور کے مؤرخ ملا عبدالقادر بدایونی نے میر حسن اور امیر خسرو کے مراثی کو اپنی منتخب التواریخ میں ۴۲ صفحوں میں نقل کیا ہے۔ مگر شہزادہ محمد سلطان، اور شیخ صدرالدین کی کشیدگی، ناگواری کا کہیں اشارہ بھی نہیں ہے۔ البتہ طبقات اکبری میں اس واقعہ کا کچھ ذکر ہے، مگر مؤلف کو خود اس کی صحت میں شک ہے، اس لیے اس روایت کی ابتدا "گویند" سے کی ہے۔ یعنی یہ کہ عوام کی روایت ہے۔ راقم السطور کی بھی یہی رائے ہے کہ یہ واقعہ محض عقیدت مند عوام کی روایت ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

حضرت شیخ صدرالدین کی کیمیا اثر صحبت اور تربیت سے بہت سے ارباب کمال پیدا ہوئے، جو مختلف مقامات میں مخلوق خدا کے ظاہری و باطنی اخلاق کو آراستہ کرنے میں مشغول تھے۔ شیخ جمال خنداں ان سے تربیت پانے کے بعد اوچھ میں قیام پذیر ہوئے اور وہاں کی مخلوق کو فیضیاب کرنے کے بعد اسی سرزمین میں آسودۂ خواب ہیں۔ ایک دوسرے خلیفہ شیخ حسام الدین ملتانی کو بدایوں میں رہنے کا حکم ملا تھا۔ چنانچہ وہ آخر وقت تک یہیں رہے اور یہیں ان کا مزار ہے۔ ایک اور خلیفہ مولانا علاء الدین خجندی حضرت شیخ صدرالدین کی خدمت میں چودہ سال تک رہے۔ ان کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ روز دو مرتبہ کلام پاک ختم کرتے تھے۔ ان کے مرشد ان کو محبوب اللہ کہا کرتے تھے۔ ان خلفا میں سے شیخ احمد بن قندھاری المعروف بہ شیخ احمد معشوق پر سب سے زیادہ جذب و سکر کی کیفیت طاری رہتی۔ اس کوچہ میں آنے سے پہلے وہ گھوڑوں اور دوسری چیزوں کے تاجر تھے۔ دولت کی فراوانی کی وجہ سے عیش و عشرت میں مشغول رہتے تھے۔ محفل نشاط میں شراب سے بھی شغل کرتے تھے۔ ایک مرتبہ تجارت کے سلسلہ میں قندھار سے ملتان آئے تو حضرت شیخ صدرالدین عارف کی زیارت کے لیے بھی حاضر ہوئے۔ شیخ نے اپنا جھوٹا ایک لقمہ ان کو کھانے کو دیا۔ اس کو کھاتے ہی ان پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ اسی وقت تجارت کا سارا سامان فقرا و مساکین میں تقسیم کردیا اور مرشد کی خانقاہ میں خلوت نشین ہوگئے اور سات سال تک تربیت پاتے رہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں فوائد الفواد میں فرماتے ہیں کہ:

"ایک بار جاڑے کے جاڑے میں آدھی رات کو وہ باہر آئے اور پاس ہی بہتے ہوئے پانی میں جا کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے کہ الٰہی میں اس وقت تک اس جگہ سے باہر نہ نکلوں گا جب تک مجھ کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ میں کیا ہوں۔ ان کے کان میں آواز آئی کہ تم وہ ہو کہ تمھاری وجہ سے قیامت کے روز بہت سے لوگ دوزخ سے محفوظ رہیں گے۔ شیخ احمد نے کہا صرف اس بات پر اکتفا نہیں کرسکتا ہوں۔ پھر آواز سنی کہ تم وہ ہو کہ قیامت کے روز تمھاری

عنایت کی وجہ سے لوگ بہشت میں جائیں گے۔ شیخ احمد نے کہا کہ اس سے بھی تسلی نہیں ہوئی، میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میں کیا ہوں۔ آواز آئی ہم نے حکم کر دیا ہے کہ سارے درویش اور عارف ہمارے عاشق ہوں مگر تم ہمارے معشوق ہو۔ یہ سُن کر خواجہ احمد پانی سے نکل کر شہر کی طرف گئے۔ راستہ میں جو شخص ان سے ملتا" السلام علیکم یا شیخ احمد معشوق" کہتا۔

فوائد الفواد میں ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ بالا واقعہ بیان کرکے زار و قطار رونے لگے۔ کسی نے اس مجلس میں کہا کہ شیخ احمد نماز نہیں پڑھتے تھے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ہاں جب ان سے کہا جاتا کہ وہ نماز کیوں نہیں پڑھتے، تو کہتے تھے کہ نماز پڑھوں گا مگر سورہ فاتحہ نہیں پڑھوں گا۔ اس پر اعتراض ہوتا کہ یہ نماز درست نہ ہوگی اور جب ان سے اصرار کیا جاتا تو کہتے کہ سورہ فاتحہ پڑھوں گا مگر اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کو چھوڑ دوں گا۔ پھر ان سے کہا جاتا کہ اس آیت کو بھی پڑھنا ہوگا۔ اس رد و قدح کے بعد وہ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے مگر سورہ فاتحہ پڑھتے وقت جب مذکورہ بالا آیت زبان سے نکالتے تو ان کے ہر بُن مُو سے خون جاری ہو جاتا، وہ نماز توڑ دیتے اور حاضرین کو مخاطب کر کے کہتے کہ ایسی حالت میں نماز کیسے جائز ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

حضرت شیخ صدر الدین نے ان روحانی یادگاروں کے علاوہ ایک علمی یادگار کنوز الفوائد بھی چھوڑی ہے۔ یہ ان کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو ان کے ایک مرید خواجہ ضیاء الدین نے مرتب کیا تھا۔ راقم السطور کی نظر سے یہ کتاب نہیں گزری مگر اخبار الاخیار میں اس کے طویل اقتباسات ہیں۔ ان اقتباسات کی مدد سے ہم شیخ صدر الدینؒ کی صوفیانہ تعلیمات کا خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں:

فرماتے تھے کہ حدیث قدسی میں ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ حِصْنِیْ فَمَنْ دَخَلَهٗ اَمِنَ عَذَابِیْ یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہے کہ لا الہ الا اللہ میرا قلعہ (حصن) ہے۔ جو کوئی اس کے اندر داخل ہوا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا۔ اس قلعہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قلعہ کی تین قسمیں ہیں: ظاہر، باطن اور حقیقت۔ حصن ظاہر یہ ہے کہ بندہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ خوفزدہ ہو اور نہ کسی سے کوئی اُمید رکھے۔ اگر تمام دنیا کے لوگ اس کے دشمن ہو جائیں تو اس سے خوش نہ ہو، کیونکہ خداوند تعالیٰ کے حکم کے بغیر نفع و ضرر اور خیر و شر کا ظہور نہیں ہوتا۔ حصن باطن یہ ہے کہ یقین ہو کہ موت سے پہلے جو کچھ بھی پیش آتا ہے وہ بالکل عارضی اور آنی و فانی ہے اور دنیا کی کسی چیز کو ثبات نہیں اس لیے اس کے وجود کی ہستی نیستی قابلِ التفات نہیں۔ حصن حقیقت یہ ہے کہ دل میں نہ بہشت کی آرزو ہو اور نہ دوزخ کا خوف ہو۔ صرف اللہ ہی اللہ ہو۔ دل میں جب یہ سچائی راسخ ہو جاتی ہے، تو بہشت خود بخود پیچھے چلی آتی ہے۔

ایک اور موقعہ پر مریدوں سے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی پہلی شرط یہ ہے کہ جس پر آپ ایمان لائے، اس پر ایمان لایا جائے اور بندہ ثابت قدم رہے اور شک و شبہ کی بجائے رغبت، محبت اور معرفت کے ساتھ دل

میں یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تبارک وتعالٰے اپنی ذات میں اکیلا اور اپنی صفات میں یگانہ ہے۔ وہ تمام صفات کمالیہ سے متصف ہے۔ اسمائے صفات اور افعال کے لحاظ سے قدیم ہے۔ اوہام وافہام کے ادراک سے بالاتر ہے۔ حدوث، عوارض اور اجسام کی علامتوں سے پاک ہے۔ تمام عالم اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس کی ذات وصفات میں چون وچرا کرنا ناجائز ہے۔ نہ وہ خود کسی سے مشابہ ہے۔ تمام پیغمبر اسی کے بھیجے ہوئے ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام پیغمبروں میں افضل ہیں اور جو کچھ آپ نے فرمایا ہے صحیح اور درست ہے اور اس میں کوئی تفاوت نہیں۔ خواہ یہ باتیں عقل میں آئیں یا نہ آئیں۔ اگر نہ آئیں تو بھی ان کو تسلیم کر لینا چاہیے تاکہ اعتقاد درست رہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے حکم کو جانا۔ اس کی کیفیت اور اسباب معلوم کرنے کی کوشش نہ کی۔ اگر خداوند تعالٰی کے حکم کی تاویل آیات واحادیث کے مطابق ہو تو تاویل کرنا جائز ہے۔ ایمان کی صحت کی علامت یہ ہے کہ اگر بندہ نیک کام کرے تو اس کو خوشی محسوس ہو اور اگر اس سے برائی سرزد ہو تو اس کو برائی برائی معلوم ہو۔ بندہ کے ایمان کی استقامت کی علامت یہ ہے کہ وہ علم کے بجائے ذوق وحال کی بنا پر اللہ اور رسول کو محبوب رکھے۔

ایک دوسرے موقع پر مریدوں کو نصیحت کی کہ کوئی سانس ذکر سے باہر نہ نکلنا چاہیے، کیوں کہ بزرگوں نے کہا ہے کہ جو کوئی ذکر کے بغیر سانس لیتا ہے وہ اپنا حال ضائع کرتا ہے۔ ذکر کے وقت وسوسہ اور حدیث نفس سے گریز کرنا چاہیے اور جب یہ صفت پیدا ہو جائے گی تو وسوسے اور حدیث نفس ذکر کے نور سے جل جائیں گے، دل میں نور ذکر اترتا جائے گا اور اس میں ذکر کی حقیقت متمکن ہو جائے گی، پھر ذکر مذکور مشاہدہ کے ساتھ ہوگا اور دل نور کے یقین سے منور ہو جائے گا اور یہی طالبوں اور سالکوں کا مقصود ہے۔

ایک اور موقع پر مریدوں کو تلقین کی کہ اللہ تعالٰے جب کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، تو اس کو بندۂ سعید لکھ دیتا ہے اور اس کو زبان کے ذکر کے ساتھ قلب کی موافقت کی توفیق عطا کرتا ہے اور زبان کے ذکر سے قلب کے ذکر کی جانب ترقی دیتا ہے، یہاں تک کہ اگر زبان ذکر سے خاموش رہتی ہے تو قلب خاموش نہیں ہوتا۔ یہی ذکر کثیر ہے اور اس فکر تک بندہ اس وقت تک نہیں پہنچتا جب تک کہ وہ نفاق سے بری نہ ہو، جس کا ارشاد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں ہے کہ میری اُمت کے اکثر منافق اس کے قاری ہیں۔ اس نفاق سے مراد غیر خدا کے ساتھ وقوف اور تعلق باطن ہے۔ اس سے پرہیز ضروری ہے۔ باطن کا لگاؤ صرف خدا کے ساتھ ہونا چاہیے۔ پس جب بندہ کو تجرید ظاہری یعنی ناپسندیدہ چیزوں سے علحدگی کی توفیق ہوتی ہے اور وہ برے وساوس اور اخلاق مذمومہ سے پاک وصاف ہو کر تفرید باطن سے معزز ہوتا ہے تو قریب ہوتا ہے کہ اُس کے باطن میں نور کا تجلّٰی ہو جائے اور شیطانی وساوس اور نفسانی خواہشات اس سے دور ہو جائیں اور اُس کے باطن میں نور کے ذکر کا جوہر نمایاں ہو جائے، یہاں تک کہ اس کا ذکر مشاہدہ مذکور کو متجلّی کر دے اور یہ وہ مرتبہ بلند اور عطیہ عظمٰے ہے، جس کے حصول کے لیے امت کے اصحاب ہمت اور ارباب بصیرت کی گردنیں بڑھتی ہیں۔

حضرت شیخ صدرالدین قدس سرہ کا وصال ۳۔ ماہ ذی الحجہ کو ظہر وعصر کے درمیان ہوا۔ تاریخ فرشتہ میں سن وفات ۶۸۴ھ ہے جو غلط معلوم ہوتا ہے۔ سفینۃ الاولیا اور مراۃ الاسرار میں ۶۹۴ھ درج ہے۔

حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کے سن وفات کی صحیح تعیین نہیں ہو سکی ہے۔ اگر ۶۶۶ھ تسلیم کر لیا جائے تو حضرت شیخ صدرالدین عارف رحمۃ اللہ علیہ کا سن وصال ۶۹۱ھ ہو سکتا ہے۔ مراۃ الاسرار کے مؤلف کا بیان ہے کہ وفات کے وقت عمر شریف اٹھتر سال کی تھی، مگر بعض تذکروں میں تہتر سال بھی بتائی جاتی ہے، اس لیے تاریخ ولادت کی بھی تعیین مشکل ہے۔ گو بعض روایتوں کے مطابق شب جمعہ ۶۱۲ھ بتائی گئی ہے۔ مرقد مبارک ملتان ہی میں حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کے پہلو میں ہے۔

حضرت خواجہ شمس الدّین ترک پانی پتیؒ

وفات ——— پانی پت ۷۱۵ھ

خواجہ خواجگاں، شمس الاولیا خواجہ شمس الدین ترک قدس سرہ العزیز، حضرت شیخ علاؤالدین صابرؒ کے خلیفہ و جانشین تھے۔ سلسلہ صابری چشتی آپ ہی کے واسطہ سے جاری ہے۔ ریاضت و مجاہدات، ذوق و شوق و استغراق میں آپ کی نظیر نہیں ملتی۔ علوم ظاہری و باطنی و کشف و کرامات میں کمال درجہ رکھتے تھے۔

آپ کا نام نامی شمس الدین اور شمس الاولیا خطاب ہے۔ خواجہ احمد یسویؒ کی اولاد سے تھے۔ سلسلہ نسب حضرت محمد بن حنفیہؒ تک منتہی ہوتا ہے، جو سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فرزند تھے۔

جب سنِ تمیز کو پہنچے تو مدّت تک ترکستان میں رہ کر تحصیل علم کرتے رہے۔ فارغ ہونے پر علوم باطنی کی تڑپ دل میں پیدا ہوئی۔ تمام تعلقات توڑ کر تجرید و تفرید اختیار کر لی، پھر مرشد کامل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے ترکستان کے متعدد بزرگوں اور مشائخ کرام سے ملاقاتیں کیں مگر کسی سے دلبستگی نہ ہوئی۔ بالآخر ہندوستان کا رخ کیا اور اجودھن (موجودہ پاک پٹن) پہنچے۔ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کی خدمت میں کچھ مدّت رہے، پھر حضرت بابا صاحب نے آپ کو تاج الاولیا شیخ علاؤالدین علی احمد صابرؒ کی خدمت میں بھیج دیا، چنانچہ آپ کلیر شریف میں آئے اور حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سیرالاقطاب میں لکھا ہے کہ حضرت بابا گنج شکرؒ سے بھی آپ کو خرقۂ خلافت ملا تھا۔

شیخ علی احمد صابرؒ کی خدمت میں رہ کر آپ نے عظیم مجاہدے کیے، طرح طرح کی مشقتیں اور ریاضتیں کیں اور پیرومرشد کی نظر کیمیا اثر سے روز بروز کسب سلوک میں ترقی کرتے گئے۔ خود درجہ کمال کو پہنچے اور دوسروں کو بھی کمالات کا حامل بنا دیا۔

پیرومرشد کی اجازت سے آپ نے سلطان غیاث الدین بلبن کے ہی سواروں میں ملازمت اختیار کر لی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ سلطان نے قلعہ اوس کا محاصرہ کیا، طویل مدت محاصرے میں گزر گئی مگر قلعہ فتح نہ ہوا۔ بالآخر وہ اولیا اللہ سے مدد کا طالب ہوا۔ آپ سے رجوع کیا۔ خدمت میں حاضر ہو کر دعا کے لیے درخواست کی، چنانچہ آپ نے دعا فرمائی اور قلعہ فتح ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد آپ نے ملازمت ترک کر دی اور دوبارہ پیرومرشد کی خدمت میں چلے آئے۔

جب علی احمد صابر کلیریؒ کی وفات کے دن قریب آئے تو انھوں نے شیخ شمس الدینؒ کو بلا کر خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور وصیت کی کہ جب میں اس جہانِ فانی سے رحلت کر جاؤں تو تم تین دن سے زیادہ یہاں قیام نہ کرنا، بلکہ پانی پت میں جا کر خلق اللہ کی رہنمائی کا فرض انجام دینا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے پانی پت کی خدمت تمھارے سپرد کر دی ہے۔

آپ نے جواب دیا، میری تو دلی خواہش ہے کہ ساری عمر میں آپ کے قدموں میں رہوں اور خدمت بجا لاؤں، لیکن اب جبکہ آپ حکم دیتے ہیں مجھے کوئی عذر نہیں، مگر پانی پت میں حضرت شرف الدین بو علی قلندرؒ تشریف فرما ہیں، میرا ان سے نباہ کس طرح ہوگا۔ پیر و مرشد نے فرمایا، فکر نہ کرو، ان کی مدت ختم ہو چکی ہے۔ تمہارے پہنچنے تک وہ شہر کو خالی کر چکے ہوں گے۔ پھر چند روز کے بعد انتقال کر جائیں گے۔

غرض پیر و مرشد کی وفات کے بعد آپ پانی پت تشریف لے گئے۔ حضرت بو علی قلندرؒ کو جب آپ کا نام معلوم ہوا تو اپنے حجرے کا دروازہ بند کر کے مسافرت کا قصد فرمایا۔ صاحب مرآۃ الاسرار لکھتے ہیں کہ "شیخ شرف از پانی پت برآمده متوجه موضع بوده کهو (کرنال) شد، چوں در موضع رسید چند روز آنجا بوده برحمت حق پیوست"۔ یعنی آپ کی آمد پر حضرت بو علی قلندر پانی پت چھوڑ کر کرنال کی طرف چلے گئے اور تھوڑے ہی دنوں بعد ان کا وصال ہو گیا۔

جب تک آپ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں رہے انھیں غسل اور وضو کرایا کرتے تھے۔ کھانا بھی تیار کرتے تھے۔ جنگل سے لکڑیاں لاتے اور اسی قسم کی دوسری خدمات انجام دیتے۔

کہا جاتا ہے کہ اپنے وطن میں ایک مرتبہ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے اور بہت سے دوسرے اکابر بھی وہاں موجود تھے۔ بہت سے سید بھی موجود تھے۔ ایک سید نے جو کار شہر سے تھا اور بہت شہرت رکھتا تھا، آپ سے استہزا کیا کہ آپ کی سیادت کا کیا ثبوت ہے؟ آپ نے اپنا نسب نامہ بیان کر دیا۔ اس شخص نے کہا یہ بھی ثبوت کا محتاج ہے۔ یہ سن کر آپ جلال میں آگئے، فرمایا یہ بات عوام میں مشہور ہے کہ سید کے جسم کو آگ نہیں جلا سکتی، اگرچہ اس کا کبھی تجربہ نہیں کیا گیا مگر اس سے بہتر کوئی دلیل نہیں کہ ایک گڑھے میں خوب آگ روشن کی جائے اور ہم دونوں اس میں داخل ہوں جسے آگ نہ جلائے وہی سید ہے۔ لوگوں نے یہ بات قبول کی اور ایک گڑھے میں آگ روشن کر دی گئی۔ جب اس کی گرمی خوب شدت اختیار کر گئی تو آپ اس میں داخل ہو گئے، مگر آگ نے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچایا۔

آپ نے سید کو آواز دی کہ آؤ تم بھی بیٹھ جاؤ۔ کیوں دیر کرتے ہو۔ سید لوگوں کی شرم کے مارے اور اپنی آن رکھنے کی خاطر آگے بڑھا، مگر آگ کی حدت کو محسوس کر کے بدحواس ہو گیا۔ جونہی گڑھے کے قریب پہنچا، اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور وہ شور و فریاد کرنے لگا۔ حضرت شمس الدین گڑھے سے باہر آگئے اور اپنا دست مبارک اس کے کپڑوں پر پھیرا، آگ فوراً بجھ گئی۔ یہ کرامت دیکھ کر وہ شخص آپ کے قدموں پر گر پڑا اور معافی مانگی۔ دوسرے لوگ بھی یہ واقعہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے۔

پانی پت میں تشریف لانے کے بعد آپ خلق اللہ کی ہدایت میں مشغول ہو گئے اور اس علاقے کے لوگوں کو بہت فیض پہنچایا۔ بکثرت لوگ مرید اور معتقد ہو گئے۔ جب آخر وقت آیا تو خرقۂ خلافت شیخ جلال الدین پانی پتی کو عطا فرما کر انھیں اپنا جانشین مقرر کیا۔ ۱۹۔ شعبان کے دن رحلت فرمائی۔ صاحب مرآۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ آپ کا سن وفات میری نظر سے نہیں گزرا، لیکن شیخ

ل یہ حوالہ اخبار الصالحین۔

نصیرالدین محمودؒ آپ کے ہمعصر تھے، جنھوں نے سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں ۷۵۷ھ میں وفات پائی۔ روضۃ الاصفیاء میں جو متاخرین میں سے مفتی غلام سرور لاہوری کی لکھی ہوئی ہے۔ سیر الاقطاب و تذکرۃ العاشقین اور معارج الولایت کے حوالے سے وفات ۷۱۵ھ لکھا ہے۔ بعض شجروں میں ۷۱۸ھ بھی ہے۔ لیکن مفتی صاحب مرحوم نے اوّل الذکر کو صحیح تسلیم کیا ہے، اور یہ قرین قیاس بھی ہے۔ اس لیے کہ حضرت شیخ علی احمد صابرؒ کا وصال بقول صاحب مرأۃ الاسرار ۶۹۰ھ میں ہوا اور آپ کی وفات کے تقریباً پچیس سال بعد تک حضرت شمس الدین ترک زندہ رہے۔ روضۃ الاصفیا میں یہ قطعہ تاریخ درج ہے:

رفت از عالم چو شمس الدین بخلد — سال وصل آں امام پیشوا!
طالب مقبول شمس الدین بگو — نیز شمس الدین ولیِ باصفا
شمس دیں سلطان نامی شد عیاں — باز شمس الدین امیر آمد ندا
نیز شمس الدین اکبر گفتہ ام — سال وصل آں ولی مقتدا

حضرت محبوب الٰہی سلطان المشائخ

حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاؒ

ولادت ـــــــــــ بدایوں ٦٣٦ھ

وفات ـــــــــــ دہلی ٧٢٥ھ

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ جنھیں عموماً محبوب الٰہی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان اولیائے کرام میں سے ہیں جنھوں نے ہندوستان کو نور ولایت سے منور فرمایا۔ آپ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے اہم خلفاء میں سے ہیں جنھوں نے سلسلہ نظامیہ جاری کیا اور اس کی اشاعت و ترقی کے لیے نمایاں کام کیا۔ آپ تمام مقامات قلبی و روحانی و وجدانیت سے گزر کر مرتبہ محبوبیت پہ پہنچے۔

نام و نسب: آپ کا اسم مبارک محمد ہے۔ سلسلہ نسب حضرت علی علیہ السلام تک اس طرح پہنچتا ہے:

محمد بن سید احمد بن سید علیؒ بن سید عبداللہ خلمی بن سید حسن خلمی بن سید علی شہدی بن سید احمد شہدی بن سید ابی عبداللہ بن سید علی اصغر بن سید جعفر ثانی بن امام علی ہادی نقی بن امام محمد تقی بن امام علی رضا بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام علی زین العابدین بن سیدنا امام حسین علیہ السلام بن سیدنا امیرالمومنین حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام۔

ولادت: سیر الاسرار اور بعض دوسری مستند کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ آپ کا خاندان بخارا سے ہجرت کر کے لاہور آیا۔[۱] پھر آپ کے دادا خواجہ علی اور نانا خواجہ عرب اپنے اہل و عیال سمیت بدایوں تشریف لے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ یہ دونوں بزرگ قریبی عزیز تھے۔ خواجہ عرب کی ایک صاحبزادی بی بی زلیخا تھیں۔ جن کا نکاح خواجہ احمد بن علی کے ساتھ ہوا۔ وہ نہایت درجہ نیک اور متقی شخص تھے، چنانچہ بادشاہ وقت نے انھیں بدایوں کا قاضی مقرر کیا۔ ان کا مزار آج بھی بدایوں میں مرجع خلائق ہے۔

حضرت محبوب الٰہی بدایوں میں[۲] ٢٧ صفر ٦٣٦[۳] ہجری میں پیدا ہوئے۔

---

[۱] سیر الاولیاء میں آپ کا نام محمد بن احمد دانیال لکھا ہے۔ نزہۃ الخواطر میں بیان ہے کہ "نام ایشاں محمد بن احمد بن دانیال بدایونی است"۔ یعنی آپ کے والد کا نام احمد دانیال بتایا گیا ہے۔ لیکن ان کا نام علی تھا۔ [۲] سیر العارفین کا بیان [illegible] سے مختلف ہے یعنی جد بزرگوار شیخ احمد دانیال از غزنی بہ ہندوستان رسیدہ بود [illegible] بہ بدایوں [illegible] گشت [illegible] [illegible] ہے جس [illegible] خواجہ [illegible] الٰہی پیدا ہوئے وہ [illegible] کے سب [illegible] محلہ بتایا جاتا ہے۔ [۳] اخبار الاخیار میں سن ولادت ٦٣٦ ہجری لکھا ہے مگر تذکرہ [illegible] ٦٣٤ ہجری [illegible] گیا ہے۔ اول الذکر زیادہ قرین قیاس ہے۔

ابتدائی تعلیم پانچ برس کے ہونے تو والد بزرگوار کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، چنانچہ والدہ ماجدہ کے زیر تربیت پرورش پانے لگی والدہ خود بڑی عابدہ اور نیک خاتون تھیں۔ انھوں نے اس دریتیم کو مدرسے میں بیٹھا دیا۔ مولانا علاؤالدین اصولی سے قدوری پڑھی انھوں نے دستارِ فضیلت باندھی اور اس موقع پر علماء و مشائخ کو مدعو کر کے فرمایا: اس بچے کا سر کسی انسان کے سامنے خم نہ ہوگا۔

بدایوں میں خواجہ محبوب الٰہی کے اساتذہ مولانا علاؤالدین اصولی سے استفادہ کرنے کے علاوہ آپ نے قرآن پاک بھی ختم کر لیا اور کتب متداولہ پڑھنا شروع کیں۔ پھر علم لغت میں مشق بہم پہنچائی اور مزید تعلیم کے لیے والدہ کے ہمراہ دہلی چلے آئے۔

دہلی میں خواجہ محبوب الٰہی کے مشاغل جب آپ دہلی پہنچے اس وقت آپ کی عمر سولہ برس کی تھی۔ دہلی اس زمانہ میں علماء و فضلا کا گہوارہ تھا۔ فضل و کمال کے لحاظ سے مولانا شمس الدین دامغانی بہت ممتاز درجہ رکھتے تھے اور وقت کا بادشاہ غیاث الدین بلبن بھی ان کا بے حد قدردان تھا، چنانچہ اس نے انھیں "شمس الملک" کا خطاب دے رکھا تھا اور مستوفی ممالک کا عہدہ بھی انھیں حاصل تھا۔ یہ باکمال بزرگ درس و تدریس کے سلسلے میں بہت شہرت رکھتے تھے۔

خواجہ محبوب الٰہی نے دہلی پہنچ کر انھیں کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ مولانا شمس الدین نے بھی گوہر نایاب کو ایک ہی نظر میں پہچان لیا، چنانچہ پوری توجہ سے تربیت کرنے لگے اور اپنے دوسرے دو عزیز ترین شاگردوں[1] کے ساتھ خواجہ صاحب کو بھی اپنے حجرے میں بلا کر درس دیا کرتے تھے۔

مولانا شمس الدین کی عادت تھی کہ جب کوئی شاگرد درس سے غیر حاضر ہو جاتا تو اس سے یوں سوال کرتے "میں نے تمہارا کیا قصور کیا تھا کہ تم درس میں نہ آئے۔ مجھے میرا قصور بتا دو تاکہ میں پھر وہی قصور کروں اور تم درس میں نہ آؤ" یہ فقرہ وہ مذاق کے طور پر ہر غیر حاضر ہونے والے شاگرد سے کہا کرتے تھے، مگر خواجہ محبوب الٰہیؒ اگر کبھی ناغہ کر جاتے تو انھیں وہ ایسا نہیں کہا کرتے تھے بلکہ جب وہ استاد کی خدمت میں آتے تو وہ انھیں دیکھ کر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

باسے کم آنکہ گاہ گاہے | آئی وبما کنی نگاہے

غرض خواجہ محبوب الٰہی نے مولانا سے حریری کے چالیس مقامات پڑھے۔

دہلی میں ایک اور باکمال متقی اور متدین بزرگ مولانا کمال الدین تھے جو اپنے عہد کے جید علماء میں شمار ہوتے تھے[2]۔ خواجہ صاحب نے ان سے حدیث پڑھی اور اس علم میں بڑا درجہ حاصل کیا۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ آپ نے علم حدیث مولانا احمد تبریزیؒ سے بھی سیکھا اور ان سے سند حاصل کی اور اس علم میں اتنے ماہر ہو گئے کہ وقت کے تمام محدثین سے سبقت لے گئے، پھر مختلف مشاہیر

---

[1] ان دو شاگردوں کے نام قطب الدین ناقلہ اور برہان الدین عبدالباقی ہیں۔

[2] بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان بلبن نے مولانا کمال الدین کے زہد و تقویٰ و دیانت اور کمالات علمی کے باعث انھیں بلا بھیجا اور منصب امامت کی پیشکش کی مگر مولانا نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا کہ میرے پاس نماز کے سوا اور کوئی چیز نہیں اور اسے بھی آپ مجھ سے چھیننا چاہتے ہیں۔

سے علم ہیئت، فقہ، اصول، علم تفسیر اور ہندسہ میں مشق بہم پہنچائی۔

بابا فریدالدین گنجشکرؒ سے ارادت

خواجہ محبوب الٰہی دہلی میں ہلال طشت دار کی مسجد کے نیچے جس حجرہ میں قیام فرماتے، اس کے قریب ہی حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے چھوٹے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل بھی رہا کرتے تھے۔ یہ بزرگ علوم ظاہری وباطنی سے بہرہ ور تھے۔ خواجہ صاحب کی ان سے اکثر صحبتیں رہتی تھیں[1]۔ چنانچہ ان مراسم کے نتیجہ میں خواجہ صاحب کے دل میں حضرت بابا صاحب کی عظمت گھر کرتی چلی گئی اور آپ بابا صاحب سے ملنے کے لیے بے تاب رہنے لگے۔

خواجہ غریب نوازؒ کا بیان

خواجہ محبوب الٰہیؒ کا اپنا ارشاد ہے کہ میں ابھی چھوٹا ہی تھا، یعنی میری عمر تقریباً بارہ برس کی ہوگی کہ میں علم لغت پڑھتا تھا۔ ان دنوں ابوبکر خراط (جو ابوبکر قوال بھی کہلاتے ہیں) ملتان سے تشریف لائے اور میرے استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے شیخ بہاؤالدین ذکریاؒ کے اوصاف وکمالات بیان کیے، لیکن میرے دل پہ ان کا زیادہ اثر نہ ہوا۔ پھر انھوں نے حضرت گنجشکرؒ کی بزرگی بیان کی، جسے سنتے ہی میں بے اختیار ہوگیا اور آپ کی محبت میرے دل میں موجزن ہونے لگی۔ کیفیت یہ ہوئی کہ میں ہر نماز کے بعد حضرت گنجشکرؒ کے نام کی تسبیح پڑھتا تھا اور سونے سے پیشتر دس مرتبہ شیخ فرید اور دس مرتبہ مولانا فرید نام لیتا تھا۔ جب سولہ سال کی عمر ہوئی تو اپنی والدہ اور چھوٹے بھائی کے ہمراہ دہلی آیا اور اتفاقاً حضرت گنجشکرؒ کے چھوٹے بھائی شیخ نجیب الدینؒ متوکل کے پڑوس میں مکان لیا۔ پھر ان کی محبت کے باعث حضرت گنجشکرؒ کی پابوسی کا شوق روز بروز بڑھتا رہا، تاہم میں مزید چار سال تک شہر میں رہا۔ بڑی کوشش سے تعلیم حاصل کی اور سند حدیث لی۔

اجودھن کو روانگی!

اس شوق نے عملی صورت یوں اختیار کی کہ ایک رات آپ شہر کی جامع مسجد میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب صبح ہوئی تو مؤذن کو مسجد کے منارہ پر چڑھ کر یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا:

اَلَمْ یَأْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ (حدید۔ ع ۲)

(کیا اس کا وقت نہیں آیا کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے دل ذکر الٰہی سے جھک جائیں)

یہ آیت سن کر آپ پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ چنانچہ جب قدرے روشنی پھیلی تو توکل کر کے بابا شکر گنج کو ملنے کے لیے اجودھن کے سفر پہ روانہ ہوگئے۔ کسی قسم کا کوئی زادِ راہ پاس نہ تھا۔ عین شباب کا زمانہ تھا، یعنی سن مبارک بیس سال سے زیادہ نہ تھا۔

بابا شکر گنجؒ سے ملاقات

اجودھن پہنچے تو حضرت بابا صاحب نے انھیں دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا ؎

---

[1] سیر العارفین میں لکھا ہے کہ جب خواجہ محبوب الٰہی کی والدہ ماجدہ وفات پا گئیں تو اس کے بعد آپ شیخ نجیب الدین متوکل کی خدمت میں زیادہ آنے جانے لگے، اور بیشتر وقت آپ ہی کے ساتھ گزرتا۔ ایک دن آپ نے شیخ نجیب الدین کی خدمت میں عرض کیا، دعا فرمائیں کہ میں کسی جگہ کا قاضی مقرر ہو جاؤں تاکہ لوگوں کو فائدہ پہنچا سکوں۔ شیخ نے کچھ جواب نہ دیا۔ آپ نے یہی بات دوہرایا۔ جواب میں شیخ نجیب الدین نے فرمایا: "نظام الدین! تو ہرگز قاضی مشو، اما چیزے شوی کہ من می دانم"۔ اس واقعہ کے بعد آپ کے دل میں حضرت بابا صاحبؒ کی زیارت کا شوق اور بڑھنے لگا۔

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ — سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

اس ملاقات کا حال "راحت القلوب" میں آپ نے یوں بیان فرمایا ہے کہ چہار شنبہ (بعض کتابوں مثلاً سیر العارفین وغیرہ میں پنجشنبہ لکھا ہے) کے روز ماہ رجب کی دس تاریخ اور چھ سو پچپن ہجری تھا کہ دعا گوئے مسلمانان سلطان الطریقۃ فی الارض کا ایک ادنیٰ غلام نظام احمد بدایونی جو اس مجموعے کا جمع کرنے والا ہے، سید العابدین حضرت شیخ فرید الدین گنجشکر مسعود اجودھنی قدس سرہ العزیز کے شرف قدم بوسی سے سرفراز ہوا۔ آپ نے اسی وقت کلاہ چار ترکی جو سر مبارک پہ تھی دعا گو کے سر پہ رکھ دی اور خرقہ خاص و نعلین چوبیں عطا کیں، پھر فرمایا کہ میری خواہش تھی نعمت سجادہ اور ولایت ہند کسی اور کو دوں، اگر تم راستے میں تھے اس وقت میرے سر پہ ہاتف نے آواز دی کہ ٹھہر جاؤ نظام بدایونی آ رہا ہے، یہ ولایت اُسے دینا۔

دعا گو کی خواہش ہوئی کہ پا بوسی کے اس اشتیاق کا اظہار اور حال عرض کرے، جو حد سے بڑھا ہوا تھا، مگر آپ کا دبدبا تنا غالب تھا کہ کچھ بیان نہ کر سکا۔ یہ کیفیت دیکھ کر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ تم جتنا اشتیاق بیان کرتے ہو اس سے زیادہ ہے۔

قیام اجودھن حضرت سلطان المشائخ اپنے پیر و مرشد حضرت بابا صاحب کے پاس ۱۵ رجب ۶۵۵ھ میں پہنچے اور ۲ ربیع الاول ۶۵۶ھ تک یعنی ساڑھے سات ماہ کے قریب ان کی خدمت میں رہ کر تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے۔

اجودھن کے لیل و نہار بابا صاحب کی خانقاہ کے سارے درویش بڑے عسرت اور تنگی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اکثر فاقوں سے گھبرا جاتے تھے۔ مولانا بدر الدین اسحٰق اور شیخ جمال الدین ہانسوی جیسی بزرگ اور مقدس ہستیاں بھی اس درگاہ میں تربیت حاصل کر رہی تھیں، اور وہ بھی عسرت اور تنگی سے دن گزارتے تھے۔ مولانا بدر الدین اکثر غذا کے لیے جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کر کے لایا کرتے تھے اور شیخ جمال الدین جنگل سے ڈیلے لایا کرتے تھے۔ حسام الدین کابلی کے ذمہ پانی لانے کا کام تھا۔ برتنوں کی صفائی بھی انھیں کے ذمہ تھی۔ خواجہ نظام الدین ترکاری پکایا کرتے تھے۔

درویشی اور قرض؟ قریب ہی ایک بقال رہتا تھا۔ نمک اس سے خریدا جاتا تھا۔ ایک دن خریدنے کے لیے پیسے نہ تھے۔ خواجہ نظام الدین نے ایک درم کا نمک اسی بقال سے ادھار لے لیا اور ترکاری تیار کر کے پیر و مرشد اور تمام دوسرے درویشوں کے سامنے حاضر کر دی۔ مولانا بدر الدین اسحاق، شیخ جمال الدین ہانسوی اور خواجہ نظام الدین تینوں ایک ہی پیالہ میں کھایا کرتے تھے۔

جب بابا صاحب نے لقمہ اٹھانے کے لیے پیالہ میں ہاتھ ڈالا تو ہاتھ میں گرانی محسوس ہوئی اور لقمہ نہ اٹھا سکے فرمایا: "ازیں بوئے اسراف می آید" (اس میں سے اسراف کی بو آتی ہے) پھر دریافت فرمایا کہ نمک کہاں سے لیا۔ خواجہ نظام الدین پر بابا صاحب کے اس سوال نے ہیبت اور لرزہ طاری کر دیا۔ بڑی مشکل سے جواب دیا کہ قرض لیا تھا۔ بابا صاحب نے فرمایا درویش فاقے سے مر جائے تو اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنے نفس کی خواہش پورا کرنے کے لیے کسی سے قرض لے۔ توکل اور قرض میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ڈیلے ایک قسم کا پھل ہے جسے نمک اور سرکہ ملا کر اس کا اچار بنایا جاتا تھا اور سالن کے طور پہ کھایا جاتا تھا۔

یعنی اگر مقروض درویش کو اچانک موت آ جائے، اور اس پر قرض ابھی باقی ہو تو قیامت کے دن قرض کے بوجھ سے اس کی گردن جھکی رہے گی۔

اس ارشاد کے بعد بابا صاحب نے حکم دیا کہ تمام مسالن غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

خواجہ نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اسی وقت سے دل میں عہد کیا کہ آئندہ کبھی کسی سے قرض نہ لوں گا اور اپنے سابقہ پر ندامت اور توبہ کا اظہار کیا۔ بابا صاحب کو خواجہ صاحب کی اس توبہ کا کشف ہوا تو اپنی کملی جس پہ وہ تشریف فرما تھے خواجہ صاحبؒ کو دے دی اور فرمایا انشاءاللہ آئندہ تمھیں قرض کی کبھی ضرورت نہ پڑے گی۔

پیر اور مرید کی باتیں | حضرت بابا صاحب نے خواجہ نظام الدین کو جو پند و نصائح اور ہدایات فرمائیں وہ پوری تفصیل کے ساتھ راحت القلوب میں درج ہیں۔ یہ بابا صاحب کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، جسے خواجہ صاحب نے مرتب کیا تھا۔ ایک مرتبہ پیر و مرشد خدمت میں تنہا تھے، اس کے متعلق فرماتے ہیں:

"دعاگو نشستہ مجلس می راند گنجشکی بیدار شد فرمود یاران کجا اند۔ گفتم قیلولہ کرده اند، فرمود بیا تا ترا چیزے بگویم۔ آغاز کرده چو در بروی در مجاہدہ باشی، بیکار بودن ہیچ نیست۔ روزه داشتن نیمہ راه راست و اعمال دگر چوں نماز و حج نیمہ راه۔"

فرماتے ہیں ایک مرتبہ پیر و مرشد نے فرمایا "من از حق تعالیٰ خواستہ ام ہرچہ تو از حق بخواہی بیابی"۔

فرماتے ہیں ایک مرتبہ بابا صاحبؒ اپنے حجرۂ خاص میں یہ اشعار پڑھ رہے تھے:

خواہم کہ ہمیشہ در وفائے تو زیم
خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من بندہ ز کونین توئی!
از بہر تو میرم واز برائے تو زیم

خواجہ نظام الدین فرماتے ہیں کہ بابا صاحب مذکورہ اشعار پڑھتے اور سر مبارک سجدہ میں لے جاتے، میں نے یہ دیکھ کر اپنا سر آپ کے قدموں پہ رکھ دیا۔ آپ نے مہربانی فرمائی اور پوچھا "جو مانگتے ہو مانگو"۔ میں نے استقامت طلب کی جو آپ نے عنایت فرمائی۔

پیر و مرشد سے وداع ہونا | رخصت کرنے سے قبل بابا صاحب نے اپنا لعاب خواجہ صاحب کے منہ میں لگایا اور حسب ذیل وصیت فرمائی۔ "نظام! اللہ نے دنیا اور دین دونوں دیے ہیں، یہاں سب موجود ہے، لہٰذا تم ہندوستان کا ملک لو" پھر خلافت کرکے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تجھے علم، عقل اور عشق بخشا ہے اور جس میں یہ تین صفتیں ہوں خلافت کے لائق بھی وہی ہے۔ پھر یہ وصیت بھی فرمائی کہ اگر کسی سے قرض لینا ہی پڑے تو اُسے جلد لوٹانا۔ اور اپنے دشمنوں کو ہر حال میں خوش رکھنے کی کوشش کرنا، انھیں دکھ دینا اور نہ ہی انھیں ناراضگی کا موقع دینا۔

عطائے خلافت | خلافت کا شرف ۱۳ رمضان المبارک ۶۶۹ھ (بقول سیر الاولیا) یا ۲ ربیع الاول ۶۵۵ھ (بقول راحت القلوب)

کو حاصل ہوا۔ خواجہ صاحب خود فرماتے ہیں کہ حضرت بابا صاحب نے مجھے خلعت خاص مرحمت فرمایا، دوسرے اہلِ صفا بھی حاضر تھے۔ بابا صاحب نے فرمایا "نظام الدین کو ہم نے ہندوستان کی ولایت دی اور خلافت عطا کی" چنانچہ میں نے آپ کا ارشاد سنتے ہی سر جھکایا اور زمین بوسی کی۔ حضرت بابا صاحب نے مجھے سر اٹھانے کا حکم دیا۔ آپ کے فرقِ مبارک پر شیخ قطب الدین کی دستار تھی، وہ اتار کر مجھے مرحمت فرمائی، عصا بھی عنایت کیا اور اپنے ہاتھ سے خرقہ پہنایا، پھر فرمایا "دوگانہ ادا کرو" میں حکم بجالایا، جب قبلہ کی طرف منہ کیا تو بابا صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر آسمان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: تجھے خدا کے سپرد کیا۔

اس واقعہ کے دوسرے دن بعد مجھے رخصت کیا اور فرمایا پہلے ہانسی جانا اور یہ مثال شیخ جمال الدین کو دکھانا، پھر دہلی کا رُخ کرنا اور مثال قاضی منتخب کو دکھانا۔

سیر العارفین میں لکھا ہے "چوں از حضرت ایشاں بجانب دہلی رخصت یافتم در حین وداع نصیحت فرمودند کہ البتہ خصماں را بہر چہ توانی خوشنود گردانی واز کسے کہ قرض گرفتہ باشی بادائی آں روئے نمائی، حق تبارک تعالیٰ آسان گرداند"۔

خواجہ صاحبؒ کا سفر پیرومرشد کے ارشاد کے مطابق آپ ہانسی پہنچے اور شیخ جمال الدین کو خلافت کی تحریر بتائی۔ شیخ جمال الدین اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اظہار تہنیت کے طور پر یہ شعر پڑھا:

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپارد بہ گوہر شناس!

ہانسی سے آپ نے دہلی کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر وہی مثل شیخ نجیب الدین متوکل کی خدمت میں پیش کی اور کل واقعہ بھی بیان کر دیا۔ شیخ نجیب الدین نے اس پر خوشی کا اظہار کیا۔

قیام دہلی دہلی میں شیخ نظام الدین ایک عزیز کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ اس عزیز سے انھوں نے ایک کتاب مستعار لی تھی جو گم ہو گئی تھی۔ آپ نے اس سے کہا کہ کتاب گم ہو چکی ہے اگر آپ پسند فرمائیں تو میں کاغذ فراہم کر کے اپنے ہاتھ سے اسے لکھ کر آپ کے حوالے کر دوں۔ اُس عزیز نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کتاب آپ کو بخش دی۔

اس کے بعد آپ ایک بزاز کی دکان پر گئے جس سے تھوڑا سا کپڑا ادھار لے چکے تھے۔ کچھ رقم جو پاس تھی اُسے دے دی اور باقی رقم پھر ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ بزاز نے باقی رقم آپ کو بخش دی۔

پھر پیرومرشد کے حکم کے مطابق ان لوگوں سے فرداً فرداً ملے جو آپ سے کبیدہ خاطر تھے اور انھیں راضی کیا۔

اجودھن کے سفر قیام دہلی کے دوران آپ بابا صاحب کی زندگی میں تین مرتبہ پھر جا کر ملے اور سات مرتبہ بابا صاحب کی وفات کے بعد ان کے آستانہ پر حاضری دی۔

ایک مرتبہ خواجہ نظام الدین دہلی سے اجودھن گئے تو بابا صاحب نے آپ کے لیے دعا کی کہ "اے اللہ! نظام الدین تجھ سے جو مانگے کرے اسے دیا کر"۔ یہ دعا قبول ہوئی اور اسی لیے وہ محبوب الٰہی کہلائے۔

خواجہ نظام الدین فرماتے ہیں کہ تیسری مرتبہ میں رمضان ۶۶۹ھ (یا ۶۶۸ھ) میں بابا صاحب سے ملنے اجودھن گیا۔ یہ آخری ملاقات تھی، تو واپسی کے وقت بابا صاحب نے دعا دیتے ہوئے فرمایا اللہ تجھے نیک بخت کرے۔ فرمایا :

اَسْعَدَکَ اللّٰہُ فِی الدَّارَیْنِ وَرَزَقَکَ اللّٰہُ عِلْماً نَافِعاً وَّ عَمَلاً مَّقْبُوْلاً۔

پھر فرمایا تم ایسے درخت ہوگے جس کے سایہ میں مخلوق آرام پائے گی۔ پھر نصیحت فرمائی کہ حصولِ استعداد کے لیے برابر مجاہدہ کرتے رہنا۔[1]

پیرومرشد کی وفات | بابا صاحب کے وصال کے وقت خواجہ نظام الدین اجودھن میں بابا صاحب کے پاس موجود نہ تھے۔ چنانچہ بابا صاحب نے اپنا عصا اور خرقہ جو خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملا تھا مولانا بدرالدین اسحٰق کے ذریعہ (جو وہاں موجود تھے) خواجہ صاحب کے پاس دہلی بھجوا دیے۔[2]

دہلی کے لیل و نہار | خواجہ نظام الدین مرشد سے رخصت ہوکر جب پہلی مرتبہ دہلی واپس تشریف لائے، تو مرشد کی ہدایت کے مطابق مجاہدہ و ریاضت اور زہد و عبادت میں انہماک ہوگئے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، مرشد کی یہ بھی ہدایت تھی کہ مجاہدے کے ساتھ ساتھ تحصیل علم بھی جاری رہے، چنانچہ آپ ان دنوں قرآن کریم بھی حفظ کر رہے تھے۔ چونکہ آپ کا قیام شہر کی آبادی میں تھا اس لیے لوگ اس کثرت سے آنے لگے کہ آپ کے کاموں میں حرج ہونے لگا اور عبادت یا تحصیل علم کے لیے وقت نہ نکلتا تھا۔ چنانچہ آپ شہر کے ہنگامہ خیز ماحول سے دور کسی پُرسکون مقام پر جانے کا ارادہ رکھتے تھے تاکہ وہاں رہ کر اطمینان سے یادِ الٰہی کر سکیں۔ قرآن کریم حفظ کرنے کے لیے آپ جنگل میں چلے جایا کرتے تھے۔ اس اثنا میں آپ کی ملاقات ایک درویش سے ہوئی۔ دورانِ گفتگو درویش نے کہا کہ دہلی کا شہر فسق و فجور کا مرکز بنا ہوا ہے، وہاں رہنے سے تو اپنا ایمان بھی خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔

غیاث پور | درویش کی ان باتوں سے خواجہ صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی قیمت پر بھی شہر میں رہنا مناسب نہیں چنانچہ آپ شہر سے اٹھ کر قریب ہی ایک موضع غیاث پور میں چلے آئے جو دریائے جمنا کے کنارے واقع تھا۔ یہاں چند جھونپڑیاں ڈال کر اپنے درویشوں کے ہمراہ رہنے لگے۔ پھر یہیں ساری عمر بسر کر دی۔[3]

---

[1] خواجہ نظام الدین تربیت حاصل کرنے کے بعد جب سلوک و ریاضت میں لگ گئے تو اگرچہ علم کا شوق جوں کا توں موجود تھا مگر بابا صاحب سے دریافت فرمایا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں تعلیم چھوڑ دوں۔ بابا صاحب نے فرمایا میں کسی کو علم حاصل کرنے سے منع نہیں کرتا۔ تم دونوں کام کیے جاؤ (یعنی علم بھی حاصل کرتے رہو اور مجاہدہ و ریاضت میں بھی مشغول رہو)، ان میں سے جو غالب ہوگا وہ رہ جائے گا۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد باطنی اشغال کی مصروفیت اتنی بڑھ گئی اور استغراق اتنا ہوا کہ تعلیم و تعلم کا سلسلہ خود بخود ختم ہوگیا۔ خواجہ بندہ نوازؒ کا بیان ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیا کے چہرہ مبارک پر زیادہ رونے کے باعث زخم جیسے نشان پڑ گئے تھے۔ فرماتے ہیں میں نے اپنے دوستوں سے سنا ہے کہ آپ کی آنکھیں ایک ساعت کے لیے بھی خشک نہ رہتی تھیں بلکہ ہمیشہ آنسوؤں سے تر رہتی تھیں جب تک اس دنیا میں رہے گریہ رہے اور جب دنیا سے رخصت ہوئے زخم آنکھوں پر رہے۔ [2] بابا صاحب کا وصال محرم ۶۶۴ھ میں ہوا۔ [3] واضح ہو کہ خواجہ صاحب نے بابا گنج شکرؒ سے عوارف المعارف اور تمہید ابوشکور سالمی پڑھی تھی (سیر الاولیا صفحہ).

عسرت اور سختی کا دور یہ بڑی عسرت اور تنگدستی کا زمانہ تھا۔ کئی کئی دن تک فاقے رہتے اور کھانے کو کچھ میسر نہ آتا۔ آپ کا اپنا بیان ہے کہ اس زمانے میں ایک من خربوزے دو جیتل کو ملتے تھے۔ خربوزوں کی ساری فصل گزر گئی مگر ایک خربوزہ بھی چکھنا نصیب نہ ہوا۔ پھر اتفاقاً ایک شخص بہت سے خربوزے اور چند روٹیاں لے کر آیا۔ میں نے انھیں اللہ کی بھیجی ہوئی نعمت سمجھ کر لے لیا۔

ان دنوں ایک جیتل کا دو سیر آٹا ملتا تھا، مگر اتنا ارزاں ہونے کے باوجود خواجہ نظام الدین کے پاس اتنے دام بھی نہ ہوتے تھے کہ دو روٹیوں کے لیے ہی آٹا خرید سکیں، چنانچہ اکثر فاقوں سے گزر ہوتی۔

ایک دفعہ تین دن سے فاقہ تھا کہ ایک شخص نے دروازے پر دستک دی۔ آپ نے دروازہ کھولا تو کوئی شخص خشک کھچڑی دے کر غائب ہو گیا۔ آپ نے وہ کھائی۔ اس واقعہ کے بعد آپ نے کئی مرتبہ اس کھچڑی کی حلاوت بیان فرمائی۔ فرماتے ہیں "مجھے اس کھانے کے بعد کسی اور کھانے میں کبھی اتنی لذت محسوس نہیں ہوئی"

جب گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا تو ان کی والدہ فرمایا کرتیں کہ آج ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں۔ خواجہ صاحب کو والدہ کا یہ جملہ بہت لطف دیتا اور جب کبھی گھر میں کھانے کو کچھ ہوتا تو خواجہ صاحب افسوس کرتے کہ آج ان کی والدہ محترمہ اپنا مخصوص فقرہ نہ کہیں گی۔

شانِ استغنا اس قدر عسرت، تنگی اور فاقہ کشی کے باوجود بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ جب سلطان جلال الدین خلجی کو آپ کی ان پریشانیوں کا علم ہوا تو آپ کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ اگر اجازت دیں تو خدمت گزاروں کی بسر اوقات کے لیے کچھ گاؤں آپ کی نذر کر دوں۔ جب آپ کے خدمت گزاروں یعنی درویشوں کو بادشاہ کی اس پیش کش کا علم ہوا، تو سب نے یک زبان ہو کر خواجہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ موجودہ حالات میں ہم آپ کے ہاں سے کبھی کبھی روٹی کھا لیتے ہیں، اگر یہ گاؤں قبول کر لیے گئے تو اس کے بعد ہم آپ کے یہاں سے پانی پینا بھی پسند نہ کریں گے (مقصد یہ کہ ہم بادشاہ کے مرہونِ منت ہو جائیں گے جو آپ کے اور ہمارے مابین جدائی کا باعث بن جائے گا)

خواجہ نظام الدین درویشوں کا یہ جواب سُن کر بہت محظوظ ہوئے اور شاہی پیشکش کو قبول نہ فرمایا۔

انقلابی واقعہ اس زمانہ میں خواجہ صاحب کے درویشوں میں شیخ برہان الدین غریب اور شیخ کمال الدین یعقوب جیسے عظیم بزرگ بھی موجود تھے، جو بعد میں خواجہ صاحب کے خلیفہ بنے، چنانچہ ایک دفعہ چار دن کا فاقہ تھا اور کھانے کو کچھ میسر نہ آیا۔ پڑوس میں ایک نیک خاتون رہتی تھیں، جو خواجہ صاحب سے بیعت تھیں۔ انھیں درویشوں کی فاقہ مستی کا علم ہوا تو کچھ آٹا بھجوا دیا۔ شیخ کمال الدین یعقوب نے آٹا مٹی کے ایک برتن میں ڈال کر آگ پر رکھ دیا تاکہ اسے پکا کر کچھ تیار کریں، اتنے میں درویشی کے لباس میں ایک مسافر ادھر آنکلا اور کھانے کو مانگا۔ خواجہ نظام الدین بھی وہیں موجود تھے، انھوں نے برتن اٹھا کر درویش کے سامنے رکھ دیا۔ کھانا سخت گرم تھا۔ درویش نے گرم گرم لقمے ہی منہ میں ڈال لیے پھر برتن کو زمین پر پٹک دیا اور یہ کہتا ہوا غائب ہو گیا:

"شیخ فرید الدین گنجشکر نعمت باطن شیخ نظام الدین اولیا ارزانی داشت و من دیگ فقر ظاہری او بشکستم املا سلطان ظاہری و باطنی شدی۔"

یعنی شیخ فرید الدین گنجشکرؒ نے تحصیل نعمت باطنی دی اور ہم نے تمہارا فاقہ توڑا۔

خوشحالی اور فراغت کا دور اللہ والوں کی زبان سے جو نکلتا ہے وہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ چنانچہ اس نامعلوم درویش کی زبان سے جو کچھ ادا ہوا تھا وہ اسی طرح پورا ہو کر رہا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں خواجہ صاحب کی عسرت اور تنگی جاتی رہی۔ کثرت سے لوگ مرید ہو گئے اور ان کی فتوحات کا کوئی ٹھکانا اور حصر و اندازہ نہ رہا۔ جہاں پہلے کئی کئی دن تک فاقے ہوتے تھے۔ اب یہ عالم تھا کہ لنگر میں کھانا بچ رہتا اور کوئی کھانے والا نہ ملتا۔ "خیر المجالس" کے الفاظ میں "فتوحات کا یہ حال تھا کہ دولت کا دریا دروازے کے آگے بہتا تھا۔ کوئی وقت فتوحات سے خالی نہ ہوتا۔ صبح سے شام تک لوگ آتے بلکہ عشا تک، مگر لینے والے لانے والوں سے زیادہ ہوا کرتے تھے اور جو کوئی کچھ لاتا اس سے زیادہ حضرت کی عنایت سے پاتا۔ ایک بار ایک امیر سو تنکہ زر نذر کو لایا۔ آپ نے قبول نہ کیا۔ جب دیکھا کہ بہت رنجیدہ ہوتا ہے تو اس میں سے ایک تنکہ قبول کیا۔ باقی وہ پاس لیے ہوئے غمناک بیٹھا رہا۔ دل میں کہتا تھا اگر حضرت شیخ سب قبول فرمائیں تو میری سعادت ہے۔ شیخ نے فرمایا میں نے یہ سب اس لیے قبول نہیں کیے کہ تیرے کام آئیں گے۔ لے جا میرے پاس اور مال ہے۔ پھر اس سے کہا الٹی طرف دیکھ۔ اس نے نظر کی تو دیکھا کہ انبار اشرفیوں کا لگا ہوا ہے۔ سر قدموں پر رکھ کر جانے کو اٹھا۔ آپ نے اسے منع کیا کہ جو کچھ دیکھا ہے اسے اور سے مت کہنا۔ وہ پوشیدہ نہ رکھ سکا، باہر آکر یہ حال لوگوں سے بیان کر دیا۔"

غیاث پور سے بیزاری جب سلطان معز الدین کیقبادؒ[1] کا زمانہ آیا تو اس نے غیاث پور کے قریب کیلوکھڑی میں اپنا محل بنوایا۔ پھر یہاں اچھا خاصا شہر آباد کر دیا اور بہت سے امرا نے یہاں اپنے محلات تعمیر کیے۔ ایک جامع مسجد بھی یہاں بنائی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ پُرسکون اور خاموش مقام بھی دہلی شہر کی طرح بارونق اور ہنگامہ خیز بن گیا۔ بڑی کثرت سے لوگ خواجہ صاحب کے پاس آنے لگ گئے اور خواجہ صاحب کی طبیعت اس ماحول سے گھبرانے لگی۔ چنانچہ آپ نے غیاث پور کو چھوڑ کر کسی اور جگہ جانے کا ارادہ کر لیا۔

اتفاق سے ان دنوں مولانا احمد محدث تبریزیؒ جن سے خواجہ صاحب نے سندِ حدیث حاصل کی تھی دہلی میں وفات پا گئے۔ آپ نے ارادہ کیا کہ کل استادِ بزرگوار کی زیارت کو جاؤں گا تو وہاں ایسی جگہ رہ جاؤں گا جہاں لوگ کم ہوں گے۔

خلوت در انجمن ابھی آپ جانے نہ پائے تھے کہ ایک عجیب واقعہ ہوا جس نے آپ کو غیاث پور چھوڑنے کا ارادہ ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔

---

[1] یہ بادشاہ سلطان غیاث الدین بلبن کا پوتا اور ناصر الدین محمود بغرا خان کا بیٹا تھا جو غیاث الدین کی وفات کے بعد ۶۸۶ھ (۱۲۸۷ء) میں تخت پر بیٹھا۔ بڑا رنگین اور عیش پسند تھا۔

آپ خود فرماتے ہیں کہ میں اسی سوچ میں تھا کہ ایک حسین دُبلا پتلا نوجوان میرے پاس آیا اور یہ اشعار پڑھے :

روزے کہ تو مہ شدی نمے دانستی — کانگشت نمائے عالمے خواہی بود

امروز کہ زلف دل خلقے بر بود — در گوشہ نشست نمی دارد سُود

اس کے بعد کہنے لگا :

"اوّل مشہور نمی بایستی شد، ایں کس مشہور شد، چناں سعی کند کہ در روز قیامت از روئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شرمندہ نہ گردد۔ از خلق گوشہ گرفتن و بحق مشغول شدن سہل است، اما مردانگی و کار مردی آنست کہ خلوت در انجمن باشد و با وجود انبوہ خلق در مشغولی خلل نیفتد۔" (سیر الاولیا و سیر العارفین)

مطلب یہ کہ اول تو مشہور نہ ہونا چاہیے اور اگر مشہور ہو گئے تو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کل قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرمندگی نہ ہو۔ یہ بھی کوئی حوصلہ ہے کہ خلق اللہ سے کنارہ کرکے گوشہ نشینی اختیار کی جائے۔ قوت اور حوصلہ تو اس کا نام ہے کہ اژدحام خلائق کے باوجود ذکر حق جاری رکھا جائے۔

خواجہ نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ اس شخص کی یہ نصیحت سننے کے بعد میں نے غیاث پور چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

لنگر خانہ | جب غیاث پور میں امراء وغیرہ نے اپنے مکانات اور محل تعمیر کیے اور وہ یہاں رہنے لگے تو قریب ہونے کے باعث خواجہ صاحب کی خانقاہ میں وہ لوگ بھی اکثر آنے لگے اور ان کی آمد و رفت کے ساتھ ہی ان کی طرف سے بے انداز فتوحات آنے لگیں جس سے خانقاہ میں دنیاوی مال و متاع کا کوئی اندازہ نہ رہا۔ حالت یہاں تک پہنچی کہ بعض بیانات کے مطابق آپ کے لنگر میں اتنا کھانا پکتا تھا کہ منوں کے حساب سے روزانہ صرف نمک خرچ ہوتا تھا۔ بہرحال لنگر میں جو کچھ پکتا اور فتوحات سے جو کچھ آتا وہ سب اہل دنیا میں تقسیم ہو جاتا۔ خواجہ صاحب کی اپنی ذات ان آلائشوں سے منزہ تھی۔ آپ ہمیشہ روزہ سے رہتے اور افطار کے وقت ایک روٹی یا آدھی روٹی، ترکاری یا کسی قدر چاول تناول فرما لیتے پھر بڑے دستر خوان پر تشریف لاتے اور دائیں بائیں لوگوں کو تقسیم کرتے رہتے۔

امیر خسرو کی بیعت! | خواجہ نظام الدین کے حالات میں امیر خسرو کا بہت ذکر آتا ہے۔ امیر خسرو خواجہ صاحب کے خلیفہ تھے۔ ان کے مفصل حالات آگے بیان ہوں گے۔ یہاں ہم ان کے وہ اہم واقعات بیان کرتے ہیں، جن کا تعلق خواجہ نظام الدینؒ کی زندگی سے ہے۔

امیر خسرو اپنے دور کے باکمال فارسی شاعر تھے۔ آپ کا کلام بے حد شیریں، مؤثر اور عشق انگیز ہوتا تھا، چنانچہ خواجہ نظام الدینؒ آپ کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے۔ امیر خسرو کو بھی حضرت سے دلی وابستگی اور عقیدت ہو گئی تھی۔

بیعت کا واقعہ | امیر خسرو کا واقعہ بیعت خواجہ حسن نظامی دہلوی نے اپنی ڈائری میں یوں لکھا ہے: "امیر خسرو نے بتایا میں تو حضرت سے بہت چھوٹی عمر میں بیعت ہو گیا تھا اور اس کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک دن میرے والد امیر سیف الدین محمود مجھ کو اور میرے بڑے بھائی کو حضرت کے پاس لے گئے۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ والد نے فرمایا میں تم کو

ے بڑے بھائی کو حضرت خواجہ نظام الدین بدایونی کا مرید کرانا چاہتا ہوں۔
میں نے جواب دیا مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس جگہ دروازے پر بیٹھ جاؤں، اندر نہ جاؤں۔ آپ بڑے بھائی کو لے کر اندر
،ان کو مرید کرائیے، میں یہاں آپ کی واپسی کا انتظار کروں گا۔
میرا یہ جواب سن کر میرے والد مسکرائے اور میرے بڑے بھائی کو ساتھ لے کر مکان کے اندر چلے گئے۔ میں دروازے
پر گیا جب میرے والد اندر چلے گئے تو میں نے باہر بیٹھے بیٹھے اپنے دل میں ایک شعر موزون کیا۔ اس خیال سے کہ اگر حضرت
نو اپنے نورِ باطن سے اس شعر کا حال معلوم کر لیں گے اور مجھے اس شعر کا جواب شعر کے ذریعے دیں گے۔ تب میں اندر
ت کا مرید ہو جاؤں گا، ورنہ جب میرے والد اور بھائی باہر آئیں گے تو ان کے ساتھ اپنے گھر واپس چلا جاؤں گا اور جو
نے اپنے دل میں موزوں کیا تھا، وہ یہ تھا:

تو آں شاہے کہ بر ایوانِ قصرت ... کبوتر گر نشیند باز گردد!
غریبے مستمندے بر درآمد ... بیاید اندروں یا باز گردد

(تُو ایسا بادشاہ ہے کہ اگر تیرے محل کے کنگورے پر کبوتر آن بیٹھے تو تیری برکت سے وہ کبوتر باز بن جائے۔ پس ایک
حاجت مند تیرے دروازے پر آیا ہے وہ اندر آ جائے یا واپس چلا جائے)
امیر خسرو نے کہا میں یہ شعر موزون کر کے چپ چاپ بیٹھا تھا اور حضرت کے جواب کا انتظار کر رہا تھا کہ یکایک حضرت کا
م دروازے کے باہر آیا اور مجھ سے کہا کہ حضرت نے مجھے حکم دیا ہے، دروازے کے باہر ایک ترک زادہ بیٹھا ہے اس کے
یہ شعر پڑھ دو اور واپس چلے آؤ:

بیاید اندروں مردِ حقیقت ... کہ با مایک نفس ہمراز گردد!
اگر ابلہ بود آں مردِ ناداں! ... ازاں راہے کہ آمد باز گردد

(حقیقت کے میدان کا مرد اندر چلا آئے تا کہ ہمارے ساتھ کچھ دیر ہمراز بن جائے اور اگر وہ آنے والا ناسمجھ اور نادان ہے
استے سے یہاں آیا ہے اُسی راستے سے واپس چلا جائے)
امیر خسرو نے کہا جب خادم نے میرے دل کے شعر کا جواب حضرت کی طرف سے اس شعر میں سنا دیا تو میں اپنی جگہ سے
دیوانوں کی طرح خادم کے ساتھ ساتھ حضرت کے مکان کے اندر چلا گیا۔ میرے والد اور بھائی اور حضرت سید محمد کرمانی وہاں
۔ میں نے حضرت کو دیکھا کہ وہ مسکرا مسکرا کر میری طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے دوڑ کر حضرت کے قدموں میں سر رکھ
رت نے فرمایا: بیا، بیا اے مردِ حقیقت ایں جا بیا و یک نفس با ما ہمراز بشو۔ (آ جا، آ جا اے مردِ حقیقت اور ایک دم
ہمارا ہمراز بن جا)
میں نے سامنے بیٹھ کر بیعت ہونے کی درخواست کی اور حضرت نے مجھے بیعت کا شرف عطا فرمایا۔

امیر خسرو کے نانا عماد الملک اور والد بزرگوار امیر سیف الدین لاچین بھی خواجہ محبوب الٰہی کے مرید تھے اور ان دونوں کا پورا خاندان حضرت سے بیعت تھا۔

مرشد سے لگاؤ | امیر خسرو نہ صرف شاعر ہی تھے، بلکہ شاہی دربار میں امیر خسرو کی بڑی قدر و منزلت تھی اور اس وجہ سے آپ بہت دولت مند بھی تھے، مگر امارت کے باوجود آپ بڑی انکساری اور سادگی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ خواجہ نظام الدینؒ کی خدمت میں ایک ادنیٰ خدمت گار کی حیثیت سے رہتے اور پیر و مرشد کے ہر حکم کی تعمیل اپنا اولین فرض جانتے۔ خواجہ صاحب بھی دل سے ان کی قدر کرتے تھے اور ان سے بہت محبت تھی۔ فن شاعری کے باعث تمام حلقوں میں مقبول تھے۔ پیر و مرشد کی تربیت اور ان کی صحبت کا یہ اثر تھا کہ چالیس سال تک ہمیشہ دن میں روزہ رکھتے تھے۔

آپ اپنے اشعار پیر و مرشد کو گا کر سنایا کرتے تھے اور جو شعر خواجہ صاحب کو زیادہ پسند آتا وہ بار بار گاتے۔ قوالی کی محفلوں میں امیر خسرو بڑے اہتمام سے اپنی غزلیں سناتے۔ آپ نے خواجہ صاحب کی مدح میں قصیدے بھی کہے۔ خواجہ صاحب نے بھی امیر خسرو کی شان میں ذیل کے اشعار کہے:

خسرو کہ بنظم و نثر مثلش کم خواست !
ملک است کہ ملک سخن خسرو ماست
ایں خسرو ماست ناصر خسرو نیست،
زیرا کہ خدائے ناصر خسرو ماست

مرید کا عشق | امیر خسرو کو مرشد سے نہ صرف عقیدت و محبت اور وابستگی تھی بلکہ کمال درجے کا عشق تھا۔ اس کی ایک نادر مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ کسی درویش نے خواجہ نظام الدین کی خدمت میں آکر سوال کیا۔ اتفاق سے لنگر خانہ میں کوئی ایسی شے موجود نہ تھی جو اسے دی جاتی۔ خواجہ صاحب نے درویش سے کہا کہ اتفاق سے آج کوئی شے نہیں آئی البتہ کل کی فتوح تمھیں دے دی جائے گی۔ دوسرے دن بھی کوئی شے نہ آئی۔ تب خواجہ صاحب نے اپنے پاؤں سے جوتیاں اتار کر درویش کو دے دیں اور رخصت کیا۔

اتفاق سے اس وقت امیر خسرو بادشاہ کے ساتھ کہیں جا رہے تھے، راستہ میں وہی درویش مل گیا۔ آپ نے درویش سے اپنے پیر و مرشد کی خیر و عافیت پوچھی۔ جب درویش گفتگو کرنے لگا تو امیر خسرو بے ساختہ بول اٹھے "مرا از بوئے پیر روشن ضمیر من می آید شاید کہ از شیخ نشانی نزد خود داری"۔ یعنی مجھے اپنے پیر روشن ضمیر کی بو آرہی ہے، شاید ان کی کوئی نشانی تیرے پاس ہے۔

درویش نے یہ سن کر خواجہ صاحب کی جوتیاں سامنے کر دیں اور کہا یہ مجھے عنایت کی گئی ہیں۔ امیر خسرو پیر کی جوتیاں دیکھ کر بے تاب ہو گئے اور درویش سے کہا کیا تم انھیں فروخت کرنے کو تیار ہو؟ درویش آمادہ ہو گیا۔ امیر خسرو کے پاس اس وقت پانچ لاکھ نقرئی تنکے تھے جو سلطان نے ایک قصیدے کے صلہ میں دیے تھے۔ آپ نے وہ سب کے سب درویش کو دے کر اس سے

جوتیاں لے لیں اور اپنے سر پر رکھ کر مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کیا" درویش بہمیں اکتفا کرد ورنہ اگر تمام جان و مال من بعوض ایں کفش طلب می کرد حاضری کردم"۔ یعنی درویش نے اسی قیمت پہ اکتفا کر لیا ورنہ اگر وہ ان جوتیوں کے عوض میں میرا جان و مال مانگتا تو بھی دینے سے دریغ نہ کرتا۔

محبوب الٰہی کا محبوب

پیرو مرشد کو بھی امیر خسرو سے اس قدر محبت تھی کہ اکثر فرمایا کرتے تھے اگر شریعت اس بات کی اجازت دیتی تو میں وصیت کرتا کہ امیر خسرو کو مرنے کے بعد قبر میں میرے ساتھ دفن کرنا، تاکہ ہم دونوں ایک ہی جگہ رہیں[1]۔ تاہم آپ نے وصیت فرمائی کہ" امیر خسرو بعد از من نخواہد زیست، چوں رحلت کند در پہلوئے من دفن کنید کہ او صاحب اسرار من است و من بے او قدم در بہشت نہم"۔ یعنی امیر خسرو میرے بعد زندگی نہ پا سکیں گے، جب وفات پا جائیں تو انھیں میرے پہلو میں دفن کرنا، اور میں ان کے بغیر بہشت میں قدم نہ رکھوں گا۔

مرشد کی وفات کے وقت امیر خسرو پاس موجود نہ تھے بلکہ سلطان محمد تغلق کے ساتھ بنگالہ کی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ اچانک حالت متغیر ہو گئی، اسی وقت دہلی کا رخ کیا اور پیر و مرشد کا حال دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے ہیں۔ یہ سنتے ہی دل تھام کے رہ گئے، اپنا تمام مال و متاع فقراء اور مساکین میں خیرات کر دیا اور ماتمی لباس پہن کر مزار پر گئے۔ جونہی مزار کے قریب پہنچے، بے اختیار ہو کر مزار سے ٹکر ماری اور چیخ کر کہا:

"سبحان اللہ! آفتاب در زیر زمیں و خسرو زندہ"۔

(آفتاب زمین کے نیچے چلا گیا اور خسرو زندہ ہے)

یہ کہا اور بے ہوش ہو گئے۔ اس دن کے بعد غم و اندوہ کا یہ عالم تھا کہ کبھی چہرے پر مسکراہٹ نظر نہ آئی۔ غمناک اور دکھے دل کے ساتھ مرشد کے بعد صرف چھ ماہ تک زندہ رہ سکے، مگر مرشد کی وفات کے بعد ان کے پہلو میں دفن نہ کیے جا سکے۔

فرشتہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:

"چوں امیر خسرو فوت شد، خواستند کہ بموجب وصیت پہلوئے قبر شیخ درون گنبد دفن کنند۔ یکے از خواجہ سرایاں کہ منصب وزارت داشت و مرید شیخ بود، مانع شد کہ بعضے مریدان شیخ و امیر خسرو مشتبہ خواہد شد۔ پس او را در پایانِ شیخ بر چبوترہ یاران مدفون ساختند[2]"

بادشاہوں سے بے نیازی

خواجہ نظام الدینؒ بادشاہوں کی صحبت سے ہمیشہ گریز کرتے رہے اور ان سے ملنا تک پسند نہ فرماتے تھے اور آخر عمر تک اسی اصول پر کاربند رہے۔ سلطان جلال الدینؒ خلجی کو آپ سے بے حد عقیدت تھی اور آپ سے

---

[1] خواجہ صاحب کے الفاظ یہ ہیں: او را در قبر من دفن نمایند تا ہر دو یکجا باشیم۔ [2] تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۴۰۴۔

[3] ان کا مصنف یہ امیروں کے کسی گروہ میں گنا جو ایک دوسرے کے حریف تھے۔ نظام الدین نام ایک امیر بادشاہ کا خاص آدمی تھا اور دہلی کے کوتوال کا داماد تھا،

(باقی اگلے صفحہ پر)

ملاقات کا بہت شوق تھا مگر جانتا تھا کہ آپ بادشاہوں سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ اس لیے ملاقات سے محروم رہا۔ امیر خسرو اس کے دربار سے متعلق تھے۔ چنانچہ بادشاہ نے امیر خسرو کے ذریعہ ملاقات کرنی چاہی اور امیر خسرو سے اس خواہش کا ذکر کیا۔ انھوں نے بادشاہ سے کہا اگر خواجہ صاحب سے آپ کی ملاقات کی اجازت طلب کی گئی تو وہ ہرگز اجازت نہ دیں گے۔ البتہ میں حضرت کی اجازت کے بغیر ہی اپنے طور پر آپ کو وہاں لے جاؤں گا۔ سلطان خوش تھا کہ چلو کسی نہ کسی طرح خواجہ صاحب کی زیارت کا شرف حاصل ہو جائے گا مگر امیر خسرو نے کسی مصلحت کی بنا پر خواجہ صاحب سے یہ بات پوشیدہ نہ رکھی اور انھیں کہہ دیا کہ سلطان حاضر خدمت ہونا چاہتا ہے۔ خواجہ صاحب اُسی وقت غیاث پورہ سے اجودھن کو روانہ ہوگئے۔ تاکہ بابا شکر گنج کی زیارت کر آئیں۔

جب سلطان کو اس صورت حال کا پتہ چلا تو امیر خسرو سے دریافت کیا کہ آپ نے خواجہ صاحب سے میرے حاضر خدمت ہونے کی اجازت کیوں طلب کی، بلکہ طے شدہ تجویز کے مطابق مجھے ساتھ کیوں نہ لے گئے؟ امیر خسرو نے جواب دیا کہ آپ اگر اس بات پر ناراض ہوگئے ہیں تو مجھے زیادہ سے زیادہ اپنی جان کا خطرہ ہوگا لیکن پیرو مرشد ناراض ہو جاتے تو میرے ایمان کا خطرہ تھا۔ سلطان کو امیر خسرو کا یہ جواب بہت پسند آیا اور مسکرا دیا۔

(بقیہ صفحہ سابقہ) اس نے خلجیوں کا زور بڑھتا دیکھا تو انھیں مٹانے کی تدبیریں کرنے لگا۔ چنانچہ خلجیوں نے جلال الدین فیروز کی قیادت میں اپنی پارٹی بنا لی اور ان کا زور روز بروز بڑھتا گیا۔ چنانچہ جلال الدین نے کیقباد بادشاہ کو قتل کرا دیا اور دہلی کا تخت خلجیوں کے قبضہ میں آگیا۔ فوج کے سپاہیوں اور شہریوں نے سلطان جلال الدین کی اطاعت قبول کر لی۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خلجی افغان تھے یا ترک۔ عام خیال یہ ہے کہ وہ ترک تھے جنھوں نے افغانستان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ سلطنت غلاماں کے دَور میں ان لوگوں نے بڑے کارہائے نمایاں کیے جن میں علی مردان اور بختیار کے کارنامے ہندوستان کی تاریخ میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ انھیں لوگوں کی بہادری کے طفیل خلجیوں کو بلبن اور اس سے پہلے کے بادشاہوں کے دربار میں عزت اور مرتبہ حاصل ہوا اور وہ امرا بن گئے۔ پھر موقع ملتے پر سلطنت پر قبضہ کر لیا۔

نئے خلجی خاندان کا سب سے پہلا بادشاہ جلال الدین خلجی تھا جو بہت سادہ اور نرم دل تھا۔ اس کی نرم دلی کا یہ عالم تھا کہ مجرموں کو قطعی کوئی سزا نہ دیتا تھا۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ درباری امراء اور عام لوگ بھی اس سے ناراض رہتے تھے۔ ساری عمر میں اس نے صرف ایک مرتبہ سزا دینے میں سختی کی۔ یہ سزا سیدی مولا نام ایک درویش کو دی گئی، جس پر بغاوت کا الزام تھا۔ بلبن کے بھتیجے ملک چھجو نے بھی بغاوت کی اور سلطنت پر اپنا قبضہ جمانا چاہا، مگر جلال الدین نے اُسے بھی معاف کر دیا۔

جب ہلاکو خان نے ہندوستان پر حملہ کیا تو جلال الدین خلجی نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور وہ ناکام واپس جانے پر مجبور ہوگیا۔ علاؤالدین اس کا بھتیجا اور داماد تھا، جسے وہ بہت چاہتا تھا اور اس پر پورا اعتماد تھا مگر جب وہ دیوگری کی مہم سے واپس آیا تو جلال الدین کو دھوکے سے قتل کرا دیا اور خود تخت کا مالک بن گیا۔

سلطان علاؤ الدین خلجی کی عقیدت

سلطان علاؤ الدین خلجی کو بھی خواجہ صاحب سے بہت عقیدت تھی اور اس کی بھی خواہش تھی کہ خواجہ صاحب سے ملاقات کرے مگر جانتا تھا کہ خواجہ صاحب اپنے اصول کے مطابق اس سے ملاقات نہیں کریں گے تاہم اس نے ایک مرتبہ کہلا بھیجا کہ حضور میرے ہاں تشریف لائیں۔ آپ نے جواب بھیجا کہ میں ایک گوشے میں پڑا ہوں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ رہا۔ بادشاہ اور تمام مسلمانوں کے لیے دعائے خیر کرتا رہتا ہوں، اگر بادشاہ نے اصرار کیا تو میں یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں گا۔

سلطان نے جواب پاکر دوبارہ کہلا بھیجا کہ آپ نہیں آتے تو میں خود حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔

خواجہ صاحب نے جواب بھیجا کہ آپ یہاں آنے کی تکلیف نہ کریں، میں یہیں سے دعا میں مصروف ہوں۔ غیب کی دعائیں اثر زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بھی کہلا بھیجا کہ میرے مکان کے دو دروازے ہیں اگر آپ ایک دروازے سے آئیں گے تو میں دوسرے دروازے سے نکل جاؤں گا۔"

ان تمام امور کے باوجود بادشاہ کی عقیدت میں ذرا فرق نہ آیا۔ وہ ہمیشہ آپ کا معتقد رہا اور آپ بھی ہمیشہ سلطان کے حق میں دعائے خیر کرتے رہے۔ غالباً یہ خواجہ صاحب کی دعاؤں ہی کا اثر تھا کہ علاؤ الدین بہت بڑی سلطنت کا مالک بنا اور فتوحات پر فتوحات حاصل کیں۔ چنگیز خان کے سپاہیوں نے جب دہلی کا محاصرہ کیا تو اس وقت شہر میں فوج نہ تھی، بلکہ باہر گئی ہوئی تھی۔ ایسے موقع پر تاتاریوں کے لیے شہر پر قبضہ کر لینا کچھ مشکل نہ تھا مگر خواجہ صاحب کی دعاؤں کے اثر سے غنیم پر ایسی گھبراہٹ طاری ہوئی کہ ناکام واپس لوٹے۔

علاؤ الدین کا بیٹا شہزادہ خضر خاں خواجہ صاحب کا مرید تھا اور باپ کے کہنے پر حضرت کا مرید ہوا تھا۔

علاؤ الدین سے بے نیازی

اگرچہ علاؤ الدین کو خواجہ صاحب سے بے پناہ عقیدت تھی اور خواجہ صاحب بھی بادشاہ کے حق میں دعا کیا کرتے تھے، اس کے باوجود خواجہ صاحب نے بادشاہ سے ملنا کبھی پسند نہ کیا۔ جب کبھی بادشاہ نے

؎ علاؤ الدین بڑا بہادر اور منچلا تھا، جب کسی کام کا ارادہ کر لیتا تو ہر طریقے سے اسے پورا کرنے کی کوشش کرتا، اگرچہ ان پڑھ تھا مگر بڑا معاملہ فہم اور زیرک تھا۔ بڑا باجبروت اور پُرشکوہ بادشاہ تھا۔ اس نے ملک میں بہترین اصلاحات کیں۔ کم خرچ پر اعلیٰ تربیت یافتہ فوج رکھی۔ اس کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ قلعہ رنتھنبور کی فتح ہے جو ہندوؤں کی قوت کا مرکز تھا۔ ۱۳۰۳ء میں اس نے میواڑ پر چڑھائی کی اور وہاں کی حسین رانی پدمنی کو گرفتار کیا، جس کا واقعہ تاریخوں میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ پھر اجین، مانڈو، دھار اور چندیری فتح کر کے تمام شمالی ہند کا مالک بن گیا۔

۱۳۱۲ء میں اس کی عظمت پورے عروج پر تھی۔ لاہور سے دوار سمندر تک کا سارا ملک اس کے تصرف میں آچکا تھا۔ وہ ہندوستان کا پہلا مسلمان حکمران ہے جو مذہب کو سیاست کے تابع جانتا تھا اور علمائے دین کے مشوروں کی پابندی ضروری نہ سمجھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا "میں جائز اور ناجائز کو نہیں جانتا بلکہ وہی کرتا ہوں جو ملکی تقاضوں کے لیے ضروری سمجھتا ہوں۔"

کچھ تحفے تحائف یا زرِ نقد بھیجا، آپ نے اسے قبول کرنے پر کبھی آمادگی ظاہر نہ کی۔

سلطانی نذر کا حشر

محمد کاشف حاجب اور ملک قرا بیگ نام دو امرا تھے، جنھیں خلجی دربار سے تعلق تھا۔ یہ دونوں خواجہ صاحب کے معتقدین میں سے تھے۔ ایک مرتبہ علاؤالدین نے محمد کاشف حاجب کے ذریعہ پچاس ہزار نقرئی ٹنکے خواجہ صاحب کی خدمت میں نذر کے طور پر بھیجے۔ جب محمد کاشف یہ رقم لے کر پہنچا اس وقت خواجہ صاحب رشد و ہدایت کے سلسلے میں کسی عقدے کے حل کرنے کے وعدہ کا ایفا کرنے والے تھے۔ محمد کاشف نے رقم لاکر سامنے رکھ دی۔ خواجہ صاحب فوراً بول اُٹھے، بادشاہ کے انعام کی طرف توجہ کروں یا عہد پورا کروں۔

مریدوں نے عرض کیا "وفائے عہد بہتر از ہشت بہشت است، چہ جائے کہ پنجاہ ہزار تنکہ"۔

ورنگل کی سلطانی مہم

ایک مرتبہ سلطان علاؤالدین نے ملک کافور کو ورنگل فتح کرنے کے لیے بھیجا۔ جب کچھ دنوں تک سلطان کی مہم کی کامیابی یا ناکامی کی کوئی اطلاع نہ ملی تو پریشان ہوگیا اور ایک شخص کو خواجہ صاحب کے پاس بھیج کر درخواست کی کہ نورِ باطن سے کیفیت معلوم کرکے بتائیں کہ مہم کس مرحلے پر ہے۔ خواجہ صاحب نے بشارت دی کہ مہم میں کامیابی ہوگی، چنانچہ دوسرے ہی دن بادشاہ کو فتح کی خوشخبری ملی۔ اس نے ملک قرا بیگ کو کچھ اشرفیاں دے کر خواجہ صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ خواجہ صاحب کے پاس ایک قلندر بیٹھے تھے، آپ نے ساری اشرفیاں اُٹھا کر انھیں دے دیں۔

سلطان نے اپنے دو بیٹوں خضر خان اور شادی خاں کو دو لاکھ ٹنکے دے کر محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں بھیجا کہ ان کے دامن ارادت سے وابستہ ہوجائیں، چنانچہ محبوب الٰہی نے دونوں کو مرید کرلیا۔ محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ کی عمارت خضر خاں ہی نے بنوائی۔

محبوب الٰہیؒ کے کارنامے

محبوب الٰہی کے فیوض و برکات کے طفیل ملک میں ایک ہمہ گیر اخلاقی اور معاشرتی انقلاب پیدا ہوگیا۔ یہ علاؤالدین خلجی کا زمانہ تھا۔ ضیاءالدین برنی نے اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں اس عہد کی جو تصویر کھینچی ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ سلطان علاؤالدین کے زمانہ میں خواجہ نظام الدین اولیا، شیخ علاؤالدین اور شیخ رکن الدین جیسے صوفیائے کرام موجود تھے، جن کی انفاسِ متبرکہ سے ایک دنیا روشن ہوئی۔ ہزاروں انسانوں نے ان کی بیعت کا ہاتھ پکڑا اور دین و دنیا کی کامرنی حاصل کی۔ ان مشائخ کرام کے اوصافِ حمیدہ اور کمالاتِ باطنیہ سے لاکھوں انسانوں نے فیض حاصل کیا۔ لوگوں کے معاملات میں سچائی پیدا ہوگئی۔ انھوں نے اپنے اخلاق کو بدل لیا۔ قحط اور وبا سے لوگ محفوظ ہوگئے۔ اس وقت کا سب سے بڑا فتنہ یعنی تاتاریوں کی ہندوستان پر یورشیں ختم ہوگئیں۔ ان بزرگوں کے وجود سے شعارِ اسلام کو بلندی نصیب ہوئی۔ احکام شریعت کی سختی سے پابندی ہونے لگی۔ سلطان نے ملک کی بہتری کے لیے تمام منشّی اور ممنوع چیزوں کو اور فسق و فجور و بدعات کو سختی سے روک دیا۔ سُود، ذخیرہ اندوزی جیسی لعنتیں بھی دور کردی گئیں۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے بیعت کا عام دروازہ کھول دیا تھا، وہ گناہ گاروں کو خرقہ پہناتے، ان سے توبہ کراتے اور اپنے مریدوں میں شامل کرلیتے۔ بادشاہ، فقیر، امیر، وزیر غرض ہر شخص کو نیکی اور پاکیزگی کی تعلیم دیتے اگر مرید سے کوئی لغزش ہوجاتی تو بیعت کی تجدید کراتے۔ شیخ کی مریدی کی شرم بہت سے لوگوں کو برائی سے روکے رکھتی۔ عبادت

کی طرف لوگوں کا رجحان زیادہ ہوگیا تھا۔ مرد، عورت، بوڑھے، نوجوان، بازاری، عامی، غلام اور نوکر سب نماز ادا کرتے تھے۔ نیک لوگوں نے شہر سے غیاث پور تک چند تنزیہی مقامات پر چبوترے بنا دیے تھے اور چھپر ڈال رکھے تھے۔ کنوئیں کھدوائے، پانی سے بھرے ہوئے گھڑے اور مٹی کے لوٹے رکھوا دیے تھے۔ چٹائیاں بچھوا دی تھیں۔ ہر چبوترہ اور ہر چھپر میں ایک چوکیدار اور ایک غلام مقرر تھا، کہ مرید اور توبہ کرنے والے نیک لوگوں کو شیخ کے آستانہ تک آنے جانے میں، نماز ادا کرنے کے وقت وضو کرنے کے لیے کوئی تردد نہ ہو اور چبوترہ اور چھپر میں نفل پڑھنے والے نمازیوں کا ہجوم دیکھا جاتا تھا۔ لوگوں میں ارتکاب جرم کے واقعات بہت کم ہو گئے تھے۔ اکثر لوگ چاشت، اشراق، اوابین اور تہجد ادا کیا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب کسی دنیا دار کے گھر کی طرف رخ نہیں کرتے تھے۔ دنیا اور اہلِ دنیا کے معاملات کی داستانیں سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ کوئی محلہ ایسا نہ تھا جس میں ایک مہینہ بیس دن کے بعد صلحا کا اجتماع اور صوفیوں کی محفل سماع نہیں ہوتی تھی۔ سلطان علاؤالدین اپنے تمام گھر والوں کے ساتھ خواجہ صاحب کا معتقد ہوگیا تھا۔ بڑے بڑے گناہوں کو لوگ کفر جانتے تھے اور ان سے حتی المقدور بچتے تھے۔ شراب، زنا وغیرہ کا نام تک زبان پر نہ آتا تھا۔ کم تولنے کا رواج کم ہوگیا تھا۔ تصوف اور احکام شریعت کی کتابوں سے لوگوں کو رغبت زیادہ ہوگئی تھی۔ قوۃ القلوب، احیاء العلوم، عوارف، کشف المحجوب، شرح تصوف، رسالہ قشیری، مرصاد العباد، مکتوبات عین القضاۃ، لوائح ولوامع (قاضی حمید الدین ناگوری)، فوائد الفواد (امیر حسن سنجری) کے بہت سے خریدار پیدا ہو گئے تھے۔ کتب فروشوں سے لوگ سلوک وحقائق کی کتابیں مانگتے پھرتے تھے۔ صوفیوں کی کثرت خریداری کے باعث لوٹا اور چرمی طشت مہنگے ہو گئے تھے۔

قطب الدین خلجی کی عداوت | سلطان علاؤالدین کے بعد قطب الدین خلجی تخت نشین ہوا، تو چونکہ اس نے خضر خاں اور شادی خاں کو قتل کر کے تخت حاصل کیا تھا اور وہ دونوں محبوب الٰہی کے مرید تھے، اس لیے قطب الدین خلجی محبوب الٰہی سے بدگمان رہا۔ اور ان سے دشمنی کرنے لگا۔ اس نے خانقاہ میں امراء کی آمد و رفت بند کرا دی اور لنگر کو جو شاہی خرچ ملا کرتا تھا وہ بھی دینا بند کر دیا۔ سلطان نے محبوب الٰہی کو پیغام بھیجا کہ ہفتہ میں دو بار دربار میں آیا کریں، مگر محبوب الٰہی نے اسے پسند نہ کیا اور جانے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے سختی کرنا چاہی مگر اسے زندگی نے مہلت نہ دی اور جلد ہی وہ خسرو خاں کے ہاتھوں قتل ہوگیا، پھر خسرو خاں بھی تخت سے الگ کر دیا گیا اور اس کی جگہ غیاث الدین تغلق تخت پر بیٹھا۔

محفلِ سماع | غیاث الدین تغلق اپنے عقیدہ کے رو سے سماع کے خلاف تھا، چنانچہ اس نے ایک عام شاہی حکم جاری کر دیا، جس کے بموجب سماع کو ممنوع قرار دیا گیا، مگر محبوب الٰہی کے ہاں سماع بدستور جاری رہا۔ جاہ طلب علماء نے بادشاہ کے کان بھرے، چنانچہ بادشاہ نے علما کا ایک محضر طلب کیا، جس میں سماع پر بحث ہونی تھی کہ جائز ہے یا ناجائز۔ محبوب الٰہی بھی اس میں شریک ہوئے۔ خاصی گرم بحث ہوئی، آخر سماع کے حق میں فیصلہ ہوگیا۔ بادشاہ نے محبوب الٰہی کو بڑی عزت کے ساتھ رخصت کیا۔

غیاث الدین کے بعد سلطان محمد تغلق اس کا جانشین بنا۔ وہ بھی محبوب الٰہی کا بڑا معتقد تھا۔ اسی کے زمانہ میں محبوب الٰہیؒ کا انتقال ہوا۔

ملفوظاتِ خواجہ | فوائد الفواد، فضل الفواد، راحت المحبین اور سیرالاولیا، نام سے آپ کے چار ملفوظات یا تصانیف بیان کی جاتی ہیں۔ فوائد الفواد خواجہ حسن سنجری نے مرتب کی، جو محبوب الٰہی کے نامدار خلیفہ تھے۔ ان ملفوظات کو ہر زمانہ میں مقبولیت حاصل رہی۔ امیر خسرو کہا کرتے تھے کاش میری تمام تصانیف خواجہ حسن سے نامزد ہو جاتیں اور ان کے بدلے میں فوائد الفواد کا حسن قبول میرے لیے نامزد ہو جاتے۔

اس کتاب میں ایسے مضامین درج ہیں جو خضرِ راہ اہلِ سلوک اور مونس اہل اللہ ہیں۔ مرآۃ الاسرار کے مصنف عبدالرحمٰن چشتی اور مشہور مصنف اور سیاح فرشتہ نے بھی اس کتاب کی بہت تعریف کی ہے۔

افضل الفواد کے نام سے امیر خسرو نے بھی اپنے مرشد کے ملفوظات جمع کیے، مگر یہ کتاب زیادہ مقبول نہ ہوئی۔

خواجہ سید محمد مبارک محبوب الٰہی کے مرید تھے۔ انھوں نے سیرالاولیا میں اپنے پیر و مرشد کے ارشادات جمع کیے ہیں۔ اس کتاب میں خواجگانِ چشت کے حالات بھی درج ہیں۔ محبوب الٰہی کے ملفوظات کتاب کا آخری حصہ ہیں۔

سماع | فوائد الفواد میں سماع کا ذکر بار بار آیا ہے۔ محبوب الٰہی فرماتے ہیں کہ سماع ایک صورت موزوں ہے اس لیے فی نفسہٖ حرام نہیں۔ اس سے تحریکِ قلب ہوتی ہے۔ اگر یہ تحریک یادِ الٰہی کے لیے ہے تو مستحب ہے اور اگر فساد کی طرف مائل ہو تو حرام ہے۔

سماع کے لیے ذیل کی شرطیں لازمی ہیں:

۱ - سُنانے والا لڑکا یا عورت نہ ہو۔

۲ - جو چیز سنائی جائے وہ فواحش اور بُرائی سے پاک ہو۔

۳ - صرف خدا کے لیے سُنا جائے، تفریح کے لیے نہیں۔

۴ - آلاتِ موسیقی یعنی چنگ، رباب اور دوسرے مزامیر نہ ہوں۔

۵ - سماع میں عورتیں شریک نہ ہوں۔

مرض الموت | ۷۲۵ھ میں آپ علیل ہوگئے۔ چونکہ ہمیشہ ریاضت و مجاہدہ میں لگے رہتے تھے اور اکثر روزہ سے رہتے تھے، اس لیے جسمانی طور پر پہلے ہی کمزور تھے، بیماری نے اور لاغر بنا دیا، پھر یہ کہ عمر مبارک نوّے برس کے قریب ہو چکی تھی، چنانچہ بیماری کے دنوں میں کمزوری سرعت سے بڑھنے لگی۔ وفات سے چالیس روز قبل کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ دوا کی طرف بھی مطلق توجّہ نہ فرماتے تھے۔ جیسا کہ پہلے خواجہ بندہ نواز کا بیان نقل کیا جا چکا ہے۔ خواجہ صاحب کی آنکھیں ہمیشہ نمناک رہتی تھیں اور اکثر روتے رہتے تھے، کثرتِ گریہ سے چہرے پر زخم جیسے نشان پڑ گئے تھے۔ علالت کے ان دنوں میں رونے کی یہ کیفیت اور زیادہ شدت اختیار کر گئی اور آنکھوں سے آنسو جاری رہنے لگے۔ جب کھانے پینے کے لیے اصرار کیا جاتا تو فرماتے:

کسیکہ مشتاقِ حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم باشد او طعام دنیا چگونہ خورد

جب مرض الموت کی شدت ہوئی تو آپ سے دوا پینے کے لیے اصرار کیا گیا مگر آپ نے نہ پی اور فرمایا:

"دردمندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست"۔

سلطان محمد تغلق نے خواجہ صاحب کی بیماری کو بڑھتا دیکھ کر اپنا شاہی طبیب آپ کے علاج کے لیے بھیجا، ساتھ ہی کہلا بھیجا کہ مجھے بھی آپ کی عیادت کا اشتیاق ہے اگر اجازت ہو تو میں قدم بوسی کے لیے حاضر ہو جاؤں۔

جب طبیب آیا اس وقت خواجہ صاحب پر غشی کی حالت طاری تھی اور رہ رہ کر بے ہوشی کے دورے پڑتے تھے۔ جب ہوش آتا تو دریافت فرماتے میں نے نماز پڑھی ہے یا نہیں۔ جب عرض کیا جاتا کہ آپ نے نماز پڑھی ہے تو مکرر نماز پڑھنے لگ جاتے۔

وصال کے روز لنگر میں خورد و نوش کی جتنی چیزیں تھیں، سب غربا میں تقسیم کرا دیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں گرفت نہ ہو۔ آپ نے سید حسین کرمانی سے فرمایا، میں نے اقبال سے کہا تھا کہ لنگر خانہ میں کوئی چیز باقی نہ رکھے، سب تقسیم کر دے ورنہ تو ذمہ دار ہوگا، جاکر دیکھو کہ ایسا کیا گیا ہے یا نہیں۔ خادم نے کچھ غلہ درویشوں کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ جب خواجہ صاحب کو خبر دی گئی، کہ تھوڑا سا غلہ بچا کر رکھ لیا گیا ہے تو بہت ناخوش ہوئے، فرمایا انبار خانوں کے دروازے توڑ دو اور زمین کی اس ریت (غلے) کو شاہ و اور ہر توشہ خانہ میں جھاڑو پھیر دو۔ چنانچہ اس ارشاد پر عمل کیا گیا۔

جب شاہی طبیب خواجہ صاحب کی چارپائی کے قریب آیا، اس وقت انھوں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور عالمِ سکوت میں تھے۔ طبیب نے نبض پر ہاتھ رکھا تو آپ نے آنکھیں کھول دیں۔ آپ کو بتایا گیا کہ سلطان نے اپنا شاہی طبیب آپ کے علاج کے لیے بھیجا ہے۔ آپ نے یہ سن کر کچھ جواب نہ دیا اور خاموشی سے طبیب کے چہرے پر نظریں جمائے رکھیں پھر دھیمی آواز سے فرمایا:

"دردمندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست"۔

وفات سے تھوڑی دیر پیشتر بہ توجہ خاص سے بعض اشیا نکالیں اور مختلف خلفا کو عنایت فرمائیں اور انھیں خاص خاص مقامات پر جانے کا حکم دیا۔ خلیفۂ اعظم شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کو بابا گنج شکرؒ کا عطا کردہ خرقہ، مصلّیٰ، کاسۂ چوبیں اور تسبیح دے کر حکم دیا "شما را در دہلی باید بود و جفائے مردم باید کشید"۔

شیخ رکن الدین سے آخری ملاقات

غیاث الدین تغلق سے شیخ ابوالفتح رکن الدینؒ[1] کے بہت اچھے مراسم تھے۔ بادشاہ بھی ان کا بے حد عقیدت مند تھا۔ شیخ ملتان سے انھیں ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ غیاث الدین کے بعد جب سلطان محمد تغلق تخت پر بیٹھا تو شیخ رکن الدین سے اس نے بھی تعلقات قائم رکھے۔ شیخ رکن الدین بادشاہ سے ملنے کے لیے اکثر دہلی آیا کرتے تھے۔ جن دنوں خواجہ نظام الدینؒ مرض الموت میں مبتلا تھے، ان دنوں شیخ رکن الدین بادشاہ سے ملنے دہلی آئے، اور

---

[1] شیخ رکن الدین شیخ صدر الدین کے فرزند اور شیخ بہاؤ الدین زکریا کے پوتے تھے۔ آپ ملتان میں رہتے تھے۔ بڑے پایہ کے بزرگ اور ولی اللہ گزرے ہیں۔

خواجہ صاحب کی بیماری کا سُن کر اُن کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ اس وقت خواجہ صاحب عالم تحیر میں تھے۔ مریدوں کو پریشانی ہوئی کہ اس حالت میں دونوں کی ملاقات کیسے ہو، لیکن شیخ کے آنے پر خواجہ صاحب کا تحیر دور ہوگیا اور شیخ رکن الدین کو دیکھتے ہی تعظیم کے لیے چارپائی سے نیچے اُترنے لگے مگر کمزوری کے باعث اُتر نہ سکے اور رکن الدین کو چارپائی پر بیٹھنے کو کہا مگر شیخ صاحب نے تعظیماً آپ کی چارپائی پر بیٹھنے سے گریز کیا۔ تب ایک کرسی لائی گئی اور وہ اس پر بیٹھ گئے۔

شیخ رکن الدین نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا، انبیاء کو موت اور زندگی کا اختیار دیا جاتا ہے اور اولیا چونکہ انبیاء کے جانشین ہوتے ہیں اس لیے انھیں بھی زندگی اور موت کا اختیار مل جاتا ہے۔ میری خواہش تھی کہ آپ کچھ دن اور دنیا میں رہتے تاکہ ناقصوں کو کمال تک پہنچا سکتے۔

خواجہ محبوب الٰہی نے یہ الفاظ سنے تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے، فرمایا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے فرما رہے ہیں، نظام! تم سے ملنے کا بڑا شوق ہے"۔

شیخ رکن الدین نے یہ جواب سنا تو ان پر بھی گریہ طاری ہوگیا۔ اس موقع پر جو لوگ حاضر تھے ان کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہوگئے۔

مھندر مرید ہردیو کی ڈائری میں خواجہ نظام الدین کے آخری وقت کے متعلق لکھا ہے کہ "ساری رات یہی حالت رہی کہ ہوش آتا تھا اور پھر غشی طاری ہو جاتی تھی۔ ہوش کی حالت میں حضرت کچھ فرماتے تھے، مگر آواز کی ناتوانی کے باعث ہم اسے سننے سے محروم رہ جاتے تھے۔ صبح کی نماز پڑھ کر ہم سب پھر حاضر خدمت ہوگئے اور ہم نے سُنا کہ حضرت نے صبح کی نماز بھی کئی دفعہ پڑھی[1] اور خواجہ سید محمد امام کو قریب بلا کر کان میں کچھ فرمایا۔

وفات | بعد ازاں حضرت نے فرمایا حضرت شیخ العالم تشریف لائے ہیں، مجھے تعظیم کے لیے اٹھاؤ۔ ہم سب آگے بڑھے تاکہ حضرت کو سہارا دے کر اٹھایا جائے اچانک حضرت پر سکوت طاری ہوگیا اور سانس کی حرکت بھی بند ہوگئی۔ اس وقت ہم سب جان گئے کہ سورج غروب ہوگیا، حالانکہ وقت چاشت کا تھا اور سورج آسمان پر تیزی سے چمک رہا تھا (روز چہار شنبہ ۱۸[2] ربیع الآخر ۷۲۵ھ کو وفات پائی) ہم سب کی حالت پہلے تو سکتے کی سی ہوگئی، جو کھڑا تھا وہ دم بخود اسی طرح کھڑا رہا اور جو بیٹھا تھا وہ بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہ گیا۔ اقبال، مبشر اور عبدالرحیم کی بے قراری حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ خواجہ سید محمد امام اور قاضی سید محی الدین کاشانی اور خواجہ سید موسیٰ اور سید حسین کرمانی وغیرہ مخلصین خاص بہت زیادہ اندوہگین اور مضطرب تھے۔ خلف بھی رو رہے تھے مگر کوئی شخص

---

[1] جب نماز کا وقت آتا خواجہ صاحب ایک ہی وقت کی نماز کئی کئی دفعہ پڑھتے، پھر بھی تسکین نہ ہوتی۔

[2] "اخبار الصالحین" اور بعض دوسری مستند کتابوں میں تاریخ وفات ۱۸ ربیع الآخر بتائی گئی ہے مگر "بزم صوفیہ" مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڑھ صفحہ ۲۴۳ پر ۱۸ ربیع الاول تحریر ہے۔ جو غالباً کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

صبر و ضبط کی حد سے آگے نہ بڑھتا تھا یعنی چیخ چیخ کر کوئی نہ روتا تھا۔

لحد کی تیاری اچانک اطلاع ملی کہ سلطان محمد تغلق آیا ہے اور حضرت رکن الدین سہروردی بھی تشریف لائے ہیں۔ سلطان نے حضرت کے پلنگ کے قریب آکر چہرہ مبارک کھول کر زیارت کی اور بہت رویا پھر پوچھا دفن کا انتظام کہاں ہوگا۔ سید حسین کرمانیؒ نے آگے بڑھ کر بادشاہ سے حضرت کی وصیت کا ذکر کیا اور تالاب کے اندر دفن کرنے کی تجویز بادشاہ کو سنائی۔ بادشاہ نے اسے پسند کیا اور حکم دیا کہ احمد ایاز خواجہ یہاں شاہی مزدوروں کے لیے فوراً انتظام کرے۔ یہ سن کر میں اسی وقت گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کو گیا ۔ وہاں سے مزدوروں کو لایا اور تھوڑی دیر میں تالاب بھر دیا گیا ۔ وہاں قبر تیار کر دی گئی۔"

حضرت شیخ رکن الدین سہروردی نے نماز جنازہ پڑھائی ۔ بادشاہ کے علاوہ ان لوگوں نے بھی میت کو کندھا دیا جو خواجہ صاحب کی زندگی میں ان کے مخالف تھے۔ یہ غالباً بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے کیا گیا۔

محبوب الٰہیؒ کے خلفاء حضرت کے خلفاء کی فہرست بہت طویل ہے۔ مشہور خلفاء یہ ہیں : شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی، شیخ قطب الدین منور، شیخ حسام الدین ملتانی، شیخ برہان الدین غریب، شیخ حسام الدین سوختہ، شیخ اخی سراج الدین، خواجہ شمس الدین دہاری، شیخ شرف الدین بو علی شاہ قلندر، شیخ منتخب الدین۔

خواجہ نصیر الدین چراغ نے دہلی، پنجاب، گجرات اور اودھ میں رشد و ہدایت کی شمع جلائی۔ شیخ اخی سراج الدین نے بہار بنگال اور آسام کے اطراف و اکناف میں شمع ہدایت روشن کی۔ برہان الدین غریب نے دکن کو اپنے فیوض و برکات سے روشن کیا۔ غرض ان سب حضرات کرام نے ہندوستان کے مختلف گوشوں کو ضیائے اسلام سے منور کیا۔

محبوب الٰہیؒ کے پانچ پیارے سیر الاولیا وغیرہ کتب قدیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب الٰہی کو اپنے خلفاء میں پانچ بہت زیادہ عزیز تھے۔ خواجہ حسین کرمانی، خواجہ سید محمد امام، خواجہ سید رفیع الدین ہارون، امیر خسرو اور امیر حسن سنجری۔

حضرت امیر خسرو اور حضرت سید رفیع الدین ہارون اور حضرت سید حسین کرمانی اور حضرت خواجہ حسن علا سنجری کو خلافتیں تو ملی تھیں مگر یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ لوگوں کو بیعت کرتے تھے یا نہیں۔ مگر حضرت خواجہ محمد امام کی بابت سیر الاولیا میں تفصیل سے لکھا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ نے صرف انہی کو یہ اجازت دی تھی کہ وہ حضرت سلطان المشائخ کی موجودگی میں لوگوں سے بیعت لیں اور جب کہیں سے کسی مجلس کا بلاوا آتا تھا تو حضرت سلطان المشائخ انہی کو اپنا قائم مقام بنا کر بھیجتے تھے اور اپنی مجلس میں بھی خواجہ سید محمد امام ہی کو سب سے اونچی جگہ بیٹھنے کے لیے عطا فرماتے تھے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کو ان سے بہت زیادہ محبت تھی۔

خواجہ سید حسین کرمانیؒ سیر الاولیا میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ سید حسین کرمانی کو حضرت سلطان المشائخ کا منہ بولا بیٹا سمجھا جاتا تھا اور وہ تمام خلفاء کی عرض معروض حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں پیش کرتے تھے ۔ خلافت نامے بھی عموماً انہی کے قلم سے لکھوائے جاتے تھے۔ خواجہ حسین کرمانی بہت جامہ زیب تھے ۔ سادات اور صوفیائے کرام کے رواج کے موافق لباس پہنتے تھے۔ مگر لباس کا کپڑا نہایت قیمتی اور اعلیٰ ہوتا تھا۔ اور پان بھی بہت کھاتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر کسی وقت ایک پان دس روپے قیمت میں ملتا تب بھی

اسی قیمت میں پان لے کر استعمال کرتے تھے۔ حضرت سلطان المشائخ کی وفات کے بعد بہت عرصے تک زندہ رہے یعنی حضرت کا وصال ۷۲۵ھ میں ہوا تھا اور یہ ۷۵۲ھ تک زندہ رہے تھے۔ سیرالاولیاء کے صفحہ ۲۲۲ پر یہ بھی مذکور ہے کہ جب خواجہ جہاں احمد ایاز سلطان محمد تغلق کا وزیر اعظم ہو گیا، جس نے حضرت سید حسین کرمانی کا قرب حضرت سلطان المشائخ کی مجلس میں دیکھا تھا تو اُس نے سید حسین کرمانی سے درخواست کی کہ آپ بھی دیوگیر میں تشریف لائیے اور میرے پاس قیام کیجیے، کیوں کہ سلطان محمد تغلق ان دنوں دیوگیر (دولت آباد) میں رہتا تھا۔ سید صاحب نے جواب دیا میں اس شرط پر وہاں آؤں گا کہ اپنا لباس نہیں بدلوں گا اور کوئی نوکری قبول نہیں کروں گا۔ سلطان محمد تغلق کے وزیر اعظم خواجہ جہاں احمد ایاز نے ان شرطوں کو قبول کیا اور سید دہلی سے دولت آباد تشریف لے گئے اور وہاں مقیم رہے۔ ۱۲ شعبان ۷۵۲ھ جمعرات کے دن فالج کی بیماری میں وفات پائی اور اپنے والد حضرت مولانا خواجہ سید محمد کرمانی کے مزار کے قریب دفن کیے گئے۔

۲۔ خواجہ سید محمد امام | ان کا تذکرہ راجکمار ہردیو عرف احمد ایاز خواجہ جہاں کی کتاب چہل روزہ میں بہت تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ سیرالاولیا کے مصنف نے جو حالات ان کے اور ان کے بھائی خواجہ سید موسیٰ کے لکھے ہیں اُن سے پوری طرح ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں بھائی حضرت سلطان المشائخ کے مقبول پیاروں میں تھے۔

۳۔ خواجہ سید رفیع الدین ہارون | سیرالاولیا کے صفحہ ۲۰۹ پر لکھا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ اپنے پوتے خواجہ سید رفیع الدین ہارون سے اتنی محبت کرتے تھے کہ جب تک وہ دسترخوان پر نہ آ جاتے تھے کھانا شروع نہ کرتے تھے اور ان کے آنے کا انتظار کرتے رہتے تھے اور چونکہ خواجہ سید رفیع الدین ہارون کو تیر کمان وغیرہ فنون سپہ گری سے رغبت تھی اس واسطے حضرت ان کی دلجوئی کے لیے جب ان سے مخاطب ہوتے تھے تو سپاہیانہ شوق کی باتیں کرتے تھے اور اپنی زندگی میں ان کو اپنے حظیرے اور خانقاہ کا متولی اور منتظم بنا دیا تھا۔ ان کا مزار حضرت سلطان المشائخ کے پائیں گوشہ مشرق و جنوب میں ہے۔ قریب ہی ان کے دادا حضرت خواجہ سید صالح کا مزار ہے۔

۴۔ امیر خسرو | امیر خسرو کا ذکر اسی باب میں پہلے ہو چکا ہے۔ سیرالاولیا اور بعض دوسری کتابوں میں ان کے جو حالات درج ہیں ان کا اقتباس یہ ہے کہ

امیر خسرو کے والد کا نام امیر سیف الدین محمود تھا جو لاچین نسل کے ترک تھے۔ امیر خسرو ۶۵۱ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت اس کے نانا راوت عرض کی عمر ۱۱۶ برس کی تھی۔ باپ نے ان کا نام ابوالحسن رکھا تھا۔ جب پیدا ہوئے تو اُن کے والد ان کو کپڑے میں لپیٹ کر پڑوس کے ایک مجذوب کے پاس لے گئے۔ مجذوب نے ان کو دیکھ کر کہا یہ بچہ تو خاقانی سے دو قدم آگے بڑھ جائے گا۔ ہوش سنبھالا تو حضرت سلطان المشائخ کے مُرید ہو گئے۔ اُس وقت انھوں نے ایک شعر کہا تھا:

مفتخر از دے بغلامی منم   خواجہ نظام ست و نظامی منم

(حضرت کی غلامی سے مجھے فخر ہے۔ میرے خواجہ نظام ہیں اور میں نظامی ہوں)

جس وقت سے حضرت امیر خسرو نے یہ شعر کہا تھا حضرت سلطان المشائخ کے مریدوں میں اپنے آپ کو نظامی کہنے کا ایک خاص جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔

حضرت سلطان المشائخ نے ایک روز امیر خسرو سے فرمایا تم اپنی نظموں میں اصفہانی شعراء کا رنگ اختیار کرو، یعنی عشق و محبت کا رنگ تمھارے کلام میں زیادہ ہونا چاہیے۔ حضرت نے اس کی فوراً تعمیل کی اور اس سے ان کے کلام کو بہت زیادہ مقبولیت ہوئی۔ ایک روز امیر خسرو نے اپنا کلام حضرت کو سنایا تو حضرت نے خوش ہو کر فرمایا "مانگ کیا مانگتا ہے"؟ امیر خسرو نے عرض کی اپنے کلام میں شیرینی چاہتا ہوں۔ ارشاد ہوا میری چارپائی کے نیچے شکر سے بھرا ہوا ایک تھال رکھا ہے وہ اٹھا کر لا۔ امیر خسرو نے اس کو پیش کیا۔ حضرت نے تھوڑی شکر امیر خسرو کو اس میں سے کھلائی اور فرمایا یہ تھال اپنے سر پر رکھ۔ چنانچہ اس وقت سے حضرت کے کلام میں عجیب لذت اور شیرینی پیدا ہو گئی۔

حضرت امیر خسرو نے اپنا دیوان "تحفۃ الصغر" اور دوسرا دیوان "نہایۃ الکمال" مولانا رفیع الدین پانچہ کے والد مولانا قاضی معز الدین پانچہ کی معرفت حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں پیش کرایا۔ اس کے بعد سے امیر خسرو کی حاضری حضرت کی خدمت میں ہونے لگی اور حضرت نے ان کو محرم راز بنانے کا شرف عطا فرمایا، یہاں تک کہ پھر امیر خسرو جس کسی مضمون کی کوئی نئی کتاب لکھتے تھے، حضرت کی خدمت میں لے کر حاضر ہوتے تھے۔ حضرت اس کو دیکھ کر کبھی برکت کی دعا فرماتے تھے اور کبھی کسی مضمون پر اعتراض بھی کرتے تھے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصلاح مد نظر ہوتی تھی۔

حضرت امیر خسرو دن بھر بادشاہوں کی صحبت میں رہتے تھے۔ رات کو اپنے گھر میں ہوتے تو قرآن مجید کے سات پاروں کی تلاوت کرتے اور تہجد ادا فرماتے تھے یا حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں شب باشی کرتے تو حضرت کے ساتھ شب بیداری کرتے تھے۔

ایک روز امیر خسرو نے سلطان المشائخ سے عرض کی آج کل تہجد کے وقت بہت رونا آتا ہے"، ارشاد ہوا خدا کا شکر ہے کہ اب کچھ کچھ ظاہر ہونا شروع ہو گیا ہے۔

حضرت سلطان المشائخ خاص اپنے ہاتھ سے خطوط لکھ کر بھیجا کرتے تھے، جن کے اندر بے بہا اور بیش قیمت باتیں ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ حضرت نے امیر خسرو سے خطاب فرمایا:

"میں سب سے تنگ ہو جاتا ہوں، مگر اے ترک تجھ سے کبھی تنگ نہیں ہوتا۔ دوسری بار فرمایا کہ میں سب سے تنگ ہو جاتا ہوں، یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی مگر سوائے تیرے اے ترک۔ ایک دفعہ حضرت نے امیر خسرو سے تخلیے میں فرمایا میری سلامتی کی دعا مانگ کہ تیری سلامتی میری سلامتی پر منحصر ہے۔ کیونکہ تو میرے بعد جلد ہی دنیا سے رخصت ہو جائے گا اور یہ بھی دعا کر کہ لوگ تجھ کو میرے قریب دفن کریں، اور انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا"۔

امیر خسرو نے یہ بھی کہا کہ میرے حضرتؒ مجھے ہمیشہ "ترک اللہ" فرمایا کرتے تھے اور جتنے خطوط میرے نام لکھتے تھے ان کے شروع میں "ترک اللہ" لقب تحریر فرماتے تھے۔

ایک روز کا ذکر ہے حضرت نے فرمایا : میں نے خواب میں حضرت شیخ بہاؤالدینؒ کو دیکھا کہ وہ میرے پاس تشریف لائے ہیں۔ اُسی وقت تو امیر خسرو وہاں آیا اور معرفت کے نکات بیان کرنے لگا۔ یکایک صالح مؤذن نے صبح کی اذان کہی اور میری آنکھ کھل گئی۔ پھر ارشاد ہوا کہ یہ بہت بڑی بات ہے کہ تجھ کو میں نے ایسے مقام میں دیکھا۔ تجھ کو چاہیے کہ بزرگوں کے کلمات ہر وقت اپنے سامنے رکھا کرے۔ اس کے بعد اپنی خاص ٹوپی منگائی اور میرے پر سر رکھی۔

ایک روز حضرتؒ نے اپنی زبان مبارک سے میری نسبت یہ رباعی ارشاد فرمائی :

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم | ملکیت ملک سخن آں خسرو راست
آں خسرو ماست ناصر خسرو نیست | زیراکہ خدائے ناصر خسرو ماست

۵۔ امیر حسن علا سنجریؒ سیرالاولیا کے صفحہ ۳۰۶ سے ۳۰۷ تک حضرت خواجہ حسن علا سنجریؒ کے حالات درج ہیں، جن میں حضرت سلطان المشائخ کی اس خاص توجہ کا ذکر ہے، جو خواجہ حسن پر حضرت کی تھی۔ مصنف سیرالاولیا نے یہ بھی لکھا ہے کہ حسن علا سنجری نے جو ملفوظات حضرت سلطان المشائخ کے فوائد الفواد کے نام سے جمع کیے تھے۔ اُن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ حسن نے وہی الفاظ نقل کیے تھے جو حضرت کی زبان سے نکلے تھے، اس لیے یہ کتاب گھر گھر مقبول ہوئی۔ حسن علا سنجری آٹھویں دن اپنے لکھے ہوئے ملفوظات حضرت سلطان المشائخ کو دکھاتے تھے اور حضرت اپنے قلم مبارک سے اُن کو کبھی کبھی درست بھی فرماتے تھے۔ حضرت خواجہ حسن ساری عمر مجرّد رہے شادی نہیں کی اور آخر عمر میں دولت آباد تشریف لے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔

سلسلہ نظامیہ کی اشاعت اب اس سلسلے کی گزشتہ اور موجودہ حالت بیان کی جاتی ہے۔ محبوب الٰہیؒ کے خلفا میں صرف تین چار بزرگ ایسے گزرے ہیں، جن سے نظامیہ سلسلے کو بہت ترقی ہوئی اور یہ بات ہر بزرگ کے زمانے میں پائی جاتی تھی کہ اولاد سے سلسلہ نہ پھیلتا تھا بلکہ خلفاء سے چلتا تھا۔ حضرت خواجہ صاحب اجمیریؒ کے بہت سے خلفا بھی تھے اور فرزند بھی تھے مگر سلسلہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے پھیلا اور حضرت خواجہ قطب صاحبؒ کے بھی خلفا بہت تھے لیکن سلسلے کو ترقی دینے والے تین بزرگ ہوئے : ایک حضرت مخدوم جمال الدین ہانسویؒ جن سے جمالیہ سلسلہ چلا۔ دوسرے حضرت سلطان المشائخؒ جن سے نظامیہ سلسلہ جاری ہوا۔ تیسرے حضرت مخدوم علاؤالدین علی احمد صابرؒ، جن سے صابریہ سلسلہ جاری ہوا۔ اسی طرح حضرت سلطان المشائخ کے بھی بہت سے خلفا تھے۔ لیکن سلسلے کو بڑھانے والے صرف دو بزرگ سب سے نمایاں رہے : ایک حضرت مخدوم نصیرالدین محمود چراغ دہلیؒ اور دوسرے حضرت مخدوم اخی سراجؒ۔ حضرت چراغ دہلویؒ سے نظامیہ نصیریہ سلسلہ جاری ہوا۔ سراجیہ سلسلہ زیادہ تر صوبۂ بہار و بنگال اور آسام میں پھیلا اور حضرت خواجہ سالار بن سے نظامیہ سلسلہ چین میں پھیلا اور حضرت چراغ دہلویؒ کے ذریعے پنجاب، راجپوتانہ، گجرات، دکن کے علاقوں میں سلسلے کی اشاعت ہوئی۔

نظامیہ سلسلے کے مجدد مغل حکومت کے آخری دور میں حضرت مولانا نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے فرزند حضرت مولانا فخرالدین اورنگ آباد سے دہلی میں تشریف لائے، جو نظامیہ سلسلے کے مجدد ثابت ہوئے۔ ان کے زمانے تک نظامیہ نصیریہ سلسلہ

تمام ہندوستان میں عالمگیر نہیں ہوا تھا، صرف دکن میں حضرت بندہ نواز سید محمد گیسو درازؒ سے سلسلہ پھیلا تھا اور گجرات میں حضرت شیخ کمال الدین علامہؒ کے ذریعے سلسلے کی اشاعت ہوئی تھی۔ لیکن حضرت مولانا فخر صاحبؒ نے دہلی میں بیٹھ کر اس سلسلے کی اشاعت کا بہت بڑا کام کیا۔ ان کے زمانے میں حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ بہت بڑے عالم اور جگت استاد عالم دہلی میں موجود تھے، جن کو حضرت مولانا فخر صاحبؒ کی ترقی اچھی معلوم نہ ہوئی اور انھوں نے ایک رسالہ لکھا، جس میں یہ اعتراض تھا کہ چشتیہ سلسلہ حضرت علیؓ تک متصل نہیں ہوتا، کیوں کہ حضرت خواجہ حسن بصریؒ حضرت علیؓ کے زمانے میں بہت کم عمر تھے اور کم عمری میں ان کو روحانی خلافت کیوں کر مل سکتی تھی؟ اس کے جواب میں حضرت مولانا فخر صاحبؒ نے ایک محدثانہ اور محققانہ رسالہ عربی زبان میں فخر الحسن کے نام سے لکھا اور عالمانہ انداز سے ثابت کر دیا کہ حضرت خواجہ حسن بصریؒ حضرت علیؓ کے زمانے میں کم عمر نہیں تھے بلکہ روحانی خلافت کی اہلیت رکھتے تھے۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی دہلی اور ہندوستان کے علما اور مشائخ میں حضرت مولانا فخر صاحبؒ کی دھوم مچ گئی اور دور دور سے اہل علم ان سے فیض حاصل کرنے کے لیے آنے لگے۔ حضرت مولانا فخر صاحبؒ کی روحانی تعلیم ایسی عجیب و غریب تھی کہ ان کے خلفا جہاں بھی گئے نظامیہ سلسلے کو چار چاند لگا کر روشن کر دیا۔ چنانچہ پنجاب میں حضرت مولانا نور محمد صاحب مہارویؒ کو بھیجا گیا، جن سے سارا پنجاب منور ہو گیا، اور آج تونسہ شریف ، چاچڑاں شریف ، سیال شریف گولڑہ شریف اور جلال پور شریف وغیرہ خانقاہیں حضرت مولانا نور محمد صاحب مہارویؒ کے فیض سے روشن ہیں۔ روہیل کھنڈ میں حضرت مولانا شاہ نیاز احمد صاحب نیاز بریلوی نے نظامیہ سلسلہ چمکایا اور پھیلایا۔ دہلی میں حضرت حاجی لال محمد صاحب اور حضرت حافظ لقمان صاحب سے سلسلے کی بڑی اشاعت ہوئی۔ جے پور میں حضرت مولانا ضیاء الدین تشریف لے گئے اور تمام راجپوتانہ کو روشن کر دیا۔

حضرت مولانا فخر صاحبؒ کے فرزند حضرت میاں قطب الدین صاحبؒ تھے اور ان کے فرزند حضرت میاں نصیر الدین کالے صاحبؒ تھے۔ ان سے بھی سلسلہ چلا تھا، مگر زیادہ ترقی حضرت مولانا فخر صاحب کے خلفا سے ہوئی۔

حضرت مولانا نور محمد صاحب مہارویؒ کے خلیفہ حضرت شاہ سلیمان صاحب تونسویؒ ہوئے، جن کے جانشین حضرت خواجہ اللہ بخش صاحبؒ تھے اور ان کے جانشین حضرت حافظ موسیٰ صاحب تھے اور ان کے جانشین حضرت حامد صاحب تھے اور ان کے جانشین حضرت مولانا [illegible]رالدین صاحب ہوئے۔

حضرت مولانا شاہ سلیمان صاحبؒ کے بہت خلفا ہوئے جن میں حضرت مولانا شمس الدین صاحب سیالویؒ نے سلسلے کو بہت بڑھایا، جن کے ایک خلیفہ گولڑہ، راولپنڈی میں حضرت مولانا سید پیر مہر علی شاہ صاحب تھے، جن کے فرزند حضرت مولانا سید غلام محی الدین صاحب ہیں اور دوسرے خلیفہ پیر سید حیدر شاہ صاحب تھے، جن کا مزار جلال پور پنجاب میں ہے۔ ان کے سجادہ نشین حضرت مولانا پیر فضل شاہ صاحب ہیں، لیکن حضرت شاہ سلیمان صاحب تونسویؒ کے فرزند حضرت خواجہ اللہ بخش صاحب نے سلسلے کو اتنا پھیلایا کہ حضرت شاہ سلیمان صاحب تونسویؒ کے خلفا ان کے زمانے تک اتنا سلسلہ نہیں پھیلا سکے تھے۔

چاچڑاں، ریاست بہاول پور میں حضرت مولانا نور محمد صاحب مہارویؒ کے خلیفہ حضرت قاضی محمد عاقل صاحبؒ تھے۔ ان کے

جانشین حضرت خواجہ غلام فرید صاحبؒ ہوئے، جن سے نظامیہ سلسلے کی بہت زیادہ اشاعت ہوئی۔ ان کے جانشین حضرت محمد بخش صاحبؒ ہوئے۔

مہاراں شریف میں جہاں حضرت مولانا نور محمد صاحب کا مزار ہے وہاں بھی ریاست بہاولپور نے جاگیریں دی ہیں۔ اس واسطے حضرت مولانا نور محمد صاحب مہارویؒ کی اولاد میں کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا جو سلسلے کو ترقی دیتا۔

گجرات میں حضرت شیخ کمال الدین علامہؒ کی اولاد جب تک دنیا داری سے الگ رہی سلسلہ پھیلتا رہا۔ دکن میں حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کی درگاہ میں بھی ایک لاکھ روپے کے قریب جاگیر ہے۔ اس لیے وہاں بھی سلسلے کی اشاعت کا کام رُک گیا ہے اور ناقابلِ اظہار خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ اورنگ آباد میں بھی ایک بڑی جاگیر ہے جو حضرت میاں کالے صاحبؒ کی اولاد کے قبضے میں ہے، اس لیے وہاں بھی سلسلے کی اشاعت کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ کیوں کہ جاگیر کی مقدمہ بازیوں کے سبب کسی کو اس طرف متوجہ ہونے کا وقت نہیں ملا۔

<u>نظامیہ سراجیہ سلسلہ</u> | حضرت مخدوم اخی سراجؒ کا مزار مالوہ بنگال میں ہے۔ ان کے سلسلے کی یوپی اور بہار اور بنگال اور آسام میں بہت سی خانقاہیں ہیں، مگر سلسلے کی اشاعت سب سے زیادہ پھلواری شریف کے سجادہ نشین حضرت مولانا محی الدین کے ذریعے سے ہوئی۔ کٹرہ مانک پور اور سہسرام وغیرہ مقامات میں بھی نظامیہ سراجیہ سلسلے کے مشائخ سلسلے کی اشاعت کر رہے ہیں۔ سلون ضلع رائے بریلی یوپی میں بھی ایک بڑی خانقاہ نظامیہ سراجیہ سلسلے کی ہے، جہاں جاگیر نے غفلت اور بے حسی پیدا کر دی ہے۔

الغرض مولانا فخر صاحبؒ سلسلہ نظامیہ کے مجدد تھے اور آج کل تمام ہندوستان میں نظامیہ سلسلے کی ترقی اور رونق حضرت مولانا فخر صاحبؒ کی روحانیت سے وابستہ ہے۔

صفی پور ضلع اُناؤ میں بھی نظامیہ سلسلے کی بہت بڑی خانقاہ ہے۔ اور یوپی میں صفی پوری مشائخ کے ذریعے نظامیہ سلسلے کی بہت اشاعت ہوئی ہے اور حیدر آباد دکن میں بھی حضرت مولانا فخر صاحب کے خلفا کی شاخیں موجود ہیں، جن سے نظامیہ سلسلہ سارے دکن میں پھیل رہا ہے۔ حضرت شاہ سلیمان تونسویؒ کے ایک خلیفہ حضرت حافظ محمد علی صاحب خیر آبادی تھے، جن کا مزار خیر آباد ضلع سیتاپور میں ہے۔ ان کے جانشین حضرت حافظ محمد اسلم صاحبؒ بہت بڑے بزرگ تھے۔ ان کے بعد ان کے جانشین میاں امتیاز حسین صاحب ہوئے تھے۔ حضرت حافظ محمد علی صاحب خیر آبادیؒ کے خلفا حیدر آباد میں بڑے بڑے کامل گزرے ہیں، جن میں ایک خلیفہ مولانا حسن الزماں صاحبؒ تھے، جنھوں نے رسالہ فخر الحسن کی ایک ضخیم شرح عربی زبان میں "القول المستحسن" کے نام سے لکھی تھی اور شائع کی تھی۔ بارہ جلدیں فضائل بیت کی لکھی تھیں، جن میں سے کئی شائع ہو چکی ہیں اور باقی قلمی ہیں۔ اور دوسرے خلیفہ حضرت حافظ محمد علی صاحب خیر آبادیؒ کے حضرت حبیب علی شاہ صاحبؒ حیدر آباد میں آباد تھے۔ ان سے بھی یہ سلسلہ بہت پھیلا اور تیسرے خلیفہ حضرت سردار بیگ صاحبؒ تھے۔ ان سے بھی حیدر آباد دکن میں نظامیہ سلسلے کی بہت اشاعت ہوئی مگر ان میں سے کوئی بھی جاگیر دار نہیں ہے۔

آستانہ عالیہ اور دیگر عمارتیں حضرت سلطان المشائخ خواجہ سید نظام الدین اولیا محبوب الہیؒ کا مزار جہاں ہے، اس کے اطراف میں چاروں طرف کئی کئی میل تک بے شمار قبریں ہیں کیونکہ یہ عقیدہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے کہ جو شخص حضرت سلطان المشائخ کے جوار اور پڑوس میں دفن ہوگا اللہ تعالیٰ اس کو نجات دے گا۔ آستانہ عالیہ اور اس کے قرب جوار کی چند مشہور قبروں کا حال درج ذیل ہے :

حضرت کے مزار کے شرق میں آدھ میل کے فاصلے پر جمنا دریا کے کنارے شہنشاہ ہمایوں کا مقبرہ ہے، جس کے گوشہ شرق وشمال میں حضرت سلطان المشائخ کی خانقاہ ہے اور اس خانقاہ کے غرب میں حضرت سید شمس الدین اوتار اللہ کا مزار مبارک ہے، جو حضرت سلطان المشائخ کے زمانے میں تھے اور اسپین کا مشہور سیاح ابن بطوطہ بھی ان سے ملا تھا۔ یہاں منت ماننے والے لوگ چاندی کے پتے چڑھاتے ہیں اور مچھلی پکا کر نیاز دلواتے ہیں۔ اس مزار اور مقبرہ ہمایوں کے قریب جنوب و غرب میں عرب سرائے ہے، جہاں ہمایوں بادشاہ کی بیوی نے عربوں کو آباد کیا تھا، جو ہمایوں کی قبر پر قرآن شریف پڑھتے تھے۔ اب یہ سرائے ویران ہو گئی ہے۔ عرب لوگ سب مر گئے یا دہلی جاکر آباد ہو گئے اور غیر مسلم باشندے قریب کی نئی آبادی جنگ پورے میں چلے گئے۔ عرب سرائے کے گوشہ شمال وغرب میں حلیمہ کا باغ ہے۔ یہاں عیسیٰ خاں کا مقبرہ اور ایک مسجد بھی ہے۔ عیسیٰ خاں شیر شاہ سوری کے اُمرا میں تھا۔ عرب سرائے کے غرب اور متھرا کی سڑک کے شرق میں عربوں کا قبرستان ہے، جس کو تربہ کہتے ہیں۔ اسی جگہ مولوی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ کی قبر بھی ہے۔ اس کے غرب میں وہ سڑک ہے جو دہلی سے متھرا کو جاتی ہے اور سڑک کے کنارے پر شہنشاہ اکبر کے مشہور امیر اور ہندی زبان کے نامور شاعر عبدالرحیم خان خاناں کا مقبرہ ہے۔ یہ مقبرہ بھی حضرت سلطان المشائخ کے قرب کی وجہ سے بنایا گیا تھا۔ اس کے قریب انگریزوں نے نئی آبادی جنگ پورہ کے نام سے بسائی ہے۔ متھرا روڈ کے غرب میں بنگلے والی مسجد ہے، جو مرزا الٰہی بخش صاحب مرحوم نے بنوائی تھی اور جہاں حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ رہتے تھے اور تعلیم دیتے تھے — وہیں ان کے اور ان کے فرزند حضرت مولانا میاں محمد صاحب کے مزارات ہیں۔ اس مسجد کے غرب میں حضرت سلطان المشائخ کا بنوایا ہوا چبوترہ تھا، جس پر حضرت کے خلفا کے مزارات تھے۔ یہ مزارات اب بھی موجود ہیں۔ سنگ خارا کے بڑے بڑے تعویذ ہیں، مگر مٹی میں دب گئے ہیں۔ کیوں کہ یہاں مرزا الٰہی بخش صاحب نے اپنا اصطبل بنوایا تھا اور ان کے وارثوں نے یہ زمین فروخت کر دی تھی، جس کے بعد یہاں رہائش کے مکان بن گئے ہیں۔

بسنتی برج کے غرب میں ملا ہوا جلال الدین خلجی کا کوشک لال ہے جہاں ابن بطوطہ ٹھہرا تھا اور عباسیوں کے آخری خلیفہ کا پوتا بھی ٹھہرا تھا اور اسی جگہ سلطان محمد تغلق کی بہن کی شادی عباسی خلیفہ کے پوتے سے ہوئی تھی۔ جنوب میں نواب لوہارو کے خاندان کی قبریں ہیں اور انھی قبروں میں مرزا غالب بھی مدفون ہیں اور مرزا غالب کی بائیں فصیل کے اندر سنگ مرمر کی ایک شاندار عمارت ہے جس کو چونسٹھ کھمبہ کہتے ہیں، جس میں شہنشاہ اکبر کے دودھ بھائی مرزا عزیز کوکلتاش اور ان کے خاندان کی قبریں ہیں۔ چونسٹھ کھمبے کے جنوب میں باہر کے رُخ بہت سی قبریں ہیں، جو غالباً ڈھائی سو برس پہلے کی ہیں۔ ان میں ایک قبر مرمت کے وقت کھل گئی تھی اور اس کے

اندر سے سفید داڑھی کے ایک بزرگ کی لاش نکلی تھی جن کا کفن بھی سلامت تھا اور چہرے کی کھال اور بال بھی سلامت تھے۔

بری کے گنبد کے غرب میں خان اعظم سید شمس الدین خاں اتکہ کا خوبصورت مقبرہ ہے، جو سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ اس مقبرے کے غرب میں حضرت مولانا حافظ خواجہ سید موسیٰ کا مزار ہے جو درگاہ کی جالیوں سے ملا ہوا ہے۔ مزار کے شرق میں احمد ایاز خواجۂ جہاں کی بنائی ہوئی برجی ہے اور جالیوں کے غرب میں حضرت سلطان المشائخ کا مزار شریف ہے۔ حضرت کے مزار کے گوشۂ شمال و شرق میں مرادوں کا پیالہ ہے۔ یہ سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے، اس میں گیارہ من دُودھ آتا ہے۔ اس کے قریب شمال میں نواب اعتقاد خاں کا مقبرہ ہے جو عالمگیر کے زمانے میں ایک امیر تھے اور صوبہ بہار کے رہنے والے تھے۔ اس حجرے کے پاس ایک بڑی املی ہے۔ اس سے ملا ہوا درگاہ کا مالن دروازہ ہے، جس کے سامنے ایک اونچے چبوترے پر اُمرائے دہلی کے تاریخی اور سنگیں مزارات ہیں۔ مالن دروازے کے غرب میں سنگ مرمر کا ایک چبوترہ ہے جس پر محمد شاہ کے پوتوں کی قبریں ہیں اور ان قبروں کے شمال میں مغلوں کا بنایا ہوا سماع خانہ ہے۔ اس سماع خانہ کے غرب میں نواب محمد اسحٰق خاں صاحب اور اُن کے اجداد کے مزارات ہیں اور اُن سے ملے ہوئے چند حُجرے ہیں۔ اس کے بعد علاؤالدین خلجی کے ولی عہد خضر خاں کی بنوائی ہوئی مسجد ہے، جہاں حضرت سلطان المشائخ کے زمانے کا وہ تاریخی سنگی چراغ دان ہے، جس میں چھ سو برس سے آج تک مرادیں ماننے والے اولاد کی مرادوں کے لیے چراغ روشن کرتے ہیں۔ اس چراغ دان کو مرادوں کی جھل ملی کہا جاتا ہے۔ اس چراغ دان میں بارہ طاق ہیں اور چراغ دان کے اوپر مسجد کا نشان بنا ہوا ہے اور ...

... اس چراغ دان کے غرب میں مسافر خانے کے غربی دروازے سے ملا ہوا حضرت خواجہ سالار حسن بن کا مزار ہے، جو سلطان المشائخ کے مرید و خلیفہ تھے اور جن کے ذریعے چین میں نظامیہ سلسلہ پھیلا تھا۔

خضر خاں کی مذکورہ مسجد کی جنوبی دیوار سے ملحق اور حضرت سلطان المشائخ کے پائیں چشتی منزل ہے، جس کے شرق میں درگاہ کے اندر شاہجہان بادشاہ کی بیٹی جہاں آرا بیگم کا مقبرہ ہے۔ اس کے شرق میں محمد شاہ رنگیلے کا مقبرہ ہے اور اس کے شرق میں بہادر شاہ کے بھائی مرزا جہانگیر اور مرزا بابر کا مقبرہ ہے اور اس کے شرق میں حضرت سلطان المشائخ کے خادمِ خاص خواجہ عبدالرحمٰن کا مزار ہے، جس کے اطراف میں مرزا الٰہی بخش اور ان کی اولاد کی قبریں ہیں۔ مقبرہ مرزا جہانگیر کے جنوب میں حضرت مولانا خواجہ سید رفیع الدین ہارونؒ کا مزار ہے اور ان کے برابر ان کے دادا خواجہ سید صالحؒ کا مزار ہے۔ اس احاطے کے جنوب میں حضرت خواجہ سید ابوبکر مصلّیٰ بردار اور ان کے بھائی اور اولاد کے مزارات ہیں اور درگاہ میں آنے کا مشرقی دروازہ ہے اور اس دروازے کے اندر آتے ہی سنگ مرمر کا بنا ہوا حضرت حاجی لال محمد کا مزار ہے اور ان کے پائیں حضرت قطب الدین کاشانی کا مزار ہے اور اس کے پائیں اور بہت سے سنگی مزارات ہیں جن میں سے بعض پر کتبے لگے ہوئے ہیں۔

حضرت شیخ ابوالفتح رکن الدینؒ

ولادت ــــــــــــ ملتان ۶۴۷ھ

وفات ــــــــــــ ملتان ۷۳۵ھ

ابتدائی حالات | شیخ ابوالفتح رکن الدینؒ ملتان کے اولیاء مشائخ میں سے ہیں۔ شیخ صدرالدینؒ کے فرزند، شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے اور حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کے پیرومرشد ہیں۔ آپ کی والدہ کا نام بی بی راستی تھا، جو زہد و تقدس میں اونچا درجہ رکھتی تھیں۔ شیخ رکن الدین کی ولادت سے قبل حضرت بہاؤالدین زکریاؒ نے ان کے متعلق اشارہ کیا تھا۔

ظاہری تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی اور جد امجد نے باطنی علوم سے آراستہ کیا۔ باپ اور دادا دونوں کو بہت پیارے تھے چونکہ شیخ رکن الدین اپنے باپ اور دادا دونوں کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے اور کبھی ان کے سامنے آنکھیں نہ اٹھاتے تھے اس لیے خواجہ شمس الدین تبریزی نے متاثر ہو کر انھیں رکن الدین عالم کا خطاب دیا تھا۔ اور وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ انھیں دونوں بزرگوں کی صحبت میں انھوں نے صوری اور معنوی کمالات حاصل کیے۔ علم، تواضع، شفقت، حلم، موافقت، بشاشت، مروت، عفو، حیا، وقار، حسن ظن اور تسخیر نفس جملہ صفات ان میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں اور انھوں نے مکاشفہ و محاسبہ سے اتنے مدارج طے کر لیے تھے کہ ان کو "مخزن مشہود الٰہی، منبع جود نامتناہی، ادریس خلوت وحدت، برجیس برج معرفت، گوہر معدن، صفات لاریب، لولوئے بحر، دریائے غیب، زبدۃ المشائخ، مفتاح قفل حق الیقین کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ سیرالعارفین کے مؤلف نے ان کے روحانی مرتبہ کی مدح ان الفاظ میں کی ہے:

جہان معرفت سلطان معنی	وجودش آیتے در شان معنی
دلش از طلعت اسرار مسرور	ہمیشہ جانش از انوار معمور
بباطن در حقیقت رفتہ بے باک	بظاہر در شریعت چست و چالاک
بریدہ گردن شیطان خناس	خریدالش ز تیغ پاس انفاس
بملک فقر از کشف و کرامات	زدہ بر عرش کوس استقامات
کلامش پاک از طامات و از شطح	یگانہ شیخ رکن الدین ابوالفتح
بملک فقر جز نعمت نبودش	جمالی ریزہ چین خوان جودش"

زہد و ریاضت | شیخ کے متعلق ان کے خلیفہ حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ لکھتے ہیں کہ آپ تہجد کے وقت سے دوپہر تک عبادت

ریاضت میں مصروف رہا کرتے تھے۔ جب والد کی مسندِ خلافت پر تشریف فرما ہوئے تو عمر مبارک چھتیس برس کی تھی۔ اس وقت تک درجہ کمال کو پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ دُور دُور سے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیضیاب ہوتے۔ حاجت مندوں کی حاجت روائی فرماتے۔ چنانچہ لوگ انھیں "قبلہ حاجات" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ کشف کی یہ حالت تھی کہ دل کی بات جان لیا کرتے تھے اور جو حاجتمند آتا اس سے کچھ سُنے بغیر اس کی دلجوئی فرما دیا کرتے تھے۔

عوام کے علاوہ بادشاہوں سے بھی آپ کے تعلقات تھے اور امراء بھی آپ کے معتقد اور غلام تھے۔ آپ کے زمانہ میں علاؤالدین خلجی دہلی کے تخت پر متمکن تھا۔ آپ ایک مرتبہ ملتان سے دہلی تشریف لے گئے تو سلطان نے شاہانہ شان و شوکت سے آپ کا استقبال کیا اور بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے محل میں لے گیا، بہت سا روپیہ نذر کیا۔ رخصت کے وقت مزید رقم پیش کی۔ شیخ نے رقم قبول فرمالی مگر ساری کی ساری وہیں فقراء میں تقسیم کر دی، ساتھ کچھ نہ لے گئے۔

خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے تعلقات

حضرت نظام الدین اولیاؒ سے آپ کو بہت محبت تھی۔ خواجہ نظام الدینؒ بھی آپ کی بہت عزت کیا کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں، میں ملتان سے دہلی صرف خواجہ کی زیارت کے لیے گیا تھا، چنانچہ جب سلطان علاؤالدین استقبال کو آیا تو خواجہ نظام الدین اولیاؒ بھی آپ کی عزت افزائی کے لیے وہاں تشریف لائے تھے، اگرچہ آپ سلطان کے ہاں مہمان ٹھہرے مگر زیادہ وقت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ساتھ بسر کیا کرتے تھے۔

ایک اور موقع پر جب آپ دہلی تشریف لائے تو نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے مسجد میں تشریف لے گئے۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ نماز ختم ہو گئی تو خواجہ نظام الدینؒ اپنی جگہ سے اٹھے اور شیخ رکن الدینؒ کے پاس آئے، جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو دونوں نے بڑی گرمجوشی سے معانقہ کیا۔ باتیں ہوتی رہیں، پھر دونوں بزرگ اپنے اپنے ڈولے میں سوار ہو کر چلے گئے۔

چند واقعات

ایک مرتبہ شیخ رکن الدین خواجہ صاحب سے ملاقات کے لیے ان کی خانقاہ میں تشریف لے گئے۔ شیخ کے پاؤں میں تکلیف تھی اس لیے جب ڈولے سے باہر آنے لگے تو خواجہ صاحب نے انھیں باہر آنے سے روک دیا اور خود اپنے مریدوں کے ساتھ ڈولے کے پاس ہی بیٹھے رہے اور باتیں ہوتی رہیں۔ اس گفتگو کا حال بیان کرتے ہوئے "بزمِ صوفیہ" کے مصنف لکھتے ہیں۔ شیخ رکن الدین کے بھائی شیخ عماد الدین اسمٰعیل کے دل میں بعض علمی نکات حل کرنے کا سوال پیدا ہوا، اور دونوں بزرگوں سے اجازت لے کر عرض کیا کہ ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کیا مصلحت تھی۔ حضرت شیخ رکن الدین نے فرمایا کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض کمالات کی تکمیل مدینہ منورہ کی ہجرت ہی پر موقوف و منحصر تھی، اس لیے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی جانب جلوہ فرما ہوئے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے ارشاد فرمایا کہ اس مسئلہ میں میری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے اپنے محبوب کو مدینہ طیبہ اس لیے بھیجا کہ وہ اصحاب صفہ جو اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے مکہ معظمہ حاضر ہونے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، وہ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے مستفیض و مستفید ہو کر ظاہری و باطنی کمالات میں مکمل ہو جائیں۔

اس گفتگو کے بعد حضرت محبوب الٰہی نے ڈولے ہی کے پاس کھانا منگوایا اور کھانے کے بعد اعلیٰ درجہ کا کپڑا اور سو اشرفیاں

شیخ رکن الدینؒ کی خدمت میں بہ طور نذر پیش کیں ۔ اشرفیوں کو دیکھ کر حضرت رکن الدین نے حضرت نظام الدین اولیا کو مخاطب کرکے فرمایا اُستُرْ ذَهَبَكَ (یعنی آپ اپنا سونا چھپائیے)، لیکن حضرت محبوب الٰہی نے برجستہ جواب دیا اُستُرْ ذَهَبَكَ وَ ذِهَابَكَ وَمَذْهَبَكَ (یعنی اپنے سونے کو جانے کو (مراد دارِ سلوک) اور جانے کی جگہ کو چھپائیے ۔ اس میں تجنیس لفظی بھی قابل غور ہے ۔ حضرت شیخ رکن الدین نے ان نذرانوں کو قبول کرنے میں تامل کیا تو حضرت محبوب الٰہی نے ان کے بھائی شیخ عماد الدین اسمٰعیل کے حوالے کر دیا ۔

شیخ رکن الدین کے قیام دہلی کے زمانہ میں بابا گنج شکرؒ کے عرس کے دن آگئے، چنانچہ پاک پٹن کی طرح دہلی میں بھی عرس منایا گیا ۔ عرس میں شیخ رکن الدین اور خواجہ نظام الدین دونوں شریک تھے ۔ مجلس سماع میں خواجہ صاحب پر وجد طاری ہو گیا اور اضطراب کی حالت میں کھڑا ہونے لگے، لیکن شیخ رکن الدین نے انھیں پکڑ کر بٹھا دیا ۔ تھوڑی دیر بعد پھر خواجہ صاحب پر وہی کیفیت طاری ہو گئی اور کھڑے ہو گئے ۔ اس مرتبہ شیخ رکن الدین نے انھیں بٹھایا نہیں بلکہ دوسرے بزرگوں کی طرح خود بھی بعنت بستہ مؤدب کھڑے ہو گئے ۔ جب محفل سماع ختم ہوئی تو کسی نے شیخ رکن الدین سے دریافت فرمایا کہ کیا وجہ تھی پہلی مرتبہ جب خواجہ صاحب کھڑے ہونے لگے تو آپ نے انھیں بٹھا دیا، مگر دوسری مرتبہ آپ نے ایسا نہ کیا ۔ شیخ نے فرمایا پہلی مرتبہ خواجہ کی رسائی عالم ملکوت تک ہوئی تھی جہاں تک میرا بھی گزر ممکن تھا، اس لیے میرا ہاتھ وہاں تک پہنچ گیا اور انھیں بٹھا دیا ۔ دوسری مرتبہ ان کی رسائی عالم جبروت میں ہوئی اور وہاں تک میں نہیں پہنچ سکا ۔ اس لیے خاموش رہا ۔

ایک اور موقع پر شیخ رکن الدین ملتان سے دہلی آئے تو خواجہ نظام الدینؒ سے بھی ملنے گئے ۔ عشرہ ذی الحجہ کا دن تھا ۔ جب ملاقات ہوئی تو شیخؒ نے خواجہ صاحبؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا ۔ یہ حج کا زمانہ ہے میں حج سے بہرہ ور تو نہیں ہو سکا مگر آپ کی زیارت سے مجھے حج کا ثواب ضرور پہنچ سکتا ہے ۔ خواجہ نظام الدین یہ سن کر آبدیدہ ہو گئے اور شرمندگی کا اظہار کیا ۔

ایک شخص نے خواجہ نظام الدینؒ سے کہا کہ میں آپ کے پاس آتا ہوں تو آپ ہمیشہ مجھے کچھ نہ کچھ کھلاتے ہیں مگر شیخ رکن الدین کے پاس کئی مرتبہ گیا انھوں نے کبھی مجھے کچھ نہیں کھلایا ۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا میں اس حدیث پر عمل کرتا ہوں :

مَنْ زَارَ حَيًّا وَلَمْ يَذُقْ مِنْهُ شَيْئًا فَكَأَنَّمَا زَارَ مَيِّتًا (یعنی جو شخص زندہ کی زیارت کرے اور اس کے یہاں کچھ نہ چکھے تو گویا اس نے مردے کی زیارت کی) ۔ اس شخص نے پوچھا کیا شیخ رکن الدینؒ تک یہ حدیث نہیں پہنچی ۔ خواجہ صاحبؒ نے فرمایا، شیخ عمل معنوی کرتے ہیں اور ذوق روحانی چکھاتے ہیں ۔

اس شخص کی شیخ رکن الدین سے ملاقات ہوئی تو اس نے شیخؒ سے کہا خواجہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ شیخ رکن الدین ذوق روحانی دیتے ہیں اور میں ذوق جسمانی دیتا ہوں ۔ شیخ نے فرمایا ۔ بھائی نظام الدین نے تواضع کی ہے اور ان میں دونوں وصف ہیں وہ ذوق روحانی بھی عطا کرتے ہیں اور ذوق جسمانی بھی ۔

شیخ عثمان: چونکہ شیخ رکن الدین کو خواجہ صاحب سے بہت الفت تھی، اسی لیے اپنے محبوب خلیفہ شیخ وجیہ الدین عثمان سیاح سنامیؒ

کو ان کے قریب دہلی ہی میں قیام کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔ شیخ وجیہ الدین کا مزار مبارک بھی دہلی ہی میں ہے۔ آپ سنام سے سیاحت کے لیے نکلے اور دہلی پہنچے تو ایک جگہ نہر کے قریب شیخ رکن الدین کو نماز پڑھتے دیکھا۔ جب ان کے چہرہ مبارک پر نظر پڑی تو عجیب کیفیت طاری ہوگئی اور وہیں ان سے ارادت ہوگئی۔ شیخ انھیں اپنے ساتھ ملتان لے گئے، جہاں وہ دو سال تک ان کی خدمت میں رہے۔ کلام پاک حفظ کیا اور شیخ شہاب الدینؒ کی کتاب عوارف بھی شیخ سے پڑھی۔ شیخ رکن الدین خود فرماتے ہیں کہ شیخ عثمان جس دن میرے مرید ہوئے اسی دن سے انھوں نے ترک دنیا اور تجرد کلی اختیار کر لیا۔ بدن پر ایک چھوٹے سے کپڑے کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ حج بھی اسی بے سروسامانی کی حالت میں کیا۔ ایک سال مدینہ منورہ میں رہ کر دو مرتبہ حج بیت اللہ شریف کیا، پھر دوسرے ملکوں کی سیاحت کو چلے گئے ۔

سات سال کے بعد ملتان آکر مرشد سے ملے۔ مرشد نے گلے سے لگایا اور سر کو بوسہ دیا۔ اپنا پیراہن انھیں پہنایا اور اپنی دستار ان کے سر پر رکھی۔ کچھ روز اپنے پاس رکھا پھر دہلی بھیج دیا۔ فرمایا وہیں رہنا جہاں خواجہ نظام الدین اولیا تشریف رکھتے ہیں۔ فرمایا وہاں جاکر خواجہ سے میرا اسلام کہنا اور جو جگہ تمھارے رہنے کے لیے پسند کریں وہیں قیام کرنا۔ چنانچہ آپ نے اسی طرح کیا اور خواجہ صاحبؒ کی صحبت میں رہ کر دین و دنیا کی کامرانی حاصل کرتے رہے ۔

خواجہ صاحب کو سماع کا بہت شوق تھا اور اکثر سماع کی مجلسیں منعقد کیا کرتے تھے۔ اتفاق سے شیخ عثمان بھی سماع کے بہت دلدادہ واقع ہوئے تھے، چنانچہ دونوں بزرگوں کی صحبت بہت اچھی رہی۔ ایک مرتبہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اپنی قیام گاہ پر تشریف فرما تھے کہ سامنے سے امیر حسن قوال اپنے ساتھیوں کی معیت میں گزرا۔ امیر حسن حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کو بہت عزیز تھا اور اس کے گانے پر فریفتہ تھے۔ امیر حسن کو بھی علم تھا کہ شیخ اور حضرت خواجہ میں گہرے تعلقات قائم ہیں۔ چنانچہ وہ شیخ کی خدمت میں آکر دست بستہ کھڑا ہوگیا۔ شیخ عثمان قوال کے ساتھ بڑی اچھی طرح پیش آئے اور کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ اس زمانے میں سلطان دہلی غیاث الدین تغلق نے سماع پر پابندی لگا رکھی تھی۔ چنانچہ امیر حسن نے گانا سنانے میں تامل کیا۔ شیخ عثمان نے دروازہ بند کر دیا اور اصرار کیا کہ ضرور کچھ سنایا جائے۔ چونکہ سماع خلاف قانون تھا، اس لیے امیر حسن نے نہایت دھیمی آواز میں گانا شروع کیا، اور اس مصرعہ کو

زاہد ز دیں برآمد و صوفی ز اعتقاد　　ترسا محمدی شد و عاشق ہما کہ نیست

بار بار پڑھا تو شیخ بے خود ہو گئے اور قوال سے فرمائش کی کہ زور زور سے گائے۔ قوال بھی شیخ کے جذبے اور بے خودی کو دیکھ کر بے اختیار ہو گیا اور اونچی آواز سے گانے لگا۔ شیخ نے دروازہ کھولنے کا حکم دے دیا۔ جونہی دروازہ کھلا کئی اور قوال بھی وہاں آپہنچے پھر دوسرے مشائخ اور صوفیہ بھی محفل میں آگئے۔ سماع بڑے زور شور سے ہونے لگا۔ کئی ہزار تماشائی بھی جمع ہو گئے اور کئی لوگوں کو وجد آنے لگا۔ شیخ عثمان مذکورہ بالا شعر پڑھتے ہوئے بے خودی کے عالم میں مجلس سے نکل کر تغلق آباد کی جانب چل دیے۔ قوال بھی ساتھ ساتھ گاتے چلے جا رہے تھے اور لوگوں کا مجمع ان کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ شیخ تغلق آباد میں شاہی محل کے پاس پہنچے۔ بادشاہ نے دیکھا تو خیال گزرا کوئی فتنہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اہل کاروں نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ شیخ عثمان نے صوفیوں اور قوالوں کی ایک کھلی مجلس سماع منعقد کر رکھی ہے۔ یہ

سنتے ہی سلطان برہم ہوگیا، مگر جلد ہی ان سے ایسا متاثر ہوا کہ حکم دیا انھیں اور ان کے ساتھیوں کو لاکر محل میں ٹھہرایا جائے۔ بادشاہ نے ان سب لوگوں کو تین دن تک شاہی مہمان کے طور پر رکھا اور خوب تواضع کی۔ جب رخصت ہونے لگے تو بادشاہ نے شیخ عثمان کو نذر پیش کی، مگر انھوں نے لینے سے انکار کردیا اور غیاث پور کی طرف چلے گئے۔

بادشاہوں کے ساتھ شیخ رکن الدین کے تعلقات محض خدا کی خاطر اور لوگوں کی خدمت کے لیے تھے۔ جب علاؤالدین خلجی کے بعد اس کا بیٹا قطب الدین خلجی تخت نشین ہوا تو خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے اسے عناد ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس نے دوسرے علماء اور شیوخ سے تعلقات بڑھا لیے۔ اس نے شیخ رکن الدین سے بھی اپنی شیفتگی کا اظہار کیا اور دہلی بلایا۔ جب وہ تشریف لائے تو بادشاہ نے پوچھا دہلی میں سب سے پہلے کس نے آپ کا استقبال کیا تھا۔ شیخ کو اچھی طرح علم تھا کہ بادشاہ کے دل میں خواجہ صاحب کی طرف سے عناد پیدا ہوچکا ہے تاہم آپ نے اس بات کی پروا نہ کی اور جواب دیا کہ میرا استقبال اس شخص نے سب سے پہلے کیا جو اس شہر کا سب سے اچھا آدمی ہے۔ یعنی خواجہ نظام الدین اولیاؒ۔

شیخ رکن الدین کا معمول تھا کہ جب کبھی بادشاہ کے ہاں جاتے راستے میں اپنی سواری ٹھہراتے جاتے تاکہ جو لوگ بادشاہ کی خدمت میں عرضیاں دینا چاہتے وہ ان کے حوالے کر دیتے۔ بعض کی معروضات زبانی بھی سنتے اور بادشاہ سے بیان کرتے۔ شاہی محل کے پاس پہنچ کر دو دروازوں تک سواری چلے جاتے، تیسرے دروازے پر سلطان ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اس دروازے پر پہنچ کر سواری سے اتر جاتے اور سلطان بڑی عزت کے ساتھ انھیں دربار میں لے جاتا اور مؤدب دوزانو ہوکر بیٹھ جاتا۔ پھر شیخ ان کے سامنے لوگوں کی درخواستیں پیش کرتے۔ بادشاہ ہر درخواست کو غور سے پڑھتا اور اس کے اوپر ہی اسی وقت حکم لکھ دیتا۔ واپسی پر شیخ ان تمام درخواستوں کو ساتھ لے جاتے اور راستہ میں درخواست دینے والوں کو دیتے جاتے۔

غیاث الدین تغلق سے بھی شیخ رکن الدین کے تعلقات خوشگوار رہے۔ ایک مرتبہ جب بادشاہ بنگالہ کی مہم سے کامیاب و کامران واپس آ رہا تھا تو شیخ ذرا سی دور تک اس کے استقبال کے لیے گئے تھے۔ رات کو سلطان کے ساتھ جس جگہ کھانا کھا رہے تھے، اس جگہ کے متعلق کشف باطن سے شیخ کو معلوم ہوا کہ اس کی دیوار اچانک گر جائے گی، چنانچہ شیخ کھانا چھوڑ کر باہر چلے آئے۔ سلطان سے بھی فرمایا کہ باہر آ جائے مگر اس نے باہر آنے میں دیر کر دی، دیوار گر گئی اور سلطان اس کے نیچے دب کر ہلاک ہوگیا۔

غیاث الدین تغلق کے بعد سلطان محمد تغلق دہلی کا بادشاہ بنا تو اس سے بھی شیخ کے خوشگوار مراسم رہے۔ اس کے ہاں آ کر مہمان بھی رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خواجہ نظام الدین اولیاؒ مرض الموت میں مبتلا تھے۔

وفات جمعرات ۱۶ رجب ۷۳۵ھ نماز مغرب کے بعد اوابین پڑھ رہے تھے اور سجدہ میں تھے کہ اسی حالت میں روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ ملتان میں والد ماجد اور جد امجد کے مزار کے قریب ہی دفن کیے گئے۔ وفات سے تین ماہ قبل لوگوں سے میل جول اور بات چیت بالکل ترک کردی تھی، صرف نماز جماعت کے لیے کمرہ سے باہر تشریف لاتے۔

کشف و کرامات کہا جاتا ہے کہ آپ کو لوگوں کے دل کی باتوں کا از خود علم ہو جایا کرتا تھا گویا کشف سے دلوں کا حال جان لیا

کرتے تھے، اسی لیے ابوالفتح لقب پایا۔ شیخ کے ایک مرید نے مجمع الاخبار کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی (اس کتاب کا ذکر مولانا عبدالحق دہلوی نے اپنی کتاب اخبار الاخیار میں بھی کیا ہے) جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ سلطان غیاث الدین تغلق نے ایک مرتبہ مولانا ظہیرالدین بیگ سے پوچھا کہ کیا تم نے شیخ رکن الدین کی کوئی کرامت بھی دیکھی ہے؟ مولانا نے کہا کہ ہاں ایک دفعہ جمعہ کے دن ہم ان سے ملاقات کے لیے گئے۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ میں بھی عالم ہوں، مگر میری طرف کوئی رجوع نہیں کرتا، شاید شیخ رکن الدین کے پاس کوئی عمل ہے۔ میں نے سوچا کہ دوسرے دن صبح شیخ سے پوچھوں گا کہ وضو میں کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے میں کیا حکمت ہے۔ چنانچہ جب میں رات کو سو گیا تو خواب میں دیکھا کہ شیخ رکن الدین مجھے حلوہ کھلا رہے ہیں اور اس کی شیرینی صبح تک میری زبان پر قائم رہی۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ اگر یہی کرامت ہے تو اس طرح تو شیطان بھی لوگوں کو گمراہ کر سکتا ہے۔ پھر جب میں شیخ کی خدمت میں پہنچا تو دیکھتے ہی فرمایا میں تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ گفتگو شروع ہوئی تو فرمایا، جنابت دو طرح کی ہے: جسم کی جنابت اور دل کی جنابت۔ جسم کی جنابت کا سبب تو صاف ظاہر ہی ہے، مگر دل کی جنابت ناہموار لوگوں کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے۔ جسم تو پانی سے پاک ہو جاتا ہے، مگر دل کی جنابت آنکھوں کے پانی سے دور ہوتی ہے۔ پھر فرمایا، پانی میں تین صفتیں ہیں، رنگ، بو اور مزہ، اسی لیے شریعت نے وضو میں کلی کرنے، اور ناک میں پانی ڈالنے کو مقدم رکھا ہے۔ کلی سے پانی کا مزہ معلوم ہو جاتا ہے اور ناک میں پانی ڈالنے سے اس کی بو کا پتہ چل جاتا ہے۔ پھر فرمایا، جس طرح شیطان کسی نبی کی شکل اختیار نہیں کر سکتا، اسی طرح وہ شیخ حقیقی کی صورت بھی اختیار نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ شیخ حقیقی کو نبی کی کامل مطابعت حاصل ہوتی ہے۔

مولانا ظہیرالدین کا بیان ہے کہ جب شیخ یہ باتیں بیان فرما رہے تھے میرے تمام جسم سے پسینہ جاری تھا۔

تواضع کے بارے میں آپ کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک عرب درویش آپ کی خانقاہ میں ٹھہرا۔ آپ نے اپنے خادم خاص کے ذریعہ سے اسے کھانا بھجوایا۔ خادم نے درویش سے پوچھا کیا تم حضرت شیخ کو دیکھنا چاہتے ہو۔ اس نے کہا میری کیا مجال کہ میں انھیں دیکھوں۔ خادم واپس آیا تو شیخ رکن الدین سے یہ ماجرا بیان کر دیا۔ شیخ نے فرمایا میں خود اس کے پاس جاؤں گا چنانچہ جب دیکھا کہ درویش فارغ بیٹھا ہے تو اس کے پاس تشریف لے گئے اور اسے منزل مقصود تک پہنچا کر سرفراز فرمایا۔

ایک شخص شیخ کی خدمت میں آیا اور کہا میں آپ کے استاد کے لڑکوں میں سے ایک لڑکا ہوں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کے باپ سے آپ نے سورۂ اخلاص پڑھی تھی۔ آپ نے فرمایا تم میرے آقا زادہ ہو تم مجھے اس طرح حکم دو جس طرح ایک آقا اپنے غلام کو حکم دیتا ہے۔ اس نے کہا مجھے دنیا کا مال چاہیے۔ آپ نے اسی وقت اسے بہت سا مال دے کر رخصت کیا۔

آپ کی غذا بہت کم ہوتی تھی۔ دودھ میں کچھ میوے ڈال کر کھا لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ گھر والوں نے ایک طبیب سے کہا کہ شیخ بہت کم غذا کھاتے ہیں۔ طبیب نے آپ کی غذا منگائی اور اس میں سے چند لقمے کھائے مگر گرانی محسوس کی۔ کہنے لگا اب سات دن تک کھانے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ کیوں کہ بزرگوں کے کھانے میں کمیت سے زیادہ کیفیت ہوتی ہے۔

حضرت شیخ رکن الدین کی کسی تصنیف کا کہیں کوئی ذکر نہیں، مگر مجمع الاخبار میں ان کے وصایا و ملفوظات درج ہیں، جن کے کچھ

اقتباسات اخبار الاخیار میں نقل کیے گئے ہیں۔ مؤخرالذکر کتاب کی مدد سے حضرت شیخ رکن الدین کی صوفیانہ معلومات ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہیں: اپنے ایک مرید کو لکھتے ہیں:

آدمی دو چیزوں سے عبارت ہے، صورت اور صفت۔ ان میں سے قابلِ اعتنا آدمی کی صفت ہے۔ خداے عزوجل صورتوں کو نہیں، بلکہ دلوں کو دیکھتا ہے۔ اگر کسی کا دل اوصاف ذمیمہ سے پُر ہے تو اس کا شمار بہائم میں ہے۔ اوصافِ ذمیمہ کو دُور کرنے کے لیے تزکیۂ نفس کی ضرورت ہے اور تزکیۂ نفس اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا، جب تک بندہ خدائے عزوجل سے التجا و استعانت نہ کرے، یعنی اس کی بارگاہ میں گڑگڑائے اور اس سے مدد طلب کرے۔ التجا و استعانت سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے فضل اور رحمت حاصل ہوتی ہے۔ فضل و رحمت کے ظہور کی علامت یہ ہے کہ بندہ کی چشم بینا میں اس کے عیوب ظاہر ہو جاتے ہیں اور عظمت الٰہی کے انوار کے پرتو سے ساری کائنات اس کی نظر میں ہیچ ہو جاتی ہے۔ دنیا کے پھندوں میں پھنسے رہنے والوں کی وقعت اس کے دل سے بالکل جاتی رہتی ہے اور جب اس کے قلب پر یہ کیفیت مستولی ہو جاتی ہے، تو اس کے اوصاف فرشتوں کے اوصاف میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور اس میں ظلم کے بجائے عفو، غضب کے بجائے حلم، کبر کے بجائے تواضع، بخل کے بجائے سخاوت اور حرص کے بجائے ایثار کی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں، مگر یہ خوبیاں عقبیٰ کے طلب کرنے والوں کے لیے ہیں۔ طالبانِ حق کے اوصاف اور بھی بلند تر ہیں۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے ہر شخص کی عقل کام نہیں دیتی۔

عہد بیست مرا کہ نگیرم بجز تو دوست شرطیست مرا کہ نخواہم بجز تو ہیچ

ایک دوسرے موقع پر اپنے ایک مرید کو تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے آج تک کسی کے ساتھ نہ نیکی کی نہ بدی۔ حاضرین نے استعجاب سے پوچھا کہ امیرالمؤمنین! بدی تو خیر آپ سے نہیں ہو سکتی، مگر نیکی کے متعلق آپ کیا فرما رہے ہیں۔ ارشاد فرمایا کہ حق و علا کا قول ہے کہ جس نے اچھے کام کیے اپنے نفس کے لیے کیے اور بُرے کام کیے تو بھی اپنے نفس کے لیے کیے۔ پس جو کچھ نیکی یا بدی مجھ سے صادر ہوئی وہ درحقیقت میرے لیے تھی نہ کہ دوسروں کے لیے۔ اس کے بعد حضرت شیخ رکن الدین لکھتے ہیں:

ایک عاقل کو دنیا و آخرت کے لیے اتنی نصیحت کافی ہے، بزرگوں نے کہا

صلاح این کس صلاح اولین است

یعنی ایک شخص کا ہتھیار اس کی نیکی ہے۔

چوں دانی ہر آنچہ کاری درو ے آخر بہمہ حال نکو کاری بہ

فرماتے تھے کہ اعضاء و جوارح کو شرعی ممنوعات سے قولاً و عملاً باز رکھنا چاہیے۔ لایعنی مجلس سے بھی پرہیز لازم ہے اس سے مراد ایسی مجلس ہے جو حق تعالیٰ سے برگشتہ کرکے دنیا کی طرف مائل کرتی ہے۔ بطالوں سے بھی احتراز ضروری ہے۔ بطال وہ لوگ ہیں جو طالب حق نہیں ہیں۔[1]

---

[1] اخبار الاخیار صفحہ ۲۲-۲۴ بحوالہ "بزم صوفیہ"۔

حضرت مولانا ضیاء الدین نخشبی رح

وفات ——————— ۷۵۱ھ

حضرت مولانا ضیاء الدین نخشبی ہندوستان کے گوشہ نشین بزرگ، سلوک و طریقت کے بادشاہ اور بہت بڑے اولیاء اللہ میں سے تھے۔ تصوف اور معرفت و حکمت پر کئی تصانیف چھوڑیں۔

نام و نسب اور ابتدائی حالات آپ کا نام ضیاء الدین اور نخشبی تخلص تھا۔ بدایوں کے رہنے والے تھے۔ ظاہری اور باطنی کمالات کے باعث بہت شہرت پائی۔ شیخ حمید الدین ناگوریؒ کے پوتے شیخ فرید سے بہت عقیدت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے مگر اخبار الاخیار میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

"حضرت شیخ نظام الدین اولیا کے زمانے میں تین شخص ضیاء الدین نام کے تھے۔ ضیا سنائی جو منکر شیخ تھے، ضیا برنی جو شیخ کے معتقد اور مرید تھے، ضیا نخشبی جو شیخ کے نہ منکر تھے اور نہ معتقد۔"

ضیاء الدین نخشبی نے گوشہ نشینی اختیار کر رکھی تھی اور لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ تنہائی میں عبادت کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف کے کام میں لگے رہتے تھے چنانچہ آپ کے حالات کی زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ اخبار الاخیار اور خزینۃ الاصفیا میں آپ کا سالِ وفات ۷۵۱ھ بتایا گیا ہے۔ سنِ پیدائش کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔

تصانیف آپ نے کئی تصانیف چھوڑیں جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

۱ - سلک السلوک
۲ - عشرہ مبشرہ
۳ - کلیات و جزئیات
۴ - شرح دعائے سریانی
۵ - طوطی نامہ

آپ کی ایک تصنیف کا نام گلریز بتایا جاتا ہے۔ ناموس اکبر کے نام سے بھی آپ نے ایک کتاب تالیف کی جس میں صوفیاء اللہ سے بدن کے اعضا یعنی آنکھ، کان، ہاتھ، ناک، پاؤں وغیرہ کے اوصاف بتائے گئے ہیں۔

ان میں سے سلک السلوک اور طوطی نامہ زیادہ مقبول ہوئیں۔ طوطی نامہ ۷۳۰ھ میں لکھی گئی۔ اس میں عبرت آموز اور نتیجہ خیز کہانیاں ہیں۔ ۱۷۹۲ء میں ایک انگریز نے اسے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ترکی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکی ہے۔

سلک السلوک معرفت و سلوک سے متعلق ہے۔ اس میں الگ الگ عنوانات کے تحت تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ ہر مسئلہ الگ باب کے طور پر لکھا گیا ہے۔ کل ۱۵۱ ابواب ہیں۔ ابتدا میں تصوف کی اصطلاحات بتائی گئی ہیں اور ان کی تشریح کی گئی

ہے۔ صوفیانہ نکات و رموز کو حکایتوں کے انداز سے واضح کیا گیا ہے۔ مثلاً جہاں آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ رات کو یادِ الٰہی کرنی چاہیے وہاں فرماتے ہیں:[1]

ایک دن ایک خواجہ نے ایک لونڈی خریدی۔ جب رات ہوئی لونڈی سے کہا اے کنیز! میرا بچھونا درست کردے۔ لونڈی نے کہا اے مولیٰ! کیا تمھارے بھی مولا ہے۔ خواجہ نے کہا ہاں۔ لونڈی نے پوچھا کیا وہ بھی سوتا ہے؟ خواجہ نے کہا نہیں۔ لونڈی نے کہا تمھیں شرم نہیں آئی، تمھارا مولا تو جاگے اور تم سو رہو۔"

اسی طرح یہ تلقین کرنا چاہتے ہیں کہ نفس کا محکوم ہونے کی نسبت کسی کا محکوم ہونا بہتر ہے۔ تو فرماتے ہیں:

"ایک سجادہ نشین ہر جمعہ کو اپنی خانقاہ سے مسجد جانے کے لیے باہر نکلتے تھے، جس کسی کو دیکھتے پوچھتے کہ مسجد کا راستہ کونسا ہے؟ ایک بار ایک شخص نے کہا تم کو برسوں مسجد جاتے ہو گئے، لیکن راستہ یاد نہیں۔ انھوں نے کہا میں جانتا ہوں، مگر محکوم ہو کر چلنا حاکم ہونے سے بہتر ہے۔ چاہیے کہ اپنی ذات کو دوسروں کی طفیل میں سمجھے۔"

یہ اندازِ بیان اور زیادہ دلچسپ اور دل پذیر بن جاتا ہے، جب ہر حکایت "بشنو"، "بشنو" سے شروع ہوتی ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں:

"سنو سنو! ایک دفعہ موسیٰؑ کو حکم ہوا تھا کہ تمھاری قوم میں جتنے نیک ہیں ان کو بدوں سے الگ کر دو۔ موسیٰؑ نے آواز دی، بہت سے لوگ باہر آئے۔ حکم ہوا ان میں سے نیکوں کو چن لو۔ موسیٰ نے ان میں سے ستر آدمی نکالے۔ فرمان ہوا، موسیٰ! ان میں سے بھی چنو۔ چنانچہ آپ نے ستر میں سے سات چنے۔ پھر حکم ہوا کہ ان میں سے بھی چنو۔ تب ان میں سے تین چنے۔ حکم ہوا اے موسیٰ! میرے نزدیک یہ تینوں سب سے بُرے ہیں، کیوں کہ جب انھوں نے سُنا کہ تم نیکوں کو پکارتے ہو تو یہ اپنے کو نیک سمجھ کر باہر آئے . . . . .

اے عزیز اگر کوئی عبادت نہ کرے تو اس سے بہتر ہے کہ عبادت کرے اور فخر کرے۔ شریعت میں مدعیٰ علیہ کو قید کرتے ہیں، لیکن طریقت میں مدعی کو قید خانہ بھیجا جاتا ہے۔"

ایک اور حکایت سنیے:

"سنو سنو! ایک بقال نے ایک شخص کو شیر پر سوار اور سانپ کو کوڑا بنائے ہوئے دیکھا۔ دیکھ کر کہا یہ آسان ہے لیکن ترازو کے دونوں پلڑوں میں بیٹھنا مشکل ہے۔"

اور ایک حکایت بیان کرتے ہیں:

"سنو سنو! ایک بزرگ نے چاہا کہ بازار جا کر کچھ خریدے۔ دینار کو گھر میں تولا، جب بازار لے گئے تو دینار گھر کے

---

[1] مولانا بخشی کے ارشادات کے یہ نمونے "بزمِ صوفیہ" سے اخذ کیے گئے ہیں۔

وزن سے کم نکلا۔ رونے لگے۔ لوگوں نے پوچھا کیوں روتے ہو۔ فرمایا جب گھر کی چیز یہاں ٹھیک نہیں ہوئی تو قیامت میں دنیا کی باتوں کا کیا حال ہوگا۔"

ان حکایات میں زیادہ سے زیادہ تاثر پیدا کرنے کے لیے جابجا ان میں اپنے قطعات بھی لکھتے ہیں۔ مثلاً:

"سنو سنو! وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ کعب احبار مسجد میں سب صفوں کے پیچھے کھڑے ہوتے۔ ان سے پوچھا گیا کہ اس میں کیا بھید ہے۔ فرمایا میں نے توراۃ میں دیکھا ہے کہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسے لوگ ہوں گے کہ جب وہ مسجد میں سجدے کریں گے اور انھوں نے سر بھی نہ اٹھایا ہوگا کہ ان سے پیچھے والوں کو خدا بخش دے گا۔ میں اسی سبب سے سب سے پیچھے کھڑا ہوتا ہوں تاکہ ان کے سجدے سے میرا کام بن جائے ؎

بخشی درمیاں ببیں خود را قطرہ را چہ سیلے مے خوانی
ہمہ کس درطفیل تو گردد گر تو خود را طفیل کس دانی"

"ایک بار ایک خلیفہ نے ایک بوڑھی عورت کے لڑکے کو قید کر دیا۔ بوڑھی عورت نے خلیفہ کے پاس پہنچ کر فریاد کی اور کہا کہ میرے لڑکے کو رہا کر دیجیے۔ خلیفہ نے کہا کہ میں نے حکم دیا ہے کہ جب تک میں خلیفہ ہوں تیرا لڑکا قید سے رہا نہیں کیا جائے گا۔ بوڑھی عورت نے یہ سن کر آسمان کی طرف دیکھا اور درد بھری آواز سے بولی:

اے سلطان عالم! دنیا کی قید و رہائی تیری قدرت میں ہے، لیکن تیرے خلیفہ نے جو حکم دیا ہے کیا تو نے اُسے سنا نہیں معلوم کہ اب تو کیا حکم دے گا۔ بوڑھی عورت کی یہ بات خلیفہ نے سنی تو اس کے دل میں رحم پیدا ہوا اور اس کے لڑکے کو قید خانہ سے باہر لانے کا حکم دیا۔ اس کو ایک خلعت دیا اور گھوڑے پر سوار کر کے بغداد کی گلیوں میں پھرایا اور ساتھ ساتھ یہ منادی کی جاتی تھی کہ هذا عطاء اللہ تعالیٰ علی رغم خلیفہ و مقاصد و محلہ (یہ خلیفہ اس کے درجے اور مرتبے کے علی الرغم اللہ تعالیٰ کی عطا ہے)۔ قطعہ

بخشی حکم خلق چیزے نیست! مرد ایں رہ کجاست در عالم
درجہاں گفت ہیچکس نشود حکم حکم خداست درعالم"

"سنو سنو! بنی اسرائیل میں ایک زاہد تھا۔ ستر سال عبادت کی۔ ایک دن کسی حاجت روائی کے لیے دعا مانگی لیکن دعا قبول نہ ہوئی۔ اپنے نفس سے برہم ہوا، کہ اے نفس! اگر تیری عبادت میں اخلاص ہوتا تو میری دعا ضرور قبول ہوتی حق تعالیٰ کے یہاں سے اس زمانہ کے پیغمبر کے پاس فرمان آیا کہ اس زاہد سے کہو نفس پر ایک ساعت کا عتاب ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ قطعہ

بخشی درعتاب خود می باش ورنہ خود باطن تو خون گردد!
ہر کہ با نفس خود عتابے کرد از عتاب ہمہ مضمون گردد

بعض دوسری حکایتیں ملاحظہ ہوں، فرماتے ہیں:

• رابعہ بصری سے لوگوں نے پوچھا کیا تو ابلیس کو دشمن سمجھتی ہے۔ فرمایا نہیں۔ لوگوں نے پوچھا اس کی کیا وجہ ہے؟ جواب ملا، میں دوست کی محبت میں اس قدر مشغول ہوں کہ مجھے دشمن کی خبر ہی نہیں۔"

• سنو سنو! جب کمان کش قاب قوسین او ادنیٰ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم عالم بالا سے واپس تشریف لائے تو جبرئیل نے پوچھا، اے محمدؐ! جس عالم سے آپ آئے ہیں وہاں آپ نے کیا کچھ دیکھا؟ آپ نے فرمایا اس سوال کا کیا محل ہے؟ کہ محمدؐ محمدؐ ہی سے پوچھ رہا ہے کہ تم نے کیا دیکھا۔ عَلِمَ مَنْ عَلِمَ فَهِمَ مَنْ فَهِمَ (جان لیا جس نے جان لیا، سمجھ لیا جس نے سمجھ لیا)"

خواجہ علی سیارح فرماتے ہیں کہ مجھے اس کے سوا کوئی تمنا نہیں کہ کوئی شخص حق بات کہے اور میں سن کر سنوں یا میں حق بات کہوں اور کوئی سنے۔"

"دولت مندوں کو دولت سے چار چیزیں ملتی ہیں؛ جسمانی رنج، دل کی مشغولی، دین کا نقصان اور قیامت کا حساب۔ اور درویشوں کو درویشی سے چار چیزیں ملتی ہیں؛ جسمانی آسائش۔ دل کی فراغت، دین کی سلامتی اور حساب قیامت سے نجات۔"

"اے درویش! ایک روز صبح سے شام تک اپنے نفس کے ساتھ جنگ کر اور دیکھ کہ کیا ظہور پذیر ہوتا ہے۔ مرد وہ ہیں جو اپنے نفس کے ساتھ جنگ کرتے ہیں، کیوں کہ اس کے ساتھ صلح نہیں ہو سکتی۔ میرے عزیز! جو شخص ہمیشہ اپنے نفس کا احتساب کرتا رہتا ہے اس کے کوئی خواہش نہیں رہتی۔"

• خواجہ جنیدؒ کو لوگوں نے خواب میں دیکھا تو پوچھا آپ کا معاملہ کہاں تک پہنچا۔ انھوں نے جواب دیا عقبیٰ کا کام اس سے کہیں زیادہ دشوار ہے جتنا ہم دنیا میں خیال کرتے ہیں۔"

حضرت شیخ برہان الدین غریبؒ

ولادت ———— ہانسی ۶۵۴ھ

وفات ———— دولت آباد ۷۳۸ھ

حضرت شیخ برہان الدین غریبؒ ہندوستان کے قطب وقت اور سلطان الاولیاء کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ قطب المدار بایزید ثانی وغیرہ القاب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ شہر برہان پور آپ ہی کے نام پر آباد کیا گیا۔ صاحب تصنیف بزرگ تھے۔

اسم گرامی برہان الدین تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: برہان الدین غریب بن شیخ محمد محمود بن ناصر ہانسوی بن سلطان مظفر بن سلطان ابراہیم بن شیخ ابوبکر بن شیخ عبداللہ بن شیخ عبدالرشید بن شیخ عبدالصمد بن شیخ عبدالسلام بن امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ۔

آپ کا خاندان شہر ہانسی میں آباد تھا جہاں ۶۵۴ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ یہ خاندان روحانی لحاظ سے بہت اونچا درجہ رکھتا تھا۔ والد بزرگوار بڑے مقبول اور باثر تھے۔ آپ کے حقیقی بھائی شیخ منتخب الدین خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے ممتاز خلفا میں سے تھے۔ خواجہ گنج شکرؒ کے خلیفہ خواجہ جمال الدین ہانسویؒ جن سے جمالیہ سلسلہ شروع ہوا آپ کے ماموں تھے، اور حضرت محبوب الٰہی کے خلیفہ مولانا قطب الدین منورؒ آپ کے ماموں زاد بھائی تھے۔

بچپن میں اپنے چچا سے قدوری پڑھی، فقہ، معانی، تفسیر اور حدیث کی تعلیم حاصل کی اور ہم عصروں میں جیّد عالم مانے جاتے تھے۔ تمام زندگی تجرد میں گزاری۔

ان دنوں حضرت محبوب الٰہی کے چشمۂ فیض سے ایک دنیا سیراب ہو رہی تھی، شیخؒ نے بھی اسی چشمہ سے منفعت حاصل کرنے کے لیے دہلی کی راہ لی اور وہاں پہنچ کر ایک مسجد میں قیام فرمایا۔ آپ کے ظاہری و باطنی کمالات دیکھ کر لوگ آپ کی خدمت میں آنے لگے۔

ایک دن محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ میں تشریف لے گئے اور ان کی خدمت میں تقرب حاصل کیا۔ محبوب الٰہی نے انھیں خلوت کا نگران مقرر کر دیا۔ محبوب الٰہی کے مریدوں میں امیر خسرو، امیر حسن سنجری، مولانا ابراہیم طشت دار، سید خاموش، خواجہ سید حسین وغیرہ بھی تھے۔ شیخ برہان الدین ان کی صحبت میں بھی رہا کرتے اور ان کی شیریں کلامی سے حظ اٹھاتے۔ ان دنوں شیخ نصیر الدین چراغ دہلی اودھ میں تھے۔ وہ بھی کبھی کبھی اس خانقاہ پر آتے اور شیخ برہان الدینؒ کے پاس رہ کر ان سے درس لیتے۔

---

[1] آپ کی وفات دولت آباد (دیوگیر) میں ہوئی اور جس جگہ مزار ہے وہ جگہ خلد آباد کے نام سے مشہور ہے۔ دولت آباد ایک ویران قصبہ ہے جو اورنگ آباد کے ضلع میں واقع ہے۔

جب شیخ برہان الدین و جیہ کمال کو پہنچے تو حضرت محبوب الٰہی نے خلافت سے سرفراز فرمایا اور کئی موقعوں پر محبوب الٰہی حضرت
شیخ کے کمالات کی تعریف فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی مجلس میں بایزید بسطامیؒ کی بزرگی کا ذکر ہو رہا تھا۔ محبوب الٰہیؒ نے
ہمی ایک بایزید رکھتے ہیں۔ کسی نے پوچھا وہ کہاں ہے؟ فرمایا "جماعت خانہ میں"۔ اس شخص نے جماعت خانے میں جا کر دیکھا
الدین وہاں بیٹھے تھے۔

شیخ برہان الدینؒ کو بھی مرشد سے بہت محبت تھی۔ ان کے بھائی منتخب الدین کی وفات کے بعد محبوب الٰہی نے انھیں دکن
کا حکم دیا کہ وہاں تبلیغ دین کریں۔ آپ کو مرشد سے جدا ہونا گوارا نہ تھا۔ مگر حکم سن کر فرمایا کہ نعلین مبارک سے جدا ہو جاؤں گا۔ مرشد
نعلین بھی ساتھ لے جاؤ۔ پھر فرمایا مجلس سے الگ ہو جاؤں گا۔ محبوب الٰہی نے فرمایا مجلس میں جتنے لوگ بیٹھے ہیں ان کو بھی
لے جاؤ۔ اس وقت مجلس میں سات سو کے قریب لوگ بیٹھے تھے جن میں امیر حسن سنجری، بابا کمال خجندی، شیخ جام اور شیخ فخر الدینؒ
ہ۔ چنانچہ آپ سات سو آدمیوں کو لے کر دولت آباد روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر اٹھائیس، انتیس سال تک قیام فرمایا۔ وفات
یں ہوئی۔

آپ اور آپ کی ساتھیوں کی کوشش سے دکن میں بہت سے غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ عام مسلمانوں نے بھی ان
ن کے طفیل علم و اخلاق اور سلوک و تصوف کی راہیں طے کیں۔ ہزاروں لوگ آپ کے مرید ہوئے۔ اور آپ نے ان کی معاشرتی
رتی حالت سنوارنے کی بہت کوششیں کیں۔

ذیل میں چند واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن سے آپ کی تعلیمات کا خاکہ ذہن میں آسکتا ہے۔

یک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہنے لگا میں دو چیزوں کے لیے آیا ہوں۔ ایک تو دین حاصل کرنے کے لیے اس لیے
صاحب ولایت اور صاحب کشف و کرامات ہیں۔ دوسرے دنیا حاصل کرنے کے لیے اس لیے کہ بادشاہ اور امراء آپ
ح ہیں۔ آپ نے فرمایا ایک خدا تمھیں دونوں چیزیں دے دے گا۔ خدا کو حاصل کر لو ساری چیزیں خود بخود حاصل ہو جائیں گی۔
مولانا وجیہ الدین یوسف نے ایک مرتبہ عرض کیا میں نفس کے عیبوں کو جتنا دور کرتا ہوں اسی قدر زیادہ عیب مجھے نظر
لگتے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ انسان کا کمال ہے۔ جب آدمی کمال کو پہنچتا ہے تو اس کی نظر اپنے عیبوں پر زیادہ پڑنے لگتی ہے۔
یک دفعہ مریدوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: دنیا سایے کی مانند ہے۔ جب آدمی سایہ کی طرف منہ کرتا ہے تو وہ آگے ہی
تا ہے اور جب پیٹھ پھیرتا ہے تو پیچھے پیچھے آتا ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا مجھے شرق سے غرب تک تمام عالم ایسے نظر آتا ہے جیسے
یہ مرغی کا انڈا۔

فرمایا دل ایک ظرف کی مانند ہے جب تک ظرف خالی ہو ہوا سے بھرا رہتا ہے۔ جب اس میں کوئی شے رکھ دی جائے
سے خالی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دل دنیا کی خواہشات سے بھرا رہتا ہے لیکن جب اس میں محبت بھر جاتی ہے تو خواہش نفسانی
تی ہیں پھر اللہ کی محبت اس میں بھر جاتی ہے۔

آپ اپنے معتقدوں کو نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ لوگوں کی راحت کے لیے کوشش کرتے رہیں۔ فرمایا ایک درخت خود تو دھوپ میں کھڑا رہتا ہے لیکن دوسروں کو سایہ دیتا ہے۔ لکڑی خود تو جلتی ہے مگر دوسروں کو آرام پہنچاتی ہے۔ اسی طرح آدمی خود تکلیف اٹھائے اور اپنی تکلیف کا خیال نہ کرے، لیکن دوسروں کو فائدہ اور آرام پہنچائے۔

فرمایا اگر کوئی شخص تم میں کوئی عیب نکالے تو دیکھو کہ تم میں وہ عیب ہے یا نہیں، اگر ہے تو اُسے دُور کرو اور عیب نکالنے والے سے کہو کہ تم نے مجھ پر احسان کیا اور اگر وہ عیب تم میں نہیں تو دعا کرو کہ الٰہی اس عیب نکالنے والے کو عیب جوئی سے بچا اور مجھے بھی بد کلامی سے محفوظ رکھ۔

فرمایا ایک سخی ہوتا ہے اور ایک بخیل۔ سخی وہ ہے جو مہمان کو دوست رکھتا ہے اور بخیل وہ ہے جو دولت کو مہمان رکھتا ہے۔

فرمایا لوگوں کو ہمیشہ عدل کرنا چاہیے اور احسان بھی۔ عدل یہ ہے کہ کھانے کے وقت ہم پیالہ کے ساتھ لقمہ کا انصاف کرے یعنی برابر برابر کھائے اور احسان یہ ہے کہ ہم پیالہ کے ساتھ لقمہ چھوڑ دیا جائے اور جو چیز لذیذ اور اچھی ہو اس سے ایثار کرے۔

فرمایا بیوی بچے باغ اور بوستان ہیں، جب اللہ تعالیٰ کی عبادت سے کوئی ملول ہو تو اسے اپنا دل بیوی بچوں سے بہلانا چاہیے کیوں کہ یہ بھی عبادت ہے۔

آپ کے کلام میں بڑی مٹھاس، فصاحت اور بلاغت ہوا کرتی تھی۔ زبان میں بڑی تاثیر تھی، اس لیے سامعین جب آپ کی باتیں سن کر اُٹھتے تو اپنے قلب کو پاکیزہ اور ذہن کو صاف پاتے۔

آپ کو سماع سے بہت رغبت تھی وجد میں آتے تو غیر معمولی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اگرچہ زیادہ وقت رشد و ہدایت اور مریدوں کو تلقین کرنے میں گزرتا تاہم عبادت و ریاضت میں کوئی فرق نہ آتا۔ عشا کے وضو سے صبح کی نماز ادا کرتے اور پچیس سال تک یہی معمول رہا۔

تیس سال تک دائودی روزے رکھے۔ افطار کبھی پانی سے کرتے کبھی دہی سے اور کبھی سرکہ کے ساتھ۔ لباس نہایت سادہ ہوتا۔ وفات کے وقت کوئی ذاتی املاک نہ چھوڑی۔ ہر چیز اپنی زندگی ہی میں غریبوں میں تقسیم کر دی۔ جس مصلّے پر نماز پڑھتے تھے، کبھی اسی پر سو جاتے اور کبھی وہی اوڑھ لیتے۔

آخری عمر میں بہت کمزور ہو گئے تھے۔ تین سال تک بیمار رہے، مگر اس بیماری میں بھی لوگوں کو تلقین کرتے رہتے تھے۔ عبادت و ریاضت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اپنے علاج کی طرف کبھی توجہ نہ دی، اس لیے کہ علاج کرانے کے قائل ہی نہ تھے۔ فرماتے تھے "میرے دوست کی یاد ہی میرا طبیب ہے۔" کبھی کبھی رونے لگتے، مگر لوگوں سے کہتے کہ یہ نہ سمجھنا میں بیماری سے گھبرا کر روتا ہوں، بلکہ ایک لمحہ بھی خدا کی یاد سے غافل رہتا ہوں تو رونے لگتا ہوں۔

مریدوں نے آپ کو دہلی لے جانا چاہا مگر انکار کر دیا اور جس جگہ آپ کا مزار ہے اس کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں، یہاں رہنا چاہتا ہوں۔

جب وفات کے دن قریب آئے تو مریدوں کو بلا کر کئی نصیحتیں کیں۔ اپنے ہاتھ سے انھیں کپڑے عنایت کیے۔ وفات کے دن پیر و مرشد کی تسبیح منگائی، اُسے سامنے رکھا اور دستار مبارک گلے میں ڈال کر کہنے لگے "مسلمان ہوں، امت رسول ہوں، شیخ کا مرید ہوں۔ میں نیک نہ تھا، نیک زندگی بھی بسر نہ کی، اپنا انصاف خود کرتا ہوں"۔ پھر مرشد کی تسبیح سے تجدید بیعت کی اور زار زار رونے لگے۔ چاشت کے وقت خادم سے کہا دوستوں کو باورچی خانہ میں لے جا کر کھانا کھلا دو، اور وہاں کچھ باقی نہ رہے۔ جب لوگ کھانا کھا رہے تھے تو آپ نے مرشد کا خرقہ اور تبرکات لانے کو کہا، اسی وقت جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ یہ ۸ صفر ۸۳۲ھ کا واقعہ ہے۔

آپ کے ملفوظات میں سے تین کے نام یہ ہیں:

۱۔ حصول الوصول، جسے آپ کے مرید خواجہ حماد کاشانی نے جمع کیا۔

۲۔ ہدایت القلوب، جسے آپ کے ایک مرید شیخ حسین نے مرتب کیا۔

۳۔ نفائس الانفاس، اسے بھی ایک مرید خواجہ رکن الدین بن عماد الدین کاشانی نے مرتب کیا۔

مؤخر الذکر تصنیف میں تصوف کے اسرار و رموز بے نقاب کیے گئے ہیں۔

خواجہ رکن الدین بن عماد الدین دبیر کاشانی نے مرشد کی فرمائش پہ شمائل الاتقیا لکھی، جو تصوف پر ایک نادر کتاب سمجھی جاتی ہے اور چار قسموں میں تقسیم ہے۔ تصوف کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو اس میں نہ ہو۔ اس کتاب کے مطالعہ سے رہروان سلوک و تصوف کے تمام مسائل کو مختلف مصنفوں کے خیالات کی روشنی میں علمی نقطہ نظر سے مطالعہ کرنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اہل نظر نے اسے جامع، مفصل اور دلچسپ تصنیف قرار دیا ہے۔

"رسالہ غریب" نام سے بھی ایک تصنیف آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اس میں شیخ نے وہ تعلیمات پیش کی ہیں، جو آپ نے خواجگان چشت سے حاصل کی تھیں۔ نماز، تلاوت قرآن کریم، روزہ، زکوٰۃ، حج، عبادت، سلوک، سکوت، ذکر، جمع و تفرقہ، علم الیقین و عین الیقین، رویت، رموز الواصلین، رضا و سیر، موت، فقر، صحو و سکر، جلال و جمال، تلوین و تمکین جیسے موضوعات اس رسالے میں جمع کر دیے گئے ہیں۔

خواجہ رکن الدین کے دو بھائی خواجہ حماد الدین اور خواجہ مجد الدین بھی صاحب تصنیف تھے۔ خواجہ حماد الدین کی کتابوں کے نام یہ ہیں: حصول الوصول، اسرار الطریقت، احسن الاقوال (ملفوظات خواجہ برہان الدین غریب)

خواجہ مجد الدین کی دو تصانیف کے نام معلوم ہوئے ہیں: غرائب الکرامت، بقیۃ الغرائب۔ ان دونوں میں خواجہ برہان الدین غریبؒ کے خوارق و کرامات کا ذکر ہے۔

حضرت شیخ نصیر الدّین محمود چراغ دہلوی رح

ولادت ـــــــــــ اودھ ـــ

وفات ـــــــــــ دہلی ۷۵۷ھ

حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے خلفائے کبار میں سے بڑے عابد و زاہد، حالات عالیہ و مکاشفات تامہ رکھتے تھے۔ طریقہ آپ کا صبر و شکر، فقر و فاقہ، رضا و تسلیم تھا۔ آپ حسنی سید تھے۔ آپ کے بزرگ وارد ہندوستان ہو کر لاہور میں قیام پذیر ہوئے اور آپ کے والد سید یحییٰ لاہور میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد اودھ آکر قیام پذیر ہوئے۔ چونکہ صحیح النسب سادات سے تھے تمام شہر باعظمت پیش آتا تھا۔ حضرت کی پیدائش اودھ میں ہوئی۔ جب عمر حضرت کی نو برس کی ہوئی تو آپ کے والد صاحب نے قضا کی اور پھر آپ کی والدہ صاحبہ نے آپ کی تربیت اور تحصیل علم میں بہت کوشش فرمائی۔ چنانچہ پہلے مولانا عبدالکریم شیروانی کے زیر تعلیم رہے ان کے انتقال کے بعد مولانا افتخار الدین گیلانی سے علوم ظاہری حاصل کیے، مگر عالم طفلی سے آثار ترک و تجرید و نفس کشی کے حضرت کی پیشانی سے ہویدا تھے۔ ہمیشہ صائم رہتے تھے۔ کبھی نماز با جماعت فوت نہیں ہوئی۔ اکثر روزے سے رہا کرتے تھے۔ سات برس متواتر ایک درویش کامل کے ساتھ نماز جماعت سے ادا کی۔ بعدہٗ ریاضت اور مجاہدہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ جب چالیس برس کا سن ہوا دہلی میں تشریف لائے۔ زیارت اور خدمت حضرت سلطان المشائخ سے مشرف ہوئے اور خدمات شائستہ بجا لاکر بخطاب محمود گنج شرف سے مخاطب ہوئے۔ آپ کا یہ دستور تھا کہ شب و روز کمر بستہ خدمت پیر مرشد میں حاضر رہتے تھے۔ حضرت سلطان المشائخ اس وقت کیلوکھڑی میں تشریف فرما تھے اور دریا کے کنارے ایک بالاخانہ تھا، اس میں عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ اس جگہ سوائے حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے دوسرا نہ جا سکتا تھا یہ بھی اسی بالاخانہ میں مشغول رہتے تھے۔ ایک بار چند درویش خاندان شیخ بہاؤ الدینؒ کے آکر شب باش ہوئے۔ صبح ان میں سے ایک درویش دریا پر غسل کرنے لگا۔ کوئی اُچکا آیا اور اس کے کپڑے اُچک لے گیا۔ وہ بیچارہ ننگا غل مچاتا آیا۔ حضرت اُس جگہ آئے اور اپنے کپڑے اُس کو دے کر فرمایا کہ غل نہ مچا، یہ لے جا۔ اس میں مقصد یہ تھا، ایسا نہ ہو کہ اُس کے غل سے پیر کی مشغولیت میں فرق آ دے۔ حضرت سلطان المشائخؒ نے یہ معاملہ اپنے کشف سے معلوم فرما کر بعد نماز چاشت آپ کو بلایا اور نہایت مہربانی سے اپنی خاص پوشاک میں سے ان کو پوشاک عطا کی۔ اخبار الاخیار سے نقل ہے کہ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کبھی کبھی حسب اجازت پیر مرشد اپنی بڑی بہن سے ملنے اودھ جایا کرتے تھے۔ آپ ہمشیرہ زادہ ایک روز حضرت مخدوم نصیر الدین نے امیر خسرو قدس سرہٗ سے کہا کہ تم سفارش کرو کہ جب میں اودھ میں ہوتا ہوں، بسبب مزاحمت خلق مشغول نہیں رہ سکتا۔ اگر شیخ کا حکم ہو تو جنگل میں رہ کر عبادت حق میں مشغول رہا کروں۔ امیر صاحبؒ یہ سن کر وقت معینہ پہ بعد نماز عشا جب

خدمت حضرت سلطان المشائخ عرض معروض کے لیے حاضر ہوئے تو جو انھوں نے کہا تھا، عرض کیا۔ اس پہ حضرت شیخ نے ارشاد فرمایا کہ اس سے کہو تجھے درمیان خلق میں رہنا ہے، ان کے جور و جفا اٹھانے ہوں گے، اس کے عوض میں بھلائی کرنی ہوگی۔ اور پھر حضرت شیخ نصیرالدین کو حجرہ شریف میں طلب فرمایا، ارشاد کیا کہ تیرے دل میں کیا ہے اور جنگل میں رہنے سے تیرا مقصود کیا ہے۔ تیرا باپ کیا کام کرتا تھا۔ آپ نے عرض کیا کہ مقصود میرا مدامی دعا مزید حیات خواجہ ہے اور کفش برداری درویشوں کی۔ میرے والد روئی کے سوداگر تھے۔ اس کے بعد حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا کہ میں اجودھن میں بابا صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ میرا ایک دوست اور ہم سبق آگیا۔ میرے رنگین کپڑے اور وہ بھی پھٹے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا کہ تمہارا یہ کیا حال ہوگیا۔ اگر اس شہر میں معلمی کرتے تو اسباب معیشت سے فارغ رہتا۔ میں نے یہ سن کر کچھ جواب نہ دیا، لیکن جب خدمت بابا صاحب میں گیا تو مجھ کو دیکھ کر فرمانے لگے کہ نظام الدین! اگر کوئی تیرا دوست آکر کہے کہ تو نے اپنا کیا حال کر رکھا ہے، معلمی ہی کر جو فراغت حاصل ہو تو کیا جواب دے گا؟ میں نے عرض کیا جو حکم عالی ہو۔ فرمایا کہ کہو ؎

نہ ہمسری تو مرا خویش گیر و برو — ترا سعادت بادا مرا نگونساری

بعدہ فرمایا کہ کھانے کا خوان لا۔ جب میں لایا تو ارشاد فرمایا کہ اس کو سر پہ رکھ کر جہاں تیرا دوست ٹھہرا ہوا ہے لے جا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ جب اس دوست کے روبرو لے گیا، اس نے کہا مبارک باد، تجھ کو یہ صحبت۔ حضرت شیخ نصیرالدین فرماتے ہیں کہ اس طرح بندہ کو تلقین فرمایا۔ بعدہ ریاضت و مجاہدہ فرمایا۔ کبھی مجھ کو دس دس روز گزر جاتے تھے، جب برا حال ہوتا تو ترشی کھاتا۔ نقل ہے کہ ایک روز ان کے کسی پیر بھائی کے گھر میں مجلس تھی اور آپ بھی اسی مجلس میں موجود تھے کہ باجے کے ساتھ سماع شروع ہوا۔ آپ وہاں سے اٹھ کر چلے۔ دوستوں نے کہا بیٹھو۔ آپ نے فرمایا میں نہ ٹھہروں گا۔ یہ امر خلاف سنت ہے۔ لوگوں نے کہا کیا سماع سے منکر ہو اور مشرب پیروں سے پھر گئے ہو؟ آپ نے فرمایا یہ کوئی حجت نہیں۔ دلیل تو کتاب و حدیث سے چاہیے۔ آخر بعض نے حضرت سلطان المشائخ سے عرض کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ ان کا اتقا بڑھا ہوا ہے۔ سیر الاولیا سے نقل ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کی مجلس سماع میں مزامیر نہیں ہوتا تھا۔ اگر کوئی ذکر بھی کرتا کہ فلاں صاحب کے یہاں سماع مزامیر کے ساتھ ہوا تو آپ منع فرماتے تھے۔ نقل ہے کہ شیخ برہان الدین غریب کہ حضرت مخدوم صاحب کے ہم مجلس تھے ان کے پاس سے وہ کلاہ نمدی کہ جو عطیۂ شیخ تھی گم ہوگئی، یہ بہت غمگین ہوگئے۔ ان کی تشویش دیکھ کر حضرت نے فرمایا کہ مولانا اس سے عمدہ تحفہ عطیہ تم کو آج بخشش ہوگا اور کلاہ گم کردہ بھی مل جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت پیر روشن ضمیر نے مولانا کو مصلے مرحمت کیا اور گٹھری میں سے کلاہ بھی مل گئی۔ ایک بار کوئی آپ کی پوشاک چرا لے گیا۔ آپ نے دم نہ مارا، بہ وصیت مرشد پابند رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن بعد نماز ظہر حضرت حجرہ میں عبادت میں مشغول تھے اور مراقبہ میں سر جھکائے ہوئے تھے۔ تراب نام ایک قلندر بیباک کہ برسوں سے آپ کا دشمن تھا، خالی موقع پا کر حجرہ میں گھس آیا اور گیارہ زخم چھرے سے جسم مبارک پر لگائے۔ سمجھا کہ کام پورا کر چکا اور وہاں سے بھاگا۔ مریدوں نے دیکھ کر اسے گرفتار کر لیا اور حضرت کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کوئی اسے مزاحمت نہ کرے اور شیخ صدرالدین حکیم

اور شیخ زین الدین کو قسم دی کہ ہرگز اس کو ایذا نہ دیں اور اس قلندر کو نزدیک طلب فرما کر بہت کچھ دے کر رخصت فرمایا۔ اور دوستوں سے کہا کہ اگر اس کو ایذا دی جاتی تو خلاف وصیت شیخ ہوتا۔ کیا عجب ہے اس کا ہاتھ دُکھا ہو۔ بعد اس واقعے کے تین برس اور بقید حیات رہے۔ سیر الاصفیا سے نقل ہے کہ سلطان محمد تغلق نے جو عمر سمرقندی و علی قندھاری کے ورغلانے سے ناخوش ہو رہا تھا، ایک روز دعوت کے حیلہ سے شیخ کو بلایا اور سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا سامنے رکھا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر شیخ نے ان برتنوں میں کھایا تو بہ حیلہ شرعی پکڑ لیں گے، اگر نہ کھایا تو توہین سلطان میں پکڑیں گے۔ حضرت نے نور باطن سے دریافت فرما کر تھوڑا کھانا ہاتھ پر لے کر پہلے زبان پر رکھا، پھر اُس کو نوش کیا۔ حاسد مجبور اور شرمندہ ہو کر رہ گئے۔ بعدہٗ سلطان نے دو توڑے زر سرخ اور دو تھان پارچہ شیخ کو پیش کیے۔ آپ نے اُن کی طرف التفات نہ فرمایا اور کھڑے ہو گئے۔ اس اثنا میں خواجہ نظام الدین وزیر بادشاہ نے دیکھا۔ یہ خواجہ بادشاہ کا عزیز اور حضرت سلطان المشائخ کا مرید صادق تھا۔ اُس نے اُٹھ کر تھان اور دونوں توڑے اُٹھا کر خدام شیخ کے حوالے کیے اور کفش حضرت کی اپنے رومال سے جھاڑ کر سامنے رکھی اور دروازہ تک ہمراہ آیا۔ جب وہ واپس سلطان کے پاس آیا، سلطان نے دست بر قبضہ ہو کر خفگی سے کہا کہ تم نے عطیہ سلطانی کیوں ہاتھ سے اُٹھایا، کیوں پاپوش جھاڑیں اور کیوں اُن کے آگے رکھیں۔ خواجہ نظام الدین نے جواب دیا کہ میرا فخر ہے کہ ان کی جوتی کو اپنا تاج سر بناؤں کہ میں غلام نظام الدین اولیا کا ہوں اور میری جان ناتوان ان کی خاک پر فدا ہے۔ یہ سُن کر سلطان کو بہت غصہ آیا، مگر حضرت کی توجہ کی وجہ سے کچھ نہ کرسکا۔

صاحب جوامع الکلم راوی ہیں کہ حضرت شیخ نصیر الدین کو خانقاہ میں اس بیت پر وجد ہوا :

جفا بر عاشقاں گفتی نخواہم کرد ہم کردی
قلم بر بے دلاں گفتی نخواہم راند ہم راندی

مولانا مغیث شاعر نے ایک رسالہ لکھا اور اس مجلس کی تمام کیفیت لکھی اور لکھا کہ شیخ کو اس بیت پر حالت ہوئی کہ جس میں خداوند تعالیٰ کی نسبت جور و جفا سے اشارہ کرتے ہیں، اس میں کفر لازم آتا ہے۔ اس میں چند کلمے ایسے ہی جمع کر کے مولانا معین الدین عمرانی کے پاس بھیج دیے۔ انھوں نے دیکھ کر حضرت کی خدمت میں ارسال کی۔ آپ نے مولانا عمرانی کو طلب فرمایا، وہ کتاب اُن کو واپس دے کر دستار خلافت عطا کی۔ دوسرے روز پھر سماع تھا حضرت کو اس رباعی پر اضطراب ہوا۔ رباعی

با طبل مغانہ دوش بیباک زدیم	عالی علمش بر سر افلاک زدیم
از بہر یکے نخچہ سے خوارہ	صد بار کلاہ تو بہ بر خاک زدیم

بعد اضطراب بسیار بالائے بام تشریف لا کر بیٹھے اور مولانا مغیث کو طلب کیا۔ جب وہ روبرو آئے تو فرمایا کہ مولانا کلمہ کہ اس جگہ کیا جمل ہے پھر فرمایا کہ باہر کرو۔ دو چار روز کے بعد مولانا مغیث نے انتقال کیا۔ اخبار الاخیار سے نقل ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ میں کس لائق ہوں کہ شیخی کروں۔ آج

مسلمانا مسلمانا مسلمانی	ازیں آئین بے دینی پشیمانی پشیمانی

فرمایا کہ ایمان کا غم کھانا چاہیے۔ در پے کرامت نہ ہونا چاہیے۔ حیران ہوں کہ خلق بے مشاہدہ کیونکر جیتی ہے۔ حضرت سید محمد گیسو دراز سے نقل ہے کہ خواجہ نے فرمایا کہ میں بچہ تھا ایک مسجد میں قرآن پڑھتا تھا۔ اس مسجد میں ایک درخت تھا، ایک کوا آکر اس پر بیٹھا، جو کچھ اس نے بآواز بلند کہا میں نے اس کو سمجھا۔ خیر المجالس سے نقل ہے کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر حضرت سے سوال کیا کہ کچھ فقیروں کے حال کے متعلق ارشاد فرمائیں کہ یہ کیوں ہوتا ہے۔ فرمایا کہ حال نتیجہ صحبت و اعمال ہے اور عمل کی دو قسمیں ہیں۔ اول عمل جوارح کہ ظاہر ہے اور دوم عمل قلب اس کو مراقبہ کہتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ اول انوار عالم علوی سے روحوں پر نازل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس کا اثر قلب پر ہوتا ہے۔ بعدہ جوارح پر۔ جوارح تابع قلب ہیں۔ جب قلب متحرک ہوتا ہے۔ جوارح بھی حرکت میں آتے ہیں۔ وفات حضرت کی ۱۷ یا ۱۸ رمضان شب جمعہ ۷۵۷ھ میں ہوئی۔ مزار قریب شاہجہان آباد درگاہ چراغ دہلی میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

خلفاء حضرت کے حسب ذیل ہیں:

۱ - حضرت شیخ کمال الدین
۲ - علامہ میر سید محمد گیسو دراز دہلوی
۳ - میر سید محمد ابن جعفر مکی
۴ - ملک زادہ احمد
۵ - مولانا معین الدین عمرانی
۶ - میر سید علاؤ الدین برادر زادہ مخدوم جلال الدین جہانیاں جہاں گشت
۷ - شیخ یوسف تحفۃ النصائح
۸ - محمد وحید الدین ادیب
۹ - سید جلال الدین کشوری
۱۰ - قاضی محمد صدر فاضل
۱۱ - شیخ سلیمان لودھی
۱۲ - شیخ محمد متوکل کشوری
۱۳ - شیخ دانیال
۱۴ - شیخ مقدم الدین
۱۵ - قاضی عبد المقتدر
۱۶ - مولانا خواجگی
۱۷ - مولانا احمد تھانیسری
۱۸ - شیخ زین الدین ہمشیرزادہ حضرت شیخ صدر الدین
۱۹ - حکیم شیخ سعد اللہ گیسو دراز

نقل ہے کہ جس زمانہ میں جواہر سنگھ جاٹ نے دہلی کو لوٹا اور اس کے اطراف میں جو قریے اور موضع تھے، سب کو تاراج کیا۔ چراغ دہلی میں ایک برہمن رہتا تھا، اس نے اپنے دل میں خیال کیا کہ ملک لٹ رہا ہے، ہم بھی تباہ ہوں گے۔ مزار شیخ پر چل کر عرض کیجیے کہ یہ بستی کسی طرح بچے۔ مراد والے دور دور سے آتے ہیں اور اس مزار کے صدقہ میں دلی مراد پاتے ہیں۔ یہ سوچ کر اس نے اپنا لوٹا جو نہایت عمدہ تھا، غسل کیا، لوٹا پانی سے بھر کر مزار معلی پر آیا، لوٹا رکھ کر عرض کیا کہ میں برہمن ہوں، میری نذر قبول ہو اور آپ پر روشن ہے کہ تمام علاقہ برباد ہو رہا ہے۔ ہم لوگ جو اس چار دیواری کے اندر بستے ہیں، آپ کی رعایا ہیں اور سوائے آپ کے دوسرا وسیلہ نہیں رکھتے۔ یہ وقت مدد کا ہے۔ یہ عرض کر کے اپنے مکان پر گیا۔ تمام دن حضرت سے لو لگائے رہا۔ شب کو جب وہ سویا خواب میں دیکھا کہ حضرت فرماتے ہیں کہ تم دروازہ بند کیے و جمعی سے

بیٹھے رہو، اگر تمھاری طرف وہ آویں گے تو اندھے ہو جاویں گے۔ چنانچہ جاٹ چراغ دہلی کے لوٹنے کو آتے تھے، احاطہ چراغ دہلی ان کو نظر نہ آتا تھا۔ تمام جنگل میں پھر کر چلے جاتے تھے۔ جب کئی بار انھوں نے حملے کیے اور ناکام رہے تو اطراف کے لوگوں سے پوچھا کہ احاطہ چراغ دہلی نہیں ملتا۔ ان لوگوں نے کہا دیکھو یہ سامنے دکھائی دیتا ہے۔ وہ پھر گئے جب قریب پہنچے، حصار چراغ دہلی پھر نہ دکھائی دیا۔ انھوں نے تجسس کیا کہ کیا وجہ ہے کہ جو ہم قریب جاتے ہیں حصار چراغ دہلی نظر نہیں آتا۔ لوگوں نے کہا کہ وہاں شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کا مزار ہے، وہ بستی ان کے نام پر مشہور ہے۔ وہ اپنی بستی پر بہت مہربان ہیں اور بستی والے ان کے بہت معتقد ہیں۔ یہ ان حضرات کا تصرف ہے۔ یہ سن کر وہ معتقد ہو گئے اور خلوص ارادہ سے واسطے زیارت کے آئے۔ شیرینی، عطر، پھول اور چادر چڑھائی اور اپنی تمام کیفیت تمام اہل بستی سے بیان کی۔ چنانچہ گورنمنٹ انگریزی نے جب دہلی پر تسلط پایا تو مسلمانان شہر جہاں ملتے گرفتار کیے جاتے، پھانسی دیے جاتے۔ ہر ایک قریہ اور قصبہ و دیہ میں مصیبت زدہ پناہ گزین تھے۔ حصار چراغ دہلی میں بھی بہت سے آدمی تھے۔ بعضے فوجی زخمی بھی تھے۔ مٹکاف صاحب سوار لیے ہر طرف گھومتے لوٹتے، مارتے، گرفتار کرتے پھرتے۔ اہل شہر کے ساتھ بعض اہل دیہہ بھی برباد ہوئے۔ یہ کیفیت دیکھ کر خدام آستانہ شریف اور دیگر اہل بستی نے اسی برہمن کی اولاد سے ایک شخص تھا کہا کہ تیرے دادا نے پہلے بھی حضرت سے عرض کیا ہے، اور وہ عرض قبول ہوئی اور لٹنے سے بستی بچی۔ ہمارا منشا یہ ہے کہ جس طرح تیرا دادا گیا تھا تو بھی اسی طرح مزار حضرت پر جا کر عرض کرتا کہ اس آفت سے بستی بچے یا جیسا حکم ہو عمل میں لائیں۔ وہ برہمن بدستور نہا دھو کر لوٹا پانی کا مزار پر انوار پر آیا اور بہت دیر تک گریہ و زاری کرتا رہا۔ اسی شب کو خواب ہوا، کیوں گھبراتا ہے، بستی والوں سے کہہ دے کہ جو آ گئے ان کو نہ نکالو، نہ اب اور کسی کو اپنی بستی میں آنے دو۔ یہاں سے کوئی گرفتار نہ ہوگا، نہ اور کوئی آفت آوے گی۔ چنانچہ ایک متنفس بھی چراغ دہلی سے گرفتار نہیں ہوا۔

صاحب معدن المعانی نے لکھا ہے کہ جب وقت انتقال شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کا نزدیک پہنچا، شیخ رکن الدین برادر شیخ کمال الدین (اپنے ہمشیرہ زادہ) کو بلا کر فرمایا کہ خواجگان چشت کی نعمتوں میں سے جتنا جس کو نصیب تھا وہ میں نے مریدوں کو دے دیا۔ تم کو چاہیے کہ جب مجھ کو قبر میں رکھو تو خرقہ میرے سینے پر اور کاسہ چوبیں سر کے نیچے اور تسبیح زیر انگشت اور ایک طرف نعلین اور ایک طرف عصا رکھنا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بعد فاتحہ سوم میر سید گیسو دراز کو دہلی میں رہنا اور خرقہ کا نہ ملنا شاق گزرا۔ آخر جس چارپائی پر حضرت کو غسل دیا تھا اس کے بان کو نکال کر وہ جھلنگا اپنے گلے میں ڈالا اور کہا میرا یہی خرقہ ہے اور دکن کی طرف کوچ کیا۔

کہتے ہیں کہ راستہ میں جس کسی پر اس جھلنگے میں سے نکال کر ذرا سا بان ڈال دیا، وہی اولیا ہو گیا۔ صاحب مراۃ الاسرار لکھتے ہیں کہ بار دوم جب میں دہلی شریف میں روز پنجشنبہ اور شب جمعہ روضہ اقدس حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی پر گزرا، تمام شب بیدار اور مشغول رہا، انواع سعادت حاصل کیں۔ جب حضور با روحانیت پاک بیدار ہوئے، بندہ نے گستاخی سے عرض کیا کہ اکثر خلفائے حضرت کے صاحب مقامات اور کرامات ہوئے، مگر خرقہ خلافت کسی کو بھی مرحمت نہیں ہوا۔ فرمایا کہ سچ ہے، بعض میرے مرید صاحب مقامات عالی ہوئے ہیں، مگر اس وقت ان میں تھوڑا سا تعصب کا اثر باقی تھا اس واسطے مقتضائے دیانت و امانت نہ تھا کہ خرقہ اپنے پیر کا اس شخص کو دوں جو قید تعصب سے باہر نہ ہو۔ اس وجہ سے خرقہ پیر کسی کو نہیں دیا گیا، مگر بعض مریدوں کو میں نے اپنا خرقہ دیا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ بسلسا

پیمانِ چشت آن سے جاری رہے گا کہ اب وہ قیدِ تعصب سے باہر ہو گئے اور حجابِ تعصب اٹھ گیا ہر تبہ توحید مطلق کے پہنچے۔ کہتے ہیں کہ بعد اس کے میرے اوپر تجلی ہوئی۔ ایسی کیفیت میں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ پس میں سجدۂ شکر بجا لایا اور تصرفات روحانیت حضور پر تجربہ ہوا

ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت چراغ دہلیؒ ان علماء و مشائخ کے ساتھ شریک تھے جنھوں نے ٹھٹھہ میں بالاتفاق فیروز شاہ کو سلطان محمد کا جانشین بنایا۔ لیکن شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی کے بیانات نسبتاً زیادہ واضح ہیں۔ فیروز شاہ کی تخت نشینی کے بارے میں لکھا ہے۔

"جب سلطان محمد تغلق طغی کی بغاوت فرو کرنے کے لیے ٹھٹھہ گیا تو حضرت شیخ نصیر الدین کو اپنے ساتھ لے گیا سلطان محمد نے ٹھٹھہ میں وفات پائی اور سلطان فیروز شاہ بادشاہ ہوا۔ حضرت شیخ نصیر الدین نے سلطان فیروز شاہ کو پیغام دیا کہ آپ وعدہ کریں کہ خلق کے ساتھ عدل و انصاف کریں گے، ورنہ ان بیکس بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے دوسرا فرمانروا طلب کیا جائے۔ سلطان فیروز نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں خدا تعالیٰ کے بندوں سے حلم و بردباری سے پیش آؤں گا۔ اور ان پر انصاف و محبت سے حکومت کروں گا۔ حضرت شیخ نے یہ جواب سُنا تو کہلایا کہ اگر آپ خلق کے ساتھ خُلق و مروّت سے پیش آئیں گے تو ہم بھی اللہ تبارک و تعالیٰ سے آپ کے لیے چالیس سال کی حکومت کے لیے دعا کریں گے۔ آخر کار وہی ہوا جو حضرت شیخ نے فرمایا تھا۔ سلطان فیروز نے چالیس سال تک حکومت کی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ شیخ نصیر الدین محمود نے سلطان فیروز شاہ کو انتالیس خرمے بھیجے جو بشارت پر بشارت خیال کی گئی۔" ص ۲۹

سلطان فیروز شاہ کا وزیر خان جہاں بھی حضرت چراغ دہلوی کا مرید تھا۔ جو نسب کے لحاظ سے تلنگی ہندو تھا سلطان محمد تغلق کے پاس حاضر ہو کر اسلام لایا اور اپنی قابلیت کی بنا پر ترقی کر کے محمد تغلق ہی کے زمانہ میں وزارت کے منصب پر فائز ہوا۔ فیروز شاہ کے زمانے میں بھی وزارت اسی کے ہاتھ میں رہی۔ جب حضرت چراغ دہلویؒ کا مرید ہوا تو ان سے عبادت و ریاضت کے متعلق پوچھا۔ مرشد نے فرمایا تمھاری عبادت یہی ہے کہ تم مملکت کے وزیر ہو۔ حاجت مندوں کی حاجت براری میں کوشش کیا کرو خان جہاں نے اوراد و وظائف کے متعلق پوچھا۔ فرمایا تم ہمیشہ باوضو رہو یہی تمھارے لیے بہتر ہے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ باوضو رہتا اور اتنی احتیاط برتتا کہ اگر دربار میں مسند وزارت پر وضو کی ضرورت پیش آجاتی تو فوراً اٹھ کر وضو کرتا اور رات کو سوتے وقت پلنگ کے قریب ایک آفتابہ اور ایک طشت بھروا لیتا۔ جب آنکھ کھلتی فوراً اٹھ کر وضو کرتا۔ وفات کے بعد حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مقبرے کے قریب دفن ہوا

خان جہاں کی خدا ترسی اور عدل گستری حضرت چراغ دہلویؒ کی صحبت کا نتیجہ تھی۔ اس کے اوصاف میں شمس سراج عفیف لکھتا ہے۔

"خان جہان وزیر صاحب تدبیر اور خدا ترس تھا، ہر وقت رعایا کی بہتری اور فلاح میں لگا رہتا۔ کسی پر ذرہ برابر ظلم

نہ ہونے دیتا۔ اگر کوئی مقطع ظلم کرتا اور مال لے کر آتا تو خان جہاں مال کے اس کو پسند نہ کرتا۔ ہر وقت رعیت کی راحت رسانی میں سرگرم رہتا۔ کام کرنے والے گروہ کی حمایت کرتا اور دل و جان سے اس کے قصور کی پردہ پوشی کرتا اور اگر کسی عامل سے کوئی قصور سرزد ہو جاتا تو نہایت عمدہ طریقہ پر اس کا حال بادشاہ سے عرض کر کے اسے شاہی باز پرس سے بری کرا دیتا۔ خان جہاں کی وفات پر تمام خلقت خدا نے ماتم کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام آثار اس کی مغفرت کی دلیل ہیں[1]

حضرت چراغ دہلوی سلطان فیروز کے ساتھ ٹھٹھہ سے واپس ہو رہے تھے، تو انھوں نے حضرت قطب الدین منور کی ملاقات کے لیے ہانسی کا رخ کیا۔ جب قطب الدین منور کو پتہ چلا تو برہنہ پا ان کی طرف دوڑ کر آئے اور دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ حضرت قطب الدین منور نے ان کے قدموں کی طرف ہاتھ بڑھایا اور حضرت چراغ نے ان کے قدم لینے کا ارادہ کیا۔ اس تواضع کے بعد دونوں بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے خانقاہ میں آئے۔ اور اپنے پیر و مرشد کو یاد کر کے بہت روئے، پھر محفل سماع منعقد ہوئی،

سید محمد بن جعفر | شیخ نصیر الدینؒ کے خلفاء میں سید محمد جعفر بڑے پایے کے بزرگ گزرے ہیں۔ توحید و تفرید میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ اولیاء اللہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اپنے زمانہ کے کاملین میں سے تھے۔ آپ نے اپنے ظاہری و باطنی احوال کے متعلق بعض ایسی باتیں لکھی ہیں، جنھیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔

"بحر المعانی" کے نام سے آپ کی تصنیف ملتی ہے، جس میں حقائق توحید، علوم دین اور اسرار معرفت بہت عمدہ طریقہ سے بیان کیے گئے ہیں۔ روح کے بیان میں ایک رسالہ بھی لکھا۔ ایک رسالہ پنج نکات ہے۔ ایک کتاب کا نام بحر الانساب ہے۔ جس میں اہل بیت رسالت کے حسب نسب کا بیان ہے اور ان کے ساتھ اپنے آباؤ اجداد کی نسبت تحریر کی ہے۔

بہت لمبی عمر پائی، صحیح تاریخوں کا علم نہیں ہو سکا۔ اتنا معلوم ہے کہ آپ سلطان محمد تغلق کے عہد سے سلطان بہلول کے عہد تک زندہ رہے۔

آپ کے آباؤ اجداد مکہ معظمہ کے شرفا میں سے تھے۔ وہاں سے دہلی آئے، پھر سرہند میں سکونت اختیار کر لی۔

بحر المعانی میں فرماتے ہیں، میں ساٹھ سال تک تحصیل علم ظاہری میں لگا رہا۔ اس دوران میں محبوب ازلی اور مقصود حقیقی سے غافل رہا۔ اب تیس برس ہوئے ہیں کہ جو کچھ میری آنکھیں دیکھتی ہیں ان کو بچشم دل دیکھتا ہوں اور جو کچھ میرے کان سنتے ہیں اس کو بگوش ہوش سنتا ہوں۔

"بحر المعانی" میں آپ نے اقطاب، اوتاد، ابدال، اور تمام رجال اللہ اور ان کے اعداد، مراتب، اسامی، اوراد، احوال قسمیں اس طرح تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں، میں نے ان سب سے ملاقات کی ہے اور ہر ایک سے

---

[1] تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف۔ ص ۳۹۳، ۴۲۴

فیض حاصل کیا ہے اور سب کے مقامات کا مشاہدہ کیا ہے۔

فرماتے ہیں ان کے علاوہ ۳۵۷ ابدال اور ہیں اور میں نے چشمۂ نیل کے پہاڑ پر ان سے ملاقات کی ہے۔ وہ پہاڑ میں رہتے ہیں، درختوں کا گوند اور جنگل کے کیڑے مکوڑے ان کی خوراک ہیں۔

ایک جگہ لکھتے ہیں: قطبیت کے مقام میں تمام اولیا میں سے دو شخص معشوقی کے درجہ تک پہنچے اور یہ مقام کسی اور کو نصیب نہ ہوا۔ ایک شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور دوسرے شیخ نظام الدین بدایونیؒ۔ یہ دونوں بزرگ روح احمدی کے سرچشمے سے سیراب تھے۔

بحرالمعانی میں فرماتے ہیں: جو کچھ میری زبان سے قلم پر آتا ہے، اسے میری زبان میرے دل سے اقتباس کرتی ہے اور میرا دل اسے میری روح سے اقتباس کرتا ہے اور میری روح اسے روح علی سے اقتباس کرتی ہے۔ حضرت علی کی روح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح سے اقتباس کرتی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح رب العزت و علا کے کلام بے حرف و صوت سے اقتباس کرتی ہے۔

فرماتے ہیں، جس قدر میں زیادہ لکھتا ہوں اتنا ہی زیادہ مشکلات میں پھنس جاتا ہوں۔

فرماتے ہیں، ابراہیمؑ صاحب ذوق تھے، موسیٰؑ صاحب لذت اور حبیب اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صاحب حلاوت۔

فرماتے ہیں، روح کی معراج راگ ہے اور دل کی معراج نماز ہے۔

آپ کی ایک غزل ملاحظہ ہو:

اے صورت تو جہان معنی ۔۔۔ با صورت تست جان معنی

یکسر شاخ گلے ز بستہ صورت ۔۔۔ مثل تو بہ بوستان معنی

از صورت تست خاطر ما ۔۔۔ منزل گہ کاروان معنی

ہر عضو کند بصد زبان پیش ۔۔۔ از صورت تو بیان معنی

در صورت وصف تو محمد ۔۔۔ تا حشر نہادہ خوان معنی

حضرت چراغ دہلویؒ کے ارشادات

حضرت خواجہ چراغ دہلویؒ کے چند چیدہ چیدہ ارشادات درج ذیل ہیں:

—— اپنے ایمان کا غم کھانا چاہیے اور کرامت کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے۔

—— بیداری میں انسان کو جو خیالات لاحق ہوتے ہیں، سوتے وقت خواب میں بھی وہی پیش آتے ہیں۔ اسی طرح زندگی میں جن باتوں سے شغل رہتا ہے یا جو چیزیں مرغوب ہوتی ہیں مرنے پر وہی پیش آتی ہیں۔

—— دل تمام اعضائے جسمانی پر حکومت کرتا ہے اور خدائے تعالیٰ دل کا قبلہ ہے اگر دل ہی اپنے قبلہ کی طرف متوجہ نہ ہوگا تو دوسرے اعضا جو اس کے تابع ہیں کیسے متوجہ ہوں گے۔

—— جو شخص ذکر الٰہی کرتا ہے خدا اس کا جلیس ہوتا ہے

——— اگر دنیا ہی مطلوب ہو تو پارسائی اختیار کرو، اس لیے کہ تقویٰ کے ساتھ رزق کو متعلق کیا گیا ہے۔

——— آدمی کے ہر کام کے لیے ایک سرمایہ ہوتا ہے اور فقیری کا سرمایہ وہ مجاہدہ ہے جو صدقِ دل سے اللہ کے لیے کیا جائے۔

——— لوگ مطلوب کی قدر نہیں جانتے، اس لیے سخت اور دشوار مجاہدے اختیار نہیں کرتے۔ اگر مطلوب کی قدر جانتے تو ان پر دشوار سے دشوار مجاہدہ بھی آسان ہوتا۔

——— راتوں کو بیدار رہو، اس لیے کہ نزولِ انوار اکثر راتوں میں ہی ہوا کرتا ہے۔

——— جو اپنے آپ کو گناہوں سے بچاتا ہے اُسے طاعت میں لذت حاصل ہوتی ہے۔

——— فقرا بہت ہیں، اگر چاہیے کہاں کا فقر بہ خوشی ہو۔

——— سالک کو عبادت میں ذوق و شوق حاصل ہو تو یہی اس کی غذا بن جاتا ہے، اگر یہ حاصل نہ ہو تو پھر عبادت اس کے لیے اکتاہٹ کا باعث ہوتی ہے۔

——— علم سے مراد عمل ہے، علم حسن لنفسہٖ نہیں بلکہ حسن لغیرہٖ ہے۔ جیسے وضو یعنی وضو سے مقصود نماز ہے اسی طرح علم سے مراد عمل ہے۔

——— اگر طلبِ دنیا میں خیر کی نیت ہو تو وہ فی الحقیقت طلبِ آخرت ہے۔

حضرت شیخ سراج الدّین عثمانؒ

وفات ـــــــــ لکھنوتی (بنگال) ۷۵۸ھ

قطب ولایت حضرت شیخ سراج الدین عثمان کمالات صوری و معنوی کے جامع تھے۔ عشق و محبت اور ذوق و سماع میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ حضرت سلطان جیؒ کے خلیفہ تھے۔ عام طور پر اخی سراج کے نام سے مشہور ہیں۔

ابھی آپ نوجوان تھے داڑھی مونچھ بھی نہ نکلی تھی کہ حضرت شیخ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور ان کی خدمت بجا لانے لگے۔ کبھی کبھی اپنے والدین کی ملاقات کے لیے اپنے وطن لکھنوتی[1] چلے جایا کرتے پھر واپس آجایا کرتے تھے۔

صاحب اخبار الاخیار کے نزدیک آپ کا اصل وطن لکھنوتی تھا، اس کی تحقیق میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ "لکھنوتی کہ آں ان بگور مشہور است۔"

مرأۃ الاسرار کا بیان ہے "ظاہراً اجداد اول در اودھ سکونت داشتہ باشند بعد ازاں پرورش در لکھنوتی متوطن شدہ باشد" اودھ سے شاید اجودھیا (فیض آباد) مراد ہے۔ اس زمانہ میں اودھ کا اطلاق آجکل کے صوبہ اودھ پر نہ تھا، جس کا صدر مقام لکھنؤ ہے اسی اودھ کی رعایت سے لطائف اشرفی میں آپ کو اودھی لکھا ہے۔

روضۃ الاصفیا نے آپ کے نام کے ساتھ بدایونی کا لفظ بھی لکھا ہے۔ لطائف اشرفی میں ہے کہ "اول کسے کہ از دیار اودھ در ولایت ہندوستان بشرف ارادۂ و خلافت مشرف شدہ وے بودہ۔" مگر مشہور ہے کہ آپ کا وطن لکھنوتی تھا جو بنگال میں واقع ہے۔

حضرت سلطان الاولیاءؒ آپ پر بہت نظر عنایت رکھتے تھے مگر علم متداولہ میں آپ کو ملکہ نہ تھا، اس لیے خلافت نہ دینا چاہتے تھے، تاہم سلطان الاولیا نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ یہ ہندوستان کے آئینہ ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا ہی بنایا۔

صاحب مرأۃ الاسرار لکھتے ہیں:

"از جمیع کمالات صوری و معنوی آراستہ بود و در عشق و محبت و ذوق و سماع نظیری نداشت و نہایت ترک و تجرید و آزادی وجود قرار دادہ بود۔ بذا، و اخلاق نہایت پسندیدہ داشت و در تربیت مریداں میان یاراں اعلیٰ ممتاز بود۔"

مرأۃ الاسرار میں لکھا ہے کہ تمام ہندوستان میں آج تک انھیں دو بزرگوں (شیخ نصیر الدین اودھی اور شیخ اخی سراج) کے سلسلے جاری ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک جاری رہیں گے۔"

---

[1] لطائف اشرفی میں بجائے لکھنوتی کے لکھنو لکھا ہے۔ یہی قرین قیاس ہے۔ چنانچہ اسی نظر سے آپ کو اودھی بھی کہا ہے (اخبار الصالحین ص۲۹۵)

چونکہ علم باطنی کے لیے علم ظاہری بہت ضروری ہے، اس لیے حضرت سلطان جی نے آپ سے فرمایا کہ "اوّل درجہ ایں کار علم است"۔ اس موقع پر مولانا فخرالدین رازی نے جو خود حضرت سلطان جی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ عرض کیا کہ میں چھ ماہ کے اندر اندر انھیں تعلیم دے دوں گا۔ چنانچہ حضرت سراج الدینؒ نے مولانا فخرالدین سے پڑھنا شروع کر دیا۔

غیاث پور میں رہ کر آپ نے مولانا رکن الدین سے کافیہ، مفصل، قدوری اور مجمع البحرین پڑھی۔

سیرالاولیا کے مصنف سید محمد کرمانی لکھتے ہیں:

"شیخ سراج الدین در کبر سن تعلیم برابر من میزان و تصریف و قواعد و مقدمات آں تحقیق نمود۔"

حضرت سلطان جی نے ان کے خلافت نامہ پر خود اپنا نشان مبارک (دستخط یا مہر) ثبت فرمایا تھا۔ آپ نے خلافت نامہ نصیرالدین اودھی کے پاس واپس اودھ بھیج دیا اور خود حضرت سلطان جی کی خدمت میں رہے۔ تعلیم بھی جاری رکھی یہاں تک کہ حضرت شیخ کی وفات کے بعد اسی تعلق سے مزید تین سال تک غیاث پور میں رہے۔ بعد ازاں حضرت شیخ کے وقف کیے ہوئے کتب خانہ سے چند کتابیں اور تبرکات جامہ ہائے مبارک ساتھ لے کر وطن کو واپس آئے۔

اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ خود حضرت سلطان جی کی زندگی میں آپ کو لکھنوتی جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب آپ کو لکھنوتی (واقعہ بنگالہ) جانے کا حکم ملا تو آپ نے فرمایا، وہاں ایک بڑے متبحر عالم شیخ علاؤالدین ہیں ان کی اور میری کیسے بنے گی؟ پیر و مرشد نے فرمایا فکر نہ کرو وہ تمھارے مرید بنیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب آپ وہاں پہنچے تو شیخ علاؤالدین آپ کے مرید ہوئے اور اس طرح یہ سلسلہ بنگالہ میں پھیلا۔

سیرالاولیاء میں مذکور ہے کہ جب آپ کی وفات کا وقت آیا تو اپنے وطن لکھنوتی میں ایک مقام پر اپنی قبر کے لیے جگہ پسند فرمائی، پیر و مرشد کے تبرکات ایک جگہ دفن کیے اور وصیت کی کہ مجھے ان کے پائیں دفن کرنا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آپ نے ۷۵۸ھ میں وفات پائی۔

شیخ علاؤالحق والدین | حضرت اخی سراجؒ کے مرید شیخ علاؤالحق والدین کا ذکر اوپر آیا ہے۔ آپ اپنے وقت کے اولیاء اللہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ پورا نام شیخ علاؤالحق والدین بن اسعد لاہوری بنگالی ہے۔ ابتدائے حال میں اپنے زمانہ کے دولت مند اور صاحب اثر لوگوں میں سے تھے۔ عوام میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے۔

شیخ علاؤالدین کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کے پاس بے اندازہ روپیہ آتا تھا اور بے دریغ اسے خرچ کرتے تھے، یہاں تک کہ بادشاہ اور امرا تک حیران ہوتے اور رشک کرتے تھے۔ بادشاہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میرا خزانہ شیخ کے باپ کے پاس ہے اور وہ ان کو دیتا ہے۔

ایک مرتبہ بادشاہ نے شیخ کو شہر سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ وہ سنارگاؤں چلے گئے اور دو سال تک وہاں رہے۔ شہر سے نکلنے کے بعد آپ نے اپنے خادم سے کہہ دیا کہ اب خرچ کو پہلے سے دگنا کر دو۔

کہا جاتا ہے کہ شیخ کی آمدان کی بظاہر کوئی صورت نظر نہ آتی تھی مگر اتنا روپیہ نہ جانے کہاں سے آجاتا تھا۔ آپ کے بزرگوں کے دو باغ تھے، جن سے خاصی آمدنی تھی، مگر وہ کسی اور کے قبضے میں تھے اور آپ نے انھیں اپنے قبضہ میں لینے کے لیے کبھی کوئی بات تک نہ کی۔ بے اندازہ خرچ کرنے کے باوجود فرمایا کرتے تھے "میرے مخدوم جو کچھ خرچ کرتے تھے، میں اس کا عشر عشیر بھی خرچ نہیں کرتا"۔

شیخ علاؤالحق والدین نے ۸۰۰ھ میں وفات پائی۔ مزار مبارک پنڈوا میں ہے۔

حضرت خواجہ محمد جلال الدین کبیر الاولیا پانی پتی رح

ولادت ــــــــــــ ۵۹۵ھ

وفات ــــــــــــ پانی پت ۷۶۵ھ

قطب الاقطاب، حجت الاولیا خواجہ محمد جلال الدین شیخ شمس الدین ترک پانی پتی رح کے مرید و خلیفہ تھے۔ شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی رح سے بھی فیض حاصل کیا۔ ریاضات و مجاہدات میں بلند درجہ رکھتے تھے۔ صوری و معنوی صفات سے سرفراز ہوئے اور اولیاء اللہ میں اونچا درجہ پایا۔

صاحب نام خواجہ محمد تھا، جلال الدین و کبیر الاولیا آپ کے خطابات ہیں۔ سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھے۔ ۵۹۵ھ کو پیدا ہوئے اور ایک سو ستر برس کی عمر پا کر ۱۳ ربیع الاول ۷۶۵ھ میں سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں بمقام پانی پت عالم جاوداں کو سدھارے۔ مزار پر انوار پانی پت میں مرجع خلائق ہے۔

آپ ارباب تجرید کے سر حلقہ اور مادر زاد ولی تھے جو کچھ زبان مبارک سے فرماتے وہ ہو کر رہتا۔ بچپن ہی میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ چچا نے آپ کی پرورش کی۔ ایام طفولیت ہی میں حضرت خواجہ بو علی قلندر رح کے منظور نظر تھے۔ حضرت خواجہ آپ کے دیکھنے کے لیے روزانہ آیا کرتے تھے اور آپ سے بے انداز محبت تھی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن بو علی قلندر رح ایک دیوار پر تشریف فرما تھے کہ خواجہ جلال الدین گھوڑے پر سوار وہاں سے گزرے۔ بو علی قلندر رح کی نظر ان پر پڑی تو بے ساختہ زبان سے نکلا "زہے اسپ، زہے سوار"۔ یہ فرمانا تھا کہ خواجہ جلال الدین کی حالت متغیر ہونے لگی۔ بے خودی کے عالم میں گھوڑے سے گر پڑے اور گریبان پھاڑ کر بے تحاشا جنگل کو نکل گئے۔

چالیس سال تک جنگلوں میں پھرے، طرح طرح کی مشقتیں اور ریاضتیں کیں، عبادت الٰہی میں لگے رہے اور درجۂ کمال کو پہنچے۔ دو مرتبہ حرمین شریفین بھی تشریف لے گئے اور حج کا شرف حاصل کیا۔ وہاں بے انداز علما و مشائخ اور اولیائے کرام سے ملے اور ان کی مجلس میں رہ کر کسب فیض کیا۔ حضرت جمال الدین قطب عالم ہانسوی کے اشارے پر وطن واپس تشریف لائے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔

آپ حضرت بو علی قلندر رح کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ مجھے رشد و ہدایت سے مستفیض فرمائیں۔ آپ نے فرمایا اے بیٹے! تیری کشائش ایک مرد خدا پر موقوف ہے، وہی تمہیں نور باطن سے مالامال کریں گے۔ کچھ دنوں میں وہ تمہیں مل جائیں گے۔ آپ نے تعمیل کی اور صبر کیا۔ چنانچہ جب شمس الاولیا شمس الدین ترک پانی پتی پانی پت

میں تشریف لائے تو خواجہ جلال الدین ان کی صوری و معنوی عنایات سے مالا مال ہو کر ان کے مرید ہوئے۔ خاصی مدت ان کی حضوری میں گزاری۔ اس دوران میں خوب مجاہدہ و ریاضت کی۔ یہاں تک کہ بہت اونچے درجہ کو پہنچے۔ حضرت شمس الدین نے آپ کو خلافت کا درجہ عطا کیا اور اپنی خانقاہ کا سجادہ نشین مقرر کیا۔

روایت ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ایسا درجہ عطا فرمایا تھا کہ دور دراز کا سفر طرفۃ العین میں طے کر لیتے۔ پھر اپنی جگہ پر واپس آجاتے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ آپ جمعہ کی نماز اکثر خانہ کعبہ میں ادا کیا کرتے تھے۔

صحرا نوردی کا بہت شوق تھا، چنانچہ بہت مدت تک جنگلوں میں رہ کر ریاضتیں کیں۔ اگرچہ آپ کے ہاں سے سلطانہ سینکڑوں آدمی کھانا کھاتے تھے مگر اپنا یہ حال تھا کہ اکثر فاقوں سے بسر ہوتی۔ بڑے سخی اور بلند حوصلہ تھے کبھی کسی کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے، ہمیشہ کچھ نہ کچھ دیا ہی کرتے تھے۔

آخری عمر میں استغراق بہت بڑھ گیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ جب دیکھو استغراق کی حالت میں ہیں۔ نماز کا وقت آنے پر خادم آپ کے کان میں تین مرتبہ حق حق کہتا تو آپ ہوش میں آجاتے اور نماز ادا کرتے پھر وہی کیفیت طاری ہو جاتی۔ استغراق سے عالم ہوش میں آنے پر نماز کے لیے ہر مرتبہ تازہ وضو کرتے۔

آپ کے صاحبزادے بھی فقر و فاقہ سے زندگی گزارتے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک کیمیا گر نے ان سے کہا کہ کیمیا گری سیکھ لو، بہت روپیہ کماؤ گے۔ انھوں نے یہ بات اپنے والد بزرگوار سے بیان کر دی۔ حضرت خواجہ نے یہ سن کر قریب کی ایک دیوار پہ تھوک دیا۔ ساری دیوار سونا بن گئی۔ پھر بیٹوں سے فرمایا تم کیمیا گری کیا کرو گے کہ اس میں جان کا بھی خوف ہے وہ کیمیائے سعادت حاصل کرو کہ تمھارا تھوک جس شے پر پڑے وہ سونا بن جائے۔

خواجہ خواجگان حضرت شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ جن کا مزار مبارک قصبہ ردولی میں ہے آپ کے مرید اور خلیفہ اعظم تھے، وہ بڑے پایے کے بزرگ اور ولی اللہ گزرے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کے حالات بھی بیان کر دیے جائیں:

حضرت شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ شان عظیم حال مستقیم رکھتے تھے، قہر و لطف سے جو کچھ آپ کے خیال میں آتا اسی وقت اس کا ظہور ہوتا۔ ریاضت اور مجاہدہ ایسا کیا کہ چھ ماہ ایک قبر میں پوشیدہ یاد حق میں رہے۔ آپ کو بھی ہر وقت استغراق رہتا تھا کہ نماز جمعہ کو جاتے تھے خادم حق حق کہتا ہوا آگے چلتا تھا تب آپ آگے قدم رکھتے تھے۔ اگر وہ کبھی چپ ہو جاتا، آپ بھی کھڑے رہ جاتے تھے۔ شیخ عبدالرحمان چشتی کہ مصنف مرآۃ الاسرار اور چشتیہ میں نقل کرتے ہیں کہ اسم حق میں ان حضرت مخدوم شیخ احمد عبدالحق و مریدان شیخ کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی سانس بغیر ذکر حق کے خالی نہ آتا تھا۔ ہر موقع ہر محل ہر کاروبار میں حق کہتے تھے۔ چنانچہ اسم حق اور جلال حق میں مستغرق رہتے تھے اور آج تک آپ کے سلسلہ میں ذکر حق جاری ہے۔ جاننا چاہیے کہ جب روح عارف کی دریائے توحید میں غوطہ زن ہوتی ہے تو انانیت گم ہو کر تنہا لفظ حق حق کہنے لگتا ہے اور حقیقت توحید معائنہ کر کے حقیقت اشیا ہیژدہ ہزار عالم کو ایک وجود جانتا ہے۔ اس سبب سے حق بحقیقت پہنچ جاتا ہے۔ سلسلۂ نسب حضرت کا چند واسطوں سے

امیرالمومنین عمر ابن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منتہی ہوتا ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ آپ کے دادا شیخ داؤد مع چند مردمان قبیلہ کے حادثۂ ہلاکو خاں میں بلخ سے نکل کر وارد ہندوستان ہوئے اور بعہد سلطان علاؤالدین خلجی اودھ میں اہلِ مد ہوئے اور قصبہ رودلی کی سکونت اختیار کی۔ شیخ داؤد مردِ عظیم القدر تھے اور مرید حضرت مخدوم نصیرالدین چراغ دہلی کے تھے۔ اپنے حالِ جمال باطنی کو کسوت اہلِ ظاہر میں پوشیدہ رکھتے تھے۔ مزار ان کا رودلی سے جنوب میں نہایت غریبانہ واقع ہے۔ بعد انتقال ایک پسر شیخ عمر کو چھوڑا۔ یہ بھی حشایخ سیرت اور متقی تھے۔ ان کا مزار بھی اپنے والد کے پاس ہے۔ شیخ عمر کے دو صاحبزادے تھے۔ ایک شیخ تقی الدین دوسرے حضرت شیخ احمد عبدالحق۔ شیخ تقی دہلی میں آ رہے تھے اور حضرت شیخ احمد عبدالحق رودلی میں والدہ کے پاس تھے۔ صاحب انوار نورالعیون تحریر فرماتے ہیں کہ شیخ احمد قدس سرہٗ سات برس کے تھے۔ ہمیشہ اپنی والدہ کے ہمراہ نماز تہجد ادا کرتے۔ ایک روز آپ کی والدہ نے شفقت مادری سے کہا کہ عبدالحق ابھی تم پر نماز فرض نہیں۔ تم تقوی میں اتنی کوشش کرتے ہو۔ چونکہ آپ عاشقِ الٰہی تھے، گھر سے بے سروسامان نکل کر چل دیے، مگر زبان پر لفظ حق جاری ہو گیا اور بعد ڈیڑھ دو ماہ کے اپنے بھائی شیخ تقی الدین کے پاس دہلی پہنچے۔ انھوں نے ان پر بہت شفقت کی اور ان کو ایک مولوی کے پاس لے گئے کہ تعلیم حاصل کریں۔ انھوں نے ان کو میزان الصرف شروع کرائی۔ جب سبق میں ضَرَبَ ضَرَبَا آیا اُس کے معنے پڑھے، اُستاد سے کہنے لگے کہ راہِ حق میں زدن اور زدہ شدن کا کیا کام۔ مجھے ایسا علم پڑھاؤ جس سے معرفتِ حق حاصل ہو کہ سوائے اس کے میں اور کو دوسعت نہیں رکھتا۔ مولوی صاحب یہ سُن کر متحیر ہوئے اور ان کی طلب صادق پر روتے، اور عذر کیا۔ ان کے بھائی سے کہا کہ اس عزیز کا مطلب دوسرا ہے۔ ہم کو اس امر میں کچھ دخل نہیں۔ اور اول سے ایسا استغراق تھا کہ ایک روز زوجہ شیخ تقی الدین نے اپنے شوہر سے کہا کہ تم اس کو کیوں نہیں پڑھاتے یا کہیں اسے پڑھنے بٹھاؤ کہ علم جوہرِ انسان ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کچھ اور ہی پڑھا ہوا ہے، دیکھو میں تمھیں دکھائے دیتا ہوں، پھر ایک بٹوہ میں پانچ روپے ڈال کر ان کو دیے اور ان سے کہا کہ ان کو بحفاظت تمام رکھنا۔ آپ نے وہ بٹوہ لے کر دروازہ کی دہلیز میں گاڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد آپ کی بھاوج نے پوچھا کہ بھائی عبدالحق وہ بٹوہ روپیہ کا کہاں ہے؟ یہ سُن کر کہنے لگے کہ کیسا بٹوہ میں کیا جانوں۔ انھوں نے کہا ابھی جو تمھارے بھائی نے دیا ہے۔ رونے لگے کہ مجھ پر بہتان لگاتی ہو، مجھ کو بٹوہ نہیں دیا۔ انھوں نے وہ جگہ بتائی جہاں آپ نے بٹوہ گاڑا تھا۔ اس وقت یاد آیا اور فرمایا کہ میں بھول گیا تھا۔ آخر آپ کو صحبتِ دنیاداراں خوش نہ آئی۔ دہلی سے نکل گئے۔ بزرگوں سے بھی آپ کے درد کو کسی نے نہ تشخیص کیا۔ ایک مدت جنگل میں عبادت میں مشغول رہے اور ریاضت اور مجاہدہ بحد کمال کو پہنچایا۔ بعد الہامِ غیبی پانی پت میں وارد ہو کر شیخ جلال الدین پانی پتی سے مل کر عارف حق ہوئے۔ اس کی کیفیت اس طرح پر ہے کہ شیخ جلال الدین نے شیخ عبدالحق کا آنا نورِ باطن سے معلوم کر کے چند گھوڑے باساز زریں کسوا کر درِ خانقاہ پر استادہ کرا دیے اور خادم کو حکم دیا کہ آج دسترخوان نہایت تکلف سے تیار ہو۔ الغرض جب شیخ عبدالحق دروازہ پر آئے، گھوڑے اور آرائش مکان اور تزک و احتشام دیکھ کر اپنے دل میں کہنے لگے کہ جو شخص ایسا باحشمت اور دنیادار ہو، محبتِ الٰہی سے اس کو کیا ذوق ہوگا۔ جب

اندر آئے تو دسترخوان کو دیکھ کر اور بھی حیران ہوئے اور وہاں سے نکل کر چل دیے۔ تمام دن چلے، شام کو قریب ایک آبادی کے پوچھا کہ اس مقام کا کیا نام ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ پانی پت ہے۔ یہ سن کر بہت ہی حیران ہوئے۔ وہ شب باہر بسر کرکے صبح پھر راہی ہوئے تھوڑی دور چلے تھے کہ راہ گم کر گئے۔ دیکھا کہ ایک خشک درخت پر ایک شخص کلاہ سر پر رکھے بیٹھا ہے۔ انھوں نے اس سے راستہ دریافت کیا، اس نے کہا کہ اسے گمراہ اصلی راستہ دروازہ شیخ جلال الدین سے گم کرکے آیا ہے، اگر یقین نہیں تو دو شخص اور آتے ہیں اُن سے پوچھ لے۔ جب یہ چند قدم اور آگے بڑھے، دیکھا کہ دو شخص بشکل مشائخ آتے ہیں، ان کے نزدیک پہنچ کر راستہ دریافت کیا۔ انھوں نے بھی کہا تو دروازہ شیخ جلال الدین سے راہ گم کرکے آتا ہے۔ تیرا راستہ دروازہ شیخ پر ہے۔ اب تو ان کو یقین ہوا کہ یہ ہدایت غیبی ہے۔ پس بہ اعتقاد تمام وہاں سے واپس ہوئے اور دل میں کہا کہ اگر وہ اپنی کلاہ مزار خواجہ شمس الدین سے مس کرکے میرے سر پر رکھیں اور حلوا دیں تو کیا خوب ہو۔ جب یہ قریب خانقاہ کے پہنچے ان کے آنے کا حال نور باطن سے معلوم کرکے روضۂ پیرومرشد میں تشریف لے گئے۔ خانقاہ پر ان کو معلوم ہوا کہ شیخ روضہ خواجہ شمس الدین میں ہیں، یہ بھی نہایت اشتیاق سے وہاں پہنچے اور اندر روضہ کے جاکر شیخ کی قدمبوسی کی۔ شیخ نے اپنی کلاہ روضہ شیخ سے مس کرکے ان کے سر پر رکھی، اسی وقت برائے نیاز ایک شخص حلوا لیے۔ شیخ نے فاتحہ دے کر ان کو اور دیگر حاضرین کو تقسیم فرمایا۔ بعض نے لکھا ہے کہ وہ کل حلوا ان کے حوالے فرمایا کہ یہ تمھاری آرزو تھی۔ یہ حلوہ لے کر خوش ہوئے اور تین بار دونوں نے حق حق کہا اور شیخ نے ان کو مرید فرمالیا۔ بعدہٗ جب کار بہ تکمیل پہنچا خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور ارشاد کیا کہ میں خدا سے چاہتا ہوں میرا سلسلہ تجھ سے جاری ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آپ کی توجہ اور برکت سے ہزار ہا خلفائے نامدار درجہ ولایت کو پہنچے اور اس سلسلے نے بڑا فروغ پایا۔

بعض نے لکھا ہے کہ جب شیخ احمد دوبارہ آئے ہیں تو شیخ ان کے شوق میں درِ خانقاہ پر کھڑے تھے اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی فرماتے ہیں، جب شیخ عبدالحق آئے اور مرید ہوئے تو شیخ کی خدمت میں رہنے لگے، مگر ان کے دل میں بوجہ اسباب معیشت تنفر تھا، کیونکہ انھیں تجرید سے الفت تھی۔

حضرت شرف الدّین احمد منیریؒ

ولادت ــــــــــ منیر (ضلع پٹنہ) ۶۶۱ھ

وفات ــــــــــ بہار ــــ ۷۸۲ھ

حضرت شرف الدین احمد منیری خطۂ ہند کے ان صوفی بزرگوں اور اولیائے کرام میں سے ہیں جنھوں نے اتباع سنت، خدمت خلق اور تعلیمات دین کی ترویج و ترقی کے لیے بہت کوششیں کیں اور خواص و عوام دونوں کو اپنے نور باطن سے مستفید کیا بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن میں تصوف اور فقہ کے مسائل پر سیر حاصل بحث کی اور ان کی شرحیں لکھیں۔

نسب اور خاندان ۲۶ شعبان ۶۶۱ھ میں پٹنہ (بہار) میں منیر کے مقام پر پیدا ہوئے سلسلہ نسب یہ ہے: شرف الدین احمد بن شیخ یحییٰ بن اسرائیل بن مولانا محمد تاج فقیہ بن ابی بکر بن ابی الفتح بن ابی القاسم بن ابی الصائم بن ابی دہر بن ابی لیث بن ابی سمر بن ابی الدین بن ابی سعید بن ابی ذر بن زبیر المکی با بی الصعب بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف۔

آپ کی والدہ محترمہ کا نسب نامہ چودھویں پشت میں حضرت امام جعفر الصادق علیہ السلام سے ملتا ہے۔ آپ کا خاندان بیت المقدس سے ہندوستان آیا اور منیر کے مقام پر سکونت اختیار کی۔ یہ خاندان زہد و تقویٰ کی بنا پر بہت ممتاز تھا اور منیر کے آس پاس بہت سے لوگ اسی خاندان کی بدولت اسلام لائے۔

شرف الدین احمد نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ سن شعور کو پہنچے تو والد بزرگوار نے انھیں ایک مشہور عالم دین ابو توامہ کے پاس سنارگاؤں بھیج دیا، جہاں انھوں نے کلام پاک، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ ریاضت و مجاہدہ میں مصروف رہا کرتے تھے۔ علم تصوف پر بھی آپ نے بہت کتابیں پڑھیں۔ وہیں اپنے استاد کی دختر سے شادی کر لی جن سے تین اولادیں ہوئیں۔

سنارگاؤں میں قیام کے دوران والد بزرگوار کی وفات کی خبر ملی تو وطن آئے اور کچھ دن وہاں قیام کیا، پھر مرشد کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ بڑے بھائی شیخ جلال الدین بھی ساتھ گئے۔

دہلی پہنچ کر دیگر بزرگان کرام کے علاوہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے بھی ملاقات کی۔ پھر سلطان المشائخ کی ہدایت کے بموجب شیخ نجیب الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بیعت کی۔ انھوں نے کچھ نصیحتیں کر کے رخصت کیا۔

مرشد کی وصیتیں پیر و مرشد نے بیعت کے وقت جو نصیحتیں فرمائیں وہ یہ تھیں:

اے عزیز ، یہ بات بڑے غور و فکر کے بعد ظاہر ہوتی ہے کہ ترکِ خودی میں مشغولیت کے علاوہ دنیا کی کسی چیز میں مشغول رہنا غلطی ہے ۔ انسانی حرکات، سکنات ، اقوال اور افعال ہی سے خودی پیدا ہوتی ہے ۔ کھانا ، بولنا ، سونا میل جول پیدا کرنا ، سُننا ، دیکھنا وغیرہ انسانی فطرت کا اقتضاء ہے ۔ لیکن یہ تمام باتیں بقدرِ ضرورت ہونی چاہئیں اگر ضرورت سے زیادہ ہوں تو حق سے دوری ہو جاتی ہے ۔ اس لیے دن رات اس فکر میں رہنا چاہیے کہ خودی میں سے کیا چیز باقی رہ گئی ہے یہاں تک کہ اللہ کے فضل سے خودی سے بالکل چھٹکارا ہو جائے ۔ اگر بال برابر بھی خودی باقی رہ گئی ہے تو حجاب باقی ہے ۔ جب تک اس سے فراغت حاصل نہ ہو جائے ، دوسرے کام میں مشغول ہونا صحیح نہیں ، کیونکہ خودی سے چھٹکارا پانے سے پہلے کسی کام میں مشغول ہونا شیطنت ہے ۔ اس لیے کسی حال میں دوسرے کام کی طرف مشغول نہیں ہونا چاہیے ۔ مجاہدہ اور ریاضتِ نفس اس طرح ہونی چاہیے کہ خودی بالکل جاتی رہے اور انتہائی درجہ کا تقویٰ حاصل ہو اور بشریت کی پوری صفائی ہو جائے ۔ کسی وقت بے وضو رہنا مناسب نہیں ، اگرچہ آدھی رات ، جاڑے کا موسم اور ٹھنڈا پانی ہی کیوں نہ ہو ۔ وضو کے بعد دو رکعت نماز کسی حالت میں فوت نہ ہونی چاہیے ۔ کھانا کھانے اور پانی پینے سے صرف تین چیزوں کی بقا ہوتی ہے ، حیات ، عقل اور قوت ۔

کھانا اس وقت تک ترک کرتے رہنا چاہیے جب تک حیات اور عقل میں خلل پیدا ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو ، خشک روٹی ، خشک چاول یا خشک کھچڑی جو کچھ بھی مل جائے ضرورت کے مطابق کھا لیا جائے ۔ نان خورش (جیسے سالن وغیرہ) کی فکر نہ کرے ۔ اسی طرح پانی پینا بھی ترک کر دے ، یہاں تک کہ جب اسے معلوم ہو کہ زندگی یا عقل میں خلل پڑے گا ، اس دن تھوڑا سا پانی جو صرف اس قدر ہو جس سے حلق تر ہو سکے ، پی لے ، تاکہ پیاس بجھ جائے لیکن قوت کے کم ہونے کی وجہ سے ہرگز نہ کھائے پیئے ۔ اور قوت کے زائل ہونے کی طرف ہرگز توجہ نہ کرے ، اور یہ بات تجربہ سے معلوم ہو سکے گی کہ نہ کھانے کی وجہ سے کتنے دنوں میں زندگی اور عقل میں خلل پڑنے کا خوف پیدا ہوگا اور جب یہ تجربہ سے معلوم ہو تو اس بات کا لحاظ رکھے ۔

رات اور دن میں کسی وقت نہ سوئے اور نماز ، قرآن کی تلاوت اور کتاب کے مطالعہ سے نیند کو دُور کرے ۔ اس کام کا تمام تر مدار اس پر ہے کہ رات اور دن میں کسی وقت نہ لیٹے ، بلکہ بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر رات دن گزارے

کسی شخص سے بات چیت نہ کرے ، البتہ سائل کا جواب دے سکتا ہے ، لیکن سائل اگر عالم ہو تو اس کا جواب نہ دے بلکہ کسی علمی جواب میں مشغول نہ ہو کہ اس میں بہت سی آفتیں ہیں ، لیکن اگر جواب علمی نہ ہو تو اس کا جواب بالکل مختصر دے اور صرف ضروری بات کرے اور وہ بھی اس وقت جب بجز بولنے کے اور چارہ نہ ہو ۔ تو جو کچھ ہو سکے گفتگو کرے ، لیکن خود کوئی بات نہ کہے ۔

کسی کے ساتھ بالکل ملاقات اور میل جول نہ کرے اور ایک خالی گوشے میں بیٹھا رہے اور جو چیز موجود ہو

اسے باقی رہنے دے اپنے کام کے لیے اپنے گوشے سے باہر نہ نکلے اور کسی کو اپنے پہلو میں آنے کی اجازت نہ دے ہمیشہ نظر نیچی زمین کی طرف رکھے۔ بے ضرورت دائیں بائیں نہ دیکھے۔ کسی کی بات نہ سنے اور نہ اس کی کوشش کرے کہ دوسرا کیا کہتا ہے۔

دل کو عمداً اور قصداً کسی چیز میں نہ لگائے۔ کوئی بات کان میں پڑے اور سمجھ میں نہ آئے تو اس کی فکر بھی نہ کرے۔ ضرورت کے وقت سوکھی روٹی کھا لے اور پانی پی لے۔ کوئی چیز اس لیے نہ کھائے کہ وہ موجود ہے۔ کیونکہ اس طرح محض خودی کا پابند ہوتا ہے۔ دوپہر کے وقت روزانہ قضائے حاجت کے لیے جائے اور اگر قلت طعام کے باعث اس کی حاجت نہ ہو تو بہتر ہے، لیکن اس سے زیادہ نہ جائے ورد وقت ضائع نہ کرے، اگرچہ اس کی ضرورت محسوس ہو اور وضو مشکوک ہو، یہاں تک کہ اس کی عادت ہو جائے۔ تمام وقت ایک کمبل کے سوا اور کچھ نہ اوڑھے، لیکن جاڑے کے دن لبانچہ (کمینہ، شاید آستین والا لبادہ مراد ہو) خرقہ کے اوپر پہنے اور اس پر دن رات میں کسی چیز کا رشتہ نہ کرے۔ کسی کے آنے جانے یا لٹنے اور کام کرنے پر ناخوش نہ ہو اور نہ کوئی اعتراض کرے۔ یہ معلوم نہ ہونے دے کہ اس کو ظاہراً و باطناً کسی چیز سے انکار ہے خواہ سر پر آگ ہی کیوں نہ برسے، لیکن چون و چرا نہ کرے اور نہ اپنے میں کیفیت و کیفیت ظاہر ہونے دے، یہاں تک کہ اس کو مقام وحدت اور حال و ذوق حاصل ہو جائے۔

سماع کے وقت جہاں تک ممکن ہو آبدیدہ نہ ہو اور جسم کو حرکت نہ دے یہاں تک کہ مغلوب نہ ہو جائے اور اپنی حفاظت آپ نہ کر سکے، لیکن سماع میں احوال کے ظاہر ہونے سے بڑی آفتیں ہیں۔ ان کا چھپانا بہت اہم باتوں سے ہے۔ قلب پر جتنی بھی آگ برسے اس کی خبر نہ ہو اور یہیں وہ مقام عظیم ہے جو بڑی مشقت، بڑے مجاہدے اور بے انتہا ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ تم اپنی طرف سے کوشش کرو خدا عطا کرے گا۔ برسوں کے بعد مشقت اٹھانے والے کو راستہ ملتا ہے اور اگر یہ سعادت حاصل نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کا اجر دیتا ہے۔ ؎

کار نازک تناں رعنا نیست　　　سنگ زیریں آسیا بودن[1]

شجرۂ شیوخ | آپ کا شجرۂ شیوخ یہ ہے:

شرف الدین احمد منیری، خواجہ نجیب الدین فردوسی، خواجہ رکن الدین فردوسی، خواجہ نجم الدین کبریٰ، خواجہ ضیاء الدین ابو نجیب، خواجہ وجیہ الدین ابو حفص، خواجہ محمد بن عبداللہ، خواجہ احمد دینوری، خواجہ ممشاد علو دینوری، خواجہ جنید بغدادی

---

[1] وصیت نامہ حضرت خواجہ نجیب الدین شائع کردہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۲۰ھ، بحوالہ بزم صوفیہ۔

خواجہ سری سقطی، خواجہ معروف کرخی، سیدنا امام علی رضا، سیدنا امام موسیٰ کاظم، سیدنا امام جعفر صادق، سیدنا امام محمد باقر، سیدنا امام زین العابدین، سیدنا امام حسین، سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔

سفر غرض بیعت کے بعد شرف الدین احمد دہلی سے چل دیے، در بہیا (ضلع آرہ) کے جنگل میں پہنچے تو مور کی آواز سن کر دل میں ایسا اضطراب پیدا ہوا کہ گریبان چاک کر کے جنگل میں غائب ہوگئے۔ بڑے بھائی ساتھ تھے، انھوں نے ہر چند تلاش کیا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔

مجاہدے آپ بارہ سال تک اسی جنگل میں رہے پھر راجگیر (ضلع پٹنہ) کے جنگلوں میں پھرتے پھراتے رہے۔ کامل تیس سال تک جنگلوں میں رہ کر ریاضت کرتے رہے۔ کھانا پینا چھوٹ گیا تھا۔ درختوں کے پتے کھا لیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں بعض ہندو جوگیوں کے ساتھ معرکے بھی ہوئے۔

جب آبادی کی طرف آئے تو خلق خدا آپ کی طرف اُمڈ پڑی۔ لوگ جوق در جوق خدمت میں حاضر ہو کر فیض یاب ہونے لگے۔ آپ بہار شریف کی جامع مسجد میں جمعہ پڑھنے کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ بہار شریف ہی میں سکونت رکھیں، چنانچہ وہیں رہنے لگے اور ۶۰ سال تک وہاں رہ کر تشنگان معرفت کو سیراب کرتے رہے۔

رشد و ہدایت سلطان محمد تغلق نے آپ کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کرادی اور اس کے اخراجات کے لیے پرگنہ راجگیر کی جاگیر بھی عطا کردی۔ آپ اس میں بیٹھ کر تقریر و تحریر کے ذریعہ رشد و ہدایت کا کام کرتے رہے۔ آپ کا کچھ مجموعہ ملفوظات اور مکتوبات کی شکل میں محفوظ ہے۔ خانقاہ میں سالکان راہ طریقت کی مجلسیں منعقد ہوا کرتی تھیں علما اور محدثین بھی جمع ہوتے تھے مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی تھی، شرف الدین منیری ہر مسئلہ وضاحت سے بیان فرمایا کرتے تھے، وہ سامعین بڑے اشتیاق سے سُنا کرتے تھے۔ ایک بیان کے مطابق:

> ہر مجلس میں مریدوں۔ نیک بندوں اور سچی طلب رکھنے والے لوگوں کا مجمع ہوتا ان میں سے ہر ایک اپنے حال اور کام کے مطابق ایک سوال کرتا جس کا تعلق طریقت، شریعت، حقیقت اور معرفت سے ہوتا۔ حضرت مخدوم ہر سوال کا شافی جواب دیتے۔ ان کا بیان دلپذیر اور ان کے اشارے کنایے بے نظیر ہوتے تھے۔ ہر بیان میں سینکڑوں معانی، ہر نکتہ میں ہزاروں لطیفے اور ہر معنی میں بے انتہا مفہوم اور ہر لطیفہ میں لاتعداد اور اکات اور ہر مفہوم میں بے شمار حالات اور ہر ادراک میں بہت سے مقامات اور ہر حال میں ناقابل بیان ذوق اور ہر مقام میں اتنی خبریں ہوتیں جن کی گنجائش دنیا میں نہیں۔

آپ کے مریدوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی جو مرید مجلسوں میں حاضر نہ ہو سکتے تھے انھیں مکتوبات کے ذریعہ ہدایت و تلقین کی جاتی تھی۔ عوام اور خواص دونوں آپ کے چشمۂ معرفت سے مستفیض ہوتے تھے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کو بھی آپ پند و نصائح فرمایا کرتے تھے۔ سلطان کے والد داد ملک کو بھی عملی تعلیم دیا کرتے تھے۔ قاضی شمس الدین حاکم چوسہ نے بھی آپ کی

تعلیمات سے بہت استفادہ کیا۔ قاضی صاحب کے نام آپ نے جو مکتوبات لکھے وہ عرفان و تصوف کا دریا ہیں۔ ان موضوعات پر کوئی مسئلہ ایسا نہ ہوگا جس کی وضاحت ان ملفوظات میں نہ ہو۔ علاوہ ازیں، دوسرے امرا یعنی قاضی صدرالدین، ملک مفرح، ملک معزالدین، شمس الملک شمس الدین خوارزمی وغیرہ کے نام آپ نے کئی خطوط لکھے، جن میں انھیں عالمانہ وقار اور سنجیدگی کے ساتھ مختلف معاملات کی نصیحتیں کی گئی تھیں۔ یہ سب مکتوبات آج تک محفوظ ہیں۔

پند و نصائح کے سلسلے میں آپ کے بعض مکتوبات کے ٹکڑے نمونہ کے لیے پیش کیے جاتے ہیں جو قابل غور ہیں۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں خواجہ عابد ظفرآبادی نے آپ سے فریاد کی کہ میرا مال ظلم و تعدی کے باعث تلف کر دیا گیا ہے۔ آپ نے سلطان کی توجہ اس طرف دلائی۔ چنانچہ انھیں بڑے عالمانہ انداز سے ایک خط لکھا:

"حضرت بلال مؤذن سے روایت ہے کہ میں حضرت رسولِ خدا کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر میں بیٹھا تھا کہ ایک شخص آیا۔ رسولِ خدا نے مجھ سے فرمایا باہر جا کر دیکھو کون ہے۔ میں گیا تو ایک نصرانی کھڑا تھا اس نے پوچھا محمد یہاں ہیں؟ میں نے کہا ہاں۔ وہ گھر کے اندر آیا اور کہا یا محمد! تم کہتے ہو کہ میں خدا کا رسول ہوں اور خدا کا بھیجا ہوا ہوں، مجھ کو اور لوگوں کو دینِ اسلام کی دعوت دیتے ہو۔ اگر تم رسولِ برحق ہو تو اس کو دیکھو کہ قوی ضعیف پر ظلم نہ کرے۔ پیغمبرؐ نے پوچھا تم پر کس نے ظلم کیا ہے۔ اس نے کہا ابوجہل نے میرا مال لے لیا ہے۔ یہ وقت آپ کے قیلولہ کا تھا اور بڑی گرمی پڑ رہی تھی، لیکن آپ اسی وقت روانہ ہوئے تاکہ مظلوم کی مدد فرمائیں۔ میں نے (حضرت بلال نے) عرض کیا یا رسول اللہ! قیلولہ کا وقت ہے، گرمی پڑ رہی ہے، ابوجہل بھی قیلولہ کر رہا ہوگا، وہ برہم ہوگا۔ مگر آپ نہ رکے اور اس طرح خشمگیں ابوجہل کے دروازے پر پہنچ کر اس کو کھٹکھٹایا۔ ابوجہل کو غصہ آیا۔ اس نے اپنے بتوں لات و عزیٰ کی قسم کھا کر کہا کہ جس نے دروازہ کھٹکھٹایا ہے اس کو جا کر مار ڈالوں گا۔ باہر آیا تو دیکھا حضرت رسالت مآب کھڑے ہیں۔ بولا کیسے آئے۔ کسی آدمی کو کیوں نہ بھیج دیا؟ پیغمبر علیہ السلام نے غصہ میں فرمایا اس نصرانی کا مال تم نے کیوں لے لیا ہے۔ اس کا مال واپس کر دو۔ ابوجہل نے کہا اگر اسی کے لیے آئے ہو تو کسی آدمی کو کیوں نہ بھیج دیا، مال واپس کر دیتا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا باتیں نہ بناؤ اس کا مال واپس کر دو۔ ابوجہل اس کا تمام مال باہر لایا اور اس کے حوالے کیا۔ نصرانی سے پیغمبرؐ نے فرمایا اب تو تمھارا مال تمھارے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کہا لیکن ایک ادنیٰ تھیلا رہ گیا ہے۔ پیغمبرؐ نے ابوجہل سے فرمایا تھیلا بھی دو۔ ابوجہل نے کہا کہ اے محمد! تم واپس جاؤ میں اس کو پہنچا دوں گا۔ حضرت رسالت مآب نے فرمایا میں اس وقت تک واپس نہ جاؤں گا، جب تک کہ تم تھیلا بھی واپس نہ کر دو گے۔ ابوجہل گھر کے اندر گیا، اس کو وہ تھیلا نہ ملا لیکن اس سے بہتر تھیلا لایا اور بولا وہ تو مجھ کو نہیں ملا مگر اس سے بہتر لایا ہوں اور اسی کو اس کے بدلے میں دیتا ہوں۔ پیغمبرؐ نے فرمایا، اے نصرانی یہ تھیلا بہتر ہے یا وہ بہتر تھا۔ اس نے کہا، اے محمد یہ بہتر ہے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا اگر تم

کتنے کروہ بہتر تھا تو میں اس وقت تک واپس نہ جاتا جب تک بین قیمت دے کر تمھارے حوالے نہ کرتا"۔

ایک دوسری روایت ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا جو کوئی مظلوم کی مدد کرتا ہے، خدا تعالیٰ قیامت کے روز پل صراط کو عبور کرنے میں اس کی مدد کرے گا اور بہشت میں جگہ دے گا اور جو کوئی کسی مظلوم کو دیکھتا ہے اور مظلوم اس سے فریاد کرتا ہے لیکن وہ فریاد نہیں سنتا تو قبر کے اندر سے آگ کے سو کوڑے مارے جائیں گے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا: جو کوئی مظلوم کی مدد کرتا ہے اس کے لیے تہتر مغفرت لکھی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک تو اسے دنیا میں مل جاتی ہے اس سے اس کا کام سدھرتا ہے اور بقیہ بہتر اس کی مغفرت عقبیٰ میں ملتی ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک کارواں شہر سے باہر ٹھہرا۔ عمر بن خطابؓ نے عبدالرحمان بن عوفؓ سے فرمایا۔ کارواں شہر سے باہر ٹھہرا ہے چلو ہم اس کی پاسبانی کریں۔ ایسا نہ ہو کہ کارواں والے سو جائیں اور کوئی ان کا سامان اٹھا لے جائے۔ چنانچہ رات بھر پاسبانی کرتے رہے۔ حق تعالیٰ نے پیغمبر کے دوستوں کو یہ اوصاف عطا فرمائے تھے رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ وہ تمام مسلمانوں پر مہربان تھے اور ان کے لیے غم کھاتے تھے۔

الحمدللہ کہ آپ (سلطان فیروز شاہ) کی ذات معظم و مکرم مظلوموں اور درماندوں کی جائے پناہ ہے اور آپ کی بارگاہ کا عدل و انصاف دنیا میں ظاہر ہو چکا ہے، اور انصاف کو یہ سعادت حاصل ہوئی ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ایک ساعت کا عدل ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

اس خط کے بعد ہی ایک دوسرا خط سلطان کے داماد داؤد ملک کے نام بڑی تواضع اور خاکساری کے ساتھ لکھا جس میں ان اوصاف کی عملی تعلیم بھی دی۔ خط یہ ہے:

"لا الہ الا ہو اشرف منیری جو کہ علماء کے آستانہ کا کتا ہے نہایت خجلت، شرمندگی اور معذرت کے ساتھ آستانہ صدر کی خدمت میں سلام و تحیت کے بعد عرض کرتا ہے کہ اس سیاہ رو کتے کی ہستی کیا ہے جو صدر نے اس کی خدمات کا ذکر اس تواضع کے ساتھ کیا ہے، البتہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے مشک سے کہا جائے کہ تجھ میں ایک برائی ہے۔ پوچھا وہ کیا؟ کہا گیا تو سب کو خوشبو دیتا ہے۔ جواب دیا میں یہ نہیں دیکھتا کہ کون خوشبو پاتا ہے میں دیکھتا ہوں کہ میں کیا ہوں، یہی میرا حال ہے۔ میری کیا حیثیت کہ صدر میرے معتقد ہوں اور مجھ کو ملک المشائخ قطب اللہ لکھیں۔ افسوس ہے کہ اس بدبخت کا کام خاکساری، انکساری، محبت پرستی اور زنانہ داری میں اہل شقاوت و لعنت سے زیادہ نہیں بڑھا، پھر بھی اس بدبخت اور منافق کے متعلق لوگوں کا خیال اچھا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک بزرگ نے ایک شخص کے جنازہ کی نماز پڑھائی نماز کے بعد کسی کی زبان سے سنا کہ وہ شخص

شہر میں نیک نام تھا، بزرگ نے کہا اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو میں اس کے جنازہ کی نماز نہ پڑھاتا۔ لوگوں نے پوچھا کیوں؟ انھوں نے کہا، جب تک کوئی شخص منافق نہیں ہوتا لوگوں میں نیک نام نہیں ہوتا۔ اگر آپ کی تواضع میری شہرت کی وجہ سے ہے تو دنیا میں اس بدبخت سے زیادہ مشہور شیطان ہے۔ اے حدر بزرگوار! اسلام ایسا دین نہیں ہے جو ہر گندے اور ناپاک شخص کو اپنا جمال دکھائے لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (اسے چھو نہیں سکتے مگر پاکیزہ لوگ) یہ آیت ایک دنیا کی قاتل ہے وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ (ان میں سے اکثر لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے، مگر بحالت شرک) اس آیت نے ایک جہان کو توحید سے ہٹادیا ہے۔ دین کا کام اتنا آسان نہیں جتنا لوگوں کو معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ دین پناہ ہیں اور اس کی ہر حقیقت سے واقف ہوگئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ خدایا ہم کو عدم بنادے، جس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ بعض لوگ زنار باندھ کر آتش خانے میں آتے ہیں اور علم و عقل کو ایک طرف رکھ کر کہتے ہیں:

اے علم نمی شنید لب بربستم　　　　اے عقل نمی خرید دیوانہ شد۔

اور جس شخص نے یہ کہا ہے کہ ؎ با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

تو اس کا مطلب یہی ہے، اگر آج کوئی اپنی رسم و عادت کو اسلام کہتا ہے تو یہ بالکل الگ چیز ہے اس کا جواب یہ ہے:

فردا کہ کند خمار کا شب مستی!

اور جب موت کے دروازے پر فکشفنا عنک غطاءک کا پردہ ہوتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ کوئی دستار رکھتا ہے یا زنار، اخلاص یا نفاق، خانقاہ میں تھا یا بت خانہ میں۔ اسی لیے کہا گیا ہے ؎

سوف تری اذا انکشف الغبار　　　　افرس تحت رجلک ام حمار

(جب غبار دور ہوگا تو دیکھو گے کہ تم گھوڑے پر سوار ہو یا گدھے پر)

قاضی شمس الدین حاکم چیہ کو لکھتے ہیں:

" برادرم شمس الدین! خدائے تعالیٰ کی اطاعت میں مستقل مزاج رہو۔ کاتب حروف کے سلام و دعا کے بعد برادر پر ضروری ہے کہ تم اپنے اخلاق کی بری باتوں کو اچھی باتوں میں تبدیل کرنے میں روزانہ ہر ممکن کوشش کرو اور اسے ایک اہم کام سمجھو۔ اس کام کو تم نے چھوڑ دیا یا اس سے غافل ہوگئے تو پھر بلائیں پیش آئیں گی نعوذ باللہ منہا۔ اس دنیا کے جانوروں اور چوپایوں میں جو صفات ہیں ان میں سے ہر ایک صفت انسان میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور اس قسم کی جو صفت انسان میں غالب رہتی ہے وہی قیامت کے دن صورت بن کر ظاہر ہوتی ہے۔

یہ ضروری ہے کہ کپڑا، جسم اور لقمہ پاک اور حلال ہو، تو اس نسبہ کی حقیقت سے پاک ہوں۔ دل بھی اوصاف ذمیمہ یعنی بخل، حسد وغیرہ سے پاک ہو۔ پہلے کی پاکی سے مرید راہِ دین میں دو قدم آگے بڑھ جاتا ہے اور تیسرے (دل) کی پاکی حاصل ہوتی ہے تو مرید تین قدم آگے بڑھ جاتا ہے اور مرید پر توبہ کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ اور وہ حقیقتاً تائب ہوتا ہے۔"

آپ کی زندگی درویشانہ تھی۔ نہایت سادہ غذا کھاتے۔ لباس بھی بالکل سادہ ہوتا۔ لباس کے کچھ تبرکات آج بھی ان کی خانقاہ میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہر وقت روتے رہتے، اور بعض اوقات عجیب وارفتگی کا عالم طاری ہو جاتا۔ اتباعِ سنت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور مریدوں کو بھی سختی سے اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ حقوق العباد ادا کرنے میں بہت کوشاں رہتے اور خدمتِ خلق کو بہت بڑا کام جانتے تھے۔

آپ کا ارشاد ہے "مسلمانوں کا کام انجام دینا اور ان کے کام میں لگے رہنا بڑی دولت ہے۔ یہ کام پیغمبروں کا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے کام کیے، اور ان کی بلائیں اپنے سر لیتے رہے۔"

ایک جگہ لکھتے ہیں: "اس تاریک دنیا میں قلم، زبان، مال اور جاہ سے جہاں تک ہو سکے محتاجوں کو راحت پہنچاؤ۔ صوم وصلوٰۃ ونوافل اپنی جگہ پہ اچھی ضرور ہیں، مگر دلوں کو راحت پہنچانے سے زیادہ سود مند نہیں۔"

بہار شریف میں رہ کر آپ نے یہی کام انجام دیا۔ درس وتدریس، پند وعظمت اور تقریر وتحریر غرض تمام ذرائع سے لوگوں کے اخلاق کو سدھارنے کا کام انجام دیا۔

سماع | آپ سماع کی مجلسیں بھی منعقد کیا کرتے تھے۔ بزمِ صوفیہ کے بیان کے مطابق "مرشد کی نصیحت تھی کہ سماع کے وقت باطنی احوال ظاہر نہ ہوں، اس لیے جب کبھی مجلسِ سماع ہوتی اور اس میں حضرت مخدوم الملک حضرت شرف الدین احمد) کو وجد آتا تو خلوت میں چلے جاتے اور دروازہ بند کر لیتے۔ وہاں کسی کو آنے کی اجازت نہ ہوتی۔

سماع کی حلت وحرمت پر معدن المعانی باب ہفتم (ص ۱۰۴ - ۲۶۱) اور مکتوبات صد (مکتوب نود وسوم ص ۱۷، ۲۶۴) میں مستقل بحثیں ہیں، جن کا ماحاصل یہ ہے کہ اگر سماع سے اللہ تعالیٰ کی محبت کی تحریک ہو اور احوال شریف یعنی مکاشفات اور ملاحظات ظہور پذیر ہوں تو یہ حلال ہے اور اگر اس سے طبیعت فسق وفجور کی طرف مائل ہو تو یہ حرام ہے۔ سماع حلال بھی ہے حرام بھی اور مکروہ بھی ہے اور مباح بھی۔ اگر سماع کے سننے سے دل صرف حق کی طرف مائل ہو تو یہ حلال ہے، اگر مجاز کی طرف مائل ہو تو یہ حرام ہے اور اگر کچھ حق اور کچھ غیر حق کی طرف متوجہ ہو تو یہ مکروہ ہے اور حق ومجاز دونوں کی طرف مائل ہو لیکن حق کی طرف زیادہ رجحان رکھے تو یہ مباح ہے (معدن المعانی ص ۲۶۳ - ۲۶۴)

سماع اہلِ حق کے لیے مستحب، اہلِ زہد کے لیے مباح اور اہلِ نفس کے لیے مکروہ ہے (مکتوبات صدی ص ۲۶۰)

سماع اگر طلبِ منفعت کے لیے ہے تو یہ مذموم ہے اور اگر طلبِ حقیقت کے لیے ہے تو یہ محمود ہے (معدن المعانی ص ۲۷۰)

مجلس سماع کے لیے تین شرطیں ضروری ہیں: مکان، اخوان اور زمان۔ مکان یعنی جہاں مجلس سماع ہوتی ہو وہ مشائخ کی جگہ ہو اور پاکیزہ، کشادہ اور روشن ہو۔ اخوان یعنی مجلس سماع میں جو شریک ہوں وہ درویش یا درویش کے دوست ہوں۔ اہل تمیز صحبت یافتہ اور مرتاض ہوں۔ زمان یعنی سماع کے وقت دل تمام چیزوں سے خالی ہو۔

مجلس سماع کے آداب کی پابندی بھی ضروری ہے۔ مثلاً شرکاء دو زانو بیٹھیں، سر کو آگے جھکائے رکھیں۔ دائیں بائیں نہ دیکھیں، ہاتھ اور سر کو جنبش نہ دیں۔ پیاس معلوم ہو تو پانی نہ پئیں۔ آپس میں گفتگو نہ کریں۔ قوال کی خوش گوئی کی داد نہ دیں۔ اشعار کو بہتر طریقہ پر پڑھنے کی فرمائش نہ کریں۔ دل کو حق سبحانہ کی طرف مائل رکھیں الخ (مکتوبات سہ صدی ص ۲۷۱-۲۷۰)

وفات | آپ نے پنجشنبہ ۶ شوال ۷۸۲ھ کی رات کو وفات پائی۔ اس روز صبح ہی سے یہ عالم تھا کہ مریدوں کو پاس بلاتے اور گلے لگاتے، بعض سے مصافحہ کرتے، دعائیں دیتے، وصیتیں کرتے، بار بار قرآن کریم کی آیات تلاوت فرماتے اور بالآخر دعائیں پڑھتے اور کلمہ ادا کرتے ہوئے جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

تصانیف | کہا جاتا ہے کہ آپ نے بہت سی کتابیں لکھیں مگر صرف حسب ذیل کتابوں کا علم ہو سکا ہے:

مکتوبات: مکتوبات صدی۔ مکتوبات دو صدی۔ مکتوبات بست و ہشت صدی۔

ملفوظات: معدن المعانی۔ مخ المعانی۔ راحت القلوب۔ خوان پر نعمت۔ کنز المعانی۔ مغز المعانی۔ گنج لایفنی۔ مونس المریدین۔ تحفۂ غیبی۔ ملفوظ الصفر اور برأت المحققین۔

تصانیف: فوائد رکنی۔ شرح آداب المریدین۔ عقائد شرفی، ارشاد السالکین۔ ارشاد الطالبین۔ اجوبہ۔ اوراد خورد اوراد اوسط۔ فوائد المریدین۔ اجوبۂ زاہدیہ۔ رسالہ اشارات۔ رسالہ مکیہ۔ اوراد کلاں۔

مکتوبات صدی میں تصوف کے تمام اہم مسائل پر مختصر بحث کی گئی ہے۔ مکتوبات دو صدی میں ۱۵۱ مکتوبات ہیں، ۷۹ء میں ترتیب دیے گئے۔ یہ ان مکتوبات کا مجموعہ ہے جو مختلف مریدوں کے نام لکھے گئے۔

مکتوبات بست و ہشت، یہ خطوط مولانا امام مظفر کے نام ہیں، ان کی تعداد اٹھائیس ہے۔

معدن المعانی۔ یہ ملفوظات مولانا زین بدر نے عربی میں مرتب کیے۔ دو جلدوں میں ہے۔ ان میں صوفیانہ نکات کے علاوہ مذہب، حدیث اور علم کلام پر بھی مباحث ملتے ہیں۔ وعظ و نصیحت، رشد و ہدایت، اوامر و نواہی اور اوصاف حمیدہ کی جگہ جگہ تلقین پائی جاتی ہے۔

خوان پر نعمت۔ اس کتاب میں زیادہ تر فقہی و شرعی مسائل اور تصوف کے متعلق بحثیں ملتی ہیں۔

مخ المعانی۔ یہ رسالہ شیخ شہاب الدین عماد نے مرتب کیا اس میں روزہ۔ توبہ۔ لیلۃ الرغائب، تلاوت قرآن، شب برأت، نماز، تراویح اور کھانے کے آداب وغیرہ کے متعلق مباحث ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں تعبیر خواب، تصفیہ و تزکیۂ نفس، رجوع، فکر اور کئی دیگر معاملات سے بحث کی گئی ہے۔

راحت القلوب۔ یہ دس مجلسوں کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ پندرہ بیس صفحوں سے زیادہ کا نہیں۔ اس میں بیعت، خواجہ اویس قرنی، سجدہ آدم صفی اللہ، تعظیم تلاوت قرآن، نماز جمعہ کی فضیلت، روزہ عاشورہ وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قرآن کریم کی بعض آیتوں کی تفسیریں بھی ہیں۔

فوائد رکنی۔ یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں آپ نے اپنے ایک مرید کو حج کعبہ کے وقت سفر میں مطالعہ کے لیے ہدایات دی تھیں۔

ارشاد الطالبین۔ یہ بھی ایک مختصر رسالہ ہے، جس میں آپ نے طالب حق کو چند ہدایات دی ہیں۔ اسے برہان العارفین عملی کہا گیا ہے۔

ارشاد السالکین۔ چار پانچ صفحوں کے اس رسالے میں آپ نے یہ بتایا ہے کہ کائنات کی تمام اشیاء ایک ہی نور کی مختلف شکلیں ہیں۔ نور عالم لاہوت سے جبروت میں آیا تو روح ہوا اور جبروت سے ملکوت میں گیا تو قالب کہلایا اور ملکوت سے ناسوت میں گیا تو جسم کا نام پایا۔ اسی طرح نور عالم کثیف میں آیا تو نار ہوا۔ نار کثیف ہو کر باد ہوئی اور باد کثیف ہو کر آب ہوئی اور آب کثیف ہو کر خاک بن گیا۔ پس انسان اور عناصر اربعہ ایک ہی شے کی مختلف صورتیں ہیں۔

رسالہ مکیہ و ذکر فردوسیہ۔ اس رسالہ میں اذکار کے اقسام اور طریقے بیان کیے گئے ہیں۔

شرح آداب المریدین۔ یہ کتاب شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی کی مشہور عربی کتاب "آداب المریدین" کی شرح ہے۔

فوائد المریدین۔ اس رسالہ میں مندرجہ ذیل باتیں بتائی گئی ہیں: کلمہ طیبہ کی فضیلت، نماز با جماعت کی برکت، گورستان، منکر نکیر، بہشت، دوزخ، قیامت، ایمان، حقوق ہمسایہ، حقوق الوالدین، حقوق الزوجین اور بعض آیتوں کی برکتیں۔

اجوبہ۔ یہ سوالات و جوابات کا مجموعہ ہے جو زین بدر عربی، محمد بن نشاط اور دوسرے مقربین حضرت سے جو وقتاً فوقتاً سوالات کیا کرتے تھے اور جو جوابات آپ انھیں دیتے تھے، ان کو اس رسالہ میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اس رسالہ میں تصوف کے بہت سے مسائل ملتے ہیں۔

لطائف المعانی۔ یہ رسالہ معدن المعانی کا خلاصہ ہے۔

آپ کی تمام تصانیف میں سب سے زیادہ اہمیت آپ کے مکتوبات کو حاصل ہے جن میں تصوف پر بے شمار مسائل اور ان کے حل ملتے ہیں۔

حضرت سیدؒ اشرف جہانگیر سمنانیؒ

ولادت ——— سمنان (عراق) ۶۸۸ھ

وفات ——— کچھوچھہ ۸۰۸ھ

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی ان اکابر اولیا میں سے ہیں جنھوں نے گاؤں گاؤں اور شہر شہر پھر کر جہالت اور گمراہی کو دور کیا اور خلقِ خدا میں رشد و ہدایت کی تبلیغ کی۔ عوام الناس اور اربابِ ثروت کی اصلاح فرمائی اور انھیں دینی اور دنیوی سرفرازی کے راستے بتائے۔

آپ کا اسم گرامی محمد اشرف اور لقب جہانگیر تھا۔ عراق کے ایک علاقہ سمنان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سمنان کے حاکم تھے۔ سات سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کر لیا۔ سن بلوغ سے قبل معقولات و منقولات کی کتابیں پڑھ لیں اور تمام عراق میں ان کی شہرت پھیل گئی۔

والد بزرگوار کی وفات پر ان کی جگہ سمنان کی حکومت سنبھالی اور بڑے عدل و انصاف کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ حکومت کے دوران بھی ذکر الٰہی سے غافل نہ ہوئے اور بیشتر وقت اوراد و وظائف میں گزرتا۔ راہِ سلوک کی طرف زیادہ مائل تھے۔

کہا جاتا ہے کہ خواب میں آپ کو اشارہ ہوا کہ بادشاہی چھوڑ کر ہندوستان جاؤ اور وہاں رہ کر رشد و ہدایت کا کام کرو، چنانچہ والدہ سے اجازت لے کر سلطنت کا کاروبار اپنے بھائی سلطان محمد کے سپرد کیا اور خود عازم ہندوستان ہوئے۔

ماوراء النہر ہوتے ہوئے بخارا پہنچے، پھر سمرقند آئے پھر اوچ (علاقہ ملتان) میں تشریف لائے، جہاں اس زمانہ میں مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ تشریف فرما تھے، ان سے ملے اور فیضیاب ہو کر دہلی پہنچے۔ وہاں کے مشائخ سے ملاقاتیں کیں اور بہار کے قصبے منیر میں آئے۔ اتفاق سے اس وقت وہاں مشہور بزرگ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کا جنازہ رکھا تھا، آپ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی، پھر کچھ عرصہ تک ان کے مزار اقدس پر مراقبہ فرماتے رہے۔ بعد ازاں بنگالہ کا رخ کیا

اس زمانہ میں بنگالہ میں مشہور چشتی بزرگ شیخ علاؤ الدین علاء الحق تشریف فرما تھے اور ایک دنیا ان کے چشمہ رشد و ہدایت سے سیراب ہو رہی تھی۔ ان کے دوسرے عزیز اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز تھے اگر خود انھوں نے درویشی اختیار کی تھی۔ بہت بڑے عالم تھے۔ بہت سخی تھے۔ ان کی خانقاہ میں ہزاروں لوگ کھانا کھایا کرتے تھے۔ جب حضرت اشرف جہانگیرؒ وہاں گئے تو اس وقت وہ آرام فرما رہے تھے۔ بول اٹھے۔ یار کی بو آرہی ہے، پھر شہر سے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا۔ حضرت اشرف جہانگیرؒ انھیں

دیکھتے ہی ان کے قدموں میں گر پڑے۔ شیخ نے بڑی محبت سے اٹھا کر گلے لگایا اور اپنے ساتھ خانقاہ میں لے آئے۔ بہت عزت و تکریم کی اور بیعت فرمایا۔

شیخ اشرف اپنے مرشد کی خدمت میں بارہ برس رہے، انہیں سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ جہانگیر کا لقب بھی پیرو مرشد ہی نے دیا۔ مرشد سے فیوض و برکات حاصل کرنے کے بعد ان ہی کے حکم سے جونپور کے نواح میں گئے اور قصبہ محمد آباد گہنہ (اعظم گڑھ) پہنچے۔ وہاں کے لوگوں کو علم ہوا تو جوق در جوق زیارت کے لیے آنے لگے۔ وہاں کے علما و مشائخ بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

محمد آباد گہنہ سے آپ ظفر آباد تشریف لے گئے۔ وہاں کے لوگ آپ کی کرامتوں سے بہت متاثر ہوتے اور عقیدت مند ہو گئے۔ شیخ کبیر سرورپوری جو بہت دولت مند اور صاحب علم بزرگ تھے، آپ کے مرید ہو گئے۔ یہی بعد میں آپ کے محبوب خلیفہ بنے۔

ظفر آباد میں تھوڑے ہی دن قیام رہا، پھر جونپور تشریف لے گئے اور ایک مسجد میں قیام فرمایا۔ وہیں اس زمانہ کے جید عالم قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے ملاقات ہوئی، پھر تعلقات گہرے ہوتے چلے گئے۔ قاضی شہاب الدین کا اصل وطن غزنی تھا مگر دولت آباد دکن میں رہے، پھر دہلی آکر وقت کے ممتاز عالموں سے علوم و فنون سیکھے۔ تیمور کے حملہ کے وقت دہلی چھوڑ کر جونپور چلے آئے جہاں کے حاکم ابراہیم شرقی نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور قاضی القضاۃ کا عہدہ تفویض کیا۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، مثلاً ۱۔ شرح قافیہ، جو شرح ہندی کے نام سے بہت مقبول ہوئی ۲۔ ارشاد در نحو، جو نئی طرز پر نحو کی ایک کتاب ہے ۳۔ بدیع البیان، جو علم بلاغت پر ایک رسالہ ہے ۴۔ بحر المواج، جو فارسی زبان میں قرآن پاک کی تفسیر ہے۔ ۵۔ اصول ابراہیم شاہی، اس میں عربی میں اصول شرح پر بحث کی گئی ہے اور ابراہیم شاہ کے نام سے موسوم ہے ۶۔ رسالہ در تقسیم علوم ۷۔ رسالہ در صنائع (فارسی)

اشرف جہانگیر بھی قاضی صاحب کے علم و فضل کے بہت مداح تھے اور اکثر ان سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ قاضی صاحب نے شیخ کی صحبت میں رہ کر بہت کچھ پایا۔ روحانی کمالات حاصل کیے۔ شیخ نے انہیں خرقۂ خلافت عطا کیا اور ملک العلماء کا خطاب بھی دیا۔

سلطان ابراہیم بھی کئی مرتبہ شیخ اشرف جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے امرا بھی ساتھ آیا کرتے تھے۔ لطائف اشرفی میں ان ملاقاتوں کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

> "حضرت قاضی نے عرض کیا کہ آج سلطان شرف ملاقات سے مشرف ہونا چاہتے ہیں، لیکن اس خادم کی خواہش ہوئی کہ آج یہ فقیر خدمت میں حاضر ہوئے تو کل پھر سلطان کے ساتھ قدم بوسی کا شرف حاصل کرے گا۔ حضرت قدس سرہ (یعنی حضرت جہانگیر) نے فرمایا، اس فقیر کے نزدیک تم سلطان سے بہت ہی بہتر ہو۔ اگر سلطان

آتے ہیں آنے دو، وہ حاکم ہیں۔ جب قاضی کو رخصت کیا تو فرمایا کہ ہندوستان میں اتنی فضیلت (جتنی کہ قاضی میں ہے) کم دیکھی گئی ہے۔ دوسرے دن حضرت قدوۃ الکبریٰ اپنے وظائف میں مصروف تھے کہ معلوم ہوا سلطان خواتین اور دوسرے لوگوں کے ساتھ آ رہا ہے۔ جب مسجد کے دروازے پر پہنچا تو حضرت قاضی نے سلطان سے عرض کی کہ اتنے اژدحام کے ساتھ حضرت سید کی ملاقات کے لیے جانا مناسب نہیں، ان کو تکلیف ہوگی۔ آخر سلطان نیچے اتر گیا اور اپنی جماعت سے چند اہل فضیلت و اہل فراست کو منتخب کر کے پابوسی کے لیے حاضر ہوا۔ اس نے حضرت کے دل کو ہاتھ میں لینے کے لیے حد سے زیادہ ادب اور احترام کیا۔ اس نے قلعہ جنادہ کی فتح کے لیے ایک بہت بڑا لشکر بھیجا تھا، اس کے لیے وہ متردد تھا، اس نے سب حال حضرت قدوۃ الکبریٰ کے سامنے یہ اشعار پڑھے!

دلی کان انور ست از جام جمشید — روان روشن تر از خورشید باشد
چہ حاجت عرض کردن بر ضمیرش — کہ نور الیقیں رسیدہ باشد

حضرت قدوۃ الکبریٰ نے فرمایا:

اگر بر یقیں شد ہمت استوار — گرد از دریائم از آتشش برآید

اور جب سلطان رخصت ہونے لگا تو حضرت نے ایک مسند عطا کی جس سے وہ بہت خوش ہوا۔ اور جب قیام گاہ پر پہنچا تو بولا:

"چہ سیادت عالی جناب و مقاصد مآب الحمد للہ کہ در ہندوستان چنیں مردم در آمدہ اند۔"

تین روز کے بعد سلطان تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ حضرت قدوۃ الکبریٰ کی خدمت میں پھر آیا۔ روٹی کا ٹکڑا اور شربت ساتھ لایا۔ لوگوں نے قلعہ کی فتح پر مبارک باد دی، لیکن حضرت نے فرمایا سلطان کو مبارک باد دو کہ بند دروازے کو کھول دے۔ اس مرتبہ سلطان کی عقیدت ہزار گنا زیادہ ہو گئی اور عرض کیا کہ بندہ تو جناب کے ہاتھ پر بیعت ہو چکا بندہ زادے بھی حلقۂ بیعت میں داخل ہو گئے چنانچہ اسی روز تین شہزادے شرف بیعت سے مشرف ہوئے۔ سلطان نے بہت سے نذرانے دینے کی کوشش کی، لیکن حضرت نے قبول نہیں فرمایا۔۔۔!

بھنڈونڈہ نام ایک مقام پر ایک ہندو جوگی سے آپ کا مقابلہ ہو گیا۔ جوگی کو دعویٰ تھا کہ وہ ہوا میں اڑ سکتا ہے لیکن اشرف جہانگیر کی روحانیت سے ایسا متاثر ہوا کہ اپنی تمام مذہبی کتابوں کو جلا دیا اور پانچ ہزار چیلوں سمیت اسلام میں داخل ہو گیا۔ اسلام لانے کے بعد جوگی بابا کمال پنڈت کے نام سے مشہور ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اشرف جہانگیر نے اسی جوگی کی مڑھی میں خانقاہ بنوائی۔

ملک الامرا محمود، اس کی اولاد اور اس کے دوسرے تمام ساتھیوں نے حضرت اشرف جہانگیر سے بیعت کی تھی۔ اسی ذریعہ روح آباد بسایا گیا، جسے آج کل کچھوچھہ شریف کہتے ہیں۔ اسی جگہ ایک خانقاہ بنائی گئی جس کا نام کثرت آباد رکھا گیا۔

مجمو بھی تعمیر کیا گیا، جو وحدت آباد کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی حجرہ کے قریب آپ تشریف فرما ہوتے اور سلوک و معرفت کے رموز بیان کرتے۔ یہ جگہ دارالامان کے نام سے موسوم ہوئی۔

آپ مختلف علاقوں میں گھوم پھر کر لوگوں کو رشد و ہدایت فرمایا کرتے تھے۔ اودھ کے حاکم نواب سیف خاں نے بھی آپ سے فیض حاصل کیا۔ اس نے آپ سے خرقہ خلافت بھی حاصل کیا۔ شمس الدین جو اس وقت کے بہت بڑے عالم مانے جاتے تھے انھوں نے آپ ہی کے فیض سے روحانیت کے درجات طے کیے، وہ بھی آپ کے خلیفہ تھے۔ اشرف جہانگیر کو ان پر بڑا ناز تھا اور ان کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ فرماتے "اشرف شمس و شمس اشرف از ہم جدا نہ اند"۔

ردولی میں شیخ صفی الدین، اور شیخ سماءالدین نے آپ سے فیوض حاصل کیئے ان کی خاطر آپ چالیس دن تک ردولی میں رہے اور انھیں سلوک کی منزلیں طے کرائیں۔ یہ دونوں بزرگ آپ کے بڑے خلفاء میں شمار ہوتے ہیں۔

ردولی کے قریب ایک گاؤں میں مولانا کریم الدین نام ایک بہت بڑے بزرگ رہتے تھے۔ جب اشرف جہانگیر سے ان کی ملاقات ہوئی تو فرمایا۔ "اشرف جہانگیر ایسے شہباز ہیں، جس کے کونین دو بازو ہیں، وہ دریا ہیں جس کا کوئی ساحل نہیں"۔ بموہیں دو ہزار کے قریب آدمی آپ کے مرید ہوئے۔ قصبہ بانس کے بھی دو تین ہزار افراد نے آپ سے بیعت کی۔ اس علاقہ کے ایک بزرگ مولانا غلام الدین بہت بڑے عالم اور فاضل تھے، انھوں نے بھی آپ سے تعلیم پائی اور خلافت حاصل کی۔ غرض اس طرح مختلف قصبوں کے لوگ آپ کے مرید ہوتے گئے اور ان کی تعداد کئی ہزار تک جا پہنچی۔

بنارس گئے تو وہاں پجاریوں سے مذہبی بحث ہوتی رہی۔ آخر آپ کی کرامت سے متاثر ہو کر ایک ہزار کے قریب ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا۔ سلطان ابراہیم شاہ آپ کی تعلیمات سے اتنا متاثر تھا کہ اس نے اپنی سلطنت میں شریعت کی ترویج کے لیے قوانین رائج کیے۔ اس مقصد کے لیے قاضی شہاب الدین نے فتاوی ابراہیم شاہی کے نام سے ایک ضابطہ مرتب کیا۔

آپ بادشاہوں اور حکمرانوں کو بھی سلطنت کے نظم و نسق اور ان کے نظام اوقات کے متعلق ہدایات دیا کرتے تھے اور انھیں بتایا کرتے تھے کہ ان کے مشاغل کیا ہونے چاہئیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"بادشاہ اپنے اوقات کو اس طرح ترتیب دیں کہ صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد اشراق تک وظیفہ پڑھیں پھر علماء و صلحاء کے ساتھ صحبت رکھیں اور چاشت کے وقت تک ان سے عدل و انصاف کے متعلق قرآنی آیتوں کے مطالب پوچھیں۔ اسی جگہ وزیروں اور ندیموں کو بلائیں اور یہ لوگ فوجوں کے جو معروضات پیش کریں ان کا مناسب جواب دیں۔ ہر شخص کے مدعا کو پورا کریں۔ اس کے بعد دربار عام ہو، جس میں رعایا اور مسلمانوں کو قضایا اور دعاوی پیش ہوں اور شریعت کے مطابق انصاف کے ساتھ فیصلہ ہو۔ مشائخ اور سلوک کے معروضات کو حتی الوسع کسی کے توسط سے سنیں۔ سادات، قضاۃ اور مشائخ کی درخواستوں کو صدر پہنچائے۔ اس گروہ کے لیے ایک ایسے شخص کو صدر مقرر کریں جو متدین اور ہمدرد ہو، بلکہ اسے صوفی مشرب بھی ہونا چاہیے

وزیر تمام علوم و فنون سے آراستہ ہونے کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ دیندار ہو۔ وکالت کا منصب ایسے شخص کو دیں جو پسندیدہ اخلاق کا حامل، نہایت عقلمند، سریع الفہم اور حاضر جواب ہو۔ اس قسم کے شخص[1] کو کوئی نہ کوئی مناسب جگہ دیں۔ حکومت کو چلانے میں تخلیط مناصب سے کام نہ لیں۔ ایک کے کام کے متعلق دوسرے سے نہ پوچھیں۔ قیلولہ کے وقت آرام کے لیے چلے جائیں۔ قیلولہ کے بعد نماز پڑھیں اور کبھی نماز نہ چھوڑیں۔ ظہر کی نماز کے بعد جس قدر ہو سکے قرآن کی تلاوت کریں۔ خصوصاً سورہ قد سمع اللہ کی مواظبت کریں، کیونکہ سلاطین اس سورہ کی مواظبت کرتے آئے ہیں۔ سلطان محمود غازی عفا اللہ عنہ برابر اس سورۃ کو پڑھا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ مجھ کو دولت اور شوکت اس سورۃ کی بدولت نصیب ہوئی۔ حضرت ابراہیم شاہ بھی ایسا ہی فرماتے تھے۔ خود میں نے جو سلطنت چھوڑی تو پہلی چیز جو میں نے اپنے برادر عزیز محمد شاہ سے کہی وہ یہ تھی کہ اس سورۃ کی برابر تلاوت کریں اور رجال الغیب کے مقابلے سے اجتناب کریں۔ کوئی کام شریعت کے خلاف انجام نہ دیں اور عدل و انصاف کے اصول میں ایک نقطہ سے بھی انحراف نہ کریں تاکہ سلطنت میں خلل واقع نہ ہو۔[2]

ایک اور موقع پہ فرمایا :

تمام ارکانِ دولت اور اعوانِ مملکت ایک نہ ایک عضو اور ایک نہ ایک حاسہ یا قوت کے مرتبہ میں ہیں، مثلاً مستوفی، مشرب، ناظر، عارض، طغرائی، منشی، دبیر، حاجب، خازن، استاذ امرا اور دوسرے عہدے دار حواس خمسہ و قوائے بشری مثلاً آنکھ، کان، ناک، زبان، لمس، فکر، خیال، وہم، حافظہ، ذاکرہ اور حسِ مشترک کے مانند ہیں۔ امرائے سلطنت، یعنی قوت، شوکت، ہمت، جرأت وغیرہ کے ساتھ اعضائے رئیسہ اور ادنیٰ درجے کے امرا مثل ہاتھ، بازو، ران، پنڈلی اور پاؤں کے ہیں۔ حاشیہ نشین قوم اور عام رعایا وغیرہ اپنے مدارج کے مطابق رگ اور پٹھے وغیرہ ہیں۔ جس طرح ایک انسان اپنے ہر عضو کا محتاج ہے، اور ہر ایک کے بغیر اس کے جسمانی نظام کو نقصان پہنچ جاتا ہے، اسی طرح ایک بادشاہ کو چاہیے کہ ارکانِ دولت و اصحابِ مناصب کو ان کی اہلیت اور استعداد کے مطابق ان کی دیانت اور نیک سیرت کو معلوم اور اچھی طرح پرکھ کر ان کو مختلف حصوں پر مقرر کرے اور اختیار دے تاکہ وہ اپنے کاموں کو پورے شرائط کے ساتھ ملک کے مصالح اور دربار کی بہبودی کے مطابق انجام دیں اور بادشاہ ان کے کاموں سے باخبر رہے۔ (لطائف اشرفی ج ۲)

آپ کی تعلیمات کا آپ کے مرید سلطان ابراہیم شاہ پر بہت اثر تھا، تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ :

---

[1] اس سے مراد ابراہیم شاہ شرقی ہیں۔ [2] لطائف اشرفی جلد دوم۔

"ابراہیم شرقی کے زمانہ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جونپور کا ہر چھوٹا بڑا بادشاہ کے وجود کو باعث برکت سمجھتا تھا، اور بے حد عیش و آرام کی زندگی بسر کرتا تھا۔ شاہ و گدا سب خوش و خرم تھے، اور ملک میں حزن و اندوہ کا نام و نشان نہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ابراہیم شرقی قاضی شہاب الدین کی بے حد تعظیم و توقیر کرتا تھا۔ چنانچہ متبرک ایام میں قاضی صاحب شاہی مجلس میں چاندی کی کرسی پر بیٹھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ قاضی صاحب بیمار ہوئے، ابراہیم ان کی عیادت کو گیا۔ مزاج پرسی اور ضروری باتوں کے دریافت کرنے کے بعد پانی سے بھرا ہوا ایک پیالہ منگوایا۔ مولانا کے سر سے پیالہ کو تصدق کر کے خود پی لیا اور دعا کی اے خدا جو بلا مولانا کے لیے مقرر ہے وہ مجھ پر نازل فرما اور ان کو شفا دے۔" اس روایت سے بادشاہ دین پناہ کا مذہبی خلوص اور علمائے شریعت محمدی کے ساتھ اس کی عقیدت مندی کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔[1]

کچھوچھہ میں کچھ مدت گزارنے کے بعد آپ حج کے لیے تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ کی زیارت کی، نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ گئے۔ پھر روم گئے، جہاں بعض جید علماء اور بزرگوں سے ملاقات کی۔ بعد ازاں دمشق جا کر شیخ فخر الدین عراقیؒ کی زیارت کی پھر مکہ معظمہ آ کر حج کیا۔ حج کے بعد بغداد تشریف لے گئے۔ بزرگانِ دین کے مزارات کی زیارت کی پھر کاشان ہوتے ہوئے اپنے وطن سمنان پہنچے اور اپنی ہمشیرہ سے ملے پھر مشہد آئے اور حضرت امام علی رضا کے آستانہ پر معتکف رہے، ان دنوں امیر تیمور گورگانی بھی آستانہ مبارک پر آیا ہوا تھا۔ وہ اشرف جہانگیرؒ سے بڑی عقیدت کے ساتھ ملا۔ وہاں سے ہرات تشریف لے گئے اور ماوراء النہر پہنچ کر شیخ بہاؤالدین نقشبندی کی صحبت میں رہ کر خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ وہاں سے ترکستان گئے پھر بخارا، قندھار، غزنی اور کابل ہوتے ہوئے وارد ملتان ہوئے۔ ملتان سے اجودھن آئے اور شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے آستانہ عالیہ پر حاضری دی۔ پھر دہلی ہوتے ہوئے اجمیر پہنچے اور خواجہ غریب نوازؒ کے مزار اقدس کی زیارت کی، پھر دکن گئے اور گلبرگہ میں خواجہ سید گیسو درازؒ سے ملے، وہاں سے سراندیپ تشریف لے گئے پھر گجرات ہوتے ہوئے کچھوچھہ واپس اپنی خانقاہ میں پہنچے

کچھ مدت گزارنے کے بعد دوبارہ سیاحت کے لیے نکلے اور دنیا بھر کی سیاحت کر ڈالی۔ بہت سے جزیروں اور جنگلوں میں گھومے اور مختلف علاقوں کے اولیاء اللہ سے مل کر کسب فیض کیا۔ اس سیاحت کے دوران تیسری مرتبہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے ملے۔ اسی سفر میں اپنے پیر و مرشد کے آستانہ پر بھی گئے، پھر کچھوچھہ واپس آئے اور زندگی یہیں بسر کر دی ۲۷۔ محرم ۸۰۸ھ میں وفات پائی۔ وفات سے کچھ روز قبل سکر کی حالت طاری رہی۔ نماز کے وقت عالم صحو میں آ جاتے۔

---

[1] تاریخ فرشتہ ۲۵ ۳۱۳ء اردو ترجمہ جامعہ عثمانیہ ص ۶۸۲

بیماری کے ایام میں بھی رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ سیّد عبدالرزاق الملقب بہ نورالعین کو وفات کے وقت اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر فرمایا اور بزرگانِ چشت کے تمام تبرکات بھی ان کے سپرد کیے۔

حضرت اشرف جہانگیر رح کا مرتبہ علمی لحاظ سے بھی بڑا اونچا تھا۔ معقولات و منقولات کے بھی بہت بڑے عالم تھے صوفیانہ نکات و رموز بیان کرتے وقت معرفت کے دریا بہا دیتے تھے۔ شریعت کے سختی سے پابند تھے۔ آپ کا ارشاد تھا کہ کوئی شخص اس وقت تک ولی کامل نہیں بن سکتا، جب تک وہ ظاہراً، باطناً، قولاً، فعلاً، اعتقاداً اور حالاً شرع کا پابند نہ ہو۔

آپ کی تعلیمات ان تین کتابوں میں پائی جاتی ہیں: ۱۔ بشارت المریدین ۲۔ مکتوبات اشرفی ۳۔ لطائف اشرفی فی بیان طوائف صوفی۔ موخرالذکر کتاب کو حضرت نظام الدین یمنی الملقب بہ نظام حاجی غریب الیمنی نے مرتب کیا۔ وہ حضرت کے مرید تھے اور تیس سال خدمت میں رہے۔

اس کتاب میں حضرت اشرف جہانگیر رح کے سوانح حیات ہیں اور ان کی تعلیمات کی آئینہ دار ہے۔ کہیں تصوف کی اصطلاحات کی پوری تشریح و توضیح ہے تو کہیں ذکر و فکر کی تمام تفصیلات درج ہیں، کہیں صوفیانہ غوامض پر مباحث ہیں تو کہیں صوفیہ کرام کے مختلف خانوادوں کی تاریخ، کہیں رسول اللہ، کہیں آلِ رسول، کہیں خلفائے راشدین اور کہیں ائمہ کبار کے حالات ہیں، کہیں صوفی شاعروں پر دلچسپ تبصرے ہیں، غرض اسے تصوف کا قاموس کہا جا سکتا ہے۔

آپ سلسلہ چشتیہ سے منسلک تھے، اس لیے آپ کی تعلیمات وہی ہیں جو اکابر بزرگانِ چشت کی تھیں۔ بعض مسائل کی تشریح و توضیح بڑے خوبصورت انداز سے کی ہے۔ حضرت خواجہ مودود چشتی رح کی تائید میں فرماتے ہیں کہ علم کے بغیر زاہد شیطان کا مسخرہ ہے۔ فرمایا راہِ سلوک کے لیے توحید، معرفت، ایمان، شریعت اور طریقت وغیرہ سے آگاہ ہونا ضروری ہے علم دین کا ایک ضروری مسئلہ جاننا ہزار رکعت نفل سے بہتر ہے۔ اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ اس کی زندگی کے صرف سات دن باقی ہیں تو اسے علم فقہ حاصل کرنا چاہیے۔"

وحدت الوجود کے مسئلہ پر فلسفیانہ انداز سے بحث کرتے ہوئے فرمایا:

وحدت کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ وحدت مطلقہ من حیث الذات والصفات۔ یعنی صرف ایک ذات اپنی صفات کے ساتھ موجود اور دوسری تمام ذاتیں اپنی ذات و صفات کے ساتھ معدوم ہوں۔

۲۔ وحدت باری۔ اور وہ یہ ہے کہ خدا موجود تھا اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔ صفات کے لحاظ سے وحدت کا مطلب یہ ہے کہ صرف ایک ہی ذات ایسی صفات سے متصف ہو کر کما حقہ دوسرا ان صفات میں شریک نہ ہو سکے۔

وحدت باری قدیم اور تخلیق کی صفت سے متصف ہے۔ وحدت مطلقہ میں غیر کا وجود اصلاً معدوم ہوتا ہے۔ وحدت مفیدہ میں مثل کا وجود معدوم ہو جاتا ہے۔

شریعت میں صفات کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی توحید کا اطلاق و اثبات اس طرح کیا جاتا ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ اس حیثیت سے واحد ہے کہ اس کے علاوہ کوئی پرستش کے لائق نہیں۔

(۲) وہ اس لحاظ سے واحد ہے کہ وہ تمام اشیاء کا خالق اور کائنات کا موجد ہے۔

(۳) وہ اس اعتبار سے واحد ہے کہ کوئی اس کا شبیہ نہیں۔

(۴) وہ اس لیے واحد ہے کہ کوئی اور ذات قدیم نہیں۔

(۵) اس کی ذات ترکیب سے پاک ہے، کیونکہ ترکیب اجسام کے عوارض سے ہے اور باری تعالیٰ کا جسم نہیں۔

وجود کی آپ نے تین منزلیں قرار دی ہیں:

(۱) وجود بشرط شے یا وجود مقید: یعنی ایک چیز کا اس شرط کے ساتھ پایا جانا کہ ایک چیز اور بھی ہو اس میں ہمہ اوست کی گنجایش نہیں۔

(۲) وجود بشرط شے۔ یعنی وجود تو ہے لیکن اس کے ساتھ دوسری شے کا وجود ضروری نہیں۔

(۳) وجود بشرط لاشے۔ یعنی وجود مطلق۔ یہ وجود اس شرط کے ساتھ ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں۔ وجود کی اس منزل میں ہمہ اوست مانا جاتا ہے۔

ولی کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ جاہل نہ ہو، اس کے افعال و حرکات پسندیدہ اور شریعت کے مطابق ہوں۔ وہ شریعت نبویؐ اور اوصاف مصطفویؐ کا تابع ہو۔ لطافتِ زبان، حسنِ اخلاق، شفقت، فیاضی اور بے غرضی سے بہرہ ور اور اوصافِ حمیدہ سے ہم کنار ہو، اور خدا کے علاوہ ہر چیز سے بے نیاز ہو چکا ہو۔ اولیاء اللہ جب تک ظاہراً، باطناً، قولاً، فعلاً اور حالاً حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطیع نہ ہوں، فنافی اللہ و باقی باللہ کے درجے کو نہیں پہنچ سکتے[۱۱]

خلافِ پیمبر کسے راہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

ولی کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کی راہ پر لے چلے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کے شیخ نے اس کو شیوخت کی اجازت مرحمت کی ہو۔ وہ دل میں خدا کا حضور اور آگاہی حاصل کر چکا ہو۔ اپنے مریدوں کے تمام اعمال کا مواخذہ اور ان کے افعال کا محاسبہ کر سکتا ہو۔ مریدوں کے سامنے تقدس کی پوری شان سے ظاہر ہوتا ہو۔

مریدوں کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

مرید کی تعلیم کا آغاز صفائے قلب سے شروع ہوتا ہے، جوں جوں اس کے دل کی تاریکی کم ہوتی جاتی ہے اس کی روح کو نور حاصل ہوتا جاتا ہے، وہ چشم بینا سے دیکھتا ہے تو شروع میں یہ نور سرخ نظر آتا ہے۔ پھر مجاہدہ کی کثرت سے سفید ہو جاتا ہے۔ جب آئینہ دل کا کلیتاً صاف ہو جاتا ہے، نور آفتاب کی طرح نور افشاں ہو جاتا ہے اور اس پر نظر مشکل سے جمتی ہے۔ جب اس نور کا عکس نورِ روح پر پڑتا ہے تو دل و روح کے تمام حجابات ٹوٹ جاتے ہیں۔ پھر ایسے نور کا شہود ہوتا ہے جس میں رنگ، کیفیت

مثل تمکین، تمکن کچھ نہیں ہوتا۔ وہ نور طلوع و غروب۔ تحت و فوق۔ زمان و مکان۔ قرب و بعد اور عرش و فرش کی قیود سے آزاد ہوتا ہے۔

اس وادی میں قدم رکھنے کے لیے ذکر و فکر کی ضرورت ہے اور ذکر و فکر کی پہلی شرط توبہ ہے۔

توبہ کا مقصد ہے، خود کو حسد، نفاق، کذب، بخل، حرص، طمع، غصب، تلبیس، ریا، بہتان اور غیبت وغیرہ سے پاک کرنا اور اس کے بعد شریعت کی روشنی میں صراط مستقیم پر چلنا۔

تسلیم و رضا یہ ہے کہ نعمت ملے تو خوش ہو، مصیبت آئے تو غمگین نہ ہو۔ تاہم اس حال میں کسب روزی کے لیے کوشش ضروری ہے۔ اکثر مشائخ ہمیشہ کوئی پیشہ کرتے تھے اور اسے موجب عزت سمجھتے تھے۔ یہاں (پاکستان و ہند میں) پیشہ کرنا بدترین خصلت سمجھا جاتا رہا یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ محتاجی اور فقیری میں مبتلا ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ اکثر مشائخ کسب معاش کے لیے کوئی نہ کوئی کام ضرور کرتے تھے۔ لہذا پیشے کی توہین کرنا ایک قسم کا کفر ہے۔ لوگوں نے کہا ہے کہ جو لوگ توکل کے آخری درجے تک نہیں پہنچتے ہیں، اگر وہ پیشے میں مشغول رہیں تو ان کے لیے جائز بلکہ لازم ہے۔

اگر سالک ان چیزوں کو قبول کرتا ہے جنھیں شریعت نے حرام قرار دیا ہے تو وہ عاصی اور فاسق ہے۔ توکل یہ ہے کہ کسی چیز کے لیے کسی سے سوال نہ کیا جائے، غیب سے فتوح آئے تو اسے قبول کر لیا جائے اور قبول کرے تو اسے اپنے پاس نہ رکھے سالک کو یقین رکھنا چاہیے کہ بہر حال روزی پہنچا تا ہے۔ لہذا روزی اس کے پاس پہنچے گی، لیکن اس کا دل روزی کے عدم و وجود کو برابر سمجھے

حضرت شاہ نعمت اللہ ولیؒ

وفات ــــــ ــــــ ۸۳۴ھ[1]

آباؤ اجداد تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ سلطان غیاث الدین کے عہد میں دو بزرگ مشہور تھے۔ ایک شیخ سید فرید الدین مسعود گنج شکرؒ دوسرے شیخ سید بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ سید بہاؤ الدین کے دو فرزند تھے۔ سید شیخ صدر الدین اور سید شیخ بدر الدین۔ سید بدر الدین اہل تصوف میں بہت مانے جاتے ہیں۔ آپ مرید اور خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے تھے۔

غزنین میں آپ کا بہت شہرہ تھا اور اکثر لوگ دور دور سے آپ سے فیض حاصل کرنے آتے تھے۔

یہی بزرگ حضرت شاہ صاحب کے اجداد میں سے تھے۔ جب سلطان شہاب الدین نے رائے پتھورا پر فوج کشی کی اور فتح نصیب نہ ہوئی۔ دوبارہ فوج کثیر لے کر آیا لیکن پھر ناکامیاب رہا تو دردولیشان با خدا کی طرف متوجہ ہو کر دعا کا خواستگار ہوا۔

غزنین آیا، میر سید بدر الدین جو بندگی میاں کے نام سے مشہور تھے ان کی قدمبوسی حاصل کی اور عرض کیا۔ دو مرتبہ فوج کشی کی لیکن لشکر اسلام کو فتح نہ ہوئی۔ تمام مسلمان زحمت میں پڑے، نہیں معلوم اس کا کیا سبب ہے؟

آپ نے فرمایا، تمہارے لشکر میں ظلم بہت ہے اور عدل نہیں ہے، اس سبب سے فتح نہیں ہوئی۔ بادشاہ نے نہایت عاجزی سے عرض کیا کہ حضرت اقدس ہماری اعانت اور مدد کریں کہ ہم کو فتح ہو اور حق اسلام کا آپ پر بھی ہے۔ بادشاہ کی التجا سے آپ نے منصب منجھلا آپ کے ہمراہ میر عطا اللہ بھی چلے آئے۔ یہاں آکر میر صاحب بیمار ہو گئے۔

شدت مرض میں راجو خاں کی بی بی کو بلایا اور کہا بہن تم سے ایک وصیت ہے اس کو ضرور پورا کرنا۔ نہیں تو میں قیامت میں دامنگیر ہوں گا۔

اس نیک بخت بی بی نے کہا۔ بھائی جو کچھ آپ فرمائیں گے بسر و چشم بجالاؤں گی۔ فرمایا، اس عالم سے جب میرا انتقال ہو منہ سیاہ کر کے پاؤں میں رسی باندھ کر چورا ہے پر پھنکوا دینا کہ مجھ ایسے سیاہ کار کی یہی سزا ہے، یہ کہہ کر کلمہ شہادت پڑھا اور راہی ملک بقا ہوئے۔

بہن کو بھائی کی وصیت نے کشمکش میں ڈال دیا۔ آخر بمشورہ لاش کے منہ پر سیاہ کپڑا لپیٹ کر اور پاؤں میں ایک جٹ باندھ کر تھوڑا کھینچا اور غسل، کفن دے کر چورا ہے پر دفن کرا دیا۔ اُن کی قبر کے سرہانے ایک چراغ روشن کیا جاتا تھا اور پائینتی غیب سے ایک چراغ روشن ہوتا تھا۔ مزار مرجع خاص و عام ہو گیا۔ دور دور سے لوگ مراد مانگنے آتے تھے۔

---

[1] تاریخ فرشتہ

آپ کی تربیت | اس یتیم بچے کی تربیت اور پرورش اہلیہ راجو خاں نے اپنے ذمہ لی اور اپنے لڑکوں کے ساتھ ان کی تعلیم
شروع کی۔ تیرہ برس کی عمر میں تیراندازی اور شمشیرزنی اور تمام فنون سپہ گری میں طاق ہو گئے۔
ایک روز دوست محمد خاں کے پاس آپ تشریف رکھتے تھے کہ ایک مقدم زمیندار آیا جس کے ذمہ زر مالگزاری باقی
تھا۔ دوست محمد خاں نے تقاضا شدید کیا۔ اُس نے کہا میرے ساتھ کسی آدمی کو کر دیجیے میں روپیہ بیباق کر دوں گا۔ ملازمین
نے اس کے ساتھ جانے سے عذر کیا، اس خیال سے کہ اس زمانے میں زمیندار اپنے گاؤں میں سرکاری ملازمین سے بدسلوکی
کرتے تھے۔
شاہ صاحب نے کہا میرا دل سیر کرنے کو راغب ہے مقدم کے ساتھ سیر کر کے واپس آؤں گا۔ دوست محمد خاں نے
ہر چند اشارۃً منع کیا، لیکن آپ نے نہ مانا اور سوار ہو کر گاؤں چلے گئے۔ جب زمیندار کے مکان پر پہنچے اس سے تاکید کی کہ روپیہ کی
فکر جلدی کرو۔ وہ ان کی دعوت کے سامان میں مصروف ہو گیا اور کھانا لے کر آیا تو آپ نے کہا روپیہ لایا؟ اس نے کہا کھانا حاضر ہے
نوش فرمایئے، روپیہ بھی آ جائے گا۔ آپ نے غصے سے اس پر چند تازیانے مارے کہ پشت زخمی ہو گئی، لیکن اس نے نہایت خندہ پیشانی
سے آپ کے ہاتھ دھلائے اور جب آپ کھانا کھانے بیٹھے تو پنکھا جھلنے لگا۔
اس اخلاق سے آپ نے ایک تصوف کا عمدہ نسخہ اخذ کیا کہ میں نے اس قدر اس پر ظلم کیا اور بے حرمتی کی لیکن یہ اسی طرح
دل و جان سے میری خدمت کر رہا ہے۔ اگر بندہ اپنے معبود سے ایسا ہی ڈرے اور رضائے الٰہی پر شاکر رہے صدیقوں میں شمار ہو۔
اُسی وقت آپ کے دل میں خیال آیا کہ دنیا چند روزہ ہے۔ اس میں اپنے پروردگار سے غافل رہنا خلاف دانشمندی ہے۔
مقدم روپیہ لایا، آپ اس کو ہمراہ لے کر دوست محمد خاں کے پاس آئے اور روپیہ حوالے کیا۔
ترک دنیا | اس وقت سے آپ کے دل میں یہ بات جم گئی کہ دنیا ترک کر کے محبت الٰہی میں بسر کرنا چاہیے لیکن ایسا اصول مقرر
ہو جو ہر کام میں رہبر ہو۔ آخر [illegible] دل میں فیصلہ کر لیا کہ ہمت کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔ جب ہمت دل میں آئی تو اس نے کہا یہ کون سا
طریقہ ہے کہ اپنے اوقات عزیز ضائع اور برباد کرتے رہو۔ اٹھو اور خدا کی جستجو کرو۔ پھر کیا ضرورت باقی تھی۔ خوار اور کنار قضا کا قبول کیا
اور ایسا سخت انتظام کیا کہ کوئی شخص بغیر اجازت سے قدم باہر نہ رکھ سکتا تھا۔ تیسری مرتبہ سلطان کو فتح نصیب ہوئی اور دہلی کو پایہ
دارالسلطنت بنایا۔ قاضی سید بدر الدین نے اپنا قیام ہانسی میں اختیار کیا اور اسی کو اپنا وطن قرار دیا۔ سلطان شہاب الدین کے زمانہ
سے اکبر بادشاہ کے زمانہ تک قاضی صاحب کی کئی پشتیں گزریں۔ سب کا قیام ہانسی میں رہا۔
لیکن حضرت سید مشرف جو شاہ صاحب کے دادا تھے، ہمایوں بادشاہ کے عہد میں انھوں نے منصب قضا سے انکار کر دیا۔
ہمایوں نے ان کے حقوق پر نظر کر کے ان کی جاگیر مقرر کر دی۔ آپ کے تمام قبیلے کی گذر اسی جاگیر پر تھی۔
اکبر بادشاہ ایک مرتبہ صوفیائے کرام کی زیارت کو ہانسی میں آیا۔ سید صاحب کے یہاں بھی آیا۔ ان میں کے ایک بزرگ موجود
تھے جو شرائط تعظیم بادشاہ بجا نہ لائے۔ بادشاہ کے رفقا نے عرض کیا کہ یہ سرکار کے نمک خوار ہیں، ان کو جاگیر معاف ہے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ

ان کی املاک ضبط کرلی جائے۔

یہ خبر میر سید مشرف کو معلوم ہوئی تو فرمانِ ہمایوں لے کر اکبر کے پاس گئے اور بادشاہ کے اس فرمان کو چاک کر ڈالا۔ اکبر نے کہا تم نے اس فرمان کو کیوں چاک کیا۔ اگر اس قدر تم کو کافی نہ تھا اور تمہارے کنبے کے خرچ کے لائق نہ تھا تو ہم کچھ زیادہ کر دیتے۔ سید مشرف نے فرمایا کہ یہ ہمارے لیے کافی تھا، لیکن ہم کو یہ پسند نہیں ہے کہ اس معاوضے میں کوئی ہمارے دروازے پر آئے اور ہم سے تعظیم کا خواہاں ہو۔

بادشاہ نے مبالغہ اور اصرار کیا، لیکن قبول نہ ہوا اور محض توکل کی زندگی اختیار کی۔ بعد وصال بندگی میر سید مشرف کے شاہ صاحب کے والد ہانسی سے نارنول چلے آئے۔

ولادت شاہ صاحب حضرت شاہ صاحب کی ولادت کی صحیح تاریخ کا تو پتہ نہیں ملتا، لیکن جب بندگی میر سید عطاء اللہ نارنول میں تشریف لائے اور راجو خاں ترکمان جو تازہ ولایت نارنول میں وارد ہوئے تھے۔ ان کے عہد میں حضرت شاہ نعمت اللہ ولی پیدا ہوئے تو بندگی میر سید عطاء اللہ صاحب میلادِ فرزند کی خوشی میں کچھ شیرینی لے کر حضرت شاہ نظام الدین نارنول کی خدمت میں بطلبِ دعا حاضر ہوئے۔

شاہ صاحب نے فرمایا کہ "میں شادی اور غمی کی کوئی چیز نہیں کھاتا ہوں، لیکن تمہارے فرزند کے پیدا ہونے کی مجھ کو بہت خوشی منظور ہے" یہ کہہ کر ایک ڈلی اٹھا کر کھالی اور کہا تم دعا کے طالب ہو۔ میں دعا کر دوں گا۔ خدا کے نزدیک تمہارے فرزند کا بہت مرتبہ ہے۔

شاہ صاحب کی ذہانت جب آپ کی دودھ بڑھائی ہو چکی تو سید صاحب نے قرآن کی تعلیم دینا شروع کی۔ چار برس اور چار مہینے کے سن میں آپ نے قرآن ختم کیا۔ آپ کے درس کی بسم اللہ گلستان سے ہوئی۔ ابھی شاہ صاحب سنِ تمیز کو نہ پہنچنے پائے تھے کہ یتیم ہو گئے۔

آپ کے والد صاحب کا انتقال جس کا ذکر اس طرح ہے کہ راجو خاں سے سید عطاء اللہ کی بہت دوستی تھی، ان کی بی بی آپ کو بھائی کہتی تھیں۔ راجو خاں نارنول سے بدر چلے آئے تو آپ کو اور کمان اور چند تیر ترکش میں رکھ کر مسلح ہو کر ایک اشرفی اور پانچ روپیہ لے کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ رات کو دریا پر یادِ خدا میں مشغول رہے۔ صبح کی نماز سے فراغت کر کے چاہتے تھے کہ قدم آگے بڑھائیں کہ ناگاہ ایک ملازم نے ان کو دیکھ لیا۔ قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا کہ آپ گھر چلیے، نہیں تو مجھ کو بھی ہمراہ لیجیے۔ آپ نے کہا، مجھ کو دو روپیہ دو میں گھر چلوں۔ اس نے کہا روپیہ یہاں کہاں، گھر چلیے تو میں دوں۔ آپ نے کہا گھر سے روپیہ لے آؤ۔ وہ تو ادھر روپیہ لینے روانہ ہوا، آپ نے جنگل کا راستہ لیا۔ ایک جگہ دریا پر چند آدمی جمع تھے اور خربوزے والا بیٹھا تھا، آپ نے سب خربوزے خرید کر تمام لوگوں کو کھلا دیے اور بقیہ لوگوں کو بانٹ دیے اور راہ ویرانے کی اختیار کی۔ بہت دنوں کے بعد اطرافِ حیدرآباد میں پہنچے۔ وہاں حضرت شیخ محمد قدس سرہٗ کے مرید ہوئے۔ آپ نے پوچھا، میاں تم علم ظاہری سے

فراغت کر چکے ؟ عرض کیا تکمیل نہیں ہوئی۔ فرمایا ایسے بھی خدا کے بندے ہیں کہ علم ظاہر تحصیل نہیں اور خدا کی طلب میں آتے ہیں۔
تحصیل علم ظاہری آپ نے پیر سے اجازت مانگی کہ مجھ کو حکم ہو تو تحصیل علم ظاہری کروں۔ رخصت ہو کر دولت آباد میں آئے وہاں ایک مشہور حکیم جبرئیل علم و حکمت میں مشہور عالم تھا اس کی خدمت میں گئے اُس نے بہت خاطر کی اور آپ نے شرح ملا جامی شروع کی۔ استاد کے تلطف اور مہربانی سے بہت جلد آپ فلسفہ اور منطق سے فراغت کر کے حکمت پڑھنے لگے۔ حکیم جبرئیل نے کہا کہ اخوند! میں چاہتا ہوں کہ تمام علوم کا ایک لقمہ بنا کر تم کو کھلا دوں' اور ایسا ہی ہوا کہ آپ بہت جلد درس و تدریس سے فراغت کر کے بجائے استاد مطب کرنے لگے۔

حکیم نے دل میں کہا کہ ایسا شریف اور نیک شاگرد ملنا مشکل ہے۔ بہتر ہے کہ اپنی دختر کی شادی اس سے کر دوں۔ لیکن بی بی اور اس کی لڑکی ولایت میں تھیں۔ ان سے کہا کہ اخوند! تم ہمارا ایک کام کر دو' اپنی والدہ کو ولایت سے لے آؤ اور کچھ روپیہ کی ہنڈی ان کو کر دی۔ بموجب ارشاد استاد ولایت میں آئے اور اہلیہ کو لے کر دولت آباد واپس آئے حکیم بہت خوش ہوا۔

صوبہ دار دولت آباد کے وزیر نے انتقال کیا اور وہ اس فکر میں تھا کہ اس کی جگہ کیسے وزیر مقرر کرے۔ حکیم صاحب سے مشورہ لیا۔ آپ نے کہا کہ میرا ایک شاگرد نعمت اللہ ہے' میں کل اس کو حاضر کروں گا۔ وہ لائق منصب وزارت کے ہے اور وعدہ کیا کہ میں کل شاگرد کو لے کر حاضر ہوں گا۔ یہ ذکر شاہ صاحب سے کیا اور کہا اخوند! خدا کا فضل ہے کہ تمہارے واسطے صورت معقول نکل آئی۔ وزارت کے عہدے پر تمہارا تقرر ہو جائے گا۔ شاہ صاحب کا دل دنیا سے سرد ہو چکا تھا۔ وہ ایسی باتوں کی طرف کب توجہ کرنے والے تھے۔ یہ سنتے ہی شباشب وہاں سے کوچ کیا اور چند مدت میں اپنے پیر شیخ محمد قدس سرہٗ کے قدموس ہوئے جب شغل و اشغال اور لوازمۂ سفر سے آگاہ ہوئے' فرمایا کہ تم فیروز پور میں سکونت اختیار کرو۔

پیر کی نصیحت چلتے وقت پیر نے نصیحت کی کہ خدا کے بندوں کو ہدایت کرنا اور یہ نعمت جو تم کو ملی ہے اپنے کو غنی نہ سمجھنا جس بزرگ سے ملاقات ہو کاسۂ گدائی پیش کرنا اور جو کچھ ملے حاصل کرنا اور نفس کو کشتہ کرنا۔ آپ رخصت ہو کر فیروز پور آئے سولہ برس تک رات کو جنگل میں عبادت کی اور جنگل کی بیتوں پر بسر کی۔ ایک روز زبانِ فیض ترجمان سے ارشاد کیا الحمد للہ چند برس تک جنگل میں ننگا پھرا لیکن ایک وقت کی نماز قضا نہ ہوئی۔ پوچھا کہ برہنہ نماز کہاں روا ہے ؟ آپ نے ارشاد کیا کہ وہاں آدمی کا نام نہ تھا۔ ناف تک ریگستان میں دھس جاتا تھا اور پتے کی ٹوپی پہن کر پنجگانہ ادا کرتا تھا اور تیمم کر کے نماز پڑھتا تھا۔ بعد اس کے آبادی دیکھنے کو جی چاہا' کچھ چیتھڑے جمع کر کے ان کو دھویا۔ ایک شخص سے سوئی اور تاگا مانگ کر ایک تہہ بند سی کر ستر پوش ہوا۔ پھر فیروز پور میں کچھ دنوں رہ کر پیر کی خدمت میں قدمبوسی حاصل کر کے اکبر آباد آیا۔ اسی طرح پھرتا پھرتا خاندیس میں پہنچا۔

دو تین جوان لڑکیاں گیت گا کر چکی پیس رہی تھیں' مجھ کو آواز ان کی اچھی معلوم ہوئی' کچھ دیر ٹھہر گیا۔ پھر دل میں خیال آیا کہ دنیا ہے' لوگ کچھ اور خیال نہ کریں' چلنے کا قصد کیا۔ ان میں سے ایک پسنہاری ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی' شاہ صاحب بیٹھیے میں نے کہا

ٹھنڈا پانی پلا دے۔ پانی پی کر دعا دی، خدا تجھ کو اولاد دے۔ وہاں سے پیر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے بہت مہربانی سے کھانا منگوایا۔ عرض کیا مدت سے ترکِ طعام ہے۔ آپ نے کہا جو کیا اچھا کیا، لیکن قبولِ دعوت میں متابعتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ مجبوراً ایک نوالہ کھایا۔ دوسرا نوالہ حضرت نے اصرار سے کھلایا۔ آخر پیر کے حکم سے پانچ نوالے کھا کر شکرِ خدا کیا۔ پیر کی خدمت میں شاہ صاحب ایک مدت تک رہے اور پانچ لقمے روزانہ کھایا کیے۔ آخر پیر سے رخصت ہو کر شیخ شاہ عالم درویش کی خدمت میں گجرات آئے۔ ان کے فرزند سید جلال سے بہت دوستی ہو گئی۔ شاہ عالم نے سید جلال کو ان کی خدمت میں تربیتِ طریقہ سلوک کے واسطے دے دیا۔ اس مدت میں حضرت شاہ عالم کا وصال ہو گیا۔ میر سید جلال الدین کی محبت سے حضرت نے گجرات میں قیام کیا۔ جب جہانگیر بادشاہ گجرات میں آیا، میر سید جلال الدین نے ملازمت شاہی اختیار کی۔ بادشاہ سے مقربین خاص نے اوصاف حضرت شاہ نعمت اللہ کے بیان کیے، بادشاہ نے ملاقات کو طلب کیا۔ آپ نے قبول نہ کیا۔ مجبوراً بادشاہ حضرت شاہ عالم کے مزار پر فاتحہ خوانی کے بہانے سے ان سے ملنے آئے۔ آپ وہاں سے چلے گئے۔ ایک روز بادشاہ نے خان بہادر سے کہا، خان بابا! میری دلی خواہش ہے کہ شاہ نعمت اللہ سے ملوں لیکن یہ امر امکان سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ خان جہاں نے وعدہ کیا کہ میں اس کام کو انجام دوں گا۔ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اثنائے کلام میں بادشاہ کی دینداری اور فقرا کے ساتھ حسنِ عقیدت کا بیان کر کے عرض کیا کہ بادشاہ کو آپ کی زیارت کا بے حد شوق ہے۔ اگر حضرت کو تشریف لے جانے میں تکلیف ہو تو اجازت دیجیے کہ وہ خود حاضر ہو کر مستفیض زیارت ہوں۔ جب یہ اصرار حد سے زیادہ گزر گیا تو آپ نے فرمایا "خان جیو" یہ بتاؤ کہ صحبت میں اثر ہے کہ نہیں۔ خان جہاں نے عرض کیا، بے شک اثر ہے۔ کہا پھر وہ بادشاہ، میں فقیر، اگر اس کی صحبت مجھ پر اثر کرے، میری گدڑی چھین جائے اور اگر میری صحبت کا اثر بادشاہ کو پہنچے تو امورِ سلطنت میں خرابی پھیلے اور رعیت تباہ ہو۔ حضرت خان جہاں خاموش ہو گئے۔ رخصت کے وقت عرض کیا، پھر بادشاہ کو کیا جواب دوں؟ آپ نے کہا تم میری طرف سے وکیل ہو، بادشاہ سے کہو، اس خدمت کی مجھ کو تکلیف نہ دے۔

ایک مرتبہ جہانگیر نے حکم دیا کہ قرآن شریف کا ترجمہ فارسی تحت اللفظ ہو۔ جس قدر حرف قرآن شریف میں ہیں، اتنے ہی حرف ترجمے میں ہوں۔ تمام متوسلانِ دولت نے جو اہلِ علم تھے بہت کوشش کی۔ آخر مجبور ہو کر ڈھائی سیپارہ کا ترجمہ پیش کر کے عرض کیا ایسا ترجمہ ہمارے امکان سے باہر ہے، شاید شاہ صاحب لکھ سکیں تو لکھ سکیں۔ بادشاہ نے کہا شاہ صاحب نے مجھ سے ملاقات تو کی نہیں، ترجمہ قرآن کیا کریں گے۔ لوگوں نے عرض کیا میر سید جلال جو سرکار میں ملازم ہیں، شاہ صاحب کے مرید ہیں۔ شاہ صاحب ان کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ ان کے توسل سے یہ کام انجام پا سکتا ہے۔ بادشاہ نے یہ حکم میر سید جلال کو بھیجا۔ میر صاحب اس حکم سے بہت ملول خاطر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام قصہ عرض کیا۔ آپ نے فرمایا اچھا، تمہارا تعلق بادشاہ سے ملازمت کا ہے، میں ترجمہ کر دوں گا۔ لفظی ترجمہ حرف بہ حرف عبارت آسان ہیں با محاورہ ہو گا، لیکن قرآن میں جہاں جہاں روایتیں طلب قصے ہیں ان کی تشریح کر دوں یا د کر دوں، اس امر کو بادشاہ سے دریافت کر لینا۔

جہانگیر نے جواب میں کہلا بھیجا کہ قصۂ طلب مقامات کی تفسیر کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ترجمہ کے حروف اصل قرآن کے حروف سے زیادہ نہ ہوں۔ حضرت نے ایسا ہی ترجمہ دو مہینے میں کیا اور نام اس کا "ترجمۂ جہانگیری" رکھا۔ ترجمہ ایسا فارسی میں تھا کہ فضلائے وقت نے دیکھ کر گردن جھکالی۔ ترجمہ بادشاہ کے سامنے پیش ہوا تو بادشاہ کو حضرت کی ملاقات کا شوق بڑھ گیا۔

میر سید جلال سے تاکید پر تاکید کی اور آخر غصے میں میر صاحب کی مدد معاش کا معافی نامہ ضبط کر لیا کہ جب تک شاہ صاحب کو راضی کر کے ہمارے پاس نہ لاؤ گے جاگیر ضبط رہے گی۔

میر صاحب مکدر گھر میں آئے اور شاہ صاحب سے تمام قصہ دربار کا بیان کیا۔ فرمایا اچھا اگر تمہاری کارسازی میری ذات پر موقوف ہے تو میں بادشاہ کے حضور میں چلوں گا، تم رنج نہ کرو، دھوپ سے چلے آتے ہو، تھوڑی دیر آرام کرو۔ ایک خدمت گار کو پنکھا جھلنے کا حکم دیا۔ میر صاحب سو گئے تو آپ نے قلمدان اٹھا کر میر صاحب کے نام خط لکھا :

جناب من۔ میں تمہاری ہر مشکل اور مہم کا غوث الثقلین کی طرف سے ذمہ دار ہوں، تمہارے کام مطابق خواہش کے بن جائیں گے، مجھ کو اپنا معین سمجھو، کچھ وسوسہ دل میں نہ لانا، اب ہم رخصت ہوتے ہیں، حشر میں ملاقات ہوگی۔ فقیر نعمت اللہ

رقعہ قلمدان میں رکھ کر آپ صحرا کی طرف کھڑے ہوئے۔ مدت تک سیاحت میں رہے۔ پھر بحکم شیخ فیروز آباد تبلیغ اسلام کرنے لگے۔ میر صاحب کو بہت صدمہ ہوا۔ شاہ صاحب کو بہت ڈھونڈا کہیں پتہ نہ ملا۔ شاہ صاحب کا خط روز ایک مرتبہ پڑھتے تھے اور زار و قطار روتے تھے۔

شاہ صاحب کی کرامتیں! ایک مرتبہ آپ اس گاؤں میں آئے جہاں ایک پنہاری لڑکی نے پانی پلایا تھا اور آپ نے دعا دی تھی۔ دیکھا تو وہاں ایک نفیس عمارت بنی ہوئی ہے اور پنہاری کا چھپر محل سے بدل گیا ہے۔ شاہ صاحب کو پہچان کر ایک عورت نے اس لڑکی سے اطلاع کی وہ خبر سنتے ہی اپنے محل سے نفیس پوشاک پہنے سر و پا برہنہ دوڑی آئی۔ قدموں پر گر پڑی اور منت سے کہا، غریب خانہ پر کرم بخشی کیجیے، میرا شوہر شکار پر گیا ہے وہ بھی حاضر ہو کر قدم بوسی حاصل کرے گا، مدت سے آنکھیں ڈھونڈتی تھیں، ہم کو تو جو کچھ ملا، آپ کی بدولت ملا۔ آپ نے فرمایا، بس بابا تم کو خوش دیکھ لیا، اب فقیر ٹھہر نہیں سکتا۔ ہر چند منت کی قبول نہ فرمایا۔ آخر مجبور ہو کر اس نے کہا تھوڑی دیر یہاں ٹھہریے میں ابھی آتی ہوں۔ یہ کہہ کر گھر میں گئی سو روپے کی تھیلی اور اپنے لڑکے کو گود میں لے کر حاضر ہوئی، لڑکے کو تو قدموں پر ڈال دیا اور روپیہ بطریق نذر پیش کر کے عرض کیا، جو کچھ ہمارے پاس ہے، سب آپ کا دیا ہوا ہے اور آپ کے طفیل ہے، ہم خدمت کو حاضر ہیں۔ آپ قیام نہیں فرماتے تو اس قلیل رقم کو راستے کے خرچ کے لیے قبول فرمائیے۔ آپ نے کہا میں نے تمہارے روپے قبول کیے اور یہ میری طرف سے اپنے لڑکے کو دے دو۔ جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو ایک روپیہ لے کر اسی محلہ کے تکیہ دار فقیر کو دے دیا۔

ایک روز آپ جنگل کو جا رہے تھے، ایک شیر سامنے دکھائی دیا، آپ ٹھہر گئے اور فرمایا، اے یار عزیز اگر مشیت الٰہی سے تو تقدیر حاضر ہے، مطابق حکم کے عمل کر اور اگر ابھی حکم نہیں تو اپنی راہ لے اور مجھ کو راستہ دے۔ شیر ایک طرف کو جست کرتا ہوا

چلاگیا۔

سخت گرمی کے زمانہ میں سروپا برہنہ ایک درخت سایہ دار کے نیچے آپ مراقبے میں مشغول تھے۔ ایک کالا سانپ آپ کے پاؤں پر سر رکھ کے سو رہا۔ آپ نے اس معاملہ کو دیکھا اور پھر مراقبے میں مشغول ہوگئے۔ سانپ کچھ دیر کے بعد کہیں چلا گیا۔

کچھ دنوں فیروزپور میں قیام رہا۔ پھر بعض اور علاقوں سے ہوتے ہوئے بہار میں قیام فرمایا۔ بہار کے گرد میں آئے وہاں سے قریب ٹانڈے میں دو بزرگ تھے۔ ایک شاہ کرم اللہ۔ دوسرے میر سید احمد مالتی پوری۔ شاہ کرم اللہ ظاہری دولت اور عزت بہت کچھ رکھتے تھے۔ سولہ ہاتھی دروازے پر جھولتے رہتے تھے۔ اس مرتبہ پر بھی اگر کوئی اہل غرض غریب عاجز مظلوم آتا اور کہتا میرا کام فلاں حاکم سے بٹا ہے اگر حضرت سفارش کریں تو کام بن جائے۔ آپ فوراً جاتے اور اس کے کام میں کوشش کرتے۔

میر سید احمد محبت الٰہی میں مستغرق تھے، اپنی خانقاہ کے حجرے سے باہر نہیں آتے تھے۔ دولت و درویش کا اپنا مشغلہ رکھتے تھے۔

ایک روز شاہ کرم اللہ نے اپنے دوستوں کے جلسے میں بلند آواز سے کہا آج ہم دونوں صاحب ولایت کا تغیر ہوگیا اور ایک شخص ہماری جگہ پر آتا ہے۔ لوگوں نے پوچھا کب تک آئیں گے۔ آپ نے کہا بہت جلد آنے والے ہیں۔ چند روز کے بعد ایک دن آپ نے کہا کہ صاحب ولایت آج گنگا کے کنارے پہنچ گیا ہے، ہم پیشوائی کو جاتے ہیں۔ لوگ ساتھ ہو لیے۔ جب دریا کے کنارے پہنچے، لوگوں نے پوچھا وہ کون آدمی ہے۔ آپ نے فرمایا، سامنے جو کشتی آ رہی ہے اس پر سوار ہیں۔ جب کشتی نزدیک آئی سب سے پہلے شاہ کرم اللہ نے دست بوسی کی سعادت حاصل کی اور حضرت شاہ صاحب کو اپنی خانقاہ میں نہایت اعزاز سے لائے اور بہت تواضع اور تکریم کی حضرت نے پوچھا میر سید احمد کہاں رہتے ہیں۔ شاہ کرم اللہ نے عرض کیا وہ مالتی پور میں قیام رکھتے ہیں چند دن کے بعد حضرت نے فرمایا ہم میر سید احمد سے ملنے جاتے ہیں۔ جب مالتی پور میں میر سید احمد کے مکان پر پہنچے، میر سید احمد حجرے سے باہر آئے اور دوڑ کر بغل گیر ہوئے، مصافحہ کیا، مبارک باد دی اور حضرت کو دست بدست حجرے میں لے گئے اور اس قدر خاطر کی کہ حضرت بہت دنوں وہاں رہے۔ بعد چند روز کے حضرت نے سیر کا قصد کیا۔ میر سید احمد نے فرمایا کہ میرا وقت قریب ہے میں چاہتا ہوں کہ نماز جنازہ آپ پڑھا کر جائیں۔ آپ نے کہا کیا مضائقہ ہے، فقیر نماز جنازہ کے وقت پہنچ جائے گا۔ یہ کہہ کر آپ شکار کو تشریف لے گئے۔ بعد چند روز کے میر صاحب نے انتقال فرمایا اور وصیت کی میرے جنازہ کی نماز کوئی نہ پڑھائے حضرت صاحب خود آکر پڑھائیں گے۔ جنازہ رکھا ہوا تھا اور قبر تیار تھی کہ حضرت صاحب آگئے۔ نماز جنازہ پڑھا کر دفن کیا۔ اور متعلقین کو دلاسا دیا اور میر صاحب کے فرزند میر سید نظام شاہ کو سجادہ نشین کیا۔

اور آپ میر صاحب کے خویش میر اسماعیل کے یہاں چلے گئے۔ اور بہت زمانہ تک وہاں قیام کیا۔ الہ داد خاں افغانی حضرت کے مرید ہوئے اور خدمت پیری بہت کرتے تھے۔ فیروزپور کے قریب جنگل میں عہد سلف سے ایک تالاب تھا، اس کا پانی جو کوئی پیتا

تھا مرجاتا تھا۔ وہ تالاب شاہ برج سے کوس بھر کے فاصلہ پر ہے۔ ایک روز حضرت نے فرمایا ہم اس تالاب پر جائیں گے۔ اور معتقدین بھی ہمراہ ہو لیے۔ تالاب کے قریب پہنچ کر حضرت نے اللہ داد خاں سے پوچھا تمہارے پاس کچھ ہے۔ آپ نے ایک روپیہ پیش کیا۔ فرمایا اس کے مزدور بلا کر تھوڑی زمین ہمارے قیام کے لیے ہموار کر دو۔

حسب ارشاد مزدور آئے۔ دوپہر کے بعد آپ نے کہا اب سب لوگوں کو بھوک لگی ہو گی اسی روپیہ میں اوگرہ پکا کر کھلاؤ۔ اوگرہ تیار ہوا تو آپ نے سب مزدوروں کو اور حاضرین کو کھلا دیا۔

شام کے قریب ایک دولت مند کشتی میں جا رہا تھا۔ اس نے خبر پائی کہ اس جنگل میں ایک درویش آیا ہے۔ کشتی سے اتر کر حضرت کی قدمبوسی کو آیا اور پانچ روپیہ نذر کیے۔ آپ نے فرمایا ایک روپیہ مزدوروں کو دے دو اور چار روپیہ میں عمدہ کھانا پکا کر سب کو کھلا دو۔ آپ کی برکت سے روز دور دور سے لوگ آتے تھے اور نذریں دیتے تھے، جس قدر آمدنی ہوتی اتنا آپ خرچ رکھتے تھے۔ غیب سے روپیہ چلا آتا تھا۔

اسلام خاں چشتی صوبہ دار جہانگیر نگر نے نیج رائے بھنڈاری کی صلاح سے بیس گاؤں کا وقف آپ کے نام کرنا چاہا۔ آپ نے انکار کیا۔ بہت اصرار سے وقف نامہ اللہ داد خاں کے حوالہ کیا گیا۔ نیج رائے وقف کا افسر اور چودھری بنایا گیا اور یہ وقف ایک پرگنہ بائیس کا تھا۔

بنگالے کے ہفت ہزاری اور پنجہزاری نواب خانخاناں و خان اعظم مہابت خاں آپ کی قدمبوسی میں حاضر رہتے تھے۔ نواب قاسم خاں نواب اعظم خاں نواب سیف خاں بہت معتقد تھے۔

مہابت خاں نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ مجھے قیافہ سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت کی خانقاہ میں ہاتھی جھولیں گے اور آپ کا لشکر و حشم بہت ہوگا۔ وہ لوگ خوش نصیب ہیں جن کی نذر آپ قبول کر لیتے ہیں، مجھ بدنصیب کی آرزو کبھی پوری نہ ہوئی۔

آپ نے فرمایا سید اسماعیل داماد میر سید احمد مالتی پوری کی خانقاہ میں درویش بہت ہیں اور خانقاہ کی کوئی آمدنی نہیں ہے تم کچھ مدد معاش مقرر کر دو۔ مہابت خاں نے ایک پروانہ معافی پرگنہ کا سید اسماعیل کے نام لکھ دیا اور ایک پروانہ جو گیدا اس رجپوت جاگیردار کے نام دخل دہانی کا لکھ دیا۔

مہابت خاں کو بادشاہ نے اپنے پاس بلوایا اور ان کے بیٹے خانہ زاد خاں کو صوبہ دار بنگالہ مقرر کیا۔

مہابت خاں آپ سے رخصت ہونے آئے تو عرض کیا، حضرت کا غلام میری جگہ پر آئے گا۔ امیدوار ہوں کہ اس پر توجہ رہے کہ اپنے ہاتھ پاؤں بچا کر راست روی اختیار کرے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اس کو ایک مہینہ پیشتر سے خطرناک واقعات کی اطلاع کر دوں گا، ماننا نہ ماننا اس کا کام ہے۔

خانہ زاد خاں نے چند روز میں حضور کے فیض صحبت سے اپنی طبیعت کا رنگ بدل دیا اور اچھا خاصا صوفی مشرب ہو گیا۔ یہ سب شاہ صاحب کی صحبت کا اثر تھا۔

لہ ایک کھانے کا نام ہے۔

ﭖ کا اخلاق | حضرت ایک روز خانہ زاد خاں کی بارہ دری میں رونق افروز تھے اور تنہائی میں نفس کشی کی ہدایت فرما رہے تھے کہ
ـــ پردیسی فقیر ڈیوڑھی پر آیا اور خانہ زاد سے ملنے کی آرزو کی (یہ بہت درویش پرست آدمی مشہور تھا) چوبدار نے خانصاحب کو
ﻣﺪﻉ کی، فرمایا، اس کا نام پوچھو۔ درویش ایک مکار آدمی تھا اور سُن چکا تھا کہ حضرت صاحب قبلہ سے خانصاحب کو بہت حسنِ
ٮ ہے۔ لیکن یہ خبر نہ تھی کہ حضرت کی قدموس میں خانصاحب دن رات رہتے ہیں۔ نہ یہ معلوم تھا کہ اس وقت حضرت صاحب رونق
ﺍﻓﺮﻭﺯ ہیں، کہا بابا مجھ کو فقیر سید نعمت اللہ کہتے ہیں۔ فیروز پور میں سائیں کا قیام رہتا ہے۔ چوبدار نے خانصاحب سے یہی الفاظ دہرا دیئے
ں صاحب نقشے میں لال ہو گئے اور چاہا اس مکار کی اچھی طرح مرمت کریں کہ آئندہ کسی کو دھوکا نہ دے، لیکن حضرت نے فرمایا کہ اخلاق
ری سے بعید ہے، خدا جانے بیچارہ کس ضرورت سے آیا ہے اور تمہارے حسنِ ظن کو دریافت کر کے ایسی حرکت کی کہ تم اس سے سلوک
ﻭ۔ غریب اگر اپنا پیٹ پالنے کے واسطے جھوٹ بولتا ہے تو کیا نقصان ہے۔ اس کو بلوا کر کچھ نیک سلوک کرو۔
حضرت کے ارشاد سے فقیر کو بلایا، حضرت تعظیم کو کھڑے ہو گئے اپنے برابر مسند پر بٹھایا۔ نام پوچھا، کہا سید نعمت اللہ شاہ کہتے
ﮨﯿں۔ فیروز پور میں خانقاہ بنوائی ہے، وہیں قیام ہے۔ حضرت نے کچھ اشارہ کیا، خانصاحب نے فوراً دو سو روپیہ منگوا کر شاہ صاحب کی
ﻧﺬﺭ کیا۔ فقیر دعا دے کر رخصت ہوا۔

ﺣﻀﺮت کی پیشین گوئی | خانہ زاد خاں رسوخ اور عقیدت حضرت سے بہت زیادہ رکھتے تھے اور اکثر آپ کی خدمت میں حاضر
ﺭﮨﺘﮯ تھے۔ حضرت بھی بہت مہربانی فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ خانصاحب کی مدح میں ایک قصیدہ فرمایا، جس میں ایک شعر میں ان کی
ﻧﻮﮐﺮی کی اطلاع بھی تھی۔ شعر یہ تھا ؎

من در ہوایت اے گل خنداں چو عندلیب ۔۔۔ اے تو بنو بہار تماشائے دیگراں

خانصاحب نے قصیدہ سُن کر اس شعر پر کان کھڑے کیے اور اسی وقت اپنے متصدیوں کو حکم دیا کہ یہ شعر لکھ لو، ہمارا قیام اب
ﯾﮩﺎں غیر ممکن ہے۔ قریب ہے کہ بادشاہ طلب فرمائے۔ وہی ہوا کہ ایک مہینے کے اندر بادشاہ نے خانہ زاد خاں کو اپنے پاس بلا لیا۔

حضرت میر سیّد جلال الدّین جہانیاں جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ

ولادت ——— اچھ (ریاست بہاولپور) ۷۰۷ھ

وفات ——— 〃 ۷۸۵ھ

آپ سید جلال سُرخ اوچی کے پوتے تھے اور سید احمد کبیر کے بیٹے تھے۔ ولی مادر زاد تھے۔ لڑکپن سے آثار بزرگی کے جلوہ نما تھے۔ کہتے ہیں اُن کی سات برس کی عمر تھی کہ ان کے والدین اُن کو شیخ جمال الدین خنداں رو کے روبرو لے گئے۔ اس وقت ان کے پاس ایک طباق کھجوروں کا بھرا رکھا تھا، فرمایا کہ حاضرین کو تقسیم کرو۔ مخدوم جہانیاں نے اپنا حصہ معہ گٹھلیوں کے کھانا شروع کیا۔ شیخ جمال نے یہ دیکھ کر تبسم فرمایا کہ بیٹا مع گٹھلیوں کے کیوں کھاتے ہو۔ مخدوم نے باوجود خورد سالی کے جواب دیا کہ یہ کھجوریں آپ کے ہاتھ سے نصیب ہوئی ہیں، ان کی گٹھلیاں بھی فیض سے خالی نہیں، اس واسطے نہیں پھینکتا۔ یہ سن کر شیخ جمال بہت خوش ہوئے اور ان کے حق میں دعا کی۔ لکھا ہے کہ مخدوم نے پہلے بیعت سلسلہ سہروردیہ میں اپنے والد سے کی، بعدہٗ اپنے چچا شیخ صدر الدین محمد غوث سے خرقہ تبرک حاصل کیا، اس کے بعد شیخ رکن الدین ملتانی سے خرقہ خلافت پایا۔ بعد اس کے شیخ اسلام شیخ عفیف الدین عبداللہ مطہری سے مکہ معظمہ میں خرقہ خلافت حاصل کیا، اور دو برس ان کی خدمت میں رہ کر عوارف اور دوسری کتابیں سلوک میں پڑھیں۔ شیخ عفیف نے ان کو گازرون میں جانے کا حکم دیا۔ جب یہ گازرون میں پہنچے تو شیخ امین الدین گازرونی نے فرمایا کہ تمہارے دادا نے مجھ سے ملنے کا قصد کیا تھا مگر شیطان نے میرے مرنے کی جھوٹی خبر ان کو دی، اور وہ مکہ معظمہ کو چلے گئے اب تو میرا سجادہ ہے، اور مقراض ان کو دے کر فرمایا کہ یہ حق تیرا ہے۔ پس ان سے خرقہ خلافت حاصل کر کے چند روز ان کی خدمت میں رہ کر مصر اور شام عراق بلخ اور خراسان وغیرہ ممالک کا سفر کرتے ہوئے اور چھ حج کر کے ہندوستان میں آئے اور بیت اللہ شریف میں امام عبداللہ یافعی کی خدمت میں رہے اور بحکم امام دہلی میں آ کر حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی کے مرید ہو کر چندے ان کی خدمت میں رہے اور فیضان چشتیہ حاصل کیا۔ جاننا چاہیے کہ مخدوم جہانیاں چودہ خانوادوں کے خلیفہ ہیں اور تمام اولیائے وقت سے ملے ہیں اور حضرت غوث پاک رضی اللہ عنہ سے نہایت عقیدت تھی۔ سید اشرف جہانگیری تحریر فرماتے ہیں کہ جس قدر خوارق اور کرامت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے صادر ہوئے۔ اولیائے متاخرین میں سے ایک کو بھی حاصل نہیں ہوئے۔ چنانچہ جس روز میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اسی روز اطوار قطبیت و غوثیت سے مشرف ہوا۔ شیخ علاؤالدین چشتیؒ قطب بنگالی نے انتقال کے وقت فرمایا تھا کہ میرے جنازہ کی نماز مخدوم جہانیاں پڑھائیں گے اور کوئی نہ پڑھائے۔ یہ سن کر تمام مرید حیران تھے کہ مخدوم اوچ میں ہیں کیونکر آپ کے جنازہ کی نماز کے وقت حاضر ہوں گے۔ چنانچہ جب ان کا انتقال ہوا تو لوگوں نے مخدوم جہانیاں کو وہاں حاضر دیکھا اور جنازہ کی نماز پڑھائی اور چند روز

ہوکر قطب عالم کو تربیت کیا اور سجادہ پر بٹھایا۔ وہاں پر بہت سے اکابر حضرت کے مرید ہوئے۔

"انوار فاطمیہ" سے نقل ہے کہ ایک روز مخدوم اپنی خانقاہ میں بیٹھے تھے کہ یکایک گھاس کی گٹھڑی میں آگ لگی اور اس میں سے شعلہ اٹھا۔ مخدوم نے ایک چٹکی خاک کی اٹھا کر یا شیخ عبدالقادر محی الدین جیلانی بآواز بلند پڑھ کر اس طرف پھینکی، فوراً آگ بجھ گئی۔

ایک روز خان جہاں مرزا وزیر سلطان فیروز شاہ حضرت کی خدمت میں آیا۔ اس نے ایک منشی کے لڑکے کو قید کیا تھا۔ اس لڑکے نے آپ کی طرف توجہ کی۔ آپ نے نور باطن سے معلوم فرما کر وزیر سے فرمایا کہ اس مظلوم کو چھوڑ دے۔ اس میں تیری خیر ہوگی۔ وزیر نے بموجب حکم عالی رہا کیا۔

"اخبار الاولیاء" سے نقل ہے کہ شب عید کو مخدوم جہانیاںؒ روضہ شیخ الاسلام بہاؤ الدین پر جاکر مستدعی عیدی کے ہوئے۔ مزار سے آواز آئی کہ تیری عیدی یہی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے تجھ کو مخدوم جہانیاں کیا۔ بعد اس کے شیخ صدر الدین عارف کے مزار پر عیدی کی التجا کی۔ وہاں سے بھی جواب باصواب پایا۔ "خزینہ جلالی" میں لکھا ہے کہ ایک بار شیخ ابو الفتح ملتانی زینہ پر سے اترتے تھے۔ مخدوم نے دوڑ کر اپنے کو زینہ پر ڈالا۔ اس لیے کہ قدم پیر کا سینہ پر پڑے۔ یہ دیکھ کر شیخ نے کہا یا سید مرتبہ ولایت تمہارا اپنے مرتبہ کو پہنچ چکا ہے۔ تم مخدوم جہانیاں ہوگئے اور اپنے ہاتھ سے اٹھا کر سینہ سے لگایا۔ اور بہت نعمتیں عطا کیں۔ اس روز سے مخاطب بہ خطاب مخدوم جہانیاں ہوئے۔ چونکہ سیاحت بہت کی تھی اس لیے "جہاں گشت" بھی کہلائے۔ ایک بار مخدوم جامع مسجد اوچ میں مع چند علماء درویشوں کے معتکف تھے، حاکم اوچ حضرت کی زیارت کے لیے آیا۔ حضرت کے گرد ہجوم درویشوں کا دیکھ کر کئی درویشوں کو جھڑک کر مسجد سے باہر نکالا۔ مخدوم نے یہ حال دیکھ کر فرمایا کہ اے بدبخت تو دیوانہ ہوا ہے کہ درویشوں کو تکلیف پہنچاتا ہے، یہ فرماتے ہی حاکم دیوانہ ہوگیا۔ کپڑے پھاڑ کے مسجد سے نکل کر لوگوں کو پتھر مارتا ہوا باہر پھرنے لگا۔ آخر بمشکل اس کو پابہ زنجیر کرکے اس کا بوڑھا باپ حضرت کی خدمت میں آیا اور اس کی معافی چاہی۔ آپ نے از راہ رحم فرمایا کہ اس کو غسل دو اور نئے کپڑے پہناؤ اور زیارت مزار شیخ جمال الدین خندہ رو کرکے میرے پاس لاؤ۔ پس بعد زیارت مزار وہ حضرت کے پاس آتے ہی اچھا ہوگیا اور مرید ہوکر واصلان حق سے ہوا۔

آپ غیر شرعی رسوم سے بہت پرہیز کرتے تھے یہاں تک کہ غیر شرعی تعظیم تک پسند نہ تھی۔ اگر کوئی مرید عزت کی خاطر پاؤں چومنے کی کوشش کرتا تو چومنے نہ دیتے تھے، نہ ہی کسی مرید کو اس بات کی اجازت تھی کہ پاؤں پر سر رکھے۔ ایک مرید نے آپ کی تعریف میں نظم لکھی اور اس میں انھیں "سید السادات" کہا۔ آپ نے فرمایا مجھے سید السادات نہ کہو، بلکہ گدائے عالم کہو۔

کسر نفسی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ خواجہ شرف الدین احمد منیریؒ نے آپ کے پاس کفش بھیجی، جس کا مطلب یہ تھا کہ میں آپ کا کفش بردار ہوں۔ آپ نے اس کے جواب میں اپنی دستار ان کے پاس بھیج دی۔ جس سے مراد یہ تھی کہ تم میرے سر تاج ہو۔

سماع سے بہت پرہیز کرتے تھے، اور فرماتے تھے سماع میں اختلاف ہے۔ لیکن اس شخص کے لیے مباح ہے جو اس کی اہلیت رکھتا ہو۔

غیر مسلم خصوصاً ہندو بہت زیادہ آپ کی خدمت میں آکر اسلام قبول کرتے۔ ایک ہندو عورت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ

آپ ہی سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئی اور ولایت کے درجہ کو پہنچی۔ جب کبھی آپ اوچ سے دہلی جاتے تو راستے میں بہت سے غیر مسلم آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتے۔

آپ کی حرم محترم بھی بڑی عابدہ و زاہدہ تھیں۔ آپ ان کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ تہجد کے لیے مجھ سے پہلے اٹھا کرتی تھی اور جب تہجد کی نماز پڑھ لیتی تو مجھے بیدار کرتی۔ بی بی ایسی ہی ہونی چاہیے۔

فرمایا "ایک مرتبہ وہ عبادت کر رہی تھیں کہ بے ہوشوں کی طرح سجدہ میں گر پڑیں۔ جب ہوش آیا تو سجدہ سے اٹھیں۔ میں نے ان سے کہا جا کر وضو کر لو کیونکہ بے ہوشی سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ کہنے لگیں مجھے بے ہوشی نہ تھی میں نے دل کی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو دیکھا، پھر تعظیم میں کیوں سجدہ نہ کرتی۔ مجازی بادشاہ کے لیے ہزاروں تعظیمیں کی جاتی ہیں، حقیقی بادشاہ کی تعظیم سجدہ سے کیوں نہ کرتی۔

آپ کے بعض لڑکوں کے نام یہ ہیں: سید شمس، سید ماہ، سید ناصر، سید صدر الدین۔

مرآۃ الاسرار کا بیان ہے:

"حضرت سید جلال الدین کی بہت سی اولاد تھی اور ان کے اکثر فرزند ولایت کے درجہ کو پہنچے، ان میں سے ایک شاہ جلال بھی تھے، جو اپنے بھائیوں کے جھگڑوں کی وجہ سے اوچ سے قنوج آ گئے تھے اور اسی شہر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اپنے کشف و کرامات کی وجہ سے بڑی شہرت پائی۔ ان کے صاحبزادے بھی صوری اور معنوی کمالات کے باعث مشہور ہوئے۔ قنوج اور نواح قنوج کے لوگ ان ہی کے سلسلہ ارادت سے منسلک رہے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ حضرت کے بعض فرزند دہلی کے نواح شکار پور میں محوِ خواب ہیں، ان میں شاہ عمر، شاہ محمد اور شاہ کبیر بڑے صاحب کشف و کرامات تھے اور بہت مشہور ہوئے۔ حضرت کے ایک فرزند شاہ قطب عالم گجرات میں مدفون ہیں۔"

جہاں گشت کے پوتے شیخ کبیر الدین بہت بڑے اولیاء اللہ تھے۔

۷۸۵ھ کو بروز چہار شنبہ عید الاضحیٰ کے دن وفات پائی اور اوچ میں مدفون ہوئے۔ یہ مقام ریاست بہاولپور میں ملتان سے ستر میل کے فاصلہ پر جنوب مغرب میں واقع ہے۔

آپ کے ملفوظات کے نام یہ ہیں:

۱ - خزانہ جلالی   ۲ - سراج الہدایہ   ۳ - جامع العلوم

سراج الہدایہ کو احمد برنی نے مرتب کیا۔ اس میں سنہ ۷۸۲ھ کے دس مہینوں کے ملفوظات ہیں، جو مختلف ابواب پر مشتمل ہیں۔

جامع العلوم تمام ملفوظات میں زیادہ دلچسپ اور مختصر ہے۔ اس میں تصوف کے تمام حقائق و معارف درج ہیں اور کثرت کے ساتھ ایسے شرعی، فقہی اور اخلاقی مسائل درج ہیں جن سے روحانی، مذہبی اور اخلاقی اصلاح عمل میں لائی جا سکتی ہے۔

سید اشرف جہانگیر سمنانی حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے ممتاز خلیفہ تھے۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے خلفا یہ تھے :

۱۔ سید صدرالدین راجو قتال، جو حضرت مخدوم جہانیاں کے سگے بھائی تھے۔ ان کا مزار مبارک دہلی میں ہے۔

۲۔ حضرت سید علم الدین، جو سادات ترمذ میں سے تھے۔ اصل وطن قنوج تھا۔ مخدوم جہانیاں کے مرید ہو کر جونپور گئے اور شاہی ملازمت میں رہے۔

۳۔ شیخ سراج الدین۔ آپ حافظ قرآن تھے۔ مخدوم جہانیاں نے کئی برس تک ان کے پیچھے نماز ادا کی۔ ان کا مزار کالپی میں ہے۔

۴۔ سید اشرف الدین مشہدی

۵۔ سید علاؤالدین بن سید حسینی

۶۔ سید محمود شیرازی

۷۔ شیخ بابو تاج الدین بکھروی

۸۔ مولانا عطاء اللہ

حضرت خواجہ بہاؤالدین محمد نقشبندؒ

ولادت ———— قصر عارفاں (بخارا) ۷۱۸ھ

وفات ———— ” ۷۹۱ھ

امام طریقت، قبلہ اولیائے جہاں، خواجہ خواجگاں، برہان الاصفیاء خواجہ بہاؤالدین محمد نقشبند ان عارفان سلوک و معرفت میں سے ہیں جنھوں نے ساری عمر فقر و فاقہ میں گزاری اور عوام الناس کے اذہان و قلوب کو معرفت الٰہی کے انوار سے روشن کیا۔

اصل نام محمد بن محمد البخاری تھا۔ حسینی سید تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

خواجہ بہاؤالدین محمد نقشبند بن امیر سید جلال الدین بن سید برہان الدین بن سید عبداللہ بن امیر سید زین العابدین بن سید امیر قاسم بن سید برہان الدین بن سید محمود بن سید ایلاق بن امیر سید نقیب بن امیر سید خلوتی بن امیر سید محی الدین بن سید محمود بن سید علی اکبر بن امام حسن عسکری صلوٰۃ اللہ علیہ۔

آپ محرم ۷۱۸ھ میں قصر عارفاں میں پیدا ہوئے۔ جو بخارا سے ایک فرسنگ کے فاصلہ پر ایک مقام ہے۔ نقشبند نام سے مشہور ہونے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب خواجہ محمد بابا سماسی نے آپ کو سید امیر کلالؒ کے سپرد کیا تو فرمایا "نقش بہاؤالدین را بربند" اسی وجہ سے آپ کو نقشبند کہا جانے لگا۔ بعض کہتے ہیں کہ جو طالب حق آپ کی خدمت میں جاتا، آپ کی تعلیم اس کے دل پر اس طرح نقش ہو جاتی کہ وہ شخص اپنے مقصد کو پہنچ جاتا۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ اپنے مریدوں کو اسمِ "اللہ" کا نقش لکھ کر دیتے تھے کہ دل صنوبری پر اس کا تصور کریں تاکہ قلوب بیت اللہ کی صفت ہو جائیں۔ نقشبند کہلانے کی یہی وجہ ہے۔ واللہ اعلم۔

طریقت میں آپ کی تربیت حضرت سید امیر کلالؒ سے تھی، مگر حقیقت میں آپ اویسی تھے۔ آپ کی تربیت خواجہ عبدالخالق غجدوانی کی روحانیت سے ہوئی تھی۔ آپ مقتدائے شریعت اور پیشوائے اہل سنت والجماعت تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی ولادت سے قبل خواجہ سماسیؒ نے آپ کی ولادت کی خبر دے دی تھی۔ جب پیدا ہوئے تو خواجہ صاحب نے انھیں اپنی فرزندی میں لے لیا اور حضرت سید امیر کلالؒ کو وصیت فرمائی کہ میرے فرزند بہاؤالدین کے حق میں تربیت و شفقت سے ہرگز گریز نہ کرنا۔ انھوں نے یہ حکم بسر و چشم قبول کیا۔

آپ خود فرماتے ہیں کہ جب میں اٹھارہ برس کا ہوا تو میرے والد کو شادی کا خیال ہوا اور مجھے خواجہ محمد بابا سماسی کی خدمت میں بھیج دیا۔ میں رات بھر آپ کی خدمت میں رہا۔ پچھلی رات کو میں مسجد میں آیا اور دوگانہ ادا کیا۔ سر سجدہ میں رکھ کر بڑی عاجزی سے دعا مانگی کہ اے اللہ! مجھے اپنی مصیبت کا بوجھ اٹھانے کی مزید طاقت عطا فرما۔ صبح ہونے پر جب حضرت بابا کی خدمت میں حاضر ہوا

تو انھوں نے فرمایا' اے بیٹے! دعا کے وقت یہ کہنا چاہیے کہ الٰہی جو تیری رضا ہو اپنے اس ضعیف بندے کو اسی پر قائم رکھ۔
خدا کی مرضی یہی ہے کہ بندے پر کوئی مصیبت نہ آئے، لیکن اگر حکمتاً وہ کوئی مصیبت اپنے بندے پر نازل کرتا ہے تو اسے
اٹھانے کی قوت بھی اُسے عطا کر دیتا ہے۔ اختیار سے بلا نہیں طلب کرنا چاہیے، یہ گستاخی ہے۔

حضرت بابا سماسیؒ کی زندگی میں آپ نے شادی نہ کی۔ بعد ازاں سمرقند گئے اور وہاں کے اولیاء اللہ سے فیض یاب
ہونے کے بعد بخارا تشریف لے گئے۔ وہیں شادی کی اور قصرِ عارفاں میں سکونت اختیار کی۔ اس دوران میں حضرت میر سید کلالؒ
وہاں تشریف لائے اور ان سے آپ نے بیعت کی اور انھیں سے تربیت حاصل کرنے لگے۔

جب تربیت ختم ہو چکی تو میر سید کلالؒ نے آپ سے فرمایا کہ میں نے اپنے پیر و مرشد کے حکم کے مطابق تمھارا کام کر دیا، مگر
تمھاری استعداد بہت اعلیٰ ہے، اس لیے تمھیں اجازت ہے کہ جس سے بھی فیض حاصل کرنا چاہو کرو۔ چنانچہ آپ شیخ قثم اور خلیل آتاؒ
کی خدمت میں گئے اور فیضِ باطن حاصل کیا۔ شیخ قثم فرمایا کرتے تھے کہ بہاؤالدین کے سینے میں طلب کی جو آگ بھڑک رہی ہے شاید
ہی بخارا کی سرزمین میں کسی کے نصیب میں آئی ہو۔ خلیل آتا کی خدمت میں آپ بارہ سال رہے۔ انھیں کے ہمراہ دو دفعہ حجاز کا سفر
بھی کیا۔ خلیل آتا کو کچھ مدت بعد ماوراء النہر کی بادشاہی مل گئی اور وہ سلطان خلیل کے نام سے مشہور ہوئے۔ بہاؤالدین فرماتے
ہیں کہ زمانہ بادشاہت میں بھی آپ کے متعلق بہت سی باتیں دیکھنے میں آئیں، جن سے میں آپ کی طرف اور زیادہ راغب ہو گیا۔
اور سلطانی کے دور میں چھ سال تک ان کی خدمت میں رہا۔ اس دوران میں بھی آپ مجھے آدابِ سلوک سکھاتے رہے، اور
آپ نے جو کچھ مجھے سکھایا میرے بہت کام آیا۔ فرماتے ہیں جب ان کی سلطنت زوال پذیر ہوئی، حکومت درہم برہم ہو گئی، تو یہ
حادثہ دیکھ کر میرے دل سے دنیا کی تمام قدر و قیمت اٹھ گئی اور میں دل برداشتہ ہو کر بخارا آ گیا اور وہاں کے ایک قصبہ ریوتون
میں رہنے لگا۔

فرماتے ہیں ایک دفعہ ابتدائی زندگی میں میری ملاقات ایک مردِ خدا سے ہوئی۔ وہ کہنے لگا تم آشنا معلوم ہوتے ہو۔
میں نے عرض کیا میں اس بات کا امیدوار ہوں کہ خدا کے دوستوں کی نظر کی برکت سے حق آشنا ہو جاؤں۔ اس نے رزق کے
بارے میں پوچھا۔ میں نے جواب دیا، مل جائے تو کھا لیتا ہوں ورنہ صبر و شکر کر لیتا ہوں۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا یہ کام تو بڑا آسان ہے
کام تو یہ ہے کہ نفس کو توبہ کے مقام میں لاؤ تا کہ روٹی نہ ملے تو سرکشی نہ کرے۔ میں نے نصیحت چاہی اس نے کہا جنگل کی طرف چلے
جاؤ اور اہلِ دنیا سے نفس کی خواہش بالکل منقطع کر لو۔ تین دن تک اس زمین پر چلو۔ چوتھے روز ایک پہاڑ کے دامن میں تم گھوڑی
کی ننگی پیٹھ پر ایک سوار کو دیکھو گے، اسے سلام کر کے آگے جانا جب تین قدم آگے بڑھو گے تو وہ پکار کر کہے گا میرے پاس ایک روٹی
ہے لے لو، مگر تم توجہ نہ کرنا۔

بہاؤالدین فرماتے ہیں میں نے ایسا ہی کیا اور یہ ساری باتیں اسی طرح ظہور میں آئیں۔ اس مردِ خدا نے فرمایا کہ لوگوں کی دل
آزاری، کمزوری اور خستہ حالوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ تمھیں ان کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور عاجزی سے پیش آنا چاہیے۔ مثلاً

نصیحت پر سختی سے کاربند رہا۔ پھر فرمایا حیوانات بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ ان پر بھی رحم کرنا چاہیے۔ اگر ان میں سے کسی کے زخم ہو تو اس کا علاج کرنا چاہیے۔ میں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ راستے میں جہاں کہیں مجھے کوئی جانور نظر آتا، جب تک وہ گزر نہ جاتا میں اپنی جگہ پر کھڑا رہتا۔ سات سال میں نے اسی طرح گزارے۔

فرماتے ہیں میں نے ایک گرگٹ کو دیکھا جو آفتاب کی طرف ٹکٹکی جمائے محو نظارۂ جمال تھا۔ یہ دیکھ کر مجھ پر بھی حالت وقت طاری ہو گئی اور دل میں کہا اس بارگاہ میں اس سے سفارش کی خواہش کروں۔ میں نے ادب سے کھڑے ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے گرگٹ نے استغراق چھوڑ کر اپنی پیٹھ زمین پر رکھ دی اور آسمان کی طرف منہ کر دیا، گویا میرے لیے دعا کر رہا ہے۔ میں دیر تک آمین کہتا رہا۔

خواجہ بہاؤالدین فرماتے ہیں، میں جذبات بے خودی میں ہر طرف گھومتا رہتا تھا اور میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ ایک پرانی پوستین پہنے رہتا تھا۔ جاڑے کا موسم آیا اور سرد ہوا چلنے لگی۔ اسی حالت میں ایک شب سید امیر کلالؒ کی خدمت میں پہنچا۔ اور درویش بھی وہاں بیٹھے تھے۔ آپ نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا کون ہے؟ کسی نے بتایا فلاں شخص ہے۔ آپ نے فرمایا اسے یہاں سے نکال دو۔ جب میں وہاں سے نکلا تو نفس نے سرکشی شروع کر دی، لیکن میں نے صبر کیا کہ چونکہ یہ ذلت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اس لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اور دل میں ٹھان لیا کہ کچھ بھی ہو اس درگاہ سے سر نہ اٹھاؤں گا۔ اس وقت برف گر رہی تھی اور ہوا سخت سرد تھی۔ میں نے تمام رات وہیں پڑے گزار دی۔ صبح کے وقت امیر سید کلال آ کر مجھے اپنے مکان پر لے گئے، فرمایا اے فرزند! سعادت کا لباس تیرے ہی قد پر درست ہے۔ پھر اپنے ہاتھ سے میرے پاؤں سے کانٹے نکالے۔ زخم صاف کیے اور بڑی شفقت سے پیش آئے۔

فرماتے ہیں ایک روز میں بخارا سے نسف کی طرف جا رہا تھا تاکہ حضرت سید امیر کلال سے ملاقات کروں کہ ایک شخص سوار سامنے آ گیا۔ اس نے کچھ گفتگو کی مگر میں نے توجہ نہ دی۔ جب میں حضرت کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے فرمایا تو نے خضر علیہ السلام کی طرف توجہ نہ کی۔ میں نے عرض کیا آپ کی خدمت میں حاضر ہونے آ رہا تھا اس لیے ان کی طرف متوجہ نہ ہوا۔

فرماتے ہیں کہ ابتدائے حال میں ایک رات زیورتوں کی مسجد میں ایک ستون کے پاس قبلہ رو بیٹھا تھا کہ فنا کا اثر مجھ پر ظاہر ہونے لگا اور رفتہ رفتہ اثر بڑھا کہ فنائے کامل حاصل ہو گئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ تو نے اپنا مقصود پا لیا۔ پھر کچھ دیر بعد میں اصل حالت پر آ گیا۔

فرماتے ہیں منازل و مقامات طے کرنے میں دو بار حضرت حسین منصور کی صفت میرے وجود میں ظاہر ہوئی قریب تھا کہ وہی آواز میرے منہ سے بھی نکلے جو ان کے منہ سے نکلی تھی۔ بخارا میں ایک سولی تھی میں دونوں بار اس کے قریب گیا اور کہا میرا اسی سولی کا سر ہے، لیکن خدا کے فضل سے میں اس مقام سے گزر گیا۔

جب حضرت سید امیر کلال میری تربیت سے فارغ ہو گئے تو فرمایا اے بیٹے! جب استاد اپنے شاگرد کو تعلیم دیتا ہے

تو اس کی یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ اپنی تعلیم کو اپنے شاگرد کے اندر دیکھے۔ چنانچہ وہ اس کا امتحان لیتا ہے تاکہ اس کی تعلیم پر کلی اعتماد حاصل ہو اور کسی کی صحبت میں اُسے پیدا کرے۔ پس میرا لڑکا امیر برہان حاضر ہے اور کسی نے ابھی تک اس کی تعلیم معنوی نہیں کی تو میرے سامنے اس کی تعلیم معنوی میں متوجہ ہو تاکہ میں اس کا اثر دیکھوں اور مجھے تیری تعلیم دیکھ کر پورا اعتماد ہو۔ آپ اس وقت مراقبے میں بیٹھے تھے اس لیے ادب کی غایت رعایت کے باعث اس امر کی امتثال میں [illegible] گیا۔ حضرت سیدؒ نے فرمایا کہ تجھے اس بارے میں توقف نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ آپ نے حضرت سیدؒ کے ارشاد کی تعمیل میں برہان الدین کی تربیت کی طرف توجہ فرمائی اور اسی وقت سکرِ حقیقی اور حال بزرگ ان میں پیدا ہو گیا۔

آپ ذکر علانیہ سے احتراز کرتے اور ذکر خفی فرمایا کرتے تھے، بلکہ جب حضرت امیرؒ کے مرید ذکر جہر شروع کرتے تو آپ اُٹھ کے چلے جاتے۔ اگرچہ یہ بات آپ کے دوسرے پیر بھائیوں کو ناگوار گزرتی، مگر آپ اس کی کچھ پروا نہ کرتے۔ تربیت اور مریدوں کی مجلس ورود کرنے کی طرف توجہ دیتے ساتھ ہی حضرت امیرؒ کی خدمت اور ان کے احکام کی تعمیل میں بھی کبھی فروگزاشت نہ کرتے۔ حضرت امیرؒ کی توجہ بھی آپ کی طرف روز بروز زیادہ ہوتی گئی۔

آپ کے بعض ارشادات اخبار الصالحین سے ملخصاً پیش کیے جاتے ہیں:

آپ فرماتے ہیں کہ ہمیں فضل کے دروازے سے اندر لائے اور ہمارا طریقہ فرض، واجب اور سنت مؤکدہ کا ادا کرنا ہے جو ہمارے اصحاب میں سے ہے اسے ہماری پیروی کرنی چاہیے۔ ورنہ ہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ فرمایا بے اختیار ہو جاؤ، اور عمل اس طرح کرو کہ اس کی رضا حاصل ہو۔ درویش کے لیے خدمتِ مشائخ نفل سے افضل ہے۔ جب کوئی ملاقاتی آپ سے ملنے آتا تو پہلے اس کی خدمت کرتے پھر اس کے جانور کی خدمت کرتے۔ فرماتے آنے والے کا احسان ہماری گردن پر ہے۔ جب کبھی اپنے کسی درویش کے گھر جاتے تو اس کے لڑکوں بالوں اور ملازموں ہر ایک کی خیریت پوچھتے، جانوروں تک کا حال دریافت کرتے۔

فرماتے ہیں جسے یار کا وصل نصیب ہوا ادب کے باعث نصیب ہوا اور جو محروم رہا، ترکِ ادب کی وجہ سے محروم رہا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے: ہمارے طریقہ میں ریاضت نہیں ہے۔ مباحات میں آپ مخالفِ نفس کے لیے ارشاد فرمایا کرتے جو شخص مخالفت نفس کی توفیق رکھتا، اس کے تھوڑے کام کو بہت خیال کیا جاتا۔ اس راہ کے چلنے والے بہت ایسے ہوئے ہیں جنھوں نے دوسروں کے گناہ کا بوجھ خود برداشت کیا ہے اور ظاہر و باطن میں اپنے آپ کو اس دوست پر سے فدا کیا ہے۔

آپ کا قول ہے کہ اللہ جل شانہٗ کے کلام يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ میں یہ اشارہ ہے کہ اس طبعی وجود کی نفی کرو اور معبودِ حقیقی کا اثبات کرو۔ اگرچہ نماز، روزہ، ریاضت و مجاہدہ سب اللہ کی درگاہ کے راستے ہیں مگر زیادہ قریب راہ نفی وجود ہے ؎

وجودك ذنب لا يقاس بها ذنب

یہ بات صرف اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے، جب آدمی ترک اختیار کرے اور اپنے اعمال میں قصور دیکھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ماسوا اللہ کے باقی تمام تعلقات قطع کر دے اور جس شے کی طرف دل مائل ہو اس سے اجتناب کرے۔ جب تک سالک راہ علامات وجود، نظر آئے تو یہ عنایت حق ان سے نفی لازم ہے اس لیے کہ جب تک وہ اموال، صفات، حرکات، سکنات خطرات و تعلقات قلبی قالبی وسری سے قطع تعلق کر کے خدائے جل شانہٗ کی طرف مشغول نہ ہوگا اس وقت تک بندہ کا اطلاق اس پر نہ ہوگا اور اخلاص کی سعادت سے مشرف نہ ہو سکے گا۔

بخارا کے ایک عالم نے آپ سے پوچھا کہ نماز میں حضوری کس شے سے حاصل ہو سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ حلال روزی سے جو از راہ وقوف کھائی جائے۔ فرماتے ہیں اَلصَّوْمُ لِیْ سے حقیقی روزہ کی طرف اشارہ ہے، جس سے قطع تعلق ماسوائے اللہ مراد ہے۔

فرماتے ہیں ولایت ایک نعمت ہے، ولی کو اپنی ولایت کا جاننا لازم ہے تاکہ وہ اس نعمت کا شکر ادا کر سکے۔ ولی عنایت الٰہی کی مدد سے محفوظ ہوتا ہے۔ تمام آفات سے اسے بچاتے ہیں۔ خوارقِ عادات اور احوال و کرامات قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ کام کی بات اقوال و افعال پر قائم رہنا ہے۔ اس راہ کے چلنے والے کو اللہ جل شانہٗ کے احکام کی تعمیل سے ولایت خاصہ عنایت ہوتی ہے۔ اس گروہ کی تین قسمیں ہیں، مقلد، کامل اور کامل مکمل۔ مقلد سنے ہوئے پر عمل کرتا ہے اور کامل اپنی ذات سے تجاوز نہیں کرتا اور نہ کر سکتا ہے۔ نیز فرماتے ہیں کہ ارادہ تسلیم و عدم اختیار بڑی صفتیں ہیں اور ان کا پیدا کرنا بڑا کام ہے۔ ارادہ سے مراد ترک ارادہ ہے۔ مرید کو چاہیے کہ مقتداء کی مرضی پر اپنی مرضی کو بالکل چھوڑ دے، یہ تسلیم ہے۔

فرماتے ہیں مرشد بمنزلہ طبیب حاذق کے ہے۔ ضرورت کے مطابق مرید کا علاج کرتا ہے۔ مرید کو اپنے علاج میں اختیار سمِ قاتل ہے۔ فرمایا ہمارا طریقہ سنتِ رسولؐ کی پیروی اور صحابہ کرام کے آثار کا اقتدار کرنا ہے، اس راہ میں فضل کے دروازے سے ہمیں اندر لائے۔ اول سے لے کر آخر تک یہی خدا کا فضل ہم نے مشاہدہ کیا ہے۔

آپ فرماتے ہیں ذکر کی تلقین کامل و مکمل پیر سے ہونی چاہیے، تاکہ اس کا اثر ظاہر ہوئے اور نتیجہ ظاہر ہو۔ ذکر کا مقصد یہ ہے کہ ذکر کلمہ توحید کی حقیقت کو پہنچ پائے۔ اس کا بہت کہنا شرط نہیں۔ کلمہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے تکرار سے ماسوا کی کلیۃً نفی ہو جائے۔ آپ فرماتے ہیں تین اسباب کی بنا پر عارف لوگ خدا کی راہ پاتے ہیں تین یہ ہیں: مراقبہ، مشاہدہ اور محاسبہ۔ مراقبہ کی تعریف ہے نسیان رؤیۃ المخلوق بدوام النظر الی الخالق۔ یعنی خالق پر اس طرح ہمیشہ نظر جمی رہے کہ مخلوق پر نظر پڑنے ہی نہیں۔ مشاہدہ سے مراد ہے واردات غیبیہ کا دل پر نازل ہونا۔ چونکہ گزرنے والے زمانے کی طرح اسے بھی قیام نہیں۔ اس لیے ہم ان کا ادراک نہیں کرتے۔ ہاں مگر قبض و بسط کی صورت میں ہو تو دریافت کر سکتے ہیں اس لیے کہ حالت قبض میں ہم جلالی صفت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور حالت بسط میں جمالی صفت کا۔ محاسبہ یہ ہے کہ ہر پل کا ہم حساب کرتے رہیں کہ حضوری میں گزرا یا غیر حضوری میں۔ اگر غیر حضوری میں دیکھیں کہ زمان بڑی نقصان ہے تو ہمیں بازگشت کرنی چاہیے اور از سر نو عمل شروع کرنا چاہیے۔ عمل

کرنے میں یہ خیال نہ ہو کہ ہم نے کوئی عمل کیا بلکہ اپنے آپ کو ہمیشہ حقیر اور پر از تقصیر سمجھنا چاہیے۔

آپ فرماتے ہیں کہ عبادت میں وجود کی طلب ہے اور عبودیت میں وجود کا تلف کرنا ہے۔ جب تک خودی باقی ہے کسی عمل کا نتیجہ ظاہر نہیں ہوتا۔

فرماتے ہیں جو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس کا غیر سے التجا کرنا شرک میں داخل ہے۔ یہ شرک عام لوگوں کے لیے قابل مواخذہ نہیں مگر خواص کے لیے قابل مواخذہ ہے۔ فرماتے ہیں متوکل کو چاہیے کہ اپنے آپ کو متوکل خیال نہ کرے اور اپنے توکل کو کسب میں چھپائے رکھے۔ فرماتے ہیں ہم نے تو اس راہ میں اپنے لیے خواری کو پسند کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہمیں عزت عطا فرمائی۔ فرماتے ہیں عادت محبت ہو جایا کرتی ہے۔ سالک کے لیے نفلوں کے ترک کی الفت کبھی کبھی جائز ہے تاکہ اسے عادت سے انس نہ ہو جائے۔ فرماتے ہیں باہر سے بے رنگ اور اندر سے بے جنگ ہونا درویشی ہے۔

فرماتے ہیں اوّل اوّل ہم نے اپنے آپ کو مطلوب بنایا اور دوسروں کو طالب لیکن اب ہم نے یہ طریقہ چھوڑ دیا ہے۔ اصل مرشد وہی اللہ ہے اور جسے اس راہ کی طلب ہوتی ہے، اسے وہی ہمارے پاس بھیج دیتا ہے جو اس کا حصہ ہوا سے مل جاتا ہے۔ فرماتے ہیں المجاز قنطرۃ (مجاز حقیقت کا پل ہے) سے مراد ہے کہ تمام عبادتیں خواہ ظاہر ہوں خواہ باطنی اور خواہ قولی اور خواہ فعلی، سب مجاز ہیں۔ جب تک سالک ان سے گزر نہ جائے وہ حقیقت کو نہیں پہنچ سکتا۔

ایک شخص نے آپ سے پوچھا سیر و سلوک کا کیا مقصود ہے؟ فرمایا تفصیلی معرفت۔ اس نے پوچھا وہ کیا ہوتی ہے۔ فرمایا جو اد کچھ مخبر صادق سے بطور اجمال قبول کیا گیا ہے، اسے مفصل پہنچایا جائے اور دلیل و برہان کے مرتبے سے کشف و عیاں کے مرتبے کو پہنچ جاتے۔ کسی نے پوچھا بلا اور بلوی میں کیا فرق ہے۔ فرمایا بلا ظاہری ہوتی ہے اور بلوی باطنی۔

پوچھا گیا اگر اللہ تعالیٰ کسی فقیر سے حال چھین لے تو اسے کیا کرنا چاہیے۔ فرمایا اگر اس کا حال ذرہ بھر بھی اس میں باقی ہے تو اسے یہ سمجھنا چاہیے کہ فقیر سے تضرع اور نیاز مطلوب ہے اور اگر بالکل جاتا رہا ہے تو اس سے صبر و رضا مطلوب ہے۔ وظیفہ محبت کے لیے یہ لازم ہے کہ محب محبوب کو تلاش کرتا رہے۔ محبوب جتنا زیادہ عزیز ہوگا اتنی ہی اس کی طلب کی راہ میں مصائب زیادہ ہوں گے۔ فرماتے ہیں اس راہ کے طلب کا کمال یہ ہے کہ طالب بےقرار و بے آرام رہے۔

کسی نے پوچھا اَلْفَقِیْرُ مُحْتَاجٌ اِلَی اللّٰہِ سے کیا مراد ہے؟ فرمایا اس سے سوال کی ضرورت کی نفی مراد ہے۔ حَسْبِیْ من سوالی علمہ بحالی۔ کسی نے پوچھا اذا تم الفقر فھو اللہ سے کیا مراد ہے۔ فرمایا اس سے مراد بندے کی ہستی اور فنا اور اللہ کی صفات میں مٹ جاتا ہے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جب طالب کی روحانیت کا پرندہ کسی صاحب دولت کی تربیت کے وسیلے سے بیضۂ بشریت سے باہر نکل آتا ہے تو پھر اس کی پرواز حق تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ فرماتے ہیں مغز کی حفاظت چھلکے سے ہوتی ہے اگر چھلکے میں کوئی خلل ہو تو مغز پر بھی اثر پڑتا ہے شریعت چھلکا ہے اور طریقت مغز۔ اگر شریعت میں خلل ہوگا تو طریقت پر ضرور اس کا اثر پڑیگا۔

آپکے پاس اکثر بڑے بڑے علماء آکر بیٹھا کرتے تھے۔ بخارا میں مولانا حسام الدین اصیلی اور مولانا حمید الدین شاشی دو بڑے عالم تھے اور یہ دونوں حضرت خواجہ صاحب کے پاس آیا کرتے تھے۔ آپ نے امیر تیمور کے زمانہ میں ۳ ربیع الاول ۷۹۱ھ میں ۷۳ سال عمر پائی اور قصر عارفاں میں دفن ہوئے۔

حضرت سید محمد گیسو دراز رح

ولادت ——— دہلی ۷۲۱ھ

وفات ——— گلبرگہ ۸۲۵ھ

صوفیہ کرام میں حضرت سید محمد گیسو دراز بہت بلند مرتبت بزرگ گزرے ہیں۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی جیسے عظیم الشان بزرگ بھی ان کی خدمت میں رہکر روحانی فیض حاصل کرتے رہے۔ آپ کی تصانیف و تالیفات منبع فیوض و برکات ہیں۔

نام و نسب اور خاندان | آپ کا اصل نام سید محمد اور کنیت ابوالفتح تھی۔ عام طور پر خواجہ بندہ نواز اور خواجہ گیسو دراز[1] کے نام سے مشہور ہوئے۔ شجرہ نسب یہ ہے: محمد بن یوسف بن علی بن محمد بن یوسف بن حسن بن محمد بن علی بن حمزہ بن داؤد بن زید بن ابوالحسن جنیدی ابن حسین بن ابی عبداللہ بن محمد بن عمر بن یحییٰ ابن حسین بن زید المظلوم بن علی اصغر بن زین العابدین بن امام حسین علیہ السلام۔

آپ کے مورث اعلیٰ ہرات سے دہلی تشریف لائے۔ آپ کے والد بزرگوار سید یوسف حسینی سید راجا کے نام سے مشہور تھے۔ انھیں خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے عقیدت تھی۔ نانا بھی خواجہ صاحب کے مرید تھے۔ سید گیسو دراز ۷۲۱ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی حالات | آپ کے والد سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں دہلی سے دیوگیر چلے گئے۔ اس وقت گیسو درازؒ کی عمر تین چار سال کی تھی۔ وہاں شیخ بابو نام ایک بزرگ تھے۔ گیسو دراز کے والد بزرگوار ان کی صحبت میں رہا کرتے تھے۔ گیسو دراز بھی ان کے ساتھ ہوا کرتے، چنانچہ اس دینی صحبت نے ان پر اپنا رنگ جمایا اور بچپن ہی میں گیسو دراز کو دینی شغف ہو گیا۔ نماز پابندی

---

[1] گیسو دراز نام کی وجہ یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ اپنے پیر و مرشد شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی پالکی دوسرے مریدوں کے ساتھ اٹھائے چلے جا رہے تھے، چونکہ بال لمبے تھے وہ پالکی کے پایہ میں پھنس گئے۔ آپ کو بہت تکلیف ہوتی رہی مگر مرشد کے ادب سے خاموش رہے۔ اسی طرح میں پالکی دور تک اٹھانے چلے گئے اور بال کو پایہ سے نہ نکال سکے۔ جب پیر و مرشد کو اس واقعے کا علم ہوا تو اپنے مرید کی اس محبت اور عقیدت سے متاثر ہو کر یہ شعر پڑھا ؎

ہر کہ مرید سید گیسو دراز شد ! واللہ خلاف نیست کہ او عشق باز شد

چنانچہ اس کے بعد گیسو دراز نام سے مشہور ہو گئے۔

سے ادا کرنے لگے۔

دس سال کے ہوئے تو والد بزرگوار کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ دولت آباد میں انھوں نے وفات پائی اور وہیں سپردِ خاک کیے گئے۔ ان کا مزار آج بھی وہاں مرجعِ خلائق ہے۔

والد کی وفات کے بعد نانا نے آپ کی تربیت فرمائی اور مختلف اساتذہ سے تعلیم دلائی۔ ان ایام میں انھیں خواجگانِ چشت سے عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔ چراغ دہلویؒ کے خاص طور پر مشتاق تھے۔ پندرہ برس کے تھے، جب ان کی والدہ دولت آباد چھوڑ کر دوبارہ دہلی چلی آئیں۔ آپ بھی والدہ کے ہمراہ وہاں آ گئے۔

دہلی میں جمعہ کی نماز سلطان قطب الدین کی جامع مسجد میں ادا کیا کرتے تھے۔ وہیں حضرت چراغ دہلویؒ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ چنانچہ ۱۶ رجب ۷۳۶ھ میں ان سے بیعت کر لی۔ چراغ دہلوی ان کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے اور یہ بھی ان کا بہت احترام کرتے تھے اور ان کے حکم کے مطابق برابر عبادت و ریاضت میں لگے رہتے تھے۔ اپنے ملفوظات میں لکھتے ہیں:

__زہد و ریاضت__ | ایک بار اشراق کے بعد پابوسی کے لیے حاضر ہوا (خواجہ صاحب نے) فرمایا صبح کی نماز کے لیے جو وضو کرتے ہو کیا وہ آفتاب نکلنے کے بعد تک باقی رہتا ہے۔ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ آپ کے صدقہ میں باقی رہتا ہے، فرمایا اچھا ہو جو اسی وضو سے دوگانہ اشراق بھی پڑھ لیا کرو۔ میں نے کھڑے ہو کر عرض کیا، آپ کے صدقہ میں پڑھوں گا۔ پھر فرمایا اسی کے ساتھ شکر النہار اور استخارہ بھی پڑھ لیا کرو۔ جب چند روز اس کی پابندی کر چکا تو ایک دن فرمایا دوگانہ اشراق پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا بلاناغہ پڑھتا ہوں۔ فرمایا اگر اس میں چاشت کی بھی چار رکعت ملا دیا کرو تو یہ نماز بھی ادا ہو جایا کرے گی۔ میں نہیں کہتا کہ اور کسی وقت پڑھو، بلکہ بعد اشراق اسی وقت چاشت پڑھ لیا کرو تو چاشت بھی ہو جایا کرے گی۔

میں ہمیشہ رجب میں روزے رکھا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ دریافت فرمایا کیا تم رجب میں روزے رکھا کرتے ہو۔ میں نے عرض کیا، ہاں۔ پھر پوچھا شعبان میں بھی؟ میں نے عرض کیا شعبان میں نو روزے رکھتا ہوں۔ فرمایا اگر اکیس دن اور رکھ لیا کرو تو پورے ایک مہینہ کے روزے ہو جایا کریں گے۔ میں نے عرض کیا آپ کے صدقہ میں رکھوں گا۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا وہ اس وقت تک حضرت شیخ سے بیعت نہ ہوئی تھیں مجھ پر برہم ہوئیں، کچھ سخت سست بھی کہا۔ میں نے عرض کیا آپ جو چاہیں کہیں، لیکن شیخ نے جو کچھ فرمایا ہے اس پر عمل کرنے سے باز نہیں آؤں گا۔

میں رمضان کے بعد شش عید کے چھ روزے بھی رکھا کرتا تھا۔ انھیں ایام میں ایک دن حضرت شیخ کی قدم بوسی کے لیے گیا آپ نے فرمایا ہمارے خواجگان صوم داؤدی نہیں رکھا کرتے تھے، بلکہ صوم دوام رکھتے تھے تم بھی صوم دوام رکھا کرو۔"

مدت تک ذکر و فکر میں مشغول رہے، پھر گھر بار چھوڑ دیا اور خطیرہ شیر خان جہاں پناہ کے ایک حجرہ میں گوشہ نشینی کرنے لگے دس برس تک یہاں ریاضت میں لگے رہے۔ پھر مرشد کی خدمت میں گئے۔ مرشد سے عرض کیا کہ اجازت ہو تو علوم ظاہری کی تعلیم اب چھوڑ دوں اور علم باطن کی تعلیم حاصل کروں۔ اجازت ملنے پر علم باطن کی تحصیل میں لگ گئے۔ پھر ریاضت شاقہ و مجاہدہ پنجگانہ

پانزدہ گانہ ادا فرماتے رہے اور طی کے روزے رکھتے تھے۔ پیر و مرشد اپنے مرید کی ان خوبیوں کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے اور ان پر فخر کرتے تھے۔ ایک بار چراغ دہلویؒ خود ان کے پاس تشریف لے گئے اور کچھ روپے نذرانہ کے طور پر دیے۔ اس واقعہ سے گیسو دراز کی بہت شہرت ہوگئی اور لوگ انھیں کامل بزرگوں میں شمار کرنے لگے۔ ریاضت و مجاہدہ کا حال یہ تھا کہ آبادی چھوڑ کر جنگلوں میں چلا جایا کرتے تھے اور وہیں عبادت کیا کرتے تھے۔

معمولات | کچھ مدت اسی طرح گزری پھر پیر و مرشد کے پاس چلے آئے۔ پیر و مرشد کو علی الصباح اٹھ کر وضو کرانا آپ کا معمول تھا پھر خود بھی وضو کر کے ان کے ساتھ نماز با جماعت ادا کرتے۔ اور جب تک پیر و مرشد نماز اور اوراد و وظائف میں مصروف رہتے آپ طالبانِ حق کو سلوک کی تعلیم دیتے۔ جب چراغ دہلویؒ کی مجلس منعقد ہوتی تو آپ بھی اس میں شریک ہوتے فراغت پانے پر کسی کونے میں بیٹھ کر ذکر و فکر میں لگ جاتے۔ چاشت کی نماز کے بعد تھوڑی دیر کے لیے آرام کرتے۔ بیدار ہونے پر کلام پاک کی تلاوت فرماتے۔ ظہر کی نماز کے وقت پہلے خود وضو کرتے پھر مرشد کو وضو کراتے۔ نماز سے فارغ ہونے پر حجرہ میں تشریف لے جاتے اور وظائف میں مشغول ہو جاتے۔ سہ پہر کو مرشد کی مجلس دوبارہ منعقد ہوتی جس میں آپ بھی شرکت کرتے پھر مرشد کے ساتھ ہی عصر کی نماز ادا کرتے اور نماز مغرب تک تسبیح فرماتے۔ مغرب کی نماز اور اوابین کے بعد عشا تک طالبانِ حق کو سلوک کی تعلیم دیتے پھر عشا کی نماز سے فارغ ہو کر آرام فرماتے اور نصف شب کو بیدار ہو کر تہجد ادا کرتے۔

سینتیس سال کی عمر میں بیمار ہو گئے۔ خون تھوکنے لگے۔ ہچکیاں بھی آتی تھیں۔ مرشد نے ان کے علاج کی طرف خاص توجہ فرمائی اور شفایاب ہو گئے۔ مرشد نے اپنا کمبل انھیں مرحمت فرمایا۔ شفایابی کے بعد مرشد سے ان کی جو ملاقات ہوئی اس کا حال سیر محمدی[1] کے مصنف نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "اپنا کمبل اپنے سامنے سے اٹھا کر حضرت مخدوم کو عطا فرمایا اور حضرت مخدوم کے ہاتھ مضبوط پکڑ کر ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی کسی کے لیے محنت مشقت کرتا ہے تو کسی چیز کے لیے کرتا ہے۔ پھر فرمایا کہ سید محمد میری طرف سے اس چیز کو قبول کرو یعنی لوگوں سے بیعت لیا کرو۔ حضرت مخدوم نے سر نیچا کر لیا اور خاموش رہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم نے قبول کر لیا؟ حضرت مخدوم نے عرض کیا میں نے قبول کیا۔ پھر ارشاد فرمایا قبول کر لیا؟ حضرت مخدوم نے عرض کیا، قبول کیا۔ اس کے بعد آپ نے دو وصیتیں ارشاد فرمائیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے ظاہری اوراد ترک نہ کرنا۔ دوسرے یہ کہ میرے متعلقین کے ساتھ رعایت و مراعات کرنا۔"

مسند نشینی پیر و مرشد کی وفات پر ان کی میت کو آپ نے خود غسل دیا۔ اور اس کی ڈوریاں پلنگ سے جدا کر کے اپنی گردن میں ڈال لیں گویہ سیر اخترعہ ہے۔ سیر محمدی کے مصنف کا بیان ہے کہ چراغ دہلویؒ نے وفات سے قبل گیسو دراز کو اپنی

---

[1] سیر محمدی کا مصنف لکھتا ہے: بعد زیارت مخدوم بندگی شیخ نصیر حضرت چراغ دہلویؒ سجادۂ ولایت پر متمکن ہوئے اور اپنا ہاتھ بیعت کے لیے بڑھایا۔ طالبانِ حق کو تلقین و ارشاد فرمانے لگے، جیسے کہ حضرت بندگی شیخ نصیر الدین محمود تلقین و ارشاد فرمایا کرتے تھے ــــــ زمانۂ شیخوخیت میں بہت سے علما، صلحا، سلاطین، خواتین اور قسم قسم کی مخلوق آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتی تھی۔" (ص ۱۲۰)

جانشینی کے لیے منتخب کیا تھا۔ چنانچہ آپ ان کی جگہ مسند نشین ہوئے۔

دوسرے علما دہلی کے علماء میں مولانا حسین نام ایک بزرگ بھی تھے جو خواجہ گیسو دراز سے بیعت تھے۔ ان کی بہن کے ایک داماد نے خواجہ گیسو دراز سے بد عقیدگی کا اظہار کیا اور مولانا حسین سے کہا کہ آپ کیوں ان کے مرید ہوئے۔ انھوں نے جواب دیا تم نے گیسو دراز کو دیکھا نہیں۔ اگر دیکھتے تو تمھیں معلوم ہو جاتا وہ کیا ہیں۔ چنانچہ اگلے روز مولانا حسین انھیں ساتھ لے کر گیسو دراز کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ ایک تخت پہ بیٹھے تھے، سر پر عمامہ بندھا تھا، ہاتھ میں سرخ چمڑے کا پنکھا تھا مولانا حسین کے داماد کے دل میں خیال آیا کہ اگر گیسو دراز صاحب نعمت ہوں گے تو پنکھا اور عمامہ مجھے عنایت کر دیں گے خواجہ گیسو دراز کو کشف سے اس کے دل کی بات معلوم ہو گئی۔ انھوں نے اسے دیکھتے ہی فرمایا: مولانا! بغداد میں ایک بازیگر تھا وہ مجمع میں ایک گدھے کو لا کر کھڑا کر دیتا اور اس کی دونوں آنکھوں پر کپڑا باندھ دیتا اور مجمع سے مخاطب ہو کر کہتا تم میں سے کوئی شخص کسی کی چیز چرالے تو میں اسے پکڑا دوں گا۔ مجمع میں سے ایک آدمی دوسرے کی چیز چرا لیتا تو بازیگر گدھے کی ایک آنکھ پر سے کپڑا ہٹا دیتا اور اس سے کہتا کہ فلاں شخص کی چیز کوئی لے گیا ہے۔ گدھا سب کو سونگھتا پھرتا اور جب چور کے پاس پہنچتا تو اس کے کپڑے دانتوں سے پکڑ لیتا۔ اور اسے کھینچ کر بازیگر کے پاس لے جاتا۔ حضرت گیسو دراز نے یہ قصہ بیان کر کے فرمایا یہ بڑا مشکل ہے کہ کوئی کرامت دکھائے اور اس گدھے کی مانند بنے اور اگر کرامت ظاہر نہ کرے تو لوگ اسے بے نعمت کہیں یہ فرمایا اور مولانا حسین کے داماد کو اپنا پنکھا اور عمامہ دے دیا کہ لے جائیے۔ وہ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا اور اسی وقت بیعت میں داخل ہو گیا۔

دہلی میں نصیر الدین قاسم ایک جید عالم تھے، حضرت گیسو دراز کے بچے ان سے درس لیا کرتے تھے۔ بچے کبھی خود ان کے ہاں چلے جاتے کبھی وہ خود خانقاہ میں پڑھانے آجاتے۔ مولانا کو کسی بزرگ سے اعتقاد نہ تھا مگر آخری عمر میں سید گیسو دراز کے معتقد ہو گئے تھے اور ان سے بیعت کر لی تھی۔ ان کے استاد کو جب اس بات کا علم ہوا تو بلا کر پوچھا تم تو خود عالم ہو گیسو دراز کے مرید کیوں ہو گئے؟ مولانا نے جواب دیا پہلے میں عالم تھا، مگر اب حضرت مخدوم کے سامنے مسلمان ہوا ہوں۔

ایک ملک زادہ آپ کے پاس آیا، گیسو دراز کے ہاتھ میں ان ہی کا لکھا ہوا ایک رسالہ تھا۔ ملک زادے نے وہ مانگ کر پڑھا تو ایک جگہ لکھا تھا اللہ تعالیٰ کو ہمارے ساتھ معیت ذاتی ہے۔ ملک زادہ اس رسالے کو دہلی کے ایک عالم عبدالمقتدر کے پاس لے گیا اور بتایا کہ گیسو دراز نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخلوق کی معیت ذاتی ہے حالانکہ کتابوں میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت علمی ہے۔ عالم اس بات کا کوئی جواب نہ دے سکا اور بات بادشاہ فیروز تغلق تک پہنچ گئی۔ سلطان نے ملک عماد الملک کو بلا کر پوچھا کہ کہیں گیسو دراز شریعت سے ہٹ تو نہیں گئے۔ علما کو جمع کر کے ان سے پوچھو۔

جمعہ کے روز جس مسجد میں گیسو دراز نماز ادا کیا کرتے تھے، عماد الملک وہاں گیا، دوسرے علماء بھی ساتھ تھے۔ جب عماد الملک پہنچا، گیسو دراز نماز پڑھ کر واپس جا رہے تھے۔ عماد الملک نے مشہور عالم سید علاء الدین کو گیسو دراز کی خانقاہ میں

بچانا کر اس مسئلہ کے متعلق ان سے بات کریں۔ وہ گئے اور حضرت سے بات کی کہ بعض لوگ کہتے ہیں آپ نے معیت سے معیت ذاتی
مراد لی ہے۔ آپ نے فرمایا، ہاں یہی میری مراد ہے۔ علماء نے معیت صفتی کہا ہے۔ صفت ذات سے علیحدہ نہیں ہو سکتی اور نہ
رہ سکتی ہے۔ تو اللہ کی جو معیت از روئے صفت ہوئی وہ از روئے ذات بھی ہوئی۔ اس کے علاوہ یہ معیت صفتی اعتباری
ہے حقیقی نہیں۔ پس اعتبار ذات میں ہو یا صفات میں، اس میں کیا حرج ہے۔ مولانا علاؤالدین کی اس جواب سے تشفی ہو گئی اور
ان کے ساتھی بھی اس دلیل کو رد نہ کر سکے۔

بعض لوگوں نے بادشاہ کو یہ خبر پہنچائی کہ گیسو دراز کی مجلس سماع میں ان کے مرید زمین پر سر پٹکتے ہیں اور شور مچاتے ہیں
بادشاہ نے حضرت کو کہلا بھیجا کہ مجلس سماع خلوت میں منعقد کیا کریں۔ چنانچہ آپ سماع کی مجلس اپنے حجرہ میں منعقد کرانے لگے
اپنے اور مریدوں کے درمیان ایک پردہ ڈال دیتے۔ جب آپ پر وجد طاری ہوتا تو خادم حجرے کا دروازہ بند کر دیتا۔

دکن کا سفر آپ چالیس سال تک دہلی میں رہے پھر گلبرگہ چلے گئے۔ دہلی سے روانہ ہوتے وقت راستہ میں کئی مقامات
پر تھوڑی دیر کے لیے قیام فرماتے اور ان مقامات کے لوگ جوق در جوق آپ کی زیارت کے لیے آتے۔ بعض علاقوں
کے حاکموں نے آپ کی آمد پر آپ کا استقبال بھی کیا۔ آپ آنے والوں کو رشد و ہدایت کی تلقین کرتے اور بعض کو حلقہ بیعت
میں بھی داخل فرماتے۔

ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب آپ چندیری کے مقام پر پہنچے تو وہاں کے مفتی کے بیٹے قاضی خواجگی نے جو خود
بھی بڑا عالم تھا، آپ سے بیعت کی اور ہدایت چاہی۔ آپ نے فرمایا کہ تلقین میں میری خاص روش ہے وہ یہ کہ طالب ذکر
جنگل سے لکڑیاں سر پر اٹھا کر لائے۔ تم خود شیخ اور شیخ کے بیٹے ہو۔ تم سے یہ کام نہ ہو سکے گا۔ جس شغل میں ہو اسی میں لگے رہو۔
سید گیسو دراز دکن پہنچے تو عوام و خواص نے انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ لوگ آپ کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔
دکن کا بادشاہ بھی آپ کا بہت زیادہ عقیدت مند تھا اور آپ پر اور آپ کے درویشوں پر بڑی نوازشیں کیا کرتا تھا۔
آپ کا طریقہ بیعت یہ تھا کہ بیعت کرنے والے کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر فرماتے: تم نے اس ضعیف، اس ضعیف
کے خواجہ اور اس ضعیف کے خواجہ کے خواجہ اور اس سلسلہ کے دوسرے مشائخ کے ساتھ عہد کیا کہ اپنی نگاہ اور اپنی زبان کی
حفاظت کرو گے اور شریعت کے سختی سے پابند رہو گے۔ کیا یہ تمھیں قبول ہے۔ مرید عرض کرتا، ہاں مجھے قبول ہے تو فرماتے الحمد للہ
پھر ہاتھ میں قینچی لیتے اور تکبیر کہتے ہوئے داہنی طرف سے کان کے قریب تھوڑے سے بال کاٹ لیتے، اسی طرح بائیں طرف
سے پھر تکبیر پڑھتے ہوئے اسے ایک ٹوپی پہناتے، پھر اُسے دو رکعت نماز ادا کرنے کو کہتے۔ جب وہ نماز پڑھ لیتا تو فرماتے
اگر اس شخص نے سچے دل سے توبہ کی ہوگی تو اس کا نام توبہ کرنے والوں میں لکھا جائے گا اور روز قیامت توبہ کرنے والوں کے
ساتھ اسے جزا ملے گی۔ پھر مرید کو پانچوں وقت پابندی سے نماز پڑھنے کی تلقین کرتے۔ غسل جمعہ اور نماز جمعہ کی بھی تاکید کرتے
پھر اور اد و وظائف بتاتے۔ ہر مہینہ ایام بیض کے روزے رکھنے کی تاکید کرتے پھر فرماتے جس طرح ایک سپاہی کے لیے کمان،

تلویا ور ڈھال وغیرہ ضروری ہیں اسی طرح ایک صوفی کے لیے بھی ان تمام باتوں پر عمل کرنا ضروری ہے ورنہ کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

اگر کسی عورت کو مرید کرنا ہوتا تو ایک پیالے میں پانی منگا کر اپنی شہادت کی انگلی پانی میں ڈالتے۔ عورت بھی اپنی انگلی پانی میں ڈالتی، اس کے بعد بیعت کرتے۔ عورت اس پانی کو پی لیتی۔ پھر آپ کپڑا یا اپنا دامن اس کے سر پر رکھ دیتے۔ اگر عورت پردہ والی ہوتی تو اس کے سامنے ایک چادر ڈال دیتے، پانی کا پیالہ درمیان میں رکھ کر اس کے کسی محرم کو وکیل بنا کے بیعت کرا دیتا۔ لڑکے اور بیمار کو بیعت نہیں کرتے تھے۔

سماع | سماع سے آپ کو بہت رغبت تھی۔ ایک مرتبہ ایک مجلس سماع منعقد کی جس میں خاص خاص یاران طریقت کو بلایا۔ محفل میں ہر قسم کے مزامیر موجود تھے۔ یہ مجلس تین دن تک ہوتی رہی۔ مکان کا دروازہ بند تھا مگر لوگ مکان کے باہر بھی جمع تھے۔ مجلس کے بعد اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے فرمایا کہ اس قسم کا سماع نہ سنا کرو۔

سماع کی مجلس میں عود کثرت سے جلایا جاتا اور خاصی روشنی ہوتی۔ اگر وجد کی حالت میں کوئی گر جاتا تو سماع روک دیتے۔ فارسی غزلیں سننے کا شوق زیادہ تھا۔ سماع کے وقت مریدوں کو غیر معمولی کیفیت کے اظہار سے منع کیا کرتے تھے۔ مگر خود بعض اوقات بے قابو ہو کر اضطراب کی حالت میں رقص کرنے لگ جاتے تھے۔

اولاد | آپ نے چالیس سال کی عمر میں شادی کی۔ بی بی کا نام رضا خاتون تھا جو سید احمد بن مولانا جمال الدین مغربی کی صاحبزادی تھیں۔ ان سے دو لڑکے سید حسین عرف سید محمد اکبر حسینی اور سید یوسف عرف سید محمد اصغر حسینی پیدا ہوئے۔ تین بیٹیاں بھی تھیں۔ دونوں بیٹے متبحر عالم نکلے۔ انھوں نے قاضی عبدالمقتدر، مولانا خواجگی نحوی، مولانا محمد مظفر اور مولانا نصیر الدین قاسم سے علم حاصل کیا۔ بڑے صاحبزادے روحانی کمالات میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے اور گیسو دراز ان سے بہت متاثر تھے۔ سید محمد اکبر نے فارسی اور عربی میں بعض کتابیں لکھیں۔ ان کی تصانیف میں معارف، علم نحو پر عربی زبان کا ایک رسالہ تھا۔ شرح ملتقط نام سے ایک کتاب میں والد بزرگوار کی تفسیر کلام پاک کی شرح لکھی۔ عقیدہ، اباحت سماع، رسالہ اباحت پوشیدن نقش ور مسجد، مقامات صوفیا، تعریف مالکی، شرح سوانح، مسئلہ زبان فارسی، رسالہ علم صرف وغیرہ ان کی تصانیف بیان کی جاتی ہیں۔ سید محمد اکبر نے والد بزرگوار کے ملفوظات کے دو مجموعے بھی مرتب کیے، جن میں "جوامع الکلم" زیادہ مشہور ہے۔ ۸۰۱ھ میں والد بزرگوار سے خلافت پائی مگر ساتھ ماہ بعد انتقال کر گئے۔ ان کا مزار بھی گلبرگہ میں ہے۔ چھوٹے بیٹے محمد یوسف کو بھی خلافت سے نوازا گیا۔ ان کے بعد سجادۂ ارشاد پر متمکن ہوئے۔ ان کا مزار بھی گلبرگہ میں ہے۔ والد بزرگوار کے مزار کے پائنتی دفن ہوئے۔

وفات | سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ گلبرگہ میں بائیس سال تک رہے اور ۱۶ ذی قعدہ ۸۲۵ھ کو وفات پائی۔ سلطان احمد شاہ بہمنی کو حضرت سے بہت عقیدت تھی۔ چنانچہ اسی نے آپ کے مزار پر عالی شان گنبد تعمیر کرایا جس پر سنہری نقش و نگار تھے۔ روضہ کی دیواروں پر سنہری حروف میں قرآن کریم کی آیات نقش کرائیں۔

مرتبہ اور تصانیف | سید گیسو دراز بہت بلند پایہ اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ سید اشرف جہانگیر سمنانی رح

جنھوں نے آپ کی خدمت میں رہ کر فیض روحانی حاصل کیا تھا، اپنے مکتوبات میں جگہ جگہ ان کا ذکر کیا ہے۔ عربی اور فارسی میں آپ نے کئی رسالے اور کتابیں تصنیف کیں۔ حسب ذیل کتابیں آپ کے رشحات قلم کا نتیجہ بتائی جاتی ہیں :

۱۔ ملتقط : صوفیانہ رنگ میں کلام پاک کی تفسیر ہے۔

۲۔ تفسیر کلام پاک : یہ تفسیر کشاف کے طرز پر لکھنی شروع کی تھی لیکن صرف پانچ پاروں ہی تک تحریر فرما سکے۔

۳۔ حواشی کشاف : تفسیر کشاف پر حواشی ہیں۔

۴۔ شرح مشارق : حدیث کی مشہور کتاب مشارق الانوار کی شرح ہے۔

۵۔ ترجمہ مشارق : مشارق الانوار کا فارسی ترجمہ ہے۔

۶۔ معارف : شیخ شہاب الدین سہروردی کی مشہور کتاب عوارف المعارف کی عربی شرح ہے۔

۷۔ ترجمہ معارف : عوارف کی فارسی شرح ہے، لیکن ترجمہ عوارف کے نام سے مشہور ہے۔

۸۔ شرح تعرف : شیخ ابوبکر محمد بن ابراہیم بخاری کی کتاب تعرف کی شرح ہے

۹۔ شرح آداب المریدین (عربی) : یہ حضرت شیخ ضیاء الدین ابو النجیب عبد القاہر سہروردی کی مشہور کتاب آداب مریدین کی عربی شرح ہے۔

۱۰۔ شرح آداب المریدین (فارسی) : آداب المریدین کی ایک فارسی شرح بھی لکھی تھی، جسے مولوی سید عطا حسین نے ایڈٹ کر کے حیدرآباد سے شائع کیا۔

۱۱۔ شرح فصوص الحکم : شیخ محی الدین ابن عربی کی مشہور کتاب کی شرح ہے۔

۱۲۔ شرح تمہیدات عین القضاۃ ہمدانی : حضرت ابو المعالی عبد اللہ المعروف بہ عین القضاۃ کی مشہور صوفیانہ تصنیف تمہیدات کی شرح ہے۔

۱۳۔ ترجمہ رسالہ قشیریہ : امام ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن القشیری کے رسالہ کا فارسی ترجمہ ہے۔

۱۴۔ خطائر القدس : اسے عشق نامہ بھی کہتے ہیں، جس کا ایک نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں بھی ہے۔

۱۵۔ رسالہ استقامۃ الشریعۃ بطریق الحقیقۃ : اس میں شریعت، طریقت اور حقیقت سے بحث کی گئی ہے۔ [illegible] کا ذکر [illegible] اس کے فارسی مخطوطات کی فہرست میں بھی ہے۔

۱۶۔ ترجمہ رسالہ شیخ محی الدین ابن عربی

۱۷۔ رسالہ سیرۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم۔

۱۸۔ شرح نحو کبیر : عربی و فارسی [illegible] ہے۔

۱۹۔ حواشی قوت القلوب : حضرت ابی طالب محمد بن ابی الحسن بن علی کی مشہور کتاب قوت القلوب پر حواشی ہیں۔

۲۰۔ اسماء الاسرار : یہ کتاب مولوی سید عطا حسین صاحب نے حیدرآباد سے شائع کی تھی۔ اس کتاب کے متعلق خواجہ گیسو دراز فرماتے ہیں: "میری کتاب اسماء الاسرار میں باطل کو نہ آگے سے آنے کا موقع ہے نہ پیچھے سے کوئی اس سے اختلاف نہیں کر سکتا کیوں کہ اس میں توحید کی تجرید اور تفرید کے افراد کے سوا کچھ نہیں"

مولانا عبدالحق اپنی کتاب "اخبار الاخیار" میں فرماتے ہیں "یکے از تصنیفات مشہور سید گیسو دراز کتاب اسماء الاسرار است کہ حقائق و معارف بزبان رمز و ایماء و الفاظ و اشارات بیان کردہ است"*

اس کے متعلق مولوی سید عطا حسین لکھتے ہیں کہ اس کتاب کے متعلق بعض بزرگوں کا خیال بالکل صحیح ہے کہ فن تصوف و سلوک معارف میں ہندوستان میں اس سے بہتر اور اعلیٰ تر کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔ مبتدی، متوسط اور منتہی سب کے لیے مفید ہے۔ اس میں ذکر ہے، شغل ہے، مراقبہ ہے، مراتب سلوک کا بیان ہے، عشق ہے، توحید ہے، حقائق ہیں، معارف ہیں۔ غرض سب ہی کچھ ہے۔

۲۱۔ حدائق الانس : اس میں معرفت کے کچھ اسرار بیان کیے گئے ہیں۔

حسب ذیل کتابوں کے موضوع ان کے نام سے ظاہر ہیں :

۲۲۔ ضرب الامثال ۲۳۔ شرح قصیدہ امالی ۲۴۔ شرح عقیدہ حافظیہ ۲۵۔ عقیدہ چند ورق۔

۲۶۔ رسالہ در بیان آداب سلوک ۲۷۔ رسالہ در بیان اشارات محباں ۲۸۔ رسالہ در بیان ذکر۔

۲۹۔ رسالہ بیان رأیت ربی فی احسن صورۃ ۳۰۔ رسالہ در بیان معرفت ۳۱۔ رسالہ در بیان بود و ہست و باشد۔

بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے فارسی مخطوطات میں خواجہ صاحب کے بعض رسائل کے نام بھی ہیں: رسالہ در تصوف، شرح بیت امیر خسرو دہلوی، اسماء ادکار خانوادہ چشتیہ، وجود العاشقین۔ انھیں مخطوطات میں آپ کی ایک تصنیف "خاتم" کا بھی ذکر ہے۔

آپ کے اکسٹھ مکتوبات بتائے جاتے ہیں جنھیں آپ کے خلیفہ شیخ ابو الفتح علاؤالدین نے مرتب کیا ہے۔ کبھی کبھی آپ شعار بھی کہہ دیتے تھے، چنانچہ آپ کے پوتے سید یداللہ عرف سید قبول اللہ نے آپ کی غزلوں اور رباعیوں کا ایک دیوان بھی رتب کیا۔

تعلیمات | حضرت گیسو دراز نے اپنی تصانیف اور خطوط میں تصوف کے بعض غوامض اور دقائق پر عالمانہ بحثیں کی ہیں۔ ان میں سے چند ایک "بزم صوفیہ" سے خلاصۃً پیش کی جاتی ہیں :

فرماتے ہیں سالکوں کو ہمیشہ با وضو رہنا چاہیے۔ ہر فرض نماز کے لیے تازہ وضو کرنا بہتر ہے۔ وضو کے بعد تحیۃ الوضو ادا کریں، بے وضو نہ سوئیں۔ اگر رات کے وقت بیدار ہو جائیں تو وضو کر لیں اور دوگانہ ادا کریں۔ وضو کرنے

---

* بزم صوفیہ

میں کسی سے بات چیت نہ کریں اور اس کا خیال رکھیں کہ ان کا ہر عضو دوسرے سے علیحدہ بھی ہے اور ملا ہوا بھی
صبح ہونے سے قبل اگر رات کی تاریکی باقی ہے تو رات کے باقی ماندہ نفلوں کو پورا کر لیں۔ فجر کی نماز
اوّل وقت ادا کریں۔ فجر، عشاء اور مغرب کی نمازوں میں قرأت لمبی نہ ہو۔ نماز میں حضورِ قلب مقدم ہے۔
فجر کی سنت پڑھنے کے وقت سے اشراق کی نماز پڑھنے تک حتی الوسع کسی سے نہ بولیں۔

اشراق سے پہلے ہلکی سی نیند لے کر آرام کریں تاکہ بیداری شب کی تکان دور ہو جائے اور دوسرے
وقت کے اوراد و وظائف میں گرانی پیدا نہ ہو اور مضمحل نہ رہیں۔ کچھ آرام کے بعد اشراق کی نمازیں ادا کریں۔
اشراق کے بعد اور چاشت سے پہلے اوراد و وظائف میں مشغول رہیں۔ تلاوت قرآن پاک بھی کریں۔
تلاوت کے بعد سلوک کی کتابیں پڑھیں، پھر چاشت کی نمازیں اس طرح ادا کریں کہ چار رکعتیں تو اشراق
سے متصل پڑھی جائیں، چار چاشت سے کچھ دیر بعد اور چار چاشت کے زوال پر ادا کی جائیں۔
زوال کے وقت قیلولہ کریں تاکہ شب بیداری میں سہولت ہو۔

زوال کے وقت دو رکعت نماز ادا کر کے اوراد میں مشغول ہوں، اس کے بعد تلاوت یا مراقبہ کریں مگر قیام
بہتر ہے۔ ظہر، عصر اور مغرب کی نمازوں میں سے ہر نماز اوّل وقت ادا کریں۔ طلوعِ آفتاب سے پہلے اور
غروبِ آفتاب کے بعد مخصوص وظائف پڑھیں۔ عصر کی نماز سے اوّابین کے ادا کرنے تک کسی سے نہ بولنا
بہتر ہے۔

مغرب کی نماز کے بعد اور نمازوں کے پڑھنے سے اگر طبیعت میں کچھ گرانی محسوس ہو تو تھوڑی دیر آرام
کر لیں پھر عشاء کی نماز پڑھیں۔

آداب سماع کے متعلق فرماتے ہیں کہ مجلس سماع کے لیے ایک علیحدہ مکان ہو۔ ارباب دنیا، امراء کے
لڑکے، بچے اور عورتیں اس میں شریک نہ ہوں۔ اس میں سالکوں اور مریدوں کو غسل کر کے طاہر اور باوضو ہو کر
اور سفید کپڑے پہن کر شریک ہونا چاہیے۔ اور وقار کے ساتھ بیٹھیں اور مراقبہ میں رہیں۔ گانے والوں پر نظر نہ
رکھیں اور نہ ان کی موسیقی پر دھیان دیں۔ اشعار کی ترکیب کو بھی خیال میں نہ لائیں۔ نہ ہر لمحہ واہ واہ کریں اور
نہ آہ آہ۔ گریہ طاری ہو تو . . . . . ضبط کریں۔ زبان سے کچھ کہنا چاہیں تو پرہیز کریں۔ اضطراب میں پیاس
معلوم ہو تو پانی نہ پئیں۔ حتی الوسع اپنے اعضاء میں جنبش پیدا نہ ہونے دیں۔

مزامیر کے متعلق فرمایا کہ فقہا کے نزدیک یہ حرام ہے، اس لیے ان سے سختی کے ساتھ احتراز کرنا
چاہیے۔ سماع کو پیشہ نہیں بنانا چاہیے۔ سماع کے بعد دل کو سماع کے مقصد کی طرف متوجہ کرنا ضروری ہے
اس کے بعد بہت سے راز معلوم ہوتے ہیں۔

خلفاء: آپ کے متعدد خلفاء تھے بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱ - مولانا علاء الدین گوالیری

۲ - شیخ صدر الدین خوندیر

۳ - قاضی اسحاق محمد

۴ - قاضی محمد سلیمان

۵ - قاضی علیم الدین عرف

۶ - حضرت سید محمود اکبر (آپ کے بڑے صاحبزادے)

۷ - حضرت ابو المعالی ابن سید احمد (آپ کے سالے خادم)

۸ - خواجہ احمد دبیر

۹ - مولانا ابو الفتح بن مولانا علاؤ الدین گوالیری

حضرت خواجہ خواجگان شیخ احمد رودلوی

وفات ——————— ۱۶ جمادی الاخری ۸۳۷ھ

قطب الاولیا، خواجہ خواجگان حضرت شیخ احمد رودلوی صاحب تصرف، ذوق و شوق اور صاحب سکر و تجرید تھے۔ حضرت خواجہ محمد جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی کے مرید اور خلیفہ اعظم تھے۔

آپ کا اسم گرامی احمد اور عبدالحق خطاب تھا۔ فاروق اعظم کی اولاد میں سے تھے۔ سن ولادت کا علم نہیں ہو سکا۔ ۱۶ جمادی الثانی ۸۳۷ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مزار مبارک قصبہ رودلی میں ہے۔

آپ بڑی شان اور مرتبہ کے بزرگ تھے۔ نگاہوں میں بڑی تاثیر تھی۔ جو کچھ زبان مبارک سے فرماتے اسی طرح ظہور میں آجاتا۔ آپ کے جد امجد بلخ کے رہنے والے تھے۔ ہلاکو خان کی تباہ کاریوں کے نتائج میں ہندوستان آگئے تھے۔ اس زمانے میں سلطان علاؤالدین خلجی دہلی کے تخت پر متمکن تھا۔ اس نے قصبہ رودلی میں ان کی وجہ معاش مقرر کر دی تھی۔ چنانچہ وہ قصبہ رودلی میں مقیم ہوئے۔ بڑے عظیم القدر اور صاحب کمال تھے۔

شیخ احمد کے والد بزرگوار بھی بڑے اہل علم، پاکیزہ سیرت اور خوش شکل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی والدہ ماجدہ رات کو نماز تہجد کے وقت اٹھا کرتی تھیں تو آپ بھی جبکہ آپ کا سن مبارک سات سال سے زیادہ نہ تھا۔ اٹھ کر نماز ادا فرماتے پھر اللہ کا ذکر کرنے لگتے۔ اتنی چھوٹی عمر میں آپ کا یہ طریق کار بڑا تعجب خیز تھا۔ والدہ ماجدہ عمر کا خیال کر کے انھیں منع کرتیں کہ آپ نہ اٹھا کریں تہجد کے لیے: تو آپ والدہ ماجدہ سے کہا کرتے۔ کہ آپ مجھے ایسا کرنے سے نہ روکا کریں، ورنہ اس طرح یاد حق سے دور پڑ جاؤں گا۔

بالآخر آپ نے سفر کا ارادہ کیا اور بارہ سال کی عمر میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ مقصد یہ تھا کہ گھر سے دور جا کر تحصیل علم کروں اور ذکر و فکر میں وقت گزاروں۔ اس زمانہ میں آپ کے بڑے بھائی جن کا نام شیخ تقی الدین تھا دہلی میں رہتے تھے۔ آپ ان کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میں علم سیکھنا چاہتا ہوں۔ برادر معظم نے علوم ظاہری کی تعلیم پر آمادگی ظاہر کی، مگر آپ نے فرمایا کہ میں تو علم باطنی کا شوق رکھتا ہوں، چنانچہ آپ بھائی کے پاس سے چلے گئے اور سیر و سیاحت کی خاطر نکل کھڑے ہوئے۔

پھرتے پھراتے پانی پت پہنچے جہاں ان دنوں شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء تشریف رکھتے تھے۔ آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضور میں رہنے کی درخواست کی۔ حضرت شیخ نے بڑی عزت و تکریم اور شفقت و محبت سے اپنے پاس رکھ لیا اور شرف بیعت سے مشرف فرمایا بعد اپنی کلاہ انھیں عطا کی۔

آپ کے لقب عبدالحق کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ آپ کی عادت تھی اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، غرض ہر وقت اونچی آواز سے حق حق فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ پیرومرشد نے ان کا لقب عبدالحق رکھ دیا۔ اور اسی نام سے پکارے جانے لگے۔ پیرومرشد فرمایا کرتے تھے، اے احمد عبدالحق میرا سلسلہ تجھ سے جاری ہوگا اور تیرے نورِ ہدایت سے ایک دنیا منور ہوگی۔ پس ایسا ہی ہوا۔ آپ حضرت کبیرالاولیا کے صحیح جانشین بنے اور ہزاروں افراد کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب فرمایا۔

پیرومرشد کی خدمت میں آپ نے تھوڑا ہی عرصہ گزارا اکثر سیاحت کرتے رہتے تھے۔ مختلف شہروں اور قصبوں میں گھومتے اور علماء و شیوخ سے ملاقاتیں کرتے۔ پیرومرشد کی وفات کے وقت بھی ان کے پاس موجود نہ تھے، تاہم مرشد نے وفات کے وقت اپنے بیٹوں کو وصیت فرمائی تھی کہ میرا خرقہ اور دوسرا مال و اسباب احمد عبدالحق کی امانت ہے انھیں پہنچا دینا، اور فرمایا تمھاری دستگیری کو احمد عبدالحق کافی ہے۔

پیرومرشد کی وفات کے تھوڑے دنوں بعد آپ پانی پت تشریف لے آئے اور مرشد کے فرزندوں کو تعلیم دے کر مرتبہ کمال کو پہنچایا۔ پانی پت سے آپ ردولی تشریف لے آئے اور اپنے والد بزرگوار کے مکان میں سکونت اختیار کی۔

آپ کے حالات بیان کرتے ہوئے خلیفہ محمد سعید اپنی کتاب تذکرہ میں لکھتے ہیں، اس وقت ردولی کی آبادی بہت کم تھی، تمام جنگل و بیابان تھا۔ الحاصل جب آپ مسندِ ارشاد پہ متمکن ہو کر ہدایتِ خلق میں مشغول ہوئے تو ہزاروں طالبانِ خدا کو خدا سے ملایا اور بہتوں کو درجہ ولایت تک پہنچایا۔ آپ زہد و تقویٰ و عبادت و ریاضت میں اعلیٰ درجہ رکھتے تھے۔ آپ نے ایسی ایسی ریاضتیں اور مجاہدے کیے ہیں کہ اس خرقہ میں کسی دوسرے نے کم ہی کیے ہوں گے۔

آپ نے کامل تیس برس تک تکیہ پر سر نہ رکھا اور تمام عمر صرف ایک خرقہ میں بسر فرمائی۔ جہاں سے پھٹ جاتا پیوند لگا کر درست کر لیتے تھے۔ آپ کو دنیا و اہلِ دنیا سے سخت نفرت تھی۔ یہاں تک کہ اگر آپ کے حضور میں دنیا و اہلِ دنیا کا ذکر آتا تو آپ کے جسم مبارک میں لرزہ پڑ جاتا۔ آپ کا معمول تھا کہ جامع مسجد میں سب سے پہلے جاتے تھے اور دستِ مبارک سے جھاڑو دیتے اور صاف کرتے تھے۔ چالیس برس کے قریب جامع مسجد میں نماز پڑھی مگر یہ نہ جانا کہ جامع مسجد کونسی ہے۔ اور کدھر ہے۔ آپ حالتِ ذوق و شوق میں اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

سخنے شکستہ از ہمہ عالم برائے یار — آرے برائے یار دو عالم توان شکست

محویت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی قرابتی یا ہمسایہ جسے آپ اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے آپ کے پاس آتا تو اس سے پوچھتے کہ تم کون ہو اور تمھارا کیا نام ہے، پھر آبا و اجداد تک پوچھتے چلے جاتے تب کہیں جا کر سمجھتے کہ یہ فلاں شخص ہے۔ پھر عالمِ محویت میں غرق ہو جاتے۔ غرض عالمِ ظاہری کی طرف سے آپ کی توجہ بالکل اٹھ گئی تھی اور آپ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہو گئے تھے۔ جب نماز کا وقت ہوتا تو خادم تین مرتبہ حق حق حق بآوازِ بلند کہتے تو آپ آنکھ کھولتے اور پوچھتے کہ بھائی تم کیا کہتے ہو؟

آپ نے ایک روز مجمع عام میں فرمایا کہ حق تعالیٰ نے مجھے ان لوگوں کی فہرست عنایت فرمائی ہے جو مجھ سے مرید ہوں گے اور

یہ بھی فرمایا کہ قسم ہے میرے مریدوں کے حق میں میری حمایت ایسی ہے جیسی آسمان کی حمایت زمین کے حق میں اور قسم ہے جب تک میرے مرید اور دوست جنت میں نہ جائیں گے میں ہرگز جنت میں نہ جاؤں گا، اور اگر میرا مرید مشرق میں ہو اور میں مغرب میں تو بھی اسے ضرر نہ پہنچنے دوں گا۔"

شیخ احمد عارفؒ | خواجہ خواجگان حضرت خواجہ شیخ احمد عارف حضرت شیخ احمد ردولوی کے فرزند، خلیفہ اعظم اور سجادہ نشین تھے آپ ۸۱۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۸۵۹ھ کو چالیس سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار پرانوار بھی قصبہ ردولی میں ہے۔

شیخ محمدؒ | شیخ احمد عارفؒ کے فرزند دلبند کا اسم گرامی خواجہ شیخ محمد تھا۔ یہ بھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے، اپنے والد بزرگوار کے خلیفہ اور سجادہ نشین ہوئے، ۸۵۸ھ میں سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں وفات پائی اور قصبہ ردولی میں دفن ہوئے۔ آپ کی بلند شخصیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ قطب العالم شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے پیرومرشد تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب آپ مرض الموت میں گرفتار ہوئے تو آپ نے اپنے صاحبزادہ شیخ الاولیا شیخ بدھن کو یاد فرمایا جو شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے پاس شاہ آباد میں تھے۔ چنانچہ وہ شیخ عبدالقدوسؒ کے ساتھ ردولی تشریف لائے۔ اس وقت آپ نزع کے عالم میں تھے اور استغراق کا پورا غلبہ تھا۔ شیخ عبدالقدوسؒ نے عرض کیا یہ وقت مردان خدا کی ہوشیاری کا ہے۔ آپ نے فرمایا تم اس سے بالکل بے فکر رہو۔ میرے سینہ میں اب اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ فرمایا اور مجھے پیران چشت کی امانت حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے سپرد کی، اور اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ شیخ عبدالقدوس نے عرض کیا آپ کے بعد میں کیونکر رہوں گا مجھ میں آپ سے مفارقت کی طاقت نہیں۔ آپ نے فرمایا اندیشہ نہ کرو، تم منجملہ اولیائے حق ہو اور میرا مقام تمہارا مقام ہے۔ تم جہاں رہو گے میں تم سے جدا نہ ہوں گا۔"

حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ

ولادت ——— باغستان تاشقند ۸۰۶ھ

وفات ——— سمرقند ۸۹۵ھ

مقتدائے طریقت و رہنمائے حقیقت حضرت خواجہ عبید اللہ احرار ماوراء النہر کے بہت بلند پایہ بزرگ اور سر حلقۂ اولیا تھے۔ آپ کی بزرگی اور فضیلت مسلم تھی۔ اپنے وقت کے شیوخ میں بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے حضرت خواجہ یعقوب چرخیؒ[1] کے مرید اور خلیفہ تھے۔

آپ کا نام عبید اللہ اور لقب ناصر الدین تھا۔ مگر خواجہ احرار کے نام سے شہرت پائی۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام خواجہ محمود بن مولانا شہاب الدین تھا۔ آپ کے والد حضرت عبد الباقی بغدادی کی اولاد سے تھے اور والدہ صاحبہ حضرت خواجہ عمر باغستانی کی اولاد سے تھیں۔ خواجہ عمر کا سلسلہ نسب سولہ واسطوں سے حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔

رمضان ۸۰۶ھ میں باغستان (علاقہ تاشقند) میں پیدا ہوئے اور ۲۹ ربیع الاول ۸۹۵ھ میں سمرقند میں وفات پائی۔ مزار مبارک اسی جگہ پر ہے۔

آپ مادر زاد ولی بیان کیے جاتے ہیں اور صغر سنی ہی میں ولایت کے نشانات آپ میں پائے جاتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کے جدِ امجد مولانا شہاب الدین شاشی صاحبِ کشف و کرامت بزرگ تھے۔ جب ان کی وفات کا زمانہ قریب آیا تو اپنے دونوں بیٹوں خواجہ محمد اور خواجہ محمود سے کہا کہ اپنے بیٹوں کو میرے سامنے لاؤ۔ چنانچہ خواجہ عبید اللہ لائے گئے آپ اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ مولانا نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا مجھے اٹھا کر بٹھا دو۔ چنانچہ لوگوں نے پکڑ کر مولانا کو بٹھا دیا اور انھوں نے خواجہ عبید اللہ کو گود میں بٹھا لیا۔ پیار کیا اور فرمایا یہی لڑکا ہے جس کے متعلق مجھے بشارت ملی ہے کہ یہ عنقریب بڑے درجے کو پہنچے گا۔

---

[1] خواجہ یعقوب چرخی بڑے عالی رتبہ بزرگ اور ولی اللہ تھے۔ غزنی کے قریب موضع چرخ کے رہنے والے تھے۔ غزنی میں پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار کا نام عثمان بن محمود الغزنوی تھا جو شیخ بہاؤ الدین نقشبند کے اصحاب میں تھے۔

اور شہرت پائے گا۔ شریعت اور طریقت کو ترویج دے گا۔ وقت کے بادشاہ اس کے تابع ہوں گے اور یہ بہت بڑے کام کرے گا۔
چنانچہ یہ سب باتیں بعد میں درست ثابت ہوئیں۔

ابتدا میں خواجہ عبید اللہ نے حضرت قاسم تبریزی سے رجوع کیا اور ان کی خدمت میں حاضری دی۔ قاسم تبریزی اپنے وقت کے اولیائے نامدار اور مشائخ کبار میں سے تھے۔ انھوں نے خواجہ عبید اللہ کی طرف پوری توجہ دی اور بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ کوئی شخص قاسم تبریزی کے حضور میں بے روک ٹوک نہ جا سکتا تھا۔ صرف خواجہ عبید اللہ ہی کو آپ نے اجازت دے رکھی تھی کہ جب جی چاہے آئیں اور جب جی چاہے چلے جائیں۔

سید قاسم یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ یہ نوجوان نادرۂ زمانہ ہے۔ ایک زمانہ اس کے نور باطن سے روشن ہوگا اور مردہ دلوں کو اپنے اعجاز مسیحائی سے زندہ کرے گا

جب آپ تحصیل علم کی خاطر سمرقند میں قیام پذیر تھے تو مولانا سعد الدین کاشغری اور مولانا نظام الدین خاموش قدس سرہ کی ملازمت کر لی اور اکثر حاضر خدمت ہوتے رہتے تھے۔ سمرقند میں آپ کی آمد سے قبل ایک روز مولانا نظام الدین مراقبہ میں تھے کہ اچانک چیخ ماری آپ سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا مشرق کی طرف سے عبید اللہ نام کا ایک بزرگ ظاہر ہوا ہے جس نے سارے عالم کو اپنے تحت کر لیا ہے۔

خواجہ عبید اللہ کچھ مدت سمرقند میں رہے پھر بخارا، خراسان اور مرو ہوتے ہوئے ہرات گئے اور چار سال تک وہاں رہے۔ اپنے متعلق خود فرماتے ہیں کہ قیام ہرات کے دوران ایک مرتبہ مجھے خواجہ یعقوب چرخی کی ملازمت کا شوق ہوا۔ چنانچہ میں سفر کی مصیبتیں اٹھاتا ہوا آپ کی خدمت میں ہلفتون پہنچا۔ پہلی ملاقات کے موقع پر میں نے آپ کے چہرے پر ایک ایسا سفید داغ دیکھا جسے دیکھ کر نفرت آتی تھی۔ آپ نے مجھ سے ایسی ترش روئی اور سختی کے ساتھ باتیں کیں اور ایسا خراب رویہ دکھایا کہ میری طبیعت کو سخت ناگوار گزرا اور مجھے افسوس ہوا کہ میں کیوں یہاں آیا۔ چنانچہ میں آپ سے مایوس ہو کر چلا گیا۔

ایک اور موقع پر میں دوبارہ آپ کی خدمت میں گیا۔ اس مرتبہ آپ نے شفقت و محبت کا ایسا اظہار کیا اور ایسی خندہ پیشانی اور مروت سے پیش آئے کہ میں حیران رہ گیا۔ آپ نے میری بڑی عزت کی، مجھے بھی آپ کی صورت بہت پیاری معلوم ہونے لگی۔ آپ نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔ خواجہ بہاؤالدین نقشبند نے جب بیعت کے وقت میرا ہاتھ پکڑا تھا تو فرمایا تھا میرا ہاتھ تیرا ہاتھ ہے۔ جس نے میرے ہاتھ کو پکڑا اس نے گویا تیرے ہاتھ کو پکڑا۔ پس تم خواجہ بزرگ کا دست مبارک پکڑ لو۔ میں نے بلا تامل دست مبارک کو پکڑ لیا اور بیعت میں داخل ہو گیا۔ آپ نے مجھے تعلیم دینے کے بعد فرمایا جو کچھ مجھے خواجہ بزرگ سے پہنچا تھا وہ میں نے تمھیں پہنچا دیا۔ اگر تم طالبان حق کی تربیت بطریق جدیدہ کرنا چاہو تو تمھیں اس بات کی اجازت ہے۔ جب بعض لوگوں نے حضرت مولانا سے پوچھا کہ آپ نے جس طالب کو بھی اس طریقہ کی تعلیم دی ہے اس سے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ طریق جدیدہ پر تعلیم دے۔ فرمانے لگے جو طالب کسی عزیز کی صحبت کو پہنچے اسے خواجہ عبید اللہ کی طرح ہونا چاہیے کہ چراغ مہیا کیے اور روغن و فتیلہ تیار کیے ہوئے وہ

صرف سے جلانے اور روشن کرنے کی ضرورت ہو۔

یہ سفر تیمور بخشتے کا تھا، اس کے بعد ہرات واپس آئے اور سال بھر وہاں رہے۔ پھر واپس آکر تاشقند میں قیام فرمایا۔ ایک اور شخص کے ساتھ مل کر زراعت شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کام میں برکت دی اور اس قدر مال و متاع، مواشی اور اسباب جمع ہوگئے جن کا حساب نہ تھا ہزاروں ایکڑ زمین آپ کے زیر کاشت رہتی۔

مولانا جامیؒ نے اسی بارے میں یہ شعر کہا ہے ؎

ہزارش خرمن دہ زیر کشت است　　　کہ زاد رفتن راہ بہشت است

آپ واقف ناواقف سب کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے۔ کبھی کسی سے کوئی ہدیہ یا نذرانہ قبول نہ کرتے تھے دوست دشمن سب کے ساتھ حسن سلوک کرتے تھے۔ جس زمانہ میں سمرقند میں مولانا قطب الدین کے مدرسہ میں تھے۔ بیماروں کی تیمارداری اور خدمت میں سرگرم رہتے تھے۔ خود ہی ان کے کپڑے وغیرہ دھو دیا کرتے تھے اور ان کی آسائش کا پورا خیال رکھتے تھے۔

قیام ہرات کے دوران آپ نے ایک حمام اور گرم خانہ کی خدمت اپنے ذمہ لے لی تھی اور نہانے والوں کی خدمت کیا کرتے تھے۔ آپ کا ارشاد تھا ہر شخص کسی نہ کسی دروازہ سے لایا گیا ہے اور میں خدمت کے دروازہ سے لایا گیا ہوں یہی وجہ ہے کہ مجھے لوگوں کی خدمت زیادہ مرغوب ہے۔ مجلس میں ظاہری اور باطنی آداب کی رعایت ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ آپ نہ صرف دوسروں کی مدد کیا کرتے تھے بلکہ اکثر دوسروں کی تکلیفیں خود برداشت کرکے انھیں راحت پہنچاتے تھے۔ عبادت و ریاضت میں بھی آپ کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد تہجد کے وقت تک دو زانو بیٹھ کر ذکر میں لگے رہتے اور زانو بھی نہ بدلتے۔ تہجد سے فارغ ہونے پر پھر اسی طرح دو زانو بیٹھ کر ذکر کرنے لگتے یہاں تک کہ صبح کی نماز کا وقت ہو جاتا۔ رات میں ایک لحظہ کے لیے بھی آنکھ نہ لگتی۔ عشا ہی کے وضو سے صبح کی نماز بھی ادا کرتے تھے۔

آپ کے بعض کلمات طیبات "تذکرہ" سے نقل کیے جاتے ہیں:

اذکیا پر لازم ہے کہ دل کو دونوں جہانوں کی گرفتاری سے کہ درحقیقت یہی حجاب ہے اس آشنا کے ساتھ تمسک کرکے جو خلاصی کا سبب ہوتا ہے، قبل از مرگ خلاصی بخشیں۔

ارباب شہود کی صحبت دل کو گرفتاری سے جلد خلاصی بخشتی ہے۔ پس اسی صحبت کو صحبت کی نگہداشت کے ساتھ اپنے اوپر لازم رکھیں۔ اپنی استعداد کے مطابق اشتغال ذکر میں تقصیر کو راہ نہ دیں۔ دل کا غیر کی گرفتاری سے خلاصی پانا درحقیقت وصول و شہود ہے۔ جب دل وجود غیر کی مزاحمت شعور سے خلاصی پاتا ہے تو شہود حق کی گرفتاری کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔

غیر حق سبحانہ کی ناآگاہی سے دل کی تخلیص و تجرید ہے۔ وحدت علم و شہود وجود غیر حق سے دل کی خلاصی ہے۔ اتحاد حضرت حق سبحانہ تعالیٰ کی ہستی میں بالکل مستغرق ہے۔ سعادت حق سبحانہ کی دید میں اپنے سے نکل جانا ہے۔ شقاوت اپنے میں رہنا ہے اور حق سبحانہ سے نکل جانا ہے۔ وصل شہود نور وجود حق سبحانہ تعالیٰ میں اپنے کو بھول جاتا ہے۔

عمل کو محبوب رکھنا چاہیے نہ حضور و جمعیت کو، اس لیے کہ حضور و جمعیت اختیاری نہیں اور اس میں فتور کو بہت کچھ دخل ہے بخلاف عمل کے کہ کسب کی چیز اور اختیاری ہے۔ مواظبت یا مداومت جمعیت و حضور کی موجب ہے۔

اہل صحبت کی تعلیم میں فرماتے ہیں کہ زیادہ گرسنگی اور زیادہ بیداری دماغ کو منحرف و ضائع کرتی ہے اور حقائق کے ادراک سے باز رکھتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بعض اہل ریاضت سے کشف میں غلطیاں واقع ہوتی ہیں۔ البتہ زیادہ بیداری اس شخص کو ضرر نہیں دیتی جس کے لیے اس بیداری میں فرحت و اطمینان نتیجہ ہو چکا ہو۔ کیونکہ وہ فرحت و سرور خواب کا کام دیتی ہے۔ اور دماغ کو یبوست سے بچاتی ہے۔

ذکر میں اس طرح کا استغراق ہونا چاہیے کہ ذاکر کو نہ ذوق بہشت کا ہو نہ خوف دوزخ کا اور اس کے نزدیک خواب بیداری یکساں ہو جائے۔ پھر شیطان کی مجال نہیں جو اس کے نزدیک پھٹکے۔

خواجہ خواجگان حضرت مولانا محمد زاہد بخشی آپ کے مرید و خلیفہ تھے جو کبرائے مشائخ سلسلۂ نقشبندیہ اور عظمائے علمائے عہد سے تھے۔ فقر و تجرید، زہد و ریاضت اور ورع و تقویٰ میں لاثانی تھے۔

خواجہ عبید اللہ سے آپ کی بیعت کا واقعہ اس طرح ہے کہ جب آپ پیر و مرشد سے بیعت کے لیے روانہ ہوئے اور حضرت خواجہ کے مسکن کے قریب پہنچے تو خواجہ صاحب آپ کے استقبال کے لیے خود باہر تشریف لائے اور راستہ میں آ لیا۔ دونوں باہم بغلگیر ہوئے۔ خواجہ علیہ الرحمۃ ان کے ساتھ ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے اور وہیں شرف بیعت سے مشرف فرمایا اور تلقین و اجازت کا خرقہ عطا فرما کر اسی جگہ سے رخصت کر دیا۔ اس کے علاوہ آپ کو دوبارہ پیر و مرشد سے ملاقات کا موقع نہ ملا۔

خواجہ محمد زاہد مولانا یعقوب چرخی کے نواسے تھے۔ آپ نے ربیع الاول ۹۳۶ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مزار مبارک وخش میں ہے جو مضافات حصار کا ایک مقام ہے۔

حضرت شیخ امان پانی پتیؒ

وفات ———— ۹۵۵ھ

عارف ربانی واقف اسرار حقیقت، سرچشمہ علوم ظاہر و باطن حضرت شیخ امان پانی پتیؒ موحد علمائے صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں۔ علم تصوف میں بلند درجہ رکھتے تھے۔ مسئلہ توحید کے بیان میں بڑی دسترس حاصل تھی۔ تصوف میں آپ کا مشرب ملامتیہ تھا۔ ذکر حق اور نشر علوم میں وقت بسر ہوتا تھا۔

آپ کا اسم گرامی عبدالملک تھا۔ امان اللہ لقب تھا۔ امان پانی پتی کے نام سے مشہور ہوئے۔ تصوف میں شیخ ابن عربی کی متابعت کرتے تھے۔ تصوف سے بہت شغف تھا اور اکثر اسی موضوع کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔

شیخ محمد حسنؒ[1] کے مرید اور شیخ مودود لاریؒ[2] کے شاگرد تھے۔ علم تصوف اور توحید پر بہت سی کتابیں اور رسالے لکھے۔ آپ کے کلام سے آثار تحقیق ظاہر ہیں۔ ایک رسالے کا نام اثبات الاحدیت ہے۔ آپ نے لوائح مولانا عبدالرحمن جامیؒ پر شرح بھی لکھی جو نہایت بسیط اور طویل ہے

آپ تہذیب اخلاق اور محبت اہل بیت رسولؐ، آپ کا ارشاد ہے کہ ان کی محبت کی علامت یہ ہے کہ محبوب سے

---

[1] شیخ محمد حسنؒ عارف روزگار تھے۔ شیخ حسن نو بہار کے فرزند تھے۔ علم و حال کے جامع تھے۔ مظاہر صوریہ سے بھی تعلق تھا۔ آپ کی نسبت والد بزرگوار کی طرف سے سلسلہ چشتیہ ہے۔ مگر غالب رجحان سلسلہ قادریہ سے تھا۔ حرم مدینہ کے مجاور بھی رہے۔ یمن کے خاندان قادریہ سے بیعت و اجازت حاصل کی۔ شیخ حاجی عبدالوہاب کے ساتھ مدینہ منورہ سے واپس وطن تشریف لائے۔ ولادت جونپور کی ہے۔ مگر آگرہ میں سکونت اختیار کر لی۔ دہلی میں حوض منڈل کے نیچے اپنے والد بزرگوار کے مزار کے قریب مدفون ہیں۔

آپ کے بعض مکتوبات جمع کیے گئے ہیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ بعض مرید آپ کو شاہ خیال کہا کرتے تھے۔ آپ کے ایک مکتوب کا نمونہ یہ ہے:

"جان لے کہ ایک عالم ایسا ہے جسے حواس کے سوا اور کوئی چیز معلوم نہیں کر سکتی۔ ایک دوسرا عالم ہے جسے عقل کے سوا اور کوئی چیز نہیں پہچان سکتی اور ایک عالم ایسا ہے جس کا ادراک علم کے سوا نہیں ہو سکتا۔ ایک عالم وہ بھی ہے جسے عشق کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔"

آپ نے ۲۰۔ رجب ۹۴۴ھ کو وفات پائی۔

[2] شیخ محمد مودود لاریؒ ماہر علم توحید اور رند مشرب تجرد و تفرید تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کو کیمیا اور بعض دیگر عجیب و غریب علوم میں دسترس تھی۔ مدت تک آگرہ میں رہے، پھر پانی پت چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔

اس کے متعلقین تک تجاوز کر جائے۔ پس حبِ الٰہی کے کمال کی علامت یہ ہے کہ ان کے اہل بیت سے محبت کرے۔

آپ فرمایا کرتے تھے، ہر شخص کو کسی نہ کسی چیز میں کشائش دی گئی ہے، ہماری کشائش صوفیہ کی کتابوں میں ہے۔ جو طالب حق آپ کے پاس آتا اُس سے فرماتے کہ پڑھو کیونکہ ہمارا طریق یہی ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے عوام الناس آپ کے پاس کم آتے تھے اور آپ کی کوئی خانقاہ بھی نہ تھی۔

طالبوں کو عشقِ صورت سے منع فرمایا کرتے تھے۔ آپ کا ارشاد تھا کہ اس کام میں مبتلا ہونا مبتدی کو اصل کام سے باز رکھتا ہے۔ آپ اپنے پاس کھانا پینے کا سامان اور دوسرا اسباب ضرورت نہ رکھتے تھے۔ اکثر واسطوں سے رابطہ تھا۔ مشرب قلندریہ دو واسطوں سے شاہ نعمت اللہ ولی تک پہنچتے ہیں۔

آپ کی وفات ۱۳ ربیع الثانی ۹۵۷ھ کو ہوئی۔ پانی پت میں مدفون ہوئے۔

حضرت خواجہ مولانا درویش محمدؒ

وفات ــــــــــ اسفرار ماوراء النہر ۹۷۰ھ

خواجہ خواجگان حضرت مولانا درویش محمد رحمۃ اللہ علیہ بڑے عابد و زاہد، صاحب ذکر و فکر اور کشف و کرامات میں ممتاز درجہ رکھتے تھے، تجربہ و تطہیر اور ارشاد و ہدایت میں بہت شہرت تھی۔

۱۹ محرم الحرام ۹۷۰ھ میں وفات پائی۔ مزار پُر انوار موضع اسفرار میں ہے جو ملک ماوراء النہر میں شہر سبز کے مضافات میں واقع ہے۔ مولانا محمد زاہد وخشی کے مرید اور خلیفہ تھے۔

پیر و مرشد کی بیعت سے قبل ہر وقت عبادت اور ریاضت میں مصروف رہتے، جنگلوں اور ویرانوں میں گھومتے، کھانے پینے کی مطلق خیال نہ ہوتا تھا۔ کئی کئی دن فاقوں سے گذر جاتے۔

ایک دن بھوک نے سخت غلبہ کیا تو پریشان ہو گئے، مگر اس شدید پریشانی میں بھی زبردست صبر کا ثبوت دیا، چنانچہ انوار باطنی سے آپ کا دل روشن ہو گیا۔ کسب کمال کے لیے مولانا محمد زاہد کی خدمت میں حاضر ہوتے اور تکمیل مراتب کو پہنچے۔ اگرچہ خوارق و کرامات سے متصف تھے مگر آپ ان کے اظہار سے ہمیشہ اجتناب کرتے تھے، اور کبھی خوش نہ ہوتے تھے۔ مریدین کی تعلیم و تربیت اور ان کی روحانی ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ بے شمار مخلوق نے آپ سے کسب فیض کیا۔

جذب و استغراق، شوق و ذوق میں درجہ کمال اور اس طائفہ عالیہ کے حالات و مقامات میں کامل بہرہ تھا۔ گمنام زندگی بسر کرنے کی عادت تھی۔ اپنا حال لوگوں سے ہمیشہ پوشیدہ رکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

آپ کے فرزند مولانا خواجگی امکنگی بیان کرتے ہیں کہ میرے والد بزرگوار کی شہرت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک روز ایک درویش نے ان کے سامنے شیخ نورالدین خوافی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ بہت بڑے بزرگ ہیں، اگر اس طرف ان کے آنے کا اتفاق ہو تو آپ ان سے ضرور ملنا۔

اس بات کو تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ شیخ نورالدین کا اس طرف سے گذر ہوا۔ میرے والد کو ان کے آنے کی اطلاع ملی تو میلے کچیلے کپڑے جو وہ پہنے ہوئے تھے انہیں میں باہر نکلے۔ کچھ ہدیہ ساتھ لیے اور شیخ کی ملاقات کو پہنچ گئے۔

جب شیخ کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے میرے والد کے ساتھ بڑی گرمجوشی سے معانقہ کیا۔ دیر تک دونوں مراقبہ میں بیٹھے جب میرے والد ان سے مل کر رخصت ہونے لگے تو شیخ چند قدم ان کے ساتھ گئے اور رخصت کر کے چلے گئے۔

والد بزرگوار کے چلے جانے کے بعد حضرت شیخ نے لوگوں سے کہا کہ اس علاقے کے طالبانِ حق مولانا درویش محمد کی خدمت

میں آتے جاتے ہوں گے۔ لوگوں نے کہا یہ شیخ نہیں ہیں بلکہ قرآن پڑھایا کرتے ہیں۔

شیخ نورالدین یہ سُن کر بولے، سبحان اللہ! یہاں کے لوگ بھی عجیب نابینا اور مردہ ہیں کہ ایسے کامل شخص سے استفادہ نہیں کرتے۔

شیخ کی یہ بات لوگوں میں مشہور ہو گئی اور لوگ جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کسب فیض کرنے لگے مگر میرے والد لوگوں کی آمد و رفت سے پریشان ہی رہتے تھے۔

مولانا خواجگی امکنگی حضرت مولانا درویش محمد کے فرزند ان کے مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ موضع امکنگ کے رہنے والے تھے جو مضافات سمرقند میں واقع ہے۔ ۹۱۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۲ شعبان ۱۰۰۸ھ میں فوت ہوئے۔ آپ کا مزار پر انوار امکنگ میں ہے۔

مولانا امکنگی بڑے عابد و زاہد اور صاحب ذکر و فکر و بزرگ حالات و کشف و کرامات تھے۔ اپنے والد بزرگوار کی طرح وہ بھی لوگوں سے چھپ کر ذکر و فکر میں مصروف رہتے تھے اور اخفائے حال کو پسند فرماتے تھے۔ تیس سال تک اپنے والد بزرگوار کی مسند پر متمکن اور خلق خدا کی رشد و ہدایت میں سرگرم رہے۔ آپ کی خوارق و کرامات بہت مشہور ہیں۔ امرا اور فقرا علما و صلحا آپ کی خدمت میں کسب فیض کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے۔ بادشاہ بھی آپ کی درگاہ عالیہ پر حاضر ہو کر قدم بوسی کا شرف حاصل کیا کرتے تھے۔ تواضع اور مہمان نوازی میں آپ بے مثل تھے۔ بڑھاپے میں اگرچہ ہاتھ کانپتے تھے تاہم مہمانوں کے لیے خود کھانا لے کر لاتے اور ان کے سامنے پیش کرتے۔ خادموں سے یہ کام نہ لیتے تھے۔

ایک مرتبہ کچھ لوگ آپ کی آزمائش اور امتحان کے ارادہ سے آئے۔ پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتے آپ نے خود ہی ان کے دلی خیالات ان کے سامنے بیان کر دیے۔ فرمایا اس گروہ کا حال مختلف ہے۔ ان کی آزمائش کی غرض سے نہیں آنا چاہیے تاکہ فاسد خیالات کی وجہ سے ان کی برکات سے محرومی نہ ہو بلکہ جب ان کے پاس آئیں خالصاً للہ آئیں تاکہ کچھ فیض حاصل ہو سکے۔

اپنی وفات کے قریب آپ نے ایک خط اپنے خلیفہ خواجہ باقی باللہ کو لکھا جس کے آخر میں یہ اشعار لکھے۔

زمان تا زماں رگ یاد آیدم ندانم کنوں تا چہ پیش آیدم
جدائی مبادا مرا از خدا دگر ہر چہ پیش آیدم شایدم

حضرت شیخ داؤد کرمانیؒ

ولادت ــــــــ ـــ علاقہ ملتان

وفات ــــــــ شیر گڑھ ۹۸۲ھ

شیخ داؤد کرمانی خطۂ پنجاب کے ان اولیائے کرام اور صوفیہ عظام میں سے ہیں جنھوں نے اس سرزمین کو انوار باطنی سے منور کیا اور شریعت و طریقت کی ترویج فرمائی۔ آپ کے سن ولادت کا علم نہیں ہو سکا۔ آپ کی نسبت چند واسطوں سے امام موسی کاظمؓ تک اس طرح پہنچتی ہے،

سید داؤد کرمانی بن سید فتح اللہ کرمانی بن سید مبارک بن سید فیض اللہ باقی بن سید صفی الدین آدم کرمانی بن سید تقی الدین احمد بن سید عبدالمجید بن سید عبدالحفیظ بن سید عبدالرشید بن سید ابوالمقائم بن سید ابوالمکارم بن سید ابوالمحاسن بن سید ابوالفیض بن سید ابوالمفضل بن سید عبدالباقی بن ابوالمعالی محمد بن سید ابوالواہب بن سید ابوالحیات بن سید ماہ بن سید شاہ محمد میر بن سید مسعود بن سید محمود بن سید ابوالاحد بن سید داؤد بن سید ابوابراہیم اسماعیل بن سید محمد بن موسیٰ مبرقع بن امام موسیٰ کاظمؓ

ابتدائی حالات | حضرت شیخ داؤد کرمانی کے بزرگ عرب سے ہندوستان آئے تھے اور ملتان کے قریب کسی جگہ سکونت اختیار کرلی تھی۔ شیخ داؤد ایام شیرخوارگی ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ ان دنوں لاہور میں مشہور شاعر اور عالم مولانا جامی کے ایک شاگرد مولانا اسمٰعیل رہتے تھے۔ شیخ داؤد نے علوم ظاہری میں ان سے تربیت حاصل کی، پھر جلد ہی علوم باطنی کی طرف مائل ہو گئے چنانچہ حضرت غوث اعظمؒ سے اویسی طریقے سے تربیت پائی۔

بیعت | قادریہ سلسلہ کے مشہور عالم شیخ عبدالقادر ثانی (وفات ۱۰۴۰ھ) کے پوتے سید حامد سے جو حامد گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں، بیعت کی اور ان کے مریدوں میں شامل ہو گئے۔

؎ خواجہ یعقوب چرخی بڑے عالی بزرگ اور اولیاء اللہ تھے۔ غزنی کے قریب موضع چرخ کے رہنے والے تھے۔ غزنی میں پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار کا نام عثمان بن محمود الغزنوی تھا جو شیخ بہاؤالدین نقشبند کے اصحاب میں سے تھے۔ شیخ بہاؤالدین نے آپ کو خواجہ علاؤالدین عطار کے سپرد کیا تھا۔ انہیں کے منظر کرم سے درجہ کمال کو پہنچے۔ علوم ظاہری و باطنی اور رموز صوری و معنوی کے جامع تھے۔ بڑے زبردست محقق و مفسر تھے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ میں بڑی دسترس حاصل تھی۔ آپ نے قرآن کریم کے آخری دو پاروں کی تفسیر مرتب فرمائی جو رموز تصوف سے بھری ہے۔ آپ نے ۵ صفر بروز شنبہ وفات پائی۔ مزار پُرانوار ہلغتون میں ہے جو ملک خراسان میں حصار کے علاقہ کا ایک مقام ہے۔

عبادت و ریاضت | عبادت و ریاضت میں بہت مصروف رہنے لگے۔ بڑی بڑی ریاضتیں کیں۔ تن تنہا جنگل میں پھرتے رہتے۔ خاص وقت اسی طرح گزری پھر شیر گڑھ میں سکونت اختیار کرلی۔

بزرگی اور کرامت | آپ بڑے باکمال اور با کرامت بزرگ تھے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اس زمانے کے مشہور چشتی بزرگ شیخ قطب عالم کا ایک بیان نقل کیا ہے کہ جب میں (شیخ قطب عالم) شیخ داؤد کی خدمت میں پہنچا تو خیال گزرا کہ کہیں آپ مہدوی[۱] نہ ہوں۔ ادھر میرے دل میں یہ خیال گزرا ادھر شیخ نے میرے اظہار کے بغیر فرمایا کہ "مہدوی فرقہ گمراہ ہے اور ان کے پاس اپنے طریقے کی کوئی سند نہیں"۔

آپ بڑے پابند شریعت تھے۔ قرآن اور حدیث کے خلاف کوئی کام نہ کرتے تھے۔ آپ کی روحانیت اور تقدس کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔

اکبر کا نامہ و پیام | ایک مرتبہ شہنشاہ اکبر نے شہباز خان کو بھیج کر انھیں اپنی خدمت میں طلب کیا، لیکن آپ نے کہلا بھیجا کہ میں یہیں بیٹھا تمھیں غائبانہ دعا دیتا ہوں؛ میں یہی کچھ کرسکتا ہوں۔

تبلیغی کام | اگرچہ آپ کے ملفوظات اور تذکروں میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو کہ آپ نے اشاعت اسلام کے سلسلہ میں کوئی باقاعدہ اور باضابطہ کام کیا ہو تاہم اسے آپ کی روحانی عظمت سمجھیے کہ روزانہ پچاسوں کی تعداد میں غیر مسلم اپنے کنبے سمیت حاضر خدمت ہو کر مشرف بہ اسلام ہوتے تھے[۳]

مشہور مؤرخ بدایونی کی ملاقات | مشہور مؤرخ شیخ عبدالقادر بدایونی نے شیر گڑھ جا کر آپ سے ملاقات کی، وہ تین چار روز آپ کے پاس رہا[۲]۔ پھر اپنے تذکروں میں حضرت کے متعلق اس نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی آپ کی عظمت اور بزرگی کا قائل تھا اور آپ کے تقدس سے بہت متاثر ہوا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ گفتگو کے وقت شیخ کے چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک اور نور نظر آتا تھا۔ بدایونی نے آپ کے چہرے کے جمال و جلال کی بھی بہت تعریف کی ہے۔

وفات | آپ کی وفات ۹۸۲ھ میں ہوئی اور شیر گڑھ میں دفن ہوئے جو ضلع منٹگمری کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے جانشین شیخ ابوالمعالی قادری لاہوری (وفات ۱۰۲۴ھ) نے جو صاحب تصنیف بزرگ گزرے ہیں پنجاب میں قادریہ سلسلے کا فیض گھر گھر پہنچایا۔

---

۱ مہدوی سے مراد وہ لوگ ہیں جو سید محمد جونپوری کے پیرو تھے۔ سید محمد جونپوری ۸۴۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ظاہری اور باطنی علوم میں یگانۂ زمانہ تھے۔ حج کرنے گئے تو مکہ معظمہ میں مہدویت کا دعویٰ کیا۔ پھر احمد آباد گجرات واپس آئے تو یہاں بھی مہدویت کا دعویٰ کیا اور کہا کہ جو میرے دعوے پر ایمان نہ لائے وہ کافر ہے۔ چنانچہ ان کے لیے قتل کا فتویٰ دیا گیا اور تنگ آکر وہ چلے گئے یہاں بھی علماء نے ان کی مخالفت کی پھر خراسان کے شہر فراہ کی طرف چلے گئے اور وہیں ۹۱۰ھ میں وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد کئی با اثر اور مشہور علماء نے مہدوی طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ تھا کہ مہدوی ہر وقت قیامت کے انتظار میں رہتے تھے۔ دنیا کی پائداری پر اعتماد نہ رکھتے تھے چنانچہ بہت سے لوگ اپنا تمام دنیوی مال و سامان فقرا میں بانٹ کر توکل کی زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ شرع کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ خلاف شرع امور کو روکنے میں کسی جابر سے جابر حاکم کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔

۱ ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان۔ ۲ حضرت نے اپنی کلاہ بھی بدایونی کو عنایت کی تھی۔ ۳ خزینۃ الاصفیاء (جلد اول)

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ

ولادت ——————— ۸۶۱ھ

وفات ——— گنگوہ ۹۴۵ھ

یہ حضرت محتشانِ روزگار و عارفانِ صاحبِ اسرار میں سے تھے۔ نیز صاحبِ کرامت و خوارق تھے۔ اوّل خرقۂ درویشی اپنے پیر شیخ محمد صاحب صابر سے حاصل کیا۔ بعدہٗ شیخ الاسلام شیخ درویش محمد بن قاسم اودھی سے خرقۂ خلافت پہنچا اور سلسلۂ مدارسیہ سہروردیہ اور نظامیہ میں اجازت یافتہ ہوئے۔ نظامیہ سلسلہ تین طرح پر عطا ہوا۔ ایک شیخ صدرالدین طبیب سے مل کر حضرت سلطان جی سے ملتا ہے۔ دوسرے سید محمد گیسو دراز سے مل کر شیخ نصیرالدین چراغ دہلی سے ملتا ہے۔ تیسرا مخدوم جہانیاں سے مل کر مخدوم نصیرالدین چراغ دہلی سے ملتا ہے۔

صاحب مرآۃ الاسرار فرماتے ہیں کہ شیخ صفی الدین حنفی جد شیخ عبدالقدوسؒ میر سید اشرف سمنانیؒ کے مرید تھے۔ قیام ان کا ردولی میں تھا۔ ایک بار سید صاحب کچھوچھے تشریف لائے۔ آپ نے ان کو پیار کیا اور فرمایا کہ یہ بھی میرا مرید ہے۔ اس کو اللہ تعالےٰ فرزند عطا کرے گا۔ جو قطبِ عالم ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بعد انتقال شیخ احمد عبدالحق کے پیدا ہوئے۔ جب ذرا سیانے ہوئے جاروب کشی روضہ شیخ کا شوق پیدا ہوا۔ ایک روز کتاب کافیہ لیے روضہ کے اندر گئے۔ اندر سے حق حق کی آواز آئی اور ایسی کیفیت پیش آئی کہ بے ہوش ہو گئے۔ زیارت روضہ روحانیت حضرت سے مشرف ہوئے۔ فرمان ہوا کہ مطالعہ علم ظاہری حجاب اکبر ہے۔ اس روز سے پڑھنا لکھنا چھوڑ کر کارِ باطنی میں مشغول ہوئے۔ تمام شب اطاعتِ حق میں بسر کرتے اگر کبھی نیند آ بھی جاتی تو شیخ کھڑے ہو کے جگاتے معلوم ہوتے اور دن کو شیخ پیارہ سے صحبت رہتی۔ لطائف قدسی میں لکھا ہے کہ جب قصبہ اپنے دادا بھائی شیخ فخرالدین کا سنا۔ پچاس برس انھوں نے پانی نہیں پیا۔ آپ نے بھی پانی پینا ترک کر دیا۔ اور خورد سالی میں یہ کیفیت تھی کہ اوّل وقت نماز کے مسجد میں جا کر اوّل صف میں بیٹھتے۔ جوں جوں نمازی آتے جاتے آپ پیچھے ہٹتے جاتے تھے، یہاں تک کہ سب سے پیچھے ہو جاتے بعد فراغ نماز کے نمازیوں کی جوتیاں سیدھی کر کے رکھتے۔ سبحان اللہ کیا انکسار تھا۔ لطائف قدسی سے نقل ہے کہ جب آپ نے پڑھنا ترک کیا تو آپ کے والد نے آپ کے ماموں قاضی دانیال سے کہا کہ بھانجے کی خبر لے اس نے پڑھنا بالکل چھوڑ دیا۔ انھوں نے کئی بار بہت تاکید کی اسی عرصہ میں ڈوم میراثی دائرہ لیے گاتی نکلی۔ اس پر آپ کو وجد ہوا۔ انھوں نے یہ کیفیت دیکھ کر آپ کے والد سے کہا کہ کچھ اندیشہ نہ کرو، یہ نیک ہوگا اس کو معلم دوسری طرح کا چاہیے کہ جو علم باطن پڑھاوے۔ اس وقت مخدوم شیخ خواجگی کہ خلیفہ شیخ سید عالم کے تھے اور وہ خلیفہ شیخ شمس الدین اودھی کے اور وہ خلیفہ میر سید اشرف سمنانی کے تھے اور ساڈھورہ میں مقیم

تھے۔ آپ اُن کی خدمت میں سادھو ہو آئے اور کہا میں نے علم نہیں پڑھا۔ شیخ نے فرمایا کہ شغلِ باطن کر، جب علم اصول آگیا فروعات کیا چیز ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جس قسم کا مسئلہ حضرت کے روبرو پیش ہوتا کہ آپ اس کو حل فرماتے۔ لطائف قدسیہ سے نقل ہے کہ حضرت کے مجاہدہ اور ریاضت کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ اکل و شرب مطلق چھوٹ گیا تھا اور آتشِ روحانی میں ایسے افروختہ ہوئے تھے کہ سانس سے بوئے کباب آتی تھی۔ کبھی سانس میں سے عود و عنبر کی خوشبو آتی تھی۔ یعنی عشقِ الٰہی میں اپنے کو سوختہ کر دیا تھا جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

تا نسوزد بر نیاید بوئے خود   ورنہ او ہم چوب مثل دیگر است

اور سر اور کاکل میں سے دھواں اٹھتا معلوم ہوتا تھا۔ جب شیخ محمد صاحب کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ یہ آتشِ عشق اور مجاہدہ میں جل چکا ہے ارشاد فرمایا کہ اس کے سر پر باسی پانی روز ڈالا کریں اور کثرتِ درود شریف کے واسطے حکم دیا کہ ترویحِ قلب ہو۔ اوّل اوّل آپ کو خلق سے نہایت نفور تھا۔ مرشد کے گھر کے کاروبار تمام بجالاتے تھے اور ہمیشہ پوشاک درویشی زیب تن رکھتے۔ ایک بار شیخ خواجگی نے بہت اصرار سے دوسرے کپڑے پہنوا لیے۔ بعد ان کے پھر لباس درویشی اختیار کیا۔ بعد نمازِ عشا کے ذکرِ جہر شروع کر کے صبح کرتے۔ اقتباس الانوار سے روایت ہے کہ جس وقت حضرت گنگوہ میں آئے وہاں ایک سنیاسی کا مٹھ نہایت دلکشا تھا، آپ کو پسند آیا، چاہا کہ اسی جگہ قیام ہو۔ اندر اس کے جا کر چیلوں سے پوچھا کہ گورو جی کہاں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک برس گذرا کہ گپھا میں ہیں فقط ایک روزن دیوار میں ہوا کے واسطے رکھا ہے کسی کی مجال نہیں کہ ان کے پاس جا سکے۔ الغرض اس روزن کو معلوم فرما کر قریب اس کے بیٹھ کر مراقبہ فرمایا۔ روحانیت کی صفت نے جسدِ مبارک پر غلبہ پایا اور روزن کی طرف توجہ کی، چنانچہ جسد رنگِ لطافت پر آیا۔ اس روزن سے گزر کر گپھا کے اندر آئے دیکھا کہ فقیر حبسِ دم کیے ہوئے اپنے کام میں مشغول ہے۔ پھر مراقبہ فرما کر اپنی رُوح سے اس کی روح کو حرکت دی، معاً ہوشیار ہوا اور حضرت سے پوچھا کہ تو کون ہے اور یہاں کیونکر آیا؟ آپ نے فرمایا کہ میں خدا کا بندہ ہوں اور اسی کی قدرت سے یہاں آگیا، مگر تُو نے اپنا کام کہاں تک پہنچایا۔ اس نے جواب دیا کہ دیکھو ابھی پانی ہوا جاتا ہوں، اور پانی ہو گیا۔ حضرت نے اس پانی میں قدرے پارچہ تر کر لیا۔ جب وہ ہیئتِ اصلی پر ہوا آپ نے فرمایا کہ میں بھی پانی ہوتا ہوں تو اس میں کپڑا تر کر لیجیو۔ چنانچہ جب حضرت پانی ہوئے اُس نے بھی کپڑا تر کیا۔ جب آپ ہیئتِ اصلی پر آئے اور فرمایا کہ اپنے پارچہ اور میرے پارچہ کو سونگھو۔ پہلے اُس نے اپنے پانی کا پارچہ سونگھا جس سے دماغ اس کا پریشان ہوا، پھر حضرت کے پانی کے پارچہ کو سونگھا، دماغ معطر ہو گیا۔ اسی وقت معتقد ہوا اور کہا کہ میں تو اپنے فن میں کامل ہوں مگر تم بھی کامل نکلے۔ البتہ بدبو اور خوشبو کا تفاوت رہا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ خوشبو اسلام کی ہے اور وہ بدبو کفر کی تھی۔ اس فقیر نے کہا کہ مجھ کو بھی اسلام سے مشرف کیجیے۔ آپ نے اس کو کلمہ پڑھایا اور وہ صدقِ دل سے مسلمان ہوا اور حضرت سے بیعت کی۔ اس جوگی کو بعد تکمیل مذہب مع اس کے چیلوں کے برائے ہدایتِ خلق مقرر فرمایا۔ روضۂ حضرت کا اور آبادی آپ کی اولاد کی اسی فقیر کی جگہ ہے۔ وہ اب سرائے شیخ مشہور ہے۔ لکھا ہے کہ شیخ حمید الدین صاحبزادہ کلاں رودولی میں تولد ہوئے۔ ان کی گیارہ برس کی عمر تھی کہ شاہ آباد میں آئے وہاں شیخ رکن الدین مصنف

لطائف قدسی پیدا ہوئے، وہ لکھتے ہیں کہ ایک بار میں نے برائے تعلیم عرض کیا۔ کچھ تلقین نہ فرمایا۔ میں نے بے اجازت کتب خانہ سے ایک کتاب نکالی اور اس کی تحریر کے موافق نماز چاشت اور اشراق ادا کرنے لگا۔ جب میں حاضر خدمت ہوا فرمایا کہ ابھی مشغول رہو ذکر جو میں کہوں اسی طرح مشغول ہو۔ سبحان اللہ کیا کشف باطن تھا۔

ایک بار حضرت نے خود فرمایا کہ میرا ارادہ خلق میں مخلوط ہونے کا نہ تھا بلکہ ارادہ تھا کہ پہاڑوں میں عمر بسر کروں مگر مجبور ہوا کہ مشائخ وقت نے حیات میں بکوشش تمام خرقہ خلافت دے کر مجھ فقیر کو سجادہ پر بٹھایا۔ خاص کر روح حضرت شیخ احمد عبدالحق روحانیت حضرت سلطان المشائخ و حضرت گنج شکر و دیگر مشائخان قدس اللہ اسرارہم نے بجبر اس فقیر کو سجادہ پر بٹھایا۔ خلق اللہ کو رجوع ہوئی۔ لطائف قدسی سے نقل ہے کہ انتقال سے تین برس پہلے آپ خاموش ہو گئے تھے۔ ہمیشہ احدیت میں مستغرق رہتے تھے۔ کسی سے بات نہ کرتے تھے۔ شیخ احمد نے ایک روز عرض کیا۔ سکوت کس وجہ سے ہے۔ فرمایا کہ وجود میرا سراسر ذکر ہو گیا ہے۔ ہر وقت عالم فنا کی موجیں آتی ہیں اور غرق کر کے شہود حق میں لے جاتی ہیں۔ اس طرف آنے نہیں دیتیں۔ لکھا ہے کہ

۱۵۔ جمادی الآخر روز دوشنبہ کو عرس مخدوم شیخ احمد عبدالحق تھا اسی روز حضرت کو تپ لرزہ آیا اور روز جمعہ کو پانچواں روز تھا قدرے صحت ہوئی، نماز جمعہ ادا کی۔ بعد نماز کے پھر تپ شروع ہوا اور چار روز اور تپ آیا۔ بروز سہ شنبہ وقت نماز چاشت ۲۲ ماہ جمادی الآخر ۹۴۵ھ میں رحلت فرمائی۔ مزار گنگوہ شریف میں فیض بخش عالم ہے۔ شیخ رکن الدین فرماتے ہیں، تادم مرگ عبادت میں فرق نہیں آیا، قبل از انتقال تجدید وضو کیا اور دوگانہ ادا کر کے بے ہوش ہوئے اور حق حق کہتے ہوئے انتقال کیا۔ عمر شریف ۹۴ برس کی ہوئی، جس میں ۳۵ برس ردولی میں مجاہدہ اور ریاضت میں مشغول رہے۔ ۲۵ سال شاہ آباد میں قیام فرمایا اور ۳۴ سال گنگوہ میں بسر فرمائے۔

شیخ رکن الدین کہتے ہیں جب کفن پہنا چکے میں نے سینہ مبارک پر ہاتھ رکھا تو قلب کو حرکت تھی، ذکر جاری تھا۔ آپ کے سات لڑکے تھے، سب کے سب عالم اور عارف ہوئے۔

کیفیت شیخ عبدالکبیر پسر تذکرہ بالا کی یہ ہے کہ آپ مرید و فرزند شیخ عبدالقدوس کے تھے۔ ذوق اور شوق، سخاوت اور شجاعت، خوارق و کرامت میں بے مثل تھے۔ ایک بار سلطان وقت آپ کی زیارت کو چلا دو وزیر اس کے ہمراہ تھے۔ تینوں نے اپنے واسطے ایک ایک کھانا مقرر کیا کہ اگر ہم کو ہماری خواہش کے موافق شیخ نے کھانا دیا تو ضرور شیخ اہل کمال ہیں۔ جب بادشاہ نزدیک آیا، حضرت نے بریوں کے گوشت کے بھرے ہوئے سموسے سلطان کے روبرو رکھے۔ تاج بخش میاں بڈھے کے آگے۔ ملک محمد کے آگے حلوہ رکھا۔ یہ کشف دیکھ کر تینوں صاحب حیران رہے۔ آپ نے فرمایا کہ یارو! کیا حیرت کی بات ہے خداوند تعالیٰ اپنے دوستوں کو اہل دنیا کے سامنے شرمندہ نہیں کرتا، جو چاہتے ہیں مرحمت فرما دیتا ہے۔

بعد وفات والد دو برس زندہ رہے۔ ۹۴۷ھ میں وفات پائی اور ایک کتاب کے حاشیہ پر لکھا دیکھا ہے کہ آپ کے پانچ سو خلیفہ ہوئے مگر جو صاحب ارشاد اور مشہور ہوئے ہیں اوّل شیخ جلال الدین محمود الفاروق تھانیسری۔ ان کا ذکر آگے آئے گا۔

دوسرے شیخ عبدالغفور اعظم پوری عالم اور کامل سیاح تھے اور مرید اپنے نانا کے بھی تھے۔

ایک بار آپ کو جن اٹھا کر لے گئے۔ ایک مدت ان کے ملک میں رہے، ان کی زبان کے ماہر تھے۔ ان کے ملک کی کیفیت بیان فرمایا کرتے تھے، مگر بوجہ اختلاف آب و ہوا کے ہیئت میں کسی قدر فرق آگیا تھا۔ ہندوستانی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ شیخ ہمارے قبیلہ سے تھے۔

وفات حضرت کی سنہ ۹۹۰ھ میں ہوئی اور یہ بھی لکھا ہے کہ رسول مقبولؐ نے آپ کو بحالت خواب یہ درود تعلیم فرمایا تھا: اللھم صل علی محمد و الہ بعدد اسمائک الحسنیٰ اور ان کے خلفا سے چند صاحب باکمال ہوئے ہیں۔ شیخ ابو اسحاق فرزند شیخ عبدالغفور و بندگی شیخ احمد و میر سید علاؤ الدین ساکن کنانہ۔ جب ان کا انتقال ہوا ہے تو مزار میں سے تین بار کلمۂ حق کی آواز آئی اور ایک شعلۂ نور سرہانے سے ایک پائنتی سے پیدا ہو کر دونوں باہم مل کر قبر میں سما گئے۔ تیسرے خلیفہ شیخ عبدالقدوس کے شیخ ابوالنور باف سہارنپور کے درویش کامل گزرے ہیں۔ ایک بار ان کو جنون ہو گیا تھا۔ اس حالت میں غیب کی باتیں کہتے تھے۔ حضرت نے ان سے آگاہ ہو ایک تعویذ مرحمت فرمایا۔ اس کے باندھتے ہی اچھے ہوئے، اور جو غیب کی باتیں کرتے تھے ان کا مشاہدہ ہونے لگا۔ چوتھے شیخ بہرو کہ پہلے یہ دائم الخمر تھے۔ جب جذبۂ الٰہی دامنگیر ہوا، ایک روز حضرت سے ملے، روئے مبارک پہ نظر پڑتے ہی توبہ کی اور مرید ہو کر کار فقر کو انجام پہنچا کر اولیا ہوئے۔ پانچویں خلیفہ حضرت کے شیخ بہاؤ الدین کہ اعلیٰ درجہ کے پیر دست تھے۔ چھٹے خلیفہ شیخ عبدالستار سہارن پوری۔ ساتویں خلیفہ شیخ عبدالاحد پدر شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہندی آٹھویں خلیفہ میر سید رفیع الدین اکبرآبادی۔ نویں خلیفہ شیخ عبدالرحمٰن، اکثر مکتوب ان کے نام صادر ہوئے۔ دسویں شیخ عبدالنبی اور از روئے تحریر تذکرۃ العارفین ہمایوں بادشاہ نے دوسرے جشن جلوس میں حضرت سے بیعت کی۔ گیارھویں بندگی شیخ جامن مسطور کہ مقرب بارگاہ مرشد تھے اور آپ کو مقام فنا فی الرسول حاصل تھا۔ یہ ہمدم شیخ عبدالقدوس سرہٗ کے اور محرم اسرار تھے۔ حضرت کی اکثر روایات آپ سے سند ہوئی ہیں۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی شیخ محمد ردولویؒ کے عزیز ترین مرید اور خلیفہ تھے۔ وہ صابریہ سلسلہ کے پہلے بزرگ ہیں جن کے حالات معاصر تذکروں اور تاریخوں میں ملتے ہیں۔ جو شہرت اور عظمت ان کو حاصل ہوئی وہ اس سے پہلے صابریہ سلسلہ کے کسی بزرگ کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔

شیخ عبدالقدوسؒ ابتدائے حال میں ردولی میں مقیم رہے۔ سنہ ۱۴۹۱ء میں ردولی کے حالات خراب ہو گئے[1] اور وہ ترک وطن کر کے شاہ آباد آ گئے۔ جہاں ۳۰ سال تک انھوں نے ارشاد و تلقین کا ہنگامہ برپا رکھا۔ آخری عمر میں گنگوہ (ضلع سہارنپور) تشریف لے گئے اور وہیں سنہ ۱۵۳۷ء میں وفات پائی۔

---

[1] لطائف قدسی میں لکھا ہے: طرف ہندوستان غلبۂ کافراں بود۔ در پرگنہ ردولی عمل کافراں شدہ شعائر اسلام مندرس شدند۔ در بلاد گوشت بخلق فرو نمی شد۔ حضرت قطبی دلگیر شدہ بیروں آمدند۔ "مطبع مجتبائی دہلی سنہ ۱۳۱۱ھ"

جن حالات و گرد و پیش میں شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کو سلسلہ کی تبلیغ و اشاعت کا کام کرنا پڑا، وہ بڑے ہوشربا تھے۔ ہندوستان کی سیاسی فضا غیر یقینی تھی۔ مستحکم مرکزی نظام ختم ہو چکا تھا۔ سلطنت دہلی سانس توڑ رہی تھی۔ اس کا سیاسی اور سماجی ڈھانچہ بکھر چکا تھا۔ صوبوں میں خود مختار حکومتیں تھیں اور دارالسلطنت کے چاروں طرف ہنگامہ آرائی اور فتنہ و فساد۔ ہندوستان کی ان تمام سیاسی طاقتوں میں جو اس وقت اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے کوشاں تھیں، راجپوت سب سے زیادہ منظم اور سیاسی بصیرت رکھنے والے تھے۔ پروفیسر رشبورک ولیمس نے لکھا ہے کہ اگر بابر ہندوستان نہ آتا تو راجپوت یقیناً اپنا اقتدار قائم کر لیتے[1]۔ چندیری، مانڈو، اجمیر، رودولی وغیرہ مقامات پر حالات ایسے نازک ہو گئے تھے کہ مسلمان ان علاقوں کو خیرباد کہہ کر دوسری جگہ بسنے لگے تھے۔ ان حالات گرد و پیش میں سانس لینے والے بزرگ کا سیاست سے علیحدہ رہنا ممکن نہ تھا۔ سیاست اور سلاطین سے علیحدہ بھی اسی وقت رہا جا سکتا ہے جب کم از کم سماجی توازن تو درست ہو۔ سماجی انتشار کی صورت میں سیاست سے بچنا تقریباً ناممکن تھا۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ ابتدائے حال میں مشائخ چشت کے قدیم اصول کے مطابق سیاست و سلطان سے علیحدہ رہتے تھے۔ چنانچہ لطائف قدوسی میں ایک واقعہ لکھا ہے:

> "قاضی محمود تھانیسری داماد و غیرہ ردولی بود۔ جہان بصحبت ملاقات می آید حضرت قطبی گریختہ در ویرانے می رفتند کہ تبری از اہل دنیا بر کمال بود۔ اختلاط با ایشاں از سر قاتل می دانستند و می فرمودند کہ از اہل دنیا بوئے کریہ می آید لاچار می گریزم[2]"

لیکن بعد کو انھیں سیاست میں حصہ لینا پڑا اور سلاطین سے ربط پیدا کرنا پڑا[3]۔ ایک طویل مکتوب[4] میں انھوں نے سکندر لودھی کو غم خواری خلق بالخصوص امرا و علماء کی تیمارداری پر خاص طور سے توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ حالات کی بہت کچھ درستگی ان کے ذریعے ممکن ہے۔ کچھ عرصہ بعد جب بابر کا تسلط ہو گیا تو انھوں نے مغل شہنشاہ کو بھی خط لکھا اور ہدایت کی۔

> "بایدو بسزد کہ برائے شکر نعمت منعم سایہ عادل بر عالمیان چناں گسترند کہ ہیچ کس بر ہیچ کس ظلم نکنند و ہمہ خلق و ہمہ سپاہ با وامر و نواہی شرع مستقیم و مستدیم بودہ نماز با جماعت بگذارند و علم علماء را دوست و ند با ناز ہر شہرے محتسباں بگذرند تا شہر و بازار را بجمال عدل شرع محمدی بیارا نید و رونق دہند و معمور گردانید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چنانکہ در عہد سلف و خلفائے

---

[1] ملاحظہ ہو: AN EMPIRE BUILDER OF INDIA IN THE SIXTEENTH CENTURY R. WILLIAMS
باب اول:

[2] لطائف قدوسی ص ۱۹، ۱۸ [3] آئین اکبری (ص ۲۰۲ مرتبہ سرسید احمد خاں) میں لکھا ہے: "وانش صوری و معنوی اندوخت و در ایزدی پرستاں والا پایہ شد، فراواں حقائق از وہ برگزیدہ جنت آشیانی بابری کار آگہاں بزاو بیرا اور رشد و انجمن آگہی گرمے پذیرفتہ"۔ نیز ملاحظہ ہو گلزار ابرار ص ۲۴۳۔

[4] مکتوبات قدوسی (مطبع احمدی دہلی) مکتوب ۱۲۳ ص ۴۴، ۴۶

راشدین با جمیع شرائط بے شبہ بود[1]"

افغانوں اور مغلوں سے ان کے تعلقات پر تفصیلی بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے معاصر تذکروں، ملفوظات، تاریخوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے[2]۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ صاحب علم و فضل بزرگ تھے۔ ان کی تصانیف سے اُن کے مطالعہ کی وسعت اور نگاہ کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے عوارف کی شرح لکھی تھی[3]۔ اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی مشہور تصنیف فصوص الحکم پر حاشیہ تیار کیا تھا[4]۔ ان کی دیگر تصانیف کے نام یہ ہیں:

۱ - رسالہ قدسیہ
۲ - غرائب الفوائد[5]
۳ - رشد نامہ
۴ - مظہر العجائب
۵ - مکتوبات قدسیہ

انھوں نے اپنی تصانیف میں وحدۃ الوجود پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ رشد نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوی پر اچھا عبور رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف میں ہندوی دوہرے بہت کثرت سے ملتے ہیں۔

اتباع شریعت و سنت کا ان کو خاص خیال رہتا تھا۔ شیخ رکن الدین نے رشد نامہ کے حاشیہ میں لکھا ہے:

"حضرت ایشاں چناں در شرع محمدی و در عقیدہ اہل سنت و جماعت راسخ القدم بودند کہ ذرہ از شرع تجاوز نبود[6]"

ان کے مکتوبات میں بھی اس جذبہ کا جگہ جگہ اظہار ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے بعض امراء کو خاص طور سے اتباع شریعت کی تلقین ہے۔ خواص خاں، ہیبت خاں، شیروانی، ابراہیم خاں شیروانی، تردی بیگ وغیرہ کے نام ان کے مکتوبات بہت اہم ہیں اور اس زمانے کے حالات پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔

---

[1] مکتوبات قدوسی، ص ۳۳۲   [2] اس سلسلہ میں لطائف قدوسی کا مطالعہ خاص طور پر مفید ثابت ہوگا۔

[3] لطائف قدوسی میں لکھا ہے: "اما بعلم لدنی و فیض الٰہی چنداں استعداد بود کہ در ہر علے بحثہا غریب کردند و تصانیف بسیار کردند می فرمود کہ در ابتدائے حال نسخہ عوارف بجہت برکت در حجرہ ما می بود، دراں نسخہ خنداں دخل تمہید عاقبت الامر بکار تا بحد رسید کہ نسخہ عوارف را بشرح عربی کردند و نکات و اسرار غریب نوشتہ چنانچہ مشہور و معروف است" ص ۸۔   [4] گلزار ابرار ص ۲۲۹

[5] مختصر رسالہ ہے مولوی غلام احمد خاں بریاں نے مسلم پریس مجیبر سے شائع کیا تھا۔

[6] رشد نامہ شیخ عبدالقدوسؒ کے ابتدائی اردو کی تصنیف ہے۔ شیخ رکن الدین پسر شیخ نے اس پر ایک حاشیہ لکھا تھا۔

جہاں تک سارے سلسلہ کا تعلق ہے اس کے نظام کو ترتیب دینا اور پھیلانا شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ ہی کا کام تھا۔ مریدوں کی اصلاح و تربیت کی طرف اُن کی خاص توجہ تھی۔ مریدوں کے نام اُن کے یہ خطوط یہ بتاتے ہیں کہ وہ ان کی روحانی تعلیم کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ کسی حال میں ان کی طرف سے غفلت نہ برتی جائے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے تین فرزند تھے: شیخ حمید الدین، شیخ عبدالمجید اور شیخ رکن الدین۔ شیخ رکن الدین کے بیٹے شیخ احمد تھے اور ان کے بیٹے شیخ عبدالنبی جو اکبر کے صدر الصدور بھی رہے تھے۔

حکومتِ وقت سے تعلق صوفیہ کے لیے ہمیشہ ہلاک رہا ہے۔ غالباً اسی بنا پر مشائخ متقدمین نے ہمیشہ اس سے علٰحدہ رہنے کی تلقین کی ہے۔ اگر کوئی بزرگ کسی ضرورت اور مصلحت وقت سے مجبور ہو کر حکومت سے ذرا بھی رابطہ پیدا کر لیتا ہے، تو اس کے بعد اس کے متعلقین اسی میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریاؒ اور شیخ رکن الدین ملتانیؒ نے حکومت سے وابستگی رکھی لیکن اپنے روحانی پروگرام کو نظر انداز نہیں کیا۔ ان کی مثال سے ان کی اولاد نے غلط فائدہ اٹھایا اور سہروردیہ سلسلہ کا سارا نظام درہم برہم کر دیا۔ یہی حال حضرت گنگوہیؒ کی اولاد کا ہوا۔ شیخ عبدالقدوسؒ نے اصلاح و تربیت کی خاطر حکومت سے رابطہ پیدا کیا تھا، اُن کی اولاد نے حُبِ جاہ و زر کی خاطر شاہانِ مغلیہ کے آستانوں پر اپنی جبینوں کو جھکا دیا۔ شیخ عبدالنبی کے حالات عہدِ اکبری کی تاریخوں میں تفصیل سے درج ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حُبِ جاہ و زر نے اُن کے دینی جذبے کو بالکل ختم کر دیا تھا اور وہ مشائخ سلسلہ کے اصولوں کا قطعاً احترام نہ کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ شیخ عبدالقدوسؒ کی اولاد ان کے کام کو جاری نہ رکھ سکی، مگر ان کے کچھ خلفا ایسے عظیم المرتبت اور عالی حوصلہ تھے کہ انھوں نے سلسلہ کی نشر و اشاعت کی طرف خاص توجہ کی۔ شیخ جلال الدین تھانیسری، شیخ عبدالغفور اعظم پوری، شیخ عبدالعزیز گیلانوی، شیخ عبدالاحد سہارنپوری۔ شیخ عبدالاحد پدرِ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ارشاد و تلقین کو اپنی زندگی کا اہم ترین مقصد قرار دے کر سلسلے کے اثرات کو دور دور پھیلا دیا۔

حضرت میاں میر لاہوری قادریؒ

ولادت ———— سہوان (سندھ) ۹۵۷ھ

وفات ———— لاہور ۱۰۴۵ھ

حضرت میاں میرؒ عہد شاہجہانی کے سب سے با اثر شیخ تھے۔ انھیں نہ صرف عوام الناس میں بلکہ علمی اور درباری حلقوں میں بھی بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ ہندوستان میں قادریہ سلسلے کو انھیں کے دم قدم سے دوبارہ فروغ نصیب ہوا۔[1]

نام ونسب اور ابتدائی حالات حضرت میاں میر کا اصل نام میر محمد تھا۔ بعض نے شیخ محمد نام بتایا ہے۔ ۹۵۷ھ میں سندھ کے قدیم شہر سہوان میں پیدا ہوئے۔ قاضیوں کے اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو علم وفضل کے لحاظ سے اپنے دور میں بہت ممتاز تھا۔ والد بزرگوار کا نام سائیں دتہ اور دادا کا نام قاضی قلندر فاروقی تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ بی بی فاطمہ قاضی قارن کی دختر تھیں۔ حضرت میاں میر کا سلسلہ نسب حضرت عمرؓ تک پہنچتا ہے، چنانچہ آپ فاروقی کہلاتے ہیں۔

سات سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، مگر خاندان میں علم وفضل کا چرچا تھا، اس لیے آپ کی والدہ ماجدہ نے سلسلہ قادریہ میں تعلیم دلائی اور اچھی طرح تربیت دی۔ سن بلوغ کو پہنچنے تک علم وعرفان کی کئی منزلیں طے کر لیں۔ والدہ بھی جلد داغ مفارقت دے گئیں۔ چار بھائی اور بہنیں تھیں۔ بھائیوں کے نام یہ ہیں: میاں قاضی، قاضی عثمان، قاضی محمد اور قاضی طاہر۔ بہنوں کے نام بی بی بادی اور بی بی جمال خاتون ہیں۔ مؤخر الذکر اپنے وقت کی ولیہ عارفہ تھیں۔

مجاہدے آپ قدیم طرز کے صوفی بزرگوں میں سے تھے، جو فنا فی اللہ ہوتے ہیں اور شرع کی ترویج پر زیادہ سختی سے کاربند نہیں ہوتے، چنانچہ آپ بھی ہر وقت مجاہدہ اور ریاضت میں لگے رہتے تھے، دنیا سے الگ تھلگ گوشہ تنہائی میں بیٹھے رہتے، رفتہ رفتہ دنیا سے بالکل ہی کنارہ کر لیا۔

---

[1] شیخ محمد اکرام اپنی کتاب رود کوثر میں لکھتے ہیں: "شیخ عبدالحق محدث نے ابتدائے سلوک میں سندھ کے ایک قادری بزرگ سے فیض حاصل کیا تھا، لیکن تقویٰ و پرہیزگاری و شریعت کی کشش نے انھیں آہستہ آہستہ ایک ایسے سلسلے کی طرف کھینچ لیا جس میں اتباع شریعت پر قادریہ سلسلے سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یہ حضرت خواجہ باقی باللہ کے عزیز دوستوں میں سے تھے۔۔۔۔

جس عمل سے شیخ عبدالحق متاثر ہوئے اس کا نتیجہ جہانگیری میں نمودار ہوا اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کی عالمگیر شخصیت نے اس ملک میں نقشبندیہ سلسلے کو بے حد مقبول بنا دیا لیکن ان کی زندگی میں ہی لاہور کے قریب میں ایک ایسا شیخ سلوک کی منزلیں طے کر رہا تھا جس کے اثر سے ایک بار پھر قادریہ سلسلہ چمک اٹھا۔"

بیعت علائق دنیا سے منہ موڑ کر آپ شیخ خضر سہوستانی کے مرید ہو گئے جو اپنے زمانہ کے مشہور صوفی بزرگ تھے اور سیوستان سے کچھ فاصلے پر ایک پہاڑ پر سکونت رکھتے تھے۔ وحدت الوجودی فلسفے سے آپ کو خاص لگاؤ تھا اور بہت قابل فقیہہ تھے۔ ہم عصروں میں کوئی آپ کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔

ورود لاہور پچیس سال کی عمر میں لاہور آنے اور ریاضت و عبادت اور تلقین وہدایت شروع کی۔ اس وقت یہاں آپ کے پایہ کا کوئی بزرگ موجود نہ تھا۔ آپ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر مصروف عبادت ہوتے تھے۔ چنانچہ چالیس سال تک کسی کو علم ہی نہ ہو سکا کہ اس پایہ کا ایک بزرگ یہاں موجود ہے۔ پھر جب اہل لاہور کو آپ کے متعلق علم ہوا تو ایک خلقت امڈ پڑی اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ آ کر مرید ہونے لگے۔

عظمت اور مقبولیت عام لوگوں کے علاوہ دربار کی حلقوں میں بھی آپ کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ بڑے بڑے امراء بھی آپ کے مرید تھے۔ بادشاہ اور شہزادے بھی آپ کے ارادت کیش تھے۔ جہانگیر آپ کا حد سے زیادہ عقیدت مند تھا۔ اس نے دو مرتبہ آپ سے خط و کتابت بھی کی۔ یہ خطوط دارا شکوہ کی کتاب "سفینۃ الاولیا" میں درج ہیں۔ جہانگیر ان کا ذکر کرتے ہوئے تزک جہانگیری میں لکھتا ہے:

> "چوں بعرض رسید کہ در لاہور شیخ محمد میر نام درویشے است سندی الاصل۔ بغایت فاضل و مرتاض و مبارک نفس و صاحب حال در گوشہ توکل و عزلت نزدی گشتہ۔ از فقر غنی و از دنیا مستغنی نشستہ است۔ بنا برین خاطر حق طلب بے ملاقات ایشاں قرار نگیرد۔ و بدیدن ایشاں رغبت افزود۔ چوں بلاہور رفتن متعذر بود، رقعہ بخدمت ایشاں نوشتہ شوق باطن را انہا نمودہ ختم۔ و آں عزیز با وجود کبرسن و ضعف بیش تصدیعہ کشیدہ تشریف آوردہ و مدت ممتد تنہا با ایشاں نشستہ صحبت مستوفی داشتہ شد۔ الحق ذات شریف است و دریں عہد بغایت غنیمت و عزیز الوجود ایں نیاز مند از خود بر آمدہ با ایشاں صحبت داشت و لیسا ختاں بلند از حقائق و معارف استماع افتاد۔ ہر چند خواستم نیازے بگذرانم۔ چوں پایۂ ہمت ایشاں را ازاں عالی تر یافتم، خاطر با ظہار ایں طلب رخصت نداد۔ پوست آہو سفید بجہت جائے نماز با ایشاں گذرانیدم۔"

شاہجہان نے بھی دو مرتبہ میاں میرؒ سے ملاقات کی۔ بادشاہ نامہ میں شاہجہان نے ان ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے:

> "خدیو خدا آگاہ بکاشانۂ فیض آشیانہ پیشوائے ارباب صفوت و صفا، رہنمائے اصحاب معرفت و تقویٰ، قدوۂ حق شناساں مانی ضمیر میاں میر کہ بیشتر نیز بقدوم سعادت لزوم مہبط انوار گشتہ بود۔ تشریف فرمودہ بگذارش بسا دقائق حقائق و غوامض معارف باعث انشراح صدور و انبساط قلب آں ناموہ نشین تجرد گزیں گشتند۔"

عمل صالح میں لکھا ہے:

وحضرت بادشاہ حقائق آگاہ بہ نحوے شیفتۂ صحبت آں مقتدائے اصحاب عرفاں شدند کہ مزیدے براں متصور نہ باشد۔ چنانچہ بارہا اطوار محمودہ و احوالِ ستودۂ ایشاں را ستودہ مے فرمودند کہ از مشائخ متصوفۂ ایں کشور میاں میر را کامل تر یافتم و از ایشاں گذشتہ شیخ المشائخ شیخ فضل اللہ۔

شاہجہان کا بیٹا دارا شکوہ بھی حضرت کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے حضرت کے روحانی ذوق و شوق کو ترقی دینے کے لیے بہت کچھ کیا۔ اس نے "سکینۃ الاولیا" نام سے ایک کتاب لکھی جس میں حضرت میاں میرؒ اور ان کے خلفا کے حالات درج ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت کی کئی کرامات بھی بیان کی ہیں۔

دارا شکوہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں بیمار ہو گیا اور طبیب میرے علاج سے عاجز آ گئے۔ میری عمر اس وقت بیس برس کی تھی۔ بادشاہ (والد) مجھے حضرت میاں میر کے پاس لے گئے اور کہا یہ میرا بڑا لڑکا ہے، طبیبوں نے اس کے علاج سے ہاتھ کھینچ لیا ہے، آپ توجہ فرمائیں۔ حضرت میاں میر نے پیالے میں پانی لیا اور دم کر کے مجھے پینے کے لیے دیا۔ اسی ہفتے مجھے صحت ہو گئی۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں: "دارا شکوہ نے حضرت میاں میرؒ اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی (جو حضرت مجدد کے مرید تھے) ایک گفتگو کا ذکر کیا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ حضرت میاں میر اور مجددیہ طریقہ کے بزرگوں میں اختلاف نمودار ہو رہے تھے۔ اس گفتگو کے وقت بادشاہ بھی موجود تھا اور حضرت میاں میر نے خدا تک پہنچنے کے طریقے بتا رہے تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے کہا کہ جب سالک پر عالم ملکوت کشف ہو جاتا ہے تو ہم اسے جنگلوں میں بھیج دیتے ہیں تاکہ وہ تنہائی میں یادِ الٰہی کرے۔ مولانا عبدالحکیم نے اعتراض کیا کہ اس طرح تو نماز باجماعت فوت ہوتی ہے۔ حضرت میاں میر نے اس کا مناسب جواب دیا لیکن اس اعتراض اور جواب سے بھی خیال ہوتا ہے کہ شرع کی غیر مکمل پابندی کی نسبت جو اعتراض مجددیوں کو قادریوں پر تھے اور جنھوں نے آگے چل کر دارا شکوہ اور عالمگیر کی مخالفت کو چمکا دیا۔ وہ حضرت میاں میر کے زمانے میں ہی رونما ہو چکے تھے۔"

وفات | حضرت میاں میر نے سہ شنبہ ۷ ربیع الاول ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) لاہور کے محلہ خان پورہ میں وفات پائی۔ آپ نے عمر بھر شادی نہ کی اس لیے کوئی اولاد نہ تھی۔ شیخ شاہ محمد المعروف ملا شاہ قادری آپ کے سب سے بڑے خلیفہ تھے جو آپ کی وفات کے بعد جانشین ہوئے۔ ان کے علاوہ آپ کے چند خلفا یہ تھے:

شیخ تھا خوجہ، شیخ اسماعیل، میاں حامد قادری، ملا عبدالغفور، میراں شاہ سعید (جن کا مزار ڈیرہ بابا نانک کے قریب دھرم کوٹ کے مقام پر ہے)، عبدالغنی، شیخ نعمت اللہ سرہندی اور حاجی صالح۔

دارا شکوہ نے حضرت میاں میر کی زندگی میں ان سے بیعت نہ کی تھی مگر ان کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ ملا شاہ قادری سے بیعت ہوا۔

ملا شاہ قادری | ملا شاہ قادری کا اصل وطن بدخشاں تھا۔ شیخ محمد اکرام ان کے حالات بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ

ابتدائے شباب ہی میں کشمیر آ گئے اور وہاں سے لاہور آ کر حضرت میاں میر کے مرید ہوئے۔ چونکہ لاہور کی گرمی آپ کے نزار و نزار جسم کے لیے ناقابلِ برداشت تھی اس لیے آپ مرشد کی اجازت سے موسم گرما میں کشمیر تشریف لے جاتے جہاں دارا شکوہ اور جہاں آرا نے آپ کے لیے دامنِ کوہ میں ایک شاندار خانقاہ تعمیر کرا دی تھی۔ موسم سرما میں (جب تک مرشد زندہ رہے) لاہور آ جاتے۔ تذکرہ نگار آپ کی ریاضتوں اور مجاہدوں کا اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے۔ دارا شکوہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ شروع میں آپ نے سات سال تک عشا کی نماز کے بعد سے صبح تک حبسِ نفس سے ذکر خفی کیا ہے۔ ایک اور جگہ کہتا ہے (ترجمہ) "آپ کی ریاضتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اب (۱۰۵۲ھ) تک تیس سال سے کچھ اوپر آپ نے ایک لحظہ اور ایک لمحہ بھی نیند نہیں کی۔

ان غیر معمولی ریاضتوں کی وجہ سے آپ کی شخصیت میں بڑی کشش اور بات میں بڑی تاثیر پیدا ہو گئی تھی۔ جن دنوں آپ شہر میں مقیم تھے تو وہاں شیعہ سنی اختلافات زوروں پر تھے۔ آپ برسرِ مجلس چاروں خلفا کی تعریف کرتے۔ مخالفین بحث و مناظرہ کے لیے آتے، لیکن آپ اس خوش اسلوبی سے پیش آتے اور آپ کی بات میں اتنی تاثیر تھی کہ وہ قائل ہو جاتے۔ . . . . تصوف میں آپ کا طریقہ وحدۃ الوجود کا تھا۔ دوسرے مذاہب کے ہم مشرب لوگوں سے ملنے سے آپ کو احتراز نہ تھا۔ اور بسا اوقات ان پر نیک اثر ڈالتے، چنانچہ ایک کائستھ کی نسبت جو ملی رام کے نام سے مشہور ہوا، کہتے ہیں کہ وہ پہلے فیصلہ حکومت کے تابع ایک برسرِ اقتدار امیر تھا۔ دارا شکوہ اور ملا شاہ کے فیضِ صحبت سے اسے عشقِ الٰہی دامنگیر ہوا، اور سب جاہ و مال ترک کر کے شیخ ملا شاہ کے ہاتھ پر مرید ہوا . . . ."

ملا شاہ کے کلام میں وحدت الوجودی رنگ ہے۔ بعض اوقات ان کے اشعار ایسے ہوتے جن پر لوگ شدید اعتراض کرتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ علما نے ان کے کافر اور واجب القتل ہونے کا فتویٰ دے دیا اور شاہجہان کو حد شرعی جاری کرنے کے لیے استدعا کی، مگر دارا شکوہ نے معاملہ رفع دفع کر دیا۔

جب اورنگ زیب تخت نشین ہوا، تو حالات نے پلٹا کھایا اور علماء کے آواز اٹھانے پر اورنگ زیب نے ملا شاہ کو جواب دہی کے لیے طلب کیا۔ پھر حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ اورنگ زیب نے اپنا پہلا حکم منسوخ کر دیا اور شیخ کو پیغام بھیجا کہ کشمیر چھوڑ کر لاہور چلے آئیں اور رہیں قیام کریں۔ چنانچہ ۱۰۷۰ء میں ملا شاہ لاہور چلے آئے۔ اب عمر زیادہ ہو گئی تھی، اس لیے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ ۱۶۶۱ء میں چند روز کی علالت کے بعد راہی ملکِ عدم ہوئے۔

حضرت میاں میرؒ کا روضہ

حضرت میاں میر کی وفات کے بعد دارا شکوہ نے روضہ کی تعمیر کے لیے مسالہ وغیرہ جمع کیا مگر قضا نے اُسے تعمیر کا موقع نہ دیا۔ بعد ازاں اورنگ زیب خود قبر پر حاضر ہوا تھا اور روضہ اُسی نے تعمیر کرایا۔ پہلے یہ روضہ ایک باغ کی شکل میں تھا، بعد ازاں مہدی شاہ سجادہ نشین (متوفی ۱۹۱۰ء) نے حضرت کے نام پر یہاں ایک گاؤں آباد کیا۔

روضہ کی چار دیواری میں قبریں اتنی زیادہ ہیں کہ وہ ایک اچھا خاصا قبرستان بن گیا ہے۔ یہ قبریں زیادہ تر حضرت میاں میرؒ کے عزیزوں، خادموں اور سجادہ نشینوں کی ہیں۔ انھیں قبروں میں حضرت کی دو بہنوں بی بی جمال خاتون اور بی بی جمال بادی کی قبریں بھی ہیں۔ ایک قبر شاہجہان کی بیٹی اور دارا شکوہ کی بہن نادرہؒ بیگم کی ہے۔ یہ قبر بارہ دری کے نام سے مشہور ہے اور حضرت میاں میر کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی۔

<u>ایک روایت</u> | آپ کے عقیدت مندوں میں ہر مذہب اور فرقے کے لوگ شامل تھے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب گورو ارجن دیو نے امرت سر میں دربار صاحب کی بنیاد رکھنا چاہی تو پہلے لاہور آ کر حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس عبادت گاہ کا سنگ بنیاد رکھنے کی درخواست کی۔ چنانچہ آپ امرتسر گئے اور دربار صاحب کا سنگ بنیاد اپنے ہاتھوں سے رکھا۔

نادرہ بیگم نو سال کی تھی جب حضرت میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ دو سال تک آپ کی خدمت کرتی رہی۔ پھر حضرت میاں میرؒ نے انھیں اپنی خدمت گزاری سے سبکدوش کر دیا اور فرمایا کہ تم جوان ہو گئی ہو، اس لیے اب گھر چلی جاؤ۔ مگر بارھویں سال میں قدم رکھنے سے پہلے یعنی ۱۰۴۳ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

حضرت شیخ ابوالمعالی قادری لاہوریؒ

ولادت ــــــــ ستگھرہ (شیرگڑھ) - ۹۶۰ھ

وفات ــــــــ لاہور ــــــــ ۱۰۲۴ھ

شیخ ابوالمعالی قادری پنجاب کے مشہور روحانی بزرگ تھے جنھوں نے پنجاب میں قادریہ سلسلہ کی اشاعت کے لیے بہت کام کیا۔ شیخ داؤد کرمانی شیرگڑھی کے مرید اور خلیفہ اعظم تھے۔

اصل نام خیرالدین تھا۔ کرمانی سادات میں سے تھے۔ جدی سلسلہ اٹھائیس واسطوں سے حضرت موسیٰ المبرقع بن امام محمد تقی الجواد علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ والد کا نام سید رحمت اللہ اور دادا کا نام میر سید فتح اللہ شاہ تھا۔ مرشدی سلسلہ چودہ واسطوں سے سیدالاولیا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تک پہنچتا ہے۔

۱۰ ذی الحجہ سنہ ۹۶۰ھ کو شیرگڑھ کے قصبہ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ہندوستان پر ہمایوں کی حکومت تھی۔

آپ کے آبا و اجداد میں سے سید فیض اللہ اپنے بیٹے سید مبارک کرمانی کے ہمراہ ۹۰۰ھ میں کرمان سے ہندوستان تشریف لائے، اوچھ میں سکونت اختیار کی، جسے آج کل اوچ شریف کہتے ہیں اور ریاست بہاول پور میں واقع ہے۔ بعدازاں ملتان کے نواح میں داؤد جال نام ایک قصبہ میں سکونت اختیار کر لی۔ یہ خاندان ۹۲۰ھ میں قصبہ ستگھرہ میں منتقل ہو گیا۔ اور یہیں شیخ ابوالمعالی پیدا ہوئے۔

ورود لاہور | شیخ داؤد شیرگڑھی سے جو آپ کے حقیقی برادرزادہ تھے، بیعت کی اور انھیں کے حکم سے لاہور تشریف لا کر خلق اللہ کی ہدایت میں مصروف ہوئے۔ ورود لاہور کے وقت ۵۰ سال کی عمر تھی۔

آپ نے اپنے والد محترم کی صحبت میں رہ کر علوم ظاہری میں کمال حاصل کیا تھا پھر جب دل میں عشق حقیقی موجزن ہوا تو مستانہ وار نکل پڑے۔ حضرت غوث پاکؒ کے عشق میں اویسیہ طریقہ اختیار کر لیا اور جنگلوں کی خاک چھانتے رہے۔ بعدازاں دہلی گئے۔ وہاں سے لوٹنے پر شیخ داؤد کی مقاربت اختیار کی اور مسند قادریہ پر رونق افروز ہوئے۔ چنانچہ لاہور آ کر اسی سلسلے کی نشر و اشاعت میں سرگرم ہوئے۔ اب آپ قطب الاقطاب کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ لوگ جوق در جوق خدمت میں حاضر ہونے لگے اور آپ انھیں علم و معرفت کی دولت سے مالا مال کرنے لگے۔

کرامتیں | آپ کے متعلق بہت سی کرامتیں بیان کی جاتی ہیں، منجملہ ان کے ایک نمایاں کرامت یہ ہے کہ جو بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا اسے اُسی شب خواب میں حضرت غوث اعظم محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کی زیارت نصیب ہوتی۔[1]

---

[1] خزینۃ الاصفیا جلد اول

تذکرۃ العارفین میں آپ کی کئی اور کرامتوں کا حال بھی درج ہے۔

تصانیف حضرت شاہ ابوالمعالی نے یہ پانچ کتابیں لکھیں:

دیوان غربتی[1]، تحفۃ القادری، رسالہ گلدستہ باغ ارم، رسالہ مونس جاں، زعفران زار۔ ایک کتاب ان کے اشعار پر مشتمل ہے۔

وفات آپ کی ولادت دوشنبہ ۱۰ ذی الحجہ سنہ ۹۶۰ھ[2] میں ہوئی اور ۱۶ یا ۱۰ ربیع الاول ۱۰۲۴ھ[3] کو جہانگیر کے عہد میں آپ کی وفات ہوئی۔

اولاد شاہ ابوالمعالی کے ایک نواسے اور ایک پوتے ان کے وارث تھے۔ ان کی کچھ اولاد پنڈدادن خان اور لیشاور کی طرف بھی بتائی جاتی ہے۔

روضہ آپ کا مزار لاہور میں فلیمنگ روڈ نزد میکلوڈ روڈ واقع ہے۔ مزار کے قریب ایک مسجد ہے جو حضرت شاہ ابوالمعالی نے اپنی زندگی میں تعمیر کرائی تھی۔ مسجد کے مشرق میں ایک کنواں ہے وہ بھی آپ نے خود تعمیر کرایا تھا۔ مقبرہ کے گرد و نواح میں بہت سی دوسری قبریں ہیں جن میں حضرت کی زوجہ محترمہ کے علاوہ کئی رشتہ دار بھی مدفون ہیں۔ مقبرہ میں ہزاروں کبوتر ہر وقت دیکھنے میں آتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ کے بڑے صاحبزادے شاہ محمد درویش نے جو "برقعہ پوش" کے نام سے مشہور تھے کبوتر پالے، پھر رفتہ رفتہ اس کا رواج پڑ گیا۔

آپ کے مزار پر سال میں چار میلے لگتے ہیں۔ پہلا میلہ عرس کے موقع پر ماہ ربیع الاول کو منعقد ہوتا ہے، پھر عیدین اور شب برات کے موقعوں پر بھی مزار پر میلے منعقد ہوتے ہیں جن میں دکانیں سجائی جاتی ہیں۔ قوالی اور رقص و سرود کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں ان تمام میلوں میں کثرت سے لوگ آتے ہیں۔

---

[1] غربتی آپ کا تخلص تھا۔

[2] سفینۃ الاولیاء، داراشکوہ

[3] مفتی محمد ولایت قلی کی کتاب یادرفتگان میں سن وفات ۱۰۲۴ھ تحریر ہے۔

حضرت شیخ احمد مجدّد الف ثانیؒ

ولادت ــــــــ سرہند ۹۷۱ھ

وفات ــــــــ سرہند ۱۰۳۵ھ

ابوالبرکات امام ربانی شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ نقشبندیہ سلسلہ کے مشہور صوفی بزرگ اور عالم ہیں۔ اور اس طریقہ میں بھی تجدید کر کے مجددیہ سلسلہ جاری کیا، چونکہ اس زمانے میں اسلام کی آبرو مٹ رہی تھی اور حضرت شیخ سرہندی نے تجدید اسلام کی، اس لیے آپ کو مجدد الف ثانی کہا جاتا ہے۔

سرہند شریف | ہندوستان میں جہاں آج کل سرہند کا شہر آباد ہے یہ کسی زمانہ میں جنگل تھا اور یہاں شیر رہتے تھے۔ جب شہر آباد ہوا تو اس مقام کا نام "شیر ہند" رکھا گیا، جو بعد ازاں "سرہند" ہو گیا۔

شیر ہند کی بنیاد فیروز شاہ تغلق نے رکھی۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جب فیروز شاہ تغلق پنجاب کا خزانہ لے کر دہلی جا رہا تھا تو اس مقام پر پہنچا۔ لشکر میں ایک ولی اللہ بھی تھے، انھیں کشف سے معلوم ہوا کہ یہاں ہجرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہزار سال بعد ایک ایسا شخص پیدا ہوگا جو اپنے کمالات کے باعث وحید الامت ہوگا۔ چنانچہ فیروز شاہ نے اس کی بنیاد اسی وجہ سے رکھی۔ اس کی بنیاد حضرت امام رفیع الدینؒ جو حضرت امام ربانی کے اسلاف سے نہایت باورع اور ولی اللہ ہیں اور حضرت بوعلی قلندرؒ کے ہاتھوں سے رکھی گئی۔

ولادت اور نسب | حضرت مجدد ۲۶ جون ۱۵۶۴ء، ۱۴ شوال (۹۷۱ھ) کو شہنشاہ اکبر کے عہد میں سرہند میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد مخدوم شیخ عبدالاحد حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے مرید اور بڑے صاحب نسبت اور اہل علم بزرگ تھے۔ حضرت مجدد اپنے تین بھائیوں سے چھوٹے اور تین بھائیوں سے بڑے تھے۔ آپ کا نسب مبارک اٹھائیس واسطوں سے حضرت امیر المومنین فاروق اعظم سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ اور طریقہ نقشبندیہ میں آپ کی ارادت حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ سے تھی۔ طریقہ عالیہ قادریہ میں شاہ سکندر کیتھلی سے وابستہ تھے۔ طریقہ عالیہ چشتیہ و سہروردیہ میں اپنے والد ماجد حضرت شیخ عبدالاحد فاروقی قدس سرہ العزیز سے ارادت تھی۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی سیدنا شیخ احمد سرہندیؒ نے اکثر کتابیں اپنے والد بزرگوار سے پڑھیں اور کچھ سرہند شریف کے دوسرے علما سے تھوڑے ہی عرصہ میں آپ نے قرآن مجید حفظ کر لیا اور سترہ برس کی عمر میں تمام علوم سے فارغ ہو گئے اور پھر تھوڑا زمانہ درس و تدریس دینے کے بعد آپ آگرہ تشریف لے گئے اور ابوالفضل اور فیضی سے ملاقات کی۔ ان دونوں نے آپ کے

تبحرِ علمی اور بے پایاں قابلیت کا اعتراف کیا۔

شروع میں آپ سلسلۂ چشتیہ میں بیعت ہوئے اور ان سے تعلیم باطنی حاصل کی۔ خلافت حضرت شاہ سکندر کیتھلیؒ سے حاصل ہوئی۔ حضرت شاہ سکندر ہندوستان میں سلسلۂ قادریہ کے بہت بڑے مشائخ میں سے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر بزرگوں سے بھی آپ نے باطنی تعلیم حاصل کی اور ترقی فرماتے رہے۔ غرض صرف سترہ سال کی عمر میں آپ ظاہری و باطنی کمالات کے جامع بن چکے تھے۔

قدِ مبارک متوسط، چہرۂ انور باوجاہت، رنگ گندمی مائل سفیدی، پیشانی کشادہ، داڑھی گھنی اور آنکھیں بڑی بڑی۔ صورت اقدس انوارِ ولایت سے تاباں۔ خوبصورتی اور ملاحت کے ساتھ آثارِ رعب و ہیبت نمایاں۔ جو کوئی آپ کی زیارت کرتا، بے اختیار کہتا فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں ایک شخص پیدا ہوگا جس کو صلہ کہیں گے (یعنی دو چیزوں کو ملانے والا) یہ حدیث شریف حضرت امام ربانی پر پوری صادق آتی ہے اور آپ ہی کے طفیل ظاہر و باطن جس کو زمانے نے الگ الگ سمجھ رکھا تھا۔ ایک جگہ اکٹھے ہوئے۔

سیدنا غوث الثقلین شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ نے ایک جنگل میں ایک مراقبہ کے دوران ساعت بہ ساعت بڑھنے والے نور کا مشاہدہ فرمایا۔ القا ہوا کہ اس نور کا صاحب وہ عزیزِ امت ہے جو پانچ سو سال بعد ہمارے پیغمبر کی تجدید کرے گا اور اس کے فرزند و خلفا بارگاہِ احدیت کے صدر نشینوں میں سے ہوں گے۔ حضرت غوث پاک قدس سرہٗ نے اس مشاہدہ کے بعد اپنا ایک خرقہ اپنے خلیفۂ اکبر کے سپرد کیا اور کہا کہ یہ خرقہ امانت ہے اس شخص کی جس کے متعلق یہ القا ہوا۔ چنانچہ وہ خرقہ حضرت امام ربانی کو حضرت شاہ کمال کیتھلیؒ کی وساطت سے پہنچا۔ ان کے علاوہ اور بھی بزرگانِ دین سے اس قسم کی بہت سی پیش گوئیاں حضرت امام ربانی کے متعلق منقول ہیں۔

والد صاحب کے انتقال کے بعد حضرت امام ربانیؒ حج کے ارادے کے لیے دہلی تشریف لائے۔ وہاں حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمۃ کے کمالات کی شہرت سن کر حاضرِ خدمت ہوئے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمۃ ہندوستان میں سلسلۂ نقشبندیہ کے بانی ہیں۔ حضرت خواجہ صاحبؒ بڑی شفقت سے پیش آئے اور رہنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ حضرت امام ربانیؒ حضرت خواجہ صاحب کی فرمائش پر ٹھہر گئے اور خواجہ صاحب سے بیعت ہو گئے۔ حضرت خواجہ صاحب نے اپنے ایک مرید کو حضرت امام ربانی کی آمد پر تحریر فرمایا :

"شیخ احمد نامی ایک عالم باعمل سرہند سے آئے ہیں۔ چند دن اس فقیر کے ساتھ اُٹھے بیٹھے، عجیب و غریب حالات ان کے دیکھنے میں آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک چراغ ہوں گے جس سے سارا عالم روشن ہو جائے گا۔"

حضرت امام ربانیؒ نے اڑھائی ماہ دہلی میں قیام فرمایا، اس کے بعد دوسری مرتبہ حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ کو خلعتِ خلافت عطا کی گئی اور خاص خاص اصحاب کو تعلیم کے لیے حضرت خواجہ صاحبؒ نے حضرت

امام ربانیؒ کے سپرد کر دیا۔ تیسری مرتبہ حضرتؒ نے چند قدم چل کر حضرت امام ربانیؒ کا استقبال فرمایا اور بڑی بڑی بشارتیں سنائیں اور بہت کچھ اعزاز و اکرام کیا۔ چوتھی مرتبہ جب حضرت امام ربانیؒ اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے رخصت ہونے لگے تو حضرت خواجہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے ہندوستان آنے سے قبل استخارہ کیا جس میں مجھے معلوم ہوا کہ ایک شیریں نغمہ خوبصورت طوطا میرے ہاتھ پر آکر بیٹھ گیا ہے، میں اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ڈال رہا ہوں اور وہ اپنی چونچ سے میرے منہ میں شکر ڈال رہا ہے۔ میں نے یہ استخارہ اپنے مرشد حضرت شیخ خواجہ امکنگی رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہندوستان میں تمہاری تربیت سے کوئی ایسا شخص اٹھے گا جس سے ایک عالم منور ہو گا اور تم کو بھی اس سے حصہ ملے گا۔ خواجہ صاحب نے اس کا مصداق حضرت امام ربانیؒ کو فرمایا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمۃ فرمایا کرتے تھے کہ شیخ احمد (حضرت امام ربانیؒ) ایک آفتاب ہیں کہ ہم جیسے ہزاروں ستارے اس کی روشنی میں گم ہو جائیں۔ آسمان کے نیچے ان کی نظیر نہیں ہے اور ان جیسے اس امت میں چند ہی آدمی گزرے ہیں۔

ایک بار حضرت خواجہؒ نے حضرت امام ربانیؒ سے فرمایا کہ ہم نے یہاں (سرہند میں) ایک بہت بڑا چراغ روشن کیا، اس کی روشنی آنا فانا بڑھتی گئی، ہمارے جلائے ہوئے چراغ سے بیسیوں چراغ جل گئے، اس سے مراد تم ہو۔

ادھر مغل بادشاہ اکبر تخت سلطنت پر تھا۔ بے دینی اور شرک کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ کفار نے بے خوف و خطر کئی مساجد کو شہید کر کے وہاں مندر بنا لیے۔ اکادشی کے دن (جو کہ ہندوؤں کے برت کا دن ہے) کے لیے بادشاہ نے یہ اہتمام کیا تھا کہ اس دن شہروں میں کوئی مسلمان دن کو روٹی نہ پکا سکے۔ برعکس اس کے رمضان شریف میں کھلے بندوں کھانا پکایا جاتا اور فروخت کیا جاتا اور اہل اسلام کی پستی کے سبب کوئی مزاحم نہ ہو سکتا تھا۔ علماء اور فقراء کے ذریعے ہی عوام کی اصلاح ہوتی ہے۔ علماء تو آپس کے حسد کا شکار ہو گئے تھے اور جو اس فتنہ سے بچے تھے ان کے پاس اقتدار نہ تھا۔ اور جن کا نام نہاد فقراء کو خطابات اور نوازشات سے نوازا جاتا تھا ان میں سلوک کے عروج و نزول کی خبر تک کسی کو نہ تھی اور عیش پسندی اور ہوا پرستی کے خاردار صحرا میں بھٹک رہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ نا اہل اشخاص کو مرشد اور ولی اللہ اور قطب جیسے جلیل الشان خطابات سے نوازا گیا۔ اور ان تن آسان اور اغراض پرستوں نے عوام کے خیالات سے شریعت کی پیروی کی اہمیت مٹا دی اور سنت نبوی کا احیا مشکل ترین ہو گیا۔

ایسے تاریک دور میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز ہی ایک ایسی شخصیت تھی جو اعلائے کلمۃ الحق میں مشغول تھی۔ چنانچہ آپ سرہند سے آگرہ پہنچے، ان دنوں اس کا نام اکبر آباد تھا، اور اکبر کے مقربین کو بلا کر ارشاد فرمایا:

"بادشاہ اللہ اور اس کے رسول کا باغی ہو گیا ہے، جاؤ میری طرف سے اسے کہہ دو کہ اس کی بادشاہی، اس کی طاقت، اس کی فوج سب کچھ ایک دن مٹ جانے والی ہے، وہ توبہ کر کے خدا اور رسول کا تابعدار بنے ورنہ اللہ کے غضب کا انتظار کرے۔"

ان لوگوں نے جا کر بادشاہ سے کہا، لیکن اکبر جو اپنے نئے دین کے عروج کے خواب دیکھ رہا تھا، اس نے حضرت امام ربانیؒ

کے پیغام کی کچھ پرواہ نہ کی، اور اپنے فتنہ کی کامیابی کے اظہار کے لیے خاص دن مقرر کر کے دربار اکبری سجایا۔ دوسری طرف بارگاہ محمدی بنایا۔ اکبر کا خیال تھا کہ میری بادشاہت اور سلطنت کے مقابلہ میں پرانے اور بوسیدہ مذہب کے پیرو کہاں باہر نکلیں گے۔ اور اس طریق سے ہی فخر الاولین والآخرین سید المرسلین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے مقابلہ میں اپنے شیطانی مسلک کو سرفراز کر سکوں گا۔ آنے والی نسلیں میرے رعب و داب کا سکہ مانیں گی۔ اسے کیا خبر تھی کہ امام ربانی مجدد الف ثانی ایسا ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع اس دنیا کو اپنی آمد سے منور کر چکے ہیں۔ چنانچہ اکبر نے اپنے دربار میں بوالہوسوں کی چرب زبانی کے لیے نہایت پر تکلف کھانے تیار کروائے تاکہ شکم کے بندوں کا گروہ گدھوں کی طرح اس مردار دنیا کی طلب میں اکٹھا ہو جائے اور ایسا ہی ہوا کہ اکبر اور اس کے حاشیہ نشین خوشامدی، چاپلوس اور ڈپلومیٹک لوگ جن کے نفس نے انھیں شرعی احکام کی تکلیفوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے دین سے باغی ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس دربار میں اکٹھے ہو گئے۔

دوسری طرف دربار محمدی لگایا گیا، جو ان تمام تکلفات سے بری تھا، لیکن حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کی غیرت اسلامی یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ شہنشاہ اکبر آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی تذلیل کرے۔ چنانچہ حضرت مجدد اپنے چند غریب دوستوں کے ساتھ اس کے دربار میں جلوہ افروز ہوئے۔ تھوڑی دیر گزری کہ ہوا کا ایک سخت طوفان آیا اور اکبری دربار تہ و بالا ہو گیا۔ خیموں کی چوبیں اس زور سے اکھڑیں کہ ہزار حفاظتوں کے باوجود اکبر بھی ان کی زد سے نہ بچ سکا اور زخمی ہو گیا، لیکن مجدد صاحبؒ کی قیامگاہ بالکل محفوظ رہی اور ذرا سا بھی نقصان نہ ہوا۔

اکبر کی موت کے بعد اس کا بیٹا جہانگیر تخت کا وارث ہوا۔ اتفاق سے جہانگیر کی بیوی نورجہاں شیعہ مذہب رکھتی تھی، مگر بہت خوبصورت تھی، اس وجہ سے جہانگیر نورجہاں کے حسن کا متوالا ہو گیا اور امور سلطنت قریباً قریباً نورجہاں ہی کے سپرد کر دیے اور یہاں تک وارفتہ ہو گیا کہ اکثر کہا کرتا تھا، میں نے سلطنت نورجہاں کو بخش دی۔ ایک سیر شراب اور آدھ سیر گوشت کے سوا مجھے کچھ نہیں چاہیے۔

حضرت امام ربانیؒ احیاء سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کوشاں تھے اور آپ نے تبلیغ حق کا کام نہایت وسیع پیمانہ پر شروع کر دیا تھا۔ بوالہوس لوگ آپ سے جلنے لگے اور آپ کے خلاف غلط شہرت پھیلانی شروع کر دی۔ آپ کے مکتوبات میں طرح طرح کی بے بنیاد اور غلط عبارتیں شامل کر کے علماء کو آپ کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا اور بادشاہ کے کان بھی آپ کے خلاف بھر دیے۔

سب سے پہلے نورجہاں کا شیعہ ہونا اس بات کا مقتضی تھا کہ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک کہیں جہانگیر اختیار نہ کر لے اور اس میں ایک سیاسی پہلو بھی تھا کہ نورجہاں اپنے داماد کو تخت و تاج کا وارث بنانے میں کوشاں تھی اور حضرت امام ربانی کی روافض کے رد میں بے باکانہ جرأت نورجہاں کو پیچ پاکر رہی تھی اور مجدد صاحبؒ اور آپ کے ساتھی نورجہاں کی نگاہ میں معتوب و مقہور ہو چکے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ رقص و سرود کی محفلوں کے شیدائیوں کے لیے طریقہ نقشبندیہ جس میں اتباع سنت کی تاکید تھی برافروختہ کر رہا تھا۔ مکتوبات شریف کی دو جلدیں اس وقت مرتب ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ایک شخص حسن خاں نامی کابل کا رہنے والا

حضرت مجدد صاحبؒ کی بیعت تھا۔ چند دن بعد آپ کے ایک متوسل سے اس کی کبیدگی ہو گئی۔ تھوڑے ہی دن اسے حلقۂ ارادت میں آئے ہوئے تھے، طبیعت کی کجی اور نفس کی شرارت میں مبتلا ہو کر اس نے ناراضگی کا بدلہ حضرت امام ربانی سے لینے کی ٹھان لی۔ چنانچہ اس نے مکتوبات شریف میں تحریف کر کے کفر اور زندیقانہ عبارتوں کے اضافہ کے ساتھ بیس نقلیں مرتب کیں اور ہندوستان و افغانستان کے مشہور مشہور علما اور مشائخ کے پاس وہ نقلیں بھیج کر ان سے فتاوے طلب کیے۔

یہ ایک زبردست فتنہ تھا، ہندوستان کے جلیل القدر اور صاحب علم و فضل حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی اس فتنہ میں مبتلا ہو گئے اور آپ نے حضرت مجدد کی تردید میں چند رسالے اور مضامین لکھ ڈالے۔

حضرت امام ربانی کی مخالفت میں اچھا خاصا محاذ بن گیا۔ جہانگیر نے آپ کو دربار میں طلب کیا۔ آپ تشریف لے گئے اور چند سوالات و جوابات کے بعد بادشاہ کی تسلی کر دی۔

حضرت امام ربانی کی مخالفت میں ذاتی اقتدار، حسد اور غلط فہمیاں تینوں اپنی اپنی جگہ کام کر رہی تھیں، جس کے نتیجہ کے طور پر حضرت امام ربانیؒ کو دربار میں طلب کیا گیا تھا، مگر دشمنوں کی چال کارگر نہ ہوئی۔

مخالفین نے جب یہ دیکھا کہ ہمارا کیا کرایا سب بیکار ہو گیا اور بادشاہ امام ربانی کی طرف سے مطمئن ہو گیا ہے تو انھوں نے جہانگیر کو حضرت مجددؒ کے خلاف سیاسی رنگ میں بھڑکانا شروع کر دیا اور اسے خائف کرنا شروع کر دیا کہ:

"احمد سرہندی حکومت کا باغی ہے، بڑا سرکش اور خطرناک آدمی ہے۔ دربار میں سجدہ کا رواج جو شاہ اکبر کے وقت سے آ رہا ہے، اس کے خلاف فتوے بھی دے چکا ہے اور اس کے پاس ایک لاکھ زرہ پوش سوار موجود ہیں، یہ کسی نہ کسی وقت بغاوت کر دے گا۔"

جہانگیر کے لیے یہ سیاسی خطرہ مذہبی خطرہ سے بھی زیادہ تشویشناک تھا، مکتوبات کی تحریف شدہ عبارتیں اور حضرت مولانا عبدالحق محدث دہلوی کے تردیدی مضامین بھی حاسدوں نے بادشاہ کی نظروں سے گزارے ہوئے تھے۔ جہانگیر نے امرا و ارکین کو جمع کیا اور حضرت امام ربانی کے متعلق مشورہ کیا۔ مختلف راؤں کے بعد بادشاہ نے اپنے وزیر آصف جاہ (جو کہ شیعہ تھا) کی رائے پر اتفاق کیا کہ جو امرا حضرت امام ربانی کے حلقۂ بیعت، میں آ چکے ہیں انھیں دور دور علاقوں پر تنخواہیں بڑھا کر تبدیل کر دیا جائے اور اس کے بعد جو کارروائی کی جائے بہتر رہے گی۔ چنانچہ خانخاناں کو ملک دکن پر، سید صدر جہاں کو مشرقی ممالک پر، خان جہاں لودھی کو مالوہ پہ اور مہابت خاں کو کابل پر تعینات کیا گیا۔ اس کے علاوہ اور بھی اُمراء اسی طرح الگ الگ علاقوں کی گورنری پر مقرر کر کے روانگی کا حکم دے دیا اور پھر دوسری بار حضرت امام ربانیؒ کو بادشاہ نے طلب کیا اور آداب شاہانہ یعنی سجدہ کا مطالبہ کیا۔ مگر خدائے قدوس کی بارگاہ میں جھکنے والا سر دنیوی بادشاہوں کے دربار میں کب جھک سکتا ہے۔ حضرت امام ربانی نے اس غیر شرعی تعظیم سے سختی سے انکار کر دیا اور ارشاد فرمایا کہ

"سوائے خدا کے کسی کو سجدہ جائز نہیں اور اے جہانگیر کیا یہ کھلی ہوئی حماقت نہیں کہ ہم اپنے ہی جیسے ایک

بے بس اور مجبور انسان کو سجدہ کروں "

جہانگیر یہ الفاظ سن کر غیظ و غضب سے بھر گیا۔ وہ کبھی یہ باور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ میرے پُر ہیبت دربار میں کسی کو جرأت ہو سکے گی کہ میرے حکم کی خلاف ورزی کرے اور اتنی بے باکی اور بے خوفی سے گفتگو کرے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ آج تک سچی بات کہنے والا اس کے ہاں آیا ہی کون تھا۔ جو لوگ اس وقت اسلام کے پاسبان اور نگہبان ہونے کے مدعی تھے وہ صرف بادشاہ جہانگیر کی خوشی کے خواہاں تھے، انھیں احکم الحاکمین کی رضا سے کیا واسطہ تھا، لیکن خدا کی زمین پرستارانِ توحید اور شمع نبوت کے پروانوں سے کبھی خالی نہیں ہوئی اور پھر حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ جیسا عظیم البرکت انسان جو محبوبیت کے گہوارے میں پلا ہو اور اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ، کا صحیح مصداق ہو اور جہانگیر ایسے بے پروا بادشاہوں کو راہ پر لگانے کے لیے پروردگارِ عالم نے جسے قبولیت کی خلعت سے نوازا ہو، دنیوی جاہ و جلال، رعب و داب سے کیسے مرعوب ہو سکتا تھا۔

دشمنوں نے اپنی چال کامیاب ہوتے دیکھ کر بغلیں بجانی شروع کیں۔ وہ اسی تاک میں تھے کہ اگر امام ربانی سجدہ تعظیمی سے انکار کریں گے تو بادشاہ کے معتوب ہوں گے اور اگر سجدہ کر گئے تو مریدین کی نظروں سے گر جائیں گے۔ اور عوام المسلمین بھی انھیں ساقط الاعتبار سمجھیں گے۔

علماء نے امراء کی پاس خاطر حضرت امام ربانی کے قتل کا فتویٰ دے دیا، جن میں شاہ عبدالحق محدث دہلوی بھی شامل تھے، لیکن بعد میں اپنے کیے پر پچھتائے اور حضرت امام ربانی کے کمالات کے معترف ہو گئے۔ قدرت کاملہ نے اس عظیم المرتبت جامع کمالات ہستی کو ایک جہان کی ہدایت و رشد کا ذریعہ بنایا تھا۔ جہانگیر نے بھی موت کا حکم تو دے دیا، مگر تھوڑی دیر کے بعد مقلب القلوب نے اس کے دل کو اس حکم سے لوٹنے کی توفیق دی اور کچھ سوچ کے بعد حضرت امام ربانی کو جیل بھیج دینے پر اکتفا کی۔

قدرت الٰہی کا کرشمہ سمجھیے کہ جہاں نورجہاں کی شیعیت کی وجہ سے بعض افسر اس فتنہ میں مبتلا تھے۔ وہیں اکثر امراء سلطنت حضرت امام ربانی کی عقیدت اور محبت دل میں رکھتے تھے، حتیٰ کہ شہزادہ خرم جو بعد میں شاہجہاں کے نام سے موسوم ہوا آپ سے خاصی عقیدت رکھتا تھا، اس اپنے خاص الخاص دو معتمد افضل خاں اور خواجہ عبدالرحمٰن کو حضرت امام ربانی کی خدمت میں بھیجا اور فقہ کی کتابیں جن میں سجدہ تعظیمی کی اباحت بتائی گئی تھی، ساتھ کیں اور کہلا بھیجا، اگر جناب بادشاہ سے ملاقات کے وقت سجدہ کر لیں تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ آپ کو کوئی گزند نہ پہنچ سکے گی۔

اس پیغام کے جواب میں حضرت امام ربانی نے جو ارشاد فرمایا وہ یہ ہے :

" جان بچانے کے لیے یہ بھی جائز ہے، مگر عزیمت اسی میں ہے کہ غیراللہ کو سجدہ نہ کیا جائے "

جہانگیر نے آپ کو قید و بند کی صعوبتوں میں ڈالنے کے حکم کے علاوہ آپ کے دولت کدہ کو بھی لوٹنے کا حکم دیا، مگر صبر و تسلیم کے اس مجسمہ نے اُف تک بھی زبان سے نہ نکالا۔ پروردگارِ حقیقی پر کامل ایمان رکھنے والے پیکر نور اور اخلاق محمدی کی زندہ تصویر نے تکلیف

دینے والوں کے حق میں بددعا تک نہ کی، بلکہ اپنے متوسلین کو اسی اخلاقِ محمدی کا مظہر بننے کی تلقین کی۔

قید خانہ سے پہلے حضرت امام ربانیؒ اپنے دوستوں سے فرمایا کرتے تھے کہ عنقریب ہم پر ایک بلا نازل ہوگی جو ہمارے لیے مقاماتِ ولایت کی ترقی کا باعث ہوگی کیوں کہ امتحانات کی کڑی منزلیں گزرنے کے بغیر ان ترقیوں کا حصول ممکن نہیں۔

حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد حضورِ اکرم فداہ ابی وامی کے اس ارشاد کے معنی سمجھا رہا ہے کہ

اِتَّقُوْا مِنْ فِرَاسَةِ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ

مختصر یہ کہ حضرت امام ربانیؒ کو اجمیر (ریاست گوالیار) کے قید خانہ میں بھیج دیا گیا۔ گوالیار کا یہ قید خانہ ان لوگوں کے لیے مخصوص تھا جن کو حکومت کا باغی قرار دیا جاتا تھا۔ حضرت امام ربانیؒ جب وہاں پہنچے تو کئی ہزار نفوس کو وہاں پایا جن میں ہزارہا غیر مسلم بھی تھے۔ آپ کے قدوم میمنت لزوم اس جیل خانہ کے قیدیوں کے لیے رشد و ہدایت کا باعث ہوئے۔ غیر مسلم اسلام کی لازوال دولت سے مالا مال ہوئے اور باقیوں نے حسبِ استعداد ظاہری و باطنی کمالات کے خزائن سے جھولیاں بھر بھر کر اپنے سینوں کو مالا مال کیا۔ جیل خانہ میں کوئی قیدی ایسا نہ رہا جسے امام ربانی کے دستِ سخا نے علم کی دولت اور کمالاتِ روحانی سے محروم رکھا ہو۔ وہ قیدی جو قید خانہ کی غیر مانوس زندگی کو اپنے لیے ایک لعنت کا طوق سمجھتے تھے، حضرت امام ربانیؒ کی موجودگی کے باعث اسی قید خانہ کو جنتِ ارضی کا واحد مقصد عیش و طرب کی محفلیں سمجھے ہوئے تھے اور قید خانہ کی دیواریں ان کے راستے میں حائل تھیں، حضرت امام ربانی کے فیوض و برکات کی بدولت عشقِ الٰہی کی سرمدی نعمت کو دلوں میں سمیٹ کر رات کی تاریکیوں میں خدائے لم یزل کی بارگاہ میں سر جھکانے کے مشتاق بن گئے۔ مجدد الف ثانیؒ ایسے مسیحا نے چشم زدن میں ان کی کایا پلٹ دی اور انھیں تانبے سے کندن بنا دیا۔

جہانگیری سلطنت کے عمائدین جو کہ حضرت امام ربانی سے عقیدت رکھتے تھے، انھیں پہلے ہی دور دراز مقامات پر تعینات کر دیا گیا تھا۔ یہ بھی سلطنت کی ایک سیاسی چال تھی، تاکہ امام ربانیؒ سے عقیدت رکھنے والے یہ صاحبِ اقتدار کوئی ایسا قدم نہ اٹھا سکیں جس سے سلطنت کی عمارت دھڑام سے نیچے آ گرے اور حقیقت بھی یہی تھی۔

چنانچہ حضرت امام ربانیؒ کی قید کی خبر سن کر خانخاناں، خانِ اعظم، سید صدر جہاں، اسلام خاں، مہابت خاں، مرتضیٰ خاں، تربیت خاں، خان جہاں لودھی، سکندر خاں، حیات خاں، دریا خاں جو سلطنتِ جہانگیری کے مختار رکن تھے، سخت بے چین ہو گئے اور بغاوت پر تیار ہوئے۔ آپس میں خط و کتابت کی اور سب نے متفق ہو کر مہابت خاں کو جو کابل کی گورنری پر متعین تھا اپنا سرگروہ تسلیم کر لیا اور اسے فوج و خزانہ سے مدد دی۔ مہابت خاں نے بادشاہ کی اطاعت سے سر پھیر لیا اور بادشاہ کی طرف سے غزنی و خراسان اور توران سے امداد لے کر جہانگیر پر فوج کشی کا حکم دے دیا۔ خطبہ اور سکہ سے بادشاہ کا نام نکال دیا۔ جہانگیر بھی اپنا لاؤ لشکر لے کر مہابت خاں کے مقابلہ کو کابل کی طرف روانہ ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جہانگیر کے کابل کی طرف جانے کے بعد باقی امراء بادشاہ کے باغی ہو گئے۔ انھوں نے بھی انحراف کر کے ملک پر قبضہ کر لیا اور شاہی طرفداروں کو چن کر نورجہاں کے ملک

تھے برطرف کر دیا۔

اب معاملہ صاف تھا۔ بادشاہ کے باغی امراء نے حضرت امام ربانی سے استدعا کی کہ ہماری شاہی مسند کو رونق بخشی جائے اور اس کے ساتھ ہی اپنے سرانجام دیے ہوئے کام کی تفصیل آپ تک پہنچائی۔ مگر حضرت امام ربانی نے اس کے جواب میں تمام امراء کو تحریر فرمایا :

"مجھے سلطنت کی ہوس نہیں اور میں تمہارے فتنہ و فساد کو پسند نہیں کرتا۔ میں نے جو قید کی تکلیف اٹھائی وہ اور کام کے لیے ہے۔ جب وہ کام پورا ہو جائے گا میں خود بخود تمہاری کوشش کے بغیر ہی قید سے رہا ہو جاؤں گا۔ یہ فساد میرے کام کے لیے رکاوٹ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم بغاوت سے باز آ جاؤ اور فوراً اپنے بادشاہ کی اطاعت قبول کر و میں بھی انشاء اللہ جلد ہی قید سے آزاد ہو جاؤں گا۔"

ادھر مہابت خاں بادشاہ جہانگیر کے مقابلہ پر تھا۔ اس اثنا میں جہانگیر کی فوج میں سے بہت سے آدمی مہابت خاں کے ساتھ جا ملے اور بادشاہ محصور ہو گیا۔ آصف جاہ کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور اس کی اچھی خاصی درگت کی گئی۔ تمام فسادات کی جڑ بھی یہی تھا اور اسی کے پڑھائے ہوئے سبق نور جہاں کی معرفت جہانگیر کی اصلاح میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔

جہانگیر اور آصف جاہ کی گرفتاری کی خبر نور جہاں کو ملی تو وہ بھی امداد کے لیے پہنچی۔ مہابت خاں نے اُسے بھی قید کر لیا اور چاہتا تھا کہ ان تینوں کو حضرت امام ربانی رح کے قید کرنے کا مزہ چکھائے کہ عین اسی وقت حضرت امام ربانی رح کا وہ مکتوب جو آپ نے امراء کو لکھا تھا۔ مہابت خاں کو پہنچا اور اپنے ساتھی امراء کی طرف سے بھی حضرت امام ربانی رح کے مکتوب سے مشرف ہونے اور اس کے مضمون کے متعلق خطوط ملے۔ مہابت خاں حضرت امام ربانی رح کا حکم پڑھ کر جہانگیر کے پاس آیا اور کہا کہ میں حضرت کے حکم سے آپ کو رہا کرتا ہوں اور جہانگیر کو تخت پر بٹھا کر سوائے سجدہ کے تمام شاہی آداب بجا لایا۔

بڑے بڑے افسرانِ فوج، حکام اور عہدیداران حضرت امام ربانی کے متوسلین میں شامل تھے جن میں شیخ فرید۔ مہابت خاں، اسلام خاں، سکندر خاں، حکیم فتح اللہ خاں، شیخ عبدالوہاب، سید محمود اختر۔ سید احمد۔ خضر خاں لودھی۔ مرزا بدیع الزمان؟ خاں۔ خان جہاں۔ قلیچ خاں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان کی اصلاح کے لیے کس کس طبقہ کو چنا؟ یہ چیز آج بھی مسلمانوں کی رہنمائی کرے گی۔

سب سے اوّل آپ نے ان غربا و فقراء کی جماعت تیار کی جو عملی نمونہ بن کر لوگوں کے سامنے اسلامی روایات پیش کریں۔ اس لیے آپ نے روحانی کمالات سے کام لیا۔

دوسرے درجہ پر آپ نے اہلِ علم اور سنجیدہ طبقہ کے ذہنوں میں انقلاب پیدا کیا اور صحیح عقائد اسلامیہ ان تک پہنچا۔ اس کے لیے آپ علم و استدلال کی طاقت حرکت میں لائے۔

تیسرے درجہ پر ان امراء کو جو خالص سنی المذہب تھے اور با اختیار تھے، اپنی ذمہ داریاں محسوس کرنے کی تلقین کی اور ان کی عزت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں اپنے مکتوبات شریف سے نوازا اور ان کی تسلی و تشفی فرماتے رہے۔

چوتھے طبقہ پر بادشاہ جو کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ با اختیار تھا اس کی اصلاح کے لیے آپ کو مختلف صعوبتوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن یہ ایک نفیس نکتہ تھا جس کی طرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِہِمْ ہے۔
پہلے تین درجوں میں حضرت امام ربانی رحمۃ بہترین کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ اب صرف آخری درجہ باقی تھا اور اس میں کامیابی کے لیے آپ نے قید و بند کی مصیبتیں اٹھائیں۔

حقیقت میں اصلاح کے لیے قدم اٹھانا بوالہوس کی نظر میں ایک سیاسی شغل سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور وہ لوگ عمداً یا سہواً اس نیک نیتی کو سیاست میں کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت عرب کی زمین میں خدا کا نام بلند کرنے کے لیے مبعوث ہوئے تو بدباطن لوگوں نے یہی اتہام آپ پر لگایا کہ آپ بادشاہی چاہتے ہیں یا مال۔ جس چیز کی آپ کو تمنا ہو لیجیے، مگر ہماری اصنام پرستی میں خلل نہ دیجیے۔ اس وقت آپ نے کفار سے فرمایا کہ مجھے ان چیزوں کی خواہش نہیں، میں تو احکم الحاکمین کی وحدانیت کا سبق پڑھانے آیا ہوں۔ بالکل یہی طریقہ حضرت امام ربانی رحمۃ کے متعلق مخالفین نے اختیار کیا۔ حضرت امام ربانی کو ایک سیاسی مہرہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔

اصلاح کا کام جب ایک منظم طور پر ہو رہا ہو تو یقیناً تخت نشین خائف ہوتے ہیں اور درپے آزار ہو جاتے ہیں۔ حضرت امام ربانی رحمۃ کا طریق اصلاح اس طور سے بے غرض اور ریا سے پاک تھا کہ بادشاہ باوجود اپنے جاسوسوں کی رپورٹوں کے کوئی ایسی چیز اخذ نہ کر سکا جس میں سوائے خدا کا نام بلند کرنے اور شریعت محمدی کے اجرا، زہد و تقویٰ اور کفر و طغیان سے بیزاری کے اور کچھ مل سکتا اور سب سے بڑھ کر یہ چیز کہ جو متوسلین نے جوش محبت میں آ کر بادشاہ سے بغاوت کی تھی انھیں حضرت امام ربانی رحمۃ نے اس کام سے روک دیا اور وہ بدستور بادشاہ کو بادشاہ کی حیثیت سے دیکھنے لگے۔ اس سے بڑھ کر اخلاص کا امتحان جہانگیر کو کیا چاہیے تھا۔ طبیعت کچھ پلٹی اور حضرت امام ربانی کے متعلق سیاسی شکوک رفع ہو گئے اور آپ کی رہائی کے احکام جاری کر دیے۔

حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جہانگیر کو جو عقیدت ہو گئی تھی، اس کا ذکر کتابوں میں یوں لکھا ہے:

"کشمیر سے آتے جاتے دو دفعہ بادشاہ نے حضرت امام ربانی رحمۃ کے لنگر یا باورچی خانہ سے کھانا کھانے کا شرف حاصل کیا۔ کھانا اگرچہ سادہ تھا مگر بادشاہ نے کہا کہ میں نے ایسا لذیذ کھانا آج تک نہیں کھایا۔"

نیز یہ بھی لکھا ہے کہ جہانگیر آخر عمر میں کہا کرتا تھا:

"میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے نجات کی امید ہو، البتہ میرے پاس ایک دستاویز ہے، اس کو اللہ کے سامنے پیش کروں گا۔ وہ دستاویز یہ ہے کہ مجھ سے ایک روز شیخ احمد سرہندی رحمۃ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں جنت میں لے جائے گا تو تیرے بغیر نہ جائیں گے۔"

امام ربانی علیہ الرحمۃ کی تصنیفات میں سے حسب ذیل کتابوں کے نام ملتے ہیں:
(۱) مکتوبات شریف (۲) مبدأ و معاد (۳) معارف لدنیہ (۴) مکاشفات غیبیہ (۵) شرح رباعیات حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ (۶) رسالہ تہلیلیہ (۷) رسالہ فی اثبات النبوۃ (۸) رسالہ بسلسلہ حدیث وغیرہ۔
اب ہم آپ کی بلند پایہ تصنیف مکتوبات شریف سے چند مکتوب پیش کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ آپ کی تعلیمات کا صحیح مرقع ذہن میں آجائے۔

توحید

چاہیئے کہ پہلے باطل خداؤں کی نفی کرکے معبود برحق جل شانہ کا اثبات کرے اور جو کچھ چونی و چندی کے داغ سے موسوم ہو اس کو لاؔ کے نیچے لا کر خدائے بیچون کے ساتھ ایمان لائے۔ سب سے بڑھ کر عبادت کلمہ طیبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی نفی و اثبات میں ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا ہے کہ اگر میرے سوا سات آسمانوں اور سات زمینوں کو ایک پلہ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کو دوسرے پلہ میں رکھا جائے تو کلمہ والا پلہ بھاری ہوگا۔ کیوں افضل و راجح نہ ہو جب کہ اس کا ایک کلمہ تمام ماسوائے حق یعنی آسمانوں، زمینوں اور عرش و کرسی و لوح و قلم و عالم و آدم کی نفی کرتا ہے اور اس کا دوسرا کلمہ معبود برحق کا اثبات کرتا ہے، جو زمینوں اور آسمانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ حق تعالیٰ کے ماسوا جو کچھ انفس و آفاق میں ہے، سب چونی چندی کے داغ سے لتھڑا ہوا ہے۔ پس جو کچھ انفس و آفاق کے آئینوں میں جلوہ گر ہوا بطریق اولیٰ چند و چوں ہوگا جو نفی کے لائق ہے۔
حضرت خلیل علیہ الصلاۃ والسلام فرماتے ہیں اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (کیا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہو جو تم اپنے ہاتھ سے بناتے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اور تمہارے عملوں کو پیدا کیا ہے) ہمارا اپنا تراشا ہوا اور بنایا ہوا خواہ ہاتھ کے ذریعے ہو خواہ عقل و وہم کے ساتھ سب حق تعالیٰ کی مخلوق ہے اور عبادت کے لائق نہیں۔ عبادت کے لائق وہی خدائے بیچوں و بیچگوں ہے جس کے دامن ادراک سے ہماری عقل و وہم کا ہاتھ کوتاہ ہے۔ اور ہماری کشف و شہود کی آنکھ اس کی عظمت و جلال کے مشاہدہ سے خیرہ اور تباہ ہے۔ ایسے خدائے بیچوں و بیچگوں کے ساتھ غیب کے طریق کے سوا ایمان میسر نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ایمان شہود حق تعالیٰ کے ساتھ ایمان نہیں ہے بلکہ اپنی تراشیدہ اور بنائی ہوئی چیز کے ساتھ ہے کہ وہ بھی حق تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ گویا ایمان شہود وغیرہ کے ایمان کو حق تعالیٰ کے ایمان کے ساتھ شریک کرتا ہے۔ اَعَاذَنَا اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ عَنْ ذَالِكَ۔

ردِ شرک

حق تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ بنایا جائے۔ وہ نہ وجوب وجود میں اور نہ ہی عبادت کے استحقاق میں جس شخص کے

اعمال ریا و سمعہ سے پاک ہوں اور حق تعالیٰ کے سوا کسی اور سے اجر طلب کرنے کے فتنہ سے صاف نہ ہوں۔ اگرچہ وہ طلب قول اور ذکر جمیل سے ہو وہ شخص دائرہ شرک سے باہر نہیں ہے اور نہ ہی وہ موحد و مخلص ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، شرک میری امت میں اس چیونٹی کی رفتار سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے جو سیاہ رات میں سیاہ پتھر پر چلتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شرک اصغر سے بچو۔ یاروں نے عرض کیا کہ شرک اصغر کیا ہے؟ فرمایا ریا۔ شرک و کفر کی رسموں کی تعظیم کو شرک میں بڑا دخل اور رسوخ ہے اور شرک کی تصدیق اور اظہار کرنے والا اہل شرک میں سے ہے اور اسلام و کفر کے مجموعہ احکام پر عمل کرنے والا ہے۔ کفر سے بیزار ہونا اسلام کی شرط ہے اور شرک سے پاک ہونا توحید کا نشان۔ دُکھ، درد اور بیماریوں کو دُور کرنے کے لیے اصنام اور طاغوت یعنی بتوں اور شیطانوں سے مدد مانگنا جو جاہل مسلمانوں میں شائع ہے، عین شرک و گمراہی ہے اور تراشیدہ اور ناتراشیدہ پتھروں سے حاجتوں کا طلب کرنا یہ واجب الوجود جل شانہ کا محض کفر و انکار ہے۔ اللہ تعالیٰ بعض گمراہوں کے حال کی شکایت بیان فرماتا ہے:

يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ ۖ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ طاغوت کی طرف اپنا فیصلہ لے جائیں۔ حالانکہ ان کو حکم ہے کہ اس کا انکار کریں، لیکن شیطان یہ چاہتا ہے کہ ان کو سخت گمراہ کرے) اکثر عورتیں کمال جہالت کے باعث اس قسم کی ممنوع استمداد میں مبتلا ہیں اور ان بے معنی اسموں سے بلیہ و مصیبت کا دفع ہونا طلب کرتی ہیں، اور شرک اور اہل شرک کی رسموں کے ادا کرنے میں گرفتار ہیں۔ خاص کر مرض چیچک کے وقت نیک و بد عورتوں سے یہ بات مشہور و محسوس ہوتی ہے۔ شاید ہی کوئی عورت ہوگی جو اس شرک سے خالی ہو اور شرک کی کسی نہ کسی رسم میں مبتلا نہ ہو (مگر جس کو اللہ تعالیٰ بچائے) ہندوؤں کے دنوں کی تعظیم کرتی اور ان کی مشہور رسموں کو بجا لاتی ہیں اور اپنی عید مناتی ہیں۔ اور کافروں اور مشرکوں کی طرح ہدیہ اور تحفے اپنی بیٹیوں، بہنوں کو بھیجتی ہیں اور اس موسم میں اپنے برتنوں کو رنگ کر کے ان کو سُرخ چاولوں سے بھر کر بھیجتی ہیں اور اس موسم کا بڑا اعتبار اور شان بناتی ہیں۔ سب شرک اور دین اسلام کا کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم مُّشْرِكُونَ (ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے بلکہ شرک کرتے ہیں) اور حیوانات کو مشائخ کی نذر کرتے ہیں اور ان کی قبروں پر جا کر ذبح کرتے ہیں۔ روایات فقہیہ میں اس کو بھی شرک میں داخل کیا ہے اور اس بارہ میں بہت مبالغہ کیا ہے اور اس ذبح کو جن کے ذبیحوں کی قسم سے خیال کیا ہے جو ممنوع شرعی ہے اور شرک کے دائرہ میں داخل ہے۔ اس عمل سے بھی پرہیز کرنا چاہیے کہ اس میں بھی شرک کی بو پائی جاتی ہے۔ نذر ماننے اور منت کے وجوہ اور بہت ہیں، کیا حاجت ہے

کہ حیوان کے ذبح کی منت و نذر مانیں اور جن کے ذبیحوں سے ملائیں اور جن کے پجاریوں کے ساتھ مشابہت پیدا کریں۔ اسی طرح وہ روزے جو عورتیں پیروں اور بیبیوں کی نیت پر رکھتی ہیں اور اکثر ان کے ناموں کو اپنے پاس سے گھڑ کر ان کے نام پر روزے کی نیت کرتی ہیں ، ہر روزہ کے لیے خاص اہتمام کرتی ہیں اور خاص طور پر افطار کرتی ہیں اور روزوں کے لیے دنوں کا تعین بھی کرتی ہیں اور اپنے مطلبوں اور مقصدوں کو ان روزوں پر موقوف کرتی ہیں اور ان روزوں کے ذریعے ان کو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا جانتی ہیں، یہ سب عبادت میں شرک ہے اور غیر کی عبادت کے ذریعے اس غیر سے اپنی حاجتوں کا طلب کرنا ہے۔ (مکتوب ۴۱ جلد ثالث)

اتباعِ سنت

وظائف بندگی کو ادا کرنا اور حضرت جل مجدہٗ کی جانب ہمیشہ اور ہر وقت متوجہ رہنا پیدائش انسان کا مقصود ہے یہ بات صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے کہ سید الاولین و الآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہراً و باطناً ہر طرح سے پوری پوری اتباع کی جائے۔ (مکتوب ۵۴ جلد ثالث)

اخروی نجات اور ابدی فلاح سید الاولین و الآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے وابستہ ہے۔ اس لیے ایک مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت سے ہی درجۂ محبوبیت پر فائز ہوتا ہے اور آپ کی متابعت کے ذریعہ سے ہی مرتبہ عبدیت پر مشرف ہو سکتا ہے جو تمام مراتب کمال سے بالا ہے اور مقام محبوبیت کے حصول کے بعد حاصل ہوتا ہے، جو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں کامل تر ہوتے ہیں ان کو انبیاء بنی اسرائیل سے تشبیہ دی گئی۔ اولوا العزم انبیاء مرسلین بھی اتباع خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کرتے رہے۔ بلاشبہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنی پڑتی۔

آپ کی اتباع افضلیت کے باعث ہی آپ کی اُمت تمام امتوں سے افضل اور بہتر ہے۔ اسی سبب سے تمام اُمتوں میں سب سے زیادہ اور سب سے پہلے یہ امت داخلِ جنت ہوگی اور خداوند عالم کی اعلیٰ ترین نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوگی۔ مکتوب ۲۴۹ جلد اول)

سرورِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل دو قسم پر ہوتے تھے۔ ایک برطریق عبادت۔ دوم بر سبیل عادت۔ رسول اللہؐ کے جو عمل عبادت کے طور پر ہوتے تھے ان کے مخالف عمل کو بدعت منکر سمجھتا ہوں اور اس کی ممانعت اور بندش میں بہت زیادہ جدوجہد کرتا ہوں کیونکہ دین میں ایجاد یہی ہے جو مردود ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو افعال بر سبیل عرف و عادات ہوتے تھے، ان کے مخالف عمل کو بدعت منکر نہیں سمجھتا، اور نہ اُن کی ممانعت اور بندش میں ضرورت سے زیادہ جدوجہد کرتا ہوں، کیونکہ یہ عمل دین سے متعلق نہیں

ان کا وجود و عدم عرف کے سبب سے تھا۔ دین اور ملت کے سبب سے نہیں اور عرف و رواج سے مختلف ہوا کرتا ہے اور ایک شہر میں بھی زمانوں کے تفاوت سے عرف و عادت میں تفاوت واقع ہوجایا کرتا ہے، مگر اس کے باوجود اس قسم کی سنت کی پاسداری اور ایسی سنتوں پر عمل بھی بہترین نتیجہ پیدا کرتا ہے اور فتح سعادت ہے۔

(مکتوبات ۲۳۱ جلد اول)

فرزند! قیامت کو کام آنے والی چیز اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ صوفیا کے حال، وجد، علوم، معارف، رموز و اشارات اگر اس متابعت اور اتباع کے مطابق ہوں تو بہت بہتر ورنہ سراسر خسر و دین اور عتاب ربانی کا سبب ہیں۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا، ان کی حالت دریافت کی تو حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ سارے رموز و اشارات ختم ہوگئے۔ جملہ علوم و معارف ہیچ ثابت ہوئے، صرف ان چند رکعتوں نے کام دیا جو درمیان شب پڑھ لیا کرتا تھا۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین کے نقش قدم پر چلنے کو ضروری سمجھو۔ کیونکہ یہ برکت ہے اور سراسر برکت ہے اور شریعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے پوری پوری احتیاط برتو۔ نہ تو قولاً مخالفت اور نہ عملاً نہ اعتقاداً کیونکہ یہ مخالفت سراسر نحوست اور بربادی ہے۔

(مکتوب ۱۹۵ جلد اول)

اس مبارک اور پسندیدہ متابعت کا ایک ذرہ دنیا کی تمام لذتوں اور آخرت کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے۔ شرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت سے فضیلت حاصل ہوسکتی ہے اور ہر ایک عظمت کی صرف یہی ایک صورت ہے۔ قیلولہ (دوپہر کو آرام کرنا) جو متابعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت سے ہو اور کروڑوں شب بیداریوں سے افضل ہے جو متابعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محروم ہوں۔ عید الفطر کا افطار جس کا شریعت نے حکم دیا ہے ابد الآباد روزے رکھنے سے افضل ہے۔ اہل ریاضت بہت کچھ مجاہدے کرتے ہیں لیکن اگر وہ شریعت مطہرہ کے مطابق نہ ہوں تو بے کار ہیں اور بے سود۔ اگر ان اعمال شاقہ پر کوئی اجر مرتب بھی ہوتا ہے تو وہ صرف دنیاوی۔

(مکتوب ۱۱۴ جلد اول)

انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور تکلیفات شرعی کا مقصود اور حکمت نفس امارہ کی تعجیز و تخریب ہے۔ خواہشات نفسانی کو مٹانے اور دفع کرنے کے لیے احکام شرع وارد ہوئے ہیں۔ تقاضائے شریعت پر جس قدر عمل کیا جائے اسی قدر خواہش نفسانی میں زوال ہوتا ہے۔ لہٰذا خواہش نفس کے ازالہ میں کسی ایک حکم شرعی پر عمل کرنا ان ہزار سالہ مجاہدوں اور ریاضتوں سے بہتر ہے جو اپنی رائے سے ہوں بلکہ یہ تمام مجاہدے اور ریاضتیں جو شریعت غرا کے بموجب نہ ہوں، خواہش نفسانی کے لیے مؤید و مقوی ہیں۔

(مکتوب ۵۲ جلد اول)

درستی عقیدہ

حکماء اور اطباء کے نزدیک مسلم ہے کہ جب تک مریض کا مرض زائل نہ ہو کوئی غذا مفید نہیں بلکہ مقوی مرض ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے مرض کا ازالہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ مناسب غذا دیتے ہیں۔ اسی طرح جب تک کوئی شخص قلبی امراض میں مبتلا ہے کوئی عبادت یا کوئی اطاعت نفع نہیں دے سکتی بلکہ مضر ہے۔

(مکتوب ۱۵ جلد اوّل)

قرآن پاک اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بموجب جس طرح علما اہل حق نے عقائد کو سمجھا ہے اسی کے بموجب اپنے عقائد کو صحیح کرنا ہمارے اوپر لازم ہے۔ ہماری اور آپ کی سمجھ درجہ اعتبار سے ساقط ہے، جب تک ان بزرگوں کی توضیح اور تفسیر کے بموجب نہ ہو۔ ہر بدعتی اور ہر گمراہ اپنے عقائد باطلہ کے لیے کتاب اور سنت ہی کی آڑ لیا کرتا ہے، حالانکہ قطعاً بے سود اور بے معنی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے عقائد کو صحیح کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد حلال و حرام، فرض، واجب وغیرہ شرعی احکام کا علم۔ پھر اس کے بموجب عمل۔ اس کے بعد تزکیہ اور تصفیہ کا نمبر ہے۔ جب تک عقائد صحیح نہ ہوں احکام شریعت کی واقفیت فائدہ مند نہیں اور جب تک یہ دونوں نہ ہوں صفائی قلب ناممکن ہے۔ (مکتوب ۲۵ جلد اوّل)

فضائل صحابہ و حبّ اہلبیت رضی اللہ عنہم

حضرت شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی افضلیت، صحابہ و تابعین کے اجماع سے ثابت ہو چکی ہے۔ چنانچہ اس کو بزرگواران کی ایک بڑی جماعت نے نقل کیا ہے جن میں سے ایک امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ شیخ ابوالحسن اشعری جو اہل سنت کے رئیس ہیں فرماتے ہیں کہ شیخین کی افضلیت باقی امت پر قطعی ہے۔ سوائے جاہل یا متعصب کے اس کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ (مکتوب ۶۷ جلد ثانی)

شیخین کی فضیلت اور حسنین رضی اللہ عنہما کی محبت اہل سنت والجماعت کی علامتوں میں سے ہے، یعنی شیخین کی فضیلت جب حسنین کی محبت کے ساتھ جمع ہو جائے تو یہ امر اہل سنت و جماعت کے خاصوں میں سے ہے۔ شیخین کی فضیلت صحابہ اور تابعین کے اجماع سے ثابت ہو چکی ہے چنانچہ اس کو اکابر آئمہ نے نقل کیا ہے۔

عبدالرزاق نے جو اکابر شیعہ میں سے ہے جب انکار کی مجال نہ دیکھی تو بے اختیار شیخین کی فضیلت کا قائل ہو گیا اور کہنے لگا کہ جب حضرت علی شیخین رضی اللہ عنہم کو اپنے اوپر فضیلت دیتے ہیں تو میں بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ارشاد کے بموجب شیخین رضی اللہ عنہما کو حضرت علی پر فضیلت دیتا ہوں۔ اگر وہ فضیلت نہ دیتے تو میں بھی نہ دیتا۔ یہ بڑا گناہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کا دعویٰ کریں اور پھر ان کی مخالفت کریں۔ چونکہ حضرت حسنین رضی اللہ عنہما کی خلافت کے زمانہ میں لوگوں کے درمیان بہت فتنہ اور فساد ہو گیا تھا اور لوگوں کے دلوں میں کدورت پیدا ہو گئی تھی اور مسلمانوں کے دلوں میں عداوت اور

کینہ غالب آگیا تھا، اس لیے حسنینؓ کی محبت کو بھی اہل سنت وجماعت کی شرائط میں شمار کیا گیا تاکہ کوئی جاہل اس سبب سے حضرت خیر البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصحاب پر بدظنی نہ کرے اور آپ کے جانشینوں کے ساتھ بغض و عداوت حاصل نہ کرے۔ پس حضرت امیر المومنینؓ رضی اللہ عنہ کی محبت کو بھی اہل سنت وجماعت کی شرائط میں شمار کیا گیا تاکہ کوئی جاہل اس سبب سے حضرت خیر البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اصحاب پر بدظنی نہ کرے اور آپ کے جانشینوں کے ساتھ بغض و عداوت حاصل نہ کرے۔ پس حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی محبت اہل سنت وجماعت کی شرط ہے اور جو شخص یہ محبت نہیں رکھتا وہ اہل سنت سے خارج ہے اس کا نام خارجی ہے اور جس نے حضرت امیر المومنینؓ کی محبت میں افراط کی طرف کو اختیار کیا اور جس قدر کہ مناسب ہے اس سے زیادہ اس سے وقوع میں آتی ہے اور محبت میں غلو کرتا ہے اور حضرت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو سب وطعن کرتا ہے اور صحابہ اور تابعین اور سلف صالحین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے طریق کے برخلاف چلتا ہے وہ رافضی ہے۔ پس حضرت امیر المومنینؓ کی محبت میں افراط وتفریط کے درمیان جن کو روافض اور خارج نے اختیار کیا ہے، اہل سنت وجماعت متوسط ہیں اور شک نہیں کہ حق وسط میں ہے اور افراط وتفریط دونوں مذموم ہیں۔

چنانچہ حضرت امام حنبل رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر المومنینؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے کہا حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی تجھ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال ہے جس کو یہودیوں نے یہاں تک دشمن سمجھا کہ اس کی ماں پر بہتان لگایا اور عیسائیوں نے یہاں تک دوست رکھا کہ اس کو اس مرتبہ تک لے گئے جس کے وہ لائق نہیں تھا۔ یعنی خدا کا بیٹا کہہ دیا۔

پس خارجیوں کا حال یہودیوں کے حال کے موافق ہے اور رافضیوں کا حال نصاریٰ کے مطابق، کہ دونوں حق وسط سے بر طرف جا پڑے ہیں۔ وہ شخص بہت جاہل ہے جو اہل سنت وجماعت کو حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے محبوں سے نہیں جانتا اور حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی محبت رفض نہیں ہے، بلکہ خلفائے ثلاثہ سے تبرّیٰ اور بیزاری رفض ہے اور اصحاب کرام سے بیزار ہونا مذموم اور ملامت کے لائق ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر آل محمدؐ کی محبت رفض ہے تو جن و انس گواہ رہیں میں رافضی ہوں۔

اہل بیت کی محبت کا نہ ہونا، اہل سنت کے حق میں کس طرح گمان کیا جاتا ہے، جب کہ یہ محبت ان بزرگوں کے نزدیک ایمان کی جزو ہے اور خاتمہ کی سلامتی اس محبت کے راسخ ہونے پر وابستہ ہے۔

اہل بیت کی محبت اہل سنت وجماعت کا سرمایہ ہے۔ مخالف لوگ اس معنی سے غافل اور ان کی محبت متوسط سے جاہل ہیں۔

رام اور رحمٰن

خوب سمجھ لو کہ نہ صرف ہمارا اور تمھارا بلکہ ساری ارضی و سمائی کائنات کا رب ایک ایسا خداوند ہے جو سب سے نرالا ہے۔ جہاں توالد و تناسل، کفاءت و تماثل کو کبھی رسائی نہیں ہو سکتی اور موجودات علم کا کوئی شعبہ نہ تو اس کے ساتھ کیفیت اتحاد پیدا کر سکتا ہے اور نہ آسے اپنے اندر جذب کر سکتا ہے۔

بارگاہِ قدس اس سے کہیں بلند و برتر ہے کہ کائنات کا کوئی فرد شان صمدیت کو اپنے وجود میں پنہاں کر لے یا کوئی ہستی بعینہٖ ذاتِ احدیت کا ظہور ذاتی ہو۔ زمان و مکاں کے تقیدات سے قطعاً بے نیاز ہے، اس لیے کہ یہ سب چیزیں اس کی مخلوق ہیں۔ ہستی ازلی کی نہ کوئی ابتداء اور بقائے ابدی کی نہ کوئی انتہا ہے۔ پس پرستش کا حق دار وہی اور صرف وہی ہے۔

ہندو جس رام و کرشن کی پرستش کرتے ہیں یہ تو ماں باپ کے ذریعے پیدا ہوئے ہیں۔ رام دسرتھ کا بیٹا و لچھمن کا بھائی اور سیتا کا خاوند ہے۔ رام جب سیتا کو بچا نہ سکا تو پھر کسی اور کی کیا امداد کرے گا۔ درحقیقت اس تمام لغزش کی ذمہ دار تقلید محض ہے۔

پس یہ کہنا کہ رام و رحمٰن ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں کسی طرح بھی ٹھیک نہیں۔ ایک شے خود ہی خالق اور خود ہی مخلوق ہے جو جسمی مشابہت سے واحد نہ ہو، پھر وہ بے شبہ و بے مثال کس طرح ہو سکے۔ رام و کرشن کی پیدائش تک خدائے قدوس کو کسی نے رام و کرشن نہ کہا۔ ان کے پیدا ہونے کے بعد ذاتِ احدیت پر رام کرشن کا اطلاق کیا۔ اس دعویٰ کی روشن دلیل نہیں کہ ان ناموں کے پردے میں خدا تعالیٰ کے عوض رام و کرشن کی پرستش کی جاتی ہے وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ الخ اللہ کے ماسوا جن کی پرستش کرتے ہو یہ تو ایسے نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے از خود رکھ لیے، اللہ نے ان کی کوئی سند نازل نہ فرمائی۔

اللہ کے سچے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام جو قریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں، مبعوث ہوئے۔ یہ سب خلقت کو خالق کی عبادت کی ہدایت فرماتے رہے۔ انھوں نے لوگوں کو غیر اللہ کی عبادت سے منع کیا اور خود ایک با نیاز بندے کی طرح عظمت و جلال بے نیاز سے سلنہ برانداز رہے اور ہندوؤں کے اوتار مخلوقِ خدا کو اپنی پرستش کی ترغیب دلاتے رہے۔ یہ بات اور بھی عجیب ہے کہ پروردگار عالم کا وجود تسلیم کر لینے کے باوجود ساتھ ساتھ اس اعتقاد پر بھی قائم ہیں کہ احدیت مطلقہ ہمارے جسم میں نزول فرما کر مقید ہو کر رہ گئی ہے اور ان کی یہ رقیق ذہنی اختراع ان کے استحقاق عبادت کا جائز ذریعہ بنی رہی اور اسی بناء پر کہ معبودیت و الوہیت کا دائرہ تصرف محدود نہیں ہے ان کے کردار میں محرمات کو بھی حلت کا درجہ حاصل ہو گیا۔

اس کے برعکس انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام جن کے کردار ان کے گفتار کا آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے جس چیز کا اعلان

کے لیے ناجائز کیا۔ اس سے وہ خود پوری پابندی سے مجتنب رہے اور ترکیب بشریت کو اپنے اور اپنے ماسوا سب لوگوں کے لیے مساوی درجہ کی شے قرار دیا۔ (مکتوب ۴۷ جلد اوّل)

حقوق اللہ و حقوق العباد

اگر گناہ اس قسم کے ہیں کہ جن کا تعلق اللہ کے حقوق کے ساتھ ہے جیسے کہ زنا کرنا، شراب پینا، سرود اور ملاہی کا سننا، غیر محرم کی طرف بنظر شہوت دیکھنا، بغیر وضو کے قرآن مجید کو ہاتھ لگانا، بدعت بد اعتقاد رکھنا وغیرہ وغیرہ، تو ان کی توبہ ندامت اور استغفار اور حسرت و افسوس اور بارگاہِ الٰہی میں عذر خواہی کرنے سے ہے۔ اور اگر فرائض میں سے کوئی فرض ترک ہو گیا ہو تو توبہ میں اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔ اور اگر گناہ اس قسم کے ہیں جو بندوں پر مظالم اور ان کے حقوق سے تعلق رکھتے ہیں تو ان سے توبہ کا طریق کار یہ ہے کہ بندوں کے حقوق اور مظالم ادا کیے جائیں، ان سے معافی مانگیں اور ان پر احسان کریں اور ان کے حق میں دعا کریں۔ اور اگر مال و اسباب والا شخص مر گیا ہو تو اس کے لیے استغفار کریں اور اس کا مال اس کے وارثوں اور اولاد کو دے دیں اور اگر اس کا وارث معلوم نہ ہو تو مال و جنابت کے برابر صاحب مال اور اس شخص کی نیت کرکے جس کو ناحق ایذا دی ہو فقراء و مساکین پر صدقہ خیرات کر دیں۔

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ جو شخص صبح و شام توبہ نہ کرے وہ ظالم ہے۔ عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ حرام کے ایک پیسے کا پھیر دینا سو پیسوں کے صدقہ کرنے سے افضل ہے۔ بعض بزرگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ایک رتی چاندی کا پھیر دینا اللہ تعالیٰ کے نزدیک چھ سو حج مقبول سے افضل ہے۔

بعض علمائے ربانی فرماتے ہیں کہ جب تک انسان ان دس چیزوں کو اپنے اوپر فرض نہ کرلے کامل ورع حاصل نہیں ہوتی:

۱۔ زبان کو غیبت سے بچائے
۲۔ بدظنی سے بچائے
۳۔ مسخرہ پن یعنی ہنسی ٹھٹھے سے پرہیز کرے۔
۴۔ حرام سے آنکھ بند کرلے۔
۵۔ سچ بولے۔
۶۔ ہر حال میں اللہ تعالیٰ ہی کا احسان جانے تاکہ اس کا نفس مغرور نہ ہو۔
۷۔ اپنا مال راہِ حق میں خرچ کرے اور باطل میں خرچ کرنے سے بچے۔
۸۔ اپنے نفس کے لیے بلندی اور بڑائی طلب نہ کرے۔

۹ ۔ نماز کی محافظت کرے ۔
۱۰ ۔ اہل سنت وجماعت پر استقامت اختیار کرے ۔
(مکتوب ۹۶ جلد ثانی)

ولایت کا نشان اتباع شریعت ہے ۔

وہ علامت جس سے اس گروہ کا سچا یا جھوٹا جدا ہو سکے یہ ہے کہ جو شریعت پر استقامت رکھتا ہو اور اس کی مجلس میں دل کو حق تعالیٰ کی طرف رغبت و توجہ پیدا ہو جائے اور ما سوا کی طرف سے دل سرد ہو جائے، وہ شخص سچا ہے اور درجات کے اختلاف کے بموجب اولیاء کے شمار میں ہے۔ مگر یہ بھی ان لوگوں کے لیے ہے جو اس گروہ کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں اور جن کو اس گروہ کے ساتھ مناسبت نہیں وہ محروم مطلق ہیں۔
(مکتوب ۹۷ جلد ثانی)

حق تعالیٰ کی طرف پہنچانے کے دو راستے ۔

وہ راستے جو جناب قدس جل شانہٗ کی طرف لے جانے والے ہیں دو ہیں: ایک وہ راستہ ہے جو قرب نبوت سے تعلق رکھتا ہے اور اصل الاصل تک پہنچانے والا ہے۔ اس راستے کے پہنچنے والے بالاصالت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور ان کے اصحاب ہیں اور امتوں میں سے بھی جس کسی کو چاہیں اس دولت سے سرفراز کرتے ہیں مگر یہ لوگ قلیل بلکہ اقل ہیں۔ اس راستہ میں واسطہ اور حیلولہ نہیں۔ ان واصلوں میں سے جو کوئی فیض حاصل کرتا ہے کسی کے واسطہ کے بغیر حاصل کرتا ہے اور کوئی ایک دوسرے کا حائل نہیں ہوتا ۔
دوسرا وہ راستہ ہے جو قرب ولایت سے تعلق رکھتا ہے ۔ قطب، اوتاد اور ابدال و نجیب اور عام اولیاء اللہ سب اسی راستے سے واصل ہوئے ہیں۔ راہ سلوک اسی سے مراد ہے بلکہ جذبہ متعارفہ بھی اسی میں داخل ہے۔ اس راستہ میں واسطہ اور حیلولہ ثابت ہے ۔ اس راہ کے واصلوں کے پیشوا اور ان کے گروہ اور ان بزرگواروں کے فیض کا سرچشمہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں اور یہ عظیم الشان مرتبہ انہی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اس مقام میں گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں مبارک قدم حضرت علی المرتضیٰؓ کے سر مبارک پر ہیں اور حضرت فاطمہؓ اور حضرات حسنینؓ بھی اس مقام میں ان کے ساتھ شریک ہیں اور اس راہ سے جس کسی کو فیض و ہدایت پہنچتا ہے، انہی کے وسیلے سے پہنچتا ہے کیونکہ اس راہ کا آخری نکتہ یہی ہے اور اس مقام کا مرکز انہی سے تعلق رکھتا ہے۔ جب حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا دورہ تمام ہوا، یہ عظیم الشان مرتبہ ترتیب وار حسنین رضی اللہ عنہما کے سپرد ہوا اور ان کے بعد بارہ اماموں میں سے ہر ایک کے ساتھ ترتیب و تفصیل وار قرار پایا - ان بزرگوں کے زمانہ میں اور ایسے ہی ان کے انتقال فرما چکنے کے بعد جس کسی کو فیض و ہدایت پہنچتا رہا - انہی بزرگوں کے واسطہ و حیلولہ سے پہنچتا رہا

گو اپنے زمانہ کے اقطاب و نجبا ہی ہوئے ہیں، لیکن سب کا ملجا و ماوی یہی بزرگوار ہوئے ہیں۔ کیونکہ اطراف کو مرکز کے ساتھ ملحق ہونے سے چارہ نہیں۔ حتیٰ کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کی نوبت آ پہنچی، اور منصب مذکور اس بزرگ قدس سرہٗ کے سپرد ہوا۔ مذکورہ بالا اماموں اور حضرت شیخ قدس سرہٗ کے درمیان کوئی شخص اس مرکز پر مشہور نہیں معلوم ہوتا۔ اس راستہ میں تمام اقطاب و نجبا، کا فیوض و برکات کا پہنچنا شیخ قدس سرہٗ ہی کے وسیلہ شریف سے مفہوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ مرکز شیخ قدس سرہٗ کے سوا کسی اور کو میسر نہیں ہوا۔

(مکتوب ۱۲۳ جلد ثالث)

باطن کی صفائی بھی ضروری ہے۔

غرض ظاہر کو احکام شرعیہ سے آراستہ کر کے باطن کی طرف متوجہ ہونا چاہیے، تاکہ غفلت کے ساتھ آلودہ نہ رہے، کیونکہ باطن کی امداد کے بغیر احکام شرعی سے آراستہ ہونا مشکل ہے۔ علما فتوے دیتے ہیں اور اہل اللہ باطن کا کام کرتے ہیں۔ باطن میں کوشش کرنا ظاہر کی کوشش کو مستلزم ہے اور جو کوئی باطن ہی کی درستی میں لگا رہے اور ظاہر کی پروا نہ کرے، وہ ملحد ہے اور اس کے وہ باطنی احوال استدراج ہیں۔ باطنی حالات کے درست ہونے کی علامت ظاہر کو احکام شرعیہ سے آراستہ کرنا ہے، استقامت کا طریق یہی ہے۔

(مکتوب ۸۷ جلد ثانی)

اتباع شریعت ہی کرامت ہے۔

جب خوارق کا ظاہر ہونا ولایت میں شرط نہیں، ولی اور غیر ولی میں امتیاز کس طرح ہوگا۔ اور حق مبطل سے کس طرح جدا ہوگا۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ متمیز نہ ہو اور گو حق بجانب اور مبطل ملا جلا رہے۔ حق و باطل کا ملا جلا رہنا اس دنیا میں لازم ہے اور ولی کی ولایت کا علم کچھ ضروری نہیں۔ بہت سے اولیاء اللہ ایسے ہیں کہ ان کو خود اپنی ولایت کا علم نہیں۔ پس دوسرے کو ان کی ولایت کا علم کس طرح ضروری ہو سکتا ہے۔ نبی میں خوارق کا ظہور ضروری ہے تاکہ نبی اور غیر نبی میں امتیاز ہو جائے، کیونکہ نبی کی نبوت کا علم واجب ہے اور ولی چونکہ لوگوں کو اپنے نبی کی شریعت کی دعوت دیتا ہے۔ نبی کا معجزہ اس کے لیے کافی ہے۔ اگر ولی اپنے نبی کی شریعت کے سوا کی دعوت دیتا تو اس کے لیے خوارق کا ہونا ضروری تھا۔ چونکہ اس کی دعوت اپنے نبی کی شریعت کے ساتھ مخصوص ہے، اس لیے خوارق کی کچھ ضرورت نہیں۔ علمائے ظاہر شریعت کی دعوت دیتے ہیں اور اولیاء ظاہر شریعت اور باطن شریعت کی بھی۔ وہ پہلے مریدوں اور طالبانِ خدا کو توبہ وانابت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور احکام شریعت کی بجا آوری کی ترغیب دیتے ہیں پھر ذکر حق سبحانہٗ کی راہ دکھاتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ اپنے تمام اوقات کو ذکر حق سبحانہٗ سے ایسا معمور رکھے کہ ذکر غلبہ پائے اور مذکور کے سوا

کسی چیز کو دل میں نہ رہنے دے۔ یہاں تک کہ مذکور کے سوا تمام سے ایسی فراموشی حاصل ہو جائے کہ اگر تکلف سے اشیا کو یاد کرے تو یاد نہ آئیں۔ یقینی امر ہے کہ ولی کے لیے اس دعوت کے واسطے کہ جس کا تعلق ظاہر شریعت اور باطن شریعت سے ہے۔ خوارق کی ضرورت نہیں۔ پیری و مریدی سے مراد یہی دعوت ہے جو خوارق سے سروکار اور کرامت سے تعلق نہیں رکھتی۔ باوجود اس کے کہ ہم کہتے ہیں مرید رشید اور طالب مستعد سلوک کے طریق میں ہر گھڑی اپنے پیر کے خوارق و کرامات کا احساس کرتا ہے اور معاملہ غیبی میں ہر وقت اُس سے مدد مانگتا اور پاتا ہے اور دوسروں کے لیے ظہور و خوارق ضروری نہیں۔ مگر مریدوں کے لیے خوارق پر خوارق اور کرامات پر کرامات ہیں۔ مرید اپنے پیر کی خوارق کا احساس کس طرح نہ کرے کہ پیر نے مرید کے مردہ دل کو زندہ کیا ہے اور مشاہدہ و مکاشفہ تک پہنچا دیا ہے۔ عوام کے نزدیک ایک مردہ جسم کا زندہ کرنا بڑی بات ہے اور خواص کے نزدیک قلب و روح کا زندہ کرنا قاطع دلیل ہے۔ خواجہ محمد پارسا قدس سرہٗ رسالہ قدسیہ میں لکھتے ہیں کہ چونکہ مردہ جسم کا زندہ کرنا اکثر لوگوں کے نزدیک بڑا اچھا کام سمجھا جاتا تھا، اہل اللہ ایسے زندہ کرنے سے منہ پھیر کر روح کے زندہ کرنے میں مشغول ہو گئے ہیں اور طالب کے مردہ دل کو زندہ کرنے کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ حقیقت میں مردہ جسم کو زندہ کرنا قلب کے زندہ کرنے کے مقابلہ میں اس چیز کی مثل ہے جو راستے میں پھینک دی گئی ہو، کیونکہ جسم کا زندہ کرنا چند روزہ ہی زندگی کا سبب ہے اور قلب کا زندہ کرنا ہمیشہ کی زندگی کا وسیلہ ہے، بلکہ ہم کہتے ہیں کہ اہل اللہ کا وجود حقیقت میں کرامات میں سے ایک کرامت ہے اور لوگوں کو حق سبحانہٗ کی طرف ان کی دعوت حق تعالیٰ کی رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے اور مُردہ دلوں کا زندہ کرنا بڑی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اہل اللہ زمین والوں کے لیے امان اور زمانہ کے لیے غنیمت ہیں۔ ان کی شان میں ہے کہ ان کے طفیل سے لوگوں کے لیے بارش ہوتی ہے اور ان ہی کے طفیل سے لوگوں کو رزق ملتا ہے، ان کا کلام دوا ہے اور ان کی نظر شفا ہے، وہ اللہ کے ہم نشین ہیں اور وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کا ہمنشین بدبخت نہیں رہتا اور ان کا محب زیاں کار نہیں ہوتا۔ وہ علامت کہ جس سے اس گروہ کا محق مبطل سے ممتاز ہو جائے، یہ ہے کہ اگر ایسا شخص ہو جو شریعت پر ثابت قدم ہو اور اس کی صحبت میں دل کو حق سبحانہٗ کی طرف رغبت و توجہ پیدا ہوتی ہو اور ماسوائے حق سے بے توجہی مفہوم ہوتی ہو۔ وہ شخص حق بجانب ہے اور حسب تفاوت درجات اولیاء کے شمار میں ہے۔ یہ علامت امتیاز بھی مناسبت والوں کے لیے ہے جو شخص محض بے مناسبت ہو وہ بالکل محروم ہے۔

(مکتوب ۸۲ جلد ثانی)

دنیاوی کاروبار بھی ذکر الٰہی ہیں

جاننا چاہیے کہ ذکر سے مراد غفلت کا دور کرنا ہے، جس طرح کہ ہو سکے، نہ یہ کہ ذکر کلمۂ نفی و اثبات کے تکرار یا اسم ذات

کے تکرار میں منحصر ہے جیسا کہ گمان کیا جاتا ہے۔ پس اوامر شرعیہ کی بجا آوری اور نواہی شرعیہ کی رعایت کے ساتھ ذکر ہے۔ کیونکہ رعایت مذکورہ کے ساتھ ان کاموں کے کرنے کے وقت امر کرنے والا اور منع کرنے والا (اللہ جل شانہٗ) ان کے کرنے والے کے مدنظر ہوتا ہے۔ پس غفلت کی گنجائش نہیں، لیکن وہ ذکر جو مذکور (یعنی حق سبحانہٗ) کے اسم وصفت کے ساتھ واقع ہو، جلدی اثر کرنے والا اور مذکور کی محبت بخشنے والا اور مذکور تک جلد پہنچانے والا، بخلاف اس ذکر کے جو اوامر کی بجا آوری اور نواہی سے باز رہنے کے ساتھ واقع ہو۔ وہ ان اوصاف سے چنداں بہرہ ور نہیں۔ اگرچہ بعض افراد میں کہ جن کا ذکر اوامر کی بجا آوری اور نواہی سے باز رہنے کے ساتھ ہوتا ہے یہ اوصاف کمی کے طور پر پائے جاتے ہیں۔ حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا تابادی قدس سرہٗ علم کی راہ سے خدا تعالیٰ تک پہنچتے ہیں اور نیز وہ ذکر جو اسم اور صفت کے ساتھ واقع ہو وسیلہ ہے اس ذکر کا جو حدود شرعیہ کی رعایت کے ساتھ حاصل ہو۔ کیونکہ سب کاموں میں احکام شرعیہ کی رعایت کرنی ناصب شرع کی محبت کے بغیر میسر نہیں اور یہ کامل محبت اللہ تعالیٰ کے اسم وصفت کے ذکر سے وابستہ ہے، لیکن پہلے وہ ذکر چاہیے تاکہ اس ذکر کی دولت سے مشرف ہو جائے۔ (مکتوب ۱۲ جلد ثانی)

خلافِ شرع کشف۔

جاننا چاہیے کہ صوفیوں کے اعتقادات آخر کار یعنی منازل سلوک کے پورا ہونے اور ولایت کے درجوں کی نہایت کو پہنچنے کے بعد وہی ہیں جو علمائے اہل حق کے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ علماء کو نقل یا استدلال سے حاصل ہوئے ہیں اور صوفیوں کو کشف یا الہام سے۔ اگرچہ صوفیائے کرام سے بعض کو اثنائے راہ میں سکر و غلبہ حال کے سبب سے ان اعتقادات کے خلاف امور ظاہر ہوتے ہیں، لیکن اگر اس کو ان مقامات سے گزار کر نہایت کار کو پہنچا دیں تو وہ امور نیست و نابود ہو جاتے ہیں، ورنہ وہ اسی مخالفت پر باقی رہتے ہیں۔ پس سالک کو چاہیے کہ حقیقت کار پر پہنچنے سے پہلے باوجود اپنے کشف و الہام کی مخالفت کے علماء اہل حق کی تقلید کو لازم جانے اور علماء کو حق بجانب اور اپنے تئیں خطا کرنے والا خیال کرے، کیونکہ علماء کی دلیل انبیاء علیہم الصلوات والسلام کی تقلید ہے، جو قطعی وحی کے ساتھ مؤید اور خطا اور غلط سے معصوم ہیں، اور سالک کا کشف و الہام جو وحی کے ساتھ ثابت شدہ احکام کا مخالف ہو خطا اور غلط ہے۔ پس اپنے کشف کو علماء کے قول پر مقدم رکھنا حقیقت میں احکام قطعیہ منزلہ پر مقدم رکھنا ہے اور یہ عین گمراہی اور محض خسارہ ہے، اور نیز جس طرح کتاب وسنت کے بموجب اعتقاد ضروری ہے، اسی طرح ان کے مقتضا پر عمل کرنا اس طریق پر کہ مجتہدین نے کتاب وسنت سے استنباط کیا ہے اور ان سے احکام نکالے ہیں۔ یعنی حلال و حرام و فرض و واجب و سنت و مستحب و مکروہ و مشتبہ اور ان احکام کا جاننا بھی ضروری ہے۔ مقلد کے لیے جائز نہیں کہ مجتہد کی

رائے کے خلاف کتاب وسنت سے احکام اخذ کرے اور ان پر عمل کرے۔ اُسے چاہیے کہ عمل میں اس مجتہد کے مذہب سے جس کا یہ مقلد ہے۔ قول مختار کو اختیار کرے اور رخصت سے بچ کر عزیمت پر عمل کرے۔

(مبدا و معاد)

آخری ایام | حضرت امام ربانی رحؒ نے وفات سے چند ماہ پہلے اکثر دوستوں سے ارشاد فرمایا کہ مجھے اپنی عمر تریسٹھ سال کی معلوم ہوتی ہے اور یقیناً ایسا ہونا تھا۔ آفتاب نبوت سے ضیا حاصل کرنے والا ماہ منیر بھی اتباع سنت سے کیسے غفلت کرے۔ اختیاری معاملات میں جب اُس کا یہ حال ہوگا تو غیر اختیاری معاملات میں من جانب اللہ سنت کی اتباع اسے حاصل ہوگی۔

چنانچہ حضرت امام ربانی رحؒ ایام مرض میں تنہائی بہت پسند کرتے تھے۔ ایک روز حرم سرا کی دہلیز میں بیٹھے ہوئے تھے کہ فرمایا، اس موسم سرما میں جو دو مہینے تک آئے گا ہم اس گھر میں نہ سوئیں گے۔ حاضرین نے عرض کیا کہ آپ شاید خلوت گاہ میں آرام فرمائیں گے۔ فرمایا نہیں، ان گھروں میں سے کسی میں بھی نہیں۔ حاضرین نے عرض کی کہ پھر کس جگہ؟ آپ نے فرمایا میں دیکھ رہا ہوں جو کچھ ہونے والا ہے۔

اس کے بعد آپ نے ارشاد و ہدایت کا سب کام صاحبزادوں کے سپرد فرمایا اور اپنا تمام وقت تلاوت قرآن مجید اور اذکار و اشغال میں مشغول فرمانے لگے۔ سوائے نماز کے خلوت سے باہر نہ آتے۔ نوافل اور صدقات و خیرات کی بھی اس زمانہ میں بہت کثرت فرمائی۔ درویشوں کو کپڑے بھی تقسیم فرمائے۔ ذوالحجہ میں آپ کو ضیق النفس کا دورہ ہوگیا۔ اگرچہ آپ پر ضعف غالب آگیا تھا، لیکن عبادات و نوافل کے اوقات میں سر مو فرق نہ آیا، بدستور نماز با جماعت ادا فرماتے رہے۔

وفات | وصال سے پہلی رات آپ نے اپنے خادموں کو ارشاد فرمایا کہ تم نے بہت محنت کی، صرف آج کی رات اور محنت ہے۔ اس رات آپ نے کئی دفعہ پنجابی مصرعہ پڑھا ؏

آج ملا وا کو نت سوں سکھی سب جگہ ولیاں وار

اسی رات آپ نے وہ تمام دعائیں پڑھیں جن کا صحیحین میں ذکر ہے۔ رات کے آخری حصہ میں وضو فرمایا اور تہجد کھڑے ہو کر ادا کی اور فرمایا یہ ہماری آخری تہجد ہے۔ فجر کی نماز با جماعت ادا کی، حسب عادت مراقبہ اور اشغال بھی فرمایا۔ نماز اشراق اور ادعیہ ماثورہ بھی پڑھیں۔ اور اسی دن یعنی ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ کو تریسٹھ سال کی عمر میں اپنے محبوب حقیقی کو یاد کرتے کرتے خدا کے یہ سچے عاشق حقائق کے دریا میں تیرنے والے وصول الی اللہ کے زینہ، حکمت کے دفینہ، رحمت کے خزانہ، کاملین کی محبت طریقت کے نور، علماء کے سردار اور اہل جہان کی زینت اس دار فانی سے رفیق اعلیٰ سے جا واصل ہوئے۔

خلفا | حضرت مجدد الف ثانی رحؒ کے خلفا بہت زیادہ ہیں، اور ان کے فیض یافتگان کا سلسلہ بھی بہت وسیع ہے۔ ان خلفا میں شیخ آدم بنوری رحؒ اور خواجہ محمد معصوم خاص طور پر مشہور ہیں۔ شیخ آدم بنوری پہلے شاہی لشکر میں ملازم تھے۔ پھر ترک ملازمت کے بعد حضرت مجدد رحؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نعمت باطنی حاصل کی۔ قرآن مجید پڑھا اور علوم ظاہری حاصل کیے، پھر ایسے درجہ

کو پہنچ کر ہزاروں کی تعداد میں طلباء آپ کی خانقاہ میں حاضر ہو کر درس پاتے۔ لنگر کا یہ عالم تھا کہ ہزاروں افراد مفت کھانا کھاتے۔ لاکھ کے قریب مرید اور سو کے قریب آپ کے خلفا ہیں۔ آپ کے مریدوں میں پٹھانوں کی کثرت تھی۔ ۱۰۵۳ھ میں لاہور تشریف لے گئے۔ چونکہ آپ کے ساتھ سینکڑوں کی جمعیت رہتی تھی، اس لیے بعض لوگوں نے شاہجہان بادشاہ سے کہا کہ شیخ کسی وقت بھی حکومت کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ شاہجہان نے اپنے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خان اور ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کو دریافت حال کے لیے بھیجا۔ ان کی تحقیقات کے نتیجہ میں شاہجہان متردد ہو گیا اور شیخ کو مشورہ دیا کہ وہ حج کو چلے جائیں تاکہ بادشاہ کے خدشات دور ہو جائیں۔ شیخ نے تعمیل کی اور مدینہ منورہ چلے گئے۔ وہیں وفات پائی۔

حضرت مجددؒ کے دوسرے مشہور خلیفہ شیخ محمد معصومؒ ہیں، جو حضرت مجدد کے فرزند تھے۔ کہا جاتا ہے اورنگ زیب بھی آپ کا مرید تھا۔ آپ نے اپنے فرزند شیخ سیف الدین کو شاہی لشکر کی رشد و ہدایت پر مامور کر رکھا تھا۔ نواب مکرم خاں گورنر لاہور بھی آپ کا بڑا معتقد تھا اور سب کچھ چھوڑ کر شیخ کی خدمت میں رہنے لگ گیا تھا۔

فارسی کا مشہور شاعر ناصر علی سرہندی بھی شیخ معصومؒ کا مرید تھا، اس نے آپ کی تعریف میں کئی شعر کہے۔

شیخ معصومؒ اورنگ زیب کے دسویں سال جلوس ۱۰۷۹ھ میں فوت ہوئے۔ مزار مبارک سرہند میں ہے۔ یہ مزار اورنگ زیب کی بیٹی روشن آرا نے تعمیر کرایا تھا۔

حضرت کے اقوال اور ارشادات حضرت مجدد کے ارشادات عالیہ بے شمار ہیں، ان کے مکتوبات میں علم و عرفان کا سمندر موجیں مار رہا ہے۔ آپ کی مختلف تصانیف سے بعض نادر اقوال و ارشادات انتخاب کر کے پیش کیے جاتے ہیں۔

فرماتے ہیں:

—— گناہ کے بعد شرمندگی بھی توبہ ہی کی ایک شاخ ہے۔

—— جو شخص صبح و شام توبہ نہ کرے وہ ظالم ہے۔

—— مومن ہو یا کافر کسی کی دل آزاری نہ کرو، اس لیے کہ کفر کے بعد یہی سب سے بڑا گناہ ہے۔

—— اپنی حاجت پر دوسروں کی حاجت کو مقدم رکھنا ہی حقیقی کرم ہے۔

—— آخرت کے کام آج ہی کرو اور دنیا کے کام کل پر چھوڑ دو۔

—— تمام مخلوقات میں انسان ہی سب سے زیادہ محتاج ہے۔

—— جو شخص کافروں کو عزیز رکھتا ہے اس نے اہل اسلام کو ذلیل کیا۔

—— لوگوں کے ساتھ زیادہ میل جول رکھنا اذیت کا باعث ہوتا ہے۔

—— بُرے علماء وہ ہیں، جو لوگوں سے عزت کے طالب رہتے ہیں۔

—— جب تک کوئی شخص قلبی امراض میں مبتلا ہے کوئی عبادت اور اطاعت فائدہ نہیں دے سکتی، بلکہ مضر ہے۔

——— گوشہ نشینی یہ ہے کہ تو عبث اور بے کار کاموں سے منہ موڑے رکھے۔ اور ترک دنیا سے مراد یہ ہے کہ تجھے دنیا سے کوئی رغبت نہ ہو۔ نہ کسی شے کے ملنے کی خوشی ہو اور نہ کسی شے کے چلے جانے کا غم۔

——— جب تک عقائد صحیح نہ ہوں احکام شریعت سے آگہی فائدہ مند نہیں اور جب تک یہ دونوں نہ ہوں قلب کی صفائی ممکن نہیں۔

——— نفس کے لیے سب سے مشکل کام شریعت کی پابندی ہے۔

——— کمال اسلام یہ ہے کہ اس دنیوی غرض کو چھوڑ دیا جائے جو کفار کے ساتھ وابستہ ہو۔

——— بہترین احسان وہ ہے جو ہمسایے کے ساتھ کیا جائے۔

——— خدا کے دشمنوں کے ساتھ دوستی خدا اور اس کے رسول کے ساتھ دشمنی کی طرف لے جاتی ہے۔

——— مغروروں کے ساتھ تکبر سے پیش آنا صدقہ ہے۔

——— پیغمبر کی بات کے مقابلہ میں حکما کے اقوال چھوڑ دو۔

——— اہل اللہ زمین والوں کے لیے امان اور زمانہ کے لیے غنیمت ہیں۔

——— ظاہری ولادت کی زندگی چند روزہ ہے اور ولادت معنوی کی زندگی ابدی ہے۔

——— عوام کے نزدیک ایک مردہ جسم کو زندہ کرنا بڑی بات ہے اور خواص کے نزدیک قلب و روح کو زندہ کرنا بڑی قاطع دلیل ہے۔

——— جسم کا زندہ کرنا چند روزہ زندگی کا سبب ہے اور قلب کا زندہ کرنا دائمی زندگی کا وسیلہ ہے۔

——— اہل اسلام کی عزت کفر اور اہل کفر کی ذلت میں ہے۔

———

حضرت خواجہ قیوم ثانی محمد معصوم رح

ولادت ——————— سرہند ۱۰۰۷ھ

وفات ——— ——— " ۱۰۷۹ھ

حضرت خواجہ محمد معصوم امام ربانی حضرت محبوب سبحانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رح کے تیسرے فرزند اور آپ کے دوسرے مشہور خلیفہ تھے۔ ان کے متعلق حضرت مجدد فرمایا کرتے تھے کہ میرے فرزند محمد معصوم کی دنیا میں آمد ہمارے لیے بڑی مبارک ثابت ہوئی۔ حضرت مجدد آپ کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔

۱۱ شوال ۱۰۰۷ھ میں شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں سرہند میں پیدا ہوئے۔ آپ جامع علوم معقول و منقول، قطب الوقت اور بڑے صاحب درجات و کشف و کرامات بزرگ تھے۔ قیوم ثانی آپ کا لقب تھا۔ آپ کے والد نے آپ کے علمی شوق کو بھانپ لیا تھا چنانچہ نہایت شفقت اور محبت سے خود ہی انہیں تعلیم دی۔ مختلف کتابیں آپ کو پڑھائیں۔ فرمایا کرتے تھے، تعلیم سے جلد فراغت حاصل کرو، مجھے تم سے بہت کام لینے ہیں۔ چنانچہ آپ نے تین ماہ میں قرآن مجید حفظ کر لیا اور سولہ برس کی عمر میں تمام علوم ظاہری سے فارغ اور سب علوم میں کامل و اکمل ہو گئے۔ پھر تحصیل حال میں لگ گئے۔ اللہ تعالیٰ کے کرم اور والد بزرگوار کی توجہ سے تھوڑے ہی عرصہ میں احوال و اسرار سے واقف ہو کر قطبیت کے بڑے درجہ کو پہنچ گئے۔

آپ کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ دہلی کے سفر کے دوران حضرت مجدد الف ثانی رح کے ہمراہ مخدوم زادے بھی تھے۔ ایک دن حضرت مجدد حجرہ سے باہر تشریف لائے کہ تھوڑی دیر آرام کریں، دیکھا کہ آپ کی جگہ حضرت قیوم ثانی آرام فرما رہے ہیں۔ آپ فوراً واپس چلے گئے۔ خدام نے عرض کیا اجازت ہو تو ہم انھیں بیدار کر دیں۔ فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ سے خوف آتا ہے کہ خدا کا ایک دوست آرام کر رہا ہے اور میرے جانے سے اسے رنج پہنچے۔ غرض حضرت مجدد خاصی دیر تک دھوپ میں تشریف فرما رہے حالانکہ مسجد کا فرش خاصا گرم تھا، مگر آپ دھوپ ہی میں بیٹھے رہے، یہاں تک کہ خواجہ قیوم ثانی خود بیدار ہوئے اور والد بزرگوار کو دھوپ میں دیکھ کر ان کے لیے جگہ خالی کر دی۔

کہا جاتا ہے کہ تقریباً نو لاکھ افراد نے آپ کے دست حق پر گناہوں سے توبہ کی اور مرید ہوئے۔ آپ کے خلفا کی تعداد بھی سات ہزار کے قریب بیان کی جاتی ہے۔ آپ کی صحبت کیمیا اثر کا یہ عالم تھا کہ طالب حق میں ایک ہفتہ میں فنا حاصل ہو جاتی تھی اور مہینہ بھر کے عرصہ میں درجہ ولایت کو پہنچ جاتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک ہی نظر میں طالب کو جمیع مقامات سے گزار دیتے۔ کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر بھی آپ کا مرید تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ مرید نہ تھا بلکہ صرف عقیدت مند تھا اور

جب بھی آپ کی مجلس میں جاتا دوسرے عوام کی طرح جہاں جگہ ملتی وہاں بیٹھ جاتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کا رعب اس قدر غالب تھا کہ اورنگ زیب آپ سے زبانی گفتگو نہ کرسکتا تھا، جو کچھ کہنا ہوتا لکھ کر خدمت میں پیش کر دیتا۔ اورنگ زیب کی لڑکی زیب النساء کو بھی آپ سے بہت عقیدت تھی اور آپ کی خدمت میں حاضر رہا کرتی تھی۔ ایک دن آپ نے اس سے خوش ہو کر فرمایا تیرا حشر حضرت خاتون جنت رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ آپ کے دستر خوان پر چار ہزار آدمی کھانا کھایا کرتے تھے، چار ہزار خدام تھے، جو ہر وقت خدمت کے لیے حاضر رہتے تھے۔ جب آپ حرمین شریفین کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے تو عرب اور عجم کے کئی متعدد لوگ آپ سے بیعت ہوئے۔ جب آپ نے جہاز سے اتر کر خشکی کا سفر اختیار کیا تو فرمایا آخر کعبہ بکمال بشاشت مجھ سے بغلگیر ہوا ہے۔ فرمایا کرتے تھے مکۂ معظمہ کے قیام کے دوران مجھ پر امور عجیبہ و غریبہ ظاہر ہوتے ہیں اور اکثر کعبہ مجھ سے گلے لگ کر ملتا ہے۔

آپ کے زمانہ میں ایک جوگی جادو کے زور سے آگ باندھ دیتا تھا اور اس طرح آگ نقصان نہ پہنچاتی تھی۔ اس شعبدہ باز کو دیکھ کر لوگ جوگی کے پرستار ہو گئے تھے۔ آپ کے پتہ چلا تو لکڑیوں کو آگ سلگانے کا حکم دیا۔ جب شعلے بھڑکنے لگے تو آپ نے آیت کریمہ پڑھ کر آگ پر دم کیا اور ایک شخص سے کہا کہ آگ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرو۔ وہ خاصی دیر تک آگ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتا رہا۔ آگ نے اسے کوئی ضرر نہ پہنچایا۔

آپ نے اپنے صاحبزادے شیخ سیف الدین کو اورنگ زیب کے لشکر میں ارشاد و ہدایت کے لیے بھیجا تھا۔ اورنگ زیب ان کے ارشادات کو بڑی توجہ سے سنا کرتا تھا۔

فرحت الناظرین میں لکھا ہے کہ شیخ محمد معصوم کے دوسرے بھائی شیخ محمد یحییٰ، شیخ محمد سعید اور مذکور الذکر کے دو فرزند شیخ سعد الدین اور شیخ عبدالاحد المعروف بہ میاں گل کئی بار "بادشاہ دین پناہ" کی بارگاہ میں پہنچے اور الطاف شاہنشہی سے فیضیاب ہوئے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالمگیر کو صرف شیخ محمد معصوم ہی سے نہیں بلکہ اس سارے خاندان سے عقیدت تھی۔

نواب مکرم خاں لاہور کا گورنر تھا، وہ شیخ کا بہت معتقد تھا، چنانچہ ملازمت ترک کر کے اور سب کچھ چھوڑ کر شیخ محمد معصوم کی خدمت میں رہنے لگ گیا تھا۔ اس سلسلے میں واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے گورنر سے ترک ملازمت کے بعد ایک موقعہ پر اس کی عمر پوچھی۔ اس نے کہا چار سال۔ اورنگ زیب مسکرا دیا۔ مکرم خاں نے کہا حضور مسکرانے کی کوئی بات نہیں میری اصل مدت عمر وہی ہے جو میں نے اپنے شیخ کی خدمت میں گزاری۔ باقی سب وبال آخرت ہے۔ نواب مکرم خاں وہی ہے جس کے دربار سے مشہور شاعر غنیمت وابستہ تھا۔

مآثر الامراء میں لکھا ہے کہ جب نواب آصف جاہ نے بہادر شاہ اول کے زمانہ میں کچھ عرصہ کے لیے گوشہ نشینی اختیار کی تو وہ نواب مکرم خاں کی خدمت میں استفادہ کے لیے جایا کرتے تھے۔ فارسی کا مشہور شاعر ناصر علی سرہندی بھی خواجہ محمد معصوم کا مرید تھا۔ اس نے آپ کی تعریف میں کئی اشعار کہے۔ مثلاً :

چراغ ہفت محفل خواجہ معصوم — منور از فروغش ہند تا روم
رود جائیکہ جا آنجا نہ گنجد — نظر بے کار ماند پا نہ گنجد
روائے ماہتابی شرع بر دوش — چو صبح از پاکیٔ باطن قلب پوش
ستون بارگاہ شرع اسلام — بہ افعال پیمبر گام بر گام
زہے عزت کہ رب العزتش داد — کہ بر سر تاج قیومیش بنہاد!

خواجہ محمد معصوم کی وفات ۱۰۷۹ھ میں ہوئی۔ آپ کا مزار مبارک سرہند میں ہے جسے شاہجہان کی بیٹی روشن آرا نے تعمیر کرایا تھا۔ اس روضہ کے متعلق ناصر علی نے ایک قصیدہ لکھا ؎

اے زہے مولد قدسی نسب و ہفت سما — رفعت بام تو از عالم ایجاد ورا
مظہر نور خدا ست مزار ملکوت! — مرقد خواجہ کنم نام تو با عرش خدا

روضہ کی شان میں ناصر علی نے ایک غزل بھی کہی جس کا مطلع ہے ؎

در قفس است نشیں از کشائش نا امید اینجا
برنگ دانہ از ہر قفل مے روید کلید اینجا

آپ کی وفات کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ آخری عمر میں بہت کمزور ہو گئے تھے۔ وفات سے تین روز قبل دوستوں کو دعا کے لیے لکھا کہ خاتمہ بالخیر کی دعا کریں۔ ایک دن پہلے جمعہ کے روز مسجد میں تشریف لے گئے۔ حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا "امید نہیں کل اس وقت تک میں دنیا میں رہوں۔" اس کے بعد حاضرین کو بہت سی نصیحتیں کیں اور گھر واپس تشریف لے آئے۔ رات جیسے گزری گزار دی۔ صبح کے وقت نماز فجر ادا کی اور مراقبہ میں بیٹھ گئے۔ سورۂ یٰسین تلاوت فرماتے رہے۔ اسی روز دوپہر کے وقت اس عالم فانی سے عالم جاوداں کو رخصت ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اورنگ زیب کے زمانہ شہزادگی کا ذکر ہے کہ ایک مرتبہ خواجہ معصوم دکن سے گزر رہے تھے، اورنگ زیب بارہ ہزار کی تھیلی لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ اس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آئے اور سلطنت کی شہادت دی۔ جب اورنگ زیب تخت نشین ہوا تو اس کی بہن فخر سے کہا کرتی تھی کہ میرے بھائی نے تو سلطنت بارہ ہزار میں خریدی ہے۔

ایک شخص اپنے بیٹے کو لے کر حاضر خدمت ہوا کہ یہ لڑکا دنیا کے سارے کام چھوڑ کر ایک عورت پر فریفتہ ہو گیا ہے۔ آپ اُسے نصیحت فرمانے لگے۔ وہ بولا میں تو نیکی کے کوچہ سے گزر ہی نہیں سکتا۔ یعنی اس عورت کے عشق سے باز نہیں آ سکتا ہاں اگر آپ میرے حال کو ناپسند فرماتے ہیں تو میری حالت بدل دیں۔ حضرت نے فرمایا اچھا، ہم نے تمہاری حالت بدل دی۔ اس شخص نے اسی وقت عورت کے عشق سے دستبرداری اختیار کر کے توبہ کر لی۔

حضرت شیخ رحمکارؒ (کاکا صاحبؒ)

ولادت ———— ۹۸۳ھ

وفات ———— زیارت کاکا صاحب ۱۰۶۳ھ

حضرت شیخ رحمکارؒ سرحد کے ان عظیم المرتبت اولیائے کرام میں سے ہیں جنھوں نے سرحد میں دین اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں بہت گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

نام ونسب! حضرت کاکا صاحب کا اصل نام کستیر گلؒ تھا۔ مگر ہر خاص وعام کے ساتھ رحیمانہ برتاؤ کے باعث شیخ رحمکار کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اس نام نے اتنی شہرت پائی کہ آپ کا اصل نام بہت کم لوگ جانتے تھے۔ پشتو زبان میں بزرگ یا بہت قابلِ عزت شخص کو "کاکا" بھی کہا جاتا ہے۔ شیخ رحمکار کی چونکہ بہت زیادہ عزت کی جاتی تھی اس لیے عزت کے طور پر لوگ آپ کو "کاکا" کہہ کر بھی پکارتے تھے۔ مزید تعظیم کے لیے صاحب کا لفظ بڑھا کر "کاکا صاحب" کہہ کر پکارنے لگے۔ اسی نام کی نسبت سے آپ کی اولاد "کاکاخیل" کہلاتی ہے۔

والد ماجد کا نام نامی شیخ بہادر باباؒ ہے، جو ایک صاحب کے نام سے مشہور تھے اور اپنے وقت کے قطب گزرے ہیں۔ حضرت کاکا صاحب حسینی سید ہیں سلسلۂ نسب تیئیسویں پشت میں حضرت امام حسینؓ سے اس طرح ملتا ہے:

شیخ رحمکار بن شیخ سید بہادر بن سید نادر صاحب بن سید غالب بن سید آدم بن سید یٰسین بن سید محبت بن سید باقر بن سید محمود بن سید احمد بن سید سیف الدین بن سید سعد الدین بن سید علی اکبر بن سید لقمان بن سید رمال بن سید قاف بابا بن سید قارح بن سید خاتم بن سید اسماعیل بن حضرت امام جعفرؒ بن حضرت امام باقر بن حضرت امام زین العابدین بن حضرت امام زین العابدین بن حضرت سیدنا حسین علیہ السلام۔

۳۰ شعبان یا یکم رمضان ۹۸۳ھ میں ولادت ہوئی۔ اس وقت ہندوستان پر شہنشاہ اکبر کی حکومت تھی۔

تعلیم اور عبادت وریاضت! زمانۂ طفولیت ہی میں علوم ظاہری کی کتابیں پڑھ لی تھیں، پھر حدیث وتفسیر اور دوسرے علوم وفنون میں دسترس حاصل کی۔ آپ کے استاد کا نام اخون درین بتایا جاتا ہے۔ عبادت وریاضت کا شوق

---

[۱] غالباً فارسی لفظ کستری کو پشتو میں کستیر بنا دیا گیا جس کا معنی مشک ہے۔ بعض کسی خوشبودار پھول کا نام کستیر بتاتے ہیں۔

[۲] حضرت شیخ بہادر صاحب موجودہ قصبہ زیارت سے چھ میل جنوب مغرب کی طرف جنگل میں رہتے تھے، یہیں حضرت کاکا صاحب کی ولادت ہوئی۔

بچپن ہی میں ترقی کر گیا تھا، حالت یہ تھی کہ ہر وقت تنہائی میں اللہ کی عبادت کیا کرتے۔ کھانا پینے کا بہت کم خیال ر
چنانچہ ضعف اور ناطاقتی اکثر غالب رہتی۔

نقل مکانی | والد کی وفات کے تین سال بعد آپ اُس جگہ چلے آئے جسے اب میلہ کہتے ہیں اور زیارت کا کا صاحب
ڈیڑھ میل جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔ یہاں پہاڑیوں میں ایک چشمہ کے پاس قیام فرمایا۔ یہ آپ کی جوانی کا زمانہ
آپ کے زہد و تقویٰ اور ولایت کی خبر دُور دُور تک مشہور ہو چکی تھی، چنانچہ اُس پاس کے علاقوں سے لوگ آپ کو
کے لیے آنے لگے اور میلہ میں اچھی خاصی رونق ہونے لگی۔

شہنشاہ اکبر سے ملاقات | اتفاق سے شہنشاہ اکبر دہلی سے پشاور آیا۔ اُس نے کاکا صاحب کی بزرگی کا حال سُن رکھا تھا۔ چنانچہ ا
کے مقام پر حضرت سے ملاقات کی اور بہت عزت و تکریم کی۔ اکبر نے حضرت کو اپنے ساتھ لے
بار بار پوچھا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں مگر حضرت نے ہر مرتبہ یہی کہا کہ میں اللہ کے سوا کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔
کے انکار کے باوجود اکبر نے علاقہ خٹک اور اتمان بلاق آپ کو جاگیر کے طور پر دے دیے۔ آپ نے وہی جاگیر اپنے مرید
خٹک کو جو مشہور شاعر اور سردار خوش حال خاں خٹک کا باپ تھا، مرحمت کر دی۔

طریقت | آپ نے صرف اپنے والد بزرگوار سے بیعت کی تھی۔ دوسرے مشائخ کرام سے صحبتیں ہوئیں اور ان سے
استفادہ بھی کیا، مگر بیعت کسی سے نہ کی۔ گویا آپ کا طریقہ اویسی تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ نے مست بابا سے طریقہ سہ
میں بیعت کی تھی۔ مست بابا نے انھیں خرقۂ خلافت بھی عطا فرمایا تھا۔ بعد ازاں آپ نے متعدد علما و مشائخ سے ملا
کیں اور آخر میں طریقہ چشتیہ میں بیعت کی۔

عادات | اکثر خاموش رہتے۔ بہت کم قیل و قال فرماتے۔ اگر عقیدت مندوں کی خواہش پر خلوت میں کبھی کچھ ارشاد ف
تو نہایت نرم اور آہستہ زبان میں مختصر طور پر بات کرتے۔ کبھی ہنسی یا قہقہہ نہ لگایا۔ ہنسی کے موقع پر صرف تبسم فرماتے

کام اور طرزِ زندگی | اپنی نگرانی اور سرپرستی میں سات مدرسے جاری کیے۔ تین میں قرآن مجید کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ قائم ت
اور باقی چار میں دوسرے علوم پڑھائے جاتے تھے۔ آپ کی اپنی مجلس میں علمائے کرام اکثر حاضر رہتے۔
علمی اور دینی بحثوں میں آپ کا فیصلہ آخری سمجھا جاتا تھا۔ تمام متنازعہ فیہ مسائل میں علماء آپ ہی سے رجوع کرتے۔
آپ کے کتب خانے میں ہزاروں کتابیں تھیں جن سے طلبا استفادہ کرتے تھے۔ ہر جمعہ اور پنجشنبہ کے روز اہل علم کے لیے
وعظ ہوتا۔ اتنی مدھم آواز میں وعظ فرماتے کہ دُور بیٹھے ہوئے لوگ مشکل سے سُن سکتے تھے۔ غربا کے لیے ایک وسیع لنگر جار
تھا۔ عقیدت مند جو کچھ پیش کرتے وہ لنگر کے لیے وقف ہو جاتا۔ اپنے پاس کبھی کچھ نہ رکھا۔

وفات | ۲۴ رجب ۱۰۶۲ھ (۲۰ یا ۲۱ جون ۱۶۵۲ء) بروز جمعۃ المبارک شاہجہان کے عہد میں وفات پائی۔ عمر مبارک ا
کی تھی۔

عجیب واقعہ کاکا صاحبؒ کی وفات کے موقع پر ہر علاقے کے مرید موجود تھے اور ہر کوئی چاہتا تھا کہ کاکا صاحبؒ اسی کے علاقے میں دفن کیے جائیں۔ آخر طویل بحث کے بعد طے پایا کہ آپ کی نعش قبیلہ یوسف زئی اور خٹک کی سرحد پر دفن کی جائے۔ چنانچہ جنازہ اٹھایا گیا۔ جب جنازہ اس جگہ پہنچا جہاں آپ کا مزار ہے تو لوگ سستانے کے لیے ٹھہر گئے اور جنازہ رکھ دیا گیا۔ جب دوبارہ اٹھانے لگے تو جنازہ اٹھایا نہ جا سکتا تھا۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ ایک مرید نے کہا کہ میں نے کاکا صاحب کی زبانی ایک مرتبہ سنا تھا انھوں نے فرمایا اس جگہ کی زمین نے مجھ سے عرض کیا تھا کہ مجھے آپ کا مدفن بننے کا شرف بخشا جائے جو میں نے منظور کر لیا۔ غالباً اسی لیے جنازہ یہاں سے اٹھ نہیں سکا۔ بالآخر آپ کو اسی جگہ دفن کیا گیا۔

زیارت کاکا صاحبؒ جس جگہ آپ کا مزار ہے وہ جگہ زیارت کاکا صاحب کے نام سے مشہور ہے اور اچھا خاصا قصبہ ہے پشاور کی تحصیل نوشہرہ سے قریباً چھ میل جنوب میں ہے اور نوشہرہ سے زیارت کاکا صاحب تک نیم پختہ سڑک ہے جس پر تانگوں اور لاریوں کے ذریعے آمد و رفت ہوتی ہے۔

خلفاء آپ کے خلفاء بہت ہیں جن میں کئی مشہور بزرگ تھے۔ یہاں طوالت کے ڈر سے ان کے حالات نظر انداز کیے جاتے ہیں۔

اولاد کاکا صاحبؒ کے پانچ فرزند تھے۔ سب سے بڑے فرزند کا نام شہید بابا تھا جو والد بزرگوار کے جانشین تھے۔ شہید بابا نام کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو حق و صداقت کی حمایت کی پاداش میں شہید کیا گیا تھا۔ آپ کا مزار بھی زیارت کاکا صاحب ہی میں ہے۔

شہید بابا کے علاوہ حضرت صاحب کے چار صاحبزادے اور تھے، حاجی محمد، مرزے خاں، حلیم گل اور نجم الدین۔

کاکا صاحبؒ کے والد بزرگوار، دادا اور پردادا تینوں مشہور بزرگ گزرے ہیں اور یہ تینوں سرحد کی سرزمین ہی میں مدفون ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا کہ اسی ضمن میں ان تینوں کا بھی تھوڑا تھوڑا حال بیان کر دیا جائے۔

بہادر باباؒ آپ کا نام سید بہادر ہے مگر بہادر بابا یا ایک صاحب کے نام سے مشہور ہیں۔ کاکا صاحبؒ کے والد بزرگوار تھے۔ نیز ان کے ظاہری مربی اور مرشد بھی ہیں۔ اپنے زمانہ کے قطب تھے۔ ہزاروں لوگوں نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ آپ کا مزار پر انوار قصبہ زیارت کاکا صاحب سے قریباً ۶ میل جنوب مغرب میں واقع ہے۔ کاکا صاحبؒ کی ولادت یہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ مزار تک پہنچنے کے لیے پہاڑوں اور گھنے جنگلات سے گزرنا پڑتا ہے اور راستہ بہت دشوار گزار ہے تاہم بہادر باباؒ کے عقیدت مندوں کو بابا صاحبؒ کا والہانہ عشق وہاں کھینچے لے جاتا ہے۔ چنانچہ مزار مقدس پر ہر وقت زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔

مست باباؒ آپ کاکا صاحبؒ کے دادا اور بہادر باباؒ کے والد بزرگوار ہیں۔ اصل نام سید نادر ہے، مگر مست بابا ہی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ آپ زیارت کاکا صاحب کے شمال کی طرف پہاڑوں میں رہا کرتے تھے۔ چونکہ آپ مستانہ رنگ کے بزرگ تھے اس لیے مست بابا نام پڑ گیا۔ اپنے وقت کے بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ مزار پر انوار زیارت کاکا صاحب سے سات آٹھ میل دور جنوب مغرب میں غیر آباد جگہ پر جنگل میں واقع ہے۔ مگر زائرین کے قیام و طعام، پانی اور دوسری ضروریات کا خاطر خواہ انتظام ہے۔

غالب باباؒ | غالب بابا کا نام سید غالب ہے۔ غالب بابا کہلاتے ہیں۔ نسبت بہاوالدینؒ کے عالم بزرگوار ہیں۔ آپ ضلع پشاور کی تحصیل ڈنشہرہ کے جنوبی علاقہ خوڑہ میں رہتے تھے۔ آبائی سلسلہ سہروردیہ تھا۔ مگر سلسلہ چشتیہ میں بھی بیعت کی اور مدارج سلوک طے کیے۔ ہندوستان کے بعض شہروں کی سیاحت کے بعد وطن واپس لوٹے اور فیوض و برکات سے لوگوں کو مستفید کرنے لگے۔

علاقہ خوڑہ میں مردبہ نام ایک گاؤں کے قریب آپ کا مزار بتایا جاتا ہے۔ یہ مزار قصبہ زیارت کا کا صاحب سے قریباً ۱۸ میل جنوب مغرب میں چراٹ کی پہاڑی سے تین چار میل دُور واقع ہے اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ

ولادت ـــــــــــ نگراوان متصل لکھنؤ ۱۰۶۰ھ

وفات ـــــــــــ اورنگ آباد (دکن) ۱۱۴۲ھ

حضرت نظام الدین اورنگ آبادی خطۂ پاکستان وہند کے ان مشائخ کرام میں سے ہیں جنھوں نے اس برصغیر میں اسلام کی اشاعت کی اور اس کفرستان کو ضیائے اسلام سے منور کیا۔

آپ ۱۰۶۰ھ میں کاکوری موضع نگراواں متصل لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سلسلہ نسب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے واسطے سے حضرت صدیق اکبرؓ سے جاملتا ہے اور والدہ ماجدہ کی طرف سے سلسلہ حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ تک پہنچتا ہے۔

تحصیل علم کے لیے آپ دہلی آئے اور طالب علمی کا زمانہ یہیں گزارا۔ پھر تحصیل علم کے شوق میں شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے مریدوں میں شامل ہو گئے۔ شیخ کلیم اللہ کی مجلس میں رہ کر علوم ظاہری میں کمالات حاصل کیے اور انھیں آپ سے بہت محبت ہو گئی۔ شیخ نے مرید کو اپنے خاص رنگ میں رنگ کر صاحب ولایت کر دیا اور خرقۂ خلافت عطا کر کے روحانی تعلیم دینے کے لیے دکن کی طرف بھیج دیا۔ ہدایت تھی کہ اورنگ آباد میں قیام کریں، چنانچہ مرشد کے ارشاد کی تعمیل میں دولت آباد ہوتے ہوئے اورنگ آباد پہنچے اور اشاعت اسلام میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں چاروں طرف آپ کے علم وعرفان کی دھوم مچ گئی۔ ہزاروں لوگ بارگاہ میں حاضر ہو کر حلقۂ مریدین میں شامل ہونے لگے۔ آپ نے اس سرزمین کفر میں اسلام اور سلسلہ چشتیہ کا چراغ روشن کیا، سارے دکن میں آپ کا نام زبان زد خاص وعام ہو گیا۔

آپ بڑی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ سادہ غذا کھاتے اور سادہ لباس پہنتے، بہت زیادہ مہمان نواز تھے۔ آپ کا لنگر ہر خاص وعام کے لیے کھلا رہتا۔ سماع سے بہت دلچسپی تھی۔ اکثر سماع کی محفلیں منعقد کرتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی مرید نے عرض کیا، میں نے رباب بجانے والے ایک قوال کو آپ کے لیے نوکر رکھ لیا ہے، اگلی مجلس میں حاضر کروں گا۔ سیر اولیاء کے مصنف خواجہ گل محمد احمد پوری بھی وہاں موجود تھے، انھوں نے پوچھا آیا صدائے رباب دوسرے سازوں سے زیادہ موثر ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

از کاسۂ رباب مرا نغمتے رسید ! !
شد آفتاب ہر کہ ازاں ذرۂ چشید !

پھر کر رد و اشعار فرمائے ـــ

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست　　از کجا می آید این آواز دوست
نے ز تار و نے ز چوب و نے ز پوست　　خود بخود می آید این آواز دوست

سلطنت حیدرآباد دکن کے بانی قمرالدین علی خاں کو ۱۱۳۴ھ میں دکن کی تسخیر کا خیال آیا۔ اس وقت وہ مغلیہ فوج میں صوبیدار تھا۔ چنانچہ شیخ کلیم اللہ شاہجہاں آبادی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے روحانی مدد چاہی۔ آپ نے فرمایا ہم نے دکن کے لیے نظام الدین کو مقرر کیا ہے، تم ان سے جا کر ملو۔ قمرالدین نے عرض کیا کوئی سفارش عطا فرمائیں۔ شیخ نے ایک ٹھیکری پر یہ عبارت لکھ دی:

"کتا آ رہا ہے ہڈی ڈال دو۔"

قمرالدین نے یہ سفارش لے کر دکن پر چڑھائی کر دی۔ پھر دکن کے ضلع اورنگ آباد میں حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صبح کا وقت تھا اور آپ کھانا تناول فرما رہے تھے۔ قمرالدین نے کسی شخص کے ذریعہ وہ ٹھیکری اندر پہنچا دی اور بتایا کہ ایک شخص آیا ہے اور حضرت شیخ کلیم اللہ کی طرف سے یہ ٹھیکری لایا ہے۔ شیخ نظام الدین نے ٹھیکری کی تحریر چومی، آنکھوں سے لگائی اور جو روٹیاں سامنے رکھی تھیں ان میں سے سات روٹیاں اٹھائیں ان پر ایک ہڈی رکھی اور ملازم کو دی کہ قمرالدین کو دے دے۔ آپ نے ملازم سے کہا مہمان کو پہلے کھانا کھلا دو، ہم آتے ہیں۔

قمرالدین خاں اولیاء اللہ کے ایسے نکات و رموز سے واقف تھے۔ وہ روٹی لے کر کھانے لگے۔ جب فارغ ہو گئے، تو خواجہ نظام الدین تشریف لے آئے اور دریافت حال کے بعد پوچھا روٹیاں ختم ہو گئیں یا اور چاہئیں؟ قمرالدین نے عرض کیا، حضور خوب سیر ہو کر کھا لیا اب حاجت نہیں رہی۔ آپ نے اُسے قریب بلایا وہ دو زانو ہو کر ادب سے بیٹھ گیا اور اپنا مدعا بیان کیا۔ آپ نے ماجرا سُن کر اپنے پیرہن خاص سے ایک زرد حصہ پھاڑا اور اس کے سر پر باندھ کر فرمایا جا آج سے تو "نظام" ہے۔

قمرالدین وہاں سے رخصت ہو کر لڑائی میں شریک ہو گیا اور تھوڑے ہی دنوں میں دکن فتح کر لیا۔ قمرالدین کی بجائے نظام الملک آصف جاہ اوّل کہلانے لگے۔ اور شاہی لباس میں زرد رنگ کی دستار کو اپنا طرۂ امتیاز بنایا۔ پھر اُسے مزید کئی فتوحات حاصل ہوئیں اور حیدرآباد کی سلطنت وسیع ہو گئی۔

قمرالدین کو یہ سب شان و شوکت خواجہ نظام الدین ہی کی بدولت حاصل ہوئی تھی، چنانچہ وہ آپ کا بہت زیادہ عقیدتمند ہو گیا اور کبھی فراموش نہ کیا۔ ایک مدت کے بعد اورنگ آباد آیا اور بہت سارا روپیہ خواجہ کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا کہ میں آپ کی سکونت کے لیے ایک محل تعمیر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے دریافت فرمایا تم میرے لیے کتنے عرصے میں محل تیار کرا لوگے؟ بولا دو سال کے عرصے میں۔ آپ نے حکم دیا کہ خانقاہ کے سامنے اس چبوترہ پر سارا روپیہ ڈال دو۔

اس زمانہ میں نوٹ وغیرہ نہ تھے صرف روپے ہوتے تھے اور ان کا وزن ہوتا تھا۔ وزن اور تعداد دونوں زیادہ ہوتے تھے اور انھیں ڈھیر کی صورت میں رکھ لیا جاتا تھا۔ چنانچہ قمرالدین نے سارا روپیہ گاڑیوں پر لادا ہوا تھا، حکم ملتے ہی اس نے

گاڑیوں بھر کے روپیہ اُترواکر چبوترے پر ڈال دیا۔ جب سارا روپیہ جمع ہوگیا تو حضرت خواجہ نے فقرا اور مساکین کو جمع کیا اور انھیں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ پھر مسکرا کر قمرالدین کی طرف دیکھا اور فرمایا تم نے تو دو سال میں ایک محل تعمیر کرنے کا کہا تھا اور ہم نے بارہ پل میں کئی محل تعمیر کر دیے۔ قمرالدین آپ کی اس سخاوت سے بہت متاثر ہوا۔

دوسری مرتبہ اس نے تیرہ موضعات آپ کی خدمت میں نسلاً بعد نسل بغرض پرورش خاندان برطور نذر پیش کیے۔

اس وقت سے آج تک خواجہ نظام الدین کے عرس کے موقع پر جو تبرک شاہ وقت کو جاتا ہے وہ نان کی سات ٹوٹیاں اور ایک ہڈی ہوتی ہے جو زرد رنگ کے کپڑے میں باندھ کر درگاہ سے بھیجی جاتی ہے۔ جو بادشاہ حضرت کے مزار پر آتا ہے وہ زرد رنگ کا کپڑا سر پر باندھ کر آتا ہے۔

خواجہ نظام الدینؒ کو اپنے پیر و مرشد سے بہت محبت تھی۔ اتفاق دیکھیے کہ آپ کا اور آپ کے پیر و مرشد کا سن وصال بھی ایک ہی ہے۔ یعنی خواجہ صاحب ۱۲ ذی قعدہ ۱۱۴۲ھ سہ شنبہ کی رات کو فوت ہوئے، عمر مبارک ۸۲ سال کی تھی اور پیر و مرشد کا وصال ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ میں ہوا۔ پیر و مرشد اور مرید دونوں کی عمر بھی اکیاسی سال تھی۔

آپ کے پانچ فرزند تھے، سب سے بڑے کا نام محمد فخرالدین فخر جہاں تھا جو آپ کے خلیفہ اعظم تھے۔ دوسرے چار فرزندوں میں حضرت محمد عمادالدین، حضرت محمد معین الدین، حضرت مخدوم بہاؤالدین اور حضرت غلام اللہ تھے۔

۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے بعد حضرت کی اولاد ترک وطن کر کے اورنگ آباد میں اپنے دادا کے مزار پر رہنے لگی۔ نظام آصف جاہ کے عطا کردہ ۱۳ موضعات کی آمدن پر ان کی زندگی بسر ہوتی تھی۔ آپ کی اولاد میں سے شاہ نصیرالدین فخری، شاہ نظام الدین فخری و حضرت شاہ کمال الدین فخری ہجرت کر کے پاکستان آگئے۔

حضرت خواجہ محمد زبیرؒ

ولادت ———— ۱۰۹۳ھ

وفات ———— دہلی ۱۱۵۲ھ

حضرت خواجہ محمد زبیر اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ، قطب الارشاد اور صاحب کشف و کرامات تھے۔ انوار ولایت بچپن ہی سے ظہور میں آ رہے تھے۔ آپ کا اسم گرامی محمد زبیر اور کنیت ابوالبرکات ہے۔ سامی شمس الدین اور قبلہ عالم آپ کا لقب تھا۔ والد محترم کا نام شیخ ابوالعلی تھا۔ حضرت خواجہ حجت اللہ نقشبندؒ کے پوتے ہیں۔ انہیں کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ۵ ذی قعدہ ۱۰۹۳ھ بروز دوشنبہ اورنگ زیب کے عہد میں پیدا ہوئے اور ۴ ذی قعدہ ۱۱۵۲ھ بروز چہارشنبہ محمد شاہ کے عہد میں دہلی میں وفات پائی۔ سرہند میں دفن کیے گئے۔ آپ کا مزار حضرت عروۃ الوثقیٰؒ کے مزار کے قریب علیحدہ گنبد میں ہے۔

خلیفہ محمد سعید نے اپنی کتاب میں آپ کے جو حالات بیان کیے ہیں، ان کا ملخص یہ ہے کہ خواجہ محمد زبیرؒ نے پہلے قرآن مجید حفظ کیا پھر علوم ظاہری کی تحصیل میں استعداد کامل حاصل کی اور اپنے جد امجد سے فیض باطنی حاصل کیا۔ دولت دنیا اور دولت عقبیٰ دونوں حاصل تھیں۔ وقت کے سلاطین اور امراء بھی آپ کے معتقد اور مرید تھے۔ جب کبھی آپ خانقاہ سے باہر تشریف لاتے تو امرائے شاہی خانقاہ مبارک سے قلعہ شاہی تک دوشالے اور پگڑیاں بچھا دیتے تھے۔ کسی مریض کی عیادت یا کسی کی دعوت میں تشریف لے جاتے تو آپ کی سواری کے ساتھ بادشاہوں کی طرح جلوس ہوتا۔

گفتگو بہت کم فرماتے تھے۔ آپ کا کہنا تھا کہ بولنے میں بہت سی آفتیں ہیں اور خاموشی میں اکثر بلائیں دور رہتی ہیں۔ آپ فقر و تقویٰ اور زہد و ورع میں مستحکم اور قدم محکم رکھتے تھے۔ کثرت عبادت، اتباع سنت اور دوام استقامت میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ روزانہ دن کے وقت چوبیس ہزار بار نفی اثبات اور پندرہ ہزار بار اسم ذات پڑھتے تھے۔ نماز مغرب کے بعد صلوٰۃ اوابین میں قرآن مجید کے دس سپارے پڑھ کر دس ہزار بار نفی اثبات کرتے، پھر حلقہ میں بیٹھ جاتے اور مریدوں پر توجہ فرماتے۔ نماز عشا سے فارغ ہو کر محلسرا میں تشریف لے جاتے اور عورتوں کے حلقہ میں بیٹھتے۔ نصف شب کو محل سرا سے نکل کر کچھ دیر کے لیے استراحت فرماتے۔ پھر نماز تہجد کے لیے اٹھتے۔ تہجد میں کبھی چالیس اور کبھی ساٹھ بار سورہ یٰسین پڑھتے۔ نماز فجر سے فارغ ہو کر اشراق کے وقت تک ذکر و فکر میں لگے رہتے۔ دوپہر کے وقت تھوڑی دیر قیلولہ کرتے اور بطول قرأت نماز زوال پڑھتے۔ پھر ختم خواجگان پڑھ کر ظہر کی نماز ادا کرتے۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتے اور مریدوں کی طرف توجہ فرماتے۔ پھر کھانا کھاتے۔ دن رات میں صرف یہی ایک کھانا کھاتے۔

نمازِ عصر سے فارغ ہوکر مشکوٰۃ شریف و مکتوبات حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا درس دیتے غرض یہی آپ کا رات دن کا معمول تھا اور اسی طرح ساری عمر گزاری۔

آپ کے خلفا میں حضرت خواجہ سید قطب الدین بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں اور خاص شہرت کے مالک ہیں۔ عالم باعمل اور فاضل بے بدل تھے۔ بہت بڑے ولی اللہ تھے۔ کئی زبانوں کے عالم تھے اور ان زبانوں میں بے تکلف گفتگو کر لیا کرتے تھے۔ پہلے کسی اور سلسلہ میں اپنے والد کے ساتھ رشتہ انتساب رکھتے تھے۔ پھر خواجہ محمد زبیرؒ کے مرید و خلیفہ ہوئے۔ تنہائی اور گوشہ نشینی آپ کو بہت پسند تھی۔ امیروں کے ساتھ میل جول ناپسند تھا۔ رات دن قرآن مجید کی تلاوت، درود شریف اور ذکر و فکر سے شغف تھا۔ کبھی سرہند شریف جاکر اپنے پیر مرشد کے روضہ پر کچھ دن گزارتے اور کبھی دہلی میں خواجہ باقی باللہؒ کے مزار پرانوار پر قیام فرماتے۔

۱۱۷۳ھ میں جب احمد شاہ درانی نے ستر ہزار سپہدار لشکر مرہٹہ کو قتل کیا، آپ شہر کے باشندوں کے ساتھ جو فتنہ سے پہلے شہر چھوڑ چکے تھے، مکبیر میں آ گئے۔

چونکہ زیارت رسول ﷺ کا بہت اشتیاق تھا۔ اس لیے حضرت حافظ جمال اللہ رام پوریؒ کو اپنا خلیفہ و جانشین مقرر کرکے حرمین شریفین کو روانہ ہو گئے۔ سعادت حج بیت اللہ سے فارغ ہوکر مدینہ گئے اور ننگے پا برہنہ شہر میں داخل ہوئے۔ غایت اشتیاق و محبت میں در و دیوار کو چومتے۔ مدینہ میں کچھ مدت تک رہے اور ذکر و فکر میں مشغول ہو گئے۔ وہاں بہت سے لوگ آپ کے حلقہ عقیدت میں شامل ہو گئے۔ وہیں آپ نے ۱۱ رجب ۱۱۸۰ھ میں وفات پائی۔ مزار پرانوار جنت البقیع میں حضرت خواجہ محمد پارسا کی قبر کے قریب ہے اور یہ دونوں قبریں سیدنا حضرت امام حسن علیہ السلام کے روضہ مبارک کے شمال و مغربی گوشہ میں واقع ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ جس طرح ہندوستان میں حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتیؒ ہندوالی مشہور ہیں، اسی طرح خواجہ سید قطب الدین بھی مدینہ منورہ میں ہندوالی کہلاتے ہیں۔

حضرت شاہ محمد غوث قادری لاہوری رحؒ

وفات ــــــــــــ لاہور ۱۱۵۲ھ

لاہور میں دہلی دروازہ اور اکبری دروازہ کے باہر لب سڑک لاہور کے مشہور عالم دین اور ولی کامل حضرت شاہ محمد غوثؒ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ جنھوں نے پنجاب میں سلسلہ عالیہ قادریہ کو بہت فروغ دیا اور ہزاروں تشنگان معرفت کو رشد و ہدایت سے سرفراز فرمایا۔

خاندان اور خلافت حضرت شاہ محمد غوث پشاور کے ایک جید عالم اور بزرگ سید حسین کے فرزند تھے۔ سلسلہ صلبیہ حضرت غوث اعظمؒ سے ملتا ہے۔ سید حسین کا تعلق قادری سلسلے سے تھا۔ علوم ظاہری و باطنی کے پیکر، رموز طریقت و حقیقت کے مظہر اور زہد و عبادت میں یکتائے زمانہ تھے۔ آپ کے جد امجد سید عبداللہ گیلان سے ہندوستان آئے تھے اور پشاور میں سکونت اختیار کی تھی۔

حضرت شاہ محمد غوث والد بزرگوار کی صحبت میں رہ کر شریعت و حقیقت کے جامع بن گئے تھے۔ معرفت الٰہی سے دل روشن ہو گیا تھا۔ خاندان قادریہ میں خلافت کا پروانہ والد ہی کی طرف سے ملا اور ان کی اجازت سے مزید فیوض روحانی کی خاطر گھر سے نکلے۔

سیاحت اور فیضان صحبت ظاہری و باطنی کمالات سے آراستہ ہو کر سیاحت کے لیے گھر سے اس غرض سے نکلے کہ مختلف علاقوں میں بزرگان دین اور مشائخ عظام سے ملاقات کریں اور معرفت الٰہی کے چشموں سے قلب و روح کی سیرابی اور دولت ایمان کی فیض یابی کی صورت پیدا ہو۔ چنانچہ ہندوستان کے متعدد شہروں میں پھرے۔ حضرت شاہ دولہ، سید بھیکہ چشتیؒ، عبدالغفور نقشبندی اور حاجی محمد نوشاہ وغیرہ کئی بزرگان و کاملانِ وقت کی مجالس میں وقت گزارا اور ان کی صحبت سے روحانی فیض اور باطنی شرف حاصل کیا۔ پھر سلسلہ نقشبندیہ اور چشتیہ میں تلقین کی اجازت حاصل کی۔

رسالہ غوثیہ کی تصنیف آپ نے غوثیہ نام سے ایک رسالہ بھی لکھا جس میں اپنی زندگی کے بہت سے واقعات تحریر کیے ہیں۔

خواب میں حضرت میاں میرؒ سے ملاقات رسالہ غوثیہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ میں تلاش حق میں لاہور پہنچا تو رات بسر کرنے کے لیے حضرت میاں میرؒ کی خانقاہ میں گیا۔ خواب میں حضرت میاں میرؒ مجھے ملے اور فرمایا تم طلب حق میں نکلے ہو اور قرب خداوندی کا وسیلہ تلاش کر رہے ہو، میں تمھیں ورد کا ایک ایسا طریقہ بتاتا ہوں جس سے تمھاری تمنا پوری ہو جائے گی۔ چنانچہ حضرت میاں میر نے مجھے مصروف عبادت رہنے کے لیے ایک ورد بتایا اور فرمایا کہ اس پر عمل کیے جاؤ۔

شیخ حامد لاہوری سے ملاقات | شیخ عبدالقادر ثانی کے پوتے شیخ حامد لاہوری یا حامد گنج بخش جن کا ذکر شیخ داؤد کرمانی شیر گڑھی کے ضمن میں بھی آیا ہے اپنے عہد میں شیخ زمانہ مانے جاتے تھے۔ حضرت شاہ محمد غوث اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ میں اپنے عہد کے باکمال بزرگ شیخ حامد لاہوری کی خدمت میں گیا اور حضرت میاں میر سے خواب میں ملاقات کا واقعہ سنایا۔ حضرت نے فرمایا کہ میاں میرؒ نے جو کچھ تمھیں دیا ہے وہی تمھارے لیے کافی ہے اسی پر عمل کیے جاؤ۔

نادر شاہ کی شاہ محمد غوثؒ سے برہمی | کہا جاتا ہے کہ شاہ محمد غوث کے مریدوں میں بھی ایک شخص کا نام محمد غوث تھا جو پشاور میں رہتا تھا، محمد غوث ایک صالح مرد اور خدا رسیدہ بزرگ تھا۔ ان دنوں نادر شاہ ہندوستان پر چڑھائی کرنے کے خیال سے پشاور آیا تو محمد غوث کی باطنی کاملیت کا علم ہونے پر اس کا عقیدت مند ہو گیا۔ کسی نے نادر شاہ کو بتایا کہ لاہور میں اسی نام کا ایک بزرگ ہے جو اس سے بھی زیادہ کامل ہے۔ چنانچہ نادر شاہ نے حضرت شاہ محمد غوث کو ملاقات کے لیے پشاور بلایا۔ شاہ محمد غوث نے جواباً کہلا بھیجا کہ بادشاہ کے بلانے پر اس کے پاس جانا میرے آقا و مرشد کے طریقے کے خلاف ہے جس پر نادر شاہ غصے میں آ گیا اور کہا اچھا لاہور پہنچ کر پہلے شاہ محمد غوث کی خبر لوں گا پھر دہلی کی طرف قدم بڑھاؤں گا۔

جب نادر شاہ نے لاہور کا رخ کیا تو راستے میں دریائے اٹک عبور کرنا پڑا۔ جو اتنی شدید طغیانی پر تھا کہ نادر شاہ کے لیے اُسے عبور کرنا ناممکن ہو گیا۔ اور وہ کئی دن تک لشکر سمیت وہاں پڑا رہا۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ کہیں یہ شاہ محمد غوث سے برہمی کا نتیجہ تو نہیں۔ چنانچہ اپنے ارادہ پر افسوس کیا اور شاہ محمد غوث کی مخالفت کا خیال دل سے نکال دیا۔ نادر شاہ کی اس سوچ کے ساتھ ہی طغیانی جاتی رہی اور اُس نے اٹک کو عبور کر لیا۔

بعض کہتے ہیں کہ نادر شاہ کو محمد غوث پشاوری نے مشورہ دیا تھا کہ تم شاہ محمد غوث کے خلاف جذبات کو دل سے نکال دو تو یہ مصیبت ٹل جائے گی۔ چنانچہ اس کے مشورہ پر نادر شاہ تائب ہوا اور طغیانی جاتی رہی۔[1]

نادر شاہ کی عقیدت! | بہرحال اس واقعہ سے نادر شاہ پر شاہ محمد غوث کی ہیبت چھا گئی اور وہ ان کی عظمت اور بزرگی کا قائل ہو گیا۔ لاہور پہنچ کر شرف باریابی حاصل کیا اور عقیدت سے سر تسلیم خم کر دیا۔

وفات | حضرت شاہ محمد غوث نے ۱۱۵۲ھ میں وفات پائی۔ آپ کی اولاد پشاور اور کشمیر میں بتائی جاتی ہے۔

---

[1] یہ واقعہ خزینۃ الاصفیا اور بعض دوسری کتابوں میں بھی درج ہے۔ " یادِ رفتگان " میں بھی حضرت کی ایک کرامت کا حال بحوالہ کندن خوشحال سنگھ درج ہے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

ولادت ———— علاقہ حیدرآباد سندھ ۱۱۰۲ھ[1]

وفات ———— بھٹ شاہ ۱۱۶۵ھ

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سندھ کے وہ مشہور صوفی بزرگ ہیں جنھوں نے اپنے زہد و تقویٰ، علم و فضل، کشف و کرامات اور صوفیانہ شاعری کے طفیل عالمگیر شہرت حاصل کی ۔ سندھ کے اولیائے کرام میں بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار سندھیوں میں بہت مقبول ہیں۔

خاندان | شاہ صاحب ۱۱۰۲ھ مطابق ۱۶۹۰ء میں حیدرآباد سندھ کے ایک گاؤں بالا حویلی[2] میں پیدا ہوئے۔ سادات کے مشہور گھرانے سے تھے۔ والد کا نام سید حبیب تھا۔ سید عبداللطیفؒ کا سلسلہ نسب سید حبیب اللہ عرف سید حبیب بن سید عبدالقدوس بن سید جمال بن سید عبدالکریم کے وسیلہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے آباؤ اجداد میں شاہ عبدالکریم نام ایک مشہور ولی اللہ گزرے ہیں جو اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کا مزار بلڑی میں ہے۔

شاہ صاحب[3] کچھ عرصہ تک بالا حویلی میں رہے پھر والد بزرگوار کے ہمراہ کوٹڑی چلے آئے۔ بعد ازاں دوسرے بزرگانِ دین کے قاعدے کے بموجب سیر و سیاحت کے لیے نکلے، تاکہ دوسرے علاقوں میں رہنے والی خدا رسیدہ ہستیوں سے متعارف ہوں اور ان سے کسبِ فیض کریں۔ اس سلسلہ میں ملتان، جیسلمیر، لس بیلا، مکران، کچھ اور کاٹھیاواڑ کے علاقوں میں پھرتے رہے مختلف بزرگانِ کرام سے ملاقات کی اور فیض حاصل کیا۔

سندھ کی دینی حالت | اس زمانے میں دینی معاملات کے متعلق علمائے اسلام میں تفرقہ پڑا ہوا تھا۔ دینی ارکان اور شرعی امور کے بارے میں علماء کے کئی گروہ بن چکے تھے۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کی مخالفت میں سرگرم تھا۔ علماء نے اپنے حامیوں اور ارادت مندوں کی باقاعدہ جھگڑالو ٹولیاں بنا رکھی تھیں، ہر گروہ اپنی الگ شرع بنائے بیٹھا تھا۔

شاہ صاحب کا عملی کام! | شاہ صاحب ہر وقت دین اسلام کی تبلیغ میں سرگرم رہتے تھے۔ آپ نے جب علمائے سندھ کی یہ کیفیت دیکھی تو بہت صدمہ پہنچا۔ آپ نے تہیہ کر لیا کہ دین اسلام کی سچی تعلیم کا علم بلند کر کے اسلام میں اس تفرقہ اندازی کا خاتمہ کر دیں گے۔ چنانچہ آپ نے اسلام کی اصل روح اور اسلامی تعلیم کا صحیح نقشہ لوگوں کے سامنے پیش کیا

---

[1] سنِ پیدائش میں اختلاف ہے۔ [2] اب اس گاؤں کے صرف کھنڈر باقی ہیں۔ [3] یہ حالات "عرس اور میلے" مصنفہ امان سرحدی سے لیے گئے ہیں۔

اور بڑی شدت کے ساتھ اسلام کے صحیح اصولوں کی تبلیغ کرنے لگے ۔

سندھی علماء حسب ونسب اور ذات پات کے جھگڑے کھڑے کرکے ایک دوسرے کو پچھاڑنے میں مصروف تھے شاہ صاحب نے علی الاعلان کہا کہ اسلام کسی حسب ونسب یا ذات پات کو نہیں مانتا۔ آپ نے بتایا کہ خدا کے نزدیک وہی بہتر ہے جس کے اعمال بہتر ہوں۔ لوگوں میں جو غیر اسلامی رسمیں مروج تھیں، شاہ صاحب نے ان کے خلاف جہاد کرکے ان کا قلع قمع کیا۔ سندھی مسلمانوں میں ہندوؤں کی بیشتر رسوم رواج پا چکی تھی۔ اور عام مسلمان اسلام سے نابلد ہونے کے باعث ان رسموں کو اسلامی رسمیں سمجھتے تھے، شاہ صاحب نے ایسی تمام رسموں کا خاتمہ کرکے دم لیا۔

عملی کام کا نتیجہ | شاہ صاحب کی ان سرگرمیوں کے نتیجہ میں عام لوگ اسلام کی صحیح اور سچی تعلیم سے واقف ہونے لگی ہندوانہ رسمیں یا غیر اسلامی طریقے ختم کر دیے گئے۔ ذات پات کی تمیز اٹھ کر صحیح اسلامی مساوات اور اسلامی اخوت کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ علماء آپس کے جھگڑے ختم کرکے ایک پلیٹ فارم پر آنے لگے اور شاہ صاحب کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوتے گئے۔

ذاتی کیفیت | شاہ صاحب کا بیشتر وقت تبلیغ دین کے علاوہ عبادت الٰہی میں گزرتا تھا۔ مریدوں کو علحدہ علحدہ بھی دینی مسائل سمجھاتے۔ کبھی کبھی خاص کیفیت طاری ہوتی تو زبان مبارک سے حقائق اور معرفت کے چشمے پھوٹ نکلتے، وہ وہ باتیں بیان فرماتے جو علم ودانش کا خزینہ ہوتی تھیں۔ ایسی حالت میں زبان سے نکلی ہوئی باتیں سننے والوں پر خاص اثر کرتیں۔ ان کی بڑی خصوصیت ان کی خدا پرستی ہے۔

شاعری | آپ کو اشعار کہنے بھی خاص ملکہ تھا آپ نے اپنی نظموں کا مواد عوامی کہانیوں سے اخذ کیا اور بہت سی کام کی باتیں اشعار میں کہی ہیں۔ اسی طرح وہ انسانی کردار کی عظمت کی تصویر کشی کرتے رہے۔ مگر سارے کے سارے اشعار جمع نہ ہو سکے۔ مریدوں نے جو کچھ سنا اسے حفظ کر لیا یا لکھ کر محفوظ رکھ لیا۔ آپ کی وفات کے بعد مریدوں نے آپ کا سارا شاعرانہ کلام اکٹھا کیا جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا۔ آپ کا مطبوعہ کلام " شاہ جو رسالو " (شاہ صاحب کے رسالے) کے نام سے مشہور ہے جو سندھی میں ہے۔ آپ نے نتیجہ خیز کہانیاں اور قصے ان شعروں میں بیان کیے ہیں۔ سندھ کی رومانی داستانیں یعنی سسی پنوں، عمر ماروی اور کومل رانو وغیرہ کی داستانیں بڑے عمدہ طریقہ سے نظم کیں جنھیں آج بھی سندھ کے عوام بڑے شوق سے گاتے ہیں۔ چونکہ کلام کا اندازہ کرنے کے لیے ہر نظم کا پس منظر بھی معلوم ہونا چاہیے، لہٰذا ذیل میں ہم عمر ماروی، لیلاں اور چنیسر کے بارے میں شاہ صاحب کی نظموں کے چند اقتباسات محمد اکرام رہبر کے ایک مضمون سے ملخصاً پیش کرتے ہیں، جس میں مذکورہ بالا نظموں کے چیدہ چیدہ اشعار کا ترجمہ اور متعلقہ داستان کا خلاصہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ صاحب مضمون لکھتے ہیں:

" سندھ میں عمر اور ماروی کا قصہ بہت مشہور ہے۔ یہ داستان محبت صرف افسانہ ہی نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے ماروی ملیر گاؤں کے ایک غریب گلہ بان کی لڑکی تھی۔ یہ بہت حسین تھی اس کی نسبت اس کے قبیلہ ماروء کے ایک نوجوان سے ہو چکی تھی۔ عمر کوٹ کا راجہ سمرو کسی کے بہکانے سے اور اسے حسین دیکھ کر اُسے اٹھا لے گیا

اسے اپنے حرم میں داخل کرنا چاہا لیکن ماروی راضی نہ ہوئی۔ سمرو نے اسے ایک دو منزلہ مکان میں بند کر دیا۔ وہ پیکر وفا ثابت قدم رہی۔ سمرو نے سختی سے کام لینا چاہا تو ماروی نے اسے دھمکی دی کہ وہ چھلانگ لگا کر نیچے کود جائے گی اور خودکشی کر لے گی۔ آخر یہ طے پایا کہ اگر بارہ مہینے کے اندر اندر اس کے عزیزوں نے آکر اسے چھڑا لیا تو ٹھیک ورنہ ماروی کو اس سے شادی کرنا پڑے گی۔ وہ اس بالاخانے میں بارہ ماہ قید رہی تھی اس کہانی کی نظم میں اس کے انہی جذبات کی آئینہ داری کی گئی ہے کہ قید میں اپنے دیس کی یاد میں گھلتی ہے اور اپنے رشتہ داروں کے انتظار میں چشم براہ ہے جو آکر اسے قید سے چھڑا لیں گے۔

عمر ماروی کی داستان سے شاہ صاحب نے وطن پرستی، عصمت وعفت اور سچی محبت کی تعلیم دینے کی کوشش کی ہے۔ اپنے رشتہ داروں، محبوب اور وطن سے دور ماروی اپنی عصمت وعفت کو ہر ممکن طریقہ سے محفوظ رکھتی ہے وہ دولت وحشمت ریشم وزربفت، محلات اور جھولوں کی طلب گار نہیں۔ وہ اپنی گودڑی کو ان سے زیادہ قیمتی سمجھتی ہے۔

" اے قوم کے سردار! میں ان چیزوں کی طلبگار نہیں، میں اپنی گودڑی کو اس شہانی شال پر ترجیح دیتی ہوں"۔

" اس حاکم عمر کے اچھے اچھے کھانے اور خوان گڑھے میں جائیں، میرے لیے تو اپنے قبیلہ والوں کی خشک روٹی ان سے بہتر ہے"۔

" ماروی اپنے محبوب سے دور ہے وہ اس قید کی زندگی کو زندگی نہیں سمجھتی"۔

" میرے کپڑوں میں سیکڑوں پیوند ہیں، میری کمبلی پرانی اور پھٹی ہوئی ہے، میں نے کسی دن بال بھی نہیں سنوارے، میری زلف اپنی قدرتی خوشبو کھو چکی ہے۔ اے کاش میں اپنے محبوب چرواہے کو دیکھوں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے، جس میں میں ہوں"۔

" ماروی نے نہ کبھی بال سنوارے نہ نئے کپڑے پہنے تاکہ جب مارو اسے دیکھیں تو یہ اندازہ کر لیں کہ یہ امید وآرزو کے سہارے زندہ تھی"۔

ماروی سمرو سے کہتی ہے:

" اے سمرو تو مجھے قید کر کے کیا لے گا۔ میرا من تیری طرف آنا مشکل ہے۔ اے سمرو تو مجھے دفن کر دے تو اچھا ہے کیونکہ تو مجھے حاصل نہیں کر سکتا۔ کاش کہ میں پیدا نہ ہوتی، اگر پیدا ہوئی تھی تو مر جاتی تاکہ میرے قبیلہ والوں کو یہ بدنامی تو نہ ہوتی (کہ ماروی کو سمرو اٹھا کر لے گیا)" شاہ صاحب سبق دیتے ہیں کہ

" اے حسینہ! جہاں سکھ ہے وہاں دکھ بھی ہے، اگر تو وفا پر قائم ہے تو پھر یہ قید کوئی معنی نہیں رکھتی۔ بس یہ خیال رکھنا کہ ناامید نہ ہونا چاہیے، یہ قید کی مدت تو جلد ہی ختم ہو جائے گی۔

لیلاں اور چنیسر

لیلاں اور چنیسر کا قصہ بہت دلچسپ اور مشہور ہے۔ اس قصہ میں انسانی کمزوریوں، عام جذبات اور ان غلطیوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ جو انسان لالچ میں آکر کر بیٹھتا ہے۔ چنیسر دیول کوٹ کا نامور اور شجاع حاکم تھا، اپنی شجاعت کی وجہ سے بہت مشہور تھا، لیکن جس طرح جہانگیر نور جہاں کے آگے بے بس تھا اسی طرح یہ اپنی حسین و جمیل رانی لیلاں کی دلفریب اداؤں کے آگے بالکل بے بس تھا۔ زندگی بڑی کامرانی اور مسرت سے گزر رہی تھی۔ اسی زمانے میں ایک راجہ تھا، جس کی لڑکی کندو بہت خوب صورت اور ضدی تھی۔ ایک دن اس کی سہیلیوں نے طعنے کے طور پر اسے کہا کہ اگر تو اتنی ہی خوب صورت ہے تو جا کر لیلاں کو ہٹا کے چنیسر سے شادی کر لے۔ لڑکی تھی ضدی، اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ چنیسر کو ضرور ہی اپنے دام میں لے آئے گی۔ وہ ایک ملازمہ کے بھیس میں محل میں آئی اور لیلاں کی خدمت گار مقرر ہو گئی۔ جب لیلاں کے دل میں گھر کر لیا تو ایک دن اسے ایک نہایت قیمتی ہار دکھا۔ لیلاں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کندو نے کہا کہ اس کی قیمت یہ ہے کہ چنیسر کے ساتھ ایک رات بسر کرنے کی اجازت مل جائے۔ زیور عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ لیلاں کا دل اس ہار پر آگیا تھا، اس نے کہا کہ اچھا ایک رات کی بات ہی کیا ہے، اتنا اچھا ہار اسے مل جائے گا۔

"میں یہ سمجھتی تھی کہ یہ مرصّع ہار جب میرے پاس ہو گا تو اس سے میرا حسن دوبالا ہو جائے گا، مجھے کیا خبر تھی کہ ظالم کندو نے یہ کوئی جال بچھایا ہے۔"

بات یہ تھی کہ اس نے اپنے محبوب پر حد سے زیادہ بھروسہ کر لیا تھا۔ جب چنیسر کو اس لالچ والے سودے کی خبر ملی تو وہ انتقاماً کندو کے پاس چلا گیا۔ لیلاں کو چھوڑ دیا اور اسے اس کے گاؤں بھیج کر کندو سے شادی کر لی —

لیلاں کہتی ہے:

"اے میرے محبوب میں کیا کروں تیری تو سو رانیاں ہیں، لیکن میرے تو صرف تم ہی محبوب ہو۔"

"اے میرے محبوب اگر میں نے غلطی کی تھی تو تیرا کام تو غلطیاں چھپانا ہے۔"

شاہ کی نظموں میں لیلاں کی نامرادی اور پچھتاوے کا ذکر ہے۔ آخر میں لیلاں چنیسر کے بازوؤں میں اس احساس کے ساتھ کہ وہ اب بھی اس سے محبت کرتا ہے خوشی کی زیادتی سے دم توڑ دیتی ہے۔"

رئیس نور محمد کا واقعہ سندھ کے ایک رئیس میاں نور محمد کو شاہ صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔ اس نے عقیدت کے طور پر مثنوی مولانا روم کا ایک بہت عمدہ نسخہ منگا کر شاہ صاحب کی خدمت میں نذرانہ گزارا۔ نور محمد کے ہاں اولاد نہ تھی۔ اس نے شاہ صاحب سے اپنے حق میں اولاد کے لیے دعا چاہی۔ شاہ صاحب نے دعا فرمائی۔ چنانچہ نور محمد کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ نور محمد نے شاہ صاحب کے نام کی مناسبت سے اپنے بیٹے کا نام غلام شاہ رکھا۔ یہی غلام شاہ

بڑا ہو کر سندھ کا حکمراں بنا۔ غلام شاہ کے عہدِ حکومت میں شاہ صاحب وفات پا چکے تھے۔

بھٹ شاہ | پہلے بیان ہو چکا ہے کہ شاہ صاحب بچپن ہی میں والد کے ہمراہ کوٹڑی چلے آئے تھے جو حیدرآباد سندھ کے قریب دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔ پھر عمر کے آخری حصے میں ایک اچھی جگہ نئی آبادی کی بنیاد رکھی۔ اس کی تعمیر میں آپ خود بھی مزدوروں کی طرح کام کرتے رہے۔ آبادی کے سب مکانات ریت کے ٹیلوں پر بنائے گئے۔ سندھی زبان میں ریت کے ٹیلے کو "بھٹ" کہتے ہیں، اس لیے اس آبادی کو "بھٹ شاہ عبداللطیف" کہا جانے لگا۔ اب اسے صرف "بھٹ شاہ" کے نام سے پکارتے ہیں۔ بستی حیدرآباد سے ۳۳ میل مشرق میں ریت کے چند تودوں پر واقع ہے۔ بھٹ شاہ، شاہ صاحبؒ کی زندگی ہی میں آباد ہو گیا تھا۔ دور دور تک کچے پکے مکان بن گئے تھے۔ کھجوریں، بڑے جھنڈ، ہری بھری کھیتیاں اور ہریالی نظر آنے لگی تھی۔ اب بھی وہاں یہی کیفیت ہے۔

مزار کی کیفیت | سندھ کے حکمران غلام شاہ نے آپ کی قبر پر خوبصورت روضہ تعمیر کرایا۔ اسی نے سکھر کے ایک مشہور خطاط اور نقاش سے روضہ پر نقاشی کرائی۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھٹ شاہ میں ایک ثقافتی مرکز کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ بھٹ شاہ کے قریب کرار نام ایک جھیل ہے جس کا پانی بہت ٹھنڈا اور میٹھا ہوتا ہے۔ زائرین اسی جھیل کے کنارے خیمہ زن ہوتے اور سفر کی کوفت دور کرتے ہیں تاکہ عرس کے لیے تیار اور تازہ دم ہو جائیں۔ قیامِ پاکستان سے پہلے ہندو بھی کثیر تعداد میں عرس میں شریک ہونے کے لیے آتے تھے۔ عرس سے کچھ دن پہلے آمد و رفت کا ایسا تانتا بندھتا ہے جو عرس کے چند دن بعد ہی ٹوٹتا ہے۔

بھٹ شاہ کی پُرسکون اور سادہ بستی عرس کے دنوں میں دور دور تک پھیل جاتی ہے۔ جا بجا خیمے دکھائی دیتے ہیں۔ قصبے کے اطراف میں بڑے شہر کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ منڈیاں لگتی ہیں، بازار سجائے جاتے ہیں۔ دن کو منڈیوں اور بازاروں میں خوب چہل پہل ہوتی ہے مگر رات کے وقت یہ ساری رونق مزار کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

مزار کے صحن میں موسیقی کی محفل منعقد ہوتی ہے جس میں مغربی پاکستان کے قوال خصوصاً سندھ کے قوال حصہ لیتے ہیں۔ شاہ صاحب کی لکھی ہوئی کہانیاں، دوہے اور کافیاں گا کر سنائی جاتی ہیں اور عقیدت مند "واہ سائیں"، "مٹھا سائیں" کے نعرے لگاتے ہیں۔

حضرت بُلّھے شاہ رح

ولادت ———— قصور ———

وفات ———— قصور ۱۱۷۱ھ

حضرت بُلّھے شاہ پنجابی زبان کے وہ مشہور صوفی شاعر اور بزرگ ہیں جن کی کافیاں آج بھی پنجاب کے مختلف علاقوں میں بڑی مشہور و مقبول ہیں۔ ان قافیوں میں بُلّھے شاہ نے تصوّف اور معرفت کے دریا بہائے ہیں۔ ان کا نام خدا رسیدہ بزرگوں میں لیا جاتا ہے۔

حالات | بُلّھے شاہ حضرت سید عنایت شاہ شطاری کے مرید بتائے جاتے ہیں۔ جو شاہ رضا[1] قادریؒ شطاری لاہوری کے بڑے خلفا میں سے تھے۔ مرشد نے خرقۂ خلافت عطا کرنے کے بعد سید عنایت کو قصور کی طرف بھیج دیا، تاکہ وہاں رہ کر خدمتِ خلق اور اعلائے دینِ حق کا فرض انجام دیں۔ چنانچہ قصور میں بہت سے لوگ آپ کے مرید ہوئے اور ہر وقت عقیدتمندوں کا ہجوم رہنے لگا۔[2]

شاعری | جب بُلّھے شاہ نے شاعری شروع کی اور مرشد کو اس کا پتہ چلا تو انھوں نے اسے پسند نہ کیا بلکہ ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ مگر جب انھوں نے ان کے اشعار سنے تو ان کی غلط فہمی دور ہو گئی اور بلّھے شاہ کی عالی دماغی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ پیرو مرشد نے شاگرد کی کافیوں میں علم و معرفت اور حکمت کی باتیں دیکھیں تو انھیں شاعری کی پوری پوری اجازت دے دی۔ مرشد کی اس حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلّھے شاہ نے سینکڑوں کافیاں کہہ ڈالیں اور وہ اس قدر مقبول ہوئیں کہ آج بھی لوگ انھیں بڑے شوق سے گاتے اور سنتے ہیں۔ انھیں کافیوں کے طفیل بلّھے شاہ کو لافانی شہرت نصیب ہوئی۔

---

[1] رضا شاہ قادری شطاری بہت بڑے عالم دین اور اولیاء اللہ تھے۔ علوم ظاہری و باطنی کے جامع اور صاحب کشف و کرامات تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ جو بات زبان سے نکالتے ہیں وہ ہو کر رہتی ہے۔ اوراد و وظائف سے بہت محبت تھی اور ہمیشہ اسی شغل میں لگے رہتے تھے۔ بہت سی کرامات ان سے سرزد ہوئیں۔ پنجاب میں ان کے پایے کا کوئی بزرگ نہ تھا۔ ان کے مرشد کا سلسلہ چند واسطوں سے شاہ محمد غوث قادری شطاری گوالیاری تک پہنچتا ہے۔ سلسلہ یہ ہے شاہ رضا قادری مرید قاضی شیخ محمد فاضل لاہوری مرید شیخ اللہ داد قادری، مرید شیخ محمد جمال مرید سید نور مرید محمد غوث گوالیاری قادری شطاری۔ لاہور میں مدفون ہیں۔

[2] خزینۃ الاصفیا میں لکھا ہے کہ آخر عمر میں شاہ عنایت قصور کے افغان حاکم حسین خاں سے کبیدہ خاطر ہو کر لاہور چلے آئے اور یہیں ۱۱۴۱ھ میں وفات پائی۔

کافیوں کے نمونے نمونے کے طور پر آپ کی دو کافیاں درج کی جاتی ہیں۔ فرماتے ہیں:

پڑھ پڑھ علم لگاویں ڈھیر　　　قرآن کتاباں چار چوفیر
گردے چانن وچ انھیر　　　باجھوں رہبر خبر نہ سار
علموں بس کریں او یار
اکو الف ترے درکار

اس کافی میں علمائے سُو کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ کہ عالم کے چاروں طرف کتابوں کے ڈھیر لگے ہیں، گویا اس کے ارد گرد کتابوں کی شکل میں علم کی روشنی پھیلی ہوئی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ خود اس کے اندر اندھیرا ہے، کیونکہ مرشد کے بغیر وہ محض کتابوں سے کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ ایسے علم سے بہتر ہے کہ وہ اُس سے کنارہ کش رہے۔ اُسے اگر ضرورت ہے تو ایک "الف" کی ضرورت ہے۔

پھر اس الف کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"الف" اللہ نال رتا دل میرا مینوں "ب" دی خبر نہ کائی
"ب" پڑھدیاں مینوں سمجھ نہ آوے، لذت "الف" دی آئی
"عین" تے "غین" نوں سمجھ نہ جاناں گل "الف" سمجھائی
بُلھا شاہ قول "الف" دے پورے جیہڑے دل وچ رکھن صفائی

اس کافی کا مطلب یہ ہے کہ الف اور ب کے اصل معنی وہ نہیں جو سکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے "ب" کے پڑھنے میں وہ لطف نہیں ملتا جو الف کے پڑھنے میں حاصل ہوتا ہے اور افسوس ہے کہ میرا یہ مطلب لوگ نہیں سمجھتے۔ سمجھنا چاہیے کہ توحید کے عاشقوں کی اصطلاح میں الف اللہ کو کہتے ہیں اور ب عالم کو۔ پس یہ طے شدہ اور آزمودہ بات ہے کہ الف یعنی اللہ ہی کے ذکر سے دل کی صفائی ممکن ہو سکتی ہے اور کسی طریقہ سے نہیں۔

غرض بلھے شاہ کی کافیاں معرفت و حکمت، دانائی اور عبرت کی باتوں سے لبریز ہیں۔ آپ نے قصور میں وفات پائی وہیں ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔ سن ولادت اور وفات کی تصدیق نہیں ہو سکی۔
قصور بجا طور پر ایسے باکمال شخص کے مدفن پر فخر کر سکتا ہے۔

حضرت شاہ ابو سعید مجددیؒ

ولادت ———— رام پور ——

وفات ———— ٹونک ۱۲۰۵ھ

شاہ ابو سعیدؒ اپنے وقت کے صاحب کرامت بزرگ تھے۔ فقر و فاقہ اور درویشی میں اپنی مثال آپ تھے۔ رام پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ سیف الدینؒ کے واسطہ سے حضرت خواجہ محمد معصومؒ و حضرت امام ربانیؒ سے ملتا ہے۔ آپ کا اصل نام شریف شاہ ابو سعید تھا۔

ابتدائے عمر سے ہی طبیعت فقیری کی طرف مائل تھی اور ذکر و فکر کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ لکھنؤ گئے۔ جس محلہ میں رہتے تھے وہاں کی مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جایا کرتے تھے، راستہ میں ایک برہنہ مجذوب رہتا تھا۔ وہ آپ کو دیکھ کر اپنا ستر چھپانے لگتا۔ لوگوں نے اس سے وجہ دریافت کی تو کہنے لگا۔

"اللہ کے اس شیر کو ایسا منصب ملنے والا ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ یہ مرجع خلائق ہوگا اور دنیا اس سے رشد و ہدایت حاصل کرے گی۔"

مجذوب کا یہ کہنا بالکل صحیح ثابت ہوا۔

شاہ ابو سعید نے دس برس کی عمر میں ہی قرآن کریم حفظ کر لیا تھا۔ قرأت ایک بہت اچھے اور صاحب کمال شخص سے سیکھی۔ قدرت نے بہت اچھی آواز دے رکھی تھی، چنانچہ جو سنتا وارفتہ ہو جاتا۔ حفظ قرآن کے بعد آپ نے علم و ادب، فقہ، حدیث اور دیگر علوم میں کمال حاصل کیا۔ شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ سے بھی فیض پایا اور بعض علوم انہیں سے سیکھے۔

اب آپ باطنی علوم حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہوئے۔ اس مقصد کے لیے حضرت درگاہی شاہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو بڑے پایے کے بزرگ اور ولی اللہ تھے۔ ان پر ہر وقت سکر کی کیفیت طاری رہتی۔ حضرت درگاہی شاہ مرزا مظہر جانِ جاناں کی مجالس میں بھی رہ چکے تھے۔ انھوں نے شاہ ابو سعید کے حال پر توجہ فرمائی اور کمال شفقت سے ان کی تربیت قبول کی۔ چنانچہ آپ نے ان کے پاس رہ کر معرفت الٰہی کی بعض منزلیں طے کیں پھر حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ سے جو مرزا مظہر جانِ جاناں کے مرید تھے، استفادہ کیا۔ بعد ازاں حضرت غلام علی شاہؒ کی خدمت میں دہلی چلے آئے۔

شاہ صاحب نے ان کی بہت عزت کی اور پیار و محبت سے اپنے پاس رکھا، پھر اپنی مسند ان کے لیے خالی کر دی، فرمایا "یہ ہے آپ کی جگہ اور فقیر آپ کے خاندان کا ایک ادنیٰ فیض یافتہ ہے۔" شاہ ابو سعید نے قدم بوسی کے بعد عرض کیا "میں آپ کی

کفش برداری، اور آپ سے استفادہ کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں"۔

شاہ غلام علی نے عرض قبول فرمائی اور علم و عرفان کی کئی منزلیں طے کرانے کے بعد آپ کو طریقہ نقشبندیہ مجددیہ میں ماہر کر دیا۔ معرفت و سلوک کی راہ دکھائی۔ پھر شاہ ابوسعید اتنی ترقی کر گئے کہ سلوک اور طریقت پر ایک رسالہ تصنیف کر کے شاہ غلام علی کی خدمت میں پیش کیا۔ جسے شاہ صاحب نے بہت پسند فرمایا۔

شاہ صاحب حضرت ابوسعید کی لیاقت و قابلیت اور ان کے باطنی کمالات کے بہت معترف تھے اور اکثر ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ فرماتے "ارادت ہو تو شاہ ابوسعید جیسی ہو جنھوں نے پیری چھوڑ کر مریدی اختیار کر رکھی ہے اور یہاں پڑے ہیں"۔

اگرچہ شاہ ابوسعید کی حیثیت شاہ غلام علی کے مرید کی سی تھی، تاہم جب شاہ ابوسعیدؒ کبھی سفر پر جانے لگتے تو شاہ غلام علیؒ ان کی تعظیم کے لیے اٹھ کر ان سے ملتے اور دروازے تک چھوڑ کر آتے۔ جب ابوسعید سفر سے واپس آتے اور شاہ غلام علیؒ کو ان کی آمد کی خبر ملتی تو خاصی دور تک ان کے استقبال کے لیے جاتے۔ آپ وہی سلوک کرتے جو خواجہ باقی باللہؒ اپنے مرید اور خلیفہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ پھر خواجہ باقی باللہؒ ہی کی پیروی میں شاہ غلام علی بھی اپنے مریدوں کو شاہ ابوسعیدؒ کے سپرد کر دیا کرتے تھے۔ مولانا خالد رومی اور مولانا اسمٰعیل مدنی جو اکابر خلفا میں سے تھے۔ شاہ ابوسعیدؒ ہی سے رجوع فرمایا کرتے تھے۔

شاہ صاحب پندرہ سال تک شاہ غلام علیؒ کی خدمت بابرکت میں رہے اور ہر طرح ان کی خدمت بجا لاتے رہے۔ اپنے پیر و مرشد کے محرم راز بھی تھے۔ شاہ غلام علی کو آپ سے اتنی محبت تھی اور تعظیم بھی اتنی زیادہ کیا کرتے تھے کہ ایک دفعہ بیماری کے دوران خبر ملی کہ شاہ ابوسعید سفر سے واپس دہلی آ رہے ہیں تو آپ نے مریدوں سے فرمایا میں بیماری کے باعث اٹھ کر پیدل نہیں چل سکتا، لہٰذا تم میری چارپائی اٹھا کر مجھے اسی جگہ لے چلو، جہاں میں تندرستی کی حالت میں جا کر ابوسعید کا استقبال کیا کرتا تھا۔

ان باتوں سے مقصد یہ تھا کہ پیروں کو یہ غرور نہیں کرنا چاہیے کہ صرف وہی اپنے مریدوں کی نظروں میں قابل احترام ہیں، بلکہ مرید بھی پیروں کے لیے قابل تعظیم ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت باقی باللہ اسی خیال کے تحت حضرت امام ربانیؒ کے استقبال کو خود جایا کرتے تھے۔

جب شاہ غلام علی مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو شاہ ابوسعید کو لکھا "از غیب القا می شود کہ ابوسعید را باید طلبیدہ روح مبارک حضرت امام مجدد الف ثانیؒ را ارشاد فرمائند بر راہ راست خود نشاندہ اہم وصیے کہ آثار آں عنقریب نماید بشما شوند و حاصل شدہ خانقاہ شمارا مبارک باشید"۔

جب شاہ صاحب وفات پا گئے تو ابوسعید خانقاہ مجددیہ میں ان کے جانشین مقرر ہوئے اور خدمت خلق میں لگ گئے۔ آپ کے متعلق بہت سی کرامات بیان کی جاتی ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں کہ ایک دفعہ ایک خادم نے عرض کیا، تہجد کے

وقت میری آنکھ نہیں کھلتی۔ آپ نے دوسرے روز سے تہجد کے وقت پابندی سے مرید کو اٹھانا شروع کر دیا (باطنی قوت کے زور سے)

ایک مرتبہ ایک مرید پر استغراق کی کیفیت طاری ہوئی۔ اس نے کہا مجھے نماز کے وقت قبلہ کی سمت دکھائی نہیں دیتی۔ آپ نے فرمایا بوقت تحریمہ میری طرف متوجہ رہو، میں تمہیں قبلہ کی طرف متوجہ کر دیا کروں گا۔ چنانچہ مرید نے ایسا ہی کیا۔ جونہی اس نے تحریمہ کے وقت مرشد کا تصور باندھا اسے قبلہ نظر آنے لگا۔

ایک مرتبہ خانقاہ میں لوگوں کے درمیان نزاع کی صورت پیدا ہو گئی۔ رات کے وقت ایک مرید نے خواب دیکھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار لگا ہے اور حضرت ابوسعیدؒ کی خانقاہ کا جھگڑا رسول خدا کے سامنے پیش ہے۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ فلاں فلاں شخص کو خانقاہ سے نکال دیا جائے۔ مرید کو خوف ہوا کہ کہیں رسول اللہ ان لوگوں میں میرا نام بھی نہ لے دیں۔ اس خوف سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

تہجد کے وقت وہی مرید حضرت ابوسعیدؒ کو وضو کرا رہا تھا کہ انھوں نے مرید کی طرف دیکھا اور مسکرا کر فرمایا گھبراتے کیوں ہو، حضورؐ نے تمہارا نام تو نہیں لیا۔ پھر حضرت ابوسعید نے نماز سے فارغ ہونے پر ان تمام درویشوں کو خانقاہ سے نکل جانے کا حکم دیا جن کے نام رسول خدا نے گنائے تھے۔

آپ حرمین شریفین کی زیارت کے لیے گئے تو وہاں کئی بزرگان دین اور مشائخ عظام سے ملے۔ سب نے آپ کی بہت عزت و تکریم کی۔ واپسی پر ریاست ٹونک کے نواب کی درخواست ملی کہ میرے ہاں ضرور تشریف لائیں۔ چنانچہ آپ وہاں چلے گئے اور بیمار ہو گئے۔ والیٔ ٹونک نے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مگر آخر وقت آ چکا تھا، دوا سے کچھ افاقہ نہ ہوا۔ نواب روزانہ آپ کے دیکھنے کو آتا تھا۔ عید کا دن آیا تو آپ نے نواب کو اپنے پاس آنے سے منع کر دیا۔ فرمایا دنیاداروں کے آنے سے ظلمت آتی ہے۔ حکم دیا کہ سورۂ یٰسین تلاوت کی جائے۔ تین مرتبہ تلاوت ہونے کے بعد آپ نے فرمایا " فرصت کم ہے بند کر دو" اور اسی روز انتقال فرمایا۔

تابوت دہلی لایا گیا اور حضرت غلام علیؒ کی خانقاہ میں ان کے مزار کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ

ولادت ——————— بستی چوہٹالہ (مہار شریف) ۱۱۴۲ھ

وفات ——————— مہار شریف ——— ۱۲۰۵ھ

ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کے عہد میں تصوف کو پھر فروغ ہوا، اور دو تین صدیوں کے بعد چشتیہ سلسلے نے متذکرہ ایسے بزرگوں کے ذریعہ رونق پائی، جو یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہوئے۔ ان بزرگوں میں سے ایک شیخ کلیم اللہؒ جہاں آبادی تھے، جنھوں نے اپنے مولد شاہجہاں آباد میں چشتیہ سلسلے کی اشاعت و تبلیغ کا کام کیا۔ ان کے جانشین شیخ نظام الدین ولی اورنگ آبادیؒ نے اورنگ آباد (دکن) میں اپنے پیر و مرشد کے کام کو جاری رکھا۔ پھر ان کے فرزند مولانا فخر الدینؒ فخر جہاں شاہجہاں آبادی نے دہلی میں بیٹھ کر شمالی ہندوستان میں چشتیہ سلسلے کی بڑے کامیاب طریقہ سے اشاعت کی۔ انھوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اپنے خلفا بھیجے۔ خواجہ نور محمد مہارویؒ انھیں خلفا میں سے ہیں، جنھوں نے خانقاہ تونسہ (ضلع ڈیرہ غازی خاں) کے بانی خواجہ محمد سلیمان تونسویؒ اور گولڑہ (ضلع راولپنڈی)، جلال پور اور چاچڑاں کے مشہور بزرگوں کو مرید کیا۔[۴]

پیدائش اور حسب و نسب خواجہ صاحب کا اصل نام بابل یا ببل[۳] تھا۔ وطن بستی چوہٹالہ (چوٹالہ) ہے، جو مہار شریف[۵] سے چار کوس مشرق کی طرف ہے۔ یہیں ۱۴ رمضان ۱۱۴۲ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔

والد کا نام ہندوال یا ہندال تھا جو محمود کھرل کے پڑپوتے تھے۔ والدہ محترمہ کا نام عاقل خاتون تھا۔ سلسلہ نوشیرواں عادل سے اس طرح ملتا ہے:[۶]

خواجہ نور محمد بن ہندال بن مامطار بن فتح بن محمود کھرل بن مُرہ بن عزیز بن ڈاتا بن دینا بن چھتر بن تاتار بن اُوہر بن جامو بن کورا بن جگ سین بن بکی سین بن سریک بن راجت بن دیوا سے بن گڈن شہیر بن مُتوا بن بدھ بن بوہل بن بابدہ بن کھرل بن کسیرہ بن مانس بن دہوہڑ بن شیل بن تمج بن آہر ابن بہوٹا بن راسے دیون بن جالک بن سکنگھی بن راجہ کرن بن سورج بن مولراج بن راجہ

---

[۱] متوفی ۱۱۴۲ھ۔ [۲] متوفی ۱۱۹۹ھ میاں کا سے خاں جن کا بہادر شاہ ظفر مرید تھا: مولانا ہی کے پوتے تھے۔

[۳] مقدمہ کوثر مصنفہ شیخ محمد اکرام ۱۹۵۸ء ص ۶۰۰

[۴] یہ نام والدین نے رکھا تھا۔ بعد ازاں آپ کے مرشد بزرگوار خواجہ فخر جہاں نے نور محمد تجویز کیا۔

[۵] مہار شریف پاک پتن سے ۱۵ کوس مغرب میں واقع ہے [۶] حدیقۃ الاخیار ترجمہ تکملہ سیر الاولیاء مولفہ خواجہ امام بخش ص ۱۱

جگ دے بن بھوٹا بن رائے دیوان بن چالک بن بنسیرو بن قیصر بن ہرمز بن نوشیرواں عادل۔

تعلیم و تربیت خواجہ صاحب نے پہلے قرآن پاک حفظ کیا پھر مہار شریف ہی میں رہ کر عقلی اور نقلی علم سیکھتے رہے۔ بعد ازاں ڈیرہ غازی خاں جاکر درسی کتابیں پڑھیں۔ پاک پٹن کے نواح میں موضع بیلا کے ایک شخص شیخ احمد کھوکھر سے بھی کچھ تعلیم پائی پھر خواجہ محکم دین کے ہمراہ لاہور آکر تحصیل علم میں مصروف رہے۔ لاہور میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد دہلی چلے گئے، اور نواب غازی الدین کے مدرسۃ العلوم میں پڑھتے رہے۔

مولانا فخر الدین فخر جہاں کی شاگردی اور بیعت ان دنوں دہلی میں اورنگ آباد دکن کے مشہور بزرگ اور متبحر عالم مولانا فخر الدین فخر جہاں مقیم تھے خواجہ صاحب نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر زانوئے تلمذ طے کیا۔ سولہ سال تک ان کی خدمت کی اور علوم ظاہری و باطنی میں کمال حاصل کیا۔ ۱۱۶۵ھ میں جبکہ خواجہ صاحب کی عمر ۲۳ سال کی تھی، فخر جہاں نے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے روضہ اقدس پر انھیں بیعت سے سرفراز کیا۔

خلافت خواجہ صاحب کو اپنے پیر و مرشد سے بہت محبت تھی۔ مولانا بھی خواجہ صاحب کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ اور ان کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خواجہ صاحب نے کامل سولہ سال تک آپ کی خدمت کی۔ چنانچہ مولانا نے آپ کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا۔ مولانا کے خلفا یوں تو سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے، مگر خواجہ صاحب کو آپ سب خلفا سے زیادہ پسند کرتے تھے اور انھیں خلیفۂ اعظم کا درجہ دے رکھا تھا۔ اپنی کتاب "مناقب فخر" میں مولانا نے ان کا ذکر بھی کیا ہے۔

وطن کو واپسی عطائے خلافت کے بعد مولانا نے انھیں وطن لوٹ جانے کی اجازت دی۔ چنانچہ آپ عرفان باطنی سے مالا مال ہو کر مہار شریف واپس آگئے۔

"حدیقۃ الاخیار" میں خواجہ نور محمد مہارویؒ کے حالات درج ہیں۔ اس کتاب سے چیدہ چیدہ ٹکڑے اخذ کر کے درج کیے جاتے ہیں۔ لکھا ہے کہ آپ ایک ہفتہ مہار شریف ٹھہرے۔ ان ایام میں آپ کا معمول تھا کہ دو وقت والدہ صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور باقی تمام وقت مسجد کے گوشہ میں بیٹھ کر مشغول عبادت رہتے۔ ایک ہفتہ گزرنے کے بعد آپ نے واپسی کا قصد کیا اور والدہ صاحبہ سے رخصت مانگی۔ انھوں نے فرمایا کہ بیٹا! بارہ تیرہ برس کی طویل مفارقت کے بعد واپس آیا، میرا دل نہیں چاہتا کہ اب تو ایک پل کے لیے بھی میری آنکھوں سے اوجھل ہو۔ اگر خواہ مخواہ تجھے واپس جانا ہے تو دس بارہ دن اور میرے پاس ٹھہر، مگر قبلہ عالم (خواجہ مہارویؒ) کو چونکہ شیخ کی جناب پاک سے ایک ہفتہ کی رخصت ملی تھی، اس لیے بہت کوشش کر کے والدہ صاحبہ سے رخصت لی۔ باقی بھائیوں، چچا و استاد سے مل کر پاک پٹن شریف روانہ ہوئے۔

قبلہ عالم پہلے حضرت گنج شکرؒ کی جناب پاک میں حاضر ہوئے۔ بعد ازاں مولانا کی قدم بوسی سے مشرف ہوئے۔ حضرت مولانا نے قبلہ عالم سے معانقہ فرمایا، سفر کے حالات دریافت کیے، گھر کی خیریت پوچھی، بعدہٗ فرمایا کہ میاں صاحب جو خدمت میں نے

پہلے آپ کے سپرد کی تھی وہ آج سے موقوف ہوئی۔ اب تمہارے سپرد ایک دوسری خدمت کی جاتی ہے۔ اب آپ ہم سے علٰحدہ ہو کر برج نظامی میں ڈیرا لگائیں۔

قبلہ عالم نے حسب فرمایش ذیشان اسی طرح تعمیل کی۔ بعد ازیں جو شخص حضرت مولانا کی خدمت میں بیعت کی غرض سے یا حل مشکلات کی خاطر آتا آپ اسے قبلہ عالم کی خدمت میں بھیجتے۔

ایک بار جب حضرت گنج شکرؒ کا عرس شریف ختم ہوگیا تو حضرت مولانا نے قبلہ عالم کو فرمایا کہ میرا ارادہ اور دو ماہ یہیں ٹھہرنے کا ہے، بہتر ہے کہ آپ دوبارہ گھر جاکر والدہ ماجدہ اور عزیز و اقارب سے اچھی طرح ملاقات کر آویں اور تاریخ معین پر واپس میرے پاس آجانا۔ قبلہ عالم حسب الحکم مہار شریف کو روانہ ہوئے۔

اس دفعہ آپ مہار شریف زیادہ مقیم ہوئے، کیونکہ مولانا کا فرمان تھا کہ میری واپسی دہلی کے دن جب قریب آئیں تو آجانا۔ میعاد ختم ہوئی اور قبلہ عالم واپس پاک پٹن جانے لگے تو آپ کے ساتھ آپ کے بھائی، چچا اور استاد بھی پاک پٹن تشریف لے گئے۔ قبلہ عالم مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر زمین بوس ہوئے۔ مولانا از راہ کرم سروقد کھڑے ہوگئے اور آپ سے معانقہ فرمایا۔ قبلہ عالم کی درخواست پر مولانا نے آپ کے ہمراہیوں کو بیعت کر لیا۔ چند یوم کے بعد مولانا دہلی تشریف لے گئے، قبلہ عالم بھی ساتھ گئے اور قبلہ عالم کے چچا اور استاد صاحبان مہار شریف لوٹ آئے۔

خلاصۃ الفوائد میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا صاحب دو مہینے اور گیارہ دن پاک پٹن شریف ٹھہرے۔ قبلہ عالم حضرت مولانا کے ساتھ دہلی چلے گئے تھے۔ آپ دہلی میں حضرت کی خدمت میں آٹھ یا نو مہینے رہتے اور چند مہینے واپس گھر آکر ٹھہرتے اسی طرح کچھ عرصہ تک یہی معمول رہا۔ حضرت مولانا کی پاک پٹن تشریف آوری سے حضرت قبلہ عالم کا خاندان مولانا کے شرف بیعت سے مشرف ہونے لگا تھا۔

نقل ہے کہ ایک روز آپ مسجد میں تشریف فرما تھے، علماء و فقراء اور تمام غلام آستانہ فیض کاشانہ پر حاضر تھے۔ قصص عشقیہ شروع ہوئے۔ لیلےٰ مجنوں اور فرہاد شیریں کی حکایتیں گرم ہوئیں، تو حضور نے زبان جوہر نشاں سے یہ شعر پڑھا:

شمۂ از داستانِ عشق شور انگیز ما ۔۔۔ واں حکایت ہا کہ از فرہاد و شیریں می کنند

یہ سن کر تمام خاموش ہوگئے۔ اس میں یہ لطیف نکتہ سمجھایا کہ طالب کو چاہیے شیخ کے حضور میں چپ ہو کر بیٹھے اور فضول کلام نہ کرے، کیونکہ جتنی مشکلات صحبت شیخ میں حل ہوتی ہیں، اس قدر بہت سے مجاہدوں اور ریاضتوں سے بھی نہیں ہوا کرتیں۔

خواجہ نور محمد مہارویؒ کا فیض ہر امیر و فقیر کے لیے یکساں تھا اور کلام خالی از حکمت نہ فرماتے۔ غرض آپ کا تمام طریقہ اتباع سنت نبویہ تھا۔ زہد و پرہیزگاری کو بہت پسند فرماتے۔ علم تصوف و اخلاق کا اکثر شغل رکھتے۔ چنانچہ کتاب لوائح و نفحات الانس و فقرات و شرح لمعات و سواد السبیل و عشرہ کاملہ اور فصوص الحکم کا مطالعہ اکثر اوقات کرتے تھے۔ ایک روز فرمایا کہ ایک دن حضرت مولانا صاحب کتاب فقرات ہاتھ میں لیے باہر تشریف لائے اور مجھے کتاب دے کر فرمایا کہ یہ کتاب تمہارے

بہت کام آئے گی۔ اس کا بہت مطالعہ کرنا کیونکہ اس میں بہت جذبہ ہے۔ خود ہی فرماتے ہیں کہ اگر میں اپنے تئیں تعلیم اور مطالعہ کتب و دیگر امورِ خلق مشغول نہ رکھوں تو خدا جانے کس حالت پہنچ جاؤں، لیکن خلقِ خدا کے فائدے کے واسطے جو کہ ایک اہم ترین کام ہے۔ ناچار آپ کو دوسری طرف بھی مائل کرتا ہوں۔

جب حضرت قبلہ عالم رونق افزائے ملک پنجاب ہو کر مہار شریف میں اقامت پذیر ہوئے اور عالم کو انوارِ رحمت آثار سے مشرف فرمایا تو حسب الحکم حضرت مولانا کئی سال نمازِ جمعہ پاک پٹن شریف حضرت گنج شکرؒ کے حضور میں پڑھتے۔ جب آپ کے مزاج گرامی میں ضعف پیدا ہوا تو حضرت گنج شکر کے ایما سے آئندہ کے لیے یہ مجاہدہ ساقط کر کے حضرت تاج الدین سرورؒ (جو کہ حضرت گنج شکرؒ کے پوتے ہیں) کے ہاں جمعہ کی نماز پڑھتے رہے۔ جہاں بابا صاحب کی اولاد مدفون ہے۔

خواجہ صاحب کے مریدوں کا حلقہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اپنے مریدوں کو سلوک کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ مولانا فخر جہاں برابر آپ کی طرف توجہ فرماتے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ علم و عرفان کی جو شمع انھوں نے روشن کی ہے اس کی ضیا سے پنجاب اور بہاول پور کی سرزمین یقیناً جگمگا اٹھے گی۔ خواجہ نور محمد مہاروی ہی وہ شمع معرفت تھے جس کے گرد پروانے جمع ہو رہے تھے اور سلسلہ چشتیہ نظامیہ کو ہندوستان میں دوبارہ اپنی پوری شان سے جلوہ گر ہو گیا تھا۔

وفات | ۳ ذی الحجہ ۱۲۰۵ھ میں بعمر ۶۳ سال مہار شریف میں وفات پائی اور آپ کی خواہش کے بموجب نعش مبارک موضع تاج سرورؒ (چشتیاں) لے جائی گئی۔ وہیں آپ کا روضہ ہے۔ یہ روضہ رنگین عمارت ایک وسیع خوش فضا میدان، حوض، کنواں، مسجد اور چند مکانات پر مشتمل ہے، ساتھ ایک بڑی سرائے ہے جو نواب بہاول پور نے تعمیر کرائی تھی۔

اولاد | خواجہ صاحب کے تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ بڑے صاحبزادے کا نام نور الصمد تھا جو والد کے وصال پر مسند آرائے خلافت ہوئے اور یکم ربیع الاول ۱۲۱۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مزار والد کے مزار کے متصل مشرق کی طرف ہے۔

دوسرے فرزند کا نام خواجہ نور احمد تھا جنھوں نے ۱۲۲۴ھ میں وفات پائی۔

تیسرے صاحبزادے کا نام خواجہ نور حسن تھا، وہ ۱۲۸۰ھ میں فوت ہوئے۔

خلفاء | ۱۔ خواجہ صاحب کے خلفا میں خواجہ سلیمان تونسویؒ بہت شہرت کے مالک ہیں۔ آپ بڑے باکمال بزرگ گزرے ہیں۔ جب خواجہ صاحب مولانا فخر جہاں سے خرقۂ خلافت حاصل کر کے رخصت ہونے لگے تو مولانا نے بعض نصیحتیں کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ تمھارے دامن سے ایک کوہستانی شہباز وابستہ ہوگا۔ یہ خواجہ سلیمان تونسویؒ ہی کے متعلق تھا۔ خواجہ تونسوی

---

[1] اس مقام پر بابا فرید شکر گنجؒ کے پوتے اور شیخ بدر الدین سلیمان کے بیٹے تاج الدین سرور مدفون ہیں۔ چنانچہ انھیں کی نسبت سے اس جگہ کا نام "تاج سرور" رکھا گیا۔ چونکہ فریدی خاندان کے لوگ یہاں کثرت سے آباد ہیں، اس لیے اسے "بستی چشتیاں" بھی کہا جاتا ہے۔

خواجہ مہاروی کو تاج سرورؒ کے مزار سے بہت عقیدت تھی۔ آپ ہر جمعہ کو وہاں آیا کرتے تھے، چنانچہ یہیں اپنی خانقاہ بھی قائم کر لی تھی۔

کے مفصل حالات اس کتاب میں علیحدہ بیان کیے گئے ہیں۔

۲۔ خواجہ صاحب کے دوسرے مشہور خلیفہ خواجہ نور محمد ثانی عرف نارووالہ ہیں۔ آپ مولانا فخر جہاں کی ہدایت پر خواجہ صاحب سے بیعت ہوئے تھے۔ بڑے باخدا ولی تھے۔ بڑے عابد اور شب بیدار تھے۔ اکثر مراقبے میں رہتے تھے۔ شرع کے بہت پابند تھے۔ ۶ جمادی الاول ۱۲۰۳ھ میں وفات پائی۔ روضہ مبارک ڈیرہ غازی خاں کے قصبہ حاجی پورہ میں مرجع خلائق ہے۔

۳۔ خواجہ صاحب کے تیسرے خلیفہ حافظ محمد جمال ملتانی ہیں جو خواجہ صاحب کے وضو کی خدمت پر مامور تھے۔ بڑے صوفی اور متقی آپ سے علوم ظاہری اور باطنی کا درس لیا کرتے تھے۔ آپ کا روضہ ملتان میں ہے۔ آپ کے مفصل حالات بھی اسی کتاب میں الگ درج ہیں۔

۴۔ خواجہ صاحب کے چوتھے خلیفہ قاضی محمد عاقل ساکن کوٹ مٹھن ہیں جن کے سلسلہ سے خواجہ غلام فرید تعلق رکھتے ہیں جن کی پنجابی کافیاں عام مقبول اور مشہور ہیں۔

قاضی صاحب بھی بڑے باکمال بزرگ تھے۔ کوٹ مٹھن میں سکونت تھی۔ آخر عمر میں کوٹ مٹھن چھوڑ کر موضع شدانی چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ نواب محمد صادق والی بہاول پور آپ کو وہیں دفن کرنا چاہتا تھا مگر آپ کے صاحبزادے احمد علی کی خواہش پر جنازہ کوٹ مٹھن لے جایا گیا اور وہیں دفن ہوئے۔

ان مشہور خلفاء کے علاوہ خواجہ مہاروی کے اور بھی کئی خلفا ہیں جن میں سے بعض کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

غلام محمد ساکنہ میلوالی	محمد غوث بچیدانہ	محمد بخش چشتی
اصالت خاں	نواب لطف اللہ خاں	مولوی نور محمد ساکنہ نواح بہاول پور
مولوی محمد حسین	اختیار خاں	مولوی محمد اکرم ڈیرہ غازی خاں
حافظ نبی	مولوی محمد حبیب	مولوی محمد مسعود جہانگیر والا
قاضی عزیز اللہ	غلام محمد کیٹری	قاری صبغۃ اللہ
میاں صبغۃ اللہ	میاں محمد فاضل نیکوکارہ	حافظ ناصر
نواب غازی الدین	نور الحق	حافظ غلام حسین
عبدالوہاب اوچی	میاں غلام حسین بھٹی	مولوی تاج محمود ساکن گڑھی
مخدوم نوبہار اوچی	سید صالح محمد شاہ	شیخ جمال چشتی فیروز پوری
حافظ عظمت میران شاہ	مخدوم محب جہانیاں	مخدوم عبدالکریم۔

حضرت حافظ محمد جمال ملتانیؒ

وفات ———— ملتان ۱۲۲۶ھ

ملتان ایک مدت سے سلسلہ سہروردیہ کا مرکز تھا۔ شیخ بہاؤالدین زکریاؒ نے یہاں اس سلسلے کی عظیم الشان خانقاہ قائم کی تھی اور یہ سلسلہ اپنے پورے عروج پر تھا۔ کسی اور سلسلے کو یہاں فروغ پانے کا موقع نہ ملا تھا۔ حافظ محمد جمال ملتانی پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے یہاں چشتیہ سلسلے کی بنیاد رکھی۔ آپ خواجہ نور محمد مہاروی کے خلیفہ تھے۔ بہت بڑے ولی اللہ اور عالم فاضل بزرگ تھے۔ آپ کا مزار ملتان میں ایک قلعہ نما فصیل کے اندر ہے۔ نہایت خوبصورت روضہ ہے جہاں جمادی الاول کے مہینے میں ان کا عرس منایا جاتا ہے۔

خاندان | حافظ صاحب کے والد بزرگوار کا نام محمد یوسف اور دادا کا نام حافظ عبدالرشید تھا۔ قوم اعوان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے دادا اعوان کاری کے علاقہ سے ہجرت کر کے ملتان آگئے تھے۔ قلعہ ملتان کے شرق میں ان کی سکونت تھی۔

ان دنوں بادشاہ دہلی کی طرف سے ابوالقاسم اور ابوالہاشم ملتان کے حاکم تھے۔ یہ دونوں بڑے اہل علم اور علماء و فضلاء کے قدردان تھے۔ مسجد معہ حجرہ اور کنواں جو شاہی کے نام سے مشہور ہے انھیں کی تحویل میں تھے انھوں نے حافظ صاحب کے والد بزرگوار محمد یوسف کو ان سب کا متولی بنا دیا تھا۔ محمد یوسف ان دونوں حاکموں کے معتمد وزیر تھے[1]۔

ابتدائی حالات | حافظ صاحب بچپن ہی سے بہت ذہین اور محنتی واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ چھوٹی عمر ہی میں علوم ظاہری سیکھ لیے تھے۔ پھر علوم ظاہری پر پورا عبور حاصل کیا۔ عبادت و ریاضت کا بھی بہت شوق تھا۔ بیشتر وقت مراقبہ اور استغراق میں گزرتا۔ ہر ماہ ملتان کے مشہور بزرگ شیخ رکن عالمؒ[2] کے مزار پر حاضری دیتے اور رات بھر اعتکاف میں رہتے۔ پھر مہار شریف کا رخ کیا۔ خواجہ نور محمد مہارویؒ کی خدمت میں پہنچے اور ان سے بیعت کی۔ ہر وقت خواجہ صاحب کے ساتھ رہتے۔ آفتابہ برداری اور وضو کرانے کی خدمت انجام دیتے رہے۔ لنگر کا انتظام بھی انھیں کے سپرد تھا۔

مقبولیت | کمالات کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے علما آپ کی مجلس میں آ کر زانوئے ادب طے کرنے لگے۔ لوگ جوق در جوق حلقہ ارادت میں شامل ہونے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ حاکم ملتان ساون مل کو آپ سے بہت عقیدت تھی۔

---

[1] حدیقۃ الاولیاء ترجمہ گلشن ابرار از خواجہ امام بخش، ص ۱۴۰-۱۴۱

[2] آپ شیخ بہاؤالحق کے پوتے ہیں۔ ۷ جمادی الاول ۷۳۵ھ میں وفات پائی۔ مزار حضرت بہاؤالحقؒ کے مزار سے ذرا آگے ہے۔

عادات | آپ کو سماع سے بہت رغبت تھی اور اکثر اس کا شوق فرمایا کرتے تھے۔ مولانا جامی کی غزلیں بڑے شوق سے پڑھتے اور سنتے تھے۔ مولانا جامی اور شیخ ابن عربی کی کتابیں اکثر زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ مسئلہ وحدت الوجود میں اعلم العلما تھے۔ نفاست کا یہ عالم تھا کہ اپنا لوٹا اور وضو کی جگہ صرف اپنے لیے مخصوص تھی، کسی اور کو استعمال نہ کرنے دیتے تھے۔

علمی کارنامہ | آپ نے ملتان میں اپنا ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ خواجہ گل محمد احمد پوری[1] بھی اس مدرسہ میں درس دیا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ علم و فضل کا اعلیٰ مرکز تھا جس سے ہزاروں طلبا مستفید ہو کر نکلے۔

سکھوں سے لڑائی | حافظ صاحب کے زمانہ میں پنجاب سکھوں کے تصرف میں تھا اور مسلمانوں کو بہت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ سکھوں نے ملتان پر بھی کئی بار حملہ کیا مگر اس پر قبضہ نہ کر سکے۔ حافظ صاحب کو سکھوں کی سرگرمیاں کھٹک رہی تھیں چنانچہ آپ مسلمانوں میں شجاعت اور بہادری کی روح پھونکتے رہتے تھے۔ خود بھی مردانہ وار جنگ کرنے کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سکھوں کے مقابلہ پر ڈٹ کر لڑے۔ قلعہ ملتان کے برج سے آپ سکھوں پر تیر اندازی کرتے رہے۔

۱۲۲۶ھ میں دوسری مرتبہ سکھوں نے ملتان پر حملہ کیا۔ اس وقت آپ ملتان میں موجود نہ تھے۔ جب خبر ملی تو چناب کو عبور کر کے ملتان پہنچے۔

غرض کئی مرتبہ آپ سکھوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔

ملفوظات | خاصی تعداد میں آپ کے ملفوظات پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض مرتب بھی کیے گئے ہیں۔ ذیل کے ملفوظات مشہور ہیں:

۱۔ فضائل رضیہ	از	مولوی عبدالعزیز
۲۔ اسرار کمالیہ	از	زاہد شاہ
۳۔ انوار جمالیہ	از	منشی غلام حسن شہید ملتانی

وفات | ۵ جمادی الثانی ۱۲۲۶ھ کو بعارضہ تپ صفراوی وفات پائی۔

اولاد | آپ نے دو شادیاں کی تھیں، مگر اولاد کسی سے نہ ہوئی۔

خلفاء | آپ کے خلفاء کی تعداد بہت زیادہ ہے، چند کے نام یہ ہیں:

۱۔ مولانا مولوی خدا بخش خیرپوری

۲۔ مولوی عبدالرزاق جو حافظ صاحب کی زندگی ہی میں وفات پا گئے اور ملیسی میں مدفون ہیں۔

۳۔ مولوی حامد صاحب

---

[1] خواجہ گل محمد احمد پوری حافظ محمد جمال ملتانی کے شاگرد تھے۔

۴ - سید زاہد شاہ صاحب

۵ - سید بلند شاہ صاحب جن کا مزار جھکڑ ضلع میانوالی میں مرجع خلائق ہے ۔

۶ - مولوی غلام حسن　　　　۷ - صاحبزادہ غلام فرید

۸ - قاضی عیسیٰ خان پوری　　　　۹ - مولوی عبید اللہ ملتانی

۱۰ - مولوی عبدالعزیز پڑہیاری

مولانا خدا بخش ملتانیؒ حافظ صاحب کے خلیفہ مولانا خدا بخش ملتانیؒ ان کے جانشین بنے جنھوں نے چشتیہ نظامیہ سلسلہ کی ترویج کے لیے بہت کام کیا۔ خیر پور میں آپ کا روضہ مرجع خلائق ہے۔ قصبہ تلمبا کے رہنے والے قوم ملہنا میں سے تھے۔ آپ کے بزرگوں میں مولوی محمود صاحب ولی کامل تھے۔ آپ کے والد بزرگوار مولوی جان محمد بھی بڑے عالم اور متقی شخص تھے ۔

طلب علم کے لیے مولوی عبدالحکیم چشتی[1] کے ہاں گڑھی اختیار خاں جانے کا ارادہ کیا۔ جب شجاع[2] آباد پہنچے تو لوگوں کے اصرار پر دو تین ماہ تک وہیں مقیم رہے۔ پھر ملتان کا قصد کیا تاکہ حافظ محمد جمال ملتانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ چنانچہ ان کے آستانہ پہ حاضری دی اور بیعت سے سرفراز ہوئے ۔

حافظ صاحب کی ہدایت کے مطابق آپ تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، علم ہیئت، صرف و نحو، منطق و معانی، بدیع و بیان وغیرہ جملہ علوم متعارفہ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ یہ شغل بڑھاپے تک جاری رہا۔ تمام لوگوں میں آپ کے علمی کمالات کا چرچا پھیل گیا تھا۔ سینکڑوں طالب علم آپ سے فیض حاصل کر کے روحانیت کے اعلیٰ مدارج پر پہنچے ۔ آپ نے " توفیقیہ" کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف کی جس میں احکام شریعت کے آداب، حقیقت اور معرفت کے اسرار بیان کیے ۔

طویل مدت ملتان اور اطراف واکناف میں گزارنے کے بعد آپ خیر پور چلے آئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ بہاولپور کے نواب محمد صادق خاں نے آپ کے خدام کا روزینہ مقرر کر دیا اور لنگر کا سارا خرچ بھی اپنے ذمے لیا، چنانچہ وہاں ایک عمدہ سرائے فقرا کے لیے حجرے اور دیگر عمارتیں تعمیر کرائی گئیں ۔

آپ کے کشف و کرامات کے کئی واقعے بیان کیے جاتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ ملتان کی کسی گلی میں سے گزر رہے تھے کہ کتیا آپ پر بھونکی۔ آپ نے مڑ کر اس پر نگاہ ڈالی اور چلے گئے۔ کچھ دیر بعد واپس اسی راستے سے گزرے تو دیکھا کہ کتیا مری پڑی ہے، آپ اس کے پاس کھڑے ہو گئے اور فرمایا اے کتیا، اس فقیر نے تجھے کچھ نہیں کہا، مگر خدا نے اپنے بندے کے حق میں تیری یہ گستاخی گوارا نہ ہوئی۔

صفر [illegible] میں خیر پور میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے ۔

---

[1] یہ بزرگ حضرت گنج شکرؒ کی اولاد میں سے تھے ۔　　　[2] یہ شہر ملتان سے اٹھارہ کوس کے فاصلے پنجاب میں ہے۔

حضرت خواجہ خواجگان شاہ عیسیٰ ولیؒ

ولادت ——— گنڈاپور (مضافات ملتان)

وفات ——— " ۱۲۲۰ھ

حضرت خواجہ شاہ عیسیٰ ولی ان بزرگانِ دین اور اولیائے کرام میں سے ہیں جن کی صحبت کیمیا اثر سے سرحد کے ہزاروں بندگانِ خدا نے فیض حاصل کیا اور انوار باطنی سے اپنے دلوں کو منور کیا۔ آپ سید النسب تھے۔ آپ کے وطن کا نام بعض نے چوڑہ اور بعض نے گنڈاپور بتایا ہے، جو ملتان کے مضافات میں ایک مقام ہے۔ یہیں آپ نے ۷ ذی الحجہ ۱۲۲۰ھ میں وفات پائی اور اسی جگہ مدفون ہیں۔ حافظ جمال اللہ رامپوری کے مرید و خلیفہ تھے۔

آپ کمالات ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔ صاحب مقامات و کشف و کرامات بزرگ تھے۔ ابتدائے حال میں حافظ جمال اللہؒ کی صحبت کیمیا اثر میں رہے اور انوارِ باطنی سے مستفید ہوتے رہے۔ انھیں کے ہمراہ دہلی سے رام پور اور رام پور سے دہلی کا سفر کرتے رہے۔ پیرو مرشد کے ساتھ بڑے مشفقانہ اور رازدارانہ تعلقات تھے۔ حافظ صاحب کے پاس جو لوگ فیض روحانی حاصل کرنے آتے تھے حافظ صاحب انھیں آپ کے سپرد کر دیا کرتے تھے اور آپ بڑی محبت اور محنت سے انھیں سلوک و عرفان کے منازل طے کراتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ جب حضرت بابا فیض محمدؒ نے حافظ صاحب سے بیعت کی تو حافظ صاحب نے انھیں رشد و ہدایت اور تعلیم و تربیت کی غرض سے خواجہ عیسیٰ ولیؒ کی خدمت میں بھیج دیا تھا جہاں انھوں نے کسب سلوک میں اونچا درجہ حاصل کیا۔ آپ نے انھیں ظاہری و باطنی کمالات سے فیض یاب کرنے کے بعد اپنی اجازت خاص سے مشرف فرمایا اور تا زندگی اپنے فیض و دیدار سے شاد کام کرتے رہے۔

جب حافظ صاحب وفات پا گئے تو شاہ عیسیٰ ولیؒ اپنے وطن موضع گنڈاپور واپس آگئے اور یہیں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ دو ایک مرتبہ اپنے مرید خاص حضرت بابا فیض اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات کے لیے تیراہ بھی تشریف لے گئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ تیراہ گئے تو حضرت محمد فیض اللہؒ کے تمام فرزندوں کو طلب فرمایا، ان کے ساتھ بڑی شفقت اور مہربانی سے پیش آئے۔ ہر ایک کا مزاج پوچھا، پھر حضرت بابا نور محمدؒ کا حال دریافت فرمایا۔ اس موقع پر بابا فیض اللہ نے فرمایا کہ ان کے دوسرے بھائی پوری طرح تحصیل علم کر چکے ہیں مگر ان کا ذہن ابھی اچھی طرح رسائی نہیں کرتا اور ابھی تک انھوں نے بمشکل نصف قرآن مجید ختم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بہت افسردہ خاطر رہتے ہیں۔

حضرت خواجہ صاحب نے یہ سُنا تو انھیں بہت دُکھ ہوا اور حضرت نور محمدؒ پر بڑا رحم آیا۔ بڑی محبت اور شفقت سے پاس بلایا، پیار کیا اور تسلی و تشفی دی۔ پھر اپنے سینہ مبارک سے لگایا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے حضرت نور محمد کا سینہ انوار باطنی سے مزین ہوگیا اور منزل علم و عمل آسان ہوگئی۔ سینہ ایسا کھلا کہ جس کتاب کو پڑھتے اس پر حاوی ہو جاتے۔ اور جو بھی مسئلہ دریافت کیا جاتا پوری شرح اور اسناد کے ساتھ بیان کر دیتے۔

کہتے ہیں ایک دن حضرت بابا فیض اللہؒ نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے ایک عزیز دوست کی محبت نے بہت پریشان کر رکھا ہے، وہ طالب علمی کے زمانہ میں کئی سال میرے ساتھ پڑھتے رہے۔ اب میرا جی چاہتا ہے کہ ان کی ملاقات کروں۔ وہ پشاور شہر کے قریب کسی جگہ رہتے ہیں اور حضرت جی کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔

آپ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا کہ میں آپ کی خواہش کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا، شاید کوئی ایسا موقع مل جائے کہ میں آپ کی ان سے ملاقات کرا دوں۔

اس واقعہ کے تھوڑے دن بعد ایک مرتبہ پر حضرت شاہ عیسٰی ولیؒ نے بابا فیض اللہ سے فرمایا کہ میرے ساتھ چلو۔ وہ ساتھ ہو لیے۔ جب آبادی سے باہر ویران جگہ میں آئے تو شاہ عیسٰی نے فرمایا مراقب ہو کر بیٹھ جاؤ اور خود بھی ان کے ساتھ مراقبے میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ دُور سے دو آدمی چلے آرہے ہیں۔ نزدیک آکر انھوں نے دونوں کو سلام کیا آپ نے سلام کا جواب دیا اور بڑے ادب کے ساتھ ان سے مصافحہ کیا۔ جب حضرت فیض اللہ نے ان کی طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ ان میں سے ایک وہی حضرت جی ہیں جن سے ملنے کا انھیں اشتیاق تھا۔ حضرت شاہ عیسٰی ولیؒ نے حضرت فیض اللہ سے مخاطب ہو کر فرمایا او دیوانے! تو جانتا ہے کہ یہ دوسرا شخص کون ہے، انھوں نے عرض کیا انھیں میں نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا یہ دوسرے صاحب حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔ کچھ مانگنا ہو تو ان سے مانگ لو۔ حضرت فیض اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے عرض کیا مجھے جو کچھ ملنا ہے وہ آپ ہی سے ملنا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام بھی ملے ہیں تو آپ ہی کی برکت و عنایت سے، ورنہ میری کیا طاقت تھی!

حضرت عیسٰی ولیؒ کو حضرت فیض اللہؒ کا یہ جواب بہت پسند آیا، اٹھ کر گلے لگایا اور مقصودِ اصلی کو پہنچا دیا۔

خواجہ عیسٰی ولیؒ کے دو فرزند صاحب ولایت تھے۔ جب خواجہ صاحب کے وصال کا وقت آیا تو دونوں کو بلا کر وصیت فرمائی کہ میری وفات کے بعد تم دونوں حضرت فیض اللہؒ سے تجدید بیعت کرنا اور انھیں کی خدمت میں رہنا۔ یہاں تک کہ منازل تصوف طے نہ کر لو۔ ان کو چھوڑ کر کہیں نہ جانا۔ چنانچہ ہر دو فرزندوں نے والد بزرگوار کی وصیت پر پوری طرح عمل کیا۔ والد کی وفات کے بعد دونوں حضرت فیض اللہؒ کی خدمت میں رہے اور ان کی صحبت کیمیا اثر سے فیضیاب ہو کر روحانیت کے اعلیٰ مدارج کو پہنچے پیر و مرشد کی وفات کے بعد دونوں بھائی ان کے مزار مبارک پر حاضری دینے کے لیے تیراہ بھی تشریف لے جایا کرتے تھے۔

حضرت خواجہ بابا محمد فیض اللہ تیراہی رح

ولادت ———— تیزئی (تیراہ)

وفات ———— تیزئی ۱۲۳۵ھ

خواجہ خواجگان حضرت بابا محمد فیض اللہ علاقہ تیراہ کے بڑے صاحب کمال بزرگ تھے۔ کشف و کرامات میں بہت اونچا درجہ رکھتے تھے۔ حضرت سید حافظ جمال اللہ[1] کے مرید و خلیفہ تھے، لیکن زیادہ تر حضرت شاہ عیسٰی ولی رح کی صحبت میں رہ کر کسب فیض کیا۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام خان محمد تھا۔ وہ شادی خیل نام ایک مقام پر جو کوہاٹ شہر کے مضافات میں واقع ہے، درس علوم دیا کرتے تھے اور درس و تدریس کے سلسلہ میں بہت ماہر تھے۔

اپنے فرزند محمد فیض کو بھی انھوں نے خود پڑھایا اور اکیس سال کی عمر میں انھیں علوم ظاہری کی تعلیم سے فارغ کر دیا۔ "تذکرہ" میں خلیفہ محمد سعید لکھتے ہیں:

> آپ (بابا محمد فیض رح) نہایت صاحب کمال متشرع اور کشف و کرامات میں نہایت بلند درجہ رکھتے تھے۔ اکیس سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل سے فارغ ہو گئے اور علوم باطنی کی تحصیل میں مصروف ہوئے لیکن چونکہ عالم و پابند شریعت تھے اس لیے اکثر جگہ تلاشِ پیر میں ناکام رہے۔ اوائل میں ایک بزرگ کی شہرت سُن کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، دیکھا کہ وہ بزرگ نماز میں مشغول ہیں، لیکن دونوں پاؤں کے درمیان ایک بالشت کا فاصلہ ہے۔ یہ دیکھتے ہی آپ اُلٹے پاؤں لوٹ آئے کہ جو خود غیر شرع ہے وہ مجھے کیا فیض پہنچائے گا۔

---

[1] سید حافظ جمال اکابر اولیاء اللہ میں سے تھے۔ وطن مالوف گجرات شاہ دولہ تھا۔ قطب الاقطاب سید شاہ قطب الدین رح کے مرید و خلیفہ تھے۔ مصطفیٰ آباد (رام پور) میں رہ کر رشد و ہدایت کا کام انجام دیتے رہے۔ کچھ مدت صوبہ کٹھرہ میں بھی رہے جو رام پور کا صوبہ ہے۔ پھر رام پور آکر نواب کے سواروں میں ملازم ہو گئے۔ جب کیف و مستی کی حالت طاری ہوئی تو اخفائے راز نہ ہو سکا اور دنیا کو معلوم ہو گیا کہ حافظ جمال محض ایک عام شاہی ملازم ہی نہیں بلکہ بہت بڑے ولی اللہ ہیں۔ چنانچہ ایک دنیا آپ کی طرف اُمڈ آئی اور آپ کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے لگی۔ رام پور کے مشہور نواب کلب علی خاں رح کو آپ سے بہت زیادہ عقیدت تھی۔ اس نے وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد مجھے حافظ صاحب کے قریب دفن کیا جائے، چنانچہ اس کی قبر بھی حافظ صاحب کے مزار کے قریب واقع ہے۔ حافظ صاحب نے ۳ صفر المظفر ۱۲۰۹ھ کو وفات پائی۔ مزار مبارک رام پور میں ہے۔

آپ عالم شباب میں سپاہگری کرتے تھے اور ماہواری تنخواہ سے جو کچھ پس انداز ہوتا اس سے فقرا و صلحا کی خدمت کرتے۔ اتفاقاً رام پور جاکر نوکر ہوئے اور آپ کا پہرہ ایک برج پر مقرر ہوا۔ ایک دفعہ حضرت خواجہ حافظ جمال اللہ رحمۃ اللہ علیہ شکار کے واسطے تشریف لے جارہے تھے۔ اس راستہ سے گزر ہوا اور حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ کی نظر کیمیا اثر آپ پر پڑی۔ نظر کا پڑنا تھا کہ آپ از خود رفتہ ہو گئے اور اسی عالم مدہوشی میں برج سے نیچے گرے۔ حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ نے راستے ہی میں آپ کو دبوچ لیا اور اپنے گھر لے جاکر اپنی مسند پر بٹھایا اور شرف بیعت سے مشرف فرماکر آپ کی تربیت حضرت خواجہ علیسی ولیؒ اپنے محبوب خلیفہ کے سپرد فرمائی جب حضرت خواجہ محمد علیسی ولیؒ عازم ملتان ہوئے تو آپ کو حافظ جمال اللہؒ کی خدمت پر مامور فرما گئے۔ آپ نے چار سال تک ان کی خدمت وضو ولباس انجام دی۔ اس کے بعد حضرت خواجہ حافظ جمال اللہ علیہ الرحمۃ کی اجازت سے عازم وطن ہوئے۔ آپ قریباً اٹھارہ سال تک وطن سے باہر رہے۔ جب آپ موضع تیزنی ملک تیراہ میں پہنچے، آپ کے اہل خانہ نے بوجہ کثرت مفارقت کے نہ پہچانا۔ کچھ روز قیام کے بعد اپنے ایک ہم سبق دوست کے توسل سے پہچانے گئے اور گھر جانے کی اجازت ملی۔ آپ مع اپنی دوسری بیوی کے جو اثنائے راہ میں قاضی ڈوڈہ شریف نے آپ کے نکاح میں دی تھی، اپنے گھر تشریف لے گئے اور وہاں قیام پذیر ہوئے۔

آپ حضرت خواجہ محمد علیسی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لیے ہر سال بمقام چوڈہ شریف علاقہ ملتان تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اثنائے راہ میں سخت بیمار ہو گئے اور ایک مسجد کے حجرہ میں ٹھہرے۔ ایک روز اچانک حضرت محمد علیسی رحمۃ اللہ علیہ اس مقام پر پہنچے اور شام کی نماز سے فراغت کے بعد وہاں کے باشندوں سے دریافت کیا کہ یہاں ایک مسافر بیمار وارد ہے اس کی جائے قیام کا کسی کو پتہ ہے؟ نمازیوں نے عرض کیا کہ وہ مسجد کے حجرے میں فروکش ہے۔ حضرت خواجہ صاحب حجرے میں تشریف لے گئے اور جونہی حضرت خواجہ محمد فیض اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت صاحب کو دیکھا، حالت جذبہ و وجد میں آگئے۔ حضرت خواجہ محمد علیسی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو اٹھاکر سینے سے لگایا اور دیر تک تشفی فرماتے رہے۔ حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ کی ملاقات و صحبت کی برکت کا یہ اثر ہوا کہ آپ صبح تک بالکل صحت یاب ہو گئے۔ ایک دو روز ہر دو صاحبان اسی جگہ مقیم رہے۔

بعد ازاں حضرت حافظ جمال اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لیے رام پور تشریف لے گئے۔ آپ دوبارہ حضرت خواجہ جمال اللہ علیہ الرحمۃ کی خدمت پر مامور ہوئے اور سات سال تک ان کی خدمت کیمیا خاصیت میں حاضر رہ کر وطن کو واپس ہوئے۔ آپ کے اثنائے قیام وطن مالوف میں حضرت خواجہ محمد علیسی علیہ الرحمۃ دو مرتبہ

تیزئی تشریف لے گئے۔

حضرت خواجہ محمد فیض اللہ کی کرامات کے بارے میں لکھتے ہیں:

" تیزئی میں مسجد کے قریب ایک بلند چبوترے پر زیتون کے دو درخت جن میں ایک اتنا موٹا تھا کہ آٹھ گز رسی بمشکل اس کے گرد آتی تھی، زمانہ دراز سے خشک کھڑے تھے۔ آپ درخت کے سہارے بیٹھ کر کتاب لکھا کرتے تھے۔ جس وقت پانی پیتے باقی ماندہ پانی درخت زیتون کے دامن میں ڈال دیتے۔ ایک ماہ کا عرصہ نہ گزرا تھا کہ دونوں درخت سرسبز ہو گئے اور اب تک سرسبز موجود ہیں۔

پانی کی قلت کی وجہ سے لوگوں نے عرض کیا کہ حضور دعا فرمائیے، کہیں چشمہ نکل آئے۔ آپ نے ایک درخت کے نیچے کوئی جگہ پسند فرما کر حکم دیا کہ اسے کھودو۔ تھوڑا ہی کھود پائے تھے کہ خوشگوار پانی کا ایک چشمہ نکل آیا، جو ایک چھوٹی نہر کی طرح اب بھی جاری ہے۔

آپ کی زبان مبارک میں ایسی تاثیر تھی کہ جو کچھ ایک مرتبہ فرما دیتے اسی طرح ظہور میں آ جاتا، اور جو صاحب حاجت آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر دعا کے لیے عرض کرتا، اللہ سبحانہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کی حاجت اسی وقت پوری ہو جاتی۔"

آپ نے ۱۲۳۵ھ میں اور بعض اقوال کے مطابق ۱۲۴۵ھ میں وفات پائی۔ مزار پرانوار تیزئی میں مرجع خلائق ہے۔

حضرت خواجہ قبلۂ عالم بابا نور محمد تیراہیؒ

ولادت ———— تیزئی (علاقہ تیراہ) ۱۱۷۹ھ

وفات ———— چورہ شریف (اٹک) ۱۲۶۸ھ

حضرت خواجہ نور محمد رحمۃ اللہ علیہ خاندانِ نقشبندیہ کے وہ جلیل القدر اور عالی مرتبت بزرگ ہیں جنھوں نے شمالی ہند میں رشد و ہدایت کا چراغ روشن کیا اور سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کی ترویج و اشاعت کے لیے بہت کام کیا۔

آپ کا اسم گرامی نور محمد اور قبلۂ عالم و بابا صاحب القاب تھے۔ تیزئی علاقہ تیراہ آپ کا مولد و مسکن ہے وہیں ۱۱۷۹ھ میں تولد ہوئے۔ حضرت خواجہ بابا محمد فیض اللہؒ کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ وفات سے قریباً ڈیڑھ سال قبل چورہ شریف میں تشریف لائے جو مضافات اٹک میں ایک مقام ہے اور ضلع کیمبل پور میں واقع ہے۔ یہیں ۱۲۶۸ھ میں وفات پائی۔ مزار پر انوار بھی اسی جگہ ہے۔

"تذکرہ" میں آپ کے حالات درج ہیں، جن کا ملخص پیش کیا جاتا ہے:

آپ مادر زاد ولی تھے۔ جب آپ کے والد بزرگوار موضع تیزئی میں قیام پذیر ہوئے تو آپ کی پہلی بیوی نے درگاہ خداوندی میں یہ نذر مانی کہ اگر حضرت خواجہ فیض اللہؒ کو اللہ تعالیٰ فرزند عطا کرے تو میں روزانہ سو رکعت نفل تا زندگی ادا کرتی رہوں گی۔ دوسری بیوی نے یہ وعدہ فرمایا کہ اگر مجھے اللہ تعالیٰ نے فرزند عطا کیا تو میں اُسے بڑی بیوی صاحبہ کی نذر کر دوں گی۔ اللہ تعالیٰ نے چھوٹی بیوی صاحبہ کو اسی سال فرزند نرینہ عطا فرمایا تو اس کے پیدا ہوتے ہی بڑی بیوی صاحبہ نے اُسے اٹھا کر دودھ پلانا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے بڑی بیوی صاحبہ کو ایسے دودھ اترنے لگا گویا انھیں سے یہ فرزند تولد ہوا ہے۔

حضرت خواجہ محمد فیض اللہ نے لڑکے کا نام نور محمد رکھا اور پیش گوئی فرمائی کہ یہ لڑکا نہایت صاحبِ کمال اور حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا وارث و متبع ہوگا۔ اس کے ذریعہ سے خاندانِ نقشبندیہ کو وہ فروغ ہوگا کہ کل دنیا میں خلق اللہ اس کے نور سے منور و فیض یاب ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

آپ نے تحصیل علوم ظاہر بہت کم فرمائی تھی، لیکن حضرت خواجہ محمد عیسیٰؒ کی نظر و توجہ کی برکت سے آپ کو علم لدنی سے حصہ وافر حاصل ہوا، اور ایسا شرح صدر ہوا کہ آپ دقیق سے دقیق مسئلہ کو مستند اسناد کے ساتھ حل فرما دیتے تھے اور جس طالب علم کو چاہتے، قلیل عرصہ میں درجۂ کمال تک پہنچا دیتے۔ آپ اپنے مریدانِ خاص کی طرف اس قدر توجہ اور التفات رکھتے کہ باوجود صوری مفارقت اور دوری کے آپ ہر وقت ان کے حال کے نگہبان اور آڑے وقت میں ان کی استعانت کو موجود ہوتے تھے

آپ کی ذات بابرکت سے پنجاب، ہندوستان، افغانستان اور دیگر ممالک میں وہ نور پھیلا اور اس قدر خلقت آپ سے اور آپ کے خلفا سے مستفیض و مستفید ہوئی کہ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے زمانے کے بعد ایسا سننے میں نہیں آیا۔ آپ کا فیض تمام اکناف عالم میں اب تک جاری و ساری ہے۔

آپ اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد جب ان کے جانشین ہوئے تو سب سے پہلے فقیر اللہ نور و عجب نور دو بھائی کہ قوم افغان سے تھے، آپ کی شرف بیعت سے مشرف اور آپ کی نظر فیض اثر اور صحبت کیمیا خاصیت سے درجۂ کمال کو پہنچ کر صاحب اجازت ہوئے۔ دونوں بھائی اتنے مشہور ہوئے اور افغانوں میں سے اتنے لوگ ان کی طریقت میں داخل ہوئے کہ انھیں بیعت کرنا محال ہوگیا، اور تمام افغانستان میں نورِ اسلام چمکنے لگا۔

اسی اثنا میں حضرت خواجہ نامدار شاہ عرف مولانا ہادی پاک صاحبؒ کہ نینتال علاقہ چھچھ کے رہنے والے تھے اور موضع کاشرہ میں علوم ظاہری کی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے، حضرت باباجی صاحب کو خواب میں دیکھ کر حاضر خدمت ہوئے۔ آپ نے ان پر خاص توجہ فرمائی اور شرف بیعت سے مشرف فرماکر صحبت کیمیا اثر میں رہنے کی اجازت دی۔ حضرت مولانا ہادی پاک بارہ سال تک باباصاحب کی خدمت انجام دیتے رہے اور ایسی ریاضت ہائے شاقہ اختیار فرمائیں کہ اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ آپ کی نظر التفات بھی ان پر خاص طور سے مبذول رہی، چنانچہ اپنی علو استعداد اور آپ کی نظر کیمیا اثر سے اس درجۂ کمال کو پہنچے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔

حضرت مولانا ہادی پاک جب اجازت خلافت و رشد و ارشاد سے مشرف ہوکر پنجاب کی ہدایت و تلقین پر مامور ہوئے تو ان کی ذات والا تبار سے اتنی خلق اللہ مستفید ہوئی اور اس قدر اسلام کو فروغ ہوا کہ حیطۂ تحریر میں نہیں آسکتا۔ آپ تقریباً اسی سال تیزئی میں مقیم رہے اور اس ملک میں ہر خاص و عام کو تلقین، ہدایت اور اپنے فیض سے مستفید کرتے رہے۔

آپ کے آخر زمانہ قیام میں ایک ملا مسمی ولی خاں آپ کا مخالف ہوگیا اور جگہ جگہ آپ کے خلاف بدگمانیاں پھیلانے لگا۔ جاہل لوگ ایسی خرافات سن کر مشتعل ہوگئے اور آپ کے عقیدت مندوں کو جو پنجاب اور ہندوستان سے آپ کی زیارت کے لیے آیا کرتے تھے، راستے میں لوٹ لیتے۔

آپ چند سال تک تو اسی طرح تکلیف کو برداشت کرتے رہے، لیکن آخرکار آپ کو یاروں کی تکلیف گوارا نہ ہوئی اور آپ دل آزردہ ہوکر تیزئی سے موضع ڈراڈر میں تشریف لائے۔ چند سال اسی جگہ رہے۔ آخر . . . . میں موضع چورہ شریف مضافات اٹک میں چلے گئے۔

نقل ہے کہ آپ کے چورہ شریف آنے سے گیارہ سال قبل جب کہ آپ موضع تیزئی ہی میں قیام رکھتے تھے۔ ایک روز آپ کا مخلص خاص فقیر میاں محمد ساکنہ چورہ شریف اپنے احباب کو جمع کرکے کہنے لگا کہ آج رات مجھے جناب باباجی صاحب اور مشائخ نقشبندیہ اس نالہ پر جمع ہوتے نظر آئے جو چورہ شریف سے ایک میل کے فاصلہ پر جانب شمال واقع ہے اور مجھے حکم دیا کہ اس جگہ

مسجد بنائی جائے۔ اور حضور نے آبادی کے لیے بھی کسی قدر جگہ تجویز فرمائی۔ اور اپنے روضہ مبارک اور اپنی اولاد و امجاد کے مزارات کی جگہ علیحدہ علیحدہ کر کے دکھائی۔ آؤ ہم سب دوست وہاں جا کر نشان بنا دیں۔ چنانچہ آپ اس جگہ گیارہ سال کے بعد فروکش ہوئے۔

حضور قبلہ عالم کی عادت مبارک میں بغایت اتباعِ سنّت اور اجتناب از نامشروعات و بدعات تھی۔ حقہ نوشی کو نہایت معیوب سمجھتے تھے۔ کسی حقہ نوش کو ختم خواجگان میں شرکت کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اور اپنے یارانِ طریقت کو اس بدعت سے اجتناب کی از حد تاکید فرمایا کرتے تھے۔ آپ نہایت سادہ طبیعت، فقر و فروتنی کو دوست رکھتے تھے۔ قریباً اسی سال تیراہ میں سکونت پذیر رہے، لیکن اس تمام عرصہ میں اپنے یا اپنے اہل و عیال کی سکونت کے لیے اینٹ گارے یا پتھر کا مکان نہیں بنوایا۔ باوجودیکہ اس ملک میں بہت سردی تھی، مگر آپ نے صرف جھاڑیوں کی باڑیں کھڑی کر کے گھاس پھوس اور جھاڑیوں سے جھونپڑی سی بنا رکھی تھی۔ اسی میں اہل و عیال رہتے تھے۔ باہر ایک ایسی نشست گاہ مہمانوں کے قیام کے لیے بنوا رکھی تھی۔ یارانِ طریقت کے بہت زیادہ اصرار سے اپنے آخری ایام قیام میں مہمانوں کے ٹھہرنے کے لیے پتھروں کی دیواروں کا ایک مکان بنوا دیا تھا جس کی چھت اسی نمونہ کی تھی اور یہ بھی آپ نے اس لیے گوارا فرما لیا کہ مہمانوں کو سردی سے تکلیف نہ ہو۔ آپ کی سادگی طبیعت کا یہ حال تھا کہ کھانے پہننے میں بالکل تکلف نہ فرماتے، جو کھانا میسر آتا کھا لیتے اور جس قسم کا پہننے کو میسر آتا پہن لیتے۔ آپ کے ہاں سارے برتن مٹی کے ہوتے۔ بڑے بڑے پیالوں اور برتنوں میں کئی آدمی مل کر کھاتے۔ مہمانوں کی خاطرداری میں ہمہ تن مصروف رہتے۔ اکثر مہمانوں کے ساتھ خود بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ باوجود کبر سنی کے سردیوں میں وضو یا غسل کے لیے کبھی گرم پانی استعمال نہ کیا۔ کسی ندی یا نالے کے یخ بستہ پانی سے وضو کر لیتے۔ وضو کے لیے جاری پانی کو پسند فرماتے۔ آپ نہایت کثیر العبادت تھے۔ صبح کی نماز کے بعد اشراق کا وقت ہونے پر چار رکعت نماز نفل ادا فرماتے پھر دوستوں کی مجلس میں بیٹھتے اور جو شرف ملاقات یا بیعت کے لیے آتا اس سے ملاقات کرتے اور بیعت کر کے اُسے تلقین فرماتے۔ کھانے کا وقت آتا تو دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔ کھاتے وقت کھانے کے جملہ آداب و شرائط ہمیشہ ملحوظ رکھتے۔ تھوڑے قیلولہ فرماتے اور زوال کے بعد وضو کر کے نفی اثبات کا ذکر کرتے۔ چار رکعت سنّت ظہر و عصر سے قبل آپ ضرور پڑھا کرتے تھے۔ نماز ظہر کے بعد توجہ فرماتے۔ سورۂ نوح کی تلاوت فرماتے۔ عصر کی نماز کے بعد دوستوں ہی کے ساتھ کھانا کھاتے۔ بعد ازاں چھ رکعت نفل اوابین پڑھتے، سورہ واقعہ تلاوت فرماتے۔ نماز عشا کے بعد سورہ ملک اور دوسری سورتیں پڑھ کر استراحت فرماتے۔ آخر شب میں تیسرا حصہ رات بیدار ہوتے۔ حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر وضو کرتے اور تہجد ادا کرتے۔ اکثر بارہ رکعت تہجد ادا کیا کرتے تھے۔ پھر استغفار کی ایک تسبیح پڑھ کر اور تھوڑی دیر مراقبہ کر کے نفی اثبات کا ذکر کرتے۔ ذکر اتنی تیزی اور تندہی کے ساتھ کرتے کہ آپ کے وجود مبارک سے دُور دُور تک بُھنے ہوئے گوشت کی خوشبو پھیل جاتی۔ صبح کی سنت ادا کرنے کے بعد فرض سے پہلے دائیں پہلو پر ذرا لیٹ جاتے تھے۔ کتاب مقاصد السالکین اکثر مطالعہ کیا کرتے تھے۔ سنت کی پابندی اور

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں نہایت درجہ کوشش فرماتے، طالب علموں اور مہمانوں کے ساتھ نہایت شفقت و مہربانی سے پیش آتے، اہلِ سادات اور عالموں کی بہت قدر کرتے اور ان کی تعظیم و تکریم بجالاتے۔

کامل نسبتِ مجددی سے فائز المرام اور ہر چہار سلسلوں میں صاحبِ اجازت تھے، لیکن طریقۂ نقشبندی مجددی کو زیادہ محبوب رکھتے تھے۔ اپنے خلفا میں سے حضرت ہادی پاکؒ سے زیادہ محبت تھی۔ جب انھیں خلافت عطا کرنے کے بعد پنجاب کی طرف روانہ فرمایا تو فرمایا کرتے تھے، میں نے پنجاب کی طرف ایک باز چھوڑا ہے، اس باز کی بازیاں اور بلند پروازیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب کبھی مولانا ہادی پاکؒ تیراہ تشریف لے جاتے تو آپ نہایت خوش ہوتے اور بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتے۔ کبھی کبھار فرمایا کرتے کہ مجھے اللہ جل شانہ نے اتنی طاقت اور قدرت ودیعت کی ہے کہ مولانا ہادی پاکؒ جیسے سوا لاکھ آدمی تیار کر دوں، لیکن میں کسی شخص میں ان کی سی بلندیِ استعداد نہیں دیکھتا۔ آپ کے صاحبزادوں میں بڑے صاحبزادہ حضرت فقیر محمدؒ کمالاتِ باطنی میں آپ کے وارث اور جانشین تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ بخشا نام ایک شخص نے حضرت باباجی صاحب سے بیعت کی، لیکن بدقسمتی سے بُری صحبت میں پھنس کر ایک عورت کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر بیٹھا۔ آپ اپنے ایک خلیفہ مخلص کے خواب میں آئے اور اسے تنبیہ کر کے ارشاد فرمایا، وہ راتوں رات روانہ ہو کر زنگلی پہنچے جہاں بخشا رہتا تھا اور اُسے بُری صحبت سے باز رہنے کی تلقین کی۔ اُسے خواب کا ماجرا من و عن بیان کر دیا۔ بخشا نے توبہ کی مگر شومیِ قسمت سے پھر اُسی بدعادت میں مبتلا ہو گیا۔ حتیٰ کہ ایک روز عورت کے عزیزوں نے اطلاع پا کر بخشا کو بہت زد و کوب کیا، پھر مرضِ جذام میں مبتلا ہو گیا۔ سال بھر اسی مرض میں مبتلا رہا اور بہت ذلیل ہوا۔ آخر تیراہ آیا اور حضرت باباجی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پہلے تو آپ نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی بالآخر اس کے حال پر رحم آ گیا۔ آپ کی نظرِ کرم اس پر پڑی تو وہ حالتِ جذبہ اور وجد میں آ گیا۔ اسی حالت میں مرض کے آثار دُور ہونے لگے، یہاں تک کہ حضور کی صرف چار روز کی صحبت سے وہ بالکل تندرست ہو گیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت باباجی جب تیراہ سے موضع ڈراڈو میں آ کر مقیم ہوئے تو میر اعظم نام ایک زمیندار نے اپنی بیوی کو اپنے عقد سے علیحدہ کر دیا۔ اس کے بطن سے اس کا ایک بیٹا تھا۔ ایک روز وہ لڑکا اپنی ماں سے ملنے کے لیے گیا۔ میر اعظم اس لڑکے کو مارنے لگا اور تلوار نکال کر اس کے درپے ہوا۔ لڑکا خوف کے مارے بھاگا اور حضرت باباصاحب کے دامن میں پناہ لی۔ میر اعظم اس کے پیچھے پیچھے تلوار لیے آ گیا اور بڑے تکبر کے ساتھ حضرت باباجی سے مخاطب ہوا، کہنے لگا اس لڑکے کو میرے حوالے کر دیں۔ آپ نے فرمایا لڑکا بے چارہ روتا ہے اور میری پناہ میں بیٹھا ہے، اسے کچھ نہ کہو۔ میر اعظم سے نہ رہا گیا اور تلوار چلا دی جس سے حضرت باباصاحب کی آستینِ مبارک مضروب ہو گئی۔ آپ نے فرمایا اچھا جا لڑکے کا خدا حافظ۔ یہ فرمایا اور لڑکے کو چلے جانے کی اجازت دے دی۔ لڑکا گھر کی طرف بھاگا۔ میر اعظم اسے مارنے کے لیے اس کے پیچھے گیا۔ بیس قدم سے زیادہ نہ گیا ہو گا کہ اس کے پیٹ میں سخت درد اٹھا جسے وہ برداشت نہ کر سکا اور اوندھے منہ زمین پر گر کر مر گیا۔

چورہ شریف میں حضرت باباصاحب کا عرس بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا ہے۔ چورہ شریف جانے کے لیے جنڈ ریلوے سٹیشن سے ڈیڑھ دو میل پیدل راستہ ہے۔

حضرت سچل سرمستؒ

ولادت ———— درازن (علاقہ خیرپور میرا) ۱۱۷۰ھ

وفات ———— " " " ۱۲۴۲ھ

حضرت سچل سرمست سندھ کے صوفی بزرگ اور شاعر تھے۔ کئی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ سندھی کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی اور پنجابی میں بھی آپ کے صوفیانہ ارشادات موجود ہیں۔

نام و نسب | آپ کا نام نامی عبدالوہاب تھا۔ خیرپور (سندھ) کی حد میں رانی پور سے ایک میل کے فاصلے پر شمال میں درازن نام ایک شہر ہے جہاں ۱۱۷۰ھ مطابق ۱۷۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میاں صلاح الدین اور دادا کا اسم مبارک میاں صاحبڈنو تھا۔ میاں صلاح الدین اور میاں عبدالحق دو بھائی تھے۔ دادا کی وفات کے بعد میاں عبدالحق ان کی گدی پر بیٹھے۔ آپ کا شجرہ اٹھائیسویں پشت میں حضرت عمر فاروق رضؓ سے ملتا ہے۔ اس لیے آپ فاروقی بھی کہلاتے ہیں۔

ابتدائی حالات | حضرت سچل سرمستؒ کے مفصل حالات کسی کتاب میں ہماری نظر سے نہیں گزرے، البتہ عبدالمالک آفندی کے ایک مضمون سے ان کے جو حالات سامنے آتے ہیں ان کا ملخص پیش کیا جاتا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سچل سرمستؒ کے جد امجد حضرت شہاب الدین بن عبدالعزیز بن عبداللہ بن حضرت عمر فاروق رضؓ، محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ میں آئے تھے اور جب ۹۳ھ میں سیوان کا قلعہ فتح ہوا تو محمد بن قاسم نے شیخ شہاب الدین کو سیوان کا حاکم مقرر کیا۔ وہ ۹۵ھ میں فوت ہوئے۔ ان کی قبر سیوان میں ہے۔

شیخ شہاب الدین کی وفات کے بعد ان کا خاندان اسی جگہ مقیم رہا۔ سچل سرمست اپنے والد کی وفات کے وقت بہت چھوٹے تھے، چنانچہ ان کے چچا عبدالحق نے ان کی پرورش کی۔ بچپن ہی سے عشق الٰہی کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اس زمانے میں شاہ عبداللطیف بھٹائی بھی درازن میں آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شاہ صاحب سچل سرمست کے ہاں بھی آئے، سچل سرمست بچے تھے، پاؤں میں گھنگرو باندھ رکھے تھے۔ شاہ صاحب کی نظریں پر پڑیں تو پاس بلایا اور پیار کیا۔ پھر فرمایا ہم نے معرفت الٰہی کی لذت ملی میں حاصل کی ہے اور جو ہنڈیا ہم نے پکائی ہے اس کا ڈھکن سچل اتاریں گے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی وفات کے بعد آپ کی گدی پر میاں سخی قبول محمد بیٹھے تو سچل سرمست ان سے رجوع ہوئے اور خرقہ خلافت انھیں سے حاصل کیا۔ چودہ سال کی عمر میں عربی اور فارسی سیکھ لی، پھر ویرانوں اور جنگلوں میں پھرتے رہے اور نفس کو مارنے کے لیے سخت ریاضتیں کیں۔ اس قدر پرہیزگار اور باخدا تھے کہ لوگ آپ کو منصور آخر الزمان کے نام سے پکارتے

تھے۔ جب جوان ہوئے تو چچا عبدالحق نے اپنی لڑکی سے ان کی شادی کر دی۔ ایک بچہ ہوا مگر وفات پا گیا۔

آپ کا قد درمیانہ، رنگ گندمی، پیشانی کشادہ اور خوبصورت خدوخال تھے۔ سر کے بال بہت لمبے ہوتے تھے سر پر ہمیشہ سبز رنگ کی ٹوپی رکھتے تھے۔ سفید کرتہ اور سفید دھوتی پہنتے۔ عالم مستی میں اکثر ننگے پاؤں پھرا کرتے تھے۔ ہاتھ میں ہمیشہ لمبی لکڑی رہتی تھی۔ چونکہ موسیقی سے دلچسپی تھی اس لیے اپنے ہاتھ میں یکتارہ بھی رکھتے تھے۔ بہت کم سوتے، کم کھاتے۔ زیادہ تر روزہ رکھتے، اکثر لکڑی کی چوکی پر مراقبے کی حالت میں بیٹھے رہتے۔

بہت رحمدل اور سخی تھے۔ شریعت کے سختی سے پابند تھے۔ پانچ وقت کی نماز پابندی سے ادا کرتے تھے۔ بعض وقات مستی کے عالم میں گانے اور یکتارہ بجاتے گئے۔ جب ہوش میں آتے تو انھیں معلوم نہ ہوتا کہ میں نے کیا کیا۔ خود کہا کرتے تھے کہ مستی کے عالم میں میں جو کچھ کہتا ہوں، اس کا مجھے خود علم نہیں ہوتا۔ اپنا بہت سا کلام دریا بُرد کرا دیا تاکہ کہیں لوگ اس کے مطلب کو صحیح پا کر راہ حق سے بھٹک نہ جائیں۔ بہت زیادہ تعداد میں آپ کے مرید تھے۔ نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی آپ کے عقیدت مند تھے۔

آپ کے کئی خلیفہ تھے، جنھیں بالک، کہتے ہیں۔ آپ کو مختلف زبانوں پر دسترس حاصل تھی، چنانچہ کئی زبانوں میں آپ کا کلام موجود ہے۔ مندرجہ ذیل کتابیں آپ کی تصانیف بتائی جاتی ہیں:

۱۔ دیوانِ آشکارہ (فارسی) ۲۔ رہبرنامہ (مثنوی) ۳۔ رازنامہ (مثنوی) ۴۔ قتل نامہ اور گدازنامہ ۵۔ تارنامہ ۶۔ مرغ نامہ اور ۷۔ وحدت نامہ۔ آپ "وحدۃ الوجود" کے قائل تھے۔ چنانچہ آپ کے کلام میں جگہ جگہ اس کے متعلق اشارے ملتے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں (سندھی سے ترجمہ):

کوئی اور سمجھنا محض گناہ ہے
ہر کسی صورت میں ربِ کریم کا جلوہ ہے
کوئی مجھے کچھ کہتا ہے کوئی کچھ
لیکن مجھے پروا نہیں، کیونکہ میں جو کچھ ہوں وہی ہو سکتا ہوں۔

آپ کے صوفیانہ کلام میں نورانی بجلی کی تڑپ پائی جاتی ہے۔ آپ کا عقیدہ ہے کہ محبت کی بنیاد روحوں کے ملاپ پر ہے اور جب ایسا ہو جائے تو عاشق اور محبوب دونوں ایک دکھائی دیتے ہیں۔ اس منزل کو پا کر آپ اپنے عطار کو جس نگاہ سے دیکھتے ہیں اور عطار کی دکان سے جو خوشبو اسے حاصل ہوتی ہے۔ اس نے آپ کو بے خودی کی منزل تک پہنچا رکھا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

عطار نبود آنکہ خدا بود خدا بود — او پاک وجود آنکہ خدا بود خدا بود
در نام فرید آمد آں یار یگانہ — پس عشق فزود آنکہ خدا بود خدا بود

در کوئے نشاپور کہ بری المطلب است	گردیم سجود آں کہ خدا بود خدا بود
آشکار کند علم رموزات نہانی	در عشق کشود آں کہ خدا بود خدا بود

آپ فرماتے ہیں کہ عشق الٰہی کی انتہا حاصل کرنے کے لیے عاشق کو بتدریج تین منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے "فنا فی الشیخ" "فنا فی الرسول" اور "فنا فی اللہ"۔ جب تک کوئی عاشق فنا فی الشیخ نہیں ہوتا، فنا فی الرسول کی منزل کو نہیں پا سکتا اور جب تک فنا فی الرسول نہ ہو معرفت الٰہی کی منزل تک اس کی رسائی ناممکن ہے۔

فنا فی الشیخ کی منزل سے گزرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ عاشق کے لیے فنا فی الرسول کی منزل سے گزرنا ضروری ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

اے بجز دروازۂ احمد راہ نیست	گرنہ دانی دولت آگاہ نیست
آں کہ در را احمد احد دانست فرق	در خبر او را فنا فی اللہ نیست
جز محمد نیست در کون و مکاں	جز علی دیگر کسے ہمراہ نیست
گر کسے را عشق او دامن گرفت	بالیقیں دانی کہ آں گمراہ نیست
آں خدا و آں رسول ای آشکار	اندریں رہ شک و اشباہ نیست

مطلب یہ کہ خدا کے بندے اگر تم حقیقی خدا کا وصال کرنا چاہتے ہو تو سب سے پہلے اس کے رسول محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے آغوش میں اپنے آپ کو ڈال دو، ورنہ تم منزل نہ پا سکو گے۔

پھر عاشق الٰہی کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ عشق کی وادی میں سفر کرنا اور شک و شبہ میں نہ پڑنا بہت مشکل بات ہے۔ اس راہ میں تو مرشد کامل کی رہبری اور مدد کے بغیر منزل کو نہیں پا سکتا۔ قدم قدم پر تمہیں نفس کے پھندے ملیں گے۔ اس راہ میں کئی لیلےٰ کے وصال کے لیے مجنوں ہو گئے اور کئی فرہاد پہاڑ کھود کھود کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، مگر وصال یار کسی کو نصیب نہ ہوا۔ لہٰذا اگر تم چاہتے ہو کہ اس منزل کو بخیر و خوبی طے کرو تو سب سے پہلے کسی مرشد کامل کا دامن پکڑو تاکہ وہ تمہیں صحیح راہ پر لے جائے۔ فرماتے ہیں:

یک روز بودم من بخدمت مصطفےٰ	سرور کونین آں خیر الوریٰ
ایں چنیں فرمود مارا از کرم	جز برخصت پیر عبدالحق میا
از گروہ خاص او را کردہ ام	جلوۂ فیضش بود ہم جا بجا
شان و شوکت پیر ما بالاتر است	ہمچو او کس نیست در عالم علا
آشکارا خاک پائے پیر باش	تا شوی اندر دوستی آں بادشا

فرماتے ہیں اگر تم شریعت و طریقت اور معرفت کی منزلیں طے کر کے اللہ اور اس کے حبیب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے دیدار سے مشرف ہونا چاہتے ہو تو اپنے مرشد اور پیرِ طریقت کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھو۔ اس کے ہر حکم پر تسلیم خم کردو۔ فرماتے ہیں:

ہادی و رہنماست حق الحق!	عارف و اولیاست حق الحق
بادشاہ و گدا یکے ست یکے	نہ گدا بادشاہ ست حق الحق
عبد معبود اوست گر دانی	در نظر ما خداست حق الحق
ما رسول و خدا یکے دانم	ہر دو عالم گواہ ست حق الحق
یک دمے دور نیست از ما ہیں	آشکارا بما ست حق الحق۔

"فنا فی الشیخ" کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ایک دن ایک فقیر ایک دریا کو پار کر کے دوسری طرف جانے کے لیے جسم سے کپڑے اتارنے کی تیاری کر رہا تھا کہ وہاں کے گاؤں سے ایک اور آدمی بھی آگیا۔ نو وارد نے کہا کہ اے فقیر یہاں تو دریا پار کرنے کے لیے کوئی کشتی نہیں تو کیسے دریا پار کرے گا۔ وہ بولا میں اللہ اللہ کہتا ہوا دریا سے پار اتر جاؤں گا۔

نو وارد نے کہا مجھے بھی ساتھ لے چلو، کیونکہ مجھے بھی دوسرے گاؤں جانا ہے۔ فقیر نے کہا اچھا تو بھی کپڑے اتار کر تیاری کرلے اور دریا میں اتر آ، میں اللہ اللہ کا ورد کرتا ہوا دریا پار کروں گا اور تو میرے شانے پر ہاتھ رکھ میرے نام کا ورد کرتا جا۔ تاکہ تو بھی دریا پار اتر جائے۔ اجنبی بھی فقیر کے ہمراہ دریا میں اتر گیا، جب دریا کے بیچ میں پہنچے تو اجنبی نے سوچا یہ خود تو اللہ اللہ کا ورد کرتا ہے اور میں اس کے نام کا ورد کرتا ہوں، یہ تو گناہ ہے، میں بھی اللہ کے نام کا ورد کروں گا۔ یہ سوچ کر اس نے بھی اللہ اللہ کہنا شروع کر دیا۔ خدا کی قدرت کہ وہ اس طرح کرنے سے ڈوبنے لگا۔ فقیر نے یہ دیکھا تو کہا دیکھا تم نے میری نصیحت پر عمل نہیں کیا اور ڈوبنے لگے ہو۔ اب بھی میرے نام کا ورد کرو پار اتر جاؤ گے۔ تم شک کے بھنور میں پھنس گئے ہو۔ تم نے پہلے ہی اللہ اللہ کا ورد کرنا شروع کر دیا ہے۔ ابھی تو تم میرے ہی نام کا ورد ٹھیک طرح سے نہیں کر سکتے یہ تمھاری غلطی ہے۔ مطلب یہ کہ مرشد کی رہنمائی کے بغیر گوہرِ مقصود ہاتھ نہیں آتا۔

وفات | سچل سرمست ؒ نے ۱۴ رمضان ۱۲۴۲ھ کو وفات پائی۔ وفات سے کچھ دن قبل آپ نے اس حادثے کی طرف اشارہ کر دیا تھا، فرمایا تھا میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دیدار کی تیاریاں کر رہا ہوں۔

مزارِ مبارک درازن شہر میں ہے۔ اس وقت کے والیِ خیرپور میر رستم خان نے مزارِ مبارک پر مقبرہ تعمیر کرایا۔ بعد ازاں دوسرے والیوں نے وقتاً فوقتاً مقبرے کی مرمت کرائی۔ آپ کے مزار پر دور دور سے لوگ زیارت کے لیے آتے ہیں۔

حضرت شاہ نیاز احمد بریلویؒ

ولادت ———— سرہند ۱۱۴۳ھ

وفات ———— بریلی ۱۲۵۰ھ

حضرت مولانا شاہ نیاز احمد صاحبؒ شاہ فخر صاحبؒ کے مشہور ترین خلفاء میں تھے۔ علم و فضل میں یکتائے عصر تھے۔ زہد و تقویٰ کا دُور دُور شہرہ تھا۔ بریلی کے محلہ خواجہ قطب میں ان کی خانقاہ ہے جو خانقاہ نیازیہ کے نام سے مشہور ہے۔ ہزاروں عقیدت مندوں کا وہاں ہجوم لگا رہتا تھا۔ تشنگانِ معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لیے دُور دور سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ کابل، قندھار، شیراز اور بدخشاں کے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض اٹھاتے اور فائدہ حاصل کرتے تھے[1]

خود شاہ صاحب کا عالم یہ تھا کہ عشقِ حقیقی کے نشے میں چور رہتے تھے۔ دردِ عشق ان کا سرمایہ حیات تھا۔ یہ آگ ہر وقت ان کے سینے میں سلگتی تھی۔ کبھی کبھی اس کے شرارے شعر کی صورت میں نمودار ہوتے تھے۔ وہ شعر بہت کم کہتے تھے، لیکن جب کبھی کہتے تھے اپنا دل نکال کر رکھ دیتے تھے۔ ان کے لفظ لفظ سے اثر ٹپکتا تھا۔ ان کا شعر اعماقِ روح سے نکلتا اور سننے والے کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا، یہی وجہ تھی کہ ان کا کلام اس زمانہ کے صوفیہ میں بہت مقبول ہوا۔ صاحب خزینۃ الاصفیا نے لکھا ہے "حضرت شاہ صاحب شعر کی جانب بڑی رغبت رکھتے تھے اور نہایت آبدار اشعار جن میں حقائق و معارف کا ذکر ہوتا تھا، کہتے تھے۔ چنانچہ دیوان نیاز جماعت اصفیا میں بے حد مرغوب ہے"[2]

ابتدائی حالات شاہ نیاز احمد صاحبؒ ۱۱۴۳ھ میں بمقام سرہند پیدا ہوئے[3]۔ والد ماجد حکیم شاہ رحمت صاحب کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا۔ والدہ ماجدہ نے پرورش کی اور تعلیم و تربیت کا نہایت عمدہ انتظام کیا۔ جب سرہند کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو دہلی میں شاہ فخرالدین صاحب کی خدمت بابرکت میں علوم ظاہری کی تکمیل کے لیے حاضر ہوئے۔ چونکہ نہایت ذکی اور ذہین انسان تھے، ۱۷ سال کی عمر میں معقول و منقول، فروع و اصول، حدیث و تفسیر میں کمال حاصل کر لیا۔ علوم ظاہری سے فراغت ہوئی تو شاہ فخرالدین دہلوی کے دست مبارک پر بیعت کر لی اور علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۹ سال تھی۔ آپ کی لیاقت، استعداد اور سعی پیہم سے پیر بہت متاثر ہوئے اور اپنا خلیفہ . . . مقرر کیا اور بریلی میں اقامت کی ہدایت فرمائی۔ بریلی پہنچ کر شاہ نیاز احمد صاحب نے اپنی خانقاہ قائم کی، جو بہت جلد بقول مولانا غلام سرور

---

[1] خزینۃ الاصفیا جلد اول   [2] جلد اول   [3] مناقب فخریہ۔ ص ۴۰

"معدنِ فیوضِ ربانی اور مطلعِ انوارِ ربانی" بن گئی۔ جگہ جگہ سے لوگ فیض حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اٹھارویں صدی میں چشتیہ نظامیہ سلسلے کو ہندوستان میں جو کچھ فروغ ہوا، وہ مولانا شاہ فخر الدین صاحب دہلوی کے دو مریدوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ شاہ نور محمد صاحب نے پنجاب میں اور شاہ نیاز احمد صاحب نے یوپی میں اس سلسلے کو خوب پروان چڑھایا۔

دہلی میں درس و تدریس | اس زمانہ کے صوفیہ نے درس و تدریس کا کام اپنے پروگرام کا ایک لازمی جزو بنالیا تھا۔ چنانچہ شاہ نیاز احمد صاحب نے بھی کافی عرصہ تک دہلی میں درس و تدریس کا کام انجام دیا۔ مصحفی نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ان کی "شانِ علم" اور "وجاہت" دیکھی تھی۔ ریاض الفصحا کے ایک بیان سے دہلی میں ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے[1]

مصحفی اور شاہ صاحبؒ | مصحفی نے دہلی میں حضرت شاہ نیاز احمد صاحب سے تلمذ کیا تھا۔ ریاض الفصحا میں لکھتے ہیں:

"چندروز میزان ہم از ایشاں در شاہ جہان آباد خواندہ بود"[2]

جب مصحفی لکھنؤ چلے گئے اور ان کے شاعرانہ کمالات کا شہرہ شاہ صاحب کے کانوں تک پہنچا تو اپنی ایک غزل مصحفی کو لکھ کر بھیجی۔

کسے کہ سر نہاں است ہمہ اوست | عروسِ خلوت و ہم شمعِ انجمن ہمہ اوست
زمصحفِ رخِ خوباں ہمیں نمود رقم | کہ خط و خال و رخ و زلف پرشکن ہمہ اوست
نظر بہ غیب مکن در ظہور باغِ وجود! | کہ طوطیانِ چمن زاغ و ہم زغن ہمہ اوست
ز سرِ عشق چو واقف شوی یقیں دانی | کہ قیس و لیلےٰ و شیریں و کوہ کن ہمہ اوست
شنیدہ ام بہ صنم خانہ از زبانِ صنم | صنم پرست و صنم گو صنم شکن ہمہ اوست

رساند مطربِ خوش گو ہمیں ندا در گوشش
کہ چوب و تار صدائے تنن تنن ہمہ اوست

شاہ صاحبؒ بحیثیت شاعرِ اردو | شاہ نیاز احمد صاحبؒ کو سوز و گداز سے بھری ہوئی طبیعت ودیعت کی گئی تھی۔ عشق ان کے خمیر میں تھا، جذبات عشق و محبت کبھی کبھی شعر کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ شعر بہت کم کہتے تھے، اسی وجہ سے ان کے اردو اور فارسی دونوں دیوان بہت مختصر ہیں، لیکن جو کچھ بھی ہے وہ اپنی جامعیت اور افادیت میں کم نہیں۔ ان کی فکر رسا نے تصوف کے نہایت باریک نکات کو انتہائی حسن اور دل کشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے کلام میں آورد نہیں۔ وہ قلبی واردات کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ سوز و گداز، درد، علو معانی کے علاوہ نفاست، سلاست اور روانی ان کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ حضرت نیاز نے فکرِ رسا پائی تھی اور اس پر خود انھیں بھی ناز تھا۔ کہتے ہیں: ؎

---

[1] ریاض الفصحا، ص ۳۳۹ [2] ریاض الفصحا، صفحہ ۳۳۹ (مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

رکھتے ہیں نیاز یہ اہلِ دل ترے شعر سننے کا اشتیاق　　غزل ایک دوسری اور کہ تجھے حق نے فکرِ رسا دیا

ایک جگہ اپنی فصیح البیانی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

بھلا ایک غزل اور بھی ایسی کہیو　　تجھے میں فصیح البیان دیکھتا ہوں

سلاست اور روانی حضرت نیاز کے کلام کے خاص جوہر ہیں وہ نہایت بلند خیالات کو انتہائی سادگی، نفاست اور دلکشی کے ساتھ ادا کرتے ہیں، اس سادگی میں ادبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ یہاں آمد ہی آمد ہے، آورد کا نام نہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

رواں آنکھوں سے ہے سیلاب گلگوں　　الٰہی چشم ہے یا چشمۂ خوں

اک تو ہی نہیں میں بھی ہوں ان آنکھوں کا مارا　　اے اہلِ نظر نرگسِ بیمار سے کہہ دو

کروں کیا بیاں میں ہم نشیں اثر اس کے لطفِ نگاہ کا　　کہ تعینات کی قید سے مجھے ایک دم میں چھڑا دیا

فرشِ زمیں ہے خاک نشینوں کا بسترا　　بے خانماں عشق کا تکیہ ہے خشت و سنگ

مجھ سے مریض کو طبیب ہاتھ ترا بنا مت لگا　　اس کو خدا پہ چھوڑ دے پھر خدا جو ہو سو ہو

غمِ جدائی کو ہم جانیں یا خدا جانے　　بلاکشوں پہ جو گزری تری بلا جانے

بعض چھوٹی بحر کی غزلیں اپنی روانی، سادگی اور شگفتگی میں بے نظیر ہیں ؎

ستارے نہیں یہ شبِ تار کے　　شرارے ہیں آہِ شرربار کے

مبارک رہے تجھ کو واعظ بہشت　　میاں ہم تو طالب ہیں دیدار کے

جو دیکھے تجھے بلبل اے رشکِ گل　　نہ پھٹکے کبھی گرد گلزار کے

صفائی ترے سلک دنداں کی دیکھو　　ہوئے غرق دریا گہربار کے

کہاں فصلِ گل ہے کہاں وہ بہار　　چلو گل کے رو دیں گلے خار کے

غزل اور ایسی ہی کہیو نیاز
کہ مشتاق ہیں تیرے اشعار کے

حضرت نیاز کو زبان پر بڑی قدرت تھی، وہ نہایت ہی سنگلاخ زمین میں بہت ہی بے تکلف شعر کہتے تھے اور کمال یہ ہے کہ ان اشعار میں بھی آورد کا شبہ نہیں ہوتا۔ ایک غزل کا مطلع ہے ؎

لشکرِ غم آ پڑا اقلیمِ دل پر ٹوٹ ٹوٹ　　یاں ہوئے الاماں تھی حال چلائے لوٹ لوٹ

اس زمین پر تقریباً ۲۸ شعر کہے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

چشم بد سے دور رہیو کیا ہی آب و تاب ہے　　ہوں گی یہ آنکھیں بنائی موتیوں سے کوٹ کوٹ

دیکھ میرا خونِ اشک اُس نے کہا شب مجھ کو دیکھ
تیری آنکھوں میں گئی میری حنا سب چھوٹ چھٹ

شیفتہ نے گلشنِ بے خار میں ان کے یہ اشعار منتخب کیے ہیں:

وہ جو نقشِ پا کی طرح رہی تھی نمود اپنے وجود کی
سو کشش نے دامنِ ناز کی اُسے بھی زمیں سے مٹا دیا

مجھے چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلفِ یار کا کچھ خیال
یہ جگا کے شورِ ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

صبر و قرار و شکیب طاقت و تاب و توان
اور تو سب چل بسے رہ گئی اک جان تو!

ہجر کی جو مصیبتیں عرض کیں اس کے روبرو
ناز و ادا سے مسکرا کہنے لگا جو ہو سو ہو[1]

وحدتِ وجود | شاہ نیاز احمد صاحبؒ کے دیوان کا اصل موضوع وحدتِ وجود ہے۔ انھوں نے اٹھارھویں صدی میں اس نظریے کی اشاعت میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ ان کا سارا کلام اسی سے لبریز ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وحدت کے ہیں یہ جلوے نقشِ و نگارِ کثرت
گر سِرِّ معرفت کو پاوے شعور تیرا

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از ماہ تا بہ ماہی سب ہے ظہور تیرا

عالم کہے جس کو جہاں یعنی جہانِ جسم و جاں
شانیں ہیں سب اس ذات کی جس کو کہے سنسار ایک

بے امتیازِ بیش و کم دانے میں ہیں یہ سب بہم
بیخ و درخت و شاخ و گل انبوہ برگ و بار ایک

طوطی ہو و بلبل ستاں سرا سو سو طرح سے دے نوا
ہر دم نئی بولے صدا اور ہے وہاں منقار ایک

نیرنگیوں سے یار کی حیران نہ ہو جیو
ہر رنگ میں اسی کو نمودار دیکھنا

جیسے ذات بے رنگ و بے چوں کہیں ہیں
یہ ہر رنگ جلوہ کناں دیکھتا ہوں

صورتِ گل میں کھلکھلا کے ہنسا
شکلِ بلبل میں چہچہا دیکھا

شمع ہو کر کے اور پروانہ
آپ میں آپ کو جلا دیکھا

کر کے دعوا کہیں انا الحق کا
بر سرِ دار وہ کھنچا دیکھا

کائنات ان کے نزدیک ایک بحرِ رواں ہے، مسلسل اور متواتر

اگر کوئی جانے جہاں غیرِ حق ہے
سو میں اس کو دھوکا گماں دیکھتا ہوں

یہ جو کچھ کہ پیدا ہے سب عینِ حق ہے
کہ ایک بحرِ ہستی رواں دیکھتا ہوں

ازل سے لے کے ابد تک وہی جو ہے سو ہے
یہ رنگ بحرِ رواں جس میں ہے نہ توڑ نہ جوڑ

وحدتِ ادیان | شاہ نیاز احمد صاحبؒ وحدتِ ادیان کے قائل تھے۔ ان کی حریتِ فکر و ضمیر کا یہ عالم ہے کہتے ہیں:

بہت سے دام دانہ ہو ملو ہیں شاخہائے یک درخت
ایک جڑ تے ہیں یہ نکلی ہیں ڈالیاں سب پھوٹ پھٹ

---

[1] گلشنِ بے خار، ص: ۲۲ [illegible]

گر بادۂ توحید پئیں اہلِ مشارب | ہفتاد و دو ملت کی ہو تکرار فراموش
جو ربّ الحرم ہے صنم بھی وہی ہے | حرم و دیر میں ایکساں دیکھتا ہوں
اسے برہمن اور اُسے شیخ مانے | یہ آپس کا جھگڑا یہاں دیکھتا ہوں

عشقِ حقیقی شاہ نیاز احمد صاحبؒ صوفی تھے۔ عشقِ الٰہی اُن کے خمیر میں تھا، وہ عشق کے بندے تھے، عشق کی دنیا میں رہتے تھے، عارف روم کی طرح ان کے قلب کی دھڑکنوں میں یہ آواز پوشیدہ تھی ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما | اے طبیب جملہ علت ہائے ما

عشق کے اُن پر اتنے احسان ہیں کہ کہتے ہیں: ؎

کہاں تک کہوں لطف و احسانِ انش | کہ جوں جوں گھٹا میں بڑھایا مجھے
یہاں تک دیا مجھ کو حسنِ عروج | کہ بندے سے مولا بنایا مجھے

عشق کی دنیا میں پہنچ کر وہ عقل و ہوش کو الوداع کہتے ہیں ؎

جو نہیں آمدآمد عشق کا مجھے دل نے مژدہ سنادیا | خود و حواس و شکیب نے وہیں کوس کوچ بجادیا
جب بر در دل حضرتِ عشق آن پکارے | گو شے ہوئی عقل اور رہے اوسان کنارے

جب شاہ فخرالدین صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ؎

جبھی جا کے مکتبِ عشق میں سبق مقام فنا لیا | جو کچھ لکھا پڑھا تھا نیاز نے سو وہ صاف دل سے بھلا دیا

علومِ ظاہری کو خیرباد کہہ کر وہ اس شان سے میدان میں قدم رکھتے ہیں ؎

عشق کے میدان میں آصورتِ انساں بنا | عاشقِ مولا ہوا چاند کا جیسے چکور

جذباتِ عشق ان کے سینے میں متلاطم ہوتے ہیں، بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں ؎

جوش زن ہے عشق کی مے اب خم دل میں نیاز | گھر اہلِ کردہ گرے گہ خم سے نکلے پھوٹ پھوٹ
کیا جوش میں ہے اب مئے وحدت خم دل میں | ابلے ہی پڑی رومی و عطار سے کہہ دو

آتشِ عشق ان کے سینے کو جلا دیتی ہے ؎

کہیں عاشق نیاز کی صورت | سینہ بریاں و دل جلا دیکھا

طوفانِ اشک اُمنڈتا ہے۔ بے اختیار نیاز کے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھتے ہیں ؎

یا الٰہی زورق گرداب سنبھال | بے طرح امڈا ہے یہ طوفانِ اشک

ایک لمحہ رکتا ہے، سوچتا ہے کہ حقیقتہً یہ اس کی یاوری کی ہے ؎

پھک چکے تھے ہم تو اے یار ابھی | گر نہ ہوتا اس گھڑی احسانِ اشک

عشق نے شاہ صاحبؒ کی شاعری میں ایک درد، سوز اور گرمی پیدا کر دی ہے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ محسوس بھی کرتے ہیں۔ اس لیے اس کی آتش انگیزی بھی بے پناہ ہوتی ہے۔ ہر لفظ جو ان کی زبان سے نکلتا ہے گرمی اور تاثیر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔

تبحر علمی اور تصانیف | شاہ نیاز احمد صاحب بڑے جید عالم تھے، ان کی تصانیف ان کی علمیت کی شاہد ہیں، جن میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں۔

شمس العین شریف، رسالہ راز و نیاز، تحفہ نیاز، حضرت بے نیاز، رسالہ تسمیۃ المراتب، المجموعہ قصائد عربیہ، اور حاشیہ شرح چغمنی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے اشعار سے بھی تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے۔ فلسفہ، منطق وغیرہ کی اصطلاحات جگہ جگہ اپنے اشعار میں استعمال کرتے ہیں۔

خلفاء و مریدین | حضرت شاہ نیاز احمد صاحبؒ کے خلفا کی تعداد کثیر تھی۔ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر ان کے سلسلہ کی خانقاہیں قائم تھیں۔ چند خلفاء کے نام یہ ہیں:

۱۔ تاج الاولیا شاہ نظام الدین صاحب
۲۔ مولوی عبداللطیف صاحب سمرقندی
۳۔ مولوی نعمت اللہ خاں بخاری کابل
۴۔ حافظ وزیر خواجہ کابل
۵۔ مولوی محمد حسین مکہ معظمہ
۶۔ میر محمد سمیع صاحب بدخشانی
۷۔ مسکین شاہ صاحب ولائتی
۸۔ ملا عیوض محمد بدخشانی
۹۔ مولوی یار محمد کابلی
۱۰۔ محمد عثمان خاں وزیر خیلی کابل
۱۱۔ ملا جان محمد خاں اخون کابل

سجادہ نشین | حضرت شاہ نیاز احمد صاحبؒ نے ۶ جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ کو بمقام بریلی وصال فرمایا۔ ان کے بعد ان کے خلف اکبر حضرت تاج الاولیا شاہ نظام الدین صاحبؒ سجادہ نشین ہوئے۔ ان کے چھوٹے بھائی شاہ نصیر الدین بدایوں تشریف لے گئے تھے اور وہیں لاولد وصال فرمایا۔ وہ مجرد زندگی بسر کرتے تھے۔ شاہ نظام الدین بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ ہزاروں عقیدتمند ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ان کے مریدوں میں دو بزرگ خاص طور سے قابل ذکر ہیں (۱) مولینا عبدالسلام صاحب نیازی دہلوی اور (۲) مولوی عبدالرحمن صاحب مرحوم چھرایونی۔ مولانا عبدالسلام صاحب جید عالم ہیں۔ فلسفہ، ریاضی اور الٰہیات پر خاص عبور ہے۔ وحدت وجود پر ان کی گفتگو بڑی دلچسپ اور عالمانہ ہوتی ہے۔ مولوی عبدالرحمن صاحب بزرگوں کی دیرینہ روایات کے حامل تھے اور اپنے سلسلہ کے مشائخ سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ شاہ نظام الدینؒ کے وصال کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ محی الدین صاحبؒ سجادہ نشین ہوئے۔

شاہ محی الدینؒ کے کوئی بیٹا نہ تھا، چنانچہ ان کے بعد ان کے نواسے شاہ محمد تقی عرف عزیز میاں سجادہ نشین ہوئے جو تا دم تحریر بقید حیات بتائے جاتے ہیں۔ شاعر بھی ہیں اور راز تخلص کرتے ہیں۔ "راز نیاز" کے نام سے ان کے کلام کا مجموعہ دیکھنے میں آتا ہے جسے بہزاد لکھنوی نے مرتب کیا ہے۔

حضرت شاہ محمد سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ

ولادت ـــــــــ گڑگوجی نزد تونسہ ۱۱۸۴ھ

وفات ـــــــــ تونسہ ـــــ ۱۲۶۷ھ

پنجاب میں حضرت شاہ فخر الدین صاحبؒ کا فیض اور چشتیہ نظامیہ سلسلہ کا نام شاہ نور محمد صاحب مہارویؒ کے ذریعہ پہنچا اور شاہ محمد سلیمان تونسویؒ کے ذریعہ اس کی تکمیل ہوئی۔ شاہ محمد سلیمانؒ بڑے برگزیدہ بزرگ تھے۔ ان کے ارشاد و تلقین سے پنجاب اور افغانستان کے ہزاروں گمراہان بادیہ ضلالت نے ہدایت پائی۔ ان کے خلفا ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے اور رشد و ہدایت کے وہ چراغ روشن کیے کہ ایک بار پھر صوفیہ متقدمین کی خانقاہوں کے نقشے آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ وہ سلسلہ نظامیہ کے آخری عظیم الشان بزرگ تھے۔ ان کا تبحر، تقدس، اسلامی سوسائٹی کی اصلاح کے لیے اور جدوجہد اپنی نظیر آپ تھی۔

شاہ محمد سلیمان صاحبؒ نے جس وقت پنجاب میں مسند ارشاد بچھائی تھی، اس وقت سارا صوبہ سکھوں کے تسلط میں تھا، سلطنت مغلیہ کی تجہیز و تکفین کے آخری منازل طے ہو چکے تھے، انگریزوں کا اقتدار سرعت کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ کا یہ عبوری دور تھا، ایک حکومت ختم ہو رہی تھی، دوسری حکومت کی داغ بیل پڑ رہی تھی مسلمانوں پر مغلوبیت اور افسردگی طاری تھی، قوائے عمل شل ہو رہے تھے۔

اسی زمانہ میں حضرت شاہ سید احمد شہید اپنی عظیم الشان تحریک کو چلانے میں مصروف تھے۔ سکھوں کے مظالم اور جیرہ دستیوں سے تنگ آکر وہ جہاد پر مجبور ہو گئے تھے اور مسلمانوں کی عسکری اصلاح و تنظیم کی کوشش میں منہمک تھے۔ شاہ محمد سلیمانؒ بھی اسی ماحول میں سانس لے رہے تھے۔ انھوں نے گو عملی جہاد میں حصہ نہیں لیا، لیکن شریعت و سنت کی تلقین میں برابر سرگرم رہے۔ وہ سلطنت کے واپس لے لینے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان کی نظر میں اسلامی مُنکَر کے احیاء کی ضرورت سب سے زیادہ مقدم تھی کہ اس کے بغیر حکومت اگر حاصل بھی کر لی جاتی تو کا قائم رکھنا ناممکن تھا۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ ؎

دین جڑ ہے یہ کٹی تو نخلِ دنیا پھل چکا

چنانچہ انھوں نے صاف صاف بتا دیا کہ جب تک اتباع سنت و شریعت کا التزام نہ ہوگا، حکومت کا خواب منت کش تعبیر نہ ہو سکے گا اور مسلمانوں کی پریشانیاں کم نہ ہوں گی۔ بار بار سمجھاتے ہیں

چوں مسلماناں اعمال حسنہ را ترک کردہ اند   حق تعالیٰ بر ایشاں کافراں را مسلط کردہ است[1]

---

[1] تاریخ السالکین ص ۱۰۹

(مسلمانوں نے اچھے اعمال چھوڑ دیے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے کافروں کو ان پر مسلّط کر دیا ہے)

وہ مسلمانوں کے تمام آلام و مصائب، ابتلا و پریشانی، دکھ اور درد کا علاج درستیٔ اعمال میں پاتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنی کوشش کا مرکز بھی اعمال کی درستی کو قرار دیا تھا، وہ مسلمانوں کو صحیح طور پر اخلاق محمدی کا نمونہ دیکھنا چاہتے تھے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں عادات و کردار کی درستی کو وہ سب چیزوں سے مقدم تصوّر کرتے تھے؛ چنانچہ انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اس کوشش اور جد و جہد میں صرف کیا۔ جب حکومت و سلطنت جاتی ہے تو قوموں کے اخلاق و اطوار اور کردار بگڑ جاتے ہیں۔ ان کا اجتماعی شیرازہ منتشر ہونے لگتا ہے اور انتشار و ابتری جسمانی انتشار سے زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ حضرت شاہ محمد سلیمانؒ نے حالات کے گرد و پیش میں جس طرح سرمایۂ ملّت کی حفاظت کی وہ اسلامی ہند کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ انھوں نے حضرت شاہ سیّد احمد بریلویؒ کی تحریک کو ناکامیاب ہوتے ہوئے دیکھا تھا، اس لیے اب انھوں نے اس تحریک سے قطع نظر حوادث کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنا نیا پروگرام بنایا۔ ان کی کوششوں کا محور مختلف تھا۔ انھوں نے کسی موقع پر بھی جنگ و جہاد کی صراحتاً تلقین نہیں کی، کہ وقت کا تقاضا وہ نہ تھا، لیکن انھوں نے مسلمانوں کی قومی زندگی میں ان صلاحیتوں کو اُبھارنے اور بیدار کرنے کی کوشش کی، جن میں مستقبل کے تشکیل و تجدید کا سامان موجود تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو شریعت و سنّت پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت فرمائی کہ اسی میں ان کے درد کا درماں اور مصائب کا علاج تھا۔

شاہ صاحبؒ کی جلائی ہوئی اس شرع و سنّت کی شمع کے گرد دُور دُور سے پروانے جمع ہوئے۔ ان کے خرمنِ کمال سے ہزاروں نے فیض حاصل کیا۔ سنگھڑ اور تونسہ کا غیر آباد اور غیر معروف علاقہ علم و عرفان کا مرکز بن گیا۔ جہاں سے ہزاروں عقیدت مند تربیت پا کر ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے۔ سیال، گولڑہ، جلال پور، حیدرآباد، شیخا دائی، راجپوتانہ میں چشتیہ نظامیہ سلسلہ کی خانقاہیں قائم ہو گئیں اور ایک بار پھر پرانی محفلوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ خاتم سلیمانی کا مصنّف لکھتا ہے[1]:

"اس نقارہ کی آواز پنجاب، ممالک متحدہ، راجپوتانہ سے گزر کر جزیرہ سراندیپ اور عدن تک پہنچی اور افغانستان، بلوچستان، ترکستان سب اس نقارہ کی آواز سے چونک اُٹھے۔ ہزاروں طالبانِ حق سینکڑوں کوس طے کر کے تحصیل فیض کے واسطے سنگھڑ پہنچے۔ یہ نام ہی کچھ غیر موزون تھا مگر ؎

آہن کہ بپارس آشنا شد | فی الفور بصورت طلا شد[2]

پیدائش اور خاندان | حضرت شاہ محمد سلیمانؒ کی ولادت باسعادت ۱۱۸۴ھ میں بمقام گرگوجی[3] ہوئی۔ شاہ صاحب کے والد کا اسم گرامی زکریا بن عبدالوہاب بن عمر خاں تھا۔ یہ خاندان افغان قوم کے جعفریہ قبیلہ سے متعلق تھا[4]۔ آپ چونکہ افغان تھے،

---

[1] نافع السالکین ص ۱۰۹ [2] خاتم سلیمانی ص ۹ [3] بمقام تونسہ سے تیس کوس مغرب میں ہے۔ تونسہ کا شہر ڈیرہ غازی خاں سے تیس کوس کے فاصلہ پر دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔ [4] خاتم سلیمانی ص ۱۵۱۔ جعفریہ قبیلہ، رمدانی (رحیم دانی) قبیلہ کی شاخ تھا۔

اس لیے اس علاقہ میں روہیلہ کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

شاہ صاحب کے والد کا وصال ان کے شیرخوارگی کے زمانہ میں ہوگیا تھا۔ والدہ نے بچے کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔ ان کو اپنے بچے کی اقبال مندی کا یقین ایک خواب سے ہوگیا تھا۔ ولادت سے پہلے انھوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ آفتاب آسمان سے اُتر کر گود میں آگیا ہے اور تمام گھر منور ہوگیا ہے۔ سینکڑوں آدمی مبارک باد دے رہے ہیں[1]۔

شاہ سلیمان صاحبؒ کے ایک بھائی خواجہ یوسف اور چار بہنیں تھیں۔ خواجہ یوسف جوانی میں انتقال کر گئے تھے۔ بہنوں کی شادیاں ہوئیں اور ان سے کثیر اولاد ہوئی[2]۔

تعلیم و تربیت | جب آپ کی عمر چار سال کی ہوئی تو آپ کی والدہ نے مُلا یوسف جعفر کے پاس قرآن پاک پڑھنے کے لیے بھیجا۔ ان سے پندرہ پارے پڑھنے کے بعد وہ اپنے ایک ہم قوم حاجی صاحب سے پڑھنے لگے۔ حاجی صاحب کی بیوی بہت تیز مزاج اور بدخو تھی، وہاں زیادہ عرصہ نہ ٹھہر سکے، اور حاجی صاحب کے ارشاد کے مطابق وہ تونسہ میں میاں حسن علی کے پاس چلے گئے۔ وہاں کی مسجد میں (جو تونسہ کے بازار کے پاس تھی) پڑھنا شروع کیا[3]۔ میاں حسن علی کا اصول تھا کہ مدرسہ کے طلبا کو گدائی یا مزدوری پر مجبور کرتے تھے۔ خواجہ محمد سلیمان صاحب کو گداگری کر کے پیٹ پالنے کا حکم ہوا۔ خواجہ صاحب اس حکم سے بہت گھبرائے، لیکن بجز تعمیل چارہ نہ تھا۔ بھیک مانگنے کے لیے نکلے۔ ایک ہندو بقال کو روٹی پکاتے ہوئے دیکھا اور اس کے چوکے سے بغیر اجازت روٹی اٹھا لائے۔ بقال نے آکر میاں حسن علی سے شکایت کی۔ میاں صاحب نے باز پرس کی اور بالآخر ان کو گداگری کے قابل نہ پاکر مزدوری کا حکم دیا تاکہ کپڑوں، روٹی اور کتابوں کا خرچ چل جائے۔ دوسرے دن دو آنے یومیہ پر ایک جگہ مزدوری پر لگ گئے۔ دن بھر آپ پتھر پر بیٹھے رہے۔ مزدوروں نے مالک سے شکایت کی، لیکن مالک نے آپ کو پوری مزدوری دے دی۔ میاں حسن علی کو یہ حال معلوم ہوا تو کہا کہ اب تم میرے گھر سے کھالیا کرو[4]۔

شاہ صاحب میاں حسن علی کے پاس رہنے لگے اور علم حاصل کرتے رہے۔ ایک دن وہ تونسہ شریف سے دو کوس جنوب کی طرف ایک موضع سوکڑ میں ایک کتاب خریدنے کے لیے گئے۔ وہاں مولوی نور محمد نارووالہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مولوی صاحب نے ان کی بہت تعظیم کی اور باوجود پیرانہ سالی خود پیدل چلے اور شاہ صاحب کو گھوڑے پر سوار کرایا[5]۔ میاں حسن علی سے خواجہ صاحب نے قرآن پاک پورا کیا۔ خود ایک مجلس میں فرمانے لگے:

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در تونسہ شریف پیش میاں حسن علی قرآن مجید می خواندیم"[6]۔

ان کے علاوہ پندنامہ حضرت خواجہ فریدالدین عطار، گلستان سعدی، بوستان سعدی وغیرہ کتابیں بھی ان ہی سے پڑھیں[7]۔

---

[1] خاتم سلیمانی ص ۱۸ [2] خاتم سلیمانی ص ۱۵ [3] یہ مسجد ۱۲۸۲ھ میں رود سنگھڑ سے منہدم ہوگئی تھی۔ خاتم سلیمانی ص ۲۰ [4] خاتم سلیمانی ص ۲۱-۲۲

[5] خاتم سلیمانی نیز ۲۵-۲۶ [6] نافع السالکین ص ۱۴۲ [7] خاتم سلیمانی ص ۱۱

میاں حسن علی سے پڑھ چکنے کے بعد آپ لانگھ پہنچے[1]۔ یہاں ایک عمدہ گنبد دار مسجد تھی[2] جس میں مولوی ولی محمد درس دیتے تھے۔ خواجہ صاحب نے ان ہی سے فارسی درسیات کی تحصیل کی۔ کچھ عرصہ بعد آپ کوٹ مٹھن تشریف لے گئے اور وہاں قاضی محمد عاقل ؒ کے مدرسہ میں عربی کی تحصیل شروع کی۔ خواجہ اللہ بخش ؒ کے شجرہ میں جو ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا ہے۔ خواجہ محمد سلیمان کے متعلق لکھا ہے:

"در مبادی حال در کوٹ مٹھن بہ مدرسہ قاضی محمد عاقل صاحب بہ تحصیل علم کتب درسیہ توجہ می فرمودند"[3]

یہاں آپ نے منطق کی مشہور کتاب "قطبی" پڑھی اور فقہ پر پورا عبور حاصل کیا[4]۔ کوٹ مٹھن ہی میں قیام کے زمانہ میں آپ کو خواجہ نور محمد صاحب مہاروی ؒ کے اوچ تشریف لانے کی خبر ملی۔ اس زمانہ میں آپ کو امر معروف کی تلقین کا بڑا خیال تھا[5]۔ شاہ نور محمد صاحب سے سماع پر بحث کرنے اور اس پر تنبیہ کرنے کے لیے روانہ ہوئے، لیکن ان کی خدمت میں پہنچ کر دنیا ہی بدل گئی، اس قدر مبہوت ہو گئے کہ فوراً ان کے دست حق پرست پر بیعت کر لی۔ اپنے پیر سے انھوں نے آداب الطالبین، فقرات، لوائح، عشرہ کاملہ، فصوص الحکم وغیرہ کا درس لیا[6]۔

بیعت | مشہور ہے کہ حضرت شاہ فخر صاحب ؒ نے حضرت خواجہ نور محمد مہاروی ؒ کو ایک شہباز کے مقید کرنے کی بشارت دی تھی، اور فرمایا تھا کہ اس سے سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی تبلیغ و اشاعت میں چار چاند لگ جائیں گے، چنانچہ شاہ نور محمد صاحب ہر سال اوچ اور کوٹ مٹھن اس باز کی تلاش میں آتے تھے[7]۔ آخری بار جب اوچ آئے تو اپنے ایک عزیز محمد حسین سے فرمانے لگے: "اے محمد حسین آپ کو معلوم ہے کہ میں ہر سال اس ملک میں کیوں آتا ہوں؟" عرض کیا "آپ خود ارشاد فرمائیں" اس پر خواجہ نور محمد نے فرمایا کہ میں ایک شہباز کے شکار کرنے کے لیے آتا ہوں اور یہ شاہ فخر صاحب کا حکم ہے[8]۔

جب شاہ محمد سلیمان صاحب شاہ نور محمد ؒ کی خدمت میں پہنچے تو ان کا عالم ہی بدل گیا۔ فوراً مرید ہونے کی درخواست کی۔ شاہ نور محمد صاحب نے ان کو حضرت سید جلال ؒ کے مزار کے سرہانے لے جا کر مرید کر لیا[9]۔ یہ شاہ محمد سلیمان کی نوعمری کا زمانہ تھا، لیکن وہ اپنے پیر سے عقیدت اور ان کے احکام کی بجا آوری میں کہنہ سال مریدوں سے بازی لے گئے۔

دہلی کا سفر | شاہ نور محمد صاحب ؒ نے اس طالب علم کو مرید کرنے کے بعد شاہ فخر صاحب ؒ کی خدمت بابرکت میں حاضر

---

[1] یہ مقام تونسہ سے پانچ کوس مشرق کی جانب دریائے سندھ کے کنارے واقع تھا۔ [2] یہ مسجد ۱۲۷۵ھ تک تھی اس کے بعد دریا کی طغیانی سے برباد ہو گئی۔ خاتم سلیمانی ص ۲۱

[3] شجرہ خواجہ اللہ بخش ص ۹ [4] خاتم سلیمانی ص ۲۹

[5] خود ایک مجلس میں فرمانے لگے۔ جب میں کوٹ مٹھن میں تحصیل علم کرتا تھا تو اس وقت مجھے قدرتی طور پر دینیات کی طرف زیادہ خیال تھا اور امر معروف کا گروہ فقراء کے مواضعات میں چلا جایا کرتا تھا۔ مناقب سلیمانیہ بحوالہ خاتم سلیمانی ص ۱۲

[6] خاتم سلیمانی ص ۲۲ [7] تحقیق ہے کہ اس کے بعد شاہ نور محمد صاحب پھر کبھی کوٹ مٹھن نہیں گئے: خاتم سلیمانی ص ۳۴

[8] خاتم سلیمانی ص ۲۳ [9] خاتم سلیمانی ص ۲۱ - ۲۳ - ۲۴

کا حکم دیا، جس شہباز کو دام میں لانے کی بشارت انھوں نے دی تھی، وہ مقید ہو چکا تھا۔ شاہ محمد سلیمان نے تعمیل حکم میں دہلی کا ارادہ کر دیا۔ ولادر، جودھ پور، اجمیر، جے پور، ریواڑی ہوتے ہوئے ۱۱۹۹ھ میں وہ دہلی پہنچے[1]۔ یہ گرمی کا زمانہ تھا۔ آفتاب کی وہ تمازت کہ پرندوں نے درختوں میں پناہ لے لی۔ ریگستان کا یہ عالم کہ میلوں تک پانی ندارد، نہ کوئی سواری، نہ کوئی دوست، لیکن یہ محبوب سبحانی سلیمان ثانی کمال ذوق و شوق سے قبلۂ عالم کا حکم بجا لا رہا تھا۔ اور سفر کی صعوبتوں اور راستے کی تکلیفوں کی کچھ پروا نہیں کرتا تھا[2]۔ عشق و محبت کا یہ متوالا، سفر کی صعوبتیں ذوق و شوق کے ساتھ طے کرتا ہوا دہلی پہنچا تو معلوم ہوا کہ شاہ فخر صاحبؒ وصال فرما چکے ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

والدہ کی تشویش | جب عرصہ تک شاہ محمد سلیمان کی کچھ خبر نہ ملی تو والدہ کو فکر لاحق ہوئی۔ بیٹے کی تلاش میں گڑگوجی سے سوکڑ تشریف لائیں۔ جب یہاں بھی بیٹے کا پتہ نہ ملا تو اپنے داماد کو تلاش کرنے کے لیے آگے بھیجا۔ وہ تلاش کرتے کرتے آخر شاہ صاحب سے جا ملے اور والدہ کے اضطراب اور بے چینی کی داستان سنائی۔ شاہ محمد سلیمان صاحبؒ پیر سے اجازت لے کر والدہ کے پاس گئے۔ پیر سے دوری ہٹ کر عشق کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ مفارقت کی تاب نہ لا سکے۔ ماں کا یہ عالم تھا کہ بیٹے کی جدائی کے خیال سے بھی ان کو تکلیف ہوتی تھی۔ محبت مادری اور عشق مرشد میں کشمکش شروع ہوئی۔ والدہ نے ان کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ پہرے دار بٹھائے، کانٹوں کا حصار کیا، لیکن وہ عشق جو بے خطر آتش نمرود میں کود پڑنے کے لیے تیار ہو، اس کی نظر میں یہ تدابیر سب بے معنی تھیں۔ جب عشق نے زور مارا تو یہ سب بندشیں چشم زدن میں ٹوٹ گئیں اور وہ دیوانہ وار پیر کی طرف دوڑ پڑے۔ آپ کا یہ دستور ہو گیا تھا کہ ایک مہینہ مہار شریف قیام کرتے تھے پھر کچھ دنوں کے لیے گھر آ جاتے تھے۔

مرشد سے عشق | حضرت شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کو اپنے پیر و مرشد خواجہ مہارویؒ سے عشق تھا۔ ان سے جب جدا ہوتے، پریشان اور بے چین رہتے۔ فرقت میں ذوق و شوق کا یہ عالم ہو جاتا تھا کہ اکثر پیدل ہی مہار شریف کو روانہ ہو جاتے تھے، اور راستے کی تمام صعوبتیں نہایت خوشی سے برداشت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میاں غلام حیدر میاں عیسیٰ جعفر کو ساتھ لے کر مہار شریف کو روانہ ہو گئے۔ راستہ میں پیروں سے خون جاری ہو گیا اور پاؤں کے دسوں ناخن انگلیوں سے جدا ہو گئے"[3] لیکن اسی استقلال اور ہمت کے ساتھ ۹۰ کوس کا سفر طے کیا۔ سفر میں دو دو تین تین دن کے فاقے بھی ہوئے، لیکن عقیدت و ارادت کا یہ متوالا والہانہ انداز میں یہ سب مصیبتیں جھیلتا ہوا اپنے مرشد کے قدموں میں پہنچ گیا۔

خلافت | پندرہ سولہ برس کی عمر میں خواجہ محمد سلیمانؒ خواجہ مہارویؒ سے بیعت ہوئے تھے۔ شیخ کی صحبت کا فیض کل چھ سال تک اٹھایا۔ ۲۱ - ۲۲ سال کی عمر میں پیر و مرشد نے خلافت عطا فرمائی اور تونسہ میں قیام کی ہدایت کی۔ ۶۰ سال تک بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ وہ تونسہ شریف میں تبلیغ و اشاعت اور اصلاح و تربیت میں مصروف رہے۔

---

[1] خاتم سلیمانی ص ۲۱ - ۲۲ - ۲۳ - ۲۴ [2] مشاہیر اسلام جلد اول ص ۹۹ [3] نافع السالکین ص ۱۲

تونسہ میں قیام خانقاہ تونسہ ڈیرہ غازی خاں سے ۳۰ کوس کے فاصلہ پر ایک غیر معروف گاؤں تھا۔ پیرو مرشد نے حکم دیا کہ اپنا وطن چھوڑ کر وہاں آباد ہو جاؤ۔ شاہ محمد سلیمان نے فوراً گڑگوجی کو الوداع کہا اور تونسہ پہنچ گئے۔ وہاں بقول پیر حیدر علی شاہ صاحب جلال پوری آپ سرکنڈوں کی ایک جھونپڑی بنا کر عبادت میں مشغول ہو گئے[1] جب اس علاقہ کا رئیس الف خاں حلقہ مریدین میں شامل ہوا تو اس نے شاہ صاحبؒ کی اجازت سے ایک مکان بنوا دیا۔ جب آپ کی شہرت بڑھی اور لوگ دُور دُور سے بغرض بیعت تعلیم کیلیے بخلوت اقدس میں پیش کیے۔ حضرت نے وہ روپیہ حسب دستور لنگر کے درویشوں میں تقسیم کر دیا، جو بچا وہ مسکینوں اور درویشوں کو بانٹ دیا۔ نواب بہاول پور نے پھر روپے بھیجے وہ بھی ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیے گئے۔ آخرالامر نواب صاحب نے حضرت خواجہ اللہ بخشؒ کو روپے بھیجے اور ان سے درخواست کی کہ وہ مسجد تعمیر کرا دیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ تونسہ با رونق اور پُر فضا مقام بن گیا اور دُور دُور سے لوگ وہاں آنے لگے۔

درس و تدریس خواجہ صاحب نے تونسہ کو دارالعلوم بنا دیا تھا۔ ان کے دولت کدہ کے چاروں طرف متعدد مدرسے تھے۔ پچاس اُستاد وہاں رہتے تھے۔ تعلیم و تربیت کا کام نہایت وسیع پیمانہ پر جاری تھا۔ علوم دینیہ کی ترقی و ترویج میں بے حد کوشش کی جا رہی تھی۔ مدرسوں کا اجرا شاہ صاحب کے مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ تھا۔ صرف اسی طرح سے اسلامی شعائر کی ترویج ممکن تھی۔ تونسہ جیسی بستی میں پچاس مدرسین کی موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ تونسہ اس علاقہ کا تعلیمی مرکز بن گیا تھا اور دُور دُور سے شائقین علم وہاں جمع ہونے لگے تھے۔

شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کو خود درس دینے کا بڑا شوق تھا۔ وہ اپنے خاص شاگردوں اور مریدوں کو سلوک و احسان کی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ ان کے ملفوظات میں بعض جگہ ان کتابوں کا ذکر آگیا ہے، جن کو وہ اکثر پڑھا کرتے تھے۔

شاہ صاحبؒ کا علمی تبحر شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کا مطالعہ نہایت وسیع اور نظر بہت گہری تھی۔ قرآن، حدیث اور فقہ پر ان کو پورا عبور تھا۔ ملفوظات میں جگہ جگہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی نقل کرتے ہیں۔ تصوف کی اعلیٰ کتابوں کا مطالعہ نہایت بالغ نظری سے کیا تھا، عوارف المعارف اور فتوحات مکیہ نوک زبان پر تھیں اور شیخ سہروردیؒ اور امام اکبرؒ کے بنیادی خیالات پر کافی غور و فکر کیا تھا۔

حدیث و فقہ پر عبور کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی مسئلہ آپ سے دریافت کیا جاتا تو برجستہ اسناد نقل کر دیتے۔ ایک مرتبہ قبلہ عالم کے عرس میں تشریف فرما تھے، ایک عالم نے کچھ مسائل دریافت کیے۔ آپ نے برجستہ ان کا شافی و کافی جواب عنایت فرمایا۔ اس مجلس میں مولوی خدا بخش صاحبؒ (خلیفہ حافظ جمال ملتانیؒ) بھی موجود تھے۔ انھوں نے اپنے برادر زادہ اور شاگرد مولوی عبدالغفار سے فوراً کہا کہ ان ارشادات کو ایک رسالہ کی شکل میں لکھ لو۔ چنانچہ وہ سوالات اور جوابات جمع کر لیے گئے۔ نافع السالکین میں اس رسالہ کا کچھ حصہ نقل کیا گیا ہے[2]۔ اس سے شاہ صاحب کی دقت نظر، وسعت معلومات اور تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے

---

[1] ملفوظات حضرت پیر سید شاہ جلال پوری، ذکر حبیب، ص ۲۸۲-۲۸۳

[2] نافع السالکین ص ۱۳۲ - ۱۳۹

عسرت کی زندگی | شاہ محمد سلیمان صاحبؒ نے اپنا ابتدائی زمانہ بڑی عسرت اور تنگی میں بسر کیا تھا۔ جب تونسہ میں وہ ایک طالب علم کی حیثیت سے آئے تھے تو ان کے خورد و نوش کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ ایک شخص رحم کھا کر ان کو کھانا دینے لگا۔ اس میں بھی یہ مصیبت تھی کہ اس کے دروازہ پر ایک کتا رہتا تھا۔ خواجہ صاحب کھانا لینے جاتے تو اس انتظار میں کھڑے رہتے کہ کتا ہٹے تو اندر جائیں۔ اگر کتا وہیں رہتا تو دن بھر بھوکے رہتے۔ جب خواجہ نور محمد مہارویؒ کے خلیفہ کی حیثیت سے وہ تونسہ شریف پہنچے تو عسرت کا یہ عالم تھا کہ سرکنڈوں کی جھونپڑی میں اپنا سر چھپاتے تھے اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ گڑ گوجی میں ان کی کچھ زمین تھی، لیکن خواجہ نور محمد صاحب کے ارشاد کے بموجب اسے ویسے ہی چھوڑ آئے تھے[1]۔ کچھ عرصہ بعد فتوح کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دنیا کی ہر نعمت ان کے قدموں میں آ گئی، لیکن استغنا کا وہی عالم رہا اور انھوں نے کبھی فارغ البالی کی زندگی بسر نہیں کی۔ جو کچھ ان کی خانقاہ میں پہنچتا تھا فوراً تقسیم کر دیتے تھے۔ اپنے لیے کچھ نہ رکھتے تھے۔

شاہ صاحبؒ کی مقبولیت | شاہ صاحبؒ کی خانقاہ میں جگہ جگہ سے لوگ آتے تھے۔ قریبی ریاستوں کے نواب اور جاگیردار ان کے آستانہ پر اپنی حاضری کو باعثِ فخر و مباہات سمجھتے تھے۔ افغانستان سے شاہ شجاع ان کی خانقاہ میں عقیدت و ارادت کے ساتھ حاضر ہوا تھا۔ جاگیرداروں اور والیانِ ریاست کا تو یہ معمول تھا کہ گدی پر بیٹھتے وقت ان ہی کے دستِ مبارک سے پگڑی بندھواتے تھے اور ان کی دعاؤں کو اپنے لیے سعادتِ دارین تصور کرتے تھے۔ سرسید نے (جو ان کے ہم عصر تھے) لکھا ہے کہ ان کی شہرت قاف سے قاف تک ہے۔ دہلی سے جو اپنے انحطاط کے زمانہ میں بھی علم و فضل کا مرکز تھا۔ علماء اور صوفیا فیض حاصل کرنے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

تعلیمِ اخلاق | جب کسی قوم کا سیاسی زوال شروع ہوتا ہے تو اس کے افکار و اعمال، عادات و اطوار بھی انحطاط پذیر ہونے لگتے ہیں۔ یہ قومی زوال کی آخری منزل ہوتی ہے۔ اخلاقی زوال کے اثرات سیاسی زوال سے کہیں زیادہ مہلک ہوتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ عرصہ کے لیے تجدید و احیا کی سب راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ شاہ محمد سلیمان نے جس وقت ارشاد و تلقین کا ہنگامہ برپا کیا تھا اس وقت مسلمانوں پر سیاسی ادبار کی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ اس زوال کو سب دیکھ رہے تھے، لیکن بہت کم لوگ ایسے تھے جن کی حقیقت بین نگاہ میں سیاسی زوال کے پیچھے ایک خطرناک اخلاقی زوال کے اثرات کو بھی دیکھتی ہوں۔ ایسے لوگوں نے سلطنت کا ماتم کرنے میں اپنا وقت صرف نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے اپنے علاقوں میں اسلامی اخلاق و شعائر کی نگہبانی کی۔ شاہ محمد سلیمان صاحبؒ بھی ان ہی کے چند بزرگوں میں سے تھے، جن کی کوششوں کا محور اخلاق و عادات کی درستی تھا۔

وہ اپنی نصیحت کو پُر زور اور زود اثر بنانے کے لیے آیاتِ قرآنی، احادیث اور اشعار برمحل استعمال کرتے تھے۔ جو اخلاقی درس دیتے ہیں تو ان کے لہجے میں اصولی سختی اور تبلیغی نرمی کا نہایت ہی حیرت انگیز امتزاج ہوتا ہے۔ نصیحت کرنے کا جو موقع ملتا ہے، اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جس قسم کے لوگ آتے، جس قسم کا مسئلہ زیرِ بحث ہوتا، وہ اخلاقی درس کو نہ بھولتے۔

---

[1] نافع السالکین ص ۲۹ [2] نافع السالکین ص ۱۵۸

وہ چاہتے تھے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اخلاقی اصول کار فرما ہوں۔ کسی قسم کی گفتگو ہوتی وہ اس کا اخلاقی پہلو ضرور نمایاں کر دیتے تھے۔

صوفیہ کی اصلاح | اس زمانہ کے صوفیہ مختلف قسم کی بداعتقادیوں کا شکار تھے۔ روحانی ترقی اس لیے چاہتے تھے کہ دنیاوی دشواریاں حل ہو سکیں اور

مقصودِ من خستہ زکونین تو ئی   از بہر تو میرم ز برائے تو زیم!

کی صدا اب کسی حجرہ سے سنائی نہ دیتی تھی۔ اعمال و وظائف میں حد سے زیادہ اعتقاد تھا۔ اور سارا وقت اسی میں صرف ہوتا تھا۔ شاہ صاحبؒ نے اس گمراہی کو محسوس کر لیا اور فرمایا "سالک کو چاہیے کہ عملیات میں وقت کو ضائع نہ کرے، ایسے مشغلے راہ فقر کے ڈاکو اور رکاوٹیں ہیں، اصلی مقصود خدا کا یاد کرنا ہے"[1]

ان وظائف کی جگہ جن کا مقصد کسی دنیاوی مشکل کا حل کرنا ہوتا تھا، شاہ صاحبؒ نے ذکر جہر پر زور دیا اور فرمایا "ذکر جہر بکلمہ لا الٰہ الا اللہ سب اوراد و وظائف سے بہتر ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ سب سے افضل ذکر لا الٰہ الا اللہ ہے"[2]

وہ صوفیہ کو دنیاداری سے دین داری کی طرف بلاتے تھے اور ان کو بتاتے تھے کہ کل تم کیا تھے، آج کیا ہو گئے، تمھاری کوششوں اور عبادتوں کے مرکز کیوں تبدیل ہو گئے۔ تم نے دین کے بجائے دنیا سے کیوں دل لگا لیا۔ تم نے اپنے اعتقادات میں کیوں فساد پیدا کر لیے، صحیح مذہبی جذبہ پیدا کرو کہ وہی سعادتِ دارین کا باعث ہو گا۔

علماء کو تنبیہہ | حضرت شاہ محمد سلیمان صاحب قدس سرہ العزیز نے اسلامی سوسائٹی کے جس طبقہ کو بھی غلط راستے پر پایا۔ اس کی طرف فوراً توجہ کی۔ علماء کی بے راہ روی دیکھی تو وہ کانپ اٹھے، اور فرمایا

" فساد العالِم فساد العالَم "

وہ علماء کی گمراہی کو ساری قوم کی گمراہی کے مترادف سمجھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ علماء کی گمراہی خود ان ہی تک محدود نہیں رہتی۔ عوام بھی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایک عامی کی گمراہی خود اسی تک رہتی ہے۔ لیکن عالم کی بے راہ روی سے عوام بھی متاثر ہو جاتے ہیں" وہ نہ تو جنت میں تنہا جاتے ہیں نہ دوزخ میں دونوں جگہ کثیر جماعت ان کے ساتھ ہوتی ہے"

شاہ صاحب نے اپنے زمانہ کے نصابِ تعلیم کے خلاف بھی آواز بلند کی، فرمایا کہ علماء کو فقہ اور تفسیر پر زور دینا چاہیے ان ہی کے مطالعہ سے مذہبی زندگی سنورتی ہے

اتباعِ شریعت کی تلقین | شاہ محمد سلیمان صاحبؒ شریعت کے معاملہ میں نہایت سخت گیر تھے۔ فرمایا کرتے تھے:

" ہر کہ خواہد مقبول و محبوب حق سبحانہ تعالیٰ گردد باید کہ در متابعت شریعت ظاہراً و باطناً کوشش   جو شخص چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کا محبوب ہو جائے اسے چاہیے کہ ظاہر اور باطن میں شریعت کی متابعت

---

[1] نافع السالکین ص ۲۵   [2] نافع السالکین ص ۱۴۱

نمایہ چنانچہ نص دریں باب وارد است اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ | کرے۔ چنانچہ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔

بار بار ارشاد ہوتا ہے:

"از امر غیر مشروع دور باشید" [۱] غیر شرعی چیزوں سے دور رہو۔

ان کو سوائے قرآن وحدیث کے کوئی گفتگو پسند نہ تھی۔ فرمایا کرتے تھے:

"بغیر ذکر خدا و رسول ہمہ سر دردی است" [۲]

شاہ صاحب کا خیال تھا کہ انسانیت کا کمال بغیر متابعت شریعت دشوار ہے۔

"حصول کمال انسانی بغیر متابعت شریعت ظاہری و باطنی از محالات است" [۳]

فرمایا کرتے تھے کہ صفائی قلب جو روحانی ترقی کے لیے از بس ضروری ہے، بغیر اتباع شریعت کے حاصل نہیں ہوتی [۴]
اگر کوئی ولی بھی خلاف شرع عمل کرتا ہے تو اس کی ولایت اور روحانیت کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔

"یک فعل غیر مشروع بندہ را از مرتبۂ ولایت بیفگند" [۵] | ایک غیر شرعی فعل بندے کو مرتبۂ ولایت سے نیچے پھینک دیتا ہے۔

شاہ صاحبؒ تصوف و سلوک کی مستند کتابوں کے حوالے دے کر یہ ثابت کیا کرتے تھے کہ صراط مستقیم سے مقصود شریعت ہے۔ حضرت ابن عربیؒ نے فتوحات مکیہ میں اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے عوارف المعارف میں یہی بتایا ہے کہ شریعت کی مدد کے بغیر روحانیت کی دشوار گزار راہیں طے نہیں کی جاسکتیں [۶]

شاہ صاحبؒ جب لوگوں کو شریعت سے بے اعتنائی برتتے ہوئے پاتے تھے تو ان کو سخت صدمہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ اگر اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بالفرض اس وقت موجود ہوتے تو اس زمانہ کے لوگوں کو کافر کہتے۔ اس لیے کہ انھوں نے شریعت کا اتباع چھوڑ دیا ہے اور مخلوق ان کو دیوانہ کہتی اس لیے کہ ان کے افعال و اخلاق شریعت کے مطابق ہوتے [۷]

متابعت رسولؐ کی ہدایت! شاہ صاحبؒ متابعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بے حد زور دیتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے تمام مصائب اور مشکلات کا سبب اتباع رسولؐ نہ کرنے میں پاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت بھی اس لیے نکلی ہے کہ انھوں نے متابعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"دریں زماں چوں مسلماناں متابعت نبی صاحب صلی اللہ علیہ وسلم گذاشتہ اند حق سبحانہ و تعالی کفار را

---

[۱] تاج السالکین ص ۵۴ [۲] ایضاً ص ۱۵۵ [۳] ایضاً ص ۱۰۹ [۴] ایضاً ص ۴۹ نیز ص ۱۲۸ [۵] ایضاً ص ۱۲۸
[۶] ایضاً ص ۱۲۸ [۷] ایضاً ص ۱۲۸ [۸] ایضاً ص ۱۹

برایشاں مسلط کردہ است [۱]

وہ اکثر ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ جب سکھوں نے ملتان کا محاصرہ کیا تو ایک بزرگ حضور رسول مقبول صلعم کی خدمت میں امداد کے طالب ہوئے۔ خواب میں رسولِ خدا نے ارشاد فرمایا۔

"امتِ من متابعت من گذاشتہ اند" [۲]

فرمایا کرتے تھے کہ دین اور دنیا دونوں میں کامیابی کا انحصار رسول اللہ کے اتباع پر ہے۔ بے متابعت حصولِ مقصد ناممکن ہے [۳] حکومت بھی اسی وقت مل سکتی ہے، جب زندگی کے ہر شعبہ میں اس "اکمل ترین انسان" کا اتباع ہو اور روح کی کمالیت بھی اس وقت ممکن ہے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر گامزن ہو [۴] سلوک و معرفت راہیں بغیر اتباع رسول کے طے نہیں کی جا سکتیں۔

دریں راہ بجز مرد راعی نرفت | گم آں شد کہ دنبال داعی نرفت
محال است سعدی کہ راہ صفا | تواں رفت جز در پئے مصطفٰے

مذہبی و روحانی تعلیم

شاہ صاحبؒ اپنے مریدوں میں صحیح مذہبی جذبات پیدا کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو صحیح راستہ پر لگانے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ ان کی نظر میں پیر کا کام مشاطہ کی طرح اپنے مرید کے روحانی خط و خال سنوارنا تھا، جس وقت حضرت خواجہ مہارویؒ نے اُن کو خلیفہ بنانا چاہا تھا تو انھوں نے یہ عذر کیا تھا "قبلہ! زمانہ کی حالت دگرگوں ہے لوگ بہت گمراہ ہو گئے ہیں، یہ کام مجھ سے نہ ہو سکے گا، مجھ میں استطاعت نہیں کہ اس کام کی ذمہ داری قبول کروں" [۵] لیکن جب پیر و مرشد نے اصرار کیا تو انھوں نے یہ ذمہ داری قبول فرمائی اور ساٹھ سال اسی ذمہ داری کو اس طرح پورا کیا کہ ان کی دُور رس نگاہ زندگی کے ہر شعبہ تک پہنچی اور ان کے اصلاحی ہاتھ کا اثر دُور دُور محسوس کیا گیا۔ ان کے آخری زمانہ کا ایک دلچسپ واقعہ ملفوظات [۶] میں درج ہے۔ ایک عورت نے سوال کیا "غریب نواز! لاکھوں کھا آدمی، کیا مرد کیا عورتیں آپ کے دست پر بیعت ہوتے ہیں اور یہ حال ہے کہ آپ کسی کو زیادہ دیر بیٹھنے نہیں دیتے، اور کیا دن ہو کیا رات، بیعت کرتے رہتے ہیں اور ہر ایک کا بھروسہ ہے کہ قیامت کے دن آپ کام آئیں گے اور امداد کریں گے، مگر حیرت ہے کہ کروڑوں مخلوق میں سے آپ اپنے مرید کس طرح پہچان سکیں گے"۔ جواب میں ارشاد فرمایا "رات کا وقت ہوتا ہے اور چھ سات چرواہے اپنی اپنی بھیڑیں ملا دیتے ہیں اور پھر جب چاہتے ہیں ہر ایک اپنے ریوڑ کو جدا کر لیتا ہے۔ حالانکہ سب بھیڑیں ہم رنگ ہوتی ہیں اور حالانکہ سب چرواہوں کو احمق اور بے وقوف کہا کرتے ہیں تو کیا میں اپنے مریدوں کو شناخت نہ کر سکوں گا" [۷]

---

۱ نافع السالکین ص ۵ ۲ ایضاً ص ۴۰ - ۱۰۶ - ۱۵۸ ۳ کمال روح موقوف است بر متابعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔
۴ نافع السالکین ص ۱۲۸ ۵ ایضاً ص ۱۵ ۶ خاتم سلیمانی ص ۸۹ ۷ ایضاً ص ۷۷

شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کی مذہبی و روحانی تعلیم کے بعض اہم پہلو یہ ہیں:

عبادت شاہ صاحبؒ اپنے مریدوں اور معتقدوں کو سمجھایا کرتے تھے کہ انسان کی زندگی کا مقصد خدا کی عبادت ہے۔ قرآن پاک کی یہ آیت اکثر پڑھتے تھے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ[1]
کبھی یہ شعر پڑھتے تھے:

زندگی آمد برائے بندگی   زندگی بے بندگی شرمندگی

شاہ صاحبؒ کی حیثیت ایک روحانی طبیب کی سی تھی۔ وہ ہر شخص کو اس کی طاقت، استعداد اور صلاحیت کے مطابق عبادت کا حکم دیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ریاضت بقدر استطاعت کرنی چاہیے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شروع میں انتہا سے زیادہ ریاضت کر لی جاتی ہے، بعد کو ناتوانی اور ضعف کے باعث فرائض کی ادائیگی میں بھی کوتاہی ہونے لگتی ہے[3]۔

اللہ پر صحیح اعتقاد و اعتماد شاہ صاحبؒ اپنے مریدوں کو اللہ پر صحیح اعتماد اور کامل بھروسہ کا درس دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کی تعلیمات اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

۱۔ التجا و تکیہ بہ حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ باید کرد نہ بغیر او[4]۔

۲۔ سالک را باید کہ سوائے جناب حق عز و جل تکیہ گاہ خود نہ بیند[5]۔

غیر اللہ پر تکیہ کرنا حادثہ ہے[6]۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے خدا پر بھروسہ کیا اور آگ گلزار بن گئی[7]۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے غیر اللہ پر بھروسہ کیا اور زنداں میں رہے[8]۔

حُبِّ دنیا سے پرہیز: شاہ محمد سلیمان صاحبؒ نے اپنے ملفوظات میں جگہ جگہ دنیا کی محبت[9]۔ اور دنیا داروں کی صحبت[10] سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ اس سے ان کا مقصد گوشہ نشینی یا رہبانیت نہ تھی۔ خود اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

• سالک را چند چیز در دنیا چارہ نیست واں را	سالک کو دنیا کی چند چیزوں کے بغیر چارہ نہیں
صوفیہ کرام از دنیا نے شمارند بلکہ از امور دینیہ	اور ان کو صوفیہ کرام دنیا میں شمار نہیں کرتے بلکہ
انگارند۔ چنانچہ قوتِ ضروری برائے عبادت	ان کو امورِ دینیہ میں گنتے ہیں۔ چنانچہ غذا جو عبادت
و جامۂ ضروری بنا بر ستر عورت، و آب ضروری	کے لیے ضروری ہو اور کپڑا جو ستر کے چھپانے کے لیے

---

[1] تاریخ السالکین ص ۱۴ [2] ایضاً ص ۱۴ [3] ایضاً ص ۱۰۵ [4] ایضاً ص ۲، [5] ایضاً ص ۵۹
[6] ایضاً ص ۵۷ [7] ایضاً ص ۱۹ [8] ایضاً ص ۱۲۹ [9] ایضاً ص ۱۱
[10] ایضاً ص ۲۸

بر جہت بقائے حیات و مسکن ضروری برائے عبادت و علم ضروری برائے عمل[1]
درکار ہو اور پانی جو بقائے حیات کے لیے ہو اور مسکن ضروری برائے عبادت اور علم برائے عمل وہ چیزیں ہیں جو دنیا میں شمار نہیں۔

حکومت کے متعلق شاہ صاحبؒ کا نظریہ
شاہ محمد سلیمان صاحبؒ نے جب مسلمانوں کے سیاسی زوال کے اسباب کا تجزیہ کیا تو ان کو مسلمانوں کے سب آلام و مصائب کا صرف ایک سبب نظر آیا اور وہ مذہب سے بیگانگی۔ ایک مرتبہ لوگوں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ظالموں کے ظلم سے تنگ آگئے ہیں۔ جواب میں فرمانے لگے:

"اگر کسے بدی کند بر خود کردہ باشد"[2]

شاہ عبدالعزیز[3] صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ظالم حکمران کا مسلّط ہونا لوگوں کی بد اعمالی کی دلیل ہے۔ "اعمالکم عمالکم" پر ان کا اعتقاد تھا[4] اور اپنی مجلسوں میں اسی پر اصرار کیا کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ جب خدائے تعالیٰ کسی ملک کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اس کو ظالم حاکموں کے قبضہ میں دے دیتا ہے۔ یہ شعر ان کے وردِ زبان رہتے تھے ؎

چو خواہد کہ ویراں کند عالمے — نہد مُلک در پنجۂ ظالمے
بقومے کہ نیکی پسند د خدائے — دہد خسروِ عادل و نیک رائے[5]

جب لاہور پر سکھوں کا قبضہ ہوا تو شاہ صاحب نے کہا:

انّ اللّٰہ یتجلّی علی استعداد متجلّی لہٗ

"یعنی کارِ مسلماناں در ناشائستگی از حد گزشتہ کہ ایشاں در مُلک غلبہ کردہ اند"[6]

پھر یہ شعر پڑھا ؎

چشمِ عبرت برکشا و قدرتِ حق را ببیں — شامتِ اعمالِ ما ایں صورتِ نادر گرفت

وہ حاکم کو بُرا کہنے اور غیر ضروری طور پر بدامنی اور ہنگامہ آرائی کے بجائے درستیٔ اعمال کا مشورہ دیتے تھے کہ اسی میں فتح و کامرانی کا راز تھا۔ فرماتے ہیں:

"سالک را باید کہ در حق حاکم وقت دُعائے بد نہ کند، خواہ مسلمان باشد، خواہ مشرک، خواہ ظالم باشد خواہ عادل، بلکہ برائے او دُعا کند تا در حکم آں
سالک کو چاہیے کہ حاکم وقت کے حق میں بد دعا نہ کرے۔ خواہ وہ مسلمان ہو یا مشرک، ظالم ہو یا عادل اس کے لیے دُعا کرے تا کہ اس کے حکم میں سستی

---

[1] نافع السالکین ص ۱۵ — [2] ایضاً ص ۱۴۵ - ۱۴۶ — [3] ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیزؒ
[4] نافع السالکین ص۸ — [5] ایضاً ص۸ — [6] ایضاً ص ۳۰

سستی نباشد۔ زیرا در سستی حکم نقصان خلق اللہ است و در قوتِ آں عین مصلحت [1]
نہ ہو، اس لیے کہ سستی میں خلق اللہ کا نقصان ہوتا ہے اور قوت میں عین مصلحت ہے۔

ایک مرتبہ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت دُعا فرمائیے کہ مسلمان کی حکومت ہو، ہم کفار کی حکومت سے تنگ آگئے ہیں جواب میں ارشاد فرمایا :

"حاکم حق تعالےٰ است
اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ" [2]

شاہ صاحبؒ کی مستقل رائے یہ تھی کہ حکومت سے پہلے درستیٔ اعمال ازبس ضروری ہے فرماتے ہیں :

"ہر بلا و مصیبت کہ بر مردماں منزل باشد۔ چنانچہ در حدیث شریف وارد است اعمالکم عمالکم یعنی کردارہائے شما حاکمان شما اند۔ اگر اعمال شما نیک باشند پس حاکم شما اہل اسلام و عادل باشند و اگر بالعکس باشند پس حاکم شما نیز کافر و جابر باشند" [3]

ہر بلا اور مصیبت جو انسانوں پر نازل ہوتی ہے ان کے اعمالِ ناشائستہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے اعمالکم عمالکم یعنی تمھارے کردار تمھارے حاکم ہیں۔ اگر تمھارے اعمال نیک ہوں گے تو تمھارے حاکم بھی اہل اسلام میں سے اور عادل ہوں گے۔ اگر اس کے برعکس ہوں گے تو حاکم بھی کافر اور جابر ہوں گے۔

غیر مسلموں سے تعلقات! حضرت شاہ محمد سلیمان تونسویؒ نہایت وسیع المشرب، وسیع الخیال اور وسیع النظر بزرگ تھے۔ چشتیہ سلسلہ کے دیگر اکابر کی طرح ان کا عقیدہ بھی یہ تھا کہ ہندوؤں سے اچھے تعلقات رکھے جائیں۔ وہ اپنے مریدوں کو ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ اپنے مذہب، اپنے تمدن، اپنی شریعت پر قائم رہو، لیکن ساتھ ہی ساتھ دوسرے مذاہب کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ اپنے تعلقات میں کبھی بدمزگی پیدا نہ ہونے دو۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :

"سالک را باید کہ ہیچ کس را رنج نہ دہد بلکہ ہمہ مخلوق صلح کند" [4]
سالک کو چاہیے کہ کسی کو رنج نہ پہنچائے، بلکہ ساری مخلوق سے صلح رکھے۔

شاہ صاحبؒ ہمیشہ محبت، امن اور صلح کا درس دیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے سلسلہ کے بزرگوں کی ہدایت ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں صلح رکھی جائے۔ جامع ملفوظات نے لکھا ہے۔

---

[1] [2] [3] [4] نافع السالکین ص ۲۳ - ۳۲ - ۴۰ - ۱۵۵

"حضرت قبلہ من قدس سرہٗ فرمودند کہ در طریق ما ہست کہ با مسلمان و ہنود صلح باید داشت و ایں بیت شاہد آوردند"

حضرت قبلۂ من قدس سرہٗ نے فرمایا کہ ہمارے طریقے میں ہے ہندو اور مسلمان سے صلح رکھی جائے اور اس بیت کو شہادت کے طور پر پیش کرتے تھے۔

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام[1]

یہ واضح رہے کہ شاہ صاحبؒ کا یہ برتاؤ اور یہ سلوک صرف غیر مسلموں کے ساتھ تھا۔ بدمذہبوں[2] کے معاملہ میں وہ نہایت سخت گیر تھے۔ اپنے مریدوں اور معتقدوں کو ہمیشہ بدمذہبوں سے بچنے کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"سالک را باید کہ از صحبت بدمذہبان خود را دور دارد، اگرچہ در صحبت ایشاں نعیم دنیاوی موجود شوند، ہرگز اختیار نکند، بلکہ برگرسنگی و برہنگی گذران بہتر است۔"[3]

سالک کو چاہیے کہ بدمذہبوں کی صحبت سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ چاہے ان کی صحبت میں دنیاوی فائدے موجود ہوں، ہرگز ان سے میل جول نہ رکھے، بلکہ بھوکا اور ننگا رہنا ان کی صحبت سے بہتر ہے۔

وہ بدمذہبوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے مطالعہ کو بھی پسند نہ کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بیٹے کو ایسی کتاب بھی نہ پڑھنے دی تھی، جس کا مصنف ایک معتزلی تھا۔[4]

عیسائی اور شاہ صاحبؒ | حضرت شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کے زمانہ میں برطانوی اقتدار نہایت سرعت کے ساتھ قائم ہو رہا تھا۔ مختلف مقامات پر عیسائی مبلغ اپنے مذہب کی تبلیغ و تلقین کرتے پھر رہے تھے۔ بعض لوگوں کو وہ ملازمتوں کا لالچ دیتے تھے۔ بعض کو خاموش تبلیغ کے ذریعہ اپنا ہم خیال بنا لیتے تھے۔ ایک طرف یہ کوششیں جاری تھیں کہ دوسری طرف لارڈ میکالے نے اس طریقۂ تعلیم کا سنگ بنیاد رکھا تھا، جس کے ذریعہ مغربی اثرات کا پھیلنا یقینی امر تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے پاس جب عیسائی مشنریوں کے ہنگاموں کی خبریں پہنچتی تھیں تو ان کو سخت تکلیف ہوتی تھی، وہ اپنی بساط اور اپنے مقدور کے مطابق مسلمانوں کو ان مغربی اثرات سے بچانے کی جد و جہد فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ مولوی محمد حیات صاحبؒ[5] دہلوی نے عرض کیا تھا کہ:

"بسیار مسلماناں را فرنگیاں از دین محمدی گردانیدہ

بہت سے مسلمانوں کو فرنگیوں نے دین محمدی سے

---

[1] تاریخ السالکین ص ۱۸۶ [2] ایضاً ص ۱۶ [3] ایضاً ص ۱۶۲ [4] ایضاً

[5] مولوی محمد حیات صاحب دہلوی بڑے جید عالم تھے وہ دہلی سے شاہ صاحب کی صحبت کا فیض حاصل کرنے کے لیے تونسہ شریف گئے تھے ان کا مختصر حال کے لیے ملاحظہ ہو برہان دہلی شمارہ۔

از ایمان خارج کردہ اند کہ ایشاں وین مسیحا از جہت صحبت اختیار کردہ اند" [۱]	گمراہ کردیا ہے اور ایمان سے خارج کردیا ہے اور انھوں نے دین مسیحی کی صحبت کی غرض سے اختیار کرلیا ہے۔

شاہ صاحبؒ کو یہ خبر سن کر صدمہ ہوا اور فرمایا کہ ایسی نوکری سے جس میں ایمان کا خطرہ ہو بھوکا مر جانا بہتر ہے۔ جب ملتان پر انگریزوں کا قبضہ ہوا اور شاہ صاحبؒ کو معلوم ہوا کہ انھوں نے وہاں کے مقابر کی بے حرمتی کی ہے تو سخت پریشانی میں یہ شعر پڑھا ؎

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد   میلش اندر طعنۂ پاکاں برد [۲]

ایک مرتبہ ایک شخص سے فرمانے لگے :

"فرنگیاں را تیر نمی زنی" [۳]

اس نے عرض کیا ایسی قدرت نہیں رکھتا، آپ مدد فرمائیے "آپ نے یہ شعر پڑھا اور خاموش ہو گئے ؎

کمان نرم باید کماندار چست   بوقت کشیدن درآید درست [۴]

سرکاری ملازمت اور شاہ صاحبؒ

متقدمین صوفیہ سلسلۂ چشت اپنے خلفا اور مریدوں کو "شغل" [۵] سے اجتناب کرنے کی ہدایت فرماتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سرکاری ملازم ہونے کے بعد انسان میں دینی کام انجام دینے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کا بھی یہی خیال تھا۔ وہ شغل کو روحانی ترقی میں ایک رکاوٹ تصور کرتے تھے ایک شخص نے اطلاع دی۔ مولوی علی الدین بہاول پوری احمد پور کے قاضی ہو گئے ہیں، فرمانے لگے :

"مولوی مذکور پیش ازیں خوش بود اکنوں در بلا افتاد کہ معاملۂ قضا اختیار کردہ کہ معاملۂ قضا نزد پیراں ممنوع است کہ بسیار مریداں را ازیں معاملہ منع کردہ اند" [۶]	مولوی مذکور اس سے پہلے خوش تھے، اب بلا میں گرفتار ہو گئے کہ قضا کا جھگڑا اپنے ذمہ لے لیا۔ قضا کا معاملہ ہمارے پیروں کے نزدیک ممنوع ہے اور انھوں نے بہت سے مریدوں کو اس سے منع کیا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کا واقعہ سنایا کہ ابتدائی زمانہ میں انھوں نے قاضی ہونا چاہا تھا، لیکن شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے منع کر دیا تھا۔ [۷]

ایک مرتبہ آپ کے ایک مرید مولوی علی محمد جراح نے عرض کیا کہ غریب نواز مجھے ڈیرہ غازی خاں کی قضا مل رہی ہے لیکن میں بہت ڈرتا ہوں۔ فرمایا مُسہیدی لاتخف، اَللّٰہُ مَنَابِیْ اور خاموش ہو گئے۔ [۸]

---

[۱] نافع السالکین ص ۱۶۷ [۲] ایضاً ص ۱۷۷ [۳] ایضاً [۴] ایضاً ص ۵ [۵] شغل سے مراد سرکاری ملازمت تھی۔ [۶] نافع السالکین ص ۵ [۷] ایضاً ص ۶ [۸] ...

شاہ صاحبؒ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ کی نوکری کرنی چاہیے[1]۔ سرکاری معاملہ سے دُور رہنا بہتر ہے۔ اس میں پڑکر فرشتہ بھی شیطان ہو جاتا ہے۔

"اگر فرشتہ باشد چوں در معاملۂ سرکار افتد دیو شود"[2]

ملفوظات میں متعدد جگہ انھوں نے اپنے اعلیٰ مریدوں کو سرکاری ملازمت سے منع کیا ہے۔ اس ضمن میں ایک جگہ تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

"نوکری و ملازمت نمودن بہ اہل دنیا بداست و داخل شدن در معاملۂ اہل دنیا ازاں بدتر کسیکہ حاکم شود از جانب اہل دنیا بر مخلوقات چوں بر مخلوقات حکم کند و پاس خاطر اہل دنیا نماید و رعایت امر اللہ و رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فراموش کردہ بر خلق اللہ ظلم و تعدی کند و حال خلق اللہ را بظلم و جبر بگیرد"[3]

امرا سے بے تعلقی: حضرت شاہ محمد سلیمان صاحبؒ قدس سرہٗ امراء اور دنیا دار لوگوں سے بہت اجتناب فرماتے تھے۔ ایسے لوگوں کے پاس آنا جانا روحانی ترقی میں ایک رکاوٹ تصور فرماتے تھے۔ مریدوں کو بھی ہدایت تھی کہ ایسے لوگوں سے بچا جائے ان کی صحبت سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

۱۔ "سالک را باید کہ از صحبت اہل دنیا دُور باشد"[4]

۲۔ قرب ایشاں ہلاکت جان است، قرب سلطان آتش سوزاں بود[5]

۳۔ صحبت الاغنیاء تمیت القلب ولو کانت ساعۃ"[6]

شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اہل دنیا "سفید چشم" اور "بے وفا" ہوتے ہیں[7]۔ جب اُن پر کوئی مصیبت آتی ہے تو پیر و فقیر کی تلاش میں پھرتے ہیں اور آہ و زاری کرتے ہیں، لیکن ویسے بلا مطلب وہ کبھی فقراء کی طرف متوجہ نہیں ہوتے[8]۔

امراء سے علیحدہ رہنے کے سلسلہ میں وہ ایک بہت دلچسپ حکایت سنایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شیخ سعدیؒ حضرت خواجہ فریدالدین عطارؒ سے ملاقات کے لیے گئے۔ شیخ عطار نے یہ کہہ کر ملنے سے انکار کر دیا:

"تو با تونگراں دوستی داری با تو ملاقات نکنم" — تو امیروں سے دوستی رکھتا ہے، میں تجھ سے نہیں ملتا۔

شیخ سعدیؒ کو سخت صدمہ ہوا۔ ۶ ماہ تک وہاں رہے، پھر حضرت شیخ فریدالدین عطار نے ان کو بلایا اور "آستین خود دراز کرد تا حضرت سعدیؒ براں بوسہ داد و رفت"[9]

شاہ صاحبؒ نے جاگیر کے معاملہ میں بھی اپنے بزرگوں کے مسلک پر عمل کیا۔ ایک مرتبہ عبدالجبار خاں نواب ڈیرہ غازی خاں

ل نافع السالکین ص ۸۳ ۲ ایضاً ص ۶ ۳ ایضاً ص ۸۳ ۴ ایضاً ص ۲۸ ۵ ایضاً ص ۲۸ ۶ ایضاً ص ۱۶ ۷ ایضاً ص ۱۹
۸ ایضاً ص ۵۵ ۹ ایضاً ص ۵۵ ۹ ایضاً ص ۷

نے درویشوں کے خرچ کے لیے جاگیر پیش کی، جواب میں فرمایا :

" ما ایں جاگیر نگیریم کہ خلاف سنت پیران وشیخاں ما ہر گز نخواہیم نمود کہ ایشاں قبول نکردہ اند"[1]

کچھ لوگوں نے عرض کیا کہ صاحبزادہ گل محمد کے لیے جاگیر قبول فرما لیجیے۔ جواب دیا :

" گل محمد را نیز حاجت جاگیر نیست، اگر نعلین درویشاں راست کند برائے خدمت او مقربان خدمت گار شوند"[2]

شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کا مہمان ہو کر زندگی بسر کرنی چاہیے تاکہ دینی کام پوری مرکزیت کے ساتھ انجام پا سکیں۔

شاہ شجاع اور خواجہ تونسوی رح جس زمانہ میں شاہ محمد سلیمان صاحبؒ تونسہ میں رونق افروز تھے، اس وقت مشرقی وسطیٰ کی سیاست بہت خطرناک صورت اختیار کر رہی تھی۔ نپولین کی جنگوں کے بعد سے روس مسلسل مشرق کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ۱۸۲۶ء میں روسیوں نے ایرانیوں کو شکست دے کر اس ملک پر بھی اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا۔ برطانیہ کو روس کے اس بڑھتے ہوئے اقتدار سے سخت خطرات پیدا ہو گئے تھے۔

چنانچہ اس نے افغانستان میں اپنی طاقت کا استحکام کرنا چاہا، تاکہ برطانوی ہند اور روس کے درمیان ایک طاقت ور ریاست مقابلہ کے لیے موجود رہے، لیکن افغانستان میں اس وقت اندرونی گڑبڑ ظہور ہی تھی۔ درّانی خاندان کو دوست محمد نے کابل اور غزنی سے نکال دیا تھا۔ دُرّانی خاندان کے امیدوار تخت وتاج شاہ شجاع نے بالآخر ہندوستان میں پناہ لی تھی اور انگریز شاہ شجاع کی حمایت میں تھے۔

شاہ سلیمان تونسویؒ کی روحانی شہرت کو سن کر شاہ شجاع ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خاتم سلیمانی میں کئی ایسے واقعات درج ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ شجاع کو حضور خواجہ صاحب سے بڑی عقیدت اور ارادت پیدا ہو گئی تھی۔

جب شاہ شجاع دوسری بار انگریزی امداد لے کر افغانستان جا رہا تھا تو تونسہ شریف سے اس کا گذر ہوا۔ رات کو وہیں قیام کیا۔ صبح کو خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شاہ صاحب نے اپنے مصلے پر اس کو بٹھا لیا اور ساری سرگزشت سنی۔ اس کے بعد پوچھا " افغانستان کی تسخیر کا ارادہ ہے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ کس کی پناہ میں جا رہے ہو" فوراً جواب دیا " کہن دل خاں اور پردل خاں کی حمایت میں جا رہا ہوں" اس کے بعد شاہ شجاع چلا گیا۔ شاہ صاحب اپنی مجلس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "اس کا بخت برگشتہ معلوم ہوتا ہے، وہ اللہ کے بجائے کہن دل خاں اور پردل خاں پر اعتماد رکھتا ہے" لیکن شاہ صاحب بڑے مردم شناس بزرگ تھے۔ اگر ایک طرف شاہ شجاع کی اس بات پر ان کو اعتراض تھا، تو دوسری طرف وہ اس کی ہمت مردانگی کی تعریف فرمایا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد جب شاہ شجاع کے قتل کی خبر سنی تو فرمانے لگے" شاہ شجاع بڑی ہمت والا جوان تھا۔

---

[1] نافع السالکین صفحہ ۱۶۸ [2] ایضاً صفحہ ۱۱۵ [3] خاتم سلیمانی ص ۹۷

حصولِ مطلب کی خاطر اپنی جان تک نذر کردی۔

امیر دوست محمد خاں اور شاہ صاحبؒ حضرت شاہ محمد سلیمان صاحبؒ کی شہرت ہندوستان اور افغانستان میں دُور دور تک پھیل گئی تھی۔ جس زمانہ میں شاہ شجاع اور دوست محمد خاں میں افغانستان کی حکومت کے لیے کشمکش ہو رہی تھی اور سکھوں اور انگریزوں نے شاہ شجاع کی امداد دینی شروع کر دی تھی۔ اس وقت دوست محمد خاں نے شاہ صاحب سے روحانی امداد کی درخواست کی اور لکھا کہ میں نے خالصاً للّٰہ جہاد پر کمر باندھی ہے تاکہ یہ اسلامی علاقہ کفار کے صدمات اور تصرفات سے محفوظ رہے۔ دعا فرمائیے کہ خدا مجھے فتح و نصرت عطا فرمائے۔ شاہ صاحب نے یہ خط سُن کر منشی محمد واصل سے کہا کہ جواب میں یہ شعر لکھ دو ؎

ہر آں کہ استعانت بدرویش بُرد اگر بر فریدوں زد بیش برد

وصال ماہ صفر ۱۲۶۷ھ کا چاند دیکھ کر خواجہ صاحبؒ نے فرمایا۔ ہمارے "سفر" کا مہینہ ہے۔ خدا خیر کرے۔" کچھ دن بعد زکام کی شکایت ہوئی اور ۷ صفر کو جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ نواب بہاول پور نے ۷۰ ہزار روپیہ کے صرفہ سے سنگِ مر مر کا عالی شان روضہ تیار کرایا۔

اولاد خواجہ محمد سلیمانؒ کے دو فرزند تھے: (۱) خواجہ گل محمد (۲) خواجہ درویش محمد

دونوں شاہ صاحب کی حیات ہی میں وصال فرما گئے تھے۔ اس لیے شاہ صاحبؒ کے بعد ان کے پوتے خواجہ اللہ بخش صاحب مسند نشین ہوئے۔

خلفاء شاہ محمد سلیمانؒ ۲۲ سال کی عمر میں سجادۂ مشیخت پر جلوہ افروز ہوئے تھے اور ۸۴ سال کی عمر تک تلقین و ارشاد میں مصروف رہے۔ اس مدت میں ہزاروں تشنگانِ معرفت ہندوستان اور دیگر بلادِ اسلامیہ سے اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں نے جہاں جوہر قابل پایا اس کی قدر کی اور خلافت سے سرفراز کیا۔ آپ نے کم و بیش ۷۰ بزرگوں کو خرقۂ خلافت عنایت فرمایا تھا۔ بعض خلفاء کے نام یہ ہیں:

۱۔ مولوی محمد باراں کلاچویؒ
۲۔ مولوی محمد علی مکھڈیؒ
۳۔ مولوی محمد علی خیرآبادیؒ
۴۔ مولانا احمد تونسویؒ
۵۔ صاحبزادہ نور بخش نبیرہ قبلہ عالم
۶۔ قطب الدین برادر حقیقی صاحبزادہ نور بخش
۷۔ مولوی نور جہانیاں صاحب بہاول پوری
۸۔ مولوی شہسوار صاحب سکنہ نواحی جہانہ
۹۔ شمس الدین سیالوی
۱۰۔ میاں عبدالشکور خیرآبادی
۱۱۔ مولوی امام الدین مصنف نافع السالکین
۱۲۔ حاجی نجم الدین مصنف مناقب المحبوبین

حضرت حافظ سید محمد علی خیرآبادیؒ

ولادت ———————— ۱۱۹۲ھ

وفات ———————— ۱۲۶۶ھ

حافظ سید محمد علی صاحب خیرآبادیؒ خواجہ تونسویؒ کے اوّلین خلفا میں سے تھے۔ خیرآباد میں ان کی خانقاہ علم و فضل کا مرکز اور فیوض و برکات کا منبع تھی۔ اودھ اور دکن میں چشتیہ سلسلہ کی اشاعت کا کام اسی خانقاہ میں بیٹھ کر کیا گیا تھا وہ بے پناہ عزم و استقلال کے مالک تھے۔ نامساعد حالات سے بالکل متاثر نہ ہوتے تھے۔

ولادت اور نسب | حافظ صاحبؒ کی ولادت باسعادت ۱۱۹۲ھ کو ہوئی تھی[1]۔ ان کے والد ماجد مولوی شمس الدین ایک علمی خاندان کے فرد تھے۔ ان کے اجداد میں ایک بزرگ حضرت شیخ سعد خیرآبادیؒ حضرت شاہ مینا لکھنوی کے خلیفہ تھے اور ان کی شہرت دُور دُور پھیلی ہوئی تھی۔ حافظ صاحب کا خاندان بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ علم و فضل میں اس گھرانے کو ایک امتیازی رتبہ حاصل تھا۔

ایامِ طفلی | بچپن ہی سے حافظ صاحب کی طبیعت عبادت کی طرف راغب تھی۔ رات کے آخری حصہ میں اٹھ کر یادِ حق میں مشغول ہو جاتے تھے[2]۔ شریعت کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ ایک دن وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی جگہ جا رہے تھے۔ راستہ میں بیر کے درخت ملے۔ سب لڑکوں نے ان درختوں سے پھل توڑ کر کھائے۔ حافظ صاحب سے کھانے کے لیے کہا گیا تو فرمایا "یہ درخت غیر کی ملک ہیں، بغیر مالک کی اجازت کے کیسے کر کھاؤں"[3]

تعلیم | سب سے پہلے سید محمد علی صاحب نے قرآنِ پاک حفظ کیا۔ اس کے بعد خیرآباد میں مولانا عبدالوالی صاحب سے جو اپنے زمانہ کے مشہور عالم تھے۔ شرح وقایہ تک علم حاصل کیا۔ پھر شاہ جہان پور تشریف لے گئے اور وہاں کچھ عرصہ تک تحصیل علوم میں مشغول رہے۔ یہاں شہر کے باہر ایک مسجد میں ان کا قیام رہا۔ شاہجہان پور کی علمی دنیا جب ان کی تشنگی علم کو نہ بجھا سکی تو دہلی کا رُخ کیا کہ وہی ہندوستان میں علم و ادب، احسان و سلوک کا آخری مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت شاہ ولی اللہؒ کے گھرانے نے علم کی وہ شمع روشن کر رکھی تھی، جس کے گرد دُور دُور سے علمی پروانے جمع ہو رہے تھے۔ دہلی میں مشکوٰۃ کا سبق انھوں نے حضرت شاہ عبدالقادرؒ سے لیا[4]۔ پھر حرمین شریفین میں صحیح بخاری کی سماعت فرمائی۔ جب شاہ سلیمان تونسویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے

---

[1] تذکرہ اولیائے دکن جلد اوّل ص ۳۰۰ [2] مناقب حافظیہ ص ۳-۴۹ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً [6] ایضاً

ترمیح مسلم کی سماعت کی۔ دہلی میں شاہ عبدالقادرؒ کی خدمت میں فصوص الحکم کا کچھ حصہ پڑھا۔[1]

مجاہدات | حافظ صاحب نے ابتدائی زمانہ میں سخت مجاہدات کیے تھے۔ سب سے پہلے وہ حضرت سید محمد مشتاق عرف چھیدا میاں کے مزار پر چلہ کش ہوئے۔ پھر شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ کے مزار حبر کر پر ریاضت شاقہ میں مشغول ہو گئے۔ نمازیوں کے لیے پانی بھر بھر کر لاتے۔ باقی وقت میں عبادت کرتے۔ اسی طرح کافی عرصہ گزر گیا۔ پھر حضرت قطب صاحبؒ کے مزار پر دہلی میں حاضر ہوئے اور حسب معمول مجاہدوں میں مشغول ہو گئے۔ چند مکانوں میں اُجرت پر پانی بھر کر اپنی گزر اوقات کرتے تھے۔ اور اکثر روزہ رکھتے تھے۔ تمام رات قرآن پاک کی تلاوت میں گزرتا تھا۔ دہلی سے وہ اجمیر شریف پہنچے، اور وہاں بارہ سال تک ایک مسجد میں مقیم رہے۔ یہاں سے پاک پٹن کا ارادہ کر دیا۔ پاک پٹن میں خواجہ محمد سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت و بزرگی شہرت سُن کر دل اس طرف متوجہ ہو گیا۔ یہاں ان کو عقیدت و ارادت کا ایسا مرکز مل گیا، جس نے ان کے مجاہدوں اور ریاضتوں کو صحیح راستے پر لگا دیا۔ شاہ محمد سلیمانؒ کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ فطرت کی ودیعت کی ہوئی صلاحیتیں اُبھر آئیں اور ان کو چمکنے کا موقع مل گیا۔

بیعت | حافظ صاحبؒ انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ پاک پٹن سے تونسہ روانہ ہوئے۔ شاہ محمد سلیمان کی خدمت میں پہنچ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی خواہش کا بھی اظہار نہ کر سکے۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ ایک دن حافظ صاحب کے دل میں خیال آیا کہ افسوس حضرت شاہ صاحبؒ میرے حال کی جانب متوجہ نہیں ہوتے۔ شاہ صاحب کو معلوم ہوا تو فرمایا "جس شخص سے مجھے تعلق ہوتا ہے بظاہر میں اس کی طرف توجہ نہیں کرتا ہوں"۔ یہ سُن کر حافظ صاحب کے بے چین قلب کو اطمینان ہوا۔ شاہ صاحب نے پہاڑ پر پاؤں رسی میں باندھ کر عبادت کرنے کی ہدایت کی۔ عرصہ تک حافظ صاحب اس طرح کے مجاہدے کرتے رہے۔ اس کے بعد شاہ محمد سلیمان صاحب نے اپنے سلسلہ میں داخل کر لیا، اور خلافت سے سرفراز فرمایا۔ حافظ صاحب نے کچھ عرصہ تک کسی شخص کو مرید نہیں کیا۔ شیخ کو علم ہوا تو وجہ پوچھی۔ عرض کیا "اہلِ ہند نہایت درجہ معاصی میں مبتلا ہیں۔ اسی وجہ سے سلسلہ میں داخل نہیں کیا"۔ شاہ صاحب نے فرمایا "تم کو اس سے کیا کام، میں نے اجازت دی ہے نیک خواہ بد، جو کچھ ہوں گے مجھ سے ہوں گے۔" شیخ کا یہ حکم سننے کے بعد حافظ صاحب نے بیعت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اودھ، پنجاب اور حیدرآباد کے ہزاروں باشندوں نے ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ پھر حافظ صاحب حرمین شریفین تشریف لے گئے۔ وہاں دس سال تک مقیم رہے اور کچھ لوگوں کو مرید بھی کیا۔

پیرومرشد سے عقیدت! | حافظ صاحب کو اپنے پیرومرشد سے بڑی عقیدت تھی۔ شیخ کے نوکروں تک کی عزت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شاہ صاحب کا سائیس لکھنؤ میں مل گیا، اس کی بے حد تعظیم کی۔[3] حافظ صاحب جب اپنے شیخ کی خدمت میں جاتے تو کئی کوس پہلے سے پیادہ پا چلنے لگتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک مرید نے سوار ہونے کی درخواست کی تو فرمایا ؎

لہ تا کہ مناقب حافظیہ ص ۳۹-۴۰ کہ ھ ایضاً ص ۴۰ لہ ایضاً ص ۴۹ کہ ایضاً ص ۵۱ ھ ایضاً ص ۱۱۰

وعدہ وصل چوں شود نزدیک　　　آتش شوق تیز تر گردد [1]

شاہ صاحبؒ ان کی صحبت اور خلوص کی بے حد قدر کرتے تھے اور انتہائے تعلق میں ان کو شاہ ہوری کہتے تھے [2]

بری رسموں کو دور کرنے کی کوشش

حافظ صاحبؒ کی کوشش تھی کہ مسلمانوں کی سوسائٹی کی نشو و نما اسلامی اصول پر ہو وہ ہمیشہ اسلامی رسم و رواج اور طرز زندگی پر زور دیتے تھے کہ بری رسموں کو دور کرنے کی جد و جہد کرنا سب سے زیادہ اہم کام ہے۔ خود ان کے متعلق مناقب کے مصنف کا بیان ہے " ہمیشہ سنت نبویہ کے زندہ رکھنے اور اہل ہند کی باطل رسمات کو مٹانے کے واسطے مستعد اور آمادہ رہتے تھے [3]

حافظ صاحب کی اصلاحی کوششوں کی ابتدا خود ان کے گھر سے ہوئی۔ انھوں نے اپنے گھر میں ان تمام رسومات اور توہمات کو ختم کیا جن کو وہ غیر شرعی سمجھتے تھے۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ان کو قصبہ ہوران کا سفر پیش آیا۔ حاضرین نے کہا ، کیا حضرت بی بی صاحبہ کی رسومات نہیں کریں گے ؟ فرمایا " جہاں ہوگا وہاں فاتحہ کر دوں گا۔ کیوں کہ اس سے غرض ایصال ثواب ہے اور وہ ہر جگہ ممکن ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ اسی جگہ سیوم کی فاتحہ کروں " [4]

شادی کے معاملے میں وہ غیر ضروری رسومات کو ناپسند کرتے تھے۔ ایک دن اچانک صاحبزادے حافظ جمال الدین کو دلہن کے مکان پر لے گئے اور نکاح کے لیے کہا۔ دلہن کے گھر والوں نے بے سروسامانی کا عذر کیا تو فرمایا " جو کچھ اللہ اور رسول کا حکم ہے اس کے مطابق عمل کرنا چاہیے " چنانچہ قواعد شرعیہ کے مطابق نکاح ہو گیا اور کوئی غیر شرعی رسم ادا نہ کی گئی۔

حافظ صاحبؒ کے برادر زادے حافظ تراب علی صاحب کی شادی میں کاغذ کے پھول تیار کیے گئے تھے۔ حافظ صاحب کی نظر پڑی تو سخت رنج ہوا۔ فرمایا " یہ بزرگ زادے ہیں اور ایسے مراسم قبیحہ کرتے ہیں " یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے [5]

وہ ایسی شادیوں میں جن میں اسلامی شعار کی پابندی نہیں ہوتی تھی ، شرکت نہ کرتے تھے۔ ایک شخص واجد علی خاں نے شادی میں شرکت کی درخواست کی۔ فرمایا " اس زمانہ میں اس قدر مہر قرار دیا جاتا ہے کہ اس کا ادا کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ یہ امر ناروا ہے پس ایسی تقریب نکاح میں میں شریک نہیں ہوا کرتا " [6] خاں صاحب کے اس یقین دلانے پر کہ جو مہر قرار پائے گا۔ وہ اسی وقت ادا کیا جائے گا۔ آپ شادی میں تشریف لے گئے۔

تقاریب میں رنڈیوں کے ناچ سے سخت نفرت تھی [7]

اگر کہیں رنڈیوں کا ناچ ہوتا تو ہرگز شریک نہ ہوتے [8] ایک مرتبہ حیدرآباد میں حضرت شاہ یوسف کے مزار پر حاضری کا اتفاق ہو تو دیکھا وہاں طوائفوں کا ناچ ہو رہا ہے۔ آپ کو اس قدر غصہ آیا کہ محفل میں پہنچ کر مشائخ کو للکارا۔

---

[1] مناقب حافظیہ ص-۱۰۱ [2] ایضاً ص ۱۰۶ [3] ایضاً ص ۱۰۶ [4] [5] ایضاً ص ۱۰۷

[6] ایضاً ص ۱۰۷ [7] ایضاً ص ۱۵۲ [8] ایضاً ص ۱۰۸

"یہ بال تمہاری داڑھی کے نہیں ہیں بلکہ زنّار کے تار ہیں۔ اولیاء اللہ کے مزاروں پر ایسا فسق و فجور ہوتا ہے اور تم دیکھتے ہو۔"[1]

حافظ صاحبؒ مشرکانہ تہواروں میں شرکت پسند نہ فرماتے تھے۔ کہتے تھے:

"جس مسلمان نے رسمِ کفر کو رغبتِ دل سے مشاہدہ کیا اس کے ایمان میں خلل پڑا۔"[2]

جب کسی قوم کے قوائے عمل مضمحل ہوتے ہیں تو ان علوم اور شعبدوں میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے جو بغیر ہاتھ پاؤں کو جنبش دیے آسایش کی زندگی کا دلکش خواب دکھاتے ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں عام لوگوں کو کیمیا بنانے کی فکر رہتی تھی۔ ہر شخص اسی دھن میں وقت گزارتا تھا۔ حافظ صاحب نے اپنے ملفوظات میں جگہ جگہ ایسے لوگوں کی مذمت کی ہے۔[3]

اخلاق | حافظ محمد علی صاحبؒ اخلاقِ محمدی کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ انسانی مساوات و اخوت پر ان کا ایمان تھا۔ اپنے عمل سے اس کی تائید کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دسترخوان پر بیٹھے تھے، نظر پڑی تو دیکھا ایک موچی میاں اسلم کے جوتے سی رہا ہے، فرمایا "اپنے ہاتھ دھو کر آ اور کھانا کھا۔" اور اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلایا۔[4] جاڑے کے موسم میں ایک جولاہا ان کے پاس آکر ٹھہرا۔ اس کے پاس جاڑے کا لباس نہ تھا۔ حافظ صاحب نے اس کو اپنے بستر میں اپنے پاس سلایا۔[5]

حافظ صاحبؒ جب محفل میں مدعو کیے جاتے تو کبھی ممتاز جگہ پر نہ بیٹھتے۔[6] سفر و حضر میں خادموں کے ساتھ کام میں شریک رہتے تھے۔ بعض اوقات روٹیاں اپنے ہاتھ سے پکا لیتے تھے۔[7] اظہارِ مشیخت سے نفرت تھی، بلکہ اس قسم کا تواضع جس سے ترکِ تجرید کا اظہار ہو پسند نہ کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ترک کو بھی ترک کرنا چاہیے۔[8]

اتباعِ سنّت | حافظ صاحب اتباعِ سنّت پر بہت زور دیتے تھے۔ مناقب حافظیہ میں لکھا ہے:

"حضرت شیخ الاسلام کو چونکہ اتباعِ نبوی میں بہت کد و کوشش تھی۔ ہمیشہ سنّتِ نبویہ کے زندہ رکھنے اور اہلِ ہند کی باطل رسومات کو مٹانے کے واسطے مستعد اور آمادہ رہتے تھے۔"[9]

ان کی مجلسوں میں مسائلِ شریعت اور سنّت کے علاوہ کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔[10] اپنے مریدوں کو سنّتِ نبوی پر عمل کرنے کی برابر تاکید کرتے تھے۔ ایک شخص ہر روز صبح کو آکر قدم بوسی کرتا تھا۔ ایک روز فرمایا "کیا یہ ڈنڈوت ہے کہ فجر کو اٹھ کر ہندوؤں کی طرح ایسا کرتا ہے؟ السلام علیکم کہہ کر بیٹھ جانا چاہیے۔"[11] حافظ صاحب اپنے مریدوں کو بتایا کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی اور محبتِ الٰہی کا دعویٰ بغیر اتباعِ نبوی جھوٹا دعویٰ ہے۔[12]

---

1 مناقب حافظیہ ص ۱۳۱   2 مناقب حافظیہ ص ۱۷۷   3 مناقب حافظیہ ص ۲۰۳   4 مناقب حافظیہ ص ۱۰۹
5 " " ۱۲   6 " " ۱۱۰   7 " " ۱۱۲   8 " " ۱۱۵
9 " " ۱۰۶   10 " " ۱۳۶   11 " " ۱۴۸   12 " " ۱۷۷

حافظ صاحب اپنے مریدوں کو احسان و سلوک کی صرف ان کتابوں کے مطالعہ کی ہدایت فرماتے تھے، جن میں شریعت پر خاص زور دیا گیا ہو۔ عوارف المعارف ان کو بہت پسند تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں ہر مسئلہ حدیث شریف سے لکھا گیا ہے۔[1]

مریدوں کی تربیت | حافظ صاحب اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے "مرشد کو مریدوں کا اس طرح خیال رہتا ہے، جس طرح ماں کو اپنے لڑکوں کا خیال رہتا ہے"۔[2]

حافظ صاحب اظہارِ مشیخت سے ناراض ہوتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ ہر چیز کا اخفا کیا جائے۔ ایک دن ان کے ایک مرید میر محمد علی ان لکڑیوں پر جن سے کپڑا بنا جاتا ہے بیٹھے ہوئے تھے، اتفاقاً حافظ صاحب کی نظر ان پر پڑ گئی۔ فرمایا، ایسا فعل نہیں کرنا چاہیے، جس سے لوگ یہ سمجھیں کہ یہ شخص نہایت متواضع اور منکسر ہے۔[3] ایک مرید نے اپنی رضائی ایک مسکین کو دے دی تو سخت ناراض ہوئے اور فرمایا اس فعل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص ایسا باخدا ہے کہ ایک رضائی اس کے پاس تھی وہ بھی خدا کی راہ میں دے دی۔ فرمایا کرتے تھے کہ ترک کو بھی ترک کرنا چاہیے۔ مریدوں کے بال رکھنے کو اس وجہ سے ناپسند کرتے تھے کہ اس سے اظہارِ مشیخت ہوتا ہے۔[4]

حافظ صاحب اپنے مریدوں کی ظاہری و باطنی زندگی کی اصلاح میں بڑی جدوجہد کرتے تھے۔ مرید کرتے وقت یہ ہدایتیں فرماتے تھے:

۱۔ شریعت پر قائم رہو۔
۲۔ اللہ کی محبت میں دل کو مضبوط رکھو۔
۳۔ جب تک تحصیلِ علم سے فارغ نہ ہو ذکر نہ کرو۔
۴۔ دنیا کی محبت میں مت بیٹھو، اس سے محبتِ الٰہی کی لذت سلب ہوتی ہے۔[5]

تعویذ و عملیات سے اجتناب! | جب مذہبی ذہن پریشان ہوتا ہے تو عملیات میں غیر معمولی اعتقاد پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے قوائے عمل شل ہو جاتے ہیں اور اوہام کا تار و پود، زندگی کے سرچشموں کو خشک کر دیتا ہے۔ حافظ صاحب کو یہ چیز سخت ناپسند تھی۔ مناقب میں لکھا ہے:

"شیخ الاسلام عملیات سے نفرت رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے منع فرماتے ہیں"۔[6]

آپ نے کبھی کسی کو تعویذ نہیں دیا۔ ایک شخص بے حد مصر ہوا تو مولانا روم کا یہ شعر کاغذ پر لکھ دیا ؎

---

[1] مناقب حافظیہ ص ۲۱۲ [2] مناقب حافظیہ ص ۱۸۶ [3] مناقب حافظیہ ص ۱۲۵ [4] مناقب حافظیہ ص ۱۱۵
[5] " " ۱۴۳ [6] " " ۲۱۹ [8] "

ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو ایمنی از تو مہابت ہم ز تو[1]

مثنوی مولانا روم | حافظ صاحبؒ کو مثنوی مولانا روم پر بڑا عبور تھا۔ انھوں نے عارف روم کے معارف ربانیہ کا مطالعہ نہایت بالغ نظری سے کیا تھا اور ان کو نہایت ہی بلیغ اور دل نشین انداز میں بیان کرتے تھے۔ مناقب المحبوبین میں لکھا ہے:

"گویند مثنوی را مثل ایشاں کسے نمی خوانید"[2]

اشراق کی نماز کے بعد وہ مثنوی کا درس دیتے تھے[3]۔ مرتب مناقب حافظیہ کا بیان ہے:

"اس کتاب شریف کے ساتھ حضرت شیخ الاسلام کو کمال تعلق اور محبت تھی اور اس کے معانی اور مطالب اس زمانہ میں آنحضرت کی مانند کوئی نہیں بیان کرتا تھا"[4]

حافظ صاحب اپنے اعلیٰ مریدوں کو مثنوی کے مطالعہ کی ہدایت فرمایا کرتے تھے[5]۔ وہ مثنوی کو حقائق و معارف اسرار و رموز کا ناپیدا کنار سمندر سمجھتے تھے۔ اس لیے اس کی شرح لکھنے کو کبھی اچھا نہ سمجھا۔ ایک روز مجلس میں فرمانے لگے کہ مولانا جامی نے مثنوی کی شرح لکھنی شروع کی۔ اس کے دو تین اشعار کی شرح لکھنے پائے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں کہ مولوی صاحب تمھارے شرح لکھنے سے ناخوش ہوتے ہیں، انھوں نے اپنے اسرار کو در پردہ کہا ہے اور تم اس کو فاش کرنا چاہتے ہو۔ یہ سن کر مولانا جامی نے شرح لکھنی بند کر دی[6]۔

حافظ صاحب کے درس مثنوی میں ہندو بھی شریک ہوتے تھے[7]۔

درس و تدریس | حافظ صاحبؒ کی خانقاہ میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ مولانا رومؒ، حضرت ابن عربی اور مولانا جامی کی تصانیف کا درس وہ خود دیتے تھے اور اس انداز میں دیتے تھے کہ بڑے بڑے عالم ان سے استفادہ کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی جو خود بڑے جید عالم تھے۔ فصوص کا درس لینے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے[8]۔

حافظ صاحب معاصرین کی نظر میں! | حافظ صاحبؒ ان مخصوص بزرگوں میں تھے، جن کی روحانی عظمت اور علمی تبحر کی تعریف کرنے پر خود ان کے معاصر علما و مشائخ مجبور ہو گئے تھے۔ مولانا انوار الحق صاحب قدس سرہٗ لکھنؤ کے اکابر اولیاء میں سے تھے۔ حافظ صاحب کو وہ ہمیشہ شبلی وقت کہا کرتے تھے[9]۔ ایک مرتبہ حافظ صاحب ان کی مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک شخص نے آکر مولانا سے مصافحہ کیا۔ مولانا نے حافظ صاحب کی طرف اشارہ کرکے فرمایا "ان کے ہاتھ پر بوسہ دو۔ یہ خیبر حق ہیں[10]"۔ ایک مرتبہ مولانا انوار الحق صاحب نے اپنی مجلس میں فرمایا "حافظ صاحب دولہا ہیں اور ہم سب براتی"[11]۔ لکھنؤ کے ایک دوسرے عظیم المرتبت بزرگ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے

---

[1] مناقب حافظیہ [2] مناقب المحبوبین ص۱۵۳ [3] مناقب حافظیہ ص ۱۱۵ [4] مناقب حافظیہ ص ۱۱۶ [5] مناقب حافظیہ ص ۲۱۴

[6] ؍؍ ص ۲۱۵ [7] مناقب حافظیہ ۲۵۶ [8] ؍؍ ؍؍ ۱۱۶ [9]-[10] ؍؍ ؍؍ ۱۰۲ [11] ؍؍ ؍؍ ۱۰۳

"حافظ صاحب اپنے عہد کے سلطان المشائخ ہیں"[1] حافظ صاحب جب دہلی تشریف لائے تھے تو شاہ غلام علی صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے ان کی بڑی خاطر مدارات کی تھی[2]۔ حاجی نجم الدین صاحبؒ ان کے متعلق "بیر ملانی" میں لکھتے ہیں:

اور محمد علی شاہ ساکن خیر آباد — کری جوانی خرچ جن بیچ خدا کی یاد

یہ ہیں صاحب سلسلہ صدہا لوگ مرید — دن دن شہرا جگ اندر ان کا ہوا مزید[3]

امراء سے اجتناب حافظ صاحب کا "صُحْبَةُ الْاَغْنِيَاءِ لِلْفُقَرَاءِ سَمٌّ قَاتِلٌ" پر راسخ اعتقاد تھا۔ وہ کسی امیر کے پاس جانا اچھا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کی صحبت سے اجتناب کرتے تھے، لیکن اگر کوئی آجاتا تو سنت نبوی کے مطابق اخلاق سے پیش آتے۔ حیدر آباد کے قیام کے زمانہ میں ایک مرتبہ محی الدولہ احمد یار خاں نے عرض کیا کہ حضور یہاں کے رئیس کو آپ سے ملنے کا بے حد شوق ہے۔ فرمایا تم اور وہ دونوں جھوٹے ہو۔ اگر اس کو ملاقات کا اشتیاق ہوتا تو میرے پاس نہ آتا، اجازت کی کیا ضرورت ہے؛ میرے دروازے پر نہ بواب ہیں نہ حجاب ہیں"[4]

بہادر شاہ ظفر اور حافظ صاحبؒ بہادر شاہ ظفر نے چند مرتبہ حافظ صاحب کی خدمت حاضر ہونے کی اجازت چاہی اور ملاقات کا شوق ظاہر کیا۔ لیکن حافظ صاحب نے ہمیشہ یہ فرمایا کہ ملاقات کی حاجت نہیں ہے شوق کا دل ہی میں رہنا اچھا ہے۔ بہادر شاہ نے اصرار کیا، لیکن حافظ صاحب راضی نہ ہوئے۔ بالآخر بہادر شاہ نے کالے صاحب کی وساطت سے ملنے کی کوشش کی۔ کالے صاحب وقت کے منتظر رہے۔ قطب صاحب کے عرس کے دنوں میں حافظ صاحب آستانہ شریف کی مسجد میں رونق افروز تھے۔ کالے صاحب نے فرمایا، حافظ صاحب ایک ضرورت سے جاتا ہوں، جب تک میں حاضر نہ ہوں آپ یہیں تشریف رکھیں یہ کہہ کر بادشاہ کے پاس گئے اور واپس کو لے آئے۔ حاضرین نے شور کیا کہ بادشاہ مسجد کی طرف آتے ہیں جب آواز حافظ صاحب کے کانوں میں پہنچی فوراً دیوار پھاند کر چلے گئے[5]

وہ کلمۂ حق کے کہنے میں بے باک تھے اور کسی کی پروا نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ قطب صاحب کے مزار پر حاضر ہوئے تو دیکھا کہ مزار شریف کے قریب چھتوں پر قناتیں لگی ہوئی ہیں اور ان کی رسیاں مزار مبارک کی طرف ہیں۔ پوچھا کہ یہ قناتیں کس کی ہیں۔ کہا گیا کہ بادشاہ دہلی کے محلات کے واسطے ہیں۔ حافظ صاحب نے غصہ ہو کر فرمایا، یہ انتہائی بے ادبی ہے۔ ان رسیوں کو کاٹ دو تاکہ یہ قناتیں گر پڑیں[6]

نواب بہاول خاں اور حافظ صاحبؒ نواب بہاول خاں ثانی خواجہ تونسوی کا مرید تھا۔ حافظ صاحب سے ملاقات کی تمنا رکھتا تھا، مگر کبھی اس کا موقع نہ ملتا تھا۔ ایک دن شاہ محمد سلیمان تونسوی کی خدمت میں اپنی اس تمنا کا اظہار

---

[1] مناقب حافظیہ ص ۱۰۳ [2] مناقب حافظیہ ص ۱۴۷ [3] بیر ملانی ص ۵ [4] مناقب حافظیہ ص ۱۳۵

[5] " " ۱۳۵ [6] " " ۱۲۸

کیا۔ شیخ نے حافظ صاحب کو طلب کیا۔ حافظ صاحب حاضر ہوئے تو سلام عرض کرنے کے بعد شیخ کے روبرو بیٹھ گئے۔ خان موصوف کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔ تھوڑی دیر کے بعد پیرو مرشد کی اجازت سے اپنے مقام پر واپس آگئے۔[1]

مناقب المحبوبین میں لکھا ہے کہ حافظ صاحب ایک مرتبہ احمد پور تشریف لے گئے تھے۔ نواب بہاول خاں کو جب تشریف آوری کا علم ہوا تو ملاقات کا ارادہ کیا۔ آپ کو خبر ہوئی تو فوراً تونسہ شریف کے لیے روانہ ہو گئے۔[2]

انگریزوں سے تنفر | حافظ صاحب کے زمانہ میں انگریزوں کا اقتدار ہندوستان میں پوری طرح سے قائم ہو گیا تھا۔ انگریزی معاشرت کے اثرات ظاہر ہو رہے تھے۔ حافظ صاحب کو انگریزی طور و طریقہ اور طرزِ معاشرت سے سخت نفرت تھی۔ اگر کوئی انگریزی وضع اختیار کرتا تھا تو طبیعت پر گراں گزرتا تھا۔ بوٹ پہن کر کوئی شخص آتا تو ناخوش ہوتے اور فرماتے یہ نصاریٰ کی وضع ہے۔[3] مصنف "مناقب حافظیہ" کے چچا واجد علی خاں نے ایک کوٹھی بنائی اور حافظ صاحب کو برکت کے لیے مکان میں لائے۔ حافظ صاحب نے معائنہ کے بعد فرمایا کہ واجد علی خاں نے خوب مکان بنایا ہے مگر مجھ کو پسند نہیں آیا کیونکہ اس میں دروازے انگریزی وضع کے ہیں۔[4] ایک مرتبہ ایک صاحب کے نام کے ساتھ انگریزی لفظ "مسٹر" کر اس قدر ناراض ہوئے کہ اس کا خط تک نہ پڑھا۔[5]

وحدت وجود | وحدت وجود پر وہ عوام میں گفتگو کرنے کو بُرا سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے پوچھا کہ عوام جو وحدتِ وجود پر گفتگو کرتے ہیں، اس کے متعلق کیا خیال ہے۔ فرمایا "یہ الحاد و زندقہ ہے"۔[6]

سماع | سماع کے معاملہ میں بہت احتیاط فرمایا کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ زمان، مکان، اخوان کی شرطیں جب تک پوری نہ ہوں مجلس منعقد نہیں کرنی چاہیے۔ قوال ہمیشہ باشرع ہونا چاہیے۔[8]

ہندوؤں کو عقیدت | ہندوؤں کو بھی حضرت حافظ صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔ مثنوی رومیؒ کے درس میں ہندو بھی شریک ہوتے تھے۔ حیدرآباد کے راجہ چندولال کو آپ سے بے حد عقیدت تھی۔[9] اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ دہلی کا ایک کائستھ ہندو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اس قدر متاثر ہوا تھا کہ مع اہل و عیال مسلمان ہو گیا۔[10] شاہ صاحب کا اخلاق بے حد اچھا تھا۔ ہر ملنے والا ان سے مل کر خوش ہوتا تھا اور ان کی محبت کا نہ مٹنے والا نقش لے کر ان کی مجلس سے جاتا تھا۔

واجد علی شاہ اور حافظ صاحبؒ | واجد علی شاہ کے ہنگامہ ہائے نائو و نوش اور حکومت کے کاموں سے بے تعلقی کو دیکھ کر حافظ صاحب کو سخت صدمہ ہوا۔ انھوں نے متعدد بار واجد علی شاہ سے شکایت کی اور اس کے فرائض سے آگاہ

---

[1] مناقب حافظیہ ص ۱۳۵ [2] مناقب حافظیہ ص ۵۵-۲۵۴ [3] مناقب حافظیہ ص ۱۳۶ [4]،[5] مناقب حافظیہ ص ۱۳۷
[6] " " ۱۵۵ [7] " " ۱۵۵ [8] " " ۱۸۸ [9]،[10] مناقب المحبوبین ص ۱۵۷-۱۵۸

کیا۔ جب تمام نصیحتیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں تو حافظ صاحبؒ لکھنؤ تشریف لائے اور واجد علی شاہ سے کہلا بھیجا کہ ہم جنگ کے واسطے آئے ہیں۔ اگر تجھ کو زور اور بہادری کا دعویٰ ہو تو مقابلہ کر۔ اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ تلواریں ہمراہ لاؤ ہم جنگ کریں گے مصنف مناقب حافظیہ کو بھی تلوار لانے کا حکم ہوا۔ متفکر ہو کر کئی بار فرمایا :

"میرے دل میں آتا ہے کہ اس رئیس سے تخت خالی کرا دوں"[1]

ایک رات شاہ مینا صاحبؒ کی درگاہ میں بیٹھے تھے۔ فرمانے لگے "یہ تختہ کا تختہ اُلٹے"۔ ایک پیر مرد اُن کے قریب بیٹھے تھے۔ بار بار عرض کرتے تھے "ایسا نہ فرمایئے آخر مسلمان ہے"۔ حافظ صاحب اور زیادہ جوش میں آجاتے اور فرماتے :

"اگر نصاریٰ کی عمل داری ہو تو اس حکومت سے بہتر ہے"[2]

حافظ صاحبؒ بحیثیت شاعر | حضرت حافظ صاحبؒ کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی۔ غزلیں اور رباعیاں بہت اچھی کہتے تھے۔ مشتاق تخلص تھا۔ ایک غزل ملاحظہ ہو :

دلم بربود جانانے کہ آنی دلستاں دارد ۔۔۔ شکر لب خندہ نمکینی خمار میکشاں دارد

چو گل رُخ نرگسیں چشمے پریشاں سنبلی زلفے ۔۔۔ لب نازک ترا ز لالہ قد سرو رواں دارد

کہ از تمکین نمی پُرسد ز حالِ زار من دلبر ۔۔۔ خدایا مہرباں سازش کہ دل سنگین چناں دارد

ازیں نامہرباں شوخی چہ آسایش دہد ستم ۔۔۔ کہ با کم التفاتیہا ز من خاطر گراں دارد

بکیشِ دلبری شاید روا دارد دل آزاری ۔۔۔ کہ از مژگان زند پیکاں از ابرو کماں دارد

متاعِ صبر از دلہا کند غارت بیک لمحہ ۔۔۔ مگر در گوشۂ چشمے چنیں ہا مردماں دارد

بیا مشتاق زیں بگذر تو خاکپائے سلیماں شو

کہ ہر کس از جمالِ او کمالِ بیکراں دارد

وصال | حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو آخر عمر میں فالج کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ مرض اس قدر بڑھ گیا کہ ہاتھ پاؤں بے کار ہو گئے۔ عبادت میں بھی بہت دقت ہونے لگی تو فرمایا "جسم بھاڑے کا ٹٹو تھا آخر ساتھ نہ دیا"[3] ماہ ذی قعدہ ۱۲۶۶ھ کو وصال فرمایا۔ کھیری میں سپردِ خاک کیے گئے۔

خلفاء | حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تین خلیفہ صاحب سلسلہ اور صاحب ارشاد ہوئے :

۱۔ مرزا سردار بیگؒ

---

[1] مناقب حافظیہ ص ۲۹۰

[2] مناقب حافظیہ ص ۲۹۰

[3] مناقب حافظیہ ص ۲۹۱

۲ - شاہ حبیب شاہؒ

۳ - مولانا احسن الزماںؒ

یہ تینوں بزرگ حیدرآباد میں رہے اور وہیں سلسلہ کی اشاعت اور توسیع کا کام کیا۔ مولانا احسن الزماں صاحبؒ جید عالم اور بڑے پایہ کے محدث تھے۔ انھوں نے حضرت شاہ فخرالدین صاحبؒ کی مشہور کتاب فخرالحسن کی ضخیم شرح عربی زبان میں "القول المستحسن فی شرح فخرالحسن" کے نام سے لکھی ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے علوم اہلِ بیت کے نام سے ایک کتاب چوبیس جلدوں میں تصنیف فرمائی تھی جس میں انھوں نے اہلِ سنت کا اثبات، روایات اہلِ بیت سے کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا بندوبست نواب محبوب علی خاں نے کیا تھا لیکن صرف ایک جلد طبع ہونے پائی تھی کہ نظام کا انتقال ہو گیا اور وہ کام نامکمل رہ گیا۔[1]

---

[1] مکتوبات مولانا مصباح الحسن صاحب بنام مصنف۔

حضرت خواجہ احمد میروی ؒ

ولادت ــــــــــ علاقہ کوہستان (پنجاب) ۱۲۳۲ھ

وفات ــــــــــ میرا شریف ــــ ۱۳۳۰ھ

خواجہ شاہ سلیمان تونسوی ؒ کے خلفاء میں خواجہ احمد میروی ؒ ممتاز حیثیت کے بزرگ اور اولیاء اللہ تھے۔ شاہ سلیمان ؒ کی وفات کے بعد میرا شریف میں رہ کر رشد و ہدایت کا عام فیض جاری کیا اور ہزاروں بزرگان خدا کو سیراب کیا۔

خاندان | آپ کے آباؤ اجداد کھوکھر قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ سکھوں کے دور حکومت میں اپنے وطن علاقہ دریائے چناب سے ہجرت کر کے علاقہ کوہستان میں مقیم ہو گئے۔ یہ معلوم نہیں کہ کسی گاؤں یا مقام پر فروکش ہوئے۔ خواجہ صاحب ۱۲۳۲ھ پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار کا نام برخوردار صاحب تھا۔

ابتدائی حالات | بچپن ہی میں قرآن کریم کی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ پھر اپنے ماموں کی وساطت سے خواجہ سید محمد سلیمان تونسوی ؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کا شرف حاصل کیا اور مرشد کی وفات کے بعد کچھ مدت وہیں رہے، پھر میرا شریف چلے آئے۔ رسالہ "فیض الاسلام" راولپنڈی میں آپ کے حالات شائع ہوئے جو ملخصاً یہاں پیش کیے جاتے ہیں: (خواجہ صاحب خود فرماتے ہیں) "جب میں چار سال کا ہوا تو گھر سے چار کوس کے فاصلے پر ایک اہل علم کے پاس قرآن شریف کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے قیام کیا۔ والد مرحوم نے ایک سال میری خبر نہ لی۔ استاد صاحب مال مویشی کے مالک تھے۔ میں سبق پڑھ کر دن بھر ان کی بکریاں اور بھینسیں چراتا تھا۔ جب موسم سرما آیا تو استاد صاحب نے اونٹوں کی پشم کا ایک کمبل مجھے مرحمت فرمایا۔ میں رات کے وقت دامن کوہ میں وہی کمبل اوڑھ کر سو رہتا۔ حصول علم کے لیے میں نے یہ تکالیف برداشت کیں اور کلام اللہ ختم کر کے والد مرحوم کے پاس واپس پہنچا۔"

خواجہ صاحب کے ماموں حضرت شاہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارادت مند تھے۔ ان کی وساطت سے آپ اس سرکار میں پہنچے اور عالم طفلی میں پہلی ملاقات سے اتنے متاثر ہوئے کہ عشق و اضطراب کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ پھر بلوغ کے بعد دوبارہ حاضر خدمت ہوئے اور شرف بیعت حاصل کیا۔ چند دن شاہ صاحب کے پاس توقف کر کے وطن واپس ہو گئے۔ پوری زندگی میں بیعت کے بعد چار مرتبہ شرف حضوری حاصل کیا۔ پانچویں مرتبہ گھر سے تونسہ شریف کے ارادے سے روانہ ہوئے تو راستے میں ہی حضرت مرشد طریقت کی رحلت کی خبر سنی۔ سنتے ہی جو حالت ہوئی وہ آپ کی زبان سے سنیے:

جان و جہاں فراموش بر زمیں افتادم از غایت　　　　دنیا بھر کو اور اپنے آپ کو بھول گیا۔ زمین پر گر پڑا

اضطرار و بے قراری ہمہ عالم بدیدہ ایں غم رسیدہ گرد و غبار بود دریں حالت بملامت گریاں بہ تونسہ شریف رسیدم۔

انتہائی بے بسی اور بے قراری کی وجہ سے اس غم رسیدہ کی نظر میں ساری دنیا گرد و غبار ہو رہی تھی۔ اسی پُر ملال حال میں روتا ہوا تونسہ شریف پہنچا۔

آخر اسی اضطراب کی حالت میں وطن واپس پہنچے اور اپنے حصّے کے تمام مال و مویشی رشتہ داروں کے حوالے کرکے الوداع کہی اور ماموں صاحب اور تمام قبیلے کو چھوڑ کر تونسہ شریف کی طرف ہجرت کی۔

چو دل با دلبرے آرام گیرد　　　بوصل دیگرے کے کام گیرد

سات سال سے زیادہ عرصہ تک مزارِ مرشد کے جوار میں رہ کر طلبِ علم میں مشغول رہے، کیوں کہ علم کے بغیر درویشی کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ آپ نے ایک ملفوظ میں فرمایا :

اے درویشو! علوم ظاہر و باطن اور دوسرے کسب کا مدار مادہ فطری کی استعداد و صلاحیت پر ہے، ورنہ استاد اور مرشد کامل تو دل و جان سے چاہتا ہے کہ اس کے شاگرد و مرید تکمیل و امتیاز کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوں۔ لیکن جو حضرت صانع تعالیٰ نے جو لیاقت طبیعت میں رکھی ہے۔ آثار و اطوار اُسی پر مترتب ہوتے ہیں۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست　　　در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

بارش کے زندگی بخش ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن یہی بارش حسبِ استعداد باغ میں پھول اگاتی ہے اور زمین شور میں خس و خاشاک !

خودداری و توکل : طالب علمی کے زمانے میں حضرت خواجہ احمد کی خودداری اور توکل علی اللہ کی پختگی اس روایت سے ظاہر ہے جو آپ نے خود بیان فرمائی :

" نواب بہاول خاں نے حضرت شاہ سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد درویشانِ تونسہ کے لیے کچھ وظیفہ مقرر کرنے کی غرض سے تونسہ شریف سے فہرست اسماء طلب کی۔ علمائے تونسہ نے طالب علموں کے نام تفصیلاً لکھ کر فہرست روانہ کر دی۔ ایک دن استاد مرحوم نے مجھے فرمایا " میاں خوش ہو جاؤ کہ میں نے تمہارا نام بھی درج فہرست کر دیا ہے۔ امید ہے کہ چند روپے ماہوار تمہارے لیے مقرر ہو جائیں گے اور فقر و فاقہ کی تکلیف سے آسودہ ہو کر اطمینان سے حصولِ علم میں لگے رہو گے "۔

جب میں نے جنابِ اُستاد کی زبان سے یہ بات سُنی تو بہت رویا اور عرض کیا :

" میں نے اپنے تمام رشتہ داروں کو اور گھر کے مال و اسباب کو ترک کر دیا ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے بزرگوں کے آستانے پر مقیم ہوا۔ پس اللہ تعالیٰ کی رضا، بزرگوں کا منشا اور تنگی و خوش حالی دل و جان سے قبول کروں گا اور کسی دوسرے سے کسی چیز کی توقع نہیں رکھوں گا۔ آپ نے مجھے احمد خان کی خیرات کا امیدوار کیوں بنا دیا ؟ "

" اُستاد مرحوم نے بہت کوشش کی کہ میں اس خیرات کو قبول کروں۔ لیکن میں اپنے انکار پر جا رہا۔ " آخر انھوں نے

مجبور ہو کر کہا :

"میاں احمد! تیرے ہم نام دوسرے طلبہ بھی ہیں۔ اگر تو نہ لے گا تو تیرے نام کی رقم تقسیم کے وقت دوسرے احمد طالب علم کو دے دوں گا۔"

میں نے عرض کیا :

"میں جناب کی اس تجویز پر بہت خوش ہوں، غلام کی طرف سے اسی وقت دائمی اجازت قبول فرمائیں اور میرا ماہوار وظیفہ بغیر پوچھے جسے چاہیں دے دیا کریں۔"

"اس کے بعد جب تک احمد خاں کی طرف سے وظیفہ ملتا رہا سب لوگ خوشی سے لیتے رہے اور کسی ایک نے بھی انکار نہ کیا اور میرا حصہ استاد صاحب جس کو چاہتے دے دیتے اور میں روکھی سوکھی روٹی اور پھٹے پرانے کپڑوں پر قناعت کر کے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھے ہوئے بالکل خوش و خرم تھا۔"

"تقدیر کی بات ہے کہ خواجگانِ تونسہ شریف کے تمام ارادت مندوں میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ فلاں درویش (خواجہ احمد) نے وظیفہ لینے سے انکار کر دیا ہے اور اللہ پر توکل کیا ہے اور اپنے پیروں کے دروازے پر فقر و فاقہ اختیار کر کے صابر ہو بیٹھا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ تمام لوگ میری طرف متوجہ ہوگئے اور ہر شخص حسب توفیق نقد مال وغیرہ سے میری مدد کرنے لگا۔ یہاں تک کہ میں وظیفہ پانے والوں سے زیادہ خوش حال ہوگیا۔ بفضلہ تعالیٰ دل میں کسی قسم کی تشویش نہ رہی۔ آخر چند سال کے بعد وزیر احمد خاں نے وفات پائی اور سب کا وظیفہ بند ہوگیا۔ بہت پریشان اور دکھی ہوئے۔ بعض یارانِ طریقت نے مجھے کہا کہ اے درویش! تو نے رب العالمین پر بھروسہ کیا تھا۔ احمد خاں کی موت سے تجھے کوئی غم والم نہ ہوا اور جو لوگ اس کے وظیفے کے امیدوار رہتے تھے آج ان کا باپ مر گیا اور یتیم ہوگئے۔ بعض صاحبوں نے مجھ سے بغل گیر ہو کر کہا :

"جو کچھ تو نے سمجھا ہماری عقل و فہم سے باہر ہے۔"

اس کو کہتے ہیں "فقرِ غیور" جو اللہ کے سوا کسی کو خاطر میں نہ لائے، کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے، کسی کی امید نہ رکھے! کسی سے لو نہ لگائے پھر کیوں نہ اللہ کریم اس کا وکیل و کفیل بن جائے؟

خدا خود میر سامان است ارباب توکل را

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، حضرت خواجہ احمد کی فطرت میں بچپن ہی سے یہ شان بے نیازی و خودداری پنہاں تھی جو اپنے موقع پر کامل عزم و ارادہ کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔

ایک اور ملفوظ میں درویش حقیقی کی تعریف فرماتے ہیں: "اگر کوئی شخص درویش صورت لوگوں کے پاس آئے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دے اور دین متین کی رونق کا باعث بنے اور اس کے دیدار سے دلوں میں اللہ کے ذکر و فکر کی رغبت پیدا ہو تو سمجھ لو کہ وہ مرد خدا ہے اور اگر اس کے دیدار سے ایسے آثار سرزد نہ ہوں تو وہ خالی دعویٰ ہے۔ حقائق کی معرفت اور

رموزِ عشق سے محروم:

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　　　پس بہر دستے نباید داد دست

بہت سے ابلیس آدم کی شکل بنائے پھر رہے ہیں۔ پس سوچے سمجھے اور پرکھے بغیر کسی کے مرید نہ بنو۔

فرماتے ہیں کہ:

جس زمانے میں مَیں تونسہ شریف میں مقیم تھا وہاں کی آب و ہوا میرے خلاف ہوئی تو تبدیلی آب و ہوا کے خیال سے تونسہ کی جنوبی جانب گڈریوں کی بستی میں چلا گیا۔ گاؤں کے لوگ ڈیرہ غازی خاں کے ایک سیّد صاحب کے مرید تھے۔ انھوں نے میری خدمت، تواضع میں کوئی کمی نہ کی۔ ایک حاسد نے سید صاحب کو خفیہ اطلاع دی کہ آپ کے مرید آپ سے برگشتہ ہو کر ایک نو وارد درویش کے مرید ہو گئے ہیں، وہ درویش فی الحال یہیں مقیم ہے۔ سیّد صاحب اس وحشت اثر خبر سے غضب ناک ہو کر گڈریوں کی بستی میں پہنچے۔ میری عادت تھی کہ نماز فجر کے بعد گاؤں سے نکل جاتا اور وظائف اور مثنوی شریف کے مطالعہ میں مشغول ہو جاتا۔ اس دن بھی حسبِ عادت باہر نکل گیا اور نماز مغرب سے پہلے مسجد میں آیا۔ پیر صاحب خوش عقیدہ درویشوں کے حلقے میں مسجد میں بیٹھے تھے۔ سب لوگ میری تعظیم و تکریم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مَیں نے مثنوی ایک شخص کے سپرد کی اور لوٹا لے کر وضو کا عزم کیا۔ سید صاحب کے غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ انھوں نے مریدوں سے پوچھا، "یہ شخص کون ہے؟" انھوں نے جواب دیا" یہ درویش تونسہ شریف سے آیا ہے اور یہاں قیام رکھتا ہے۔" سید صاحب نے کمال غضب اور جوش و خروش کے لہجے میں تبلیغ شروع کی:

"اے درویش! تو نے اپنے کو لوگوں میں نیکوکار، زاہد اور اہلِ شرع مشہور کر رکھا ہے اور میں تجھ کو مخالفِ شریعت دیکھ رہا ہوں۔ دن بھر تو صحرا میں رہتا ہے اور نماز باجماعت جو سنّت مؤکدہ ہے اس کا تارک ہے۔ یہ کیا درویشی ہے، شریعت کے سراسر خلاف؟"

مَیں نے جواب میں کہا:

"اے شاہ صاحب! آپ فقہ اور اصول فقہ کے مسائل سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں ورنہ ایسا بے معنی اعتراض نہ کرتے۔ اصول فقہ یہ ہے کہ جہاں فرض اور سنت مؤکدہ آپس میں معارض ہوں، فرض پر عمل کیا جائے اور سنّت کو چھوڑ دیا جائے۔ اس مسجد کے اندر کنواں ہے۔ بیگانہ عورتیں ہر روز پانی بھرنے آتی رہتی ہیں، ان سے چشم پوشی کرنا فرض ہے اس وجہ سے میں نے سنّت کو ترک کیا ہے۔"

شاہ صاحب چپ رہے اور میں نمازِ شام کے وضو میں مشغول ہو گیا۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پیش امام بنایا۔ اس کے بعد جب تک مَیں اس گاؤں میں مقیم رہا۔ شاہ صاحب صدق و محبت اور خاطر داری سے پیش آتے رہے۔"

اس ملفوظ سے خواجہ صاحب کے مذاقِ سلیم، علم غامض اور کمال تقویٰ کا پتہ چلتا ہے۔ مثنوی معنوی تک ہر کس و ناکس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ مثنوی ایک طالب حق کے دل میں محبت الٰہی کا جوش اور روحانی انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ مثنوی تصوف کا بحرِ مواج ہے۔ اس کے غوّاصوں کو ایسے ایسے گہر ہائے آب دار حاصل ہوتے ہیں، جن کے وصف سے نطق و بیان عاجز ہیں۔ اس کے علاوہ خواجہ صاحب فقہ پر بھی محض مناظرانہ عبور نہیں رکھتے تھے، بلکہ اس کی روح افروز گہرائیوں تک پہنچتے تھے اور صحتِ اعمال و عبادات سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی سید صاحب مذکور کی یہ خوبی بھی قابلِ تقلید ہے کہ شریعت سے جواب شافی پا کر کج بحثی نہیں کی اور دل صاف کر لیا۔

تذکرہ نگار مولانا نور حسین رقم طراز ہیں کہ ایک صحبتِ درس میں حضرت خواجہ احمد نے فرمایا:

"طالبِ علم و ہدایت کو چاہیے کہ ہر وقت صدق و ارادت سے خدمت کے لیے آمادہ رہے تاکہ استاد کی توجہ اور شفقت سے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرے اور ممتاز مرتبے پر پہنچے۔ اے درویشو! جب میں تونسہ شریف میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، مجھ سے زیادہ طاقت ور اور بڑی عمر کے بہت سے طلبہ حضرت استاد صاحب سے تعلیم حاصل کرتے تھے، لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ استاد صاحب مسکرا کر مجھ سے فرماتے:

"اے میاں احمد! جب میری نظر تم پر پڑتی ہے تو تمھاری مسکینی کو دیکھ کر میرا دل بہت خوش ہوتا ہے۔"

میں عرض کرتا "الحمد للہ کہ جناب کی خوشنودی ہی مجھے مطلوب ہے اور میرے لیے دونوں جہان کی سعادت ہے۔"

اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ہر وقت حضرت استاد صاحب کے خانگی کاروبار میں مشغول رہتا تھا، جس سے استاد صاحب اور ان کے گھر کے لوگ بہت خوش ہوتے اور دعائیں دیتے تھے۔

ایک سال تیرہ دن تک مسلسل مینہ برستا رہا۔ اکثر لوگوں کے مکان گر پڑے۔ استاد صاحب کا گھر گرا تو نہیں لیکن چھت کے ٹپکنے سے گھر کا تمام اسباب بھیگ کر خراب ہو گیا۔ سردی کا موسم تھا اس لیے تمام طلبا چھت کی لپائی سے گھبراتے تھے۔ مگر میں نے تن تنہا بارش کے باوجود یہ خدمت اپنے ذمے لے لی۔ استاد صاحب اور اہل خانہ میری ہمت و مردانگی سے بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔ اسی دوران میں استاد صاحب بخار میں مبتلا ہو گئے۔ جب کئی دن اسی حال میں گزر گئے تو سب طالب علم دوسری جگہ پڑھنے لگے۔ میں استاد صاحب اور ان کے گھر والوں کی خدمت میں مشغول رہا۔ جب ان کو صحت ہو گئی اور میں ان کے کپڑے دھو کر لایا اور غسلِ صحت کرایا تو انھوں نے فرمایا:

"طبیعت صحت مند اور خوش حال ہے۔ تم اشراق کے نفل ادا کرنے کے لیے مسجد میں جاؤ اور دیکھو! جلد واپس آ جانا۔"

میں خوش خوش مسجد میں پہنچا۔ میرے بعد استاد صاحب مُلکِ آخرت کو روانہ ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مہربان و شفیق استاد کی رحلت سے مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ جب تک میں تونسہ شریف میں رہا، استاد صاحب کے اہلِ خانہ

کی خدمت میں وابستہ حاضر رہا۔ . . . . ان کی وفات کے بعد ضرورتاً دوسری جگہ سے سبق پڑھنا شروع کیا "

ایک دن اپنی تعلیم کا ذکر فرما رہے تھے۔ اسی ضمن میں ارشاد فرمایا :

" جس زمانے میں یہ فقیر تونسہ شریف میں مقیم تھا، فارسی نظم و نثر اور فقہ کی اکثر کتابیں پڑھیں اور خوب یاد کرلیں۔ چنانچہ نو سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد سیاحت کا شوق پیدا ہوا۔ ایک طالب علم کو ساتھ لیا اور ملتان پہنچے۔ ایک مسجد میں قیام کیا۔ اس محلے کے لوگ سخت بے مروّت تھے۔ ہم نے خدا پر بھروسہ کیا اور حجرے میں سامان رکھ کر ایک عالم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور " کنزالدقائق " کی آخری جلد پڑھنی شروع کردی۔ استاد صاحب نے بہت شفقت اور توجہ سے سبق پڑھایا۔ ہم سبق پڑھ کر اپنی قیام گاہ پر پہنچے۔ دوسرے دن سبق کے لیے پھر حاضر ہوئے تو استاد صاحب نے ہماری وجہ معاش کے متعلق دریافت فرمایا۔ عرض کی کہ :

" اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی وسیلہ نہیں۔ چند دن سے ہم دونوں درویش صبر و فاقہ کشی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں پاتے "

استادِ محترم نے ازراہِ شفقت و عنایت فرمایا کہ فلاں محلے میں شیخ بہاء الحق رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے ایک صاحب ہیں جو طلبا اور مساکین پر بہت مہربانی فرماتے ہیں، ان کے پاس جاکر عرض کرو تاکہ تمھاری روٹی مقرر ہوجائے اور تسکین و فراغت سے تحصیلِ علم میں لگ سکو "

مجھے یہ مشورہ پسند نہ آیا، میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسرے دن انھوں نے پوچھا کہ " حضرت بہاؤ الحق کے پوتے کے پاس گئے تھے ؟"

عرض کیا ۔ " نہیں "

انھوں نے غضب ناک ہوکر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ " اٹھو میں تجھے اُن کی خدمت میں لے چلوں "

میں مجبوراً ساتھ ہولیا۔ جب اُن کے قریب پہنچے تو میں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی ۔ " مجھے بھوکا مرنا منظور ہے، رازقِ حقیقی کے سوا کسی اور کے دروازے پر جانے سے مجھے معاف فرمائیں "

استاد صاحب اور ہم دونوں واپس مسجد استاد میں پہنچے۔ پھر ہم اپنی قیام گاہ پر آگئے۔ میرے رفیق طالب علم محمد یعقوب کا بھوک سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ میں نے اسے بہت تسلی دی۔ چند دن کے بعد اسی محلے کے لوگوں نے ہمارا کھانا مقرر کردیا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت دی کہ بسا اوقات دوسرے طالب علم ہمارے پاس آکر روٹی کھاتے تھے ۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت خواجہ صاحب کی تربیت کر رہی تھی اور آگے چل کر ان سے کوئی بڑا کام لینا پیشِ نظر تھا "

۵۔ محرم ۱۳۳۱ھ بروز چہار شنبہ تیرہ دن کی علالت کے بعد وفات پائی اور سیرا شریف میں اپنے حجرہ کے اندر دفن ۔

ہوئے۔

میرا شریف ایک چھوٹی سی بستی ہے جو کیمبل پور کی تحصیل پنڈی گھیب میں واقع ہے۔ میرا شریف جانے کے لیے چھب ریلوے سٹیشن پر اُتر کر نو میل فاصلہ پیدل یا سواری پر طے کرنا پڑتا ہے۔

خواجہ صاحب کی وصیت کے مطابق خواجہ مولوی احمد خان ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ آپ اعوان خاندان کے چشم و چراغ تھے ۱۲۸۷ھ میں بمقام چکڑالہ ضلع میانوالی پیدا ہوئے اور ۲۱ صفر ۱۳۵۱ھ (۲۲ جولائی ۱۹۳۲ء) وفات پائی۔ حضرت خواجہ احمد میروی کے پہلو میں مدفون ہیں۔ آپ کا عرس ۱۹ - ۲۱ صفر کو منعقد ہوتا ہے۔

ل " عرس اور میلے " مصنفہ ارمان سرحدی۔

حضرت وارث علی شاہؒ

ولادت ——— نیشاپور ۱۲۳۲ھ

وفات ——— رسول پور ضلع بارہ بنکی

حاجی حافظ سید وارث علی شاہ صاحب قدس سرہ العزیز سیّد حسنی الحسینی ہیں۔ نیشاپور قدیم وطن تھا۔ حضرت کے مورث اعلیٰ جناب سید اشرف علی ابی طالب صاحب نیشاپوری ہندوستان تشریف لائے اور قصبہ رسول پور ضلع بارہ بنکی میں قیام فرمایا۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت کے جد امجد جناب سید عبدالاحد صاحب رسول پوری دیوہ چلے آئے اور یہاں کی زمینداری کا بڑا حصہ آپ ہی کا تھا۔

حضرت کے والد ماجد سید قربان علی شاہ صاحب ایک بڑے زمیندار کی حیثیت سے دیوہ میں رہتے تھے اور یہ سعادت قصبہ دیوے کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی کہ حضرت امام الاولیا کا مولد و مسقط الراس وہ قرار پایا۔

ابھی حضرت منصۂ شہود پر جلوہ افگن نہیں ہوئے تھے کہ حضرت کے والد ماجد نے دنیا سے رحلت فرمائی۔ جب اقدس عالم وجود میں آئے۔ اس وقت تک بارہ سو تینیس سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے گزر چکے تھے۔ ابھی حضور سن رشد کو نہ پہنچے تھے کہ جناب والدہ ماجدہ کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ اور اس طرح حضرت نے اپنے نانا سرور دو جہان رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سنّت ادا فرمائی۔

جب حضور کا سن پانچ سال کا ہوا تو مکتب نشینی کی رسم ادا کی گئی اور ایک مولوی صاحب اُس وقت کے دستور کے موافق دروازے پر پڑھانے کے لیے مقرر کیے گئے، مگر حضرت نے قرآن پاک کے سوا کوئی درسی کتاب نہ پڑھی۔ مولوی صاحب کو گھر سے زر و مال لا کر دے دیتے تھے اور مولوی صاحب اس کے لالچ کی وجہ سے نہ خود کچھ کہتے تھے نہ کسی مربّی اور نگران سے تذکرہ کرتے تھے۔ حضور نے سات سال کی عمر میں قرآن پاک یاد فرمالیا تھا۔

اپنی تعلیم کی نسبت حضرت فرمایا کرتے تھے کہ مولوی صاحب کو غلّہ گھی روپیہ جو مل جاتا تھا لا کر دے دیا کرتے تھے کہ یہ ہم کو پڑھنے کی تکلیف نہ دیں اور مولوی صاحب ہم سے خوش رہا کرتے تھے۔

حضرت تعلیم اور رواج کی تربیت سے سخت متنفر تھے اور اس کا سبب یہ تھا کہ ہوش سنبھالتے ہی رگ و پے میں عشق و محبت کے جذبات نظر آتے تھے۔ کعبہ مکرمہ بالخصوص مدینہ منورہ کا نام سُن کر از خود رفتہ ہو جاتے۔ راتوں کو میدانوں میں نکل جاتے اور صبح تک حق حق سے کام رکھتے۔ اِس بیقراری اور اضطرار کا حال جب حضرت مولانا مولوی سید خادم علی شاہ صاحب نے سُنا تو حضرت کو لکھنؤ اپنے پاس بُلالیا۔ حضرت خادم علی شاہ صاحبؒ حضرت کے رشتے میں بہنوئی ہوتے تھے اور سلسلہ قادریہ و چشتیہ

کے سر پر آوردہ صوفی اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔ فرطِ محبت سے اپنے عزیز بھائی کو تمام و کمال مراحل سلوک طے کرائے اور جب وقت رحلت آگیا تو ۱۳ صفر ۱۲۵۲ھ کو اپنے خاص حلقہ بگوش مریدانِ اخلاص کو طلب فرما کر سب کے سامنے حضرت پیرومرشد کو خاص خاص ہدایتیں فرما کر دنیا سے حجاب کر لیا۔ آخر کار تمام اصحاب کی رائے کے موافق حضرت پیرومرشد کے دستارِ خلافت باندھی گئی۔

اب ذوق و شوق کے بادل اُمنڈ اُمنڈ کر برسنے لگے اور سرور و انبساط کی ہوائیں چلنے لگیں۔ دیارِ محبوب سے پیام و سلام آنے لگے ع قدم عشق پیشتر بہتر، کی صدائیں کانوں میں ترنم ریزی کرنے لگیں۔ انھیں جذباتِ روحانی اور کیفیات گوناں گوں میں حضرت نے ایک رات خواب دیکھا کہ مولانا سید خادم علی شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "تم سفر کرو۔"

اب کیا تھا اجازت پاتے ہی رختِ سفر باندھا، یعنی متوکلاً علی اللہ گیارہ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ کو چل کھڑے ہوئے۔

حالاتِ سفر پا پیادہ کوچ او رمقام فرماتے ہوئے جے پور پہنچے۔ اُس وقت کے حکمران جناب مہاراجہ صاحب نے حاضر ہو کر مع رانی صاحبہ کے شرف قدمبوسی حاصل کیا اور مرید ہو کر دارین کی فلاح حاصل کی۔ ریاست جے پور سے حضرت قطب الاقطاب خواجہ اجمیریؒ کے آستانہ مبارک پر حاضر ہو کر کسبِ سعادت فرمایا۔

لطیفہ حضرت پیرومرشد جب آستانہ خواجہ غریب نواز پر حاضری کے قصد سے اندر چلے تو پہلے ہی پھاٹک پر ایک خادم نے روکا اور کہا صاحبزادے یہ مزار پاک مطہر و مقدس حضرت خواجہ صاحب کا ہے۔ آپ اس دلیری سے اندر جا رہے ہیں کہ جوتہ تک پاؤں سے نہیں اُتارا" ع بے ادب پا منہ ایں جا کہ عجب درگاہ است

حضور نے جوتہ اُتار کر پھینک دیا اور فرمایا کہ اگر یہ ایسی بُری چیز ہے تو آج سے ہم اس کو ترک کرتے ہیں۔ اُس دن سے پھر حضور نے کبھی جوتہ نہیں پہنا۔

آستانہ شریف کی حاضری جب پوری ہو چکی تو حضرت آگے بڑھے اور گجرات کے خطے کی سیر فرماتے ہوئے بمبئی تشریف لائے۔ بمبئی میں بھی بڑے بڑے ملک التجار مرید ہوئے اور چند روز میں ہر طبقے کے لوگ شیدا اور جان نثار نظر آنے لگے۔

جہاز کا واقعہ حضرت جس جہاز پر بیت اللہ شریف کو بمبئی سے روانہ ہوئے، اُس کے ناخدا محمد تقی تھے۔ جناب اقدس کو تین شبانہ روز کھانا کھانے کی نوبت نہ آئی اور جہاز دفعتہً رُک گیا۔ ناخدا صاحب کو سخت پریشانی ہوئی۔ اسی رات کو محمد ضیاء الدین صاحب ملک التجار نے خواب دیکھا کہ حضور پُرنور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے ضیاء الدین تم آرام سے کھانا کھاتے ہو اور ہمسایہ کی خبر نہیں لیتے۔ بیدار ہو کر تمام مسافرانِ جہاز کو دعوت کر دی، مگر حضرت پیرومرشد برحق اپنی جگہ سے نہ اُٹھے۔ دوسری رات کو پھر ملک التجار نے خواب دیکھا کہ حضور انور صلعم فرماتے ہیں "تم تنہا خور ہو" ملک التجار صاحب نے بیدار ہو کر خیال کیا کہ کوئی ایسا [illegible] اور متوکل مسافر جہاز پر ہے جو دعوتِ عام میں شرکت سے عار رکھتا ہے۔ انھوں نے پھر دعوتِ عام کی، اور جب مسافر دسترخوان دعوت پر آ گئے تو رجسٹر سے نام ملائے۔ حضور کا نام نامی جب دیکھا تو آپ کو موجود نہ پایا۔ تلاش سے حضور

ایک گوشہ میں ملے، دیکھتے ہی محو جمال ہوگیا۔ اور بہت منت وسماجت سے دو تین لقمے حضور نے تناول فرمائے۔ اُس وقت جہاز چلنے لگا۔ عدن اور جدے میں حضور نے تمام مزاروں پر تشریف لے جاکر فاتحہ پڑھا اور ۲۹ شعبان ۱۲۵۳ھ کو بیت اللہ شریف میں داخل ہوئے اور ایام حج تک وہاں قیام فرمایا۔

روایت | حضور پیر و مرشد یکم رمضان المبارک کو جب بیت اللہ شریف میں حاضر ہوئے تو در کعبہ پر ایک صاحب سلوک بزرگ تشریف رکھتے تھے، حضور کو دیکھ کر فرمایا کہ "بہت دیر آنے میں کی" یہ کہہ کر اُن بزرگ نے دنیا سے رخصت فرمائی۔ حضور نے ان کی تجہیز و تکفین فرمائی۔ بیت اللہ شریف میں ساڑھے تین مہینے سے زیادہ حضور حاضر رہے اور یہاں کسب و ریاضت سے بہت کچھ فائدہ خلق اللہ کو پہنچایا۔ جب مدینہ طیبہ میں دیدۂ دولت سرورِ کائنات پر حاضر ہوئے تو مالامال ہوگئے۔ مدینہ طیبہ میں حضرت کی حالت جذب و سلوک میں جو کچھ رہی اس کا اعادہ دشوار ہے۔ مدینہ منورہ میں ایک مدت تک قیام فرمانے کے بعد حضور اقدس بیت المقدس، شام، دمشق، بیروت، بغداد، کاظمین، نجف اشرف، کربلائے معلیٰ کے سفر میں مدتوں رہے اور ایران کے پایۂ تخت اور اس کے تمام بڑے شہروں میں مقیم رہ کر قسطنطنیہ تشریف لے گئے۔ ایک مدت تک یورپی ترکی اور روس کی سیاحت میں رہے اور زمانۂ حج میں پھر بیت اللہ شریف تشریف لائے اور بعد فراغت حج حبش اور افریقہ کی سیاحت فرمائی۔

احرام | احرام باندھ کر اگر کسی نے پھر اپنا دنیاوی لباس نہیں پہنا تو وہ جناب حاجی صاحب قبلہ ہی ہیں۔ ایک زمانہ جانتا ہے کہ یہ خصوصیت بارگاہِ ایزدی سے آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوئی، ایک سچے عاشق خدا اور رسول کی شناخت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ جب احرام باندھ کر اپنی حالت عاشقانہ بنائی تو پھر اس کو ترک کرتا کیسا۔ اور دنیا میں احرام صحابۂ رسول اللہ صلعم اور بزرگانِ دین کے سوا تنا اچھا اور بھلا بھی کسی پر نہ معلوم ہوا ہوگا۔ لاکھوں بناؤ ہزاروں سنگار تصدق اور نثار تھے۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ بلند و بالا سرو قد سر سے پاؤں تک تمام اعضا سڈول اور طلائی رنگ۔ آنکھیں ایسی نہ دیکھیں نہ سُنیں ع

اُٹھ گئی آنکھ تو کوسوں کوئی ہشیار نہ تھا!

نورانی پیشانی، خوبصورت بھویں، چہرہ ماہتاب سے زیادہ روشن اور بے داغ۔ اس حُسنِ خداداد پر شنگرفی، زرد، سیاہ، مائشی رنگ کا احرام لاکھوں بناؤ پیدا کرتا تھا۔ ہزاروں فقراء اب بھی احرام باندھتے ہیں مگر نہ کوئی ایسا حُسنِ خداداد رکھتا ہے، نہ احرام کسی کے جسم پر بھلا معلوم ہوتا ہے۔

حاجی صاحب | اسی طرح حاجی صاحب کا معزز خطاب درگاہ احدیت سے کسی کو نہیں نصیب ہوا۔ کروڑوں مسلمان حج کرتے ہیں اور حاجی مشہور ہوتے ہیں لیکن "حاجی صاحب" کا معزز لقب ہمارے پیر و مرشد کے سوا کسی حاجی کو نہیں ملا۔ ہندوستان کے کسی حصے میں جائیے، جہاں فقراء کا ذکر ہوگا تو حاجی صاحب سے صرف حضرت پیر و مرشد ہی مراد ہوں گے۔ ہر طبقے [illegible] یہاں تک کہ حضرات صوفیائے کرام کے حلقوں میں بھی حضور کا نام نہیں سُنا جاتا۔ صرف حاجی صاحب سے سمجھ لیا جاتا ہے کہ حضور کا ذکر [illegible]۔ یہ بھی ایک تصدیق اس امر کی ہے کہ حضور نے جب راہ خدا میں قدم رکھا اور ذوق و شوق سے تمام منزلیں طے فرماتے ہوئے منزل [illegible] کے

قریب پہنچے اور احرام باندھا تو خدا تعالیٰ نے احرام کی طرح حاجی صاحب کا بھی معزز خطاب مخصوص کر دیا۔

فرشِ خاک | جناب حاجی صاحب جب کربلائے معلیٰ میں حاضر ہوئے اور دیکھا کہ یہاں کچھ اور ہی سامان ہے۔ سچے عشق و محبت کے بحرِ ذخار کے تلاطمِ عظیم کے امواج فلک الافلاک تک جاتے ہیں اور بامِ عرش سے ہر وقت یہ صدا آتی ہے:

ع کشتگانِ عشق را از غیب جانے دگر است

یہاں سے زیادہ کسی جگہ عشق و عاشقی کے راز و نیاز نظر نہیں آتے اور ایک سچے عاشق اور سرفروش محبت کرنے والے کو اگر دیکھنا ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے کو دیکھو۔ اور اگر یہ دیکھنا ہو کہ عاشق صادق کس طرح جانچا جاتا ہے اور کس طرح مصائب و آلام میں گرفتار ہو جاتا ہے تو دشت کربلا کے اُن مظالم اور مصائب کو یاد کرو، جو دس دن تک ایک عاشق جانباز پر نازل ہوتے رہے۔ دنیا کی تاریخ نہیں بتلا سکتی کہ ایسے مصائب اور اس نوعیت کے ظلم کسی پر ہوئے ہیں۔ رضا و تسلیم، صبر و شکر کی تاریخ دیکھتے ہو تو صرف اہل بیت اطہار علیہم السلام کی نورانی اور مقدس صورتیں دیکھو۔ اور ان میں بھی خاص طور پر حضرت امام حسین علیہ السلام کی ذات مقدس نمایاں نظر آئے گی۔ یہ صبر و شکر، یہ رضا و تسلیم کسے نصیب ہوتے ہیں۔ حضور حاجی صاحب نے مرقدِ انوار میں جب اپنے جدِ امجد کو آرام و راحت سے دیکھا تو اس وقت دنیا نظر میں بالکل ہیچ ہو گئی اور عہد فرما لیا کہ آج سے پلنگ یا تخت پر سونا حرام ہے اور ترکِ لذات کی دل میں ٹھان لی۔ دنیا سے نفرت خلقی تھی مگر مزار پاک پر انوار کی حاضری سے استقلال و استحکام عزم میں آ گیا اور خیال فرمایا کہ ایسے عاشق جانباز اور محبِ صادق الوداد کی تقلید فرض ہے۔

سر داد و نداد دست در دستِ یزید حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

روزہ | حضور اقدس نے جس طرح کربلائے معلیٰ میں فرشِ خاک اختیار کیا، اسی طرح شہدائے کربلا کی سنت میں روزہ رکھنا اختیار فرمایا۔ شام کو صرف پانی یا کسی چیز سے افطار فرماتے، مگر کوئی افطاری غذا کی قسم سے نہ ہوتی۔ روزہ شکنی غرض تھی۔ ہاں ساتویں دن گولر کی اُبلی ہوئی ترکاری کسی قدر زیادہ استعمال فرماتے تھے۔ یہ سنت حضرت مولانا و سیدنا حضرت مخدوم صابر قدس سرہ العزیز کی تھی، سلسلہ صابریہ سے بہت بڑا تعلق حضرت اقدس کا تھا، اس لیے بہت سے صفاتِ ظاہری اور معاشرت حضرت مخدوم صاحب کے حضور میں پائے جاتے تھے اور اکثر جذبات اور ولولے ہم لوگوں نے جو دیکھے اور حضرت مخدوم صاحب کے حالات سے مطابقت کی تو معلوم ہوا کہ سلسلۂ صابریہ میں حضرت مخدوم صاحب کے بعد اگر کوئی بزرگ اور مقدس ذات ہے تو حضرت اقدس ہی کی ذات بابرکات ہے۔ گولر کی ترکاری کا سلسلہ ہندوستان کی واپسی پر شروع ہوا اور سالہا سال تک جاری رہا۔

سفر کی نوعیت | یہ بات بھی بہت حیرت انگیز ہے کہ ہندوستان اور اس کے باہر ممالک عرب و عجم اور یورپ اور بہت بڑے ایشیا کے حصے کا سفر حضور اقدس نے پا پیادہ طے کیا۔

حضور اقدس نے جب ہندوستان سے کوچ فرمایا تو بمبئی تک پا پیادہ تشریف لے گئے۔ یہ ایک بہت معمولی بات ہے، لیکن اگر غور کیا جائے اور اس اہمیت پر نظر ڈالی جائے تو ایسے التزام اور اہتمام کے ساتھ کہ ساٹھ ستر برس تک کبھی کسی سواری

حضور سوار نہیں ہوئے اور جس جذبے کے ساتھ گھر سے نکلے تھے اسی جذبے کی پوری تکمیل ان مبارک اور مقدس مقامات پر کی، جن کی برکت اور فیضانِ دوام کا وعدہ خدا نے کیا ہے تو واپسی پر ہندوستان میں بھی حضور اقدس نے پورا کر دیا کہ کسی جاندار کو حتی الوسع تکلیف نہ دی جائے گی۔ اس لیے کہ احرام باندھنے کے بعد (خانہ کعبہ میں ہمیشہ کے لیے خدا کا یہ حکم ہے کہ کسی جانور کو ایذا نہ دی جائے)

ترکِ لذات | بچپن سے حضور اقدس دنیا کی لذتوں سے نفرت کرتے تھے۔ کوئی چیز حضور کو مرغوب و پسند نہ تھی۔ ترکِ لذات کی سند اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ جب لکھنؤ تشریف لے جانے لگے تو اپنی زمینداری کے تمام کاغذات سرا ہی تالاب میں ڈال دیے اور دادی صاحبہ کے فاتحہ سوم میں بہت کچھ فقیروں اور غریبوں کو تقسیم کر دیا۔ زیور اور نقد روپیہ جو تھا وہ سب خدا کی راہ میں بانٹ دیا۔ علائق دنیا سے کوئی واسطہ کبھی نہ رکھا۔ شیریں اور نمکین یا خوش کیف غذاؤں سے کبھی رغبت نہ رکھی۔ ہم لوگوں کا تجربہ اس معاملے میں زیادہ ہے، اس لیے ہمارا بیان ایک مستند بیان ہوگا۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اعلیٰ سے اعلیٰ کھانے لوگ پکوا کر لاتے تھے اور دسترخوان پر چن دیا کرتے تھے۔ اکثر سب کے کھانوں سے تھوڑا تھوڑا ملا کر ایک دو لقمے تناول فرماتے تھے۔ یہ ایک طریقہ سنتِ نبویؐ کا تھا، مگر یہ تمیز نہ ہوتی تھی کہ یہ کیا چیز ہے۔ اور کون کھاتا ہے۔

تمام عمر حاجی صاحب نے شادی نہیں کی۔ آپ کے بارے میں کسی ایک آدمی نے بھی کسی قسم کا شک و شبہ عفت و عصمت کی نسبت نہیں کیا۔ یہ ترکِ لذت کی ایک بڑی مہم ہے کہ تمام عمر حضور اقدس کی صحبت میں ہر قسم کی عورتیں ہر شخص اور ہر طبقے کی مستورات آتی جاتی تھیں مگر کبھی کسی عورت یا مرد کی نسبت میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ حضور اقدس کی نسبت بدگمانی ہی کرتا۔

ممالکِ غیر کی سیاحت | اس سفر میں قسطنطنیہ کا سفر قابلِ تذکرہ اس لیے ہے کہ سلطان عبدالمجید خاں صاحب نے حضرتِ اقدس سے بیعت کی اور کئی مہینے حضرت اقدس قسطنطنیہ میں مقیم رہے۔ حضور اقدس عبداللہ آفندی صاحب کے گھر مقیم تھے۔ وہ حضرت اقدس کے مرید تھے۔ ایک دن سیر باغ سلطانی کے لیے حضرت اقدس تشریف لے گئے، وہاں حضرت سلطان عبدالمجید خاں آئے اور حضرت اقدس کو دیکھ کر محوِ جمال باکمال ہو گئے۔ ایوانِ شاہی میں حضرت کو لے آئے اور خود مرید ہوئے، اور اعیانِ دولت کو مرید کرایا۔ جرمنی کا سفر اس لیے قابلِ ذکر ہے کہ حضرت اقدس جرمنی میں پرنس بسمارک کے مہمان رہے اور مسٹر سید شرف الدین صاحب جج ہائی کورٹ کلکتہ سے فرماتے تھے کہ ہم جرمن گئے تھے اس وقت پرنس بسمارک اتنے بڑے آدمی نہ تھے جتنے اب بڑے ہو گئے ہیں۔ ہم انھیں کے گھر مہمان رہے تھے۔ آنریبل موصوف سے حضرت اقدس شہزادہ سرویا کی بھی تعریف کرتے تھے اور انداز کلام سے معلوم ہوتا تھا کہ شہزادہ موصوف نے بیعت بھی کی تھی۔ ممالک غیر کی سیاحت کے بہت دلچسپ واقعات اکثر جذب کی حالت میں حضرت اقدس بیان فرمایا کرتے تھے۔ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نے ۱۲۳۶ھ سے ۱۲۴۱ھ تک سفر ممالک غیر کے کیے۔

وطن کی واپسی | حضرت اقدس جب وطن آئے اور دیوے میں قدم رکھا تو ملاحظہ فرمایا کہ گھر کھنڈر ہو گیا ہے۔ علاقے پر

عزیز وا قارب قابض ہو چکے ہیں۔ جدھر حضور جاتے ہیں کوئی پہچانتا بھی نہیں۔ حضرت اقدس مسکرائے اور ہنسے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم
علاقہ اور جائداد کی غرض سے آئے ہیں اور تالاب سواری کے پُل پر جاکر بیٹھ گئے۔ اس لیے کہ . . . . . اسی تالاب میں تمام کاغذات
علاقے کے ڈبو کر تشریف لے گئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد منو شاہ حضرت کے برادر رضاعی آئے اور انھوں نے حضرت کو پہچانا۔ گھر
چلنے پر اصرار کیا، مگر حضرت راضی نہ ہوئے۔ تب وہ چنے کی روٹی اور چولائی کا ساگ لائے۔ دو چار لقمے حضرت نے ان کی خاطر
سے تناول فرمائے اور وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔ ابنائے وطن کی یہ حالت دیکھ کر حضرت اقدس کو افسوس اور ملال ضرور ہوا
محض اس وجہ سے کہ دنیا پر لوگ اس طرح جان دیتے ہیں کہ اپنے عزیز کو پہچانتے تک نہیں۔ اب حضرت اقدس نے قرب و جوار کی
سیر شروع کی۔ ۱۸۵۸ء تک حضرت نے تمام ہندوستان اور ریاستوں اور جنگلوں اور پہاڑوں کو چھان ڈالا۔ کوئی بڑے سے بڑا
پہاڑ اور جنگل بیابان اور شہر حضرت کی سیاحت سے نہیں محفوظ رہا۔

واقعاتِ سفر جو جو عجائب و غرائب حضور اقدس پر ان ایام سفر میں پیش آئے وہ اس کتاب میں بصراحت نہیں
لکھے جا سکتے۔ مگر اس موقع پر مختصراً چند حالاتِ سفر پیش کیے جاتے ہیں۔

ایک دن حضور فتحپور میں رونق افروز تھے، فرمایا کہ حال سفر کا کہیں۔ عرض کیا گیا کہ ضرور ارشاد ہو۔ فرمایا کہ ہم کعبہ شریف
کے سفر میں ایک مقام پر پہنچے۔ ایک قوال کے مکان پر گئے۔ دروازے پر وہ قوال بیٹھا تھا۔ اُس نے کہا آئیے اُستاد زادے۔
اُس وقت ہم کچھ گُن گناتے تھے، وہ سمجھا کہ قوال ہیں۔ اُس نے کہا آپ ٹھہریے میں ابھی آتا ہوں۔ کسی رئیس کی لڑکی کی نسبت کے لیے
لوگ آنے والے تھے، وہ وہاں گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک چوبدار آیا، اُس نے کہا کہ آپ کو رئیس نے یاد کیا ہے، چلیے۔ ہم گئے۔
صاحب سلامت کے بعد ہم کنارے فرش پر بیٹھ گئے۔ اُس قوال نے کہا کہ کچھ سُناؤ۔ رئیس نے بھی کہا کہ کچھ کہو۔ ہم نے کہا کہیں
کہا ہاں سناؤ۔ تب ہم نے کہا کہ سنائیں۔ تم جانو۔ کہا ہاں۔ پھر ہم نے کہا سُناتے ہیں۔ پس ہم نے ایک چیز اٹھائی، کوٹھے پر لڑکی تھی
اور مستورات تھیں، وہ لڑکی غش ہو کر گر پڑی اور کُرتہ چاک کر ڈالا۔ غل ہوا کہ تم نے جادو کیا۔ ہم نے کہا کہ کیونکر معلوم ہوا کہ جادو ہے
جب تم نے کہا کچھ کہو تو ہم نے کہا۔ غرض کہ اس لڑکی نے کہا کہ میں بیاہ نہ کروں گی، جس شکل کو میں نے دیکھا ہے، اسی صورت پر میرا
خاتمہ ہو۔ میں نے سب دنیا پر لعنت کر دی۔ اگر خدا بھی مجھ کو ملے تو اس صورت میں ملے۔ پھر وہ فقیر ہو گئی۔ ہم وہاں سے چل دیے۔

ایک روز حضور نے فرمایا کہ ہم سیر کو روس کی جانب چلے۔ راستہ میں مولوی عارف علی ایک جہاز پر جو ہمارے ہمراہ آئے
تھے ملے، ساتھ ہوئے۔ صحرا میں کہ جہاں کوسوں پانی کا نام نہ تھا گذر ہوا تو مارے پیاس کے مولوی صاحب کی زبان سوکھ کر
کانٹا ہو گئی اور دم لبوں پر آگیا۔ مولوی صاحب نے کہا حضرت مارے پیاس کے اب دم نکلتا ہے، اس وقت تو بھولی ہے۔
بس ہم نے ایک مقام پر اونچی زمین بالو کی پھٹی ہوئی دیکھی۔ تو مولوی صاحب سے کہا کہ اس کو کھودو۔ مولوی صاحب نے کھودا تو
اس میں سے ایک تربوز نکلا۔ بیچ سے کاٹ کر ہم نے بھی پانی پیا اور مولوی صاحب کو بھی پلایا۔ سو کوس گرد میں وہاں پانی نہیں
ہوتا۔ یہی تربوز زمین میں قدرتی پیدا ہوتے ہیں۔ جب ہم روس میں پہنچے تو لوگ آئے۔ اکثر لوگوں نے شکایت کی کہ بادشاہ کی لڑکی

ایک کوٹھڑی میں برہنہ باغ میں رہتی ہے۔ نہیں معلوم کیا آسیب ہے۔ ہم نے کہا ہم اس جھگڑا کو کیا جانیں۔ سہ پہر کو ہم تفریحاً باغ کو گئے۔ مولوی صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ باغ کے پھاٹک پر منشی اور سپاہی پہرے پر تھے۔ باغ کے اندر جانے کو منع کیا گیا۔ کو منظوری اجازت دی۔ ہم نے قدم پھاٹک میں رکھا تو اُس لڑکی نے ہوش میں آ کر کپڑے پہنے۔ ہم گئے تو اس نے اپنے طریق سے سلام کیا۔ ہم فرش قالین پر لیٹ گئے۔ اُس نے مسہری پر لیٹنے کو اصرار کیا۔ ہم نے کہا یہ فقیروں کو زیبا نہیں ہے۔ اُس نے پوچھا آپ کسی کے عشق میں فقیر ہوئے ہیں؟ ہم نے کہا ہاں۔ پوچھا کہ کیا وہ بہت حسین ہے۔ ہم نے کہا ہاں۔ اُس نے کہا نام اس کا کیا ہے۔ ہم نے کہا کیا کروگی پوچھ کے۔ اُس نے کہا اگر بہت حسین ہے ہم بھی اُس سے عشق کریں گے۔ ہم نے کہا مشکل ہے۔ اُس نے کہا بتلائیے آپ کا طریقہ کیا ہے اور وہ کون ہے۔ ہم نے کہا ہمارا طریقہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اور اس کا نام خدائے عز و جل ہے۔ غرضکہ کلمہ پڑھا اور کہا ہم سے اب کسی سے واسطہ نہیں ہے بجز اس صورت کے کہ ہم نے سب پر لعنت کر دی۔ اُس نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ ہمیں تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہم خدا کے ہو گئے۔ وہاں سے کچھ تنخواہ اس کے نام اور کچھ ہمارے نام لکھ کر آئی۔ ہم نے کہا کہ ہم روپیہ پیسہ لے کر کیا کریں گے، ہم لعنت کر چکے، واپس کر دی۔ اس کی کچھ تنخواہ تھی، اس سے کہا کہ خدا کی راہ میں خرچ کرو اور غریبوں، محتاجوں کو دو اور غریبوں کے لڑکوں کی شادی کر دیا کرو کہ خدا خوش ہوگا۔ چنانچہ وہ ایک قریہ موسومہ محمدیہ میں بیٹھ رہی۔ نام اس کا زوفہ تھا۔ چھ سات سال تک زندہ رہی، خدا خدا کیا کی۔ بعد اس کے انتقال ہو گیا، پہاڑ پر اُس کی قبر بنی ہے۔

ایک مرتبہ حضور نے فرمایا کہ روس کے آگے ایک پہاڑ ہے، وہاں گئے۔ ایک شخص ہمارے ساتھ تھے، پہاڑ میں راستہ تھا۔ ہم تیز جا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ جو تھے انھوں نے منع کیا کہ اس جنگل میں جنگلی آدمی رہتے ہیں، تیز چلنے سے وہ جانتے ہیں کہ ہم کو مارنے آتے ہیں تو وہ کاٹ کھاتے ہیں۔ ان کے دانتوں میں زہر ہے۔ آدمی مر جاتا ہے۔ لہٰذا آہستہ آہستہ چلیے۔ غرضکہ اس جنگل میں ایک مقام پر کمل بچھا کر ہم بیٹھے تو تمام زن و مرد، پیر و جوان نہایت حسین مگر برہنہ بالوں سے تمام بدن پیر تک ڈھنکا ہوا ناخون بہت بڑے بڑے سب جمع ہوئے اور کہا تم اگر بھوکے ہو تو یہ لوٹا اس درخت میں لگاؤ اور درخت کو مروڑو۔ چنانچہ ہمارے ساتھی نے لوٹا لگایا اور درخت کو مروڑا، دودھ سے لوٹا بھر گیا۔ کہا پیو۔ ہم نے دو گھونٹ پیا۔ شہد سے زیادہ شیریں تھا۔ ہمارے ساتھی نے دو تین گھونٹ پیا۔ بعد اُس کے ہم نے پوچھا کہ کیا کریں۔ انھوں نے کہا باقی بچا ہوا اُسی درخت کی جڑ میں ڈال دو۔ ساتھی نے ڈال دیا۔ اُس سفر بھر میں جہاں کہیں خواہش بھوک پیاس کی ہوتی ویسا ہی درخت پہچان کر عرق نکال لیتے۔ بولی اُن کی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ ہم مدینہ سے شام کو جاتے تھے۔ راستہ میں ایک شخص نے کہا کہ حضرت اس راستہ سے آپ نہ جائیں، ادھر ایک اونٹ لاگو ہے۔ جب کسی مسافر راہگیر کو آتے دیکھتا ہے تو دوڑ کر اُس کے سر کا ڈھڑ اُتار لیتا ہے۔ جب آدمی مر جاتا ہے تو قزاق لوگ جن کا اونٹ ہے، مال و اسباب آ کر لے لیتے ہیں۔ مگر ہم نے نہ مانا اُسی طرف چلے۔ جب ہم ایک میدان میں پہنچے تو فی الواقع دیکھا کہ ایک اونٹ بلبلاتا چلا آ رہا ہے۔ جیسے ہی وہ ہمارے قریب منہ پھیلا کر دوڑا، ہم نے کمر سے چاقو نکال کر سر سے اس کی زبان

کاٹ لی۔ پس وہ فوراً زمین پر گر پڑا اور مر گیا۔ قزاق لوگ دوڑے آئے کہنے لگے کہ ہمارا اونٹ کیوں مار ڈالا۔ اب کیا کھائیں گے ہم نے کہا خدا رازق ہے۔ سب نے توبہ کر لی اور کہا کہ حضرت ہم سب اس پیشہ پر لعنت کرتے ہیں۔ پھر وہ سب مُرید ہو گئے اور ہم کو کئی دن مہمان رکھا۔

استغنا جاننا چاہیے کہ آپ کے اجداد و اکرام قصبہ دیوے شریف کے بہت بڑے رئیس ابوالعظم اور امیر کبیر تھے زر و جواہر مال خزانہ دیہات مزرعہ جات صدہا زیر حکومت تھے۔ سامانِ امارت ہر ایک قسم و عمارات پختہ و اسبابِ ظاہری ضروریات دنیاداری ہر ایک قسم بے شمار تھا۔ کتب ہائے عربیہ و فارسی کے کتب خانے تھے۔ سپاہی، پیادے، نوکر چاکر، دائی ماما اندر باہر صدہا ملازم اور نمک خوار تھے۔ غرض اس جوار و دیار میں مثل آپ کے اجداد کے کوئی رئیس ہم پلّہ نہ تھا۔ باوجود اس سامان امارت اور ریاست کے جس وقت آپ نے منزلِ فقر میں قدم رکھا، سب سامان و اسباب پر لعنت کر دی اور جو کچھ نقد و جنس ریاست امارت تھی سب راہِ خدا میں لٹا دی۔ کچھ سروکار نہ رکھا۔ توکل علی اللہ پر قانع و شاکر ہو گئے۔ چنانچہ یہ حالتِ استغنا و نفرت اسباب دنیا تمام عمر آپ کی رہی۔ کبھی اس طرف توجہ اور خیال نہ کیا۔ اگر کوئی ہفت اقلیم کی دولت اور اسباب سامنے لاکر پیش کرتا تو اُن واحد میں سب بانٹ کر بیٹھ جاتے اور تقسیم کر دینے سے اس درجہ خوش ہوتے کہ بیان سے باہر ہے۔ کیسی ہی قیمتی کوئی چیز ہوتی، ایک منٹ اس کا رکھنا بار ہوتا۔ تمام عالم کے تحفے تحائف بیش قیمت بڑے بڑے رئیس راجہ تعلّق دار حکّام حضور میں لاکر پیش کرتے، چند ساعت میں آپ تقسیم کر ڈالتے۔ اکثر تحائف کے پیش کرنے والے کو اس کا معاوضہ فوراً اُس سے بڑھ کر قیمتی عنایت فرماتے۔ بارِ احسان کسی کا کبھی آپ نہ رکھتے۔ روپیہ، اشرفی پیسہ کبھی ہاتھ سے اپنے نہیں چھوا۔ حتیٰ کہ سونے چاندی کے اشیا کو کبھی ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اگر کسی ناواقف نے کبھی بطور نذرانہ روپیہ سامنے پیش کیا تو اظہار نفرت فرمایا۔ کبھی کسی بیش بہا نادر چیز پر نظر ڈالی اور نہ حقیر ذلیل اشیا سے نفرت فرمائی۔ دونوں کو ایک ہی نظر سے ملاحظہ فرمایا۔ اکثر عشاق جاں نثار و رؤسائے جوار و دیار مثل بادشاہ حسین رئیس کبرہ و فدا حسین خانصاحب رئیس کبرہ و چودھری لطافت حسین خاں صاحب رئیس راملانہ و حاجی عباس حسین خانصاحب رئیس بابوپور و شیخ عنایت اللہ صاحب رئیس سیدن پور و حاجی بشیر احمد خانصاحب رئیس غازی پور و راجہ روست محمد خاں صاحب رئیس رائے پور و ٹھاکر پنجم سنگھ صاحب رئیس زمیندار مولوی شرف الدین صاحب جج پٹنہ و بیگم صاحبہ ردولی شریف و عائشہ بی بی صاحبہ گیا۔ و منشی غنی حیدر صاحب وکیل گیا و حافظ حسن صاحب و کنہیا لال صاحب و حافظ پیاری صاحب و میاں شیدا صاحب لکھنوی و عبد الصمد صاحب نورباف ساکن مسولی۔ و تراب بز قصاب ساکن بیتے پور و بنو بھٹیاری امین آباد لکھنو۔ غرضکہ نام بنام کہاں تک لکھوں تمام رؤسا و امراء و حکام، امیر غریب، جولاہے کبڑیے، قصائی بنیے مہاجن، جو مثل پروانہ شیفتہ و جاں نثار اُس شمع ہدایت کے تھے۔ ایام سرما میں حسب حوصلہ اپنے جڑاولیں مثل رضائی، لحاف، گدّے کے ایک سے ایک اعلیٰ اور بیش قیمت کمخواب، اطلس، زربفت، نیم زری، اصلی جامہ دار مخملی، اصلی بھیلور، اونی بھیلور، جاپانی ایک سے ایک بڑھ کر لاکر پیش کرتے ان کو بھی حضور اوڑھ لیتے اور اگر کوئی غریب عقیدت مند اپنے حوصلہ کے موافق چھینٹ

وغیرہ کے جو اوّل پیش کرتا اُس کو بھی آپ بخندہ پیشانی نہایت شوق کے ساتھ زیب تن فرماتے۔ کمخواب وغیرہ اور سوتی چھینٹ میں کچھ فرق نہ فرماتے۔ دونوں کو ایک ہی حیثیت سے استعمال فرماتے۔ اگر اطلس کمخواب کی رضائی لحاف ہے تو اُس میں ہاتھ منہ، عطر، تیل پونچھ لیا اور اگر چھینٹ کی ہے تو اس میں بھی۔ . . . . . اِس کی عمدگی سے غرض، نہ اس کی کم حیثیتی کا خیال۔ اگر کسی نے تعریف کر دی کہ حضور یہ بہت بیش قیمت ہے تو کچھ پروا نہیں اور اگر کسی نے معمولی بتلا دی تو کچھ خیال نہیں کیا۔

(۱)

چنانچہ ایک مرتبہ راجہ دوست محمد خاں صاحب تعلقدار نہورنے ایک رضائی نہایت بیش قیمت سچّی زری اطلس کی بنارسی جس میں بیل اور گوٹ وغیرہ سب پر زری لگی تھی، حضور میں پیش کی۔ آپ نے نہایت خوشی سے اوڑھلی۔ دوسرے روز ایک جولاہے غریب نے ولایتی سنہری چھاپے کی اشرفی بوٹی والی چھینٹ کی رضائی لاکر پیش کی، اس وقت حضور صحن مکان میں دھوپ میں تشریف فرما تھے۔ جیسے ہی رضائی کھولی آفتاب کی شعاع سے اور زیادہ چمک معلوم ہوئی۔ حضور نے فرمایا کہ یہ رضائی بہت چمکدار اور اس زری اطلس سے کہیں اچھی ہے اور قیمتی ہے۔ نور محمد شاہ سے ارشاد ہوا کہ راجہ جو رضائی کل لائے تھے اِن کو دے دو چنانچہ وہ رضائی اطلسی راجہ صاحب والی اسی وقت نور باف صاحب کو دے دی گئی اور آپ وہی چھینٹ سنہری کی رضائی اوڑھ کر لیٹ گئے ۔ بار بار اُس پر ہاتھ پھیرتے اور فرماتے کہ بہت چکنی اور وضع دار ہے۔ یہ بہت روپیوں میں بنی ہوگی، اس کا مقابلہ کوئی راجہ بھی نہیں کرسکتا۔

(۲)

ہمیشہ عادت شریف تھی کہ جہاں ایک چیز کے موجود ہونے پر کسی نے دوسری چیز لاکر پیش کر دی تو اس کا رکھنا ایک منٹ کو بار خاطر ہو جاتا۔ جب تک وہ کسی کو نہ دیتے قرار نہ آتا۔

(۳)

مثلاً کسی نے تہبند بدلوایا یا کوئی رضائی، لحاف، دوسّا، کمبل، بانات، چادر وغیرہ لایا تو جب تک دوسری رضائی وغیرہ کسی کو نہ دے دیتے چین نہ پڑتا۔ سخت اُلجھن رہتی۔ بار بار فرماتے کہ ہم کو دوسری رکھ کر کیا کرنا ہے۔ ہمارے کون بیٹھا ہے، جو رونہ پیٹے، یہ غلانے کو دے دو۔ آپ کے علم میں اگر خادموں کے پاس کوئی چیز مثل تہبند وغیرہ یا دیگر اشیا تحفہ تحائف کسی سیر و سیاحت میں جمع ہو جاتا اور آپ کی نظر اس پر پڑ جاتی تو فوراً آپ سب سامان لٹوا دیتے۔ ایک شمہ بھر باقی نہ چھوڑتے۔ چونکہ راقم اکثر پورب کے سفر یعنی دربھنگہ و پٹنہ وغیرہ میں ہمرکاب رہا ہے۔ دیکھا کہ اس کثرت کے ساتھ تہبند اونی و سوتی و کمل و دُھسہ و دیگر تحائف بیش قیمت آتے تھے کہ عقل نہیں کام کرتی تھی، مگر جس شہر سے کوچ فرمایا سب وہیں لٹا پٹا دیا۔ خدام نے بارہا سامان ضروری مثل فرش فروش برتن یا لیمپ، گھڑی، شیشہ وغیرہ وغیرہ خفیہ طور پر جمع کیا، مگر جب آپ کی نگاہ پڑی فوراً سب پھینک دیا، لٹا دیا۔ برتن ضروری

مثل لوٹا تسلہ رکابی وغیرہ بجز مٹی کے کبھی تانبہ وغیرہ کا استعمال میں رکھنا پسند نہ فرماتے تھے۔ دروازے پر پیر غلام کسگر آباد تھا اس کے ہاتھ کا بنا ہوا لوٹا مٹی کا اور کونڈا اور رکابی پیالے ہمیشہ حضور کے استعمال میں رہے۔ دور دور لوگ لوٹے مٹی کے اس کے یہاں سے آج تک تبرکاً لے جاتے ہیں۔

(۴)

دیوہ شریف کے میلہ میں لاکھوں مخلوق دور دور سے آکر جمع ہوتی تھی اور جو عقیدت مند رئیس راجہ تعلقدار حکام غریب جہاں سے چلتا تھا وہاں کے تحفہ تحائف ، تہبند و چادر کے اپنے حوصلہ کے مولانا کے حضور میں پیش کرنا اپنا فخر سمجھتا تھا۔ غرضکہ لاکھوں تہبند، چادر اونی سوتی دھسہ، لوئی، کمل، بانات و دیگر تحائف بے شمار صدہا ہزار من مٹھائی و میوہ جات تر و خشک وغیرہ وغیرہ تخمیناً اسی نوے ہزار روپیہ کا سامان نقد جنس ایام میلہ میں جمع ہو جاتا تھا، مگر حضور سب لٹوا دیتے تھے ، چنانچہ میلہ میں یہ قواعد مقررہ تھے کہ جب سترہ تاریخ شب کو بعد قُل کے درگاہ سے حضور واپس ہوتے تو اسی وقت سے لوگوں کو رخصت کرنا آپ شروع فرماتے اور وہ سامان جمع شدہ تقسیم ہو جاتا۔ جس کو رخصت فرماتے اس کو کچھ نہ کچھ تہبند، چادر، مٹھائی، دھسہ، کمل وغیرہ جو جس کی قسمت کا ہوتا ضرور دلواتے۔ آخر کو یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ اٹھارہ تاریخ سہ پہر تک کل اسباب نقد و جنس آپ بانٹ دیتے تھے اور تمام مکان میں اندر سے باہر تک جھاڑو دے دی جاتی تھی۔ حضور اقدس سہ پہر کو وہی ایک تہبند نین سکھ کا بدن مبارک پر باندھے ہوئے موضع بینڈ کو جو متصل دیوہ شریف کے ہے روانہ ہو جاتے تھے۔ ایک ریوڑی یا ایک تاگا تک اٹھارہ تاریخ تکمیل مکان میں باقی نہ رہتا تھا۔ کوٹھری کی کنواڑیں ہی کھلے پڑے رہتے تھے۔

(۵)

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ موسم سرما میں شب کو جب سناٹا ہوا اور مستورات حضور میں حاضر ہوئیں، اس روز اتفاق سے مسماۃ راجی جو قریب ہی رہتی تھی، چدری کا موقع پاکر وہ رضائی جو بیگم صاحبہ رودلی شریف کے یہاں سے آئی تھی اور نہایت بیش قیمت تھی۔ کھونٹی سے اتار کر چلتی ہوئی۔ جب مردانہ ہوا تو نور محمد شاہ نے رضائی تلاش کی، جب نہ ملی تو زنانی ڈیوڑھی پر آکر راجی کو آواز دی اور پوچھا کہ حضرت کی رضائی تو کوئی نہیں لے گیا ہے۔ میں نے بعد دریافت کہا کہ یہاں کون لاتا آخر کو پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ راجی آج چدری سے چھپ کر وہاں گئی تھی اور فوراً چلی آئی تھی۔ اسی وقت نور محمد شاہ اس کے مکان میں گئے تو دیکھا کہ مزے سے اوڑھے پیال پر لیٹی ہے۔ یہ بہت خفا ہوئے اور رضائی چھین لائے اور حضور سے یہ قصہ بیان کیا کہ حضور کے یہاں آج چدری اس طرح ہو گئی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ راجی کو بلاؤ۔ جب وہ آئی تو آپ نے اس کو وہ رضائی اور اپنا لحاف جو اوڑھے تھے اتار کر دے دیا اور دس روپیہ نقد منگوائے اور فرمایا کہ ہمیشہ ایک رضائی اور لحاف اس کو دیا جایا کرے۔ اب ملاحظہ ہو کہ لحاف تو راجی کو دے دیا اور خود تہبند باندھے ہاتھ پاؤں کے جاڑے میں بیٹھے رہے۔ جب نور محمد شاہ نے زنانی ڈیوڑھی پر آکر یہ واقعہ بیان کیا کہ حضرت کے اوڑھنے کے واسطے اس وقت کچھ نہیں ہے کوئی لحاف موجود ہو تو دے دو۔ اس وقت عزیزی حکیم عبدالرحمان خاں صاحب

کی دلہن نے اپنا لحاف بھیجا۔

—— (۶) ——

ایک روز کا ذکر ہے کہ جب حضور آگرے کی طرف تشریف لے گئے تو حضور کے یہاں مسمی دین علی سپاہی نے بغرض طمع چوری کرنا چاہی۔ جب وہ کوٹھڑی میں داخل ہوا تو بجز اس کے کہ چند قرآن شریف وہاں تھے اور کچھ نہ پایا۔ قرآن شریف لے کر باہر صحن میں نکلا، یہیں آیا اور اندھا ہو گیا۔ کسی طرف سے راستہ نہ سوجھا۔ پکڑا گیا۔ جب حضور سفر سے بعد واپس آئے سفر کے یہ واقعہ عرض کیا گیا تو حضور سن کر بہت ہنسے اور جس قدر فرش فروش اُگالدان وغیرہ حتیٰ کہ چھت گیری تک سب بانٹ دیا اور دین علی کو بُلا کر بہت سا اسباب دے دیا۔ اُس روز سے معمول تھا کہ مٹی کا برتن تک نہیں رہتا تھا۔

رضا و تسلیم | واضح ہو کہ حضرت فخرالاولیا ہمیشہ کاربند رضا و تسلیم رہے۔ حرص و طمع و کبر و حسد و رشک و غضب و محبت دنیا و کذب و غیبت و عیب بینی سے کام نہیں رکھا۔ دنیاوی ذکر و اذکار کبھی حضور نہ سنتے۔ اگر کوئی اپنی پریشانی و بیکاری یا تکلیف بیماری و تردد و عیالداری کو حضور میں عرض کرتا تو فرماتے خدا مالک ہے، خدا مالک ہے۔

جناب امام الاولیا فرماتے کہ ہم دنیا کے جھگڑوں بکھیڑوں کو کیا جانیں۔ دنیا مردار پر ہم نے پہلے ہی لعنت کر دی ہماری منزل عشق کی ہے۔ جو ہم سے محبت کرے وہ ہمارا ہے۔ چاہے کوئی ہو۔ عاشقانہ قصے اور حکایات شبانہ روز حضور میں ہوا کرتے تھے۔ بخصوص یہ خدمت قصہ گوئی تراب علی شاہ صاحب ساکن بھٹولی و قاضی بخشش علی صاحب ساکن گدیہ کو عطا ہوئی تھی۔ بعض اور خدام آیند و روند اگر کوئی قصہ کہانی کہتا تو بھی سُنتے اور محظوظ ہوتے۔ گفتگو سے نہایت متنفر ہوتے۔ نہ گنڈا لکھنے سے مطلب نہ تعویذ سے نہ وظیفہ سے غرض۔ نہ عمل پڑھنے سے مطلب۔ عمل اس کلیہ پر تھا کہ خدا کے سامنے بھی ہاتھ نہ پھیلانا چاہیے۔ خدا سے بھی محبت کرے تو بلا مطلب کی۔ اکثر فرماتے تھے کہ عاشق کے دین و دنیا دونوں خراب۔ مگر محبت اچھی چیز ہے۔ دنیا اسی سے قائم ہے۔ محبت میں کسب نہیں، جس قدر کسب ہوگا وہی تصنع ہے۔ محبت بلا مطلب کی ہونا چاہیے۔ خواہ کسی سے کیوں نہ ہو۔ سچی ہونا چاہیے۔ خدا محبت ہی سے ملتا ہے۔ محبت سے دو دل بھی اسی طرح مل جاتے ہیں جس طرح کسی زنجیر کی کڑیاں اس کا پھندا اُس میں، اُس کا پھندا اِس میں اور دونوں مستقل اور مضبوط ہیں تو نباہ ضروری ہے۔ اگر ایک میں بھی کمزوری ہوئی تو محبت ہی کے زور میں الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ محبت کے زور کے پاسنگ بھی دنیا کی کسی شے میں زور نہیں ہے۔ محبت میں جس قدر تکلیف پہنچے اجر ہو مگر اس سے پھرے نہیں وفا لازمی ہے۔ خدا نے محبت انسان کے لیے بنائی ہے۔ فرشتوں کا فخر ہے اطاعت، انسان کا فخر ہے محبت!

ہر وقت ہر لحظہ حضور اقدس رضا و تسلیم میں رہتے۔ قصہ کہانیاں بھی اس غرض سے سنتے کہ کسی کو فضول بات کرنے اور خیال کے بتلانے کا موقع نہ ملے۔ حضور تہ بند میں مُنہ چھپائے یادِ خدا میں محو رہتے اور لوگ سمجھتے کہ حضور قصہ سُن رہے ہیں۔ ایک سچے عاشق اور صابر و شاکر کا حضور پورا نمونہ تھے۔

آپ کی چند تعلیمات مختصر ًا بیان کی جاتی ہیں۔ فرماتے ہیں:

—— فقیر کو چاہیے ہر حال میں خوش رہے اور زندگی کے دن کاٹ دے۔ تکلیف ہو تو شکایت نہ کرے اور آرام ہو تو شکر بجالائے۔

—— فقیر کو چاہیے نہ تکلیف سے گھبرائے اور نہ شکایت کرے، کیونکہ محبوب کی دی ہوئی چیز سے گھبرانا محبت کے منافی ہے اور محبوب کی شکایت مشرب عشق میں کفر ہے۔

—— بڑی فقیری یہ ہے کہ مر جائے مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے۔

—— فقیر کو چاہیے کسی کی چیز کو خیانت کی نظر سے نہ دیکھے۔

—— فقیر وہ ہے جو متوکل رہے۔

—— فقیر وہ ہے جو اپنی بستی میں رہ کر خویش و اقربا کا ممنون نہ ہو۔

—— فقیر کو لازم ہے کہ بجز خدا کے کسی پر بھروسہ نہ کرے۔

—— فقیر جہاں رہے لاطمع رہے۔

—— بڑی بات یہ ہے کہ فقیر اپنی بستی میں نیک نام ہو۔

—— مقام فقر بہت بڑا مقام ہے۔

—— سلسلۂ فقر اہل بیت کرام علیہم السلام سے ہے۔

—— فقیری بی بی فاطمہ سے ہے اور امام حسین علیہ السّلام کے ذریعہ سے یہ فیض جاری ہوا۔

—— فقیر وہ ہے جو انتظام سے علٰحدہ ہو۔

—— فقیر وہ ہے جس کے پاس بجز خدا کے کچھ نہ ہو۔

—— فقیر وہ ہے جو کسی چیز کا نہ مالک ہو اور نہ خود کسی مِلک میں ہو۔

—— فقیر کو چاہیے نہ کسی کے لیے دُعا کرے نہ گنڈا تعویذ کرے۔

—— فقیر وہ ہے جس کی کوئی سانس خالی نہ جائے (عرض کیا گیا کس سے سانس خالی نہ جائے) فرمایا کہ اللہ سے۔

—— فقیر کو لازم ہے کہ دنیا کے واسطے کوئی کام نہ کرے اور خدا کے واسطے جان دے دے۔

—— جو شخص اپنا کام آپ کرنا چاہتا ہے تو اللہ میاں بھی علٰحدہ ہو جاتے ہیں اور جو اللہ کے بھروسے پر چھوڑتا ہے تو اللہ اس کے کام کو پُورا کرتا ہے۔ لازم ہے کہ جو کام کرے اللہ کے بھروسے پر کرے۔

—— یقین کے ساتھ خدا کو اپنا مددگار جانو وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيلًا۔

—— خدا ہر چیز کا مالک اور ہر چیز پر قادر ہے۔ خیر و شر اسی کی جانب سے ہے۔ مگر تصدیق اس کی مشکل ہے۔

——— خدا تم میں ہے مگر دیکھ نہیں سکتے۔

——— ایمان خدا کی محبت کا نام ہے۔

——— من وتو کا جھگڑا جائے تو خدائی نظر آئے۔

——— اپنی ہستی کو مٹانا عین فقیری ہے۔

——— موحد ہونا مشکل ہے۔

——— آج کل توحید کے سیر ہے، بھیک مانگتے ہیں۔ بڑی چیز یہ ہے کہ مرجائے اور ہاتھ نہ پھیلائے۔ توحید کی قدر آجکل نہیں ہے۔

——— عشق وہی ہے جو کسب سے نہیں حاصل ہوتا۔

——— محبت کرو کسب سے کچھ نہیں ہوتا۔ محبت ہے تو سب کچھ ہے، محبت نہیں تو ریاضت بیکار ہے۔

——— ایک صورت کو پکڑلو، وہی تمہارے ساتھ یہاں بھی رہے گی اور وہی قبر میں اور وہی حشر میں ساتھ ہوگی۔

——— محبت میں شاہ وگدا کا فرق نہیں رہتا، جیسے محمود وایاز کا واقعہ ہے۔

——— یار کا تصور عاشق کی زندگی ہے۔

——— رضائے یار عاشق کا ایمان ہے۔

——— جس کو اپنی خواہشات کی خبر ہے وہ عشق سے بے خبر ہے (اور ارسطو نے بھی فرمایا) عاشق یار سے خبردار اور موجودات سے بے خبر رہتا ہے۔

——— معشوق کی جفا کو عاشق عطا سمجھتا ہے۔

——— محبت میں انسان اندھا ہو جاتا ہے۔

——— ایمان محبت کامل کا نام ہے۔

——— عاشق وہ ہے جو معشوق پر جان قربان کرے۔

——— عشق میں سر دے تو ہم سر ہے۔

——— جب تک خود بینی ہے، حقیقت سے حجاب رہے گا۔ خود پرستی حجاب کو بڑھاتی اور مقصود سے دور رکھتی ہے، اور بے خودی حجاب کو اٹھاتی ہے۔

——— مرید اس طرح پیر سے ملے جس طرح قطرہ دریا سے مل جاتا ہے۔ جب تک قطرہ نہیں ملتا قطرہ رہتا ہے اور جب مل جاتا ہے تو وہی قطرہ دریا ہو جاتا ہے۔ پھر اسے کوئی قطرہ نہیں کہتا۔

——— انسان اسی کے ساتھ رہتا ہے، جس سے محبت ہوتی ہے۔

——— پیر کی صحبت میں خدا ملتا ہے، جو پیر کی شکل ہے بس یہی سب کچھ ہے۔ پیر کی ذات میں فنا فی اللہ اور فنا فی الرسول کا مرتبہ

بل جاتا ہے اور تمثیل میں مولانا علیہ الرحمۃ کا یہ شعر پڑھا ؎

چونکہ ذات پیر را کردی قبول ہم خدا در ذاتش آمد ہم رسول

—— جو شخص جس سے محبت کرتا ہے اسی کے ساتھ اس کا حشر ہوتا ہے۔

—— جس کے تصور میں مروگے اسی کے ساتھ حشر ہوگا۔

—— جس کو تصدیق نہیں اس کا ایمان نہیں۔

—— جس صورت کا خیال پختہ ہو جائے گا وہی صورت بعد مرگ بھی قائم رہے گی۔

—— جو مرید پیر کو دور سمجھے وہ مرید ناقص ہے اور جو پیر مرید سے دور رہے وہ پیر ناقص ہے۔

—— کسی کو برا نہ کہو نہ برا سمجھو۔

—— کسی کی عداوت کو دل میں جگہ نہ دو۔

—— دشمن سے بدلہ نہ لو۔ دشمن کے ساتھ سلوک کرو یہ حضرت شیر خدا کی سنت ہے۔

—— جس دل کو محبت سے سروکار رہتا ہے اس میں عداوت کو گنجائش نہیں ہوتی۔

—— ہماری منزل عشق میں خلافت وجانشینی نہیں جو ہم سے محبت کرے وہ ہمارا خلیفہ ہے (پھر یوں بھی فرمایا ہے) کہ ہماری منزل عشق ہے جو کوئی دعوی جانشینی کا کرے وہ باطل ہے۔ ہمارے یہاں کوئی ہو چمار ہو یا خاکروب، جو ہم سے محبت کرے وہ ہمارا ہے۔

—— جس کی قسمت کا جو ہے وہ اس کو ملے گا اور اگر زندگی میں نہیں ملا تو مرتے وقت ضرور ملے گا اور مرتے وقت نہ ملا تو اس کی قبر میں ضرور ٹھونس دیا جائے گا۔

—— بھائی بھائی میں باہمی محبت ہونا اس کی دلیل ہے کہ ان کو باپ سے محبت ہے۔

—— خدا محض آسمان پر نہیں ہے ہم تم میں چھپ کر سب کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ بس ایک صورت پکڑ لے خدا مل جائیگا۔

—— دنیا داری دکانداری ہے۔

—— ہمارے یہاں مجوسی، عیسائی سب مذہب والے برابر ہیں کوئی فرق نہیں ہے۔

—— جو کچھ ہے لگاؤ ہے، باقی جھگڑا سب دکھلانے کی چیز ہے۔ اگر لگاؤ نہیں تو خاک ہے۔

—— عاشق کے مرید صادق کا انجام خراب نہیں ہوتا۔

—— عاشق کے خیال پر دین و دنیا کا انتظام ہے۔ اگر عاشق کی زبان سے کوئی بات غلط بھی نکل جائے تو اس کو بھی سچ کر دیتا ہے۔

—— عاشق کا گوشت درندوں پر حرام ہے۔ اس پر نہ سانپ کا زہر اثر کرسکتا ہے اور نہ شیر کھا سکتا ہے۔

——— عاشق وہ ہے جس کی ایک سانس بھی یادِ مطلوب سے خالی نہ ہو۔

——— عاشق کبھی بے ایمان نہیں مرتا۔

——— عشق میں انتظام نہیں۔

——— عاشق دین و دنیا دونوں سے بے خبر و بے نیاز ہے۔

——— عاشق کی سانس بلاکسب و ذکر عبادت ہے۔

——— عاشق غافل نہیں سمجھا جا سکتا، اس کی یہی نماز اور یہی روزہ ہے۔

——— جب کوئی کسی کا عاشق ہوتا ہے تو اس کی کوئی سانس معشوق کی یاد سے خالی نہیں ہوتی۔

——— عاشق کو خدا معشوق کی صورت میں ملتا ہے۔

——— محبت میں ادب اور بے ادبی کا فرق نہیں۔

——— فرمایا محبت وہ چیز ہے جس کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

——— محبت ہے تو ہم ہزار کوس پر بھی تمہارے ساتھ ہیں۔

——— محبت میں بے ادبی عین ادب ہے۔

——— محبت عین ایمان ہے۔

——— فقیر کم مشائخ زیادہ ہوتے ہیں۔ چونکہ منزلِ عشق سخت دشوار گزار ہے۔ اس لیے طالب اس راستے کو مشکل سے پسند کرتے ہیں۔

——— جس کو سب شیطان کہتے ہیں، اس راہ میں وہ دوست بن جاتا ہے، دشمنی نہیں کرتا۔

——— لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ زبانی کہنا اور ضرب لگانا اور بات ہے۔ بے دیکھے کسی چیز کا خیال محال ہے۔ دیکھ کے عاشق ہونا ممکن ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس چرواہے کو اپنی شریعت کی رُو سے منع کیا۔ سو وہ ناپسندیدہ ہوا اور اس کا وہی خلافِ شرع کرنا پسند ہوا، اس کو دل سے تعلق ہے۔

——— عاشق جو کچھ معشوق کی نسبت کہے بجا و درست ہے اور جو کچھ تعظیم کرے وہ سزاوار ہے اور معشوق جو کچھ عاشق کی نسبت کہے وہ مقامِ رضا و تسلیم ہے۔ عاشق کو چارہ نہیں اور عاشق اپنے معشوق کی تعریف ہر پہلو سے کر سکتا ہے نہ وہ گنہگار ہے نہ اس پر عذاب و ثواب ہے۔ لیلیٰ را بچشمِ مجنوں باید دید۔ پس دوسرا وہ آنکھ نہیں پا سکتا۔

——— مذہبِ عشق میں کفر و اسلام سے غرض نہیں؛ جو کچھ ہے معشوق ہے۔

——— زبانی پڑھنا لکھنا اور ہے اور دل سے محبت اور ہے۔ زبانی پڑھنے لکھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ محبت عجب چیز ہے۔

——— عشق کی اُلٹی چال ہے۔ جس کو پیار کرتا ہے اسی کو جلاتا ہے، جس کو پیار نہیں کرتا اس کی باگ ڈھیلی کر دیتا ہے۔

—— تمام صفاتِ عشق ذات میں فنا ہو جاتے ہیں۔ اس میں گم ہو جانے ہی کو وصال کہتے ہیں اور خودی میں نہ رہنا ہی کمال ہے۔ عشاق جب اس درجہ پر پہنچتے ہیں تو اپنی ہستی کو نیست کر دیتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جب آفتاب فلک پر نور افشاں ہوتا ہے تو ستارے مخلوق کی نگاہ سے کالعدم ہو جاتے ہیں جس طرح کواکب کا وجود آسمان پر ہے۔ اسی طرح عشاق کا وجود معشوق میں ہے بمصداق مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ (جو اللہ کا ہوا اللہ اس کا ہوا) عاشق و معشوق ایک ذات ہو جاتے ہیں۔ پس اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ وہ آفتابِ حقیقی تمام انوار و اوصاف عشاق کو اپنے میں جذب کر لے۔

—— باوجود اقتدار خدا کے واسطے ایک عضوِ خاص کو بیکار کر دو، اور کام نہ لو۔ شیطان کو بغل میں رکھ کر یادِ خدا کرنا بڑا کام ہے۔ از نفس خود سفر کردن بڑی منزل ہے۔

—— عشاق کو اللہ کی طرف سے ہر حال میں ایک حال ہوتا ہے کہ وہ ہر چیز سے ہر مخلوق سے جو چاہیں کرا دیں۔

—— لنگوٹ بند وہ ہے جو تمام عورتوں کو اپنی ماں بہن کے مثل جس طرح جانتا ہے اسی طرح خواب میں بھی وہ کسی عورت کو نفسانی خواہش کے ساتھ نہ دیکھے۔

—— جو طمع میں گھر جائے وہ ہمارا نہیں ہے۔

—— بڑی فقیری یہ ہے کہ ہاتھ نہ پھیلے۔ بلا مانگے دے تو لے لے۔

—— فقیر کا کوئی گھر نہیں اور سب گھر فقیر کے ہیں۔

—— معشوق کا ترسانا اور حجاب و عتاب ہی تو رحم و فضل ہے۔

—— تسلیم و رضا جب ہے کہ شر کو بھی خیر سمجھے اور خیر تو خیر ہی ہے اور تکلیف بھی عاشق و معشوق کا راز و نیاز ہے۔

—— جو تم سے محبت کرے اس سے محبت کرو۔ نہ کسی کے حق میں دعا کرو نہ بد دعا۔ تم رضا و تسلیم کے بندے ہو۔

—— تسلیم و رضا بی بی فاطمہؓ اور دونوں صاحبزادوں کا حصہ ہے۔

—— حضرت امام حسین علیہ السلام نے ایک رضائے معشوق کے لیے تمام خاندان کو میدانِ کربلا میں شہید کرا دیا۔ کوئی کیا سمجھ سکتا ہے۔ رمز عاشقی و معشوقی نازک ہے۔

—— انسان جس چیز کو مضبوط پکڑے اور اس پر رُک جائے، وہیں خدا ہے۔

—— نفوس کو ذائقہ موت ہے اور روح کو ذائقہ موت نہیں۔ قرآن پاک میں حق تعالیٰ فرماتا ہے كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ، یہ نہیں فرمایا كُلُّ رُوْحٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔

—— عشق تین حرفوں سے مرکب ہے، ع، ش، ق۔ عین سے عبادت الٰہی مقصود ہے۔ شین سے پابندی شرع شریف۔ قاف سے قربانی نفس۔

___ عاشق کی ابتدا میں عین ہے اور شرع کی آخر میں عین ہے۔ یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جو کوئی شرع شریف کے درجات کو آخر تک طے نہ کرے وہ عشق میں کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ کمال عشق یہ ہے کہ عاشق سے معشوق ہو جائے عاشق وہی ہے جو ذات معشوق میں محو ہو جائے۔

___ عشق ایک بے نظیر معشوق ہے اور محبوب کی محبت کے اثرات اس میں کیمیا کی خاصیت رکھتے ہیں۔

___ جس کو معشوق چاہتا ہے عشق کی زنجیر میں جکڑ دیتا ہے۔

___ کمال عشق یہ ہے کہ عاشق سے معشوق ہو جائے۔

___ علم وہی حاصل کرنا چاہیے جو مرنے کے وقت کام آئے اور وقت موت زبان سے نکلے۔ اگر زبان سے کلمہ ادا نہ ہو سکا علم کس کام آیا۔

___ موحدین شیطان و رحمان میں فرق نہیں کرتے اور عشاق شیطان کو برا نہیں کہتے بلکہ واقعہ ابلیس خاص قسم کا ایک سبق ہے لیکن شریعت کی رو سے ابلیس نے یہ غلطی ضرور کی کہ آدم کو غیر سمجھا خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ کا خیال نہ کیا۔

___ ہر شخص پر پابندئ شریعت اور اتباع سنت لازم ہے۔

___ شجرہ وغیرہ ایک رسمی چیز ہے، یہاں دل کے شجرے سے کام ہے۔

___ محبت کرو، محبت ہی سے سب کچھ ہے۔ بے محبت نماز روزہ بھی سب بیکار۔ دیکھو واقعہ کربلا کو لوگ نماز پڑھتے تھے روزہ بھی رکھتے تھے اگر دل میں محبت آل رسول کی نہیں تھی۔ تب ظلم و ستم پر کمر باندھ کر ستیاناس ہوئے۔

___ جس پر سر توحید منکشف ہو جاتا ہے، وہ جانتا ہے زبان سے اس کا راز ادا ہونا مشکل ہے۔

___ اگر شوق کامل، و طلب صادق ہے تو ہر ذرہ میں حبیب کی دید نصیب ہو سکتی ہے۔

___ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى جو یہاں اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہے۔

___ علمائے ظاہر کی الٹی چال ہے جو دیکھ کے سجدہ کرے اُسے کافر کہتے ہیں اور جو بے دیکھے سجدہ کرے اُسے مومن۔

___ عاشق وہی ہے جو ذات معشوق میں محو ہو جائے۔

___ عاشقی ایک ملامت ہے انسان دین و دنیا سے گزر جاتا ہے اور فراق میں مر جاتا ہے۔ اسی فراق میں تو مزا آتا ہے، اور کچھ بھی نہیں۔

___ عشق میں ترک ہی ترک ہے، ترک دنیا، ترک عقبیٰ، ترک مولیٰ، ترک ترک اور اپنا فراق ہے۔

___ خیال میں صورت معشوق نقش کرنا چاہیے۔ جو صورت نقش ہو گئی، وہی بعد مرگ بھی قائم رہتی ہے بلکہ اسی کے ساتھ اس کا حشر ہوگا۔

___ عاشق جس خیال میں مرتا ہے وہی خیال اس کا حشر و نشر، قیامت دوزخ و بہشت بلکہ کثرت جذب میں وہ خود ہی ہو جاتا

ہے، جس کو عشق و محبت نہیں وہ اس کو نہیں سمجھ سکتا اور نہ اس راہ میں چل سکتا ہے۔

___ منزلِ عشق میں ذات صفت ہو جاتی ہے اور صفت ذات۔

___ جس نے جان قربان نہیں کی وہ عاشق نہیں۔ لیلےٰ کے ہزاروں اور یوسف کے لاکھوں چاہنے والے تھے، مگر مجنوں اور زلیخا ہی کا حصہ تھا۔ جس جس کا حصہ ہوتا ہے وہی پاتا ہے۔

___ علم اور چیز ہے عشق اور چیز ہے، جہاں حضرت عشق آئے وہاں علم اور عقل کا کام نہیں رہتا۔

___ معرفت کسبی چیز نہیں ہے محض وہبی ہے۔ جس کو چاہے خدا اپنی معرفت بخشے اس پر کسی کا اجارہ نہیں۔

___ سُنی سُنائی آنکھ بند کرنے سے اور سانس روکنے سے اور حق حق کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ وہبی چیز ہے، جس کو چاہے خدائے پاک اپنی دولتِ معرفت دے دے، یہاں کسب کا کام نہیں۔

___ شریعت ایک انتظامی بات ہے، اگر انتظام نہ ہوتا تو سب کام بگڑ جاتے۔ اُن بولتے کو تو سبھوں نے پوچھا، مگر اس بولتے کو کوئی نہیں پوچھتا ؎

بولتا تھا ناراں میں اور نور میں	تھا انا الحق بولتا منصور میں
بولتا ہی احمد مختار تھا	بولتا ہی حیدر کرار تھا
بولتے کو بولتے کی چاہ ہے	بولتے میں دیکھو تو اللہ ہے
بولتا گر جسم سے جاتا رہا	پھر کسی سے بول کیا جاتا رہا

___ انا الحق سب پکارتے ہیں اور فنا فی اللہ بھی ہونے کو موجود ہیں، مگر انا الشیطان بایزید کوئی نہیں بولتا۔ یہ بات مشکل ہے۔

___ نقل کو دیکھنے سے کیا ہوتا ہے اصل کو دیکھنا چاہیے۔

___ جو خدا پر بھروسہ رکھتا ہے، اس کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔

___ مسجد، مندر اگر جائیں جہاں جائے سوائے ایک شان کے اور کچھ نہ دیکھے۔

___ اپنے میں جو سانس چلتی ہے یہی ذات ہے، بس اس کی تصدیق مشکل ہے۔

___ تصدیق ہزاروں میں ایک کو ہوتی ہے ہر شخص کا حصہ نہیں۔ پھر اس کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ زبانی جمع خرچ کام نہیں چلتا!

___ صاحبِ توحید ہونا آسان ہے مگر صاحبِ تصدیق ہونا مشکل ہے۔

___ جس کو یہاں تصدیق نہیں وہ کعبہ جا کر کیا کرے گا۔ وہاں جا کر سوائے پتھر کے اور کیا دیکھے گا۔ خدا تو ہر جگہ ہے کعبہ تو چھت ہے۔

___ محبت سے کچھ نہیں جب تک دلی تصدیق نہ ہو۔

___ نماز روزہ اور ہے، تصدیق اور ہے، اگرچہ تصدیق مانعِ صلوٰۃ نہیں، مگر حالت ضرور قابلِ لحاظ ہے۔

___ کتابیں پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا، تصدیق اور چیز ہے۔

——— یقین اعتقاد کی روح ہے، جس میں یقین کی کمی ہے اس میں اعتقاد کی کمی ہے۔

——— جس کے دل میں یہ ہے کہ دیکھیے یہ کام ہو کہ نہ ہو وہ کام نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ دُبدھا میں پڑا ہے، نہیں بلکہ ضرور ہوگا۔

——— خدا پر بھروسہ ہے تو وہ خود تمھارا سامان کر دے گا۔

——— جس کی نظر دوست پر ہے، اس کا کوئی دشمن نہیں۔

——— شرط انصاف یہی ہے کہ سونے چاندی کے ہم وزن شیرینی خرید کی جائے۔

نوٹ : حضور پاک اپنی دادی صاحبہ کے پاس سے اکثر اشرفیاں لاتے اور مسمی لوکئی حلوائی کو دے دیتے اور اس کے وزن کے برابر بتاشہ لے کر بچوں کو تقسیم فرماتے تھے۔

——— مال وزر فقیر کو نہیں چاہیے۔

——— مشائخ عظام کے طریقوں کے متعلق فرماتے تھے، وہ طریقے انتظامی ہیں، اگر انتظام نہ ہو تو سب کھیل بگڑ جائے اور سب ایک سے ہو جائیں۔

——— جو خدا کُل امراض دور کر سکتا ہے وہ بھوک اور پیاس کی زحمت کو بھی مٹا سکتا ہے۔

——— اہل و عیال والے کی نسبت اکثر فرمایا ہے کہ میری وجہ سے دنیا کو نہ چھوڑنا تیری دنیاداری عبادت ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ

ولادت ——— ——— نانوتہ (ضلع سہارن پور) ۱۲۳۳ھ
نانوتہ

ولادت باسعادت حضرت والا بتاریخ ۲۲ ماہ صفر المظفر بروز دوشنبہ ۱۲۳۳ھ مقدسہ بمقام نانوتہ ضلع سہارنپور ہوئی۔
ر وطن اجداد مادری حضرت کا ہے۔ اسم مبارک والد ماجد نے امداد حسین اور تاریخی نام ظفر احمد رکھا اور حضرت مولانا شاہ
ن محدث دہلوی نواسۂ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی قدس سرہما نے بلقب امداد اللہ ملقب فرمایا۔ آپ
جد کا اسم گرامی حضرت حافظ محمد امین تھا اور حضرت صاحب کے دو برادر کلاں و یک برادر و ہمشیرہ خورد بھی تھیں۔ بڑے
ِالفقار علی و منجھلے فدا حسین نام تھے اور تیسرے خود حضرت اور چھوٹے بھائی بہادر علی و ہمشیرہ بی بی وزیر النساء نام تھیں
ہ سن حضرت کا صرف سات سال کا تھا کہ حضور کی والدہ ماجدہ حضرت بی بی حسینی بنت حضرت شیخ علی محمد صدیقی نانوتوی
ل فرمایا۔ وقتِ وفات انھوں نے حضرت کے لیے ان الفاظ میں وصیت فرمائی کہ بعد میری وفات کے میرے اس میرے
ی وقت اور کسی وجہ سے کبھی کوئی شخص ہاتھ نہ لگاوے ——— ۔ چنانچہ ان کی اس وصیت کی تعمیل میں
مبالغہ کیا گیا کہ کسی کو آپ کی تعلیم کی طرف کچھ توجہ والتفات نہ ہوا لیکن چونکہ تائید ربانی ابتدائے خلقت سے مربی
ی تھی۔ اس زمانۂ صغر سنی میں بھی باوجود عدم توجہی و مطلق العنانی کبھی لہو و لعب نامشروع میں مشغول نہ ہوتے تھے اور
طبی شوق سے قرآن مجید حفظ کرنا شروع فرمایا۔ اپنے شوق سے اکثر حفاظ کو استاذ بنایا۔ مگر تقدیرات سے کچھ ایسے موانع
تے گئے کہ نوبت تکمیل حفظ کی نہ پہنچی، یہاں تک کہ بتوفیق الٰہی ۱۲۵۸ھ چند دنوں میں مکہ معظمہ میں اس کی تکمیل ہو گئی اور سولہ سال
یں وطن شریف سے بہمراہی حضرت مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ دہلی کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اسی زمانہ میں
صرات فارسی تحصیل فرمائے اور کچھ صرف و نحو اساتذہ عصر کی خدمت میں حاصل کی اور مولانا رحمت علی صاحب تھانوی
مرقدہٗ سے تکمیل الایمان شیخ عبدالحق دہلوی قدس سرہٗ کی قرأت اخذ فرمائی۔

ہنوز تکمیل علوم ظاہرہ میسر نہ ہوئی تھی کہ ولولۂ خدا طلبی جوش زن ہوا اور نو عمری میں حضرت مولانا نصیر الدین حنفی نقشبندی مجددی
ہ پر طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت کی اور اذکار طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ اخذ فرمائے اور چند دن تک اپنے پیر و مرشد کی خدمت
ضر رہ کر اجازت و خرقہ سے مشرف ہوئے، بعد ازاں بالہام مشکوٰۃ شریف کا ایک ربع قرأۃً حضرت مولانا محمد قلندر محدث
بادی برگور اتا ماہ حصن حصین و فقہ اکبر حضرت مولانا عبدالرحیم مرحوم نانوتوی سے اخذ کیا اور یہ ہر دو بزرگوار ارشد تلامذہ بحارف مستغرق

حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی کے تھے ۔

زیارتِ رسول ؐ ایک دن آپ نے خواب دیکھا کہ مجلس اعلیٰ و اقدس حضرت سرور عالم مُرشد اتم صلی اللہ علیہ و علیٰ آلہ و اصحابہ و ازواجہ و اتباعہ وسلّم میں حاضر ہوں، غایت رعب سے قدم آگے نہیں بڑھتا ہے کہ ناگاہ میرے جدِ امجد حضرت حافظ بلاقی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور میرا ہاتھ پکڑ کر حضور حضرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم میں پہنچا دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ لے کر حوالہ حضرت میانجیو صاحب چشتی قدس سرہٗ کے کر دیا اور اس وقت تک بعالم ظاہر میانجیو صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ سے کسی طرح کا تعارف نہ تھا۔ بیان فرماتے ہیں کہ جب میں بیدار ہوا عجب انتشار و حیرت میں مبتلا ہوا کہ یارب یہ کون بزرگ وار ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دیا اور خود مجھ کو ان کے سپرد فرمایا۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے کہ ایک دن حضرت استاذی مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے میرے اضطرار کو دیکھ کر بکمال شفقت و عنایت فرمایا کہ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ موضع لوہاری یہاں سے قریب ہے وہاں جاؤ اور حضرت میانجیو صاحب سے ملاقات کرو، شاید مقصود دلی کو پہنچو اور اس حیص بیص سے نجات پاؤ۔ فرماتے ہیں کہ جس وقت حضرت مولانا سے میں نے یہ سنا متفکر ہوا اور دل سے سوچنے لگا کہ کیا کروں، آخر بلالحاظ سواری وغیرہ میں نے فوراً ارادہ لوہاری کی لی اور شدتِ شوق سے حیران و پریشان چلا جاتا تھا، یہاں تک کہ پیروں میں آبلے پڑ گئے۔ بارے بکشش و کوشش آستانہ شریف پر حاضر ہوا اور جیسے ہی دُور سے جمال باکمال ملاحظہ کیا۔ صورتِ انور کو کہ خواب میں دیکھا تھا بخوبی پہچانا اور محو خود رفتگی ہو گیا اور آپے سے گزر گیا ۔ افتاں و خیزاں اُن کے حضور میں پہنچ کر قدموں پر گر پڑا۔ حضرت میانجیو صاحب قدس سرہ العزیز نے میرے سر کو اُٹھایا اور اپنے سینہ نور گنجینہ سے لگایا اور بکمالِ رحمت و عنایت فرمایا کہ تم کو اپنے خواب پر کامل وثوق و یقین ہے ۔ یہ بھی کرامت منجملہ کرامات حضرت میانجیو صاحب کی ظاہر ہوئی اور دل کو بکمال استحکام مائل بجود کیا۔

الحاصل ایک مدت خدمت بابرکت جناب موصوف میں حلقہ نشین رہے اور تکمیل سلوک سلاسل اربعہ عموماً و طریق چشتیہ صابریہ خصوصاً کیا خرقہ و خلافت تامہ و اجازت خاصہ و عامہ سے مشرف ہوئے بعد عطائے خلافت حضرت میانجیو صاحب نے فرمایا کہ کیا چاہتے ہو تسخیر یا کیمیا جس کی رغبت ہو وہ تم کو بخشوں، آپ یہ سن کر رونے لگے اور عرض کیا کہ دنیا کے واسطے آپ کا دامن نہیں پکڑا ہے خدا کو چاہتا ہوں، وہی مجھ کو بس ہے۔ حضرت میانجیو صاحب قدس سرہٗ یہ جواب سُن کر بہت مسرور و خوش مزہ ہوئے اور آپ کو بغل گیر فرما کر علوِ ہمت پر آفریں کی اور دعاہائے مزید و جمیلہ دین اور خود حضرت میانجیو صاحب انار اللہ ضریحہ نے ۱۲۵۹ھ میں رحلت فرمائی۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ۔

یادِ الٰہی بعد ازاں قلب مبارک میں جذبہ الٰہیہ پیدا ہوا اور آپ آبادی سے ویرانہ کو چلے گئے ۔ مخلوق سے نفرت فرماتے تھے اور اکثر دولتِ فاقہ سے کہ سنّتِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے مشرف ہوتے تھے، یہاں تک کہ آٹھ آٹھ روز اور کبھی زیادہ گزر جاتے اور ذرا سی چیز حلق مبارک میں نہ جاتی اور حالت شدتِ بھوک میں اسرار و عجائب فاقہ منکشوف ہوتے تھے۔ بیان فرماتے تھے کہ ایک دن بہت بھوک کی تکلیف میں ایک دوست سے کہ نہایت خلوص دلی رکھتا تھا۔ چند روپے میں نے بطور قرض مانگے باوجود

وجود ہونے کے انکار صاف کر دیا۔ اس کی اس نا اتفاقی سے تکدر و ملال دل میں پیدا ہوا، چند منٹ کے بعد تجلی توحید افعالی نے استعلا فرمایا اور معلوم ہوا کہ یہ فعل فاعل حقیقی سے متکون ہوا ہے، اس وقت سے خلوص اس دولت کا زائد ہوا اور وہ تکدر مبدل بلطف ہو گیا۔ اس واقعہ کو چند ماہ گزرے تھے کہ میں مراقبہ میں تھا سیدنا جبرئیل و سیدنا میکائیل علیہما السلام کو دیکھا محو خود رفتہ رفتہ ہو گیا جو لذت کہ حاصل ہوئی احاطۂ بیان میں نہیں آسکتی اور وہ دونوں تبسم کناں دزدیدہ نگاہ سے دیکھتے ہوئے اسی طرح چلے گئے اور کچھ نہ کہا۔

سفر حجاز مقدس سید کائنات اشرف مخلوقات صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا فرماتے ہیں کہ تم ہمارے پاس آؤ۔ یہ خواب دیکھ کر خواہش زیارت مدینہ طیبہ دل میں متمکن ہوئی۔ یہاں تک کہ بلا فکر زاد و راحلہ کے آپ نے عزم مدینہ منورہ کر دیا اور چل کھڑے ہوئے۔ جب ایک گاؤں میں پہنچے آپ کے بھائیوں نے کچھ زاد راہ روانہ کیا۔ حضور نے اس کو بخوشی خاطر قبول کیا اور روانہ ہوئے، یہاں تک کہ پنجم ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ کو بمقام بندر لیس کہ متصل بندر جدہ کے ہے، جہاز سے اترے اور براہ راست عرفات کو تشریف لے گئے اور جملہ ارکان حج بجالائے اور مکہ معظمہ میں حضرت مولانا محمد اسحاق دہلوی قدس سرہ و حضرت عارف باللہ سید قدرت اللہ حنفی بنارسی ثم المکی سے کہ کرامات و خرق عادات میں مشہور تھے فیض و فوائد حاصل کیے اور حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے چند وصایا فرمائے۔

شاہ اسحاق کے وصایا ازاں جملہ یہ کہ اپنے کو کمترین مخلوقات سمجھنا چاہیے اور یہ کہ تا امکان خود قوت حرام و مشتبہ سے پرہیز واجب جانے۔ کیونکہ لقمۂ مشتبہ و حرام سے برابر نقصان ہے اور مراقبہ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى کی تعلیم فرمایا تاکہ ملاحظہ معنی صورت رویت حق تعالیٰ خود کو ملاحظہ کرے اور اس پر مواظبت رکھے تاکہ وجدان صورت ملکہ کا ہووے اور دوسری باتیں تعلیم فرمائیں اور اپنے خاندان کے معمولات کی اجازت دی اور فرمایا کہ فی الحال بعد زیارت مدینہ طیبہ تمہارا ہند کو جانا قرین مصلحت ہے، پھر انشاء اللہ تعالیٰ تمام تعلقات منقطع کر کے اور بہ ہمت تمام یہاں آؤ گے۔ البتہ چندے صبر ضروری ہے۔ اس وقت مدینہ منورہ کا راستہ مامون تھا اور کوئی شورش بدوؤں وغیرہ کی نہ تھی اور آپ کے دل کو سخت اضطراب و قلق مدینہ طیبہ کی حاضری کا تھا کہ علت غائی اس سفر کی یہی تھی۔ خیال تھا کہ اگر وہاں جانا نہ ہوا تو گویا تمام محنت مفت رائگاں ہوئی، بالآخر آپ نے بہ انتشار بحضور جناب سید قدرت اللہ عرض کیا۔ حضرت سید صاحب نے تسکین فرمائی اور چند بدوی مریدان خود کو آپ کے سپرد کیا اور حکم دیا کہ بحفاظت تمام ان کو مدینہ طیبہ لے جاؤ اور ان کے قلب کو کوئی رنج نہ پہنچنے پاوے، کیونکہ ان کے ملال سے تمہاری عاقبت کی خرابی متصور ہے، مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد　　تا دل صاحبدلے نامد بدرد

بالجملہ آپ مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے اور دل میں خیال آیا کہ اگر کوئی عامل کامل و عارف واصل بلا میری طلب کے اجازت پڑھنے درود تنجینا کی دیتا تو بہت اچھا ہوتا بارے بفضلہ تعالیٰ اس جوار پاک شاہ لولاک میں پہنچے اور شرف جواب صلوٰۃ و سلام حضرت

خیرالانام علیہ افضل الصلوٰۃ والسّلام سے مشرف ہوئے اور عارف خدا حضرت شاہ غلام مرتضیٰ جھنجھانوی ثم المدنی سے ملاقات فرمائی اور اپنے شوق دلی کا نسبت قیام مدینہ منوّرہ کے اظہار فرمایا حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ ابھی جاؤ چندے صبر کرو، پھر انشاء اللہ یہاں بہت جلد آؤ گے اور صاحب جذب و احسان حضرت مولانا شاہ گل محمد خانصاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہ متوطن قدیم رام پور تھے اور عرصہ تیس سال سے مجاور روضہ شریف تھے، ملاقات کی اور ان کی خدمت سے بہت فوائد حاصل کیے۔ حضرت خانصاحب موصوف نے بلا ذکر و طلب اجازت درود تنجینا کی دی کہ ہر روز اگر ممکن ہو ایک ہزار بار ورنہ تین سو ساٹھ بار پڑھا کرو، اور اگر اس قدر میں بھی دقت ہو تو اکتالیس بار تو ضرور پڑھا کرو اور ہرگز ناغہ نہ ہونے پاوے کہ اس میں بہت سے فوائد ہیں۔

آپ گو ظاہری علم شریعت میں علامۂ دوران اور مشہور زمان مولوی نہ تھے مگر علم لدنی کے جامہ سے آراستہ اور نور عرفان و ایقان کے زیورات سے سرتاپا پیراستہ قصبہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کو مہبط انوار و برکات اور فیوض و تجلیات بنانے ہوئے تھے۔

خلقۃً ضعیف و نحیف ——— اس پہ مجاہدات و ریاضات اور تقلیل طعام و منام اور سب سے بڑھ کر عشق حسن ازلی، جو استخواں تک کو گھلا دیتا ہے، جس کے باعث آخر میں کروٹ تک بدلنا دشوار تھا۔

ہجرت غدر کے بعد ایام غدر میں فساد و الزام بغاوت کے زمانہ میں مکہ معظمہ ہجرت فرمائے ہوئے اور کل چوراسی سال تین مہینہ بیس روز گوشہ ہائے عالم دنیا کو منوّر فرما کر بارہ یا تیرہ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۷ھ بروز چہارشنبہ بوقت اذان صبح اپنے محبوب حقیقی سے واصل ہوئے اور جنت المعلیٰ (مقبرہ مکہ معظمہ) میں مولوی رحمت اللہ کی قبر کے متصل مدفون ہوئے۔ اطاب اللہ ثراہ و جعل الجنۃ مثواہ۔

استغنا اور قناعت اعلیٰ حضرت گھر سے خوشحال اور موروثی جائیداد کا معقول حصہ پائے ہوئے تھے جو بظاہر الحال گزران معیشت کے لیے کافی و وافی سامان تھا، مگر آپ کا قلب سلیم چونکہ بالطبع زہد و توکل کا شیدا تھا اس لیے آپ نے اپنی ساری جائداد سکنی و زرعی اپنے بھائی کے نام منتقل کردی اور مسجد کے حجرہ کو مسکن بنایا تھا۔ اعلیٰ حضرت زاویہ خمول کی زیست اور گمنامی کے ساتھ ایام گزاری کی جانب بہت راغب تھے۔ اس لیے ہمیشہ اپنے کو چھپایا اور علحدگی و یکسوئی کو اخفا و کتمان حال کا سبب بنایا مگر بقول ؎

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید!

اپنے چھپائے کب چھپ سکتے تھے، خدائی مخلوق نے جبہ سائی کو فخر سمجھا اور جیسا کہ دین کا اپنے زمانۂ ولادت سے حال رہا ہے۔ غربا و مساکین اور عوام الناس طالب دین نیک بندوں کی آمد شروع ہوئی۔ مجبوراً امتثالاً للامر آپ طالبین کو بیعت فرماتے اور اللہ کا نام سیکھنے کے لیے آنے والی خلقت کی دستگیری فرماتے تھے۔ آخر ین طالبین کا ہجوم دن بدن بڑھتا گیا اور آپ اسی توکل کے وسیع خوان پر مہمانوں کی بخوشی ضیافت فرماتے رہے، یہاں تک کہ آپ کی بھاوج نے آپ کے پاس پیغام بھیجا کہ موروثی جائداد آپ منتقل فرما چکے خود توکل پر بعسرت و فقر گزران ہے، پھر اس پہ مہمانوں کی کثرت اور نووارد مسافروں کی زیادتی گو آپ کو بار نہ معلوم ہو مگر میری غیرت تقاضا نہیں کرتی کہ اس خدمت سے چشم پوشی کروں۔ اس لیے آج سے جتنے مہمان آئیں ان کی اطلاع غریب خانہ پر فرما دیں، ان کا کھانا دونوں وقت یہاں سے آئے گا۔ اوّل تو اعلیٰحضرت نے انکار فرمایا کہ نہیں میرے مہمان ہیں ان کی خدمت کا

مجھ ہی پر حق ہے مگر آخر بھابی صاحبہ کے اصرار کے سبب جو محض اخلاص کے ساتھ تھا۔ آپ نے قبول فرما لیا اور اس روز سے مہمانوں کا کھانا دونوں وقت وہاں سے آنے لگا۔ اعلیٰ حضرت کی بھاوج کا حسنِ اعتقاد اور مخلصانہ برتاؤ تھا کہ مہمانوں کا کھانا خود پکاتی تھیں اور کسی مہمان کے ناوقت آنے سے کبھی کبھی تنگ دل نہ ہوتی تھیں۔

حضرت گنگوہی کی بیعت

حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ تھانہ بھون میں داخل ہوتے ہی اول پیر محمد والی مسجد میں پہنچے، دیکھا کہ ظہر کی نماز ہو چکی ہے اور اعلیٰ حضرت اپنی سہ دری میں بیٹھے ہوئے تلاوت قرآن مجید میں مشغول ہیں۔ حضرت مولانا حاضر خدمت ہوئے اور ختم تلاوت پر سلام مسنون عرض کر کے بیٹھ گئے، اس سے قبل غالباً ایک مرتبہ دہلی اور دو مرتبہ گنگوہ اور ایک مرتبہ تھوڑی دیر کے لیے تھانہ بھون میں اعلیٰ حضرت کی زیارت ہوئی تھی یہ پانچویں ملاقات تھی مگر یوں کہنا چاہیے، وطن میں اعلیٰ حضرت کے مہمان بننے کا عمر بھر میں آپ کو پہلا اتفاق تھا۔ اعلیٰ حضرت نہایت ہی کریمانہ اخلاق سے پیش آئے اور غایت درجہ خاطر و مدارات فرمائی اور دریافت فرمایا کہ کیسے آئے، حضرت امام ربانی نے (ایک عالم کے ساتھ) مناظرہ کا قصد ظاہر کیا۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا ہاں ہاں ایسا ارادہ نہ کرنا، میاں وہ ہمارے بزرگ ہیں، بڑے ہیں۔ بس مباحثہ کا تو اسی جگہ فیصلہ ہو گیا اور حضرت یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ حضرت آپ کے بڑے ہیں تو میرے بھی بڑے ہیں۔ اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور آپ نے موقع پاکر بالفاظِ مناسب بیعت ہونے کی درخواست کی۔ اعلیٰ حضرت اطاب اللہ ثراہ نے عادت شریفہ کے موافق بیعت میں تامل ہی نہیں فرمایا بلکہ طلب صادق کو امتحان کی کسوٹی پر پرکھنے اور اعتقاد و شوق بڑھانے کے لیے صورت انکار کے لفظ زبان پر لائے۔ یہاں سوائے اخلاص و شوق کے کیا تھا، قطبیت کا جامہ پہننے والا ایک جسم تھا جو سر تا پا طلب بنا ہوا تھا۔ نخوت علم و تکبر مولویت نام کو بھی نہ تھی اور جو کچھ تھی وہ پہلی ہی گفتگو پر نکل چکی تھی۔ بس نتیجہ امتحان یہ تھا کہ جتنا ادھر سے انکار تھا اسی قدر ادھر سے اصرار، اور جس قدر اس جانب سے استغنا کا برتاؤ تھا اتنا ہی اس طرف سے احتیاج و افتقار کا اظہار۔ چونکہ پیرانِ عظام ہمیشہ طالبِ صادق اور ہونہار کی تلاش میں رہتے ہیں، اس لیے انھیں امتحان والے دو تین دن میں ایک دوسرے بزرگ نے بھی جن سے مناظرہ کرنے تشریف لائے تھے، طرح طرح سے آپ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهٖ صاحبدل کا ایک دل چونکہ ایک کا ہو لیا تھا اس لیے نہ پھرنا تھا نہ پھرا، چنانچہ اسی اثنا میں حافظ صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ آپ سے آنے کا سبب اور حال دل پوچھنے لگے تو آپ نے بے اختیار فرمایا جدھر دل کا میلان ہے وہ قبول نہیں کرتے دوسرے اپنی طرف کھینچتے ہیں عجب قصہ ہے، جناب حافظ صاحب نے دلاسا دیا اور فرمایا کہ ابھی جلدی کیا ہے چند روز ٹھہرو یہاں کے حالات دیکھو۔ آخر جب آپ کی پختگی ہر طرح ظاہر ہو گئی تو جناب حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں سفارش کا اجر حاصل فرمایا اور تھانہ کی حاضری سے دو تین روز کے بعد آپ کو سلاسل اربعہ میں اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت حاصل ہوئی۔ حضرت مولانا قدس سرہٗ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب اعلیٰ حضرت کے دست مبارک پر بیعت ہونے کا وقت آیا تو میں نے عرض کیا کہ حضرت ذکر و شغل اور محنت و مجاہدہ کچھ نہیں ہو سکتا اور نہ راتوں کو اٹھا جائے گا، اعلیٰ حضرت نے تبسم کے ساتھ

فرمایا اچھا کیا مضائقہ ہے۔ حضرت مولانا قدس سرہٗ منظوری شرط کے بعد بیعت ہوئے اور اعلیٰ حضرت نے آپ کو بارہ تسبیح تلقین فرما دیں۔ شب کے وقت اعلیٰ حضرت نے وہ چارپائی جس پر آپ استراحت فرماتے تھے اپنے پلنگ کے پاس بچھوالی اور آرام فرمایا۔ آخر شب میں جب اعلیٰ حضرت حسب معمول اُٹھے تو حضرت مولانا کی بھی آنکھ کھل گئی، مگر چونکہ بیعت کے وقت شرط ہو چکی تھی، اس لیے اعلیٰ حضرت نے کچھ نہیں فرمایا کہ "اٹھو بیٹھو یا بتلائی ہوئی دوازدہ تسبیح کا ذکر کرلو"، لیکن شیخ کا فیضان پہلے ہی اپنا اثر کرچکا تھا بھلا کس طرح ممکن تھا کہ حضرت مخدوم قدس سرہٗ بستر پر لیٹے رہتے یا نیند آجاتی۔ دو چار کروٹیں آپ نے ضرور بدلیں، اور کسی درجہ میں چاہا بھی کہ نیند آجائے، مگر حق تعالیٰ کو آپ سے جو کام چند ہی روز بعد لینا منظور تھا اس کے اسباب قریبہ اسی پہلی رات سے پیدا ہونے مقدر تھے، پس نہ آپ کی آنکھ لگی اور نہ آپ اس ناگوار و مضطرب حالت کے متحمل ہوسکے آخر خود ہی اُٹھے وضو کیا اور مسجد میں تشریف لائے ایک گوشہ میں اعلیٰ حضرت اپنے کام میں مشغول تھے، دوسرے گوشہ میں آپ جا کھڑے ہوئے، بہ نیت تہجد نوافل ادا کیے اور ذکر نفی و اثبات بالجہر شروع کر دیا۔ حضرت قدس سرہٗ نے جس وقت اس قصہ کا خود تذکرہ فرمایا تو یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آخر کار میں نے ذکر بالجہر شروع کیا گلا اچھا تھا بدن میں قوت تھی صبح کو جب حاضر خدمت ہوا تو حضرت فرمانے لگے کہ تم نے ایسا ذکر کیا جیسے کوئی بڑا مشاق کرنے والا ہو۔ اس دن سے ذکر جہر کے ساتھ مجھے محبت ہوگئی پھر کبھی چھوڑنے کو جی نہیں چاہا اور نہ کوئی وجہ شرعی اس کی ممانعت کی معلوم ہوئی۔

ہندوستان کا غدر اور ہجرت کی تفصیل مولانا قاسم العلوم کو (زمانۂ غدر میں) الیا، گنتھلہ، لاڈوہ، پنجلاسہ اور جمنا پار کئی دفعہ آنے جانے کا اتفاق ہوا اور امام ربانی (مولانا گنگوہی) قدس سرہٗ نے قیام زیادہ تر گنگوہ یا رام پور میں کیا مگر اپنے ہادیِ برحق کی ہندوستان میں آخری زیارت کے شوق سے بے تاب ہو کر انبالہ، تگری اور پنجلاسہ کے سفر کو اُٹھے اور مخفی طور پر اس حق کو ادا فرما کر واپس وطن ہوئے اس زمانہ کی کیفیات ایسی عجیب و غریب گذری ہیں کہ اگر کھلی کرامتوں کے ذکر پر اکتفا کیا جائے تو کئی ورق چاہئیں، اس لیے ان کو تفصیلاً چھوڑتا ہوں اور ضروری مضمون پر اکتفا کرتا ہوں۔ تینوں حضرات کے نام چونکہ وارنٹ گرفتاری جاری ہوچکے اور گرفتار کنندہ کے لیے صلہ تجویز ہوچکا تھا اس لیے لوگ تلاش میں ساعی اور حراست کی تگ و دو میں پھرتے تھے اعلیٰ حضرت نے وطن کو خیرباد کہا اور بہ نیت حرمین گھر سے باہر نکلے، چونکہ مولانا گنگوہی سے زیادہ تعلق تھا اس لیے آخری ملاقات کے لیے گنگوہ تشریف لائے۔ اس وقت حضرت مولانا قدس سرہٗ کی صاحبزادی یعنی حافظ محمد یعقوب صاحب کی والدہ ماجدہ کی عمر دو سال کی تھی۔ جس وقت پنجلاسہ ضلع انبالہ میں پہنچے ہیں تو راؤ عبداللہ خاں رئیس کے اصطبل اسپاں کی ویران و تاریک کوٹھری میں مقیم تھے۔ ایک روز اُسی کوٹھری میں وضو فرما کر چاشت کی نماز کے ارادہ سے مصلٰے بچھایا اور جاں نثار حضار جلسہ سے فرمایا کہ آپ لوگ جائیں میں نفلیں پڑھ لوں۔ راؤ عبداللہ خاں اعلیٰ حضرت کے بڑے جاں نثار خادم اور مشہور مرید تھے۔ گھر کے خوشحال زمیندار اور سرکار کے نزدیک باوجاہت شخص سمجھے جاتے۔ سمجھتے تھے کہ اعلیٰ حضرت پر جو الزام لگایا گیا ہے اس کے قائم ہوتے اپنا مکان کھول دینا و نیاوی حیثیت سے کس درجہ خطرناک ہے، کیونکہ باغی کی اعانت بھی سرکاری بغاوت میں شمار رہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی غلبہ

حُبِّ دین اور فرطِ عشق میں اس درجہ مغلوب تھے کہ نہ مال کی پروا تھی نہ جان کی۔ خدا کی شان کہ جس وقت راؤ عبداللہ خاں اعلیٰحضرت کو تحریر باندھے نوافل میں مشغول چھوڑ کر کوٹھری سے باہر نکلے اور پٹ بند کر کے اصطبل کے دروازہ کے قریب پہنچے ہیں تو سامنے سے دو شخصوں کو آتے دیکھا اور ہکا بکا شش در کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ خدا جانے مخبر کون تھا اور کس بلا کا پتلا تھا۔ جس نے عین وقت روپوشی کی کوٹھری تک معین کر دی تھی، چنانچہ دوش اصطبل کے پاس پہنچی اور افسر نے مسکرا کر راؤ صاحب سے ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں، گویا اپنے ناوقت آنے کی وجہ کو چھپایا۔ جہاں دیدہ و تجربہ کار راؤ صاحب دور ہی سے تاڑ گئے تھے کہ اب گل دیگر شگفت مگر نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن۔ اپنی جان یا عزت کے جانے، ریاست و زمینداری کے ملیامیٹ ہونے اور ہتھکڑیاں پڑ کر جیل خانہ پہنچنے یا پھانسی پر چڑھ کر عالم آخرت کا سفر کرنے کی تو مطلق پروا نہ تھی۔ اگر فکر و رنج یا حزن و افسوس تھا تو یہ کہ ہائے غلام کے گھر سے آقا گرفتار ہوا اور عبداللہ خاں کی نظر کے سامنے اس کا جان سے زیادہ عزیز شیخ پابہ زنجیر کیا جائے۔ مگر اس کے ساتھ ہی راؤ صاحب ایک جوانمرد مستقل مزاج نہایت دلیر اور قوی القلب راجپوت تھے۔ تشویش کو دل میں دبایا اور چہرہ یا اعضا پر کوئی بھی اثر خطر کا محسوس نہ ہونے دیا۔ مسکرا کر جواب دیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ دوش کا افسر گھوڑے سے اترا اور یہ کہہ کر کہ میں آپ کے یہاں ایک گھوڑے کی تعریف سنی ہے اس لیے بلا اطلاع یکایک آنے کا اتفاق ہوا، اصطبل کی جانب قدم اٹھا۔ راؤ صاحب بہت اچھا کہہ کر ساتھ ساتھ ہو لیے اور نہایت ہی اطمینان کے ساتھ گھوڑوں کی سیر کرانی شروع کی۔ افسر بار بار راؤ صاحب کے چہرہ پر نگاہ جماتا اور اس درجہ مطمئن پا کر کبھی مخبر کی دروغ گوئی کا غصہ اور گاہے اپنی ناکامی و تکلیف سفر کا افسوس لاتا تھا، یہاں تک کہ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا ہوا حاکم اس حجرہ کی طرف بڑھا جس میں اعلیٰ حضرت کی سکونت کا مخبر نے پتہ دیا تھا اور یہ کہہ کر کہ اس کوٹھری میں کیا گھاس بھری جاتی ہے اس کے پٹ کھول دیے۔ راؤ عبداللہ کی جو اس وقت حالت ہوئی ہوگی وہ انھیں کے دل سے پوچھا چاہیے۔ سمجھتے تھے کہ تقدیر کے آخری فیصلہ کا وقت آگیا اور اپنا پیمانۂ حیات لبریز ہوا چاہتا ہے اسی لیے راضی برضا ہو کر حکم گرفتاری کے منتظر کھڑے ہو گئے۔

حضرت کی کرامت خداوندی حفاظت کا کرشمہ دیکھیے کہ جس وقت کوٹھری کا دروازہ کھلا ہے تخت پر مصلیٰ ضرور بچھا لوٹا رکھا ہوا اور نیچے وضو کا پانی البتہ بکھرا ہوا پڑا تھا مگر اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کا پتہ بھی نہ تھا۔ افسر متحیر و حیران اور راؤ عبداللہ خاں دل ہی دل میں شیخ کی عجیب کرامت پر فرحان و شاداں۔ کچھ عجیب سماں تھا کہ حاکم نہ کچھ اور دریافت کرتا ہے نہ استفسار کر دیکھتا ہے کبھی اُدھر۔ آخر مخبر کی دھمکی وہی سمجھ کر بات کو ٹالا اور کہا کہ خانصاحب یہ لوٹا کیسا اور پانی کیوں پڑا ہے۔ راؤ صاحب جناب اس جگہ ہم مسلمان نماز پڑھتے ہیں اور وضو میں منہ ہاتھ دھویا کرتے ہیں۔ چنانچہ ابھی آپ کے آنے سے دس منٹ قبل ملیامیٹ تھی۔ افسر نے ہنس کر کہا "آپ لوگوں کی نماز کے لیے تو مسجد ہے یا اصطبل کی کوٹھری۔" راؤ صاحب نے فوراً جواب جناب مسجد فرض نماز کے لیے ہے اور نفل نماز ایسی ہی جگہ پڑھی جاتی ہے، جہاں کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ لاجواب جواب سن نے پٹ بند کر دیے اور اصطبل کے چاروں طرف غائر نظر دوڑانے کے بعد باہر نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو کر یہ کلمات کہہ کر رخصت

راؤ صاحب معاف کیجیے آپ کو اس وقت ہماری وجہ سے بہت تکلیف اُٹھانا پڑی اور پھر بھی ہمیں کوئی گھوڑا پسند نہ آیا۔ راؤ عبداللہ صاحب کی نظر سے فوش کے سوار جب اوجھل ہو گئے تو واپس ہوئے اور کوٹھری کھول دی، دیکھا اعلیٰ حضرت نماز سے سلام پھیر چکے اور مصلے پر مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں۔

مولانا گنگوہی کی بیقراری

سب سے زیادہ مولانا گنگوہی کو اعلیٰ حضرت کی مفارقت کا غم تھا جو آپ کو کسی کروٹ چین نہ لینے دیتا تھا۔ راتوں آپ کو اس رنج میں نیند نہ آتی اور دنوں آپ اس دُھن میں رہتے کہ کسی طرح اعلیٰ حضرت کی ایک دفعہ اور زیارت کرلوں، اگر جائیں تو کہاں جائیں اور ملیں تو کس طرح ملیں نہ اعلیٰ حضرت کی کوئی جائے قیام معین نہ بحالت روپوشی کسی جگہ کا تعین۔ آخر شدہ شدہ آپ کو پنجلاسہ کا پتہ چلا اور آپ بسم اللہ کہہ کر گنگوہ سے نکل کھڑے ہوئے۔ راتوں چلتے دنوں چھپتے خاردار جنگل پیدل قطع کرتے تگری پہنچے اور حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری کے مقام پر مقیم ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مولانا عبدالرحیم صاحب کو طفولیت میں حضرت امام ربّانی کی زیارت ہوئی اور آفتاب عالم کو اپنے گھر کا مہمان بنا دیکھا۔ حضرت مولانا نے نہایت شفقت کے ساتھ آپ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا پڑھ کر دم فرمائی۔ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب مدظلہ کے والد ماجد راؤ اشرف علی خاں تگری کے خوشحال زمیندار اور نہایت نیک خیال دیندار شخص تھے۔ راؤ صاحب کا حضرت مولانا سے کوئی تعارف نہ تھا، مگر حسن اتفاق تھا کہ راؤ صاحب کو یہ انمول جواہرات گھر بیٹھے بلا طلب حاصل ہوئے اس وقت مولانا عبدالرحیم صاحب کی عمر تین یا چار سال کی تھی۔ راؤ صاحب نے کچھ عجیب اخلاص کے ساتھ مسافر مہمان کی مدارات کی اور شب کو بیعت کی درخواست کرنے لگے۔ حضرت مولانا نے انکار فرمایا اور کہا کہ اعلیٰ حضرت ابھی تشریف فرما ہیں، اگر یہ قصد ہے تو وقت کو غنیمت سمجھیے۔ غرض راؤ صاحب نے آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر رکھا اور ساتھ ہی چلنے کے متمنی و عازم ہوئے۔ حضرت مولانا نے اپنی بے سروسامانی اور اندیشہ ناک حالت ظاہر فرما کر سمجھایا کہ معیّت قرینِ مصلحت نہیں، البتہ اگلے دن آپ آئیں اعلیٰ حضرت سے سفارش کا میں ذمہ دار ہوں۔ چنانچہ ایک شب قیام فرما کر مولانا چل دیے اور اعلیٰ حضرت کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اگلے دن راؤ صاحب بھی حاضر آستانہ ہوئے اور حضرت مولانا کی تقریب سے ایسی حالت میں بیعت ہوئے جس کو سراسیمگی اور چل چلاؤ کی حالت کہا جاتا ہے۔ حضرت امام ربّانی نے ہرچند اصرار کیا کہ بندہ کو ہمرکاب لے چلیں، مگر اعلیٰ حضرت نے نہ مانا اور یہ فرمایا کہ اسی طرح خدا کا حکم ہے، جاؤ تمہیں خدا کے سپرد کیا، آپ کو وہاں سے رخصت فرما دیا۔ حضرت مولانا بادلِ نخواستہ "الفراق الفراق" کہتے روانہ ہوئے اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ اعلیٰ حضرت نے تسلی و تشفی دی اور فرمایا میاں رشید احمد تم سے تو حق تعالیٰ کو ابھی بہتیرے کام لینے ہیں گھبراؤ مت، ہندوستان سے نکلتے وقت تم سے ضرور مل کر جاؤں گا۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے اور مراتب میں ترقی دے۔ اس کے بعد دیر تک چھاتی سے لگائے رکھا اور آخر کار پدرانہ شفقت اور مربیانہ محبت کے انداز پر خود بھی چشم نم ہوئے اور مولانا کو بھی رُلایا۔

ہجرت مکہ معظمہ و نکاح

ایام غدر ہندوستان میں بوجہ بے نظمی دین و تغلب معاندان دین قیام ہند گراں خاطر ہوا اور ارادۂ ہجرت و اشتیاق زیارت روضۂ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم جوش و خروش میں آیا اور سنہ ۱۲۷۶ھ میں براہ پنجاب روانہ ہوئے اور

ے راہ میں پاک پٹن وحیدرآباد سندھ وغیرہ مواضع میں زیارات بزرگان مقامات مذکور سے مشرف اور فیوض و برکات سے
ہوتے ہوئے کراچی بندر پہنچے۔ وہاں سے جہاز پر سوار ہوئے اور انوار و برکات ہجرت ابتدائے سفر سے مشاہدہ فرمانے لگے،
بدطے منازل خیر البلاد مکہ معظمہ پہنچے اور انوار و برکات اس مقام متبرک سے فیض یاب ہوئے اور اس مقام مقدس کو مسکن و
اپنا بنایا۔ اولاً چند سال تک جبل صفا پر اسمٰعیل سیٹھ کے رباط کے ایک خلوہ میں معتکف رہے اور مشغول حضرت حق جل و علا
ت نہ دیتی تھی کہ جو دوسرے سے مخاطب ہوں ناچار مخلوق سے کم ملتے تھے، لیکن مشاہیر علماء و شیوخ کے ساتھ کبھی کبھی خلوت
بت میں اکٹھا ہوتے تھے اور کلمات رمز و اسرار و لطف و اخلاق درمیان میں آتے تھے اور باہم رسم دوستی مستحکم رکھتے تھے اور
ات کمال تعظیم و احترام حضرت فرماتے تھے۔

آپ کے ارشادات پُر از حکمت ہیں:

—— ایک شخص نے تصوف کے معنی پوچھے فرمایا کہ تصوف کے معنی میں بسبب احوال مشائخ مختلف اقوال ہیں ہر کوئی اپنے مقام یا
حال کے موافق مسائل کا جواب دیتا ہے۔ یعنی مبتدی سائل کو از روئے معاملات مذہب ظاہر اور متوسط کو از روئے احوال
منتہی کو از روئے حقیقت البتہ تمام اقوال میں اظہر قول یہ ہے کہ اول ابتدائے تصوف علم ہے اور اوسط عمل و آخر عطا و
بخشش وجذبۂ الٰہی ہے اور علم مراد مرید کی کشایش کرتا ہے اور عمل اس کی توفیق و طلب پر مدد کرتا ہے اور بخشش مرتبہ غایت
رجا کو کہ احاطۂ بیان سے باہر ہے، پہنچاتی ہے اور حق سبحانہٗ کے ساتھ واصل کرتی ہے اور اہل تصوف تین قسم کے ہیں یعنی تین
مراتب رکھتے ہیں: اول مرید کہ اپنی مراد طلب کرتا ہے، دوم متوسط کہ طلب گار آخرت ہے، سوم منتہی کہ اصل مطلوب تک
پہنچ گئے ہیں اور انتقالات احوال سے محفوظ ہیں۔

—— پھر ارشاد ہوا کہ طالب طریق تصوف کو چاہیے کہ ادب ظاہر و باطنی کو نگاہ میں رکھے۔ ادب ظاہر یہ ہے کہ خلق کے ساتھ بحسن ادب
و کمال تواضع و اخلاق پیش آئے اور ادب باطنی یہ ہے کہ تمام اوقات و احوال و مقامات میں با حق سبحانہ رہے۔ حسن ادب ظاہر
سرنامۂ ادب باطن کا ہے اور حسن ادب ترجمان عقل ہے بلکہ التصوف کلہ ادبٌ، دیکھو حق تعالیٰ اہل ادب کی بندگی کی
مدح فرماتے ہیں اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ [illegible] اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى
لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ۔ جو کوئی کہ ادب سے محروم ہے وہ تمام خیرات و مبرات سے محروم ہے اور جو کہ محروم از ادب
ہے وہ قرب حق سے بھی محروم ہے۔

از ادب پُر نور گشت است ایں فلک وز ادب معصوم پاک آمد ملک

—— ایک شخص نے حاضرین سے عرض کیا کہ صوفی کون ہے اور ملامتی کون؟ فرمایا صوفی وہ ہے کہ سوائے اللہ کے دنیا و خلق سے
مشغول نہ ہوا اور رد و قبول مخلوق کی پروا نہ رکھے۔ مدح و ذم اس کے نزدیک برابر ہو اور ملامتی وہ ہے کہ نیکی کو چھپائے
اور بدی کو ظاہر کرے۔

——— ایک آدمی نے فقیر کے معنی دریافت کیے۔ فرمایا فقر دو طرح پر ہے، اختیاری و اضطراری۔ فقر اختیاری جو واسطے رضائے حق کے ہو، دولت مندی سے بدرجہا افضل ہے۔ کہ حدیث الفقر فخری میں اسی فقر کی طرف اشارہ ہے اور فقر اضطراری عوام کو ہلاکت کفر تک پہنچاتا ہے کہ حدیث کاد الفقر ان یکون کفراً سے یہی مراد ہے اور معنی فقر کے محتاجی ہیں اور فقیر حقیقی وہ ہے کہ اپنے نفس سے بھی محتاج ہو یعنی مالک اپنے نفس کا بھی نہ رہے کیوں کہ جس قدر فقیر کا ہاتھ ہر چیز سے خالی ہوگا اسی قدر اس کا دل ماسوائے اللہ سے خالی ہوگا اور فانی فی اللہ و باقی باللہ ہو جائے گا۔

——— ایک دن بطور نصیحت کے بیان فرمایا کہ ہرگز ہرگز گرد دنیا کے نہ جاؤ اور دل کو اس کا گرویدہ نہ بناؤ کیونکہ دنیا کی مثال آدمی کے سایہ کے ہے اگر کوئی سایہ کی طرف متوجہ ہو تو وہ اس کے آگے آگے بھاگتا نظر آئے اور اگر سایہ کو پس پشت کرے وہ خود پیچھا نہ چھوڑے۔ یہی حال دنیا کا ہے کہ جو کوئی دنیا کو ترک کرتا ہے دنیا اس کا پیچھا کرتی ہے اور جو کوئی طلب دنیا میں کوشش کرتا ہے اس سے کوسوں دور رہتی ہے اور ترک کرنے والے کو تلاش کرتی ہے۔

——— ایک دن ایک شخص نے سوال کیا کہ طالب راہ حق کو کیا کیا ضرور ہے، فرمایا اوّل طالب شے کو لازم ہے کہ حقیقت و ماہیت شے مطلوبہ کی دریافت کرے تاکہ رغبت اس کے حاصل کرنے کی دل میں پیدا ہو۔ پس جو شخص کہ ارادہ کرے کہ صوفیوں کے طریق و راہ حق پر چلے، اولاً ماہیت و حقیقت و غایت تصوف (کہ راہ حق ہے) معلوم کرے۔ بعد ازاں ان کے اعتقادات و آداب ظاہری و باطنی کو سمجھے۔ خصوصاً اطلاقات کو کہ ان کے حال و قال و تصنیفات میں آتے ہیں جانے اور خاص خاص اصطلاحات کہ ان کے کلمات میں پائی جاتی ہیں ان سے واقف ہو تاکہ تابعداری ان کے افعال و اقوال و احوال کی کر سکے۔

ایک دن ایک شخص نے مسئلہ وحدت وجود کا سوال کیا فرمایا کہ یہ مسئلہ حق و صحیح مطابق الواقع ہے[له]۔ اس مسئلہ میں کچھ شک و شبہ نہیں معتقد علیہ تمامی مشائخ کا ہے، مگر قال و قرار نہیں ہے۔ البتہ حال و تصدیق ہے یعنی اس مسئلہ میں تیقن اور تصدیق قلبی کافی ہے اور استتار اس کا لازم اور افشا نا جائز ہے کیوں کہ اسباب ثبوت اس مسئلہ کے کچھ نازک ہیں بلکہ بحدے دقیق کہ فہم عوام بلکہ فہم علمائے ظاہر میں کہ اصطلاح عرفا سے عاری ہیں نہیں آتے تو الفاظ میں کہنا اور دوسرے کو سمجھانا کب ممکن ہے بلکہ جن صوفیوں کا سلوک ناتمام ہے اور مقام نفس سے ترقی کر کے مرتبۂ قلب تک نہیں پہنچے ہیں، اس مسئلہ سے ضرر شدید پاتے ہیں اور مکر نفس سے چاہ الحاد و قعر ضلالت میں پڑ جاتے ہیں۔ نعوذ باللہ منہا اس جگہ پر زبان کو روکنا واجب ہے۔

——— فرمایا کہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ طریقت شریعت سے جدا ہے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اقرار باللسان اشارہ طرف شریعت کے ہے اور تصدیق بالجنان سے طلب طریقت ہے۔ پس ایک بغیر دوسرے کے کام کا نہیں۔ اقرار بدون تصدیق نفاق ہے اور تصدیق بلا اقرار بے کار۔

له عقلی و نقلی و کشفی تینوں طرح سے ہے۔

ــــــ فرمایا کہ ایک روز دو آدمی آپس میں بحث کرتے تھے ایک کہتا تھا کہ حضرت شیخ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ حضرت غوث اعظم قدس سرہٗ سے افضل ہیں اور دوسرا حضرت غوث پاک کو شیخ پر فضیلت دیتا تھا۔ میں نے کہا کہ ہم کو نہ چاہیے کہ بزرگوں کو ایک دوسرے پر فضیلت بیان کریں اگرچہ اللہ فرماتا ہے فضلنا بعضھم علیٰ بعض جس سے معلوم ہوا کہ واقع میں تو تفاضل ہے لیکن ہم دیدۂ بصارت نہیں رکھتے۔ اس واسطے مناسب شان ہمارے نہیں ہے کہ محض رائے سے ایسی جرأت کریں البتہ مرشد کو تمامی اس کے معاصرین پر فضیلت باعتبار محبت کے دینا مضائقہ نہیں، کیونکہ ظاہر ہے کہ باپ کی محبت چچا سے زیادہ ہوتی ہے اور اس میں آدمی معذور ہے۔ اُس نے یعنی قادری نے دلیل پیش کی کہ جس وقت حضرت غوث پاک نے قدمی علی رقاب اولیاء اللہ فرمایا تو حضرت معین الدین نے فرمایا بل علیٰ عینی بر ثبوت افضلیت حضرت غوث اعظم کا ہے۔ میں نے کہا کہ اس سے تو فضیلت حضرت معین الدین صاحب کی حضرت غوث پر ثابت ہو سکتی ہے دربرخلاف اس کے کیوں کہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت غوث اُس وقت مرتبہ الوہیت یعنی عروج میں تھے اور حضرت شیخ مرتبہ عبدیت یعنی نزول میں، اور نزول کا افضل ہونا عروج سے مسلم ہے۔

ــــــ فرمایا کہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے باعتبار مراتب مردمان کے تین معنی ہیں لا معبود لا مطلوب لا موجود الا اللہ اور یہ سب مراتب سے اعلیٰ ہے۔

ــــــ فرمایا سیر تین طرح پر ہے سیر الی اللہ، و فی اللہ و من اللہ۔

ــــــ فرمایا کہ ایمان رجا اور خوف میں ہے ہم لوگ رجا پر بھروسہ اور غرور کر رہے ہیں اور خوف کو بھول بیٹھے ہیں۔

ــــــ فرمایا عاشق دو طرح پر ہے عاشق ذاتی و عاشق صفاتی اور مرتبہ عاشق ذاتی کا عاشق صفاتی سے زیادہ ہے۔ کیونکہ عاشق ذاتی پر جو کچھ وارد ہوتا ہے اس کو ذاتِ الٰہی سے جانتا ہے۔ پس اس وجہ سے رضا و تسلیم میں مرتبہ عالی پاتا ہے۔ ایک دن حضرت غوث الاعظم سات اولیاء اللہ کے ہمراہ بیٹھے ہوئے تھے ناگاہ نظر بصیرت سے ملاحظہ فرمایا کہ ایک جہاز قریب غرق ہونے کے ہے آپ نے ہمت توجہ باطنی سے اُس کو غرق ہونے سے بچایا وہ ساتوں آدمی کہ عاشق ذات اور مرتبہ رضا و تسلیم میں ثابت قدم تھے، اس امر حضرت غوث کو خلاف خیال کر کے آپ سے ناخوش ہوئے اور اپنی مجلس سے علیحدہ کر دیا۔ ایک دن آپ نے دیکھا کہ سات ڈھانچے ہڈیوں کے مسلم رکھے ہیں دریافت ہوا کہ ایک درندے نے خدا سے دُعا مانگی کہ مجھ کو اپنے دوستوں کا گوشت کھلا وہ ساتوں آدمی پیش کیے گئے اور اس درندے نے گوشت ان مردانِ خدا کا کھانا شروع کیا۔ جس وقت درندہ دانت مارتا تھا وہ لوگ ہرگز دم نہ مارتے تھے یہاں تک کہ تمام گوشت اپنا راہ مولیٰ میں نثار کر دیا اور صرف ہڈیاں باقی رہ گئیں۔

ــــــ فرمایا انما الاعمال بالنیات تصوف کی جڑ ہے۔

ــــــ فرمایا ایک آدمی نے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی غیبت کی، آپ نے ایک طبق دینار کا اُس کو ہدیۃً دیا لوگوں نے پوچھا

کہ یہ کیسا اُلٹا معاملہ ہے، امام صاحب نے فرمایا هل جزاء الاحسان الا الاحسان اس شخص نے مجھ کو نعمت اخروی دی تو کیا میں اُس کو دنیا کی نعمت بھی نہ دوں۔

——— فرمایا کہ تواضع نفاق کے ساتھ ممنوع ہے۔

——— فرمایا کہ مولد شریف تمامی اہل حرمین کرتے ہیں، اسی قدر ہمارے واسطے حجت کافی ہے اور حضرت رسالت پناہ کا ذکر کیسے مذموم ہو سکتا ہے، البتہ جو زیادتیاں لوگوں نے اختراع کی ہیں نہ چاہئیں اور قیام کے بارے میں میں کچھ نہیں کہتا۔ ہاں مجھ کو ایک کیفیت قیام میں حاصل ہوتی ہے۔

——— فرمایا واسطے تقویت حافظہ کے یا علیم علمنی مالم اکن اعلم یا علیم اکتالیس بار بعد نماز عصر پڑھنا چاہیے اور سورۂ فاتحہ بعد نماز فجر گیارہ بار پڑھنا چاہیے یا روٹی پر لکھ کر کھائیں۔

——— فرمایا ؎

یک زمانہ صحبتے با اولیاء　　　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

——— فرمایا کہ وظائف میں عدد طاق عمدہ ہیں نو ہوں یا گیارہ۔

——— فرمایا اصل ذوق شوق محبت ہے، کشف و کرامات ثمرات زائدہ ہیں، ہوئے ہوئے نہ ہوئے نہ ہوئے۔ عارف اس کو ایک جو کے برابر نہیں سمجھتے بلکہ اکثر حجاب ہوتا ہے۔

——— فرمایا صورت نیکوں کی اختیار کرنا چاہیے، سیرت اللہ تعالیٰ درست کر دے گا کیونکہ وہ واہب و فیاض ہے۔ دریافت کیا گیا کہ ساحران موسیٰ علیہ السلام مشرف بہ ایمان ہوئے اور فرعونیاں کافر رہے اس کی کیا وجہ تھی؟ فرمایا کہ ساحروں نے صورت موسوی اختیار کی تھی اس کے طفیل وہ نیک ہوئے۔

——— فرمایا کہ مراتب (عرفا) چار ہیں: مجذوبؒ - سالکؒ - مجذوبؒ سالک - سالکؒ مجذوب، اور یہ سب سے بڑا مرتبہ ہے ایک آدمی قوم ہندو، تا تھو نامی حالتِ جذب میں تھا، ایک دن مجھ سے کہا کہ اولے گریں گے، ایسا ہی ہوا اگر کافر سے ایسا ظاہر ہو تو اُسے استدراج کہتے ہیں اور ایسے آدمی حالت کفر میں مرتے ہیں۔

——— فرمایا کہ عذاب و ثواب اس جسم پر نہیں ہے بلکہ جسم مثالی پر کہ خواب میں نظر آتا ہے ہوگا و نیز روح اعظم انسانی پر کہ ایک تجلی حق ہے، عذاب نہ ہوگا مثل آفتاب کے ہے اور روح حیوانی مانند چراغ۔

——— فرمایا کہ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نے مجھ کو چار چیزیں تلقین فرمائیں: (۱) طلب رزقِ حلال (۲) تمام عالم سے اپنے کو بدتر سمجھنا (۳) مراقبہ احسان (۴) ترک اختلاط غیر جنس۔

——— فرمایا کہ مولانا فخر الدین و شاہ ولی اللہ و خواجہ میر درد و مرزا مظہر جانجاناں رحمہم اللہ تعالیٰ کی کسی شخص نے ضیافت کی اور اپنے گھر بٹھا کر خود غائب ہو گیا اور بہت دیر کے بعد یہاں تک کہ نماز کا وقت آگیا، آکر دو دو پیسے سب کے ہاتھ پر رکھ دیے

مولانا صاحب پر چونکہ اخلاق رحمت وانکسار غالب تھا آپ نے اس کی تعظیم اور بیسیوں کو بسر و چشم سے لگا کر قبول کیا اور مرزا صاحب چونکہ بہت نازک طبیعت ولطیف مزاج تھے (یہاں تک کہ زمانۂ بچپن میں بدصورت دایہ کی گود میں نہ جاتے تھے) کہنے لگے کہ میاں اگر یہی ارادہ تھا تو خواہ مخواہ اتنی دیر کی اور دوسرے حضرات نے کچھ نہیں کہا۔

——— فرمایا کہ شیر خاں صاحب خلیفہ حضرت میاںجی شاہ نور محمد صاحب قدس سرہٗ میرے برادر ارشادی جب قریب رحلت ہوئے وقت نزع لوگوں نے تلقین کلمہ شروع کیا اور وہ منہ پھیر لیتے تھے۔ سب کو تعجب تھا کہ ایسے بزرگ کی یہ حالت ہے کہ جس سے سوئے خاتمہ کا خیال ہوتا ہے۔ جب حضرت مرشد تشریف لائے اور پوچھا کہ کیا حال ہے فرمایا "الحمد للہ، لیکن یہ لوگ مجھ کو پریشان کرتے ہیں اور مسمی سے طرف اسم کے لاتے ہیں"۔ پس مراتب لوگوں کے مختلف ہیں۔ اعراض کلمہ سے سوء خاتمہ پر استدلال نہ کرنا چاہیے۔ ممکن ہے اُس میں کوئی وجہ خاص ہو جیسے ذکر۔

بہارا قول پس وہ شخص معذور ہوگا، لیکن اس سے زیادہ کمال جامعیت ہے کہ باوجود مشاہدہ مسمی کے اسم کا حق بھی ادا کیے

——— ایک بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں اور ایک کتاب پڑھی جاتی ہے جس کو حضور کمال توجہ سے سن رہے ہیں۔ دریافت فرمایا کہ یہ کون کتاب ہے۔ کہا گیا احیاء العلوم حجۃ الاسلام امام غزالی کی ہے فرمایا یہ لقب عطیہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

——— فرمایا کہ کوئی مہم پیش آئے سورہ یٰسین پڑھیں اور ہر فتح مبین پر پہنچکر سات بار سورہ فاتحہ مع تسمیہ پڑھیں اور اول و آخر سورۃ کے درود شریف پڑھیں۔ درود مثل صندوق کے ہے کہ اپنے اندر لپیٹ کر (وظیفہ ودعا کو) لے جاتا ہے۔ یا سورۂ مزمل سات بار پڑھیں کہ معمولات مشائخ سے اور مجرب ہے اور سورۃ فاتحہ اکتالیس بار جو میں نے اپنے آدمیوں (مریدوں) پر لازم کیا ہے، اس سے بہتر امور دینی و دنیاوی کے لیے کچھ نہیں ہے فقط۔

——— فقیر کو چاہیے کہ نہ طمع کرے نہ منع کرے۔

——— مومن خاں (دہلوی) مجھ سے بہت اعتقاد رکھتے تھے، میں نے پوچھا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مثنوی کی نظم سست ہے ۔ جواب دیا کہ کوئی جاہل کہتا ہوگا، اساتذہ کے نزدیک مثنوی سند ہے۔ بعد انتقال خاں صاحب کے لوگ حسب وصیت اُن کی قبر پر گئے، ان کا حال عمدہ پایا۔

——— فرمایا کہ مولوی محمد قاسم صاحب نے پوچھا کہ میں نوکری چھوڑ دوں، میں نے (حضرت نے) جواب دیا کہ جب ایسی حالت ہو کر پوچھنے کی ضرورت نہ پڑے تب چھوڑیو۔

——— دعا میں درود مثل صندوق کے ہے۔

——— فرمایا کہ جو مزہ میں نے فقر و فاقہ میں دیکھا اور اس میں میرے مراتب کی ترقی ہوئی اور انبیا علیہم السلام و ملائک مقربین کی زیارت ہوئی اور انوار و تجلیات مجھ پر نازل ہوئے وہ امور پھر فراغت میں میسر نہ ہوئے، فرمایا فقر و فاقہ بڑی نعمت ہے

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں الفقر فخری۔

——فرمایا کہ مومن خاں صاحب دہلوی فرماتے تھے کہ ایک بار چند حضرات شاہ عبدالعزیز صاحب سے حدیث شریف پڑھ رہے تھے۔ شاہ صاحب نے تذکرہ اکابرین دین کا کیا ہم لوگوں نے عرض کیا کہ اب بھی کوئی ایسا ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ پرسوں ہمارے پاس فلاں حُلیہ کا ایک شخص مسئلہ دریافت کرنے آوے گا وہ مرد کامل ہے اور سمت و وقت بھی معین کر دیا۔ ہم لوگ روز موعود میں زینت المساجد میں کہ کنارے جمنا کے واقع ہے ان کے اشتیاق میں بیٹھے تھے۔ وقت مقررہ پر دریا کے کنارے سے اُسی حُلیہ کے ایک بزرگ صاحب نمودار ہوئے۔ ہم لوگ دوڑے اور زیارت سے مشرف ہوئے، وہ شاہ عبدالرحیم صاحب تھے۔ مومن خاں صاحب اس واقعہ کی وجہ سے مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔

——فرمایا کہ دہلی میں چند مشائخ کامل ہمعصر تھے۔ چشتیہ نظامیہ میں حضرت فخرالدین صاحب اور قادریہ میں حضرت میر درد صاحب نقشبندیہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور صابریہ میں حضرت غلام سادات صاحب۔ فرمایا کہ حضرت غلام سادات صاحب کے تھانہ بھون میں اکثر لوگ مرید تھے۔ اس وجہ سے وہ اکثر یہاں تشریف لاتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ آئے تو تمام لوگ ملاقات کر گئے مگر حافظ ضامن صاحب کے دادا میر عبدالغنی حاضر نہ ہوئے۔ آپ نے دریافت کیا کہ میر عبدالغنی کیوں نہیں آئے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ان کا ایک حسین و جمیل جوان لڑکا انتقال کر گیا ہے اس وجہ سے مخبط الحواس ہو گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ایک بار انھیں میرے پاس لاؤ۔ مگر وہ نہ گئے۔ اتفاقیہ راستہ میں حضرت غلام سادات کو مل گئے۔ آپ نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا "عشق بر مردہ نباشد پائدار" اسی وقت اُن کا خبط جاتا رہا اور عشق حق غالب ہو گیا۔ مسجد میں بیٹھے رہے اور خدا کی یاد میں راہی مُلک بقا ہوئے۔

——فرمایا کہ عذاب اُخروی اس عالم میں بھی بعض اشخاص کو معلوم ہو جاتا ہے۔ جلال آباد میں (جو ہمارے قصبہ کے قریب ایک بستی ہے، ایک رئیس نے بہ طمع دنیوی ہنود کو اپنی زمین بُت خانہ بنانے کو دے دی۔ جب اُن کا وقت اخیر آیا حکیم غلام حسن ان کے معالج نبض دیکھ رہے تھے، مریض نے پکار کے کہا کہ حکیم جیو مجھے اس پنجرہ آہنی آتشیں سے بچاؤ مجھ کو اس پنجرے میں ڈالے دیتے ہیں۔ لوگ متعجب تھے اور کچھ تدارک نہیں کر سکتے تھے۔ آخر اسی فریاد و زاری میں اس کی روح پرواز کر گئی۔

——فرمایا کہ مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری جب حافظ عبدالکریم تاجر میرٹھ کے ملازم تھے، یہاں مع حافظ عبدالکریم زیارت حرمین شریفین کو آئے۔ میں نے کہا کہ مولانا مملوک علی صاحب نے میرا سبق گلستاں آپ کے سپرد کیا تھا۔ اس و سے آپ میرے اُستاد ہیں مگر میں ایک بات عرض کروں گا۔ اگر ناگوار نہ ہو۔ انھوں نے فرمایا کہ میں آپ کو اپنا بزرگ جا ہوں جو فرمائیے بسر و چشم منظور ہے۔ میں نے کہا آپ کا یہ منصب نہیں ہے کہ حافظ عبدالکریم وغیرہ آپ کو کام کا حکم دیں! ان کو آپ کا محکوم ہونا چاہیے۔ لیکن نوکری میں بجز محکومی چارہ نہیں۔ اب آپ اپنے مکان پر درس احادیث نبوی صلی

علی صاحبہا کا فرمایا کریں تاکہ خلق کو فیض ہو۔ مولانا صاحب نے قبول کر کے فرمایا کہ آپ حرم محترم میں میرے لیے دعا کریں چنانچہ یہاں سے جاکر ترک تعلق کر کے درس حدیث کا شغل اختیار کیا اور صدہا طلبا کو محدث بنادیا اور حافظ عبد الکریم نے میرے سامنے بہت کچھ معذرت کی کہ مولانا کو ہم لوگ اپنا مخدوم جانتے ہیں۔ میں نے کہا سچ ہے، مگر نوکر در حقیقت خادم ہی ہوتا ہے چاہیے اس کا آقا اسے اپنا مخدوم بھی تصور فرمائے اور لفظ خادمی کا زبان پر نہ لائے۔

——— حضرت حاجی صاحب سے کسی نے پوچھا کہ حضرت میں اللہ کا نام لیتا ہوں، مگر کچھ نفع نہیں ہوتا حضرت نے فرمایا کہ یہ تھوڑا نفع ہے کہ نام لیتے ہو، تمہارا نام لینا ہی نفع ہے اور کیا چاہتے ہو ؏

گفت آں اللہ تو لبیک ماست   وین نیاز و سوز و دردت پیک ماست

——— حضرت مولانا فتح محمد صاحبؒ حضرت حاجی صاحبؒ کی حکایت بیان فرماتے تھے کہ میں حضرت کے پاس بیٹھا ہوا تھا، بہت دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ آخر جب بہت دیر ہوئی تو میں اٹھا اور عرض کیا کہ حضرت آج میں نے آپ کی عبادت میں بہت حرج کیا۔ حضرت فرمانے لگے کہ مولانا آپ نے یہ کیا فرمایا، کیا نماز روزہ ہی عبادت ہے اور دوستوں کا جی خوش کرنا عبادت نہیں۔

——— حضرت حاجی صاحب کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ فلاں شخص آپ کو یوں کہتا تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ اس نے تو پس پشت ہی کہا، لیکن تم اس سے زیادہ بے حیا ہو کہ میرے منہ پر کہتے ہو۔

حضرت کی کرامتیں | مولانا گنگوہی سے ایک مرتبہ کسی شخص نے دریافت کیا تھا کہ اعلیٰ حضرت نے تو آپ سے وعدہ فرمایا تھا کہ "اطمینان رکھو میں عرب روانہ ہوتے وقت تم سے مل کر جاؤں گا، مگر آپ گرفتاری و حوالات میں رہے، آپ کی رہائی سے قبل ہی اعلیٰ حضرت نے بیت اللہ کی جانب ہجرت فرمائی"۔ گویا سائل کا مطلب یہ تھا کہ ملاقات کے خوش کُن الفاظ محض تسلی کے لیے تھے جس کا وقوع نہیں ہوا۔ حضرت نے بہت ہی ہلکی آواز سے فرمایا "اعلیٰ حضرت وعدہ خلاف نہ تھے"۔ چنانچہ دوسرے طریق سے معلوم ہوا کہ باوجود سنگین پہرہ کے اعلیٰ حضرت نے جیل خانہ کے اندر قدم رکھا اور کئی گھنٹہ باتیں کر کے شب ہی میں واپس ہوئے اور عرب کو روانہ ہوئے۔

مولوی ولایت حسین صاحب کی روایت ہے کہ حکیم صاحب جو اعلیٰ حضرت کے مرید انبالہ کے رہنے والے بندہ کے ساتھ سفر حج میں شریک تھے کہ جس زمانہ میں مولانا گنگوہی جیل خانہ میں تھے اعلیٰ حضرت حاجی صاحب ایک دن فرمانے لگے کہ میاں کچھ سنا، کیا مولوی رشید احمد کو پھانسی کا حکم ہو گیا۔ خدام نے عرض کیا کہ حضرت کچھ پتہ نہیں، ابھی تک تو کوئی خبر آئی نہیں۔ فرمایا ہاں حکم ہو گیا چلو، یہ فرما کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ حکیم صاحب کا بیان تھا کہ برسات کا زمانہ تھا۔ مغرب کے بعد اعلیٰ حضرت اور میں اور غالباً مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی، غرض تین آدمی چلے، شہر سے نکل کر تھوڑی دور جا کر اعلیٰ حضرت زمین کی گھاس کے قدرتی سبز مخملی فرش پر بیٹھ گئے۔ اور کچھ دیر سکوت فرما کر گردن اوپر اٹھائی اور فرمایا پھر چلو مولوی رشید احمد کو کوئی شخص پھانسی نہیں دے سکتا۔ خدائے تعالیٰ کو اُن سے ابھی بہت کچھ کام لینا ہے۔ چنانچہ چند روز بعد اُس کا ظہور ہو گیا والحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

بہنگام قیام رباط اسمٰعیل سیٹھ اُس کے لڑکے سے بعض باتیں خلاف طبع مبارک ہوئیں اس وجہ سے آپ نے وہاں کا قیام
کے رُخ توجہ بحضور باری تعالیٰ کیا، اسی بارے میں بلاکسی تحریک کے ایک حکم نامہ بتاکید ریاست حیدرآباد سے وہاں کے وکلا
پہنچا کہ منجملہ دو مکانات ریاست کے جو مکان وجگہ آپ پسند فرمائیں، اُس کی کنجی خدام حضرت کے سپرد کردی جائے۔ چنانچہ وکلا
ت نے بڑی التجا سے کیفیت حضوری میں عرض کی اور ایک مکان کی کنجی حوالۂ ملازمانِ عالی کردی۔

اسی زمانہ میں ایک ہندو نے آپ کے قرب میں ایک مکان تعمیر کیا اور اس میں ایک راستہ رکھا جس سے حضرت کے
خانہ کی بے پردگی ہوتی تھی وہ انواع واقسام کے ظلم وجبر خدمت شریف میں کرتا تھا اور آپ کی طرف سے اپنے دل میں عناد
ما حضرت نے ایک شخص کے ذریعہ سے کلمۃ الخیر تبلیغ فرمایا، لیکن اُس نے کچھ خیال نہ کیا بلکہ کلمات بیہودہ زبان پر لایا۔ لوگوں نے
حضرت سے عرض کیا اور اکثر احباب کی رائے ہوئی کہ حاکم وقت کے یہاں استغاثہ کیا جائے بجواب اس کے حضرت نے ارشاد
میرا استغاثہ حاکم حقیقی کے یہاں ہے۔ حکام مجازی کے آگے درخواست کرنا درست نہیں ہے، ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ تیغِ برّانِ
شتے اُس پر گزر کیا اور باوجود اعزاز بلیغ و اعتبار عظیم بلا وجہ ظاہری اپنے منصب وعہدے سے علیحدہ کردیا گیا اور ایسی قلت
ی میں مبتلا ہوا کہ اللہ کسی کو نہ دکھاوے۔

میاں امیر احمد رام پوری کا واقعہ میرے سامنے کا ہے، امیر احمد بار بار حضرت سے دریافت کرتے تھے کہ کیا حضرت میں ہندوستان
اور حضرت فرماتے تھے کہ ہاں جاؤ، مگر امیر احمد کو اپنے اوپر مقدمات کا قوی خطرہ تھا، اس واسطے شبہ ہوتا تھا کہ ضرور گرفتار اور
ب ہوں گا۔ اس واسطے باوجود حضرت کے ان کو اطمینان نہیں ہوتا تھا اور بار بار دریافت کرتے تھے۔

ایک روز حضرت نے چیں بر جبیں ہوکر فرمایا کہ تمھارا جی گرفتار ہونے کو چاہتا ہے میاں جاؤ تب میں نے اُن سے کہا کہ اب
ـ وشبہ چھوڑو اور حضرت نے خود ارشاد فرمایا ہے خدا کا نام لے کر چلو اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔ چنانچہ وہ میرے ساتھ ہندوستان
اور چند روز دہلی ایک مسجد میں رہ کر حاضر عدالت ہوگئے۔ چنانچہ گرفتار کرکے جیل بھیج دیے گئے اور بالآخر تمام مقدمات سے بری
پنے گھر بخیریت تمام پہنچ گئے۔

ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحب کے یہاں مہمان بہت سے آگئے، کھانا کم تھا حضرت نے اپنا رومال بھیج دیا کہ اس کو ڈھانک
ھانے میں ایسی برکت ہوئی کہ سب نے کھالیا اور کھانا بچ گیا۔ حضرت حافظ ضامن صاحبؒ کو خبر ہوئی تو عرض کیا کہ حضرت آپ
مال سلامت چاہیے، اب تو قحط کیوں پڑے گا۔ حضرت شرمندہ ہوگئے اور فرمایا کہ واقعی خطا ہوگئی توبہ کرتا ہوں پھر ایسا نہ ہوگا۔

ایک دن مولوی امیر شاہ خاں صاحب نے حضرت (گنگوہی) قدس سرہٗ سے ایک قصہ بیان کیا کہ میں ایک روز مسجد حرام میں
بزرگ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اُن کے پاس ایک نوعمر درویش آئے اور بیٹھ گئے۔ وہ بزرگ جن کے پاس میں بیٹھا ہوا تھا، اُس
ن کی طرف مخاطب ہوکر کہنے لگے کہ بھائی تمھارے قلب میں بڑی اچھی چیز ہے۔ ان بیچاروں نے اپنا حال چھپانا چاہا، مگر انھوں نے
ا فاش کردیا، کہنے لگے کہ تمھارے قلب میں ایک عورت کی شبیہ ہے، اس کی ناک ایسی ہے اور آنکھیں ایسی ہیں اور بال ایسے

ہیں۔ غرض تمام حلیہ بیان کر دیا۔ اُس وقت وہ درویش بہت نادم ہوئے اور اقرار کیا کہ بے شک آپ سچ فرماتے ہیں۔ ابتداء جوانی
میں مجھے ایک عورت سے عشق ہوگیا، ہر وقت اُس کے دھیان میں رہنے سے اُس کی شبیہ میرے قلب میں آگئی۔ اب جب کبھی طبیعت
بے قرار ہوتی ہے تو آنکھ بند کر کے اُس کو دیکھ لیتا ہوں کچھ سکون ہو جاتا ہے اور طبیعت ٹھہر جاتی ہے۔ مولوی امیر شاہ خانصاحب یہ
قصہ بیان کر کے منتظر رہے کہ حضرت کچھ ارشاد فرمائیں گے، مگر امام ربّانی قدس سرہٗ نے کچھ بھی جواب نہ دیا، سُن کر خاموش ہو گئے۔
جب کئی مرتبہ مولوی صاحب نے بات اٹھائی، تب حضرت نے ارشاد فرمایا۔ بھائی یہ کچھ زیادہ غلبہ نہیں ہے کیونکہ ان کی آنکھیں بند
کرنے اور قلب کی طرف متوجہ ہونے کی نوبت پہنچتی تھی۔ میرا حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ برسوں یہ تعلق رہا ہے کہ بغیر
آپ کے مشورہ کے میری نشست و برخاست نہیں ہوئی، حالانکہ حاجی صاحب مکہ میں تھے اور اس کے بعد جناب رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہی تعلق برسوں رہا ہے۔ اس کے بعد اتنا فرما کر آپ خاموش ہو گئے کچھ نہ فرمایا اور دیر تک ساکت و سرنگوں رہے۔

صورت و سیرت سر مقدس کلاں و بزرگ ہے اور پیشانی کشادہ و بلند ہے اور انوارِ حقانی پیشانی مبارک سے واضح و لائح ہیں
ابرو وسیع و خمدار، چشمان مبارک کلاں ہیں اور ہمیشہ خمار و ذوقیہ ربانیہ میں سرشار رہتی ہیں۔ رنگ شریف گندم گوں ہے، نحیف الجسم،
معتدل القامت گو نہ مائل بطوالت، لیکن نہ اتنا کہ طویل کہنے کے قابل بلکہ جیسا کہ قامت شریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں
آیا ہے خفیف العارضین طویل اصابع الیدین گویا حجازی ہیں، فصیح البیان عذب الکلام، کثیر المروّت عظیم الاخلاق، جس کسی سے
بات کرتے ہیں بکمال بشاشت و خوشی و تبسّم فرماتے ہیں اور افضل ترین اخلاق حضرت ایشاں تخلّق باخلاق قرآن ہے کما ورد عن
عائشۃ رضی اللہ عنہا فی وصف خُلقہ صلی اللہ علیہ وسلم جمیع اخلاق حسنہ کہ قرآن شریف میں ان کی مدح ہے ذات مبارک
میں جمع ہیں اور جتنے اخلاق رذیلہ کہ قرآن شریف میں ان کی برائی ہے بالطبع ان سے متنفر۔ اتباع سنّت واجتناب بدعات تعبیرِ عادات
جبلیہ سے ہے اور استقامت بر شریعت غرا و طریقت بیضا اخلاق لازمۂ رضیہ سے ہے کہ الاستقامۃ فوق الکرامۃ والکرامۃ
یتحصل بعد الاستقامۃ خمیر شریف آپ کا ہے، ذات پاک صاحب اشارات علمیہ و حقائق قدسیہ جامع انوار محمدیہ و منازل عرشیہ
ہے۔ دال علی اللہ السبحان و تلی سبیل الجنان و داعی الی العلم والعرفان ہے اور حامل لوا عارفاں و ضیاء قلوب ناقصاں و مبین اسرار لدنی کاشف
مظہر عوارف معارف مربی علم و حال صاحب ہمّت و مقال ہے۔ طریقہ شریفہ آپ کا متضمن جذب و مجاہدہ و عنایت ہے۔ سکر آپ کا
ادب کو پہنچاتا ہے اور صحو مقامات حجاب سے ترقی کو پہنچاتا ہے۔ حقائق توحید سامی با شریعت و مسانہ ہیں و اسرار مجاہدات گرامی معرفت
سے ہمراز۔ اولیائے عصر آپ کی ولایت پر اجماع رکھتے ہیں اور علمائے زماں آپ کے علو منزل کا اعتراف کرتے ہیں۔ حضرت حق سبحانہٗ تعالیٰ
نے علوم اسماء و صفات سے مخصوص فرمایا ہے اور معارف خاص و خصوصیات علوم اعلیٰ سے مقامات مرحمت فرمائے ہیں اور مقام اکبر
مدد اکثر و عطائے انفع و نوال اوسع پر ممتاز فرمایا ہے۔ (شمائم امدادیہ ص ۲۵)

حضرت مہر علی شاہ گولڑوی رح

ولادت ———— ۱۲۷۴ھ

وفات ———— گولڑہ ۱۳۵۶ھ

حضرت خواجہ مہر علی شاہ خطۂ پنجاب کے ان مشہور بزرگوں میں سے ہیں جنھوں نے علم دین اور شریعت کی ترویج کے لیے بہت کام کیا۔ آپ بڑے پایے کے عالم تھے۔ اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب سے بھی بہت واقفیت تھی۔ آپ خود بھی شریعت کے سخت پابند تھے اور دوسرے لوگوں کو پابندی شرع کی خاص طور سے تلقین فرمایا کرتے تھے۔ آپ کے ملفوظات میں جگہ جگہ اتباع سنتِ نبویہ کی تلقین پائی جاتی ہے۔

پیدائش و حسب نسب | خواجہ صاحب کی تاریخ ولادت یکم رمضان ۱۲۷۴ھ بتائی جاتی ہے۔ سلسلہ نسب حضرت سید عبدالقادر رح سے اس طرح ملتا ہے:

مہر علی شاہ بن سید نذر الدین بن سید پیر غلام شاہ بن سید پیر روشن دین بن سید عبدالرحمان بن سید عنایت اللہ بن سید عنایت علی بن سید فتح اللہ بن سید اسد اللہ بن سید فخر الدین بن سید احسان بن سید درگاہی بن سید جمال علی بن سید محمد جمال بن سید ابی محمد بن میراں سید محمد کلاں بن میراں شاہ قادر ———— بن السید ابی الحسنات بن السید تاج الدین بن سید بہاؤ الدین بن سید جلال الدین بن سید داؤد بن سید علی بن سید ابی صالح نصر بن السید عبدالرزاق بن الشیخ السید عبدالقادر محی الدین الجیلانی بغدادی الحسنی اباً والحسینی اماً رض۔

ہندوستان میں آمد | خواجہ صاحب کی نانی سید جلال الدین بخاری رح، مخدوم جہانیاں رح کی اولاد سے تھیں۔ آپ کے اجداد میں سے حضرت شاہ قمیض (یا کمیض) ہندوستان تشریف لائے اور حضرت عبدالقدوس گنگوہی رح سے ملاقات کی۔ کہا جاتا ہے کہ گنگوہی نے جب شاہ قمیض کی آمد کی خبر سنی تو پیشوائی کے لیے خود ہندوستان اور ایران کی سرحد پر پہنچے اور ان کا استقبال کیا۔

حضرت شاہ قمیض رح نے تمام عمر ہندوستان میں ساڈھورا یا سانڈھورا[1] کے مقام پر گزاری، وہیں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ آپ کے دو صاحبزادے تھے، وہ گولڑہ تشریف لے آئے۔ ان صاحبزادوں میں سے ایک نے عمر بھر شادی نہ کی، دوسرے صاحبزادے کا سلسلہ اب تک چلا آ رہا ہے، خواجہ مہر علی شاہ رح اسی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔

تعلیم | آپ کی ابتدائی تربیت والد محترم کے زیر نگرانی ہوئی۔ انھوں نے بڑی محنت سے ابتدائی تعلیم دلائی۔ چونکہ بہت

---

[1] علاقہ سہارنپور کلیر مشرقی پنجاب۔

ذہین تھے اس لیے چھوٹی عمر میں ہی علوم ظاہری سے فارغ ہو گئے اور درس و تدریس کا کام شروع کر دیا۔ حجاز بھی گئے، جہاں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بھی صحبت رہی۔ کہا جاتا ہے کہ حاجی صاحب ہی نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان واپس جائیں۔ اس لیے کہ وہاں ایک فتنہ ظہور میں آ رہا ہے، جس کے قلع قمع کرنے کے لیے مسلمانانِ ہند کو آپ کی خدمات کی ضرورت ہے۔

عملی کام | خواجہ صاحبؒ حجاز سے لوٹے اور ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ خواجہ شمس الدین سیالویؒ سے بیعت تھے۔ اور انھیں کے خلفاء میں سے ہیں۔

آپ عالمانِ دین کی بہت قدر کرتے تھے۔ مذہبی اختلافات کی صورت میں بڑے عالمانہ طریقہ سے اپنے نظریات پیش کرتے ہیں۔ شیخ اکبرؒ کے نظریۂ وحدتِ وجود پر انھیں بڑا عبور حاصل تھا۔ فصوص الحکم کو خوب جانتے تھے اور اس کا باقاعدہ درس دیا کرتے تھے۔

شیخ اکبر کے نظریہ وحدت الوجود سے اسلام کے بہترین دماغ متاثر ہو رہے تھے، چنانچہ اس سلسلے میں مشائخ بہت محتاط رہتے تھے، وہ اپنے مریدوں کو شیخ اکبر کی کتابیں پڑھنے یا اس نظریہ کے بارے میں کسی سے گفتگو کرنے سے روکتے تھے۔ خواجہ مہر علی شاہؒ کو شیخ اکبر کے نظریات پر بڑا عبور حاصل تھا۔ وہ شیخ کی کتاب فصوص الحکم کا باقاعدہ درس دیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں ان کی قابلیت اور مہارت کے پیش نظر علامہ اقبال نے ان سے خط و کتابت بھی کی۔ جس میں شیخ اکبر اور ان کے نظریات کے متعلق خواجہ صاحب سے بعض امور دریافت کیے۔ علامہؒ کا یہ خط نقل کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اکبر اور ان کے نظریات کے متعلق ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دیا جائے تاکہ اس خط کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آ جائے اور خواجہ صاحب کے فکر و نظر کا بھی اندازہ ہو جائے۔

شیخ اکبرؒ | شیخ اکبرؒ ۵۶۰ھ میں سپین کے ایک شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے اور ۶۳۸ھ میں وفات پائی۔ قرآن اور فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اشبیلیہ آ گئے۔ وہاں کئی مشاہیر سے ملاقاتیں ہوئیں اور ان کی صحبت میں وقت گزارا۔ سارے سپین کی سیاحت کی، قرطبہ میں ابن رشد سے بھی ملے۔ پھر مصر، بغداد، حجاز، ایشیائے کوچک اور کئی دوسرے علاقوں میں پھرے۔

شیخ اکبر کا نظریہ | آپ جس نظریے کی تبلیغ میں عمر بھر سرگرم رہے، اس کا مرکزی نقطہ وحدت الوجود تھا، یعنی کائنات میں جو کچھ موجود ہے، وہ سب خدا کے لیے ہے یا خدا کے سوا کائنات میں کوئی شے موجود نہیں۔

آپ نے سینکڑوں کتابیں لکھیں، جن میں سے (بعض کے قول کے مطابق) ان کی ڈیڑھ سو کتابیں اب بھی ملتی ہیں۔ ان کتابوں میں فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ وحدت الوجودی فلسفہ پر یہ بڑی دقیق کتابیں ہیں۔

چونکہ شیخ اکبر کا نظریہ بہت دقیق اور سخت تھا اور وہ جا بجا اس کی تبلیغ کرتے تھے، جسے عام لوگ پوری طرح نہ سمجھ سکتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کی اپنی ناسمجھی کے باعث الحاد اور زندقہ کے دروازے کھل جاتے۔ چنانچہ بعض مشائخ نے شیخ اکبر

کی مخالفت کی اور انھیں چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا۔

علامہ اقبال کا خط | شیخ اکبر کا یہی نظریہ تھا جس میں علامہ اقبال نے بھی اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور خواجہ مہر علی شاہ گولڑوی سے اس بارے میں بعض معلومات حاصل کرنا چاہیں۔ ذیل میں ہم علامہ کا وہ خط جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، نقل کرتے ہیں یہ خط علامہ نے ۱۹۳۳ء میں لکھا اور خواجہ صاحب کی زیارت کے شوق کا اظہار کرنے کے بعد کہا :

" ہندوستان بھر میں اور کوئی دروازہ نہیں جو پیش نظر مقصد کے لیے کھٹکھٹایا جائے، لہٰذا آپ سے چند امور دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ علامہ نے لکھا کہ میں انگلستان میں محی الدین ابن عربی پر کچھ کہنے کا ارادہ رکھتا ہوں، لہٰذا آپ مجھے چند سوالات کا جواب شافی مرحمت فرمائیں :

(۱) اول یہ کہ حضرت شیخ اکبر نے تعلیم حقیقت زماں کے متعلق کیا کہا ہے اور ائمہ متکلمین سے کہاں تک مختلف ہے

(۲) یہ تعلیم شیخ اکبر کی کون کون سی کتب میں پائی جاتی ہے اور کہاں کہاں؟ اس سوال کا مقصود یہ ہے کہ سوال اول کے جواب کی روشنی میں خود بھی ان مقامات کا مطالعہ کر سکوں۔

(۳) حضرات صوفیہ میں اگر کسی بزرگ نے بھی حقیقت زماں پر بحث کی ہو تو ان بزرگ کے ارشادات کے نشان بھی مطلوب ہیں۔ مولوی سید انور شاہ مرحوم و مغفور نے مجھے عراقی کا ایک رسالہ مرحمت فرمایا تھا۔ اس کا نام تھا "درایۃ الزمان" جناب کو ضرور اس کا علم ہوگا۔ میں نے یہ رسالہ دیکھا ہے، مگر چونکہ یہ رسالہ بہت مختصر ہے، اس لیے مزید روشنی کی ضرورت ہے۔

میں نے سنا ہے کہ جناب نے درس و تدریس کا سلسلہ ترک فرما دیا ہے، اس لیے مجھے یہ عریضہ لکھتے میں تامل تھا، لیکن مقصود چونکہ خدمت اسلام ہے، مجھے یقین ہے کہ اس تصدیعہ کے لیے جناب معاف فرمائیں گے، اور جواب باصواب سے ممنون فرمائیں گے۔ باقی التماس دعا۔

مخلص محمد اقبال "[1]

غیر شرعی رسومات سے خواجہ صاحبؒ کو بڑی نفرت تھی۔ ان کے ملفوظات میں جگہ جگہ اتباع سنت نبوی کی تلقین ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے شریعت نبوی کے اتباع سے بڑھ کر کوئی فخر نہیں ہو سکتا[2]

خواجہ صاحبؒ کو شعر و سخن سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن پھر بھی خوب شعر کہہ لیتے تھے۔ اُن کی ایک فارسی غزل ملاحظہ ہو :

صبا ز طرۂ شبرنگ مہوشِ طناز — کشودہ نافۂ مشکیں بر روئے اہلِ نیاز
کیم گدائے ز مفلسی کوتاہ دست — کجا ایں غالیہ عطری قصہ ہائے دراز

---

[1] اقبال نامہ جلد اول ص ۲۴۲ - ۲۴۴ [2] ملفوظات ص ۱۴۳

تو ئی کہ ذرہ صفت را با آسماں بردی — چگونہ شکر تو گوید کمینہ بندہ نواز
عرض ادائے نیاز است ورنہ حاجت نیست — کمال حشمت محمود را بعجز ایاز
رہین ساقی چشم کہ جرعہ بچشاند — ز جام چہرہ ترکان مہوشاں حجاز
بہ بزم بادہ فروشاں بہ نیم جو نخرند — متاع زاہد طماع چہ حج و صوم و نماز
مراز پیر مغاں رازہائے سربستہ است — فغاں ز واعظ خود بیں کجاست محرم راز

اگرچہ حسن تو از مہر غیر مستغنی است
من آں نیم کہ از ایمان خویش آیم باز

غرض خواجہ صاحب ان بزرگ ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے نہ صرف احیاء تصوف کی کوشش کی، بلکہ اپنے دور کے بہت سے عقائد باطلہ کی بھی تردید فرمائی۔

وفات ۲۹ صفر ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۱ مئی ۱۹۳۷ء کو وفات پائی اور اپنے والد بزرگوار کے مزار کے پاس ہی دفن کیے گئے۔

روضہ خواجہ مہر علی شاہؒ کا مزار مبارک گولڑہ میں ریلوے سٹیشن سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہے۔ آپ کی قبر کے پاس ہی آپ کی پوتی کا مزار ہے۔ مسجد عالیہ میں ان کے والد بزرگوار کا مزار ہے۔ یہیں ان کے دو بھائی پیر محمود شاہ اور پیر ولایت شاہ کے علاوہ ان کے استاد مولوی غازی صاحب کے مزارات ہیں۔ خواجہ صاحبؒ کا مزار سنگ مرمر کی سفید سلوں سے بنا ہے جو ہرے بھرے درختوں کی اوٹ میں رات کے وقت بجلی کی روشنی میں عجیب نظارہ پیش کرتا ہے۔ مسجد کے صحن میں تالاب ہے۔ پشت پر بزرگوں کا قبرستان ہے اور مسجد کے بالمقابل کتب خانہ ہے۔ ۲۹ صفر کو آپ کا سالانہ عرس منایا جاتا ہے[1]۔

۹، ۱۰ اور ۱۱ ربیع الاول کو خواجہ صاحب اپنی زندگی میں شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ کی گیارھویں کا بھی اہتمام کیا کرتے تھے۔ یہ اہتمام اب بھی انھیں تاریخوں پر کیا جاتا ہے اور ہزاروں کی تعداد میں زائرین حاضر ہوتے ہیں[2]۔

تصانیف مندرجہ ذیل کتابیں خواجہ مہر علی شاہ صاحبؒ کی تصانیف بتائی جاتی ہیں:

تحقیق الحق فی کلمۃ الحق، الاصلاح التصحیح لاعجاز المسیح معروف بہ سیف چشتیائی، شمس الہدایہ، اعلاء کلمۃ اللہ فی بیان وما اہل بہ لغیر اللہ عجابہ (یہ دو رسالہ)۔

ان تصانیف کے علاوہ آپ کے مکتوبات طیبات اور ملفوظات بھی شائع ہوئے۔

---

[1] یہ تقریب مغربی پاکستان میں اور جگہوں پر بھی ہوتی ہے مگر گولڑہ شریف میں خاص اہتمام سے بڑے پیمانے پر منائی جاتی ہے اور گولڑہ شریف کی سب سے بڑی اور پرانی تقریب ہے۔

[2] عرس اور میلے۔ مرتبہ ارمان سرحدی

حضرت شیر محمد شرق پوریؒ

ولادت ——— قصور ۱۲۸۴ھ

وفات ——— شرق پور ۱۳۴۷ھ

حضرت شیر محمد شرق پوری نقشبندیہ سلسلہ کے وہ مشہور صوفی بزرگ ہیں جنھوں نے خطۂ پنجاب میں شریعت و طریقت کا نام زندہ کیا اور پنجاب کے گوشے گوشے کو اپنے انوارِ باطن سے روشن کیا۔

حالات حضرت میاں صاحب کے مورثِ اعلیٰ کابل سے ہجرت کر کے پنجاب آئے اور قصور میں مقیم ہوئے۔ پھر حجرہ شاہ مقیم میں سکونت اختیار کی۔ میاں صاحب اسی جگہ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ قرآن کریم کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی تعلیم حاصل کی۔ خوش نویسی آبائی پیشہ تھا، چنانچہ یہی پیشہ اختیار کیا۔ مگر طبیعت بچپن ہی سے زہد و ریاضت اور معرفت و حکمت کی طرف مائل تھی۔ اس لیے جلد ہی منزلِ عرفان پر گامزن ہو گئے۔

بیعت علوم ظاہری و باطنی سے فارغ التحصیل ہو کر بابا امیر الدینؒ کے دستِ حق پر بیعت کی اور ان کی ہدایت کے مطابق اشغالِ نقشبندیہ میں سلوک کے منازل طے کرنے لگے۔

طریقت جب آپ کے کمالات کی شہرت ہوئی تو لوگ جوق در جوق زیارت کے لیے آنے لگے۔ ہزاروں بندگانِ خدا آپ سے فیض حاصل کرتے۔ خلافِ شریعت کاموں سے آپ کو سخت نفرت تھی۔ چنانچہ مریدوں کو بھی شریعت پر سختی سے کاربند رہنے کی تلقین فرماتے۔ مروّجہ تصوّف کے بھی سخت خلاف تھے۔ فرمایا کرتے تھے "اللہ تعالیٰ اپنا بندہ بنالے اگر کسی کو سجادہ نشین نہ بنائے۔ مجاہدات اور عبادت و ریاضت کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ اپنی صحت تک کا خیال نہ کرتے تھے۔ چنانچہ بہت کمزور ہوتے گئے۔

حکمت و نصیحت کی باتیں! میاں صاحب بڑے صاحبِ فہم اور دانا بزرگ تھے، ان کی باتیں حکمت و معرفت سے لبریز اور عبرت آموز ہوتی تھیں۔ مسجدوں کے اموال پر بسر اوقات کرنے والے مولویوں کو آپ ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک امام مسجد نے کہا کہ میں امام مسجد ہوں مگر دوسرے مولویوں کی طرح نہیں۔ میاں صاحب نے پوچھا وہ کس طرح؟ امام مسجد نے کہا وہ لوگ مسجد کا مال کھاتے ہیں۔ میاں صاحب نے پوچھا پھر آپ کیا کھاتے ہیں۔ اُس نے کہا مجھے ایک حاجی صاحب خرچ دیتے ہیں۔ یہ سُن کر میاں صاحب بولے ایک ہی بات ہے یہ بھی مسجد کا مال ہوا۔

چلّہ کشی آپ کو ناپسند تھی، چنانچہ ایک شخص نے آپ سے چلّہ کشی کی اجازت چاہی تو فرمایا مجھے چلّہ کشی پسند نہیں

ایک مرتبہ کسی شخص نے شکایت کی کہ مسجدیں بہت ہیں مگر نمازی کم ہیں اور زمانے کی ناقدری کا شکوہ کرنے لگے۔ میاں صاحب نے سن کر فرمایا، اصلاح ہی کرنی چاہیے، گلے شکووں سے کیا فائدہ۔

ایک شخص نے حاضرِ خدمت ہو کر پوچھا کہ مجھے کوئی ایسا طریقہ بتائیے کہ خدا مل جائے۔ فرمایا مجھے کوئی ایسا طریقہ تو نہیں آتا کہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر خدا کے ہاتھ میں دے دوں۔ ہاں اللہ اللہ کرنا آتا ہے تم بھی کر سکو تو یہی کرو۔ خدا سے ملنے کا یہی طریقہ ہے۔

حسب و نسب پر فخر یا رواجی درویشی اور فقیری کو ناپسند کرتے تھے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے آپ سے آپ کا شجرہ نسب طلب کیا۔ کہنے لگے میرے لیے تو ایک ہی شجرہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہی کافی ہے اور کسی شجرہ کی مجھے ضرورت نہیں۔ پھر فرمایا ہم فقیر تو بنتے ہیں، مگر مسلمان نہیں بنتے۔

تواضع اور انکساری میں اپنی مثال آپ تھے۔ امیر و غریب دونوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے اور رواداری قائم رکھتے۔ ایک مرتبہ ایک دولت مند شخص مہمان بنا۔ کھانا سامنے آیا تو مہمان سے پوچھا آپ کے ساتھ کوئی اور شخص بھی ہے۔ اس نے کہا ہاں میرا ملازم ہے جو نیچے کھڑا ہے، آپ نے ملازم کو بلایا اور اسے بھی ساتھ کھانے پر بٹھا لیا۔

ایک دفعہ کسی مزار پر تشریف لے گئے۔ جب نماز پڑھنے لگے تو دیکھا کہ امام کے سر پر سرکاری ٹوپی ہے۔ آپ نے امام سے پوچھا، آپ کی پگڑی کہاں ہے؟ اس نے کہا سرکار انگریزی نے مجھے یہی ٹوپی دی ہے۔ میاں صاحب نے اسی وقت اپنی پگڑی اتار کر اسے دو حصوں میں پھاڑ کر ایک حصہ امام کو دے دیا کہ اسے سر پر باندھ لو۔

بڑھاپے میں آپ بہت زیادہ کمزور ہو گئے، چنانچہ تپ محرقہ میں مبتلا ہو کر ۳ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ (اگست ۱۹۲۸ء) میں وفات پائی اور شرق پور میں دفن ہوئے۔ یہ قصبہ لاہور سے قریباً بیس میل کے فاصلہ پر ضلع شیخوپورہ میں واقع ہے۔

میاں صاحبؒ کے پیر و مرشد

یہاں آپ کے پیر و مرشد حضرت بابا امیر الدینؒ کے حالات بھی مختصراً پیش کیے جاتے ہیں۔ حضرت بابا صاحب ۱۲۰۷ھ میں ضلع گورداسپور (مشرقی پنجاب) دھرم کوٹ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ککے زئی خاندان سے تھے ان دنوں رتڑ چھتڑ میں جو دھرم کوٹ کے قریب ہی ایک قصبہ ہے، ایک نقشبندی بزرگ سید امام علی شاہ ساکن مکان شریف کی ولایت کی بڑی دھوم تھی۔ بابا صاحب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو کر مریدوں میں شامل ہو گئے۔

سید صاحب کی ہدایت کے مطابق بابا صاحب نے پولیس میں ملازمت کر لی۔ لاہور میں ٹلہ نام گاؤں کی پولیس چوکی میں تھانیدار کی حیثیت سے تعینات رہے، مگر طبعاً درویش منش انسان تھے، اس لیے زیادہ وقت ذکر و فکر میں گزرتا۔ سرکاری کام کی طرف زیادہ توجہ نہ دیتے۔ پولیس چوکی کے قریب ایک ٹیلے پر آپ نے مسجد بنوائی اور اس میں عبادت کرتے رہتے تھے۔ چونکہ ملازمت کے باعث عبادت میں خلل پڑتا تھا، اس لیے جلد ہی مستعفی ہو گئے اور اطمینان سے اللہ اللہ کرنے لگے۔

آپ کے مرشد سید امام علی کو کوٹلہ پنج بیگ میں کچھ اراضی بطور جاگیر ملی تھی۔ سید صاحب نے اس کے انتظام کے لیے بابا صاحب کو وہاں بھیج دیا۔

بابا صاحب وہاں اُٹھ آئے۔ اس وقت تک آپ جادۂ طریقت کے شہسوار بن چکے تھے، چنانچہ آپ کی عظمت چھپی نہ رہی اور جلد ہی بستی اور اس کے قرب و جوار کے لوگوں کو آپ کی باطنی کیفیت کا اندازہ ہو گیا اور دُور دُور سے لوگ اظہار عقیدت کے لیے آنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ غیر آباد جگہ رفتہ رفتہ آباد ہوتی گئی اور بابا صاحب کے احترام کے طور پر اسے کوٹلہ شریف کہا جانے لگا۔

بابا صاحب نے سوا سو سال کی عمر پائی۔ ۱۹۱۲ء میں انتقال فرمایا اور کوٹلہ میں دفن ہوئے۔

آپ کے ایک خادم کا نام میاں محمد دین تھا، وہی آپ کے خلیفہ بتائے جاتے ہیں۔ انھیں مُصلی کا لقب دیا گیا تھا۔

میاں محمد دین مصلی بھی ضلع گورداسپور کے باشندے تھے۔ ۱۲۸۳ھ میں اسی ضلع کے ایک قصبہ مسانیاں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام الٰہی بخش تھا جو قصبہ کے ایک معزز تاجر تھے۔

آپ نے بابا صاحبؒ کی وفات تک ان کی خدمت کی۔ بابا صاحب سے بے انتہا محبت تھی۔ وہ دل و جان سے انھیں چاہتے تھے، مگر بابا صاحب اپنے آخری ایام میں ان سے ناراض ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود میاں محمد دین نے بابا صاحب کا ساتھ نہ چھوڑا اور ہمیشہ ان کی دلجوئی کی کوشش کرتے رہے۔ بابا صاحبؒ کی وفات کے بعد آپ نے اپنی قبر بابا صاحب کی قبر کے ساتھ بنوالی تھی۔ وفات کے بعد وہیں دفن ہوئے۔

میاں صاحب کے خلیفہ | میاں شیر محمدؒ کے ایک مجازی خلیفہ کا نام حاجی عبدالرحمان تھا، جن کا مزار قصور میں ہے۔ حاجی صاحب میاں صاحب کے مجازی خلیفہ اور بعض روایتوں کے مطابق آپ کے محرم راز تھے۔

میاں صاحب کی وفات کے بعد حاجی صاحب قصور چھوڑ کر شرق پور چلے گئے اور کئی سال تک وہیں رہے حتیٰ کہ جب بیمار پڑے تو ان کے خادم جن کا نام محمد دین تھا انھیں قصور لے آئے۔ حاجی صاحب وفات کے بعد قصور میں دفن ہوئے۔

دوسرا حصّہ ——— متفرّقات

۱ ۔ اولیائے کرام اور بزرگانِ دین کی حکایتیں ۔
۲ ۔ صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کے چیدہ چیدہ اقوال
۳ ۔ شجرۂ طریقت مشائخ سلسلۂ چشتیہ
۴ ۔ شجرۂ طریقت مشائخ سلسلہ قادریہ
۵ ۔ شجرۂ طریقت مشائخ سلسلۂ نقشبندیہ
۶ ۔ مشائخ سلسلۂ نقشبندیہ (جامعین ہر سہ سلاسل)
۷ ۔ عرسہائے بزرگانِ پاکستان (مقام عرس)
۸ ۔ عرسہائے بزرگانِ بھارت (مقام عرس)

اولیائے کرام اور بزرگانِ دین

کی

حکائتیں

حاتم اصمؒ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور کہا کہ میں اپنے مال میں سے کچھ رقم آپ کو اور آپ کے مریدوں کو دینا چاہتا ہوں۔ فرمایا مجھے خوف اسی بات کا ہے کہ تیرے مرنے پر مجھے کہنا پڑے گا کہ اے آسمان کے روزی دینے والے زمین کا روزی دینے والا مر گیا۔

ایک دفعہ ایک سید حج کرنے جا رہا تھا، وہ بغداد میں حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اُس سے پوچھا تم کون ہو، کس کی اولاد ہو اور کہاں رہتے ہو؟ اُس نے کہا سید ہوں، گیلان میرا وطن ہے۔

آپ نے فرمایا تمہارے دادا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ دو تلواریں چلایا کرتے تھے، ایک کافروں پر، دوسری اپنے نفس پر۔ تم کون سی تلوار چلاتے ہو؟

وہ شخص قدموں پر گر پڑا اور کہا میرا حج یہیں ہو گیا۔

بایزید بسطامیؒ ایک رات مصروفِ عبادت تھے، مگر عبادت میں وہ ذوق اور کیفیت پیدا نہ ہوتی تھی جو ہونی چاہیے تھی، بہت پریشان ہوئے۔ آخر خادم سے پوچھا دیکھو گھر میں کیا شے ہے؟ خادم نے تلاش کے بعد انگور کا ایک خوشہ پیش کیا کہ یہ رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا، لے جاؤ اور کسی کو دے آؤ، ہمارا گھر میوہ فروش کی دُکان نہیں۔

اس کے بعد دوبارہ ذکر و فکر میں لگ گئے اور گم شدہ اطمینان اور سکون نصیب ہو گیا۔

ایک دفعہ حج کا قصد کیا تو تمام راستہ اس طرح طے کیا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو دو رکعت نماز پڑھتے جاتے۔ بالآخر بارہ سال کے بعد مکہ پہنچے۔ فرمایا یہ دنیا کے بادشاہوں کا دربار نہیں، جہاں آدمی ایک دم جا پہنچے۔ پھر حج سے فارغ ہونے کے بعد روضۂ رسولؐ کی زیارت کرنے کے لیے مدینہ منورہ نہ گئے، پوچھا گیا آپ نے ایسا کیوں کیا۔ فرمایا روضۂ رسولؐ کی زیارت کو حج کا تابع بنانا میرے نزدیک ادب کے خلاف ہے۔ لہٰذا میں زیارت کے لیے دوبارہ جاؤں گا۔ چنانچہ اگلے سال آپ نے

روضۂ رسول کی زیارت کے لیے علحدہ احرام باندھا۔

کسی نے ایک آتش پرست سے کہا کہ مسلمان ہو جاؤ، اس نے جواب دیا اگر مسلمانی یہی ہے جیسی بایزید کی تو مجھ میں اس کی ہمت نہیں، اگر ایسی ہے جیسی تمھاری مسلمانی تو یہ کوئی چیز نہیں۔

آپ سے پوچھا گیا، راہِ طریقت میں انسان کے لیے بہتر چیز کیا ہے؟ فرمایا مادرزاد دوست، پوچھا گیا اگر یہ نہ ملے تو؟ فرمایا، چشمِ بینا۔ پوچھا گیا، اگر یہ بھی میسر نہ ہو فرمایا پھر سننے والے کان۔ لوگوں نے کہا اگر یہ بھی میسر نہ ہوں تو؟ فرمایا پھر مرگِ مفاجات۔

ایک دفعہ آپ نے ایک امام کے پیچھے نماز ادا کی۔ نماز کے بعد امام نے پوچھا، آپ کوئی کام کاج تو کرتے نہیں کھاتے کہاں سے ہیں؟ آپ نے فرمایا، پہلے مجھے نماز کی قضا ادا کر لینے دو۔ کیونکہ ایسے شخص کے پیچھے نماز جائز نہیں جو اپنے روزی دینے والے کو نہیں جانتا۔

داؤد ظاہری مدینہ کے عالم فاضل تھے۔ ایک مرتبہ مدینہ کے قاضی نے عید کے روز انھیں دیکھا کہ چوکر بھگو کر کھا رہے ہیں۔ قاضی نے ان کے ایک پڑوسی سے جو بہت دولت مند اور سخی تھا۔ شکایت کی کہ آپ اپنے پڑوسی کا خیال نہیں رکھتے۔ پڑوسی کہنے لگا، میں نے ایک ہزار درہم انھیں بھیجے تھے، مگر انھوں نے درہم لے جانے والے ملازم کو تھیلی سمیت واپس کر دیا اور کہلا بھیجا کہ "تم مجھے کس آنکھ سے دیکھتے ہو اور میری کون سی حاجت کا تمھیں خیال آیا کہ یہ رقم تم نے میرے پاس بھیجی" ہمسائے نے قاضی سے کہا کہ اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں۔"

قاضی نے کہا تم رقم مجھے دو میں انھیں دے آتا ہوں۔ چنانچہ اس نے قاضی کو ایک ہزار کی بجائے دو ہزار درہم دیے۔ جب قاضی نے داؤد ظاہری کے خدمت میں جا کر تھیلی پیش کی تو انھوں نے فرمایا "میں نے تمھیں عالم سمجھ کر اندر آنے دیا، تم نے میری اندرونی کیفیت کا حال دوسرے شخص پر ظاہر کر کے امانت میں خیانت کی ہے۔" قاضی یہ جواب پا کر تھیلی اٹھا کر چپ چاپ واپس آ گئے۔

یونس بن عبیدؒ خواجہ حسن بصریؒ کے فیض یافتہ تھے۔ ریشمی کپڑے کی تجارت کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ریشم کا نرخ بڑھ گیا، مگر جس تاجر سے آپ نے ریشم خریدا، اس نے انھیں پہلے نرخ پر ہی دے دیا۔ آپ نے متعجب ہو کر پوچھا کیا تمھیں نرخ کے بڑھ جانے کا علم نہیں ہے؟ اس نے جواب دیا اگر علم ہوتا تو میں اپنا مال اس نرخ پر آپ کو کیوں دیتا۔ یونسؒ نے سارے کا سارا

ریشم جو آپ نے اُس سے خریدا تھا اور جس کی مالیت تیس ہزار تھی۔ یہ کہتے ہوئے اُسے واپس کر دیا کہ میں تمھاری بے خبری سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا۔

شفیق بلخیؒ ایک قبرستان کے قریب سے گزرے تو ساتھیوں سے فرمانے لگے "یہاں سب جھوٹے لوگ سوئے پڑے ہیں"۔ ساتھی بہت حیران ہوئے اور پوچھا "حضرت کیا مطلب؟ فرمایا "یہ لوگ زندگی میں کہا کرتے تھے کہ ہمارے پاس مال ہے اور ہمارے بال بچے ہیں۔ اگر یہ سب چیزیں حقیقتاً انھیں کی ملکیت ہوتیں تو یہ لوگ ان میں سے کسی ایک شے کو ہی اپنے ساتھ لاتے۔"

ایک مرتبہ آپ نے ابراہیم ادھمؒ سے پوچھا کہ آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے؟ انھوں نے کہا روزی مل جائے تو شکر کرتا ہوں، نہ ملے تو صبر کر لیتا ہوں۔ فرمایا یہ حالت تو ہمارے ہاں کے کتوں کی بھی ہے۔ ابراہیم ادھم نے پوچھا، آپ کیا کرتے ہیں؟ فرمایا: مل جائے تو خیرات کر دیتا ہوں، نہ ملے تو شکر ادا کرتا ہوں۔

ابراہیم ادہم بولے، پھر آپ میرے استاد ہیں۔

ایک بوڑھا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا میں نے بہت گناہ کیے ہیں، توبہ کرنے آیا ہوں۔ فرمایا تم بہت دیر سے آئے۔ بوڑھے نے کہا میں جلدی آیا ہوں، کیونکہ جو شخص موت سے پہلے آجائے اُسے جلدی آنا ہی سمجھنا چاہیے۔

آپ نے یہ سن کر فرمایا تم نے خوب کہا اور خوب آئے۔

خلیفہ ہارون الرشید نے آپ سے نصیحت چاہی تو فرمایا اگر تو جنگل میں اتنا پیاسا ہو جائے کہ مرنے لگے اور کوئی شخص ایک گھونٹ پانی کے بدلے میں تجھ سے آدھی سلطنت مانگے تو کیا تو دے دے گا؟ خلیفہ نے کہا ضرور دوں گا۔

پھر پوچھا اگر تیرا پیشاب بند ہو جائے اور کوئی شخص آدھی سلطنت کے عوض تیرا علاج کر سکے۔ خلیفہ نے کہا میں آدھی سلطنت دے دوں گا۔

فرمایا پھر ایسی حکومت پر کیا فخر کرتے ہو جس کی قیمت پانی کا ایک گھونٹ ہو۔ خلیفہ یہ سن کر رو دیا۔

مالک بن دینارؒ جب آیت اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) پڑھتے تو زار و قطار رونے لگتے۔ پوچھا گیا آپ کیوں روتے ہیں۔ فرمایا اگر یہ قرآن کی آیت نہ ہوتی تو میں اسے

ہرگز نہ پڑھتا۔ دریافت کیا گیا، کیوں؟ فرمایا اس لیے کہ ہم منہ سے تو اس کی عبادت کرتے ہیں اور اُس سے مدد مانگتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر ہم دوسروں پر امید رکھتے ہیں اور دوسروں کا سہارا تلاش کرتے ہیں۔

احمد حرب نے اپنے ایک پڑوسی سے جو آتش پرست تھا، پوچھا تم آگ کو کیوں پوجتے ہو؟ اس نے کہا اس لیے کہ مجھے عذاب سے بچا لے۔ آپ نے فرمایا جو چیز اتنی کمزور ہو کہ ایک بچہ اس پر پانی ڈال دے اور وہ بجھ جائے، وہ تمھیں خدا کے عذاب سے کیسے بچا سکتی ہے۔ پھر فرمایا تم نے ستر سال تک اس کی پوجا کی ہے اور میں نے نہیں کی، آؤ ہم دونوں اپنا اپنا ہاتھ اس میں ڈالتے ہیں، دیکھیں یہ تمھارا کتنا خیال کرتی ہے۔

آتش پرست کے دل پر اس بات کا بڑا اثر ہوا اور وہ مسلمان ہو گیا۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ایک روز وعظ فرما رہے تھے، بہت سے لوگ جمع تھے، اتنے میں بارش ہونے لگی۔ آپ نے آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا: "میں تیرے لیے لوگوں کو جمع کرتا ہوں اور تو انھیں منتشر کرتا ہے۔" یہ فرمانا تھا کہ بارش رک گئی۔

کی کوئی کرامت

ایک شخص کا بیان ہے کہ میں حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دل میں خیال آیا کہ آپ کا کوئی معجزہ دیکھوں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ حضرت نے میرے چہرے پر نظر کی اور مسکرائے پھر اپنا عصا جو ہاتھ میں تھا زمین میں گاڑ دیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس سے ایسی روشنی نکلی جس نے اُس پاس کی تمام چیزوں کو منور کر دیا۔

ایک دفعہ عباسی خلیفہ روپیوں کی ایک تھیلی حضرت غوث اعظم کی خدمت میں لایا۔ حضرت نے تھیلی لینے سے انکار کر دیا۔ جب خلیفہ نے بہت اصرار کیا تو آپ نے تھیلی کو اٹھایا اور اپنے ہاتھوں سے اُسے نچوڑا تو اس میں سے خون بہنے لگا۔ پھر خلیفہ سے مخاطب ہو کر فرمایا "تمھیں شرم آنی چاہیے کہ تم لوگوں کا خون میرے پاس لائے ہو، اگر تمھارا سلسلہ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متصل نہ ہوتا تو میں یہ خون تمھارے محلات تک بہا دیتا۔"

ذوالنون مصریؒ کشتی میں سوار کہیں جا رہے تھے کہ مسافروں میں سے ایک سوداگر کا موتی گم ہو گیا۔ چونکہ تمام مسافروں میں سب سے شکستہ حال آپ تھے اور بہت بوسیدہ لباس پہن رکھا تھا۔ سوداگر نے آپ ہی پر شبہ کیا اور شور مچا دیا کہ میرا موتی اس نے لیا ہے۔ چنانچہ لوگ آپ پر سختی کرنے لگے۔ آپ نے دریا کی طرف دیکھ کر فرمایا "اے دریا کے رہنے والو، یہ لوگ تو مجھے نہیں جانتے، تم تو پہچانتے ہو" یہ کہنا تھا کہ تمام مچھلیاں منہ میں موتی لیے کشتی کے پاس آ گئیں۔ تمام مسافر یہ

منظر دیکھ کر حیران ہو گئے۔

ایک مرتبہ پہاڑوں میں پھر رہے تھے کہ بہت سے لوگوں کو جمع دیکھا۔ پوچھنے پر آپ کو بتایا گیا کہ یہاں ایک عابد رہتے ہیں، جو سال میں ایک مرتبہ باہر آتے ہیں اور بیماروں پر دم کرتے ہیں جس سے انھیں شفا نصیب ہو جاتی ہے پھر واپس اپنی عبادت گاہ میں چلے جاتے ہیں۔ آپ وہاں رُک گئے تھوڑی دیر بعد دیکھا کہ ایک نہایت کمزور اور ضعیف شخص باہر آیا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور چہرہ زرد تھا، مگر ان سے بلا کی ہیبت ظاہر ہوتی تھی۔ عابد نے باہر آتے ہی آسمان کی طرف نظر اٹھائی پھر تمام بیماروں پر شفقت کی نظر کی اور دم کیا۔ جب وہ عبادت گاہ میں واپس جانے لگے تو ذوالنون مصریؒ نے ان کا دامن تھام لیا اور فرمایا آپ نے علّتِ ظاہری کا علاج تو کر دیا، اب علّتِ باطنی کا بھی علاج کریں۔ عابد نے ان کی طرف دیکھ کر کہا "میرا دامن چھوڑ دے اس لیے کہ دوست اپنی شانِ جلالی کے ساتھ دیکھ رہا ہے، اور جب وہ یہ دیکھ لے گا کہ تم اُسے چھوڑ کر غیر کا دامن تھام رہے ہو تو وہ تجھے غیر ہی کے حوالے کر دے گا۔" یہ کہہ کر عابد اپنی عبادت گاہ میں چلا گیا۔

آپ کا ارشاد ہے کہ ایک مرتبہ سجدہ میں میری آنکھ لگ گئی، میں نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو یہ فرماتے سنا کہ "اے ابوالفیض! میں نے مخلوق کو پیدا کیا اور وہ دس حصوں میں تقسیم ہوئی۔ جب میں نے دنیا ان کے سامنے پیش کی تو نو حصوں نے اس کی طرف توجہ دی اور ایک حصے نے اسے قبول نہ کیا، پھر ایک حصے کے دس گروہ ہو گئے اور جب میں نے جنت ان کے سامنے پیش کی تو ان میں سے نو حصوں نے اس کی طرف توجہ دی اور ایک حصے نے جنت کو قبول نہ کیا۔ پھر اس ایک حصے کے مزید دس حصے ہو گئے۔ جب میں نے دوزخ ان کے سامنے پیش کی تو نو حصے دوزخ کے خوف سے پریشان ہو گئے اور صرف ایک حصہ رہ گیا جس نے دوزخ کی طرف مطلق توجہ نہ دی اور وہ نہ گھبرائے۔ یہ حصہ جنت کی طرف بھی مائل نہ ہوا۔ پس میں ان سے مخاطب ہوا کہ اے میرے بندو میں نے تمھارے سامنے دنیا پیش کی تو تم نے اُسے قبول نہ کیا، جنت لائی گئی تو تم نے اس کی طرف بھی توجہ نہ دی اور جب دوزخ سامنے کی تو تم اس سے بھی نہ ڈرے۔ آخر تم ہی بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو۔" چنانچہ انھوں نے سر جھکا کر عرض کیا کہ اے اللہ! جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ تو جانتا ہی ہے۔

آپ کے پاس ایک لڑکا آیا اور کہا مجھے ایک لاکھ دینار میراث میں ملے ہیں، میں انھیں آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا تو بالغ نہیں، اس لیے صبر کر جب تک تو بالغ نہ ہو جائے انھیں صرف نہیں کر سکتا۔ جب لڑکا بالغ ہو گیا تو پھر آپ کی خدمت میں آیا اور ساری رقم محتاجوں میں تقسیم کر دی۔ پھر ایک مرتبہ اس نے کہا، کاش یہ رقم میرے پاس ہوتی۔

ذوالنونؒ نے سوچا کہ ابھی یہ لڑکا حقیقت سے دُور ہے۔ چنانچہ آپ نے اُس سے کہا کہ فلاں دوا فروش سے فلاں دوا لاؤ۔ وہ لڑکا لے آیا۔ آپ نے اُس کی گولیاں بنا کر ان پر کچھ پڑھا تو وہ یاقوت کے ٹکڑے بن گئیں۔ پھر لڑکے کو دے فرمایا کہ بازار میں جاکر ان کی صرف قیمت پوچھ آؤ، بیچنا نہیں۔ لڑکا انھیں جوہری کے پاس لے گیا۔ جوہری نے کہا کہ ہر ٹکڑا لاکھ دینار کی مالیت کا ہے اگر تم بیچنا چاہو تو ہم خرید لیتے ہیں، مگر لڑکے نے حکم کے بموجب انھیں فروخت نہ کیا اور واپس آکر ذوالنونؒ کو ان کی قیمت بتائی۔ آپ نے وہ ٹکڑے لڑکے کے ہاتھ سے لے لیے اور انھیں باریک پیس کر پانی میں گھول دیا۔ پھر لڑکے سے مخاطب ہو کر فرمایا "یہ درویش روٹی کے بھوکے نہیں بلکہ ان کی یہ حالت اختیاری ہے"۔ لڑکے نے یہ بات سُن کر توبہ کی۔

خواجہ فضیل بن عیاضؒ خراسان کے رہنے والے تھے۔ ابتداءً ڈاکو تھے۔ تسبیح گلے میں ڈال کر چوروں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ لُوٹ کے مال کی تقسیم ان کے سپرد تھی۔ نماز باجماعت کے بھی سختی سے پابند تھے۔ ایک عورت سے عشق تھا۔ تقسیم کے مال سے جو حصّہ ملتا وہ سب اُسی کو دے دیتے۔ ایک دن کسی قافلے کے لوٹنے کے لیے نکلے، راستہ میں قرآن مجید کی ایک آیت کان میں پڑی، ایسا اثر ہوا کہ لُوٹ مار سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی، کوفہ میں آکر امام ابوحنیفہ کی شاگردی اختیار کی اور عزلت اختیار کر کے یادِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔

ایک دفعہ تلاوت قرآن میں مصروف تھے کہ خلیفہ ہارون الرشید ملاقات کے لیے ان کے مکان پر آیا۔ دروازہ پر دستک دی۔ آپ نے پوچھا کون ہے۔ فضل برمکی خلیفہ کے ساتھ تھا، وہ بولا امیرالمومنین آئے ہیں۔ فضیل بولے اُسے مجھ سے اور مجھے اُس سے کیا کام؛ فضل نے کہا امیر کی اطاعت واجب ہے۔ چنانچہ بادلِ ناخواستہ اُٹھے، چراغ گل کر دیا اور دروازہ کھولا۔ ہارون نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، آپ نے اس کے نرم ہاتھ کو محسوس کر کے فرمایا کتنا اچھا ہاتھ ہے، کاش یہ آتشِ دوزخ سے خلاصی پائے۔ ہارون یہ سُن کر رونے لگا، اور عرض کیا مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔ آپ نے کہا تمھارے باپ حضرت عباسؓ رسول اللہؐ کے چچا تھے، جب انھوں نے آپ سے درخواست کی کہ مجھے بھی کسی قوم پر امیر بنا کر بھیجیں تو رسول اللہؐ نے فرمایا آپ کے لیے طاعتِ حق بہتر ہے۔

ہارون نے کہا مزید نصیحت فرمائیں۔ بولے جب عمر بن عبدالعزیز کو خلافت سپرد کی گئی تو آپ نے سالم بن عبداللہ اور محمد بن کعب کو بلا کر کہا کہ میں اس مصیبت میں ڈالا گیا ہوں، مجھے کیا کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا اگر تم قیامت میں نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو بڑھوں کو باپ کی طرح، جوانوں کو بھائی کی طرح، بچوں کو اپنی اولاد کی طرح اور عورتوں کو اپنی بہنوں کی طرح سمجھو۔

جب یہ نصیحتیں سن کر ہارون جانے لگا تو ہزار دینار کی تھیلی آپ کو پیش کی۔ آپ نے تھیلی دیکھ کر فرمایا، ہارون میری یہ نصیحتیں تیرے کام نہ آئیں اور تو نے اسی جگہ سے ظلم شروع کر دیا۔ میں تمھاری نجات چاہ رہا ہوں اور تم مجھے بلا میں پھنسا رہے ہو۔ یہ فرمایا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہارون چلا گیا، باہر نکل کر وزیر سے کہا درحقیقت مردِ خدا خواجہ فضیل ہی ہیں۔

داؤد طائیؒ کی طرف ایک شخص بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ آپ نے اس سے فرمایا تم نہیں جانتے جس طرح بہت باتیں کرنا مکروہ ہے اسی طرح بہت دیکھنا بھی مکروہ ہے۔

ابراہیم ادھمؒ ایک مرتبہ کسی جنگل میں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک کوتوال مل گیا۔ اُس نے آپ سے پوچھا آبادی کس طرف ہے۔ آپ نے فاصلے پر ایک قبرستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا وہ ہے۔ کوتوال کے ہاتھ میں بید تھا اُس نے غصہ میں آپ کے سر پر دے مارا اور کہا تو ہم سے مذاق کرتا ہے۔ پھر اپنے ساتھ شہر کی طرف لے گیا۔ شہر پہنچتے ہی لوگ آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ کوتوال نے لوگوں سے کہا تم کیوں جمع ہو گئے ہو۔ وہ کہنے لگے آپ شاید نہیں جانتے یہ ابراہیم ادھم ہیں۔ کوتوال آپ کا نام سنتے ہی قدموں پر گر پڑا اور معافی چاہی۔ پھر پوچھا کہ آپ نے مجھے آبادی کا پتہ پوچھنے پر قبرستان کا پتہ کیوں بتایا۔ فرمایا اس لیے کہ قبرستان روز بروز بڑھ رہے اور شہر ویران ہو رہے ہیں۔ اس لیے حقیقی آبادی تو قبرستان ہی ہے۔

ابوالحسن خرقانیؒ اپنے مریدوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ کئی دنوں سے سب فاقوں سے تھے۔ ایک شخص آٹے کی بوری اور بکری لے کر حاضر ہوا اور کہا میں یہ چیزیں صوفیوں کے لیے لایا ہوں۔ شیخ نے مریدوں سے مخاطب ہو کر فرمایا تم میں جو صوفی ہو وہ لے لے۔ میں صوفی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ مریدوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا مگر کسی نے وہ چیزیں لینے کی جرأت نہ کی۔

عبداللہ بن مبارکؒ ہارون الرشید کے زمانہ میں بہت بڑے فقیہ اور حدیث میں ثقہ مانے جاتے تھے۔ زہد و ریاضت اور علم و فضل میں یگانہ تھے۔ عام و خاص میں وہ قبولیت حاصل کی کہ کسی بادشاہ کو بھی نصیب نہ ہوئی۔

ایک دفعہ آپ رقہ گئے۔ اہلِ رقہ کو آپ کی تشریف آوری کا علم ہوا تو جوق در جوق زیارت کے لیے حاضر ہونے لگے۔ دیکھتے دیکھتے چاروں طرف ہزاروں افراد کا ہجوم ہو گیا۔

ان دنوں ہارون الرشید بھی رقہ میں آیا ہوا تھا اور اس کی اہلیہ بھی ساتھ تھی۔ ہارون کی اہلیہ نے عبداللہ بن مبارک کا ایسا شاندار استقبال اور اتنی مقبولیت دیکھ کر پوچھا یہ کون ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ خراسان کے مشہور عالم دین عبداللہ بن مبارکؒ ہیں۔ وہ بولی درحقیقت سلطنت اس کا نام ہے کہ لوگ خود بخود زیارت کو ٹوٹے پڑتے ہیں، ہارون کی حکومت بھی کوئی حکومت ہے کہ سپاہیوں کے بغیر ایک شخص بھی حاضر نہیں ہو سکتا۔

ایک مرتبہ آپ حج سے فارغ ہو کر حرم میں سو گئے۔ خواب میں دو فرشتوں کی باتیں سنیں۔ ایک نے پوچھا اس سال کتنے لوگ حج کو آئے؟ دوسرے فرشتے نے کہا چھ لاکھ۔ پہلے فرشتے نے پوچھا کتنے لوگوں کا حج قبول ہوا۔ دوسرے نے کہا کسی کا حج

قبول نہیں ہوا۔ البتہ دمشق میں علی بن موفق ایک موچی رہتا ہے اگرچہ وہ حج کرنے نہیں آیا مگر اس کا حج قبول ہو گیا اور اسی کے طفیل ان تمام لوگوں کا حج قبول ہوا۔

عبداللہ بن مبارک بیدار ہوتے ہی اس موچی کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ اس کے مکان پر پہنچ کر دستک دی۔ علی بن موفق باہر آیا تو آپ نے خواب اس سے بیان کیا اور پوچھا تمہارا حج کیسے قبول ہوا؟ موچی نے کہا، میں نے حج تو نہیں کیا مگر ساری عمر تھوڑا تھوڑا اسی لیے کہ حج کے لیے کچھ رقم جمع کی اور حج پر جانے کے لیے تیار تھا، اس دوران میں ایک دن میری بیوی نے پڑوسی کے ہاں سے تھوڑا سالن طلب کیا، اُس نے کہا یہ گوشت تم پر حلال نہیں، اس لیے کہ سات دن کے فاقوں کے بعد بچوں کی بھوک سے بے تاب ہو کر ہم نے مردار پکایا ہے۔

یہ سُن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے جتنا روپیہ حج کے لیے جمع کیا تھا وہ سارے کا سارا اٹھا کر ان کے گھر لے آیا تاکہ وہ اپنے بال بچوں پر خرچ کریں۔

عبداللہ بن مبارک نے یہ سُن کر فرمایا "واقعی فرشتوں نے سچ کہا تھا۔"

ایک مرتبہ ایک غلام کو دیکھا جو سخت سردی میں صرف ایک کرتا پہنے تھا اور سردی سے کانپ رہا تھا۔ آپ نے اُس سے کہا تو اپنے آقا سے کپڑا کیوں نہیں مانگتا۔ غلام نے کہا جب آقا دیکھتا ہے تو میں اُس سے کیوں کہوں؟

یہ سُن کر آپ نے فرمایا "طریقت اس غلام سے سیکھنی چاہیے۔"

داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں، میں ایک دفعہ کرمان گیا اور وہاں شیخ ابواحمد مظفر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پریشان حال تھا۔ انھوں نے فرمایا "ابوالحسن، کوئی خواہش ہے؟" میں نے کہا سماع کی خواہش ہے۔ انھوں نے ایک قوال کو بلایا اور کچھ درویش بھی آ گئے۔ مجھے سماع کے الفاظ نے مضطرب کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب میرا اضطراب اور جوش کم ہوا تو شیخ ابواحمد مظفر نے پوچھا، سماع کا کیسا اثر ہوا؟ میں نے کہا اے شیخ! بہت خوشی ہوئی۔ وہ بولے، ابوالحسن ایک وقت آئے گا جب سماع اور کوّے کی آواز میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ کیونکہ قوتِ سماع اس وقت تک ہے جب تک مشاہدہ حاصل نہ ہو۔ مشاہدہ حاصل ہو جائے تو سماع کی خواہش نہیں رہتی۔

میں عثمان جلابی کا بیٹا علی بھی پسند کرتا ہوں کہ سماع میں پڑ کر طبیعت کو پریشان نہ کیا جائے۔

ذوالنون مصریؒ نے بایزید بسطامیؒ کو کہلا بھیجا کہ تم رات کو آرام سے جنگل میں سوتے ہو، قافلہ تو چلا گیا۔ بایزیدؒ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ مردِ کامل تو وہ ہے جو رات کو آرام سے سوئے اور پھر صبح کے وقت قافلہ کے پہنچنے سے پہلے منزل پر جا پہنچے

ذوالنونؒ یہ جواب پاکر رودیے اور کہلا بھیجا کہ بایزیدؒ مبارک ہو، ہم اس مرتبے کو نہ پہنچے۔

ابو بکر شبلیؒ کی مجلس میں ایک روز عبداللہ رازیؒ ایک قیمتی جُبہ پہن کر آئے جو انھیں کسی امیر نے عطا کیا تھا۔ ابو بکرؒ اس وقت کلاہ اوڑھے ہوئے تھے۔ عبداللہ رازیؒ نے شبلیؒ کی کلاہ دیکھ کر دل میں کہا کاش یہ کلاہ میرے پاس ہوتی اور میں اسے جُبے کے ساتھ اوڑھتا۔ دونوں کا جوڑ بہت اچھا رہتا۔

رازیؒ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ شبلیؒ نے ان کی طرف گھُور کر دیکھا، پھر اُٹھے اور رازیؒ کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے مکان پر لے گئے۔ کہا کہ اپنا جُبہ اتار دو۔ رازی نے ارشاد کی تعمیل کی اور جُبہ اتار دیا۔ شبلیؒ نے جُبے کو تہ کیا، پھر اپنی کلاہ اتار کر جُبے پر رکھ دی اور دونوں کو اُٹھا کر تنور میں پھینک دیا۔ چنانچہ دونوں جل کر راکھ ہوگئیں۔ شبلیؒ نے فرمایا میں نے یہ اس لیے کیا ہے کہ آئندہ بھی جب کبھی تو دوسروں کا لباس دیکھے تو تیرا نفس ان کے حصول کے لیے تجھے نہ بہکائے۔

خواجہ جمال موصلیؒ کو سالہا سال کی ریاضت و مجاہدہ کے بعد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب میں قبر کے لائق جگہ ملی۔ آپ نے وصیت فرمائی کہ میری قبر پر یہ کتبہ لکھا جائے "وہ کتا جو کسی سعادت مند کے پیچھے ہولیتا ہے، وہ بہتر ہے۔"

مولانا ظہیر الدین دہلوی ایک مرتبہ سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا کی خدمت میں آئے تو خواجہ صاحب کے کمرے سے انھیں عُود کی خوشبو آئی۔ سمجھے کہ شاید عُود جلایا جا رہا ہے۔ جب کمرہ کھلا تو دیکھا اندر کچھ بھی نہ تھا۔ بہت حیران ہوئے۔ خواجہ صاحب نے نورِ باطن سے ان کے دل کی بات جان لی۔ فرمایا یہ عُود کی خوشبو نہیں بلکہ خدائی عطیہ ہے۔

خواجہ باقی باللہؒ ابھی عمر کے چالیسویں سال میں قدم رکھنے ہی والے تھے کہ ایک دن اپنی اہلیہ محترمہ سے فرمایا "جب میں چالیس سال کا ہوجاؤں گا تو ایک بڑا واقعہ پیش آئے گا" پھر ایک دن آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر اہلیہ سے کہا کہ اس کے اندر جھانکو۔ اہلیہ نے دیکھا تو ایک نہایت ضعیف مرد نظر آیا۔ بولیں یہ تو آپ کی صورت نہیں۔ خواجہ صاحب مسکرا دیے اور اپنی اصلی صورت آئینہ میں دکھا دی۔

ابو بکر وراقؒ کا لڑکا مکتب میں پڑھتا تھا۔ ایک دن جب وہ پڑھ کر گھر لوٹا تو ابو بکرؒ نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا رنگ فق ہے اور رو رہا ہے۔ آپ نے ماجرا پوچھا، بیٹے نے کہا آج میرے استاد نے ایک ایسی آیت سنائی جسے سنتے ہی میں بے حال ہوگیا۔ ڈر کے مارے میرے آنسو نکل آئے اور ابھی تک جاری ہیں۔ باپ نے پوچھا وہ کون سی آیت ہے۔ بیٹے

نے کہا وہ آیت یہ ہے یَوۡمًا یَّجۡعَلُ الۡوِلۡدَانَ شِیۡبًا (اس دن کہ جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا)۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد بچے کا انتقال ہوگیا۔ ابوبکر وراقؒ بیٹے کی قبر پر جایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے "اے ابوبکر! تیرا بیٹا تو ایک ہی آیت سن کر اس کی تاب نہ لاتے ہوئے راہِ حق میں قربان ہوگیا۔ مگر تجھے قرآن پڑھتے ایک عمر گزر گئی ہے اور تجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔"

ابوعبداللہ جلاءؒ نے ایک نوجوان اور نہایت خوبصورت شخص کو دیکھا جو آتش پرست تھا۔ آپ اس کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد جنید بغدادیؒ بھی وہاں آپہنچے۔ ابوعبداللہ نے جنید سے مخاطب ہوکر فرمایا کتنا حسین چہرہ ہے جو آگ کی نذر ہوگا! یہ سن کر جنید بولے "یہ صرف نفس کا دھوکہ ہے کیوں کہ کائنات میں اس سے بھی بڑھ کر ہزاروں خوبصورت چیزیں ہیں اور مجھے افسوس ہے کہ تم نے انھیں عبرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔"

سفیان ثوریؒ ایک دن مسجد میں داخل ہوئے تو پہلے بایاں پاؤں اندر رکھا۔ مسجد کے ایک کونے سے آواز آئی "اے سفیان! تم اللہ کے گھر میں بے سوچے سمجھے قدم رکھتے ہو۔" یہ سن کر آپ رو دیے اور اپنے آپ سے کہا "سفیان! اگر تم انسانوں کی طرح مسجد میں داخل ہوتے تو آج تمھارا شمار حیوانوں میں نہ ہوتا۔"

شاہ کلیم اللہؒ کی خدمت میں ایک طالب علم آیا اور کہا میں ہر نماز کی نیت میں کہتا ہوں کہ میرا منہ کعبے کی طرف ہے مگر کعبہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ شاہ صاحب مسکرا دیے اور فرمایا آنکھیں بند کرو۔ طالب علم نے آنکھیں بند کرلیں۔ شاہ صاحبؒ نے پوچھا کچھ نظر آتا ہے۔ طالب علم کہنے لگا "ہاں حضرت بیت اللہ شریف کو دیکھ رہا ہوں۔" آپ نے فرمایا تقویٰ اختیار کرو اور خدا کی اطاعت کرو، ہر وقت ایسا ہوسکتا ہے۔

معروف کرخیؒ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ کسی کام سے باہر جانا پڑا۔ آپ نے اپنا مصلّٰی اور قرآن مجید ایک کونے میں رکھ دیا اور چلے گئے۔ ایک بڑھیا مسجد میں آئی، دونوں چیزوں پر نگاہ پڑی، جب دیکھا کہ کوئی شخص موجود نہیں تو انھیں اپنی چادر میں چھپا کر لے گئی۔ راستے میں معروف کرخی مل گئے جو واپس مسجد کی طرف آرہے تھے۔ نورِ باطن سے معلوم کرلیا، کہ بڑھیا مصلّٰی اور قرآن مجید لیے جارہی ہے۔ آپ نے بڑھیا سے پوچھا تیرا لڑکا قرآن پڑھتا ہے، بڑھیا نے کہا نہیں۔ فرمایا مصلّٰی تو تمھارے کام آسکتا ہے مگر قرآن تمھارے کس کام۔ بڑھیا گھبرا گئی اور دونوں چیزیں وہیں چھوڑ کر رفوچکر ہوگئی۔

جنید بغدادیؒ کے پاس ایک شخص دینار کی ایک تھیلی لایا اور ان کی خدمت میں پیش کی۔ آپ نے اس سے پوچھا کیا

تمھارے پاس اور مال بھی ہے؟ اس نے کہا ہاں بہت ہے۔ فرمایا تو اور مال بھی چاہتا ہے، اس نے کہا کیوں نہیں؛ فرمایا پھر یہ بھی واپس لے جا کیونکہ تو ہی اس کا مستحق ہے۔ میں کچھ نہ رکھنے کے باوجود اس کی خواہش نہیں رکھتا۔

ایک چور کو پھانسی پر چڑھایا گیا۔ جنید بغدادیؒ اس کے قریب گئے اور اس کے قدموں کو چوما۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیا؟ فرمایا اس پر ہزاروں رحمتیں ہوں کہ اس نے جس کام کو شروع کیا اُسے انجام تک پہنچایا، یہاں تک کہ اس کے لیے جان دے دی۔

ایک دفعہ خلیفۂ وقت نے آپ کے ایمان کی آزمائش کے لیے ایک خوبصورت نوجوان عورت بھیجی تاکہ وہ آپ کو گمراہ کرے۔ جونہی وہ آپ کے سامنے آئی، آپ نے نظریں اٹھا کر اُسے دیکھا ہی تھا کہ وہ لڑکھڑا کر گری اور گرتے ہی دم توڑ دیا۔

خلیفہ کو پتہ چلا تو آپ کو بُلا کر پوچھا، یہ آپ نے کیا کیا؟ ایسی صورت کو خاک میں ملا دیا! آپ نے خلیفہ کو جواب دیا کہ آپ نے کیا کیا جو میری چالیس سال کی عبادت کو خاک میں ملانے کے درپے ہو گئے!

آپ اپنے مریدوں میں ایک مرید کو بہت چاہتے تھے اور دوسروں کی نسبت اس سے زیادہ اچھا سلوک کرتے تھے۔ مریدوں نے شکایت کی، تو آپ نے فرمایا اس میں فراست تم سے زیادہ ہے۔ پھر امتحان کے لیے سب مریدوں کو ایک ایک جانور اور ایک ایک چھری دے کر فرمایا اسے وہاں جا کر ذبح کرو، جہاں کوئی نہ دیکھے۔

مرید چلے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد جانور ذبح کر کے لے آئے۔ مگر وہ مرید زندہ جانور واپس لے آیا۔ آپ نے اس سے پوچھا تم نے اسے ذبح کیوں نہ کیا۔ اُس نے کہا آپ نے فرمایا تھا کہ اسے ایسی جگہ ذبح کرو جہاں کوئی نہ دیکھے، مگر خدا ہر جگہ حاضر ناظر ہے میں اسے کہاں لے جا کر ذبح کروں۔

آپ نے مریدوں کو مخاطب کر کے فرمایا تم نے دیکھ لیا میں اسے تم سب سے زیادہ کیوں چاہتا ہوں۔

آپ کے ایک مرید کا چہرہ کسی گناہ کے سبب سیاہ ہو گیا۔ تین دن تک سیاہ رہنے کے بعد سیاہی جاتی رہی۔ آپ نے مرید کو لکھ بھیجا کہ میں آج تین دن سے تمھارے لیے دھوبی کا کام کر رہا ہوں۔

ایک شخص نے پانچ سو دینار آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ آپ نے پوچھا کیا تمھارے پاس اور دینار بھی ہیں۔ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے اس کے دینار واپس کرتے ہوئے فرمایا، مجھ سے زیادہ تمھیں ان کی ضرورت ہے، لہٰذا یہ لے جاؤ۔ میرے پاس اگرچہ کچھ نہیں، پھر بھی مجھے ان کی خواہش نہیں۔

بایزید بسطامیؒ سے ایک منکر خدا نے سوال کیا کہ میں خدا کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا فلاں غار پر جاؤ، وہاں میرا ایک دوست ملے گا وہ تمھیں خدا دکھا دے گا۔ چنانچہ وہ شخص اس غار پر گیا دیکھا کہ وہاں ایک بہت بڑا سانپ بیٹھا ہے۔ سانپ کو دیکھ کر وہ ڈرا اور الٹے پاؤں بایزیدؒ کے پاس واپس آیا اور کہا کہ وہاں تو سانپ بیٹھا تھا جس سے ڈر کر میں بھاگ آیا ہوں۔ بایزیدؒ نے کہا تم تو خدا کی مخلوق کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ خدا کے سامنے کس طرح ٹھہرو گے؟

ابراہیم ادھمؒ درویشی اختیار کرنے سے پہلے خراسان کے بادشاہ تھے۔ ایک دن محل کے دروازے پر شان و شوکت سے بیٹھے تھے کہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ایک فقیر تیزی سے محل کی جانب لپکا اور اندر داخل ہونے لگا۔ پہرے داروں نے پکڑ لیا اور مارنے لگے۔ فقیر نے پوچھا کہ میری کیا خطا ہے؟ وہ کہنے لگے اس سے بڑی خطا اور کیا ہوسکتی ہے کہ تم بادشاہ کے محل میں بغیر اجازت گھسنے لگے تھے۔ فقیر نے کہا میں تھکا ماندہ مسافر ہوں آرام کرنے کے لیے مسافر خانہ میں جارہا تھا۔ پہرے داروں نے کہا تو کیسا احمق ہے۔ یہ شاہی محل ہے تم نے اسے مسافر خانہ کیسے سمجھ لیا؟ فقیر بولا اچھا یہ تو بتاؤ اس سے پہلے اس محل میں کون رہتا تھا۔ وہ بولے . . . . اس سے پہلے موجودہ بادشاہ کا باپ یہاں رہتا تھا۔ فقیر نے پوچھا اور اس سے پہلے؟ وہ بولے اس سے پہلے اس بادشاہ کا دادا۔ فقیر بولا کہ پھر میں نے غلط تو نہیں کہا تھا، یہ مسافر خانہ نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک آتا ہے اور ایک جاتا ہے۔ جب یہ بادشاہ چلا جائے گا تو کوئی اور اس جگہ آجائے گا۔

کہتے ہیں کہ اسی واقعہ نے ابراہیم ادھمؒ کو اتنا متاثر کیا کہ دنیا سے نفرت ہوگئی اور بادشاہی پر لات مار کر فقیری اختیار کرلی۔

فضیل بن عیاضؒ اور سفیان ثوریؒ ایک دفعہ بیٹھے آیات و اخبار کا ذکر کر رہے تھے۔ رات کو خاصی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ جب سفیان ثوری اٹھ کر جانے لگے تو فرمایا بڑی مبارک رات تھی اور ایسی اچھی صحبت رہی کہ آج تک میسّر نہ آئی تھی۔ فضیل بولے، بہت بُری رات تھی اور بدترین صحبت رہی۔ سفیان ثوری نے متعجب ہوکر پوچھا وہ کیسے؟ فضیل نے جواب دیا کہ تم اس فکر میں تھے کہ وہ بات کہو جو مجھے پسند آئے اور میں اس خیال میں تھا کہ ایسا جواب دوں جو تمھیں پسند آئے۔ غرض ساری گفتگو کے دوران تمھیں میری خوشنودی کا خیال رہا اور مجھے تمھاری خوشنودی کا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے کلام میں مبتلا رہے اور حق سے دُور رہے۔ اس سے تنہائی اور مناجات باحق بہتر ہے۔

ابراہیم ادھمؒ نے ایک درویش کو روتے ہوئے دیکھا تو پوچھا "کیا تجھے درویشی مفت مل گئی جو روتا ہے" درویش نے جواب دیا "کیا درویشی کی بھی قیمت ہوتی ہے؟" ابراہیم ادھمؒ بولے "کیوں نہیں میں نے بلخ کا ملک دے کر اسے خریدا ہے

اور جب غور کرتا ہوں تو مجھے یہ سودا سستا معلوم ہوتا ہے۔

سفیان ثوریؒ اور خلیفہ ہارون الرشید بچپن کے دوست تھے۔ جب ہارون خلیفہ ہوا تو سفیان نے اس سے ملاقات ترک کر دی، ہارون کو اس سے ملنے کا اشتیاق ہوا اور اُسے خط لکھا کہ خدا نے تمام مسلمانوں کو بھائی بھائی بنا دیا ہے اچنانچہ تیرے اور تمھارے تعلقات اسی طرح قائم ہیں جس طرح تھے۔ میرے تمام دوست مجھے مبارک باد دینے آتے ہیں اور میں انھیں اس کا صلہ دیتا ہوں، مگر تم ابھی تک میرے پاس نہیں آئے، یہ شانِ خلافت کے خلاف ہے۔ تم ضرور آؤ۔

سفیان ثوری نے جواباً لکھا کہ میں نے تمھیں پہلے اطلاع دے دی ہے کہ میرا اور تمھارا اب کوئی تعلق نہیں رہا۔ پھر اپنے خط میں تم نے تسلیم کیا ہے کہ تم نے مسلمانوں کے بیت المال سے بے جا طور پر خرچ کیا ہے۔ اس کے باوجود تمھاری تسلی نہیں ہوئی اور تم چاہتے ہو کہ قیامت کے دن میں بھی تمھارے اسراف کی گواہی دوں۔ تجھے خدا کے سامنے جواب دہی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ تو شان و شوکت سے زندگی بسر کرتا ہے۔ تیرے عامل خود شراب نوشی کرتے ہیں، مگر دوسروں کو شراب پینے پر سزا دیتے ہیں۔ خود چوری کرتے ہیں مگر دوسروں کے ہاتھ کاٹتے ہیں۔ ان جرائم کی پہلے تجھے اور تیرے عاملوں کو سزا ملنی چاہیے، پھر دوسروں کو۔ قیامت کے دن تیری مشکیں بندھی ہوں گی، تو آگے آگے ہوگا اور تیرے عمال تیرے پیچھے پیچھے۔ اس حال میں تجھے دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا۔ میں نے تیری خیرخواہی کے لیے یہ باتیں لکھ دیں۔ آئندہ مجھے خط نہ لکھنا۔

ہارون نے یہ خط پڑھا تو بے اختیار رونے لگا۔ سفیان ثوری کی نصیحت نے اس کے دل پر ایسا اثر کیا کہ اپنی اصلاح پر مجبور ہو گیا۔

صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین

کے چیدہ چیدہ

اقوال

——— افضل ترین رونا وہ ہے جو ایسے اوقات کے ضائع ہونے پر رویا جائے جن میں کوئی نیکی نہ کی گئی ہو۔ احمد خوارزمیؒ

——— دنیا میں سب سے طاقت ور وہ ہے جو اپنے غصے پر قابو پالے۔ ″

——— عمل میں اخلاص، عمل سے زیادہ سخت ہے۔ عبداللہ خبیقؒ

——— بھوک فقراء کی معراج ہے ابو اسحاق شامی

——— عارف سورج کی طرح ہے کہ سب کو روشنی پہنچاتا ہے، وہ زمین کی طرح ہے کہ سب چیزوں کا بوجھ اٹھاتا ہے اور پانی کی طرح ہے کہ اس سے دلوں کو زندگی ملتی ہے۔ ابو اسحاق شامی

——— تین آدمیوں سے پرہیز کرو: غافل علماء سے، دینی معاملات میں رورعایت کرنے والوں سے اور جاہل صوفیوں سے یحییٰ معاذ

——— صبر مضطر لوگوں کا زادِ راہ ہے اور رضا عارفوں کا درجہ ہے۔ احمد خضرویہ

——— اپنے نفس کو ہلاک کر تاکہ تو زندہ ہو جائے۔ ″

——— خدا کی رضامندی چار چیزوں سے حاصل ہوتی ہے، روزی میں امن رکھنے سے، کام میں خلوص کے طفیل، موت کی تیاری اور شیطان کی دشمنی سے۔ شفیق بلخی

——— ان چار چیزوں کے سوا دنیا میں اور کچھ نہیں: آنکھ، زبان، دل اور خواہش۔ عبداللہ خبیق

——— جسے گمان ہو کہ وہ حقیقت سے قریب ہے وہ اصل حقیقت سے دُور ہے۔ علی سہل اصفہانی

——— آدم سے لے کر آج تک لوگوں میں دل کے متعلق باتیں ہوتی رہی ہیں، لیکن مجھے ایسا کوئی نہیں ملا جو دل کے متعلق یہ بتا سکے کہ یہ کیسا ہے اور کیا چیز ہے۔ علی سہل اصفہانی

——— جس کی ابتدا میں ارادت درست نہ ہوگی وہ بالآخر عافیت اور سلامتی سے محروم رہے گا۔ ″

——— عقلمند شخص خدا کے حکم پر، ذاکر خدا کی رحمت پر اور عارف خدا کے قرب پر زندگی بسر کرتے ہیں

——— جب تک نفس ہلاک نہ ہو، دل زندہ نہیں ہو سکتا۔ سہل بن عبداللہ تستری

——— جو اپنے نفس کا مالک بن گیا وہ دوسروں کا بھی مالک بن گیا۔ سہل بن عبداللہ تستریؒ

——— محبت کا دعویٰ کرنے والا محبوب کی محبت کے علاوہ کسی اور شے کی طرف میلان رکھے تو وہ محبوب کا مذاق اُڑاتا ہے۔ بشر حافی

——— جو کوئی جتنا عقلمند ہوگا، اتنا ہی زیادہ عارف ہوگا اور منزل پر بھی جلد پہنچ جائے گا۔ (احمد خوانیؒ)

——— فقر کی انتہا تصوّف کی ابتدا ہے اور تصوف اپنی حالت مخفی رکھنے کو کہتے ہیں۔ ابوالعباس

——— جس کی تونگری اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے وہ ہمیشہ تونگر ہے اور جس کی تونگری کسب کے ساتھ ہے وہ ہمیشہ فقیر رہے گا۔ یحییٰ معاذؒ

——— جب امرا تباہ ہوتے ہیں تو لوگوں کی معیشت برباد ہوتی ہے۔ جب عالم تباہ ہوتے ہیں تو لوگوں کا دین بگڑتا اور برباد ہوتا ہے اور جب فقراء تباہ ہوتے ہیں تو لوگوں کے دل تباہ ہو جاتے ہیں۔ ابوبکر وراقؒ

——— نام و نمود اور شہرت کا خواہاں کبھی فلاح نہیں پاتا۔ بشر حافی

——— معرفت کے درخت کو تفکّر کا پانی ملتا ہے اور غفلت کے درخت کو جہالت کا اور توبہ کے درخت کو ندامت کا۔ احمد مسروقؒ

——— آنکھوں سے دنیا کی طرف نہ دیکھنا اور دل سے اس کے متعلق فکر نہ کرنا تقویٰ ہے۔ "

——— دنیا والوں کو سلام کرو، مگر ان سے سلام کی توقع نہ رکھو۔ بشر حافی

——— نجات چار باتوں میں ہے: کم خوری، تنہائی، شب بیداری اور خاموشی سہل بن عبداللہ

——— حدیث کی زکوٰۃ دینی چاہیے اور حدیث کی زکوٰۃ عمل ہے۔ سفیان ثوری

——— انسان اپنی حقیقت کے اعتبار سے خدا ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ خدا نے اُسے اپنی شکل پر پیدا کیا۔ منصور حلاج

——— کفر کی سخت قسموں میں ایک ریاکاری ہے۔ شاہ عبدالعزیز

——— دنیا میں روؤ تاکہ آخرت میں شادکام ہو۔ یحییٰ معاذ

——— لوگوں سے اپنی حاجت طلب کرنا اپنی عزت اور حیا کو کھونا ہے، بلکہ عزت اس میں ہے کہ جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے نیازی اختیار کر جائے۔ امام باقرؒ

——— آدمی سے مراد دو چیزیں ہیں، صورت اور صفت۔ ان دونوں میں صفت ہی قابلِ اعتنا ہے۔ شیخ رکن الدینؒ

——— تزکیۂ نفس اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک بندہ خدا کے حضور گڑگڑائے نہیں۔ "

——— کاہل، بخیل اور طول کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ ابی اسحاق گازرونی

——— خدا کا دوست دنیا کا دوست نہیں ہو سکتا اور دنیا کا دوست خدا کا دوست نہیں بن سکتا۔ "

——— ریاضت یہ ہے کہ تمام جسمانی تعلقات کی نفی ہو اور عالم ارواح اور حقیقت کی طرف پوری توجہ ہو۔ علاؤالدین عطارؒ

حسن بصریؒ
—— مومن وہ ہے جو ہر حال میں یکساں ہو۔

ابو یعقوب النہر
—— جس نعمت کی ناشکری کی جائے وہ کبھی پائدار نہیں ہوتی۔

"
—— دنیا دریا ہے اور آخرت اس دریا کا کنارہ ہے اور تقویٰ کشتی۔ مخلوق اس دریا میں مسافر کی طرح ہیں۔

—— جس کا پیٹ کھانے سے بھر جاتا ہے وہ ہمیشہ بھوکا رہے گا، جو مال کے باعث امیر ہے وہ ہمیشہ مفلس رہے گا اور جو لوگوں سے مانگتا رہتا ہے وہ ہمیشہ محروم رہے گا۔
ابو یعقوب

نا معلوم
—— فقیر وہ ہے جو دنیا کے لیے کوئی کام نہ کرے۔

—— فقر اس راز کا نام ہے جو اللہ کی طرف سے بندے کے پاس ہوتا ہے۔ جب تک وہ اسے پوشیدہ رکھے امین رہے گا جب ظاہر کر دے تو فقر کا نام اٹھ جائے گا۔
شاہ شجاع کرمانیؒ

شفیق بلخیؒ
—— دانا وہ ہے جسے دنیا دھوکہ نہ دے سکے اور دولتمند وہ ہے جو خدا کی تقسیم پر راضی ہو۔

حسن بصریؒ
—— تین آدمیوں کی غیبت روا ہے، ظالم، فاسق اور اہلِ ہوا۔

یحییٰ بن خالد
—— تین چیزیں ایسی ہیں جن سے بھیجنے والے کی عقل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ہدیہ، خط اور ایلچی۔

ابو الحسین نوری
—— حقیقی صبر یہ ہے کہ آدمی مصیبت کی آمد کو مصیبت کی رخصت کے برابر جانے۔

—— زاہد وہ ہے جس کی نظر میں لوگوں کی تعریف یا برائی کی کوئی اہمیت نہ ہو اور وہ دنیا کو حقارت کی نظر سے دیکھے۔ ابو عبداللہ جلاء

شاہ شجاع کرمانی
—— خواہشِ نفسانی کو ترک کرنا بھی مراد حاصل کرنے کے برابر ہے۔

ابو الحسن نوری
—— دنیا کی دشمنی اور خدا کی دوستی کا نام تصوف ہے۔

—— اپنی اصلاح فرضِ عین ہے، دوسروں کی اصلاح فرضِ کفایہ۔ جو شخص اپنی اصلاح کیے بغیر دوسروں کی اصلاح کی طرف توجہ دے، اس کی مثال اس طرح ہے جیسے اپنی آستین کے سانپ کی پروا نہ کرے، اور دوسروں کی مکھیاں اڑائے۔
ابو العلا

—— جو شخص عذابِ آخرت سے بچنا چاہے، اسے چاہیے کہ خدا کی اطاعت کرے، غریبوں کی حاجت روائی کرے اور بھوکوں کو کھانا کھلائے۔
معین الدین چشتیؒ

ابو العلا
—— دوسروں کو فریب دینا آسان ہے، مگر ہوشیار رہنا چاہیے کہ انسان خود فریب نہ کھائے۔

"
—— درویشی بادشاہت سے بہتر ہے بشرطیکہ گرفتاریٔ خلق شاملِ حال نہ ہو۔

"
—— انسان کو خود کندن بن جانا چاہیے تاکہ کسی اکسیر کی ضرورت نہ رہے۔

ابو سلیمان دارمی
—— بھوک آخرت کی کنجی ہے اور شکم سیری دنیا کی کنجی ہے۔

محمد علی حکیم الترمذی
—— جواں مرد وہ ہے جو سفر اور قیام کو ایک سا جانے۔

— عاقل وہ ہے جو اپنے نفس سے حساب لیتا ہے۔ — محمد علی حکیم الترمذی

— جو شخص حرام کا ایک درہم بھی اس کے مالک کو واپس دے دیتا ہے اُسے نبوت کا ایک درجہ مل جاتا ہے — "

— جس میں ایک بھی نفسانی خواہش باقی ہے وہ آزاد نہیں۔ اس کی مثال اس مکاتب غلام کی ہے جس پر ایک درہم بھی باقی ہو تو وہ اس وقت تک غلام ہی ہوتا ہے۔ — محمد علی حکیم الترمذی

— جو اپنی پریشانی لوگوں پر ظاہر کرتا ہے وہ رسوا ہوتا ہے۔ — امام باقرؒ

— انسان فقر کا حقدار اس وقت بنتا ہے، جب اس کے پاس کوئی شے باقی نہ رہے۔ — ابو عبداللہ جلاہ

— یقین ایک نور ہے، جس سے بندہ اپنے حالات میں نورانی ہو جاتا ہے۔ — ابو بکر وراقؒ

— اس درویش کا دل بہت اچھا ہے جس سے نہ تو دنیا میں بادشاہ خراج مانگتا ہے اور نہ آخرت میں خدا اس سے حساب طلب کرتا ہے۔ — ابو بکر وراقؒ

— اپنے اور اپنے نفس کے درمیان صبر اختیار کرو۔ — ایضاً

— خود عقلمند بننے کا دعویٰ نہ کرو، بلکہ دوسرے کی عقلمندی سے ڈرو۔ — ابو حفص حداد

— جس شخص کی لوگ عزت و تکریم کریں اُسے چاہیے کہ اپنے آپ کو کمتر اور حقیر خیال کرے۔ — عبداللہ منازل

— جس نے بندگی، سوال اور اس کے رد کا مزہ نہیں چکھا، اس میں کچھ بھی نہیں۔ — "

— مجھے اس شخص پر بڑا غصہ آتا ہے جو حیا کے متعلق بات کرتا ہے، مگر خود خدا سے شرم نہیں کرتا۔ — "

— انسان تین چیزوں کو دوست رکھتا ہے، مگر تینوں اس کی نہیں۔ روح، نفس اور مال۔ — ابو تراب النخشبیؒ

— توکل یہ ہے کہ انسان صبح بیدار ہو تو شام کا خیال نہ آئے اور شام ہو تو صبح کا خیال نہ آئے۔ — ابو حمزہ خراسانیؒ

— جو سفر تجھے درپیش ہے اس کے لیے توشہ مہیا کر لے۔ — "

— درویشوں کی خدمت سے تین خصلتیں ملتی ہیں: تواضع، حسنِ ادب اور سخاوت۔ — احمد خضرویہؒ

— زہد یہ ہے کہ زاہد پر خدا کے سوا اور کوئی حاکم نہ ہو۔ — احمد مسروقؒ

— نفس کو قتل کر دو تاکہ وہ زندہ ہو جائے۔ — احمد خضرویہؒ

— سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو لوگوں کی خدمت کرے۔ — عبداللہ احمدؒ

— جس نے اپنے آپ کو رضا کی نظروں سے دیکھا وہ ہلاک ہو گیا۔ — ابو حفص حدادؒ

— خوف ایک ایسا چراغ ہے، جس کی روشنی میں نیکی اور بدی دیکھی جا سکتی ہے۔ — "

— اپنی فراست کے دعویدار نہ بنو، مگر دوسروں کی فراست کے ہمیشہ قائل رہو۔ — "

— عورت کی خوبی دو باتوں سے ہے۔ اوّل یہ کہ اُسے کوئی نامحرم نہ دیکھے، دوسری یہ کہ وہ کسی نامحرم کو نہ دیکھے۔ — حضرت فاطمہؓ

یحییٰ معاذ رازیؒ
_____ اگر موت بازاروں میں بکتی تو اہلِ آخرت موت کے سوا کوئی چیز دنیا میں نہ خریدتے۔

"
_____ جو شخص مال پر تکبر کرتا ہے اس کے ساتھ تکبر سے پیش آنا عین تواضع ہے۔

قصار
_____ جو بات اپنے آپ سے بھی پوشیدہ رکھنی واجب ہے وہ دوسروں سے بھی پوشیدہ رکھو۔

_____ دنیا انسان کے سایے کی طرح ہے کہ اس کی طرف توجہ کرو تو وہ آگے آگے بھاگتا ہے اور پس پشت ہو تو آدمی کا پیچھا نہ چھوڑے۔ حاجی امداد اللہ مکی

ابو حفص حدادؒ
_____ ولی وہ ہے جو اپنے نفس سے اخلاص کا آرزومند ہو۔

_____ جو دنیا کو چھوڑتا ہے دنیا اس کا پیچھا کرتی ہے اور جو دنیا کا پیچھا کرتا ہے دنیا اُس سے دُور بھاگتی ہے، اور دنیا چھوڑنے والے کو ڈھونڈتی ہے۔ ابو حفص حداد

شاہ شجاع کرمانیؒ
_____ تقویٰ کی علامت زہد ہے اور زہد کی علامت شبہات سے بچنا ہے۔

_____ صوفی وہ نہیں جو خلوت نشینی یا چلہ کشی اختیار کرے، بلکہ صوفی وہ ہے جو اپنے آپ کو فنا کر دے۔ ابو العلا

یوسف بن الحسینؒ
_____ جو کوئی خدا سے جتنی زیادہ محبت کرتا ہے اتنی ہی زیادہ ذلت اُسے اٹھانی پڑتی ہے۔

_____ غنا یہ ہے کہ تو اپنے ہم جنسوں سے بے نیاز ہو اور فقر یہ ہے کہ تو اپنے جلیسوں کا محتاج ہو۔ ابو تراب بخشی

_____ جب خداوند تعالیٰ کسی سے مواخذہ کرتا ہے تو اُسے اپنے کاموں سے الگ کر کے نفس کے کاموں میں مصروف کر دیتا ہے۔ معروف کرخیؒ

"
_____ دنیا کی محبت دل سے دُور کر دو ورنہ اس حالت میں تم جو سجدہ کرو گے دنیا ہی کو کرو گے۔

"
_____ جوانمردی تین باتوں سے ہے ۱- بغیر جود کے تعریف - ۲- بغیر خلاف کے وفا اور ۳- بغیر سوال کے عطا

"
_____ اے نفس مجھے رہا کر دے تاکہ تو بھی رہا ہو جائے۔

_____ جو گناہ شہوت کی وجہ سے ہو اس کی بخشش کی امید کی جاسکتی ہے، لیکن جو گناہ غرور اور تکبر کی وجہ سے کیا جائے، اس کی بخشش کی امید نہ رکھو۔ سری سقطیؒ

_____ عارف وہ ہے جس کا کھانا مریضوں کا سا ہو، جس کا سونا مار گزیدہ کی طرح ہو اور جس کا عیش و آرام پانی میں غرق ہونے والے کی طرح ہو۔ سری سقطیؒ

"
_____ جو لوگوں میں اپنے متعلق ایسی باتیں بیان کرتا ہے جو اس میں نہ ہوں، وہ خدا کی نظروں سے گر جاتا ہے۔

"
_____ انسان اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی خواہشات پر دین کو مقدم نہ کرے۔

یحییٰ معاذؒ
_____ جو پوشیدہ طور پر خدا کی خیانت کرتا ہے، خدا اس کی ظاہر میں پردہ دری کرتا ہے۔

"
_____ خدا کے ساتھ باتیں زیادہ کرو اور لوگوں کے ساتھ کم۔

—— مومن کے ساتھ تین باتیں کرنی چاہئیں۔ اگر اسے نفع نہ پہنچا سکو تو نقصان بھی نہ پہنچاؤ۔ اگر اسے خوش نہ کر سکو تو خفا بھی نہ کرو۔ اگر اس کی تعریف نہ کر سکو تو مذمت بھی نہ کرو۔ یحییٰ معاذؒ

—— عقلمند کی دنیا طلبی بے عقل کی ترک دنیا سے بہتر ہے۔ "

—— دولت مند کے ساتھ تکبر سے پیش آنا عاجزوں کے ساتھ عجز و انکسار کے ساتھ پیش آنے کے برابر ہے "

—— توکل انسان کو غلامی سے آزاد کراتا ہے۔ "

—— محبت وہ ہے جو وفا دیکھ کر زیادہ نہ ہو اور جفا دیکھ کر کم نہ ہو۔ "

—— بہترین خوف یہ ہے کہ حقوق الٰہی کے بارے میں تم اپنے آپ کو سب سے زیادہ قصوروار سمجھو۔ شاہ شجاع کرمانیؒ

شکر نعمت یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہمیشہ طفیلی خیال کرو۔ حمدون قصارؒ

—— کسی کو اپنا محتاج نہ سمجھنا تواضع ہے۔ "

—— جہاں تک ممکن ہو دنیا کے لیے کبھی غصہ نہ کرو۔ "

—— مصیبت کے وقت بے صبر ہو جانا خدا پر الزام تراشنے اور تہمت لگانے کے برابر ہے۔ "

—— بندوں کے دل روحانی صفت ہیں اجب ان میں دنیا داخل ہوتی ہے تو روح پردہ کے پیچھے چلی جاتی ہے۔ منصور عمارؒ

—— بندہ کے لیے بہترین لباس عاجزی ہے۔ عارفوں کے لیے بہترین لباس تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔ "

—— جو مخلوق کے ذکر میں لگ جاتا ہے وہ خالق کے ذکر سے محروم ہو جاتا ہے۔ "

—— نفس کی مخالفت ہی میں نفس کی سلامتی ہے اور اس کی متابعت میں ہلاکت۔ "

—— زبان کی احتیاط رکھو تاکہ عذر خواہی کی ندامت سے بچ سکو۔ "

—— اہل صدق کے پاس صدق سے بیٹھو، کیوں کہ یہ لوگ دل کے جاسوس ہوتے ہیں۔ احمد بن عاصمؒ

—— جو اپنے نفس پر مطمئن ہے اسے ہلاکت کا خوف سب سے زیادہ ہے۔ "

—— تھوڑے اور معمولی گناہ کو تھوڑا اور معمولی سمجھنا ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔ "

—— دل کو زندہ رکھنے کا طریقہ ہے کہ دل کو ہمیشہ شکستہ رکھا جائے اور حرص سے بچا جائے۔ عبداللہ خفیفؒ

—— انسان کسی حال میں صدق سے مستغنی نہیں اور صدق ہر حالت میں مستغنی ہے۔ "

—— سکون کے بغیر توکل ایک اضطراب ہے۔ ابوسعید خرازؒ

—— خدا کی دوستی اور خلق خدا کی دشمنی کا نام تصوف ہے۔ ابوالحسن نوریؒ

—— تصوف نہ علوم کا نام ہے نہ رسومات کا، بلکہ نام ہے اخلاق کا۔ "

—— صابر وہی ہوتا ہے جو مصائب و آلام کا خوگر ہو اور قانع وہ ہوتا ہے جسے آئندہ کی فکر دامنگیر نہ ہو۔ عثمان الجسیریؒ

عثمان الجسیری
— خدا کے ساتھ خلوصِ نیت کا نام ہی اخلاص ہے۔
— خدا کی قدرت ظاہر ہے اور ہماری آنکھیں بند نہیں مگر اس کے باوجود ہماری نظر کمزور ہے۔ ابراہیم بن داؤد
— دنیا میں سب سے قوی وہ ہے جو شہوت کو ترک کر دے اور سب سے ضعیف وہ ہے جو اپنی شہوت پر غالب نہ آ سکے۔ ابراہیم بن داؤدؒ
— فقیر وہ ہے جو اپنے نفس اور دل کی حفاظت کرے اور حقوق اللہ کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے۔ ابو محمد زدیم
— عارف کا دل شیشے کی طرح ہوتا ہے کہ اس میں نظر ڈالے تو حق تعالیٰ کا جلوہ دیکھ لیتا ہے۔ ”
— اہلِ محبت اور حق کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ
— کامل وہ ہے جو عشق کے آغاز اور انجام میں قائم رہے اور ھَلْ مِنْ مَّزِیْد پکارتا رہے۔ ”
— محبت میں مصیبت اس لیے ہوتی ہے کہ ہر کمینہ اس کا دعویٰ نہ کرے۔ ”
— طریقت میں عارف وہ ہے جو ہر وقت تفکر کے عالم میں رہے۔ ”
— صادق وہ ہے جو دل سے خدا کے ساتھ رہے اگرچہ بظاہر بھائیوں کے ساتھ مصروف ہو۔ ابو بکر واسطیؒ
— خلقِ عظیم یہ ہے کہ نہ تیری کسی سے دشمنی ہو اور نہ کوئی تیرا دشمن ہو۔ ”
— جو چیز تمھاری طلب میں ہو اُسے مت طلب کرو اور جو شے خود تم سے ڈرتی ہے اُس سے تم خوف مت کھاؤ۔ ”
— تواضع یہ ہے کہ تو اپنے گھر سے باہر نکل کر جسے بھی دیکھے اُسے اپنے سے بہتر جانے۔ یوسف اسباطؒ
— لوگوں پر باجماعت نماز فرض نہیں مگر حلال کی طلب فرض ہے۔ ”
— گناہ کرنے والے سے میل جول رکھنا گناہ پر راضی ہونے کے برابر ہے اور گناہ پر راضی ہونا گناہ کرنے کے برابر ہے۔ معروف کرخیؒ
— صبر وہ تلخی ہے جس کا آخر شیرینی ہے اور شہوت وہ شیرینی ہے جس کا آخر تلخی ہے۔ ”
— عقلمند وہ ہے کہ مصیبت نازل ہونے پر پہلے دن وہی کام کرے جو اُسے تیسرے دن کرنا پڑے۔ ”
— کسی کا بُرا چاہنے والا ہمیشہ خود مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے۔ ”
— جو شخص مالِ حرام میں سے صدقہ دیتا ہے وہ گویا پلید کپڑے کو خون سے دھو کر پاک کرتا ہے۔ سفیان ثوریؒ
— یقینِ کامل یہ ہے کہ تو مصیبت اور بلا کے وقت خدا پر الزام نہ دھرے اور صبر و شکر کے ساتھ اسے برداشت کرے۔ ”
— درویش کا تکبر دولت مندوں کے تکبر سے بھی زیادہ ہے۔ حمدون قصار
— حقیقی راحت نفسانی خواہشات سے چھٹکارا حاصل کرنے میں ہے۔ یوسف اسباط
— انسانوں میں سب سے ذلیل وہ درویش ہے جو دولت مندوں کی خوشامد کرے۔ عبداللہ محمد مغربیؒ
— بادشاہ کی مثال بازار جیسی ہے جس میں وہی چیزیں لائی جاتی ہیں جن کی مانگ ہو۔ اگر بادشاہ خود ٹھیک ہوگا تو

اس کی رعایا بھی اسی کی طرح نیک ہوگی اور اگر بادشاہ نیک نہیں تو رعایا بھی نیک نہیں ہو سکتی۔ عمر بن عبدالعزیزؒ

——— اگر گناہوں میں بو ہوتی تو کوئی شخص میرے قریب نہ بیٹھتا۔ محمد بن سیرینؒ

——— دنیا میں زندگی کی سانسیں بہت کم اور قبر کی زندگی بہت لمبی ہے۔ ابن جوزیؒ

——— نیکی اس کے نصیب میں ہے جس نے اپنی خواہشات کو ترک کیا اور محروم وہی ہے جس نے دنیا کے مقابلہ میں آخرت سے منہ موڑا۔ ابن جوزیؒ

——— اصل کمال یہ ہے کہ علم اور عمل دونوں جمع ہوں۔ مرتبہ اُسی کا بلند ہے، جسے ان دونوں کی توفیق ہوئی۔ "

——— گزشتہ زندگی پر شرمندہ ہو اور ان گھڑیوں پر افسوس کرو جو مفت ضائع ہو گئیں۔ "

——— جو درویش نفسانی خواہش کے لیے امیروں کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس کے لیے نجات نہیں۔ ابو عثمان سعیدؒ

——— مدعی کی نسبت گنہگار بہتر ہے، کیونکہ گنہگار گناہ کا معترف ہوتا ہے اور مدعی اپنے دعوے میں گرفتار۔ "

——— کسی چیز کو جاننے کے لیے اس کی ضد کا جاننا ضروری ہے۔ جب تک ریا کو نہ سمجھے مخلص کا خلوص کامل نہیں۔ "

——— دنیا میں عزیز ہونے کی خواہش ہو تو تین چیزوں سے پرہیز کرو ۱۔ مخلوق سے حاجت مت چاہو۔ ۲۔ کسی کو برا نہ کہو۔ کسی کے ساتھ مہمان بن کر نہ جاؤ۔ بشر حافیؒ

——— جو شخص یہ خواہش رکھے کہ لوگ اُسے جانیں اُسے آخرت کی حلاوت نصیب نہ ہوگی۔ "

——— قناعت میں زندگی کی عزت کے بغیر کچھ نہ ہو تو یہ بھی کافی ہے۔ "

——— جب تک انسان اپنے اور نفس کے درمیان ایک دیوار نہ کھڑی کر دے وہ نیاز اور نماز کی لذت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ "

——— بخیل کو دیکھنے سے انسان کا دل سخت ہوتا ہے۔ "

——— کامل وہ ہے جس کا بدخواہ اُس سے امن میں ہو۔ "

——— اگر خدا کی عبادت کرنے کی طاقت نہ ہو تو کم از کم گناہ ہی ترک کر دو۔ "

——— پرہیزگاری یہ ہے کہ تو ہر وقت اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے۔ "

——— جو حق بات کہنے سے باز رہتا ہے وہ گونگا شیطان ہے۔ ابو علی الاقاقؒ

——— امیروں کی تواضع فقیروں کے ساتھ دیانت ہے اور فقیروں کی تواضع امیروں کے ساتھ خیانت ہے۔ "

——— صاحبِ سخاوت وہ ہے جو اپنے نفس پر خدا کو مقدم رکھے۔ "

——— جب دل دنیا کی محبت سے خالی ہو جاتا ہے تو اس میں حکمت پیدا ہو جاتی ہے۔ محمد الرودباریؒ

——— نفس سے خدمت اور روح سے مکاشفہ ظاہر ہوتا ہے۔ "

——— ہر شے کا کوئی واعظ ہوتا ہے اور دل کا واعظ حیا ہے۔ "

—— جوانمرد وہ ہے جو دونوں جہانوں میں خدا ہی کی تمنا رکھے۔ محمد الرودباریؒ

—— خوف کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ "

—— ایمان کو دل کے صدق سے تازہ کرو نہ کہ صرف زبانی اقرار سے۔ مولانا رومؒ

—— جب تک ہوائے نفسانی تازہ ہے ایمان تازہ نہیں ہو سکتا۔ "

—— چونکہ بہت سے ابلیس انسان کی صورت رکھتے ہیں، اس لیے ہر کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دو۔ "

—— مردانِ حق آفتاب کی مثل ہوتے ہیں جن کا کام روشنی اور گرمی پہنچانا ہے اور کمینوں کا کام بے حیائی اور فریب ہے۔ "

—— محض خرقۂ درویشی قابلِ اعتبار نہیں، اگر ایسا ہوتا تو تمام دنیا خرقہ پہن لیتی۔ نظام الدین اولیاءؒ

—— دانا وہ ہے جو پیش آنے والے سفر (آخرت) کے لیے تیاری کرے اور توشہ ساتھ رکھ لے "

—— توحید کے معنی خدا کو ایک کہنا ہے اور معرفت کے معنی خدا کو پہچاننا ہے۔ "

—— عارف کے ستر مقام ہیں، ان میں سے ایک اس جہان کی مرادوں کا نہ ملنا ہے۔ "

—— تکلیف کے موقع پر بددعا نہ دو تاکہ خدا اس کا بدلہ لے۔ "

—— اہلِ سماع اور ہے۔ جب درد کو قوال کے ایک ہی شعر پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور دوسروں کو کئی بلسریاں بھی متاثر نہیں کر سکتیں۔ نظام الدین اولیاءؒ

—— مومن وہ ہے کہ اگر وہ مشرق میں ہو اور مغرب میں کسی مسلمان کو کانٹا چبھے تو اسے محسوس کرے۔ "

—— مرد میں چار باتوں کے باعث کمال پیدا ہوتا ہے۔ کم کھانا، کم بولنا، خلق سے کم راہ و رسم رکھنا اور کم سونا "

—— جب بندہ محض خدا کے لیے کسی ادنیٰ شے کو چھوڑ دیتا ہے تو اسے اس سے بہتر شے ضرور ملتی ہے۔ "

—— صبر یہ ہے کہ بندہ کو خلافِ طبع کوئی امر لاحق ہو تو اس کی شکایت نہ کرے۔ "

—— ایمان اس وقت تک کامل نہیں جب تک نگاہ میں ساری خلقت کی حقیقت مچھر سے بھی کم نہ ہو "

—— قفلِ سعادت کی کئی کنجیاں ہیں، لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں کہ کس کنجی سے کھلے گا۔ اگر ایک سے نہ کھلے تو دوسری کنجی سے کھولنا چاہیے۔ غرض تمام کنجیوں سے کھولنا چاہیے۔ "

—— انسان اس وقت تک تائب ہوتا ہے، جب دوسری طرف کا فرشتہ پورے بیس روز تک اس کا کوئی گناہ نہ لکھے ابو عبداللہ جلاءؒ

—— پہلے وقت میں فرائض کو ادا کرنے والا عابد ہوتا ہے۔ "

—— موحد وہ ہے جو جملہ افعال کو رضائے الٰہی سمجھے۔ "

—— تصوف ایک ایسا فقر ہے جو اسباب سے تعلق نہیں رکھتا "

—— تو قع معرفت کا شکر ہے، تواضع عزت کا شکر ہے اور صبر مصیبت کا شکر ہے۔ "

___ جو شخص بات چیت کرتے وقت شرم و حیا کو محفوظ نہ رکھے، اسے خدا کی طرف سے مہلت دی جاتی ہے۔ عثمان الجسیریؒ

___ قانع وہ ہے جسے آئندہ کی فکر نہ ہو۔ "

___ اطاعت سعادت مندی کی علامت ہے۔ "

___ اخلاص کی علامت یہ ہے کہ نفس کا کسی حالت میں بھی دخل نہ ہو۔ اور خدا کے ساتھ خلوص نیت ہی اخلاص ہے۔ "

___ جو شخص سنتِ رسول کی پیروی کرتا ہے وہ حکمت بیان کرتا ہے اور جو حرص و ہوس کا اسیر ہے وہ بدعت کے گڑھے میں گر جاتا ہے۔ "

___ انسان چار اوصاف کے بغیر کامل نہیں ہوتا، اور وہ اوصاف یہ ہیں: عزت، ذلت، منع اور عطا۔ "

___ خدا کی احتیاج، غیر خدا سے فرار، مراقبہ اور تواضع یہ چار باتیں ہیں جن پر دل کی صلاحیت کا دارومدار ہے۔ "

___ جسے کوئی غم نہ ہو وہی غم زدہ ہے، مومن کے لیے ہر شے کا غم ہی اس کی فضیلت ہے۔ مگر گناہ کے سبب سے نہ ہو "

___ خوف خدا تک پہنچاتا ہے اور تکبر خدا سے دُور کر دیتا ہے۔ "

___ اپنے عیوب اور کسی کو نظر نہیں آتے سوائے اس شخص کے جو ہر وقت اپنے آپ کو ملامت کرتا رہے۔ "

___ تین اوصاف کا حامل عزیز ترین ہوتا ہے: اوّل وہ جو عالم ہو اور علم بیان کرے۔ دوسرا وہ جو لالچ سے دُور ہو، تیسرا وہ عارف جو حق کی صفات کیفیت کے بغیر بیان کرے۔

___ زاہدوں میں سب سے اچھا وہ ہے جو موت کو یاد رکھے۔ عثمان ہارونیؒ

___ مومن وہ ہے جو تین چیزوں کو دوست رکھے: موت، درویشی اور بھوک۔ "

___ لڑکیاں خدا کا ہدیہ ہیں، جو انھیں خوش رکھے اس سے خدا اور رسول خوش ہوتے ہیں۔ "

___ مرد وہ ہے جو خدا کے سوا کسی پر نظر نہ رکھے اور دنیا و آخرت میں مبتلا نہ ہو۔ "

___ علم کی دو قسمیں ہیں، ایک خاص خدا کے لیے علم سیکھنا اور ایک عوام کے طریقہ پر۔ اسی طرح عمل کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو خاص خدا کے لیے کیا جائے، یہ خواص کا عمل ہے اور دوسرا عمل وہ ہے جو لوگوں کے لیے کیا جائے۔ "

___ بہت سی ایسی مصیبتیں ہیں جو امیروں کو اٹھانی پڑتی ہیں اور غریب ان سے بچے رہتے ہیں۔ احمد کبیرؒ

___ دولت کسی کو شریف نہیں بنا سکتی۔ اور نہ ہی افلاس کے باعث کوئی کمینہ بن جاتا ہے۔ "

___ اہلِ قلوب کی صحبت اور ان کی دوستی جب ہی فائدہ دیتی ہے کہ ان کی صحبت کے آداب سے آگاہی ہو اور ان کی پوری رعایت کی جائے، ورنہ خطرے کا باعث ہے۔ "

___ اربابِ شہود کی صحبت دل کو گرفتاری سے جلد نجات دیتی ہے لہٰذا ایسی صحبت کو صحبت کی نگہداشت کے ساتھ اپنے اوپر لازم رکھو۔ ناصر الدین عبید اللہؒ

—— عمل کو محبوب رکھنا چاہیے نہ کہ حضور و جمعیت کو۔ اس لیے کہ حضور و جمعیت اختیاری نہیں۔ اس میں فتور کو بہت کچھ دخل ہے، بخلاف عمل کے کہ یہ کسب کی چیز اور اختیاری معاملہ ہے۔ ناصرالدین عبیداللہؒ

—— زیادہ بھوک اور زیادہ بیداری دماغ کو ضائع کرتی ہے اور اُسے حقائق کے ادراک سے عاری کر دیتی ہے۔ اس لیے بعض اہل ریاضت سے کشف میں غلطیاں ہوئی ہیں۔ البتہ زیادہ بیداری اسے نقصان نہیں دیتی، جس کے لیے اس میں فرحت و اطمینان فتح ہو چکا ہو، کیوں کہ یہ فرحت و سرور ہی خواب کا کام دیتا ہے اور دماغ کو نقصان سے بچاتا ہے۔ ″

—— عمل کرو اور اپنے عمل کو ناقص اور اپنے آپ کو قاصر سمجھ کر اس کی اصلاح میں لگے رہو۔ عزیزان علی رامیتنیؒ

—— بات کرتے وقت اور کھاتے وقت اپنے آپ کو خوب نگاہ میں رکھو۔ ″

—— منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے سالک کو بہت محنت و ریاضت کی ضرورت ہے مگر آسان ترین راستہ یہ ہے کہ اہلِ دل کے دل میں جگہ حاصل کرے۔ چونکہ اہلِ دل کا دل خدا کی نظر کا مقام ہوتا ہے، اس لیے وہ بھی اس نظر سے ضرور حصہ پائے گا۔ عزیزان علی رامیتنیؒ

—— توڑنا اور جوڑنا ایمان ہے۔ ″

—— جو سالک فنائے نفس کی حد تک نہیں پہنچتا، جب وہ غصہ میں آتا ہے تو شیطان اس پر غلبہ پا لیتا ہے، لیکن جس نے اپنے نفس کو فنا کر دیا اسے غصہ نہیں آتا غیرت آتی ہے اور غیرت سے شیطان بھاگتا ہے۔ عبدالخالق عجدوانیؒ

—— جو سانس اندر سے نکلے وہ حضوری و آگاہی سے ہونا چاہیے اور اس میں غفلت کو راہ نہیں ہونی چاہیے۔ ″

—— سالک کی نظر ہمیشہ پشت پا پر رہنی چاہیے تاکہ پراگندہ نہ ہو اور ایسی شے پر نہ پڑے جسے دیکھنا نا روا ہو۔ ″

—— سالک سے جس قدر میسر ہو اپنی خاطر کو نگاہ میں رکھے تاکہ غیر اس میں نہ گزرنے اور قوتِ متخیلہ اپنے عمل سے نیم ساعت کے لیے کبھی معزول ہو جائے تو اہلِ تحقیق کے لیے عظیم امر ہے۔ ″

—— خدا طلبی بلا طلبی ہے، جیسا کہ حدیث قدسی ہے کہ جو مجھ سے محبت کرتا ہے میں اُسے مبتلا کرتا اور آزماتا ہوں۔ بہاؤالدین محمد نقشبندؒ

—— جو معدہ غذا سے بھرا ہوا اس میں حکمت نہیں آسکتی۔ داؤد طائیؒ

—— علماء کا علم دو حرفوں میں ہے: اصلاحِ ملت اور تجرید خدمت! جنید بغدادیؒ

—— بدخو عالم کی نسبت نیک خو فاسق کی صحبت اچھی ہے۔ ″

—— عالم وہ ہے جو بجائے علم کے اپنا عالم ہو۔ ابوالحسن خرقانیؒ

—— نفع دینے والا علم وہ ہے جس کا تو پابند رہے اور اس پر عمل کرتا ہے اور بہترین عمل وہ ہے جو تجھ پر فرض ہے۔ ..

—— اگر تم اپنے علم پر عمل کرتے تو یقیناً دنیا سے دور بھاگتے، اس لیے کہ علم میں کوئی شے ایسی نہیں جو دنیا سے محبت کرنا سکھائے۔ غوث اعظمؒ

کتنا بھی زیادہ علم حاصل کرو مگر اُسے تھوڑا ہی جانو۔ غوث اعظمؒ

افضل شے کو افضل علم کے ذریعہ جاننا حکمت کہلاتا ہے۔ ″

بے علم نیک چلن اُن عالموں فاضلوں سے اچھا ہے جو اخلاق سے گرے ہوئے ہوں۔

حکمت عارفوں کے دل میں تصدیق کی زبان سے ہم کلام ہوتی ہے، زاہدوں کے دل میں تفضیل کی زبان سے، عابدوں کے دل میں توفیق کی زبان سے، مریدوں کے دل میں تفکر کی زبان سے اور عالموں کے دل میں تذکر کی زبان سے۔ منصور عمارؒ

علم کے سمندر میں تیرنے والے بچوں کو ان کی اپنی قوت سے تیرنا سکھاؤ۔

لوگوں نے مُردوں سے علم سیکھا ہے، مگر میں نے ایسے زندہ سے علم سیکھا ہے جسے کبھی موت نہیں آسکتی۔ بایزید بسطامیؒ

عالم شخص کے اندر ایک لاکھ جاہلوں کے برابر طاقت ہوتی ہے۔ ″

میرے لیے علم ظاہری کی متابعت سے زیادہ دشوار اور کوئی نہیں۔ ″

علم وہ ہے جس سے دنیا حقیر دکھائی دے اور عقبیٰ کی رغبت بڑھے۔ دنیا کی بُرائی کا علم ہو جائے اور بُرے اخلاق دور ہو سکیں۔ امام غزالیؒ

علم آزاد ہے اور طالب علم اس کا غلام۔ غلام خدمت کرے گا تو آقا اس سے خوش ہوگا اور اگر ناز کرے گا تو علم کا حق نازبرداری پر زیادہ ہوگا۔ امام شافعیؒ

جس طرح عالموں کے نزدیک جہل جہالت ہے، اسی طرح جاہلوں کے نزدیک علم جہالت ہے۔ ″

علم کی فضیلت اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ جاہل اس کے مدعی ہیں اور جہل کی بُرائی پر کیا کم ہے کہ جاہل اپنے جہل سے منکر ہے۔ اگر جاہل کو جاہل کہیں تو اُسے غصہ آجاتا ہے۔ ″

علم حاصل کرنا نفل پڑھنے سے افضل ہے۔ ″

علم دو ہیں، علم روح اور علم جسم۔ علم روح علم دین ہے اور علم جسم طب ہے۔ ″

جس نے جاہلوں کو علم سکھایا، اس نے علم کو ضائع کیا اور جس نے مستحق کو علم سکھانے سے گریز کیا اس نے ظلم کیا۔ ″

علم بہت شریف چیز ہے، لیکن جب اسے حاصل کر کے در در کا چکر لگایا جائے تو ذلیل ہو جاتا ہے۔ نظام الدین اولیاءؒ

شجرہ ہائے طریقت

مشائخ سلسلہ چشتیہ!

سید المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔
امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام
حضرت امام حسینؑ
حضرت خواجہ حسن بصریؒ
حضرت خواجہ عبدالواحد بن زید
حضرت خواجہ فضیل بن عیاضؒ
حضرت خواجہ ابراہیم ادھمؒ
حضرت خواجہ حذیفۃ المرعشیؒ
حضرت خواجہ ہبیرۃ البصریؒ
حضرت خواجہ ممشاد علو دینوریؒ
حضرت خواجہ ابو اسحٰق شامیؒ
حضرت خواجہ ابو احمد ابدال چشتیؒ
حضرت خواجہ ابو محمد چشتیؒ
حضرت خواجہ ابو یوسف چشتیؒ
حضرت خواجہ مودود چشتیؒ
حضرت خواجہ شریف زندنیؒ
حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ
حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ
حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ
حضرت خواجہ علاؤالدین علی احمد صابرؒ
حضرت خواجہ شمس الدین ترکؒ
حضرت خواجہ محمد جلال الدینؒ
حضرت شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ
حضرت شیخ احمد عارفؒ
حضرت شیخ محمدؒ
حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ
حضرت خواجہ رکن الدین گنگوہیؒ
حضرت خواجہ عبدالاحد سرہندیؒ
حضرت شیخ احمد سرہندیؒ { مجدد الف ثانی }
خواجہ محمد معصومؒ
حضرت خواجہ حجت اللہ محمد نقشبندؒ
حضرت خواجہ محمد زبیرؒ
حضرت خواجہ شاہ قطب الدینؒ
حضرت سید حافظ جمالؒ
حضرت خواجہ شاہ عیسیٰ ولیؒ
حضرت خواجہ بابا فیضی محمد فیض اللہؒ
حضرت بابا نور محمدؒ
حضرت خواجہ محمد صدیقؒ
حضرت خواجہ محمد رفیقؒ

مشائخ سلسلہ قادریہ

سید المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم
حضرت امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ
حضرت امام حسن علیہ السلام
حضرت خواجہ حسن بصریؒ
حضرت خواجہ حبیب عجمیؒ
حضرت خواجہ داؤد طائیؒ
حضرت خواجہ معروف کرخیؒ
حضرت خواجہ سری سقطیؒ
حضرت خواجہ جنید بغدادیؒ
حضرت خواجہ ابوبکر شبلیؒ
حضرت خواجہ عبدالعزیز تمیمیؒ
حضرت خواجہ عبدالواحد تمیمیؒ
حضرت خواجہ محمد طرطوسیؒ
حضرت خواجہ ابوالحسن ہنکاریؒ
حضرت خواجہ مبارک خرمیؒ
حضرت سید محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ
حضرت تاج الدین سید عبدالرزاقؒ
حضرت شاہ شرف الدین قتالؒ
حضرت خواجہ شاہ عبدالوہابؒ
حضرت خواجہ شاہ بہاؤالدینؒ
حضرت خواجہ شاہ عقیلؒ
حضرت خواجہ شاہ شمس الدینؒ
حضرت خواجہ شاہ گدا رحمٰنؒ
حضرت شمس الدین عارفؒ
حضرت شاہ گدا رحمٰن ثانیؒ
حضرت شاہ فضیلؒ
حضرت شاہ کمال کیتھلیؒ
حضرت شاہ سکندر کیتھلیؒ
حضرت شیخ احمد سرہندیؒ
حضرت شیخ محمد معصومؒ
حضرت شیخ محمد نقشبند ثانیؒ
حضرت شیخ محمد زبیرؒ
حضرت شاہ قطب الدینؒ
حضرت حافظ جمال اللہؒ
حضرت عیسیٰ ولیؒ
حضرت بابا فیض محمدؒ
حضرت بابا نور محمد تیراہیؒ
حضرت خواجہ محمد صدیقؒ

مشائخ سلسلہ نقشبندیہ

سید المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم
امیر المومنین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ
حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ
حضرت امام قاسم رضی اللہ عنہ
حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ
حضرت بایزید بسطامی رح
حضرت ابو الحسن خرقانی رح
حضرت ابو علی فارمدی رح
حضرت ابو یعقوب یوسف ہمدانی رح
حضرت عبد الخالق غجدوانی رح
حضرت عارف ریوگری رح
حضرت محمود انجیر فغنوی رح
حضرت علی رامیتنی رح
حضرت محمد بابا سماسی رح
حضرت سید میر کلال رح
حضرت بہاؤالدین محمد نقشبند رح
حضرت علاؤالدین عطار رح
حضرت یعقوب چرخی رح
حضرت ناصر الدین عبید اللہ احرار رح
حضرت محمد زاہد بدخشی رح
حضرت درویش محمد رح
حضرت خواجہ محمد امکنگی رح
حضرت خواجہ محمد باقی باللہ رح
حضرت مجدد الف ثانی رح
حضرت محمد معصوم رح
حضرت محمد نقشبند ثانی رح
حضرت محمد زبیر رح
حضرت شاہ قطب الدین رح
حضرت حافظ جمال اللہ رح
حضرت شاہ عیسیٰ ولی رح
حضرت بابا محمد فیض اللہ رح
حضرت بابا نور محمد رح
حضرت خواجہ نامدار شاہ رح
حضرت سید چمن شاہ رح
حضرت خواجہ محمد صدیق رح
حضرت خواجہ محمد رفیق رح

مشائخ سلسلہ نقشبندیہ

(جامعین ہر سہ سلاسل)

حضرت خواجہ خواجگان شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رح
حضرت خواجہ محمد معصوم رح
حضرت خواجہ حجت اللہ محمد نقشبند ثانی رح
حضرت خواجہ محمد زبیر رح
حضرت خواجہ شاہ قطب الدین رح
حضرت حافظ جمال اللہ رح
حضرت شاہ عیسیٰ ولی رح
حضرت بابا فیض اللہ رح
حضرت بابا نور محمد تیراہی رح

عرسہائے بزرگانِ پاکستان

نام بزرگ	مقام عرس	نام بزرگ	مقام عرس
داتا گنج بخشؒ	لاہور	مولوی غلام قادرؒ	لاہور
میاں میرؒ	"	شمس الدین قادریؒ	"
صدر دیوان لاہوریؒ	"	بی بی پاک دامنؒ	"
شاہ شرفؒ	"	حامد قادریؒ	"
مادھو لال حسینؒ	"	شیخ موسیٰ آہنگرؒ	"
شاہ بلاولؒ	"	عبدالجلیل لاہوریؒ	"
پیر مکیؒ	"	شاہ سید دیوانؒ	"
گھوڑے شاہؒ	"	ہرا بادشاہؒ	"
شاہ محمد غوثؒ	"	ابوالخیر نولکھہ ہزاریؒ	"
شاہ جمالؒ	"	سید صوفؒ	"
حشو تیلیؒ	"	بابا گلو شاہؒ	کوٹلی
موج دریا بخاریؒ	"		(ضلع سیالکوٹ)
شاہ چراغؒ	"	امام علی الحقؒ	سیالکوٹ
شاہ سروانیؒ	"	خواجہ شمس الدینؒ	"
عبداللہ شاہ قادریؒ	"	امیر الدین عرف بابا صاحبؒ	کوٹلہ شریف
شاہ ابواسحاق قادریؒ	"	جماعت علی شاہؒ (حافظ)	علی پور سیداں
فقیر تابے شاہؒ	"	جماعت علی شاہ لاثانیؒ	"
سید یعقوب زنجانیؒ	"	بابا سلیمؒ	گجرات
شاہ اسماعیل محدثؒ	"	خواجہ فیض الرسولؒ	حاجی والی شریف
میاں وڈاؒ	"	بری شاہ لطیفؒ	راولپنڈی
پچکی مخی سرورؒ	"	پیر باباؒ	بونیر

نام بزرگ	مقام عرس
عبداللطیف بھٹائیؒ	بھٹ شاہ
شاہ متینؒ	کیمبل پور
احمد میرویؒ	میرا شریف
مولوی احمد خانؒ	״
سردار سلطانؒ	ڈیرہ غازیخاں
پیر عالمن شاہؒ	مڑھ بلوچاں
جلال الدین بخاریؒ مخدوم جہانیاں	اوچ شریف
خلیفہ محمد صدیقؒ و محمد رفیقؒ	آلو مہار شریف
فریدالدین گنجشکرؒ	پاک پٹن
شاہ محمد سلیمان تونسویؒ	تونسہ شریف
سخی سرور سلطان	نگاہیہ
شاہ فضل الٰہیؒ	قصور
شاہ محمد سعیدؒ	شرق پور
میاں شیر محمدؒ	״
محمد نوشہؒ	نوشہرہ
شاہ مقیمؒ	چک جھمرہ
کاکا صاحبؒ	زیارت کاکا صاحب
فرید ثانیؒ	مٹھن کوٹ
شاہ عبدالرحمانؒ	بھرّی شاہ رحمان
شاہ دولاؒ	گجرات
شمس الدین سیالویؒ	سیال شریف
پیر سچیارؒ	ضلع گجرات
پیر حیدر شاہؒ	جلال پور
بہاؤالدین ذکریا ملتانیؒ	ملتان

نام بزرگ	مقام عرس
خدا بخش ملتانیؒ	ملتان
حافظ محمد جمال ملتانیؒ	״
شاہ یوسف گردیزیؒ	״
خواجہ نور محمدؒ	چورا شریف
شاہ بہلولؒ	شاہ بہلول
	(ضلع گوجرانوالہ)
پیر چہتلؒ	تحصیل گنداوہ
	(بلوچستان)
مہربان علی شاہ بخاریؒ	اکوڑہ خٹک
بابا گلاب شاہؒ	رسول نگر
	(ضلع گوجرانوالہ)
مہر علی شاہ گولڑویؒ	گولڑہ شریف
نورالحسن شاہؒ	کیلیاں والا
خواجہ نور محمد مہارویؒ	چشتیاں

عرسہائے بزرگانِ بھارت

نام بزرگ	مقام عرس	نام بزرگ	مقام عرس
خواجہ معین الدین چشتیؒ	اجمیر	مخدوم شاہ علیؒ	کانپور
بو علی شاہ قلندرؒ	پانی پت	شیخ احمدؒ	سرہند
ثناء اللہؒ	"	مخدوم علاؤالدینؒ	کلیر شریف
نصیر الدینؒ	دہلی	خواجہ قطب الدینؒ	دہلی
شاہ احمد سرورؒ	مراد آباد	حسین بخشؒ	فرخ آباد
شیخ حبیب الدینؒ	بدایوں	میراں شاہؒ	احمد نگر
امیر خسروؒ	دہلی	صوفی محمد امام الدینؒ	مکتسر
میاں عبد الحکیمؒ	رام پور	عبد الحکیمؒ	غازی پور
خواجہ گیسو درازؒ	گلبرگہ	نظام الدین اولیاءؒ	دہلی
بندہ نواز کابلیؒ	"	مولانا فخر الدینؒ	"
شاہ ولایت علیؒ	آگرہ	مجدد الف ثانیؒ	سرہند
شاہ علی نقیؒ	"	شاہ عبد العزیز دہلویؒ	دہلی
محمد شیر میاںؒ	پانی پت	شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	"
بھورے میاںؒ	رام پور	شہاب الدین سہروردیؒ	بنگالہ
بہاؤالدینؒ	گوالیار	شیخ عبد الحق ردولویؒ	ردولی
وارث علی شاہؒ	دیوا شریف	شاہ نعمت اللہ ولیؒ	دہلی
شاہ مطیع الرسولؒ	بدایوں	تاج الفحولؒ	بدایوں
شاہ نظام الدین چشتیؒ	بانس بریلی	مولوی نور الحقؒ	لکھنؤ
عبد القدوس گنگوہیؒ	گنگوہ	بندگی شاہؒ	سکندر آباد
غلام علی نقشبندیؒ	دہلی	خواجہ ناصر دہلویؒ	دہلی
شاہ میناؒ	لکھنؤ	افضل علیؒ	میرٹھ

نام بزرگ	مقام عرس	نام بزرگ	مقام عرس
مہر اللہؒ	صفی پور	جمال بہارؒ	مونگیر
سید غوث محمدؒ	گوالیار	فضل الرحمانؒ	گنج مراد آباد
شاہ جنیدؒ	غازی پور	شاہ صفیؒ	صفی پور
کرم الٰہی شاہ پوریؒ	بمبئی	مطیع الرسولؒ	بدایوں
محمد یحییٰ بہاریؒ	کلکتہ	شاہ جمال اللہؒ	رام پور
جلال الدین تھانیسریؒ	تھانیسر	مولانا احمد حسینؒ	کانپور
شاہ بلاقیؒ	مراد آباد	شاہ درگاہیؒ	رام پور
خواجہ زری بخشؒ	اورنگ آباد	شاہ نیاز احمدؒ	بریلی
شاہ ہمدانؒ	کشمیر		
قدم شریف	آگرہ		

تاریخ ادبِ عربی

از

استاذ احمد حسن زیات

ترجمہ

عبدالرحمٰن طاہر سورتی کونسل انجمن ترقی عربی (پاکستان)

ہمارے کلاسیکی اُردو ادب، بالخصوص شاعری پر عجمی خیالات کی چھاپ ہے۔ اس لیے علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا:

دگر بہ دشت عرب خیمہ زن کہ بزم عجم

مے گزشتہ و جام شکستہ دارد

مولانا عبدالرحمٰن طاہر سورتی نے احمد حسن زیات کی کتاب

تاریخ ادبِ عربی

کا سلیس ترجمہ کر کے اُردو دانوں کو عربی ادب سے روشناس کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ گویا سلمائے عرب کا سراپا جس کی سادہ روئی میں بھی ایک خاص دلکشی ہے۔

یہ کتاب مفید بھی ہے۔

اور

دلچسپ بھی

اس کے مطالعے سے اُردو کے ادیبوں کے لیے فکر و خیال کی نئی راہیں روشن ہوں گی۔ یہ کتاب اُردو ادب میں بیش قیمت اضافہ ہوگی۔ طباعت بذریعہ اُردو ٹائپ

سائز ۶½ × ۱۰ ضخامت ۷۸۰ صفحات

آثارِ امام شافعیؒ

تصنیف:- محمد ابو زہرہ (مصر)

ترجمہ:- سید رئیس احمد جعفری (ندوی)

امام شافعی کا شمار آئمہ اربعہ میں ہوتا ہے۔ وہ فقہ میں ایک مخصوص مکتب فکر کے بانی ہیں۔ انہوں نے تدوین فقہ اسلامی کے سلسلہ میں گراں بہا خدمات انجام دیے ہیں۔ وہ اپنے نتائج فکر بیباکی کے ساتھ ظاہر کرتے تھے۔ دُنیا کی کوئی طاقت انہیں مرعوب نہ کر سکی۔ خواہ وہ سلطان کی بارگاہ ہو یا وزیر کا ایوان۔ یا خلیفہ کی مجلس ہر موقع اور ہر جگہ انہوں نے اپنا پیام پہنچایا اور اس راستے میں طرح طرح کی اذیتیں، تکلیفیں، رسوائیاں اور عقوبتیں برداشت کیں۔ لیکن ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں پیدا ہوئی عزم اور استقامت کے ساتھ وہ اپنے راستے پر گام فرسا رہے۔ علمی اور تحقیقی اعتبار سے امام شافعی کا پایہ خاص طور پر بلند ہے۔ انہوں نے حدیث کی حجیت پر جو رسالے لکھے جو کتابیں تحریر کیں۔ وہ دلائل دیئے۔ جو مناظرے کیے اور جو نکات پیش فرمائے۔ وہ فقہ اسلامی کی تاریخ میں ایک قیمتی ورثہ اور قیمتی سرمایہ ہے۔ امام شافعی کے حالات و سوانح تعلیم و تدریس۔ سفر و سیاحت، اجتہادات اور تحقیقات پر مصر کے یگانہ روزگار فاضل علامہ ابو زہرہ نے ایک بے مثل کتاب تحریر فرمائی ہے جو دار الفکر العربی مصر سے شائع ہوئی ہے۔ سید رئیس احمد جعفری (ندوی) نے اس کتاب کا شستہ، رواں اور شگفتہ ترجمہ کیا ہے

صفحات ۵۵۰ قیمت -/۱۵ روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پرنٹرز، پبلشرز، بُک سیلرز۔ کشمیری بازار۔ لاہور

انوار انبیا

مؤلفہ ۔۔۔۔۔ ادارہ تصنیف وتالیف

قرآن کریم، انجیل مقدس، تورات شریف اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں ان تمام انبیائے کرام اور معلمین عظام کے حالات زندگی اور تعلیمات و اقوال و ارشادات کا خلاصہ جن کے تذکرے جن کے اسمائے گرامی یا جن کی طرف واضح یا مبہم اشارے ان مقدس کتابوں میں ملتے ہیں۔

قوموں کی تہذیب اور اخلاقی حالت کا تاریخی پس منظر اور بعثت کے مقاصد اور ضروریات پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

خوبصورت و دیدہ زیب ڈسٹ کور

سائز ۳۰×۲۰/۸ صفحات ۲۵۶ قیمت دس روپے

سرور عالم

مصنفہ ۔۔۔۔۔ مولانا غلام رسول مہر

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کا مرقع زبان و بیان اور اظہار مطالب کے لحاظ سے بے نظیر کتاب ہے۔ اختصار کے باوجود سیرت کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوا ہر واقعہ کا پس منظر اور احوال و ظروف کو بھی جزو واقعہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

سائز ۵×۷½ صفحات ۳۲۸ قیمت ۲/۵۰

انوار اصفیا

مرتبہ

ادارہ تصنیف وتالیف

دنیائے اسلام کے نوّے صوفیائے عظام اور عارفان عالی مقام کے مکمل حالات و کوائف انہیں کے ملفوظات و تصنیفات و مستند کتب تواریخ کی روشنی میں ہر شخصیت کے بیان میں ولادت اور رحلت کی تاریخیں۔ جائے پیدائش اور وفات، سلسلہ، طریقت و مشیخت، ذاتی زندگی، عملی کارنامے، تعلیمات، مکتوبات اور تصنیفات، غرض کوئی متعلقہ بات ایسی نہیں جو حالات کے ضمن میں بیان نہ کی گئی ہو۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ایسے تذکروں میں اپنی جلالت، ندرت اور جامعیت کے لحاظ سے ایک بالکل نئے، نادر اور مستند تذکرے کی حیثیت رکھتی ہے۔

کتاب کے آخری اوراق یعنی

دوسرے حصے میں

بزرگان دین کے چیدہ چیدہ اقوال کا خلاصہ۔ مختلف اولیا اللہ کی چھوٹی چھوٹی نتیجہ خیز اور عبرت آموز داستانیں۔ طریقت کے مشہور سلسلوں کی تفاصیل اور بزرگان دین کے عرسوں کی فہرست درج ہے۔

سائز ۷½×۱۰ ضخامت ۷۵۰ صفحات

کاغذ و طباعت اعلیٰ۔ مجلد دس روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پرنٹرز، پبلشرز، بک سیلرز کشمیری بازار لاہور